خواب کے اندر خواب

حیدر قریشی

خواب کے اندر خواب

KHAWAB KAY ANDAR KHAWAB

By: Haider Qureshi

میری محبتیں
حیدر قریشی

خواب کے اندرخواب

(تخلیقی نثر کے چھ مجموعے)

حیدرقریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

سرورق ڈیزائن:ارشدخالد
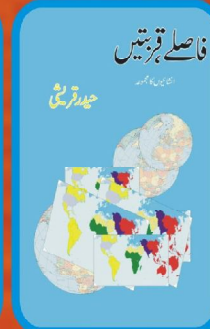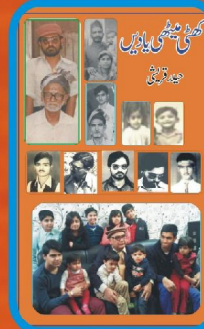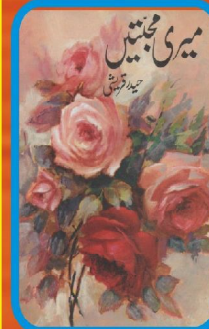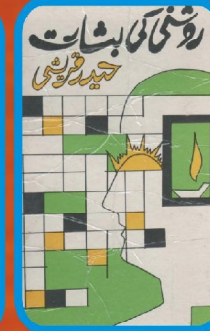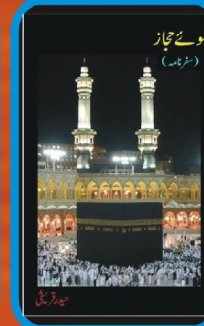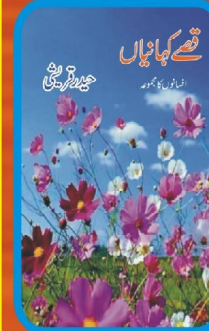
خواب کے اندرخواب

میں شامل چھ کتابوں کی ترتیب

نیچے کی جانب ہر کتاب کا نام درج ہے اوراس کے صفحات کے نمبرز بھی ہر کتاب کی فہرست کے مطابق دیئے گئے ہیں۔جبکہ اوپر کی جانب "**خواب کے اندرخواب**" کی مسلسل ترتیب کے مطابق صفحہ نمبر1 تا832 درج کیے گئے ہیں۔

....

حیدرقریشی کی مذکورہ بالا کتابیں اوردیگر تمام کتابیں بھی،ان ای لائبریریز پر دستیاب ہیں۔

http://haider-qureshi.blogspot.de/

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

http://issuu.com/haiderqureshi

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حیدرقریشی سے متعلق کتابیں اوررسالے ان لنکس پر دستیاب ہیں۔

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

http://issuu.com/haiderqureshi

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

(مرزا غالبؔ)

حیدرؔ بھید جہاں کے جیسے خواب کے اندر خواب
ایک نقاب اگر اُلٹیں تو آگے اور نقاب

انتساب

ابا جی اور امی جی کے نام!

حیدؔر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابا بھی چل بسے، تری ماں بھی نہیں رہی

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

صورت ابو کی اُبھر آئی مرے چہرے میں
دے گئی کیسی خوشی جاتی جوانی اپنی

ابتدائیہ

۲۰۰۱ء میں میرے پانچ شعری مجموعے ایک جلد میں شائع کرنے کا پروگرام بنا تھا۔ اسی پروگرام میں یہ بھی طے ہوا کہ شاعری کی کتاب کے بعد میرے پانچ یا چھ نثری مجموعے بھی ایک جلد میں شائع کیے جائیں گے۔لیکن جس دوست نے اس کام کی ذمہ داری لی تھی، وہ پھر ذمہ داری کو شروع میں ہی نبھا نہ سکے اور پاکستان سے میری کتابوں کی اشاعت کا پروگرام تاخیر کا شکار ہوتا چلا گیا۔اسی دوران انڈیا سے معیار پبلی کیشنز دہلی اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے میری متعدد کتابیں شائع کیں۔ان میں شاعری کی پانچ اور نثر کی چھ، مجموعی طور پر گیارہ کتابیں ایک جلد میں پیش کرنے کا تجربہ بھی کیا گیا۔

اب جو اپنے سارے کام کو سمیٹنے کی دھن سمائی ہوئی ہے تو پرانے منصوبے کو نئے انداز کے ساتھ ترتیب دینے کا خیال آیا ہے۔اردو ماہیا کی تحقیق وتنقید پر مشتمل میری پانچ کتابیں ایک جلد میں پاکستان سے شائع کی جا چکی ہیں۔''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' کے نام سے اس جلد کو الوقار پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا تھا۔اب ۲۰۱۴ء میں ماہیا سے ہٹ کر میرے تنقیدی مضامین کی چھ کتابیں ایک جلد میں شائع ہونے جا رہی ہیں۔ یہ جلد''ہمارا ادبی منظر نامہ'' کے نام سے آرہی ہے۔اسی دوران انٹرنیٹ لائبریری کی سہولت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے اپنے کالم اور سیاسی مضامین کو ایک جلد میں یک جا کر کے''حالاتِ حاضرہ'' کے نام سے مکمل کر لیا ہے اور اسے ای بک کی صورت میں انٹرنیٹ پر دے دیا ہے۔

مقصد تو یہ تھا کہ سارا بکھرا ہوا کام یک جا ہو جائے اور انٹرنیٹ پر کہیں ادب کا کوئی سنجیدہ قاری پہنچ جائے تو اسے میری کتابیں ڈھونڈنے کے لیے مشقت نہ کرنا پڑے۔سو میں نے اپنے چھ شعری مجموعوں کو ایک جلد میں یک جا کر کے اسے 'قفس کے اندر' کے نام سے شائع کر دیا۔کتابی

صورت میں ''قفس کے اندر'' کے عوامی ایڈیشن (صفحات ۱۵۲) کو ۲۰۱۳ء میں عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد نے شائع کیا تھا۔اس میں چھ مجموعوں کی ساری غزلیں ایک جگہ پر، ساری نظمیں الگ سیکشن میں اور سارے ماہیے الگ حصے میں دیئے گئے تھے لیکن''ای بک کی صورت میں **''قفس کے اندر''** کی نئی ترتیب میں اصنافی تقسیم کی بجائے چھ شعری مجموعوں کو ان کی الگ الگ کتابی ترتیب کے مطابق یک جا کیا گیا ہے۔۶۱۸ صفحات پر مشتمل یہ ای بک ۲۰۱۴ء کے شروع میں آن لائن کی جا چکی ہے۔اسی تسلسل میں اب تخلیقی نثر کے چھ مجموعے بھی الگ الگ کتاب کی صورت میں ترتیب دے کر ایک جلد میں شائع کر رہا ہوں۔اس جلد کا نام **''خواب کے اندر خواب''** ہے۔

اب تک میری مختلف کتابوں کو ایک جلد میں یکجا کر کے شائع کرنے کے یہ کام مکمل ہو چکے ہیں۔

۱۔**''عمرِ لاحاصل کا حاصل''** شاعری اور نثر کی **گیارہ کتابیں** ایک جلد میں۔(۲۰۰۵،اور ۲۰۰۹ء)
۲۔**اردو ماہیا تحقیق وتنقید**۔ماہیا کی تحقیق وتنقید کی **پانچ کتابیں** ایک جلد میں۔(۲۰۱۰ء)
۳۔**قفس کے اندر۔چھ شعری مجموعے** ایک ساتھ۔عوامی ایڈیشن۔**۱۵۲** صفحات میں۔(۲۰۱۳ء)

اور اس سال ۲۰۱۴ء کے شروع میں یہ کتابیں ای بک کی صورت میں یک جا کر کے انٹرنیٹ لائبریری پر شائع کر دی گئی ہیں۔

۱۔**قفس کے اندر۔چھ شعری مجموعے**۔**۶۱۸** صفحات کی ایک جلد میں۔
۲۔**حالاتِ حاضرہ**۔کالموں کے **چار مجموعے** ایک جلد میں۔
۳۔**خواب کے اندر خواب**۔تخلیقی نثر کے **چھ مجموعے** ایک جلد میں۔

ایک اور کتاب''**ہمارا ادبی منظر نامہ**''اسی برس کے وسط تک لا رہا ہوں۔اس میں تنقیدی مضامین کے **چھ مجموعے** شامل ہوں گے اور اسے ای بک کے طور پر بھی شائع کیا جائے گا۔

بہر حال اس وقت اپنے سارے کام کو ایک نظر دیکھتے ہوئے، اپنی تخلیقی نوعیت کی چھ نثری کتابیں ایک جلد میں **''خواب کے اندر خواب''** کے نام سے ای بک کی صورت میں پیش کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت ہو رہی ہے۔امید ہے ادب کے سنجیدہ قارئین بھی اسے پسند کریں گے۔

حیدر قریشی (جرمنی سے) یکم فروری ۲۰۱۴ء

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے''

روشنی کی بشارت

(افسانے)

حیدر قریشی

تجدید اشاعت گھر

اسلام آباد۔لاہور

انٹرنیٹ ایڈیشن

''جو پتھر معماروں نے رد کیا

وہی کونے کا سرا ہو گیا۔۔۔''

(حضرت مسیح علیہ السلام)

ضابطہ

(جملہ حقوق بحق مصنف)

کتاب کا نام:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔روشنی کی بشارت

مصنف:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حیدر قریشی

تاریخ اشاعت:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۹۲ء

تعداد:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۵۰۰

قیمت:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۰۰ روپے

سرورق:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شبہ طراز

ناشر: تجدید اشاعت گھر

اسلام آباد۔لاہور

انٹرنیٹ ایڈیشن ۲۰۱۴ء

ایک شام سادھو نے آکاش پر ایک تیز روشنی مشاہدہ کی جو آہستہ آہستہ نیچے اترتی شدودھن کے محل میں جا کر ختم ہوگئی۔ سادھو اس نورانی ہالہ کی تلاش میں مہاراجہ کے محل میں آیا تو وہاں ننھے سدھارتھ کو دیکھا۔

(گوتم بدھ کے بچپن کا واقعہ)

''وہ آسمانوں کا چمکتا ہوا سورج دکھائی دیتی ہے جو ادریس کے سینے میں ہے۔

وہ یسوع ہے، روشنی میں توریت۔ وہ رومی کلیسا کی بیٹی ہے۔ وہ ہمارے مذہب، زبور اور یہودی اور مسیحی بزرگوں کی فراست میں ہے۔ جس دن وہ وداع ہوئی، میں نے اپنے صبر کو پکارا۔ اور جب میں قریب المرگ تھا تو میں نے اس کے جمال اور حُسن سے شفا چاہی۔۔۔ اور وہ رضامند ہو گئی۔۔۔۔

میرا دل ہر حال پر قادر ہے، جہاں راہب کے لیے خانقاہ اور بتوں کے لیے معبد، ہرنوں کے لیے چراگاہ اور حج کو آنے والوں کے لیے کعبہ ہے۔ جہاں توریت کے نسخے اور قرآن کی سورتیں ہیں۔ میرا مذہب عشق ہے اور جہاں میرے اونٹوں کی نکیل مڑتی ہے وہیں میرے ایمان کی سچائی ہے۔''

(اقتباس از ترجمان الاشواق: حضرت محی الدین ابن العربی)

"میں ایک مخفی خزانہ تھا
سو میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں
پس میں نے آدم کو تخلیق کیا"
(حدیث قدسی)

فن

بے حد عجز و انکسار
تعظیم و تکریم اور
محبتوں کے ساتھ
کائنات کے سب سے قدیم اور سب سے عظیم تخلیق کار

اپنے پیارے خدا کے نام

اظہار

ابلاغ

"وہ منشوں کے بھاؤ خیال سے بالا
دنیا کو تخلیق کرنے والا پرماتما ہے" **(منو)**

اور خداوند آسمان سے گرجا۔۔۔۔۔۔۔
سمندر کی تھاہیں ظاہر ہوئیں۔
کرۂ ارض کی بنائیں نمودار ہوئیں۔۔۔۔۔۔
اُس نے بلندی سے ہاتھ بڑھا کر مجھے تھام لیا
اور پانی کی زیادتی میں سے کھینچ کر مجھے نکالا
میرے زور آور دشمن سے اس نے مجھے چھڑایا

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تو، اے خدا! میرا چراغ روشن کرتا ہے۔
اے خدا تو میری تاریکی کا نور ہے!
(زبور)

ترتیب

روشنی روشنی سی ہر سُو ہے
یہ تر ادھیان ہے کہ خود تُو ہے

حیدر قریشی کی افسانہ نگاری

پروفیسر جیلانی کامران

۱)

نئے اردو افسانے نے جہاں انسان کو معاشرے کے حوالے سے بیان کرنے کی روایت قائم کی ہے وہیں معاشرہ کو جن اصولوں کے تحت زیر بحث لایا ہے ان اصولوں نے معاشرے کی آب و ہوا کو ویران کر دیا ہے اور انسان کو اس کے ذہنی اور فکری پس منظر سے محروم بھی کیا ہے۔ غالباً اسی لیے نئے افسانے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ افسانہ بے آسرا انسان اور بے آباد زمین کی روداد بیان کرتا ہے۔ اسی ضمن میں ایک بات یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ نیا افسانہ محض رودادِ ذات ہے اور اس کے رگ و ریشے سے کہانی پیدا نہیں ہوتی۔ ضمیر متکلم کی روداد نمایاں ہوتی ہے۔ اور ضمیر متکلم اپنے طور پر شکست و ریخت سے دو چار ہے۔ اس لیے اس مرکزی استعارے ضمیر متکلم کی مدد سے افسانے کا انسانی تاثر واضح نہیں ہوتا۔ بلکہ نفسیاتی اعتبار سے ایک مرضیاتی زائچہ تیار ہوتا ہے۔ ایسے رویوں کی موجودگی میں حیدر قریشی کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کی بشارت" ایک نئے تخلیقی قدم اور نئے فکری اعتماد کی خبر دیتا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کی دنیا اسی ماحول سے اخذ کی ہے۔ جس ماحول سے نیا افسانہ بخوبی آشنا ہے۔ لیکن حیدر قریشی نے اس ماحول کو ایک فکری مسئلے کے طور پر قبول کیا ہے۔ اور

اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان افسانوں کے اندر موجود انسان کو اعتماد کے رویے فراہم کیے ہیں۔ ان افسانوں کی دنیا ایسی ہے جس کی اندھیری جہتوں سے باہر نکلنا دشوار ہے۔ اس لیے ان کہانیوں کے افراد اندھیرے شب و روز میں اپنے ہونے اور نہ ہونے کے آشوب سے دو چار ہیں۔ ان کی نظر میں سچائیاں اضافی ہو چکی ہیں۔ اور وہ سچائیوں کی راہنمائی کے بغیر اپنے لیے کوئی بہتر ساعت بھی دریافت نہیں کر سکتے۔ ایسے غیر فطری منظر میں کبھی وہ شک اور یقین کے دوراہے سے گزرتے ہیں اور کبھی ان کا اپنا وجود ٹوٹ کر من اور غیر از من میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ دھند کے بخشے ہوئے راستوں میں سفر کرتے ہیں اور اپنے ماضی کو اپنی خطاؤں کا مجرم گردانتے ہیں۔ تاہم ان افسانوں کے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو الزام دینے سے کتراتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کو بے معنی صورت مہیا کرنے پر برابر تیار دکھائی دیتے ہیں۔ اور جس دنیا سے ان کا سابقہ ہوا ہے اس کی اپنی رفتار صرف ہلاکت ہی کی منزل کو قریب لاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان افسانوں کے بطن میں ہلاکت کا غیر محسوس سفر جاری نظر آتا ہے اور سارے کے سارے افراد اس سفر کو قبول کر کے برابر بے حس ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورتحال کو رنگوں کا استعارہ بخوبی بیان کرتا ہے جہاں سبز رنگ پیلے رنگ میں بدل جاتا ہے اور سرخ خون سفید ہونے لگتا ہے! ان افسانوں کی دنیا میں شدید دباؤ، نفسیاتی بحران اور فرد اور گروہ کے مابین غیریت کا پھیلتا ہوا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ انسان اپنے بحران کے چنگل میں پریشان' یک و تنہا اپنی ویرانیوں کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے!

حیدر قریشی نے اس انسانی معروض کو ایک سوال کی صورت میں بیان کیا ہے اور قاری کے ذہن میں بار بار یہ ضمنی سوال ابھرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ اور ایسا کس لیے ہے؟

۲)

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کے لیے جس نوع کے عنوان چنے ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کی مدد سے اس افسانوی دنیا کی آب و ہوا مرتب ہوتی ہے جس میں قاری کو

سفر کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔اس افسانوی دنیا میں صحرا، آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ، رات اور ایک ایسا طرزِ احساس مرکزی ہیں جن سے ایک انجانا خوف پھوٹتا ہے۔اس خوف کی توجیہہ کے لیے کبھی جرنلزم کی سرخیوں کو شریک کیا گیا ہے، کبھی ایٹمی جنگ کے ہلاکت خیز امکان کو منظر میں سمویا گیا ہے اور کبھی عصرِ حاضر کے ان عالمی تعلقات کو انسانی صورتحال میں شامل کیا گیا ہے جہاں درآمدی گندم اور تیل کی پیداوار سرفہرست دکھائی دیتی ہیں ۔ اس اعتبار سے حیدر قریشی کے افسانوں کی دنیا عصرِ حاضر کے حالات، واقعات اور امکانات سے رونما ہوتی ہے۔اور رونما ہوتے ہی انسانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔اس مقام تک حیدر قریشی اجتماعی کیفیت کو ہمراہ لے کر چلتے ہیں۔لیکن بہت جلد یہ اجتماعی کیفیت اپنے بطن سے انفرادی کیفیت اخذ کرتی ہے۔اس تخلیقی عمل کے ساتھ ضمیرِ متکلم آشکار ہوتی ہے اور یہ صورت حیدر قریشی کے افسانوں کو اور ان افسانوں کے مرکزی انسان کو انفرادیت فراہم کرتی ہے۔

نئے افسانے کے آداب اور مزاج کی روشنی میں یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ نیا افسانہ اپنے منظر کی بجائے اپنے انسان کے گرد گردش کرتا ہے اور اس کا انسان ہی اس کا محور ہے۔لیکن نئے افسانے کے لکھنے والے عموماً حالات اور فرد کا رشتہ تخلیق کرتے ہوئے فرد کے مقابلے میں حالات کو بے حد طاقتور بتاتے ہیں اور اس تناسب سے فرد کی انا کو برابر کمزور ہوتے دکھاتے ہیں۔ایسا فرد افسانے کی دنیا میں حالات کے جبر سے شکست کھاتا ہے اور حالات کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں اپنے ٹوٹے ہوئے وجود ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔حیدر قریشی کے افسانوں میں ایسے حالات بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔اس لیے ان افسانوں کا انسان وجود کی شکست و ریخت سے دوچار نہیں ہوتا۔اس کی انا برابر قائم رہتی ہے اور وہ ہر لمحے حالات کو غلبہ پانے سے روکنے کی سعی کرتا ہے۔ایسا اندازِ نظر اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے کہ افسانہ جس دنیا کی نشاندہی کرتا ہے اس میں فرد کا طرزِ عمل تہذیبی رویوں کی ترجمانی کرتا ہے۔فرد کے ٹوٹنے سے تہذیبی شعور میں دراڑیں رونما ہوتی ہیں۔ حیدر قریشی کا افسانہ اس تہذیبی دوراہے کا ازالہ کرتا ہے۔

(۳

افسانے کی اس دنیا میں جسے حیدر قریشی نے دریافت کیا ہے۔روشنی کی کرن ایک ایسا استعارہ ہے جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔روشنی کی کرن رات کے پچھلے پہر ظاہر ہوتی ہے۔کبھی اس کے ساتھ انسانی شعور کے وہ رشتے آشکار ہوتے ہیں جن کی ترتیب آسمانی نشانات نے کی ہے۔اور کبھی یہ کرن امید بن کر گلاب کے پودے کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی محبت بن کر دل میں ظہور کرتی ہے۔ یہ کرن کشف اور رویا بن کر دل کا خوف دور کرتی ہے اور سفید پرندوں کو اپنے پاس بلاتے ہوئے انسانوں کو وحدت کی دعوت دیتی ہے۔حیدر قریشی نے اس استعارے کو جابر ماحول سے رہائی پانے کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔تاہم یہ استعارہ جہاں ماحول اور فطرت اور آرزوئے قلب میں ظاہر ہوتا ہے وہیں اس استعارے کی توانائی اس حقیقت میں بھی مضمر ہے کہ اس استعارے کو الہامی اور آسمانی نشانات نے آلِ آدم کی تربیت میں نسل در نسل راسخ کیا ہے۔ اس لیے روشنی کی کرن نہ تو گم ہوتی اور نہ دجل و بطلان کے دبیز پردے اسے آنکھوں سے اوجھل رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے آخری سہارے کے طور پر یہ استعارہ انسان کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے حیدر قریشی نے اس استعارے کو اپنے افسانوں میں مجسم کیا ہے اور اس کی مدد سے اپنے مرکزی کرداروں اور ضمیرِ متکلم کی تشکیل کی ہے۔اگر اس زاویے سے دیکھا جائے تو حیدر قریشی کے افسانے انسان کی امکانی صورتحال کو پیش کرتے ہیں اور یوں روشنی کی کرن کو انسانی فلاح کا مرجع قرار دیتے ہیں۔''حوا کی تلاش'' جو ان افسانوں میں اہم رمزیت کی حامل ہے ایسی ہی صورتحال سے عہدہ برآء ہوتی ہے۔اور روشنی کی کرن جدید عہد کی ٹیکنالوجی کے ہمراہ ایک نئے زمانے کی بنیاد رکھتی ہے۔اسی مجموعے کی ایک دوسری کہانی (گلاب شہزادے کی کہانی) میں گلاب کا پھول انسان کی ابدی حکمرانی کا سمبل ہے لیکن اس سمبل کو انسان کی ہوس اور نظامِ زیست کے جبر نے پامال کر رکھا ہے۔ان دونوں کہانیوں سے ایسے اشارے بخوبی حاصل کیے جا سکتے ہیں جو انسان کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔تاہم جو باتیں عمومی طور پر کہی گئی ہیں ان سے ایک نئے طریقِ کار کا احساس ہوتا ہے اور ایک ایسے اثباتی تہذیبی رویے سے آشنائی ہوتی ہے جو عصر

حاضر کے افسانے میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔حیدرقریشی نے ان افسانوں کے ذریعے کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات کی طرف اشارا کیا ہےاوراس سچائی کونمایاں کیا ہے کہ Limit Situation کے دوران انسان صرف کرب ہی کی نمائندگی نہیں کرتا اور نہ اس کا وجود ہی پاش پاش ہوتا ہے بلکہ اس کے نطق سے اس کی اپنی تاریخ گفتگو کرتی ہے۔ ہمارا افسانہ تاریخ کے اس مکالمے سے شاید اب تک غافل تھا۔حیدرقریشی نے اپنے افسانوں کی راہ سے تاریخ کے اس مکالمے کو سننے کی سعی کی ہے۔

میں نے حیدرقریشی کے افسانوں کے مرکزی رجحان کوواضح کرتے ہوئے ان کہانیوں کا ذکرنہیں کیا جن میں دانستہ روشنی کو روپوش کیا گیا ہے۔ایسی کہانیاں جواس مجموعے میں دوتین سے زیادہ نہیں ہیں دراصل حیدرقریشی کے افسانوں کی دنیا کا پس منظر ترتیب دیتی ہیں۔اوراس پس منظر کی تلخ صورت ہی سے وہ کیفیت رونما ہوتی ہے جوحیدرقریشی کے افسانوں کوان کا مزاج فراہم کرتی ہے۔حیدرقریشی کے افسانے ایک نئے طریقے سے قاری تک پہنچتے ہیں اوران کی گفتگو کا لہجہ بھی مختلف ہے۔اس اعتبار سے ان افسانوں میں ایک ایسا رویہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔کہ کہانی محض کسی واقعے ہی کی بات نہیں کرتے بلکہ اس سچائی کا ذکر بھی کرتی ہے جو واقعیت کے رگ وریشے میں جاگتی ہےاورسب سے کہتی ہے کہ مجھے پہچانو۔میں کون ہوں؟

سچائی نے ہمارے زمانے میں افسانے کا لباس پہن رکھا ہے!

☆☆☆

میں انتظار کرتا ہوں!

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اُگے

میں سوتیلے جذبوں کے عذابوں سے گزرتا ہوں کہ مجھے اپنا سفر مکمل کرنا ہے۔
میں کسی صحرا میں پیاس کی شدّت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔
اور مامتا کی ماری میری ماں پانی کی تلاش میں ہلکان ہوتی پھر رہی ہے۔
میں کسی اندھے کنوئیں میں گرا پڑا ہوں۔
اور میرے بھائی ان سوداگروں سے بھی میری قیمت وصول کررہے ہیں جو کچھ دیر بعد مجھے اس کنوئیں سے نکالیں گےاور غلام بنا کرلے جائیں گے۔
میں کسی جنگل میں بَن باس کے دن گزارر رہا ہوں۔
مری بیوی مجھے ہرن کا شکار لانے کے لیے کہتی ہے۔میں ہچکچاتا ہوں مجھے معلوم ہےاس کے بعد کیا ہوگا مگر پھر میں بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیےنکل کھڑا ہوتا ہوں۔

☆☆

میں کہ سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میری تاریخ کے سفر کا ایک حصہ مکمل ہوگیا ہے''پچھمن ریکھا'' عبور ہوتے ہی تاریخ کے سفر کا دوسرا حصہ شروع ہوگیا ہے۔میں کسی غیبی امداد کا منتظر ہوں۔

میں اندھے کنوئیں سے نکال لیا گیا ہوں۔
مگر میں ابھی تک اندھے کنوئیں میں ہوں کہ زلیخا میرے تعاقب میں ہے اور میں گناہ کے اندھے کنوئیں سے نکلنے کے لئے مسلسل دوڑ رہا ہوں۔
پیاس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔
اور میری ماں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر چُور ہو گئی ہے۔ابھی تک پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے اس کے اپنے ہونٹوں پر پیاس کی پپڑیاں جم گئی ہیں۔مگر دور دور تک کسی قافلے کے آثار نظر نہیں آتے۔
میری بے گناہی۔۔۔میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔
میں اذیت میں ہوں کہ میری ماں ابھی تک میری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔
وہ جو بادشاہ زادی ہے۔میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔
میں دکھ میں ہوں کہ حاکم کی بدکار بیوی مجھے میری نیکی کی کڑی سزا دلواتی ہے۔
میں قید میں ہوں کہ بدکاری کی تہمت مجھ پر عائد کر دی گئی ہے۔
اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے کہ میری پاک دامن بیوی پر بدکاری کا الزام عائد کیا گیا ہے۔
یہ سارے جھوٹے الزام اور تہمتیں وہی لگا رہے ہیں جو خود بدکار ہیں۔جو میرے سوتیلے عزیز ہیں۔
وہ میرے گرد سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن جمع کر رہے ہیں تاکہ اس میں نفرتوں کی آگ لگا کر مجھے بھسم کر ڈالیں۔
میں اس آگ سے بچنے کے لئے دعا کرتا ہوں کہ میں بے حد کمزور ہوں۔

☆☆

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لیے ہزاروں برس سے انتظار کر رہی تھیں۔
اور میں وہی ہوں.....چاند،سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔
اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔
مگر میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میں سوچتا ہوں۔
میں کن امتحانوں آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزر رہا ہوں؟
میری پاکدامن بیوی کی صفائی کون دے کہ میرا واسطہ بدکاروں سے ہے جو اپنی برائیاں چھپانے کے لئے دوسروں پر تہمتیں عائد کرتے ہیں۔
اور میری اپنی صفائی کون دے کہ میں اب بھی گناہ پر آمادہ ہو جاؤں تو وہی عورت میری بے گناہی کی گواہی دے کر مجھے چھڑا لے جائے گی جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔
اور میری ماں....بادشاہ زادی....جو میری حالت نہیں دیکھ سکتی اور اس کی بے قراری دیکھ کر میرا اپنا دِل خون ہوتا ہے اور میں پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ ایڑیاں رگڑنے لگتا ہوں،وہ کب تک پانی کی تلاش میں پہاڑیوں کا سفر کرتی رہے گی۔

☆☆

سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن میرے چاروں طرف جمع کیا جا چکا ہے اس ایندھن کے انبار پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔
وہ صحرا جس میں،میں ابھی تک پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور میری ماں پانی کی تلاش میں چکراتی پھر رہی ہے،
اور وہ اندھا کنواں جس میں مجھے ڈالا گیا تھا اور وہ جیل جس میں،میں اس وقت قید ہوں،
اور وہ جنگل جس میں مجھے اپنے بن باس کے سارے دن گزارنے ہیں،
سب اس ایندھن کے حصار میں آ گئے ہیں۔ایندھن کے اس حصار کی دوسری طرف میرے سوتیلے عزیز جشن منا رہے ہیں،میری تضحیک کر رہے ہیں،قہقہے برسا رہے ہیں۔اور وہ لمحہ قریب آتا جا رہا ہے جب وہ اس ایندھن میں نفرت کی آگ لگائیں گے۔آگ چاروں طرف پھیل جائے گی۔
تب یہ صحرا،یہ اندھا کنواں،یہ جنگل اور میں ...میری بے گناہی اور سچائی کے سارے نشان اس آگ میں جل کر فنا ہو جائیں گے۔مٹ جائیں گے۔اور میرے سوتیلے عزیزوں کے سوتیلے جذبوں کے ظلم کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔تب میرے سوتیلے عزیز اپنی مرضی کے مطابق میری

تاریخ لکھیں گے،تب وہ اطمینان سے لکھیں گے کہ:

میں بدکار تھا اور میری بیوی بھی بدکار تھی اور میری ماں لونڈی تھی...مگر میرا باپ؟

☆☆

میں پھر سوچنے لگتا ہوں

میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

اور میں جو جرم بے گناہی میں قید بھگت رہا ہوں،ابراہیم کا پوتا ہوں۔

اور میں جو جنگل میں بن باس کے دن کاٹ رہا ہوں۔میں بھی ابراہیم کی آل سے ہوں کہ سچ کی راہ پر چلنے والے اور ظلم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے والے ابراہیم کی آل میں شمار ہوتے ہیں۔

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔

اور میں وہی ہوں۔۔چاند سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔

اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔

میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیوں کر مٹا سکیں گے۔کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔

میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

میں ابراہیم کا پوتا ہوں۔

میں آل ابراہیم سے ہوں۔

آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔

’’آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔‘‘

یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ میری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اور اس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔

مجھے جس اندھے کنوئیں میں گرایا گیا تھا آسمان سے اس میں اتنا پانی اترے گا کہ وہ کنواں چھلک

پڑے گا اور بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا پانی سیلاب بن جائے گا۔

اور پھر سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کے ایندھن میں بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی ساری آگ بجھ جائے گی۔

☆☆

میرے سوتیلے عزیزوں نے نفرت کی آگ لگا دی ہے۔اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔میرے چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی ہے۔۔۔سوتیلے جذبوں کی آگ.....مگر میں دیکھتا ہوں کہ:

میرے بن باس کے دن ختم ہو چکے ہیں۔میرا حق میرا تخت مجھے مل گیا ہے اور میری بیوی کی پاک دامنی کی شہادت خود تاریخ دے رہی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ:

میری قید کی مدت ختم ہو گئی ہے۔اور میں ایک اعلیٰ منصب پر سرفراز کیا گیا ہوں۔اور چاند سورج اور ستارے میرے حضور سجدہ ریز ہیں۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ:

تپتے ہوئے صحرا میں میرے ایڑیاں رگڑنے سے ایک چشمہ پھوٹ بہا ہے۔مری ماں کے چہرے پر خوشیوں اور مسرتوں کا نور پھیلا ہوا ہے۔ وہ جو کسی قافلے کی امداد کی منتظر تھی اب ہزاروں قافلے اس کی مدد کے محتاج ہیں۔اور اس بادشاہ زادی کو ایک نئی بادشاہت مل گئی ہے۔اور ہزاروں برس سے میرا انتظار کرنے والی کنواریاں،میرے گلے میں ڈالنے کے لئے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار سجائے میری آمد کے گیت گا رہی ہیں۔

اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی،آسمان سے اندھے کنوئیں میں اتر کر اور پھر باہر چھلک جانے والا پانی اور میری ایڑیوں کی رگڑ سے پھوٹ بہنے والے چشمے کا پانی.....سب میری آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔

سوتیلے جذبوں سے بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے اور اس آگ کے دوسری طرف

میرے تمام سوتیلے عزیز حیرت اور خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔
میں آگ کے مکمل طور پر بجھنے کا انتظار کرتا ہوں۔
میں انتظار کرتا ہوں جب تھوڑی دیر بعد میرے سارے سوتیلے عزیز مجرموں کی طرح میرے سامنے پیش ہوں گے۔
اور میں اس وقت کے آنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

”لا تثریب علیکم الیوم.....“☆

☆ترجمہ: آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆

گلاب شہزادے کی کہانی

ہوا شہکار جب اس کا مکمل
وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

بے انت پھیلے ہوئے صحرا میں جب رات کا ایک پہر گزرنے کے باوجود کسی کو نیند نہ آئی تو چاروں درویش اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پہلے درویش نے تجویز پیش کی کہ رات کاٹنے کے لئے اپنی اپنی کوئی کہانی سنائی جائے۔سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور پہلے درویش سے کہا کہ وہ خود اپنی زندگی کی کسی کہانی سے ابتدا کرے۔
لمبے بالوں والا پہلا درویش آگے کو جھکا اور پھر یوں گویا ہوا:
”میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔
گلابی رنگ کو تم بخوبی پہچانتے ہو۔خون سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔خون میں سفید رنگ ملا دیں تو وہ گلابی بن جاتا ہے لیکن اگر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہو جاتا ہے۔خیر تو میں کہہ رہا تھا.. میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔لیکن اس کے لئے مجھے عملاً بتانا پڑے گا“
یہ کہہ کر پہلے درویش نے اپنے تھیلے سے گلاب کی ایک قلم نکالی اور اسے ریت میں گاڑ دیا۔
”میری کہانی کا باقی حصہ اس قلم کے بڑھنے تک ادھورا رہے گا۔اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ باری باری اپنی کہانیاں سنالیں.....میں آخر میں اپنی کہانی مکمل کروں گا۔“
پہلے درویش کی اس بات پر دوسرے درویش نے اپنی کہانی شروع کی:

''میری کہانی عام سی ہے۔میری بیوی نے اپنی آنکھوں کے جادو اور ہونٹوں کے منتر سے مجھے گدھا بنا دیا تھا اور میں کئی صدیوں سے بوجھ اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔پھر ایک دن مجھے بھی ایک اسم مل گیا۔میں گدھے سے انسان بن گیا اور تب میں نے اپنے اسم کے زور سے اپنی بیوی کو گھوڑی میں تبدیل کر دیا۔''

تیسرا اور چوتھا.....دونوں درویش اس کی کہانی بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے جبکہ پہلا درویش گلاب کی اس قلم کو دیکھ رہا تھا جس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کانٹے سے چپکے ہوئے تھے....قلم آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

''اب مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے تانگے میں جوت دیا تھا،گھوڑ دوڑ کے کلب میں لے گیا تھا یا ویسے ہی اسے سرپٹ دوڑا تا رہا.... یا پھر پتہ نہیں وہ خود ہی سرپٹ دوڑتی رہی.... دوڑتی رہی.....''

''پھر کیا ہوا؟''

تیسرے اور چوتھے درویش نے بڑے اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔

پہلا درویش ابھی تک گلاب کی اس بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا۔

''پھر؟'' دوسرے درویش نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا۔

''پھر.....جب میری بیوی اپنی پہلی تنخواہ لائی تھی تو اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔اس نے اپنی آدھی تنخواہ گھر کے اخراجات میں ڈال دی اور بقیہ آدھی بچوں کے مستقبل کے لئے بنک میں جمع کرادی اور پھر ہمیشہ ہی اس کا یہی طریق رہا۔میری اور اس کی تنخواہ سے ہمارا گھر خاصا خوشحال ہو گیا۔البتہ وہ اپنے باس کی بہت تعریفیں کرتی رہتی تھی۔وہ اس کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھتے تھے''۔

اچانک دوسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم پر پڑی جو اس عرصے میں حیرت انگیز طور پر دوگنی ہو چکی تھی اور اب اس میں ننھے ننھے سبز پتے بھی پھوٹ رہے تھے۔اسے یوں لگا جیسے کانٹوں میں لپٹی ہوئی گلاب کی پوری قلم کسی نے اس کے حلق میں ٹھونس دی ہو۔

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر بے اختیار پکارا۔''پانی.....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کی قلم کچھ اور سرسبز ہو گئی اور سبز پتوں کے ساتھ ایک سرخ پتہ بھی ابھر آیا دوسرے درویش نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی تینوں درویشوں نے دیکھا کہ بے انت پھیلے ہوئے صحرا نے خود کو خاصا سمیٹ لیا ہے۔

رات کا دوسرا پہر گزر چکا تھا

تیسرے درویش نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کہانی شروع کی:

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں تاریخ اور جغرافیے سے مجھے گہری دلچسپی ہے اور مرا تعلق بھی آثارِ قدیمہ سے ہے.....تین بچوں کی پیدائش کے بعد میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کروں۔چنانچہ میں نے غبارے استعمال کرنا شروع کر دیئے....مرا گھر خاصا چھوٹا اور تنگ سا ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ استعمال کے بعد میں نے غبارہ نالی میں پھینکنے کی بجائے کونے میں پڑی بڑی میز کے پیچھے پھینک دیا۔میز کے نیچے پڑے ڈھیر سارے کباڑ میں وہ غبارہ چھپا رہتا۔پھر کبھی خیال آتا تو اسے اٹھا کر نالی میں پھینک دیتا۔''

چوتھا درویش اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ایک دفعہ کسی کھنڈر سے کئی ہزار سالہ پرانی کھوپڑی دریافت ہوئی تو اس کے مطالعہ کے لئے مجھے بلایا گیا۔کھوپڑی کے مطالعہ کے بعد جب میں گھر آیا تو اپنی میز کے نیچے کباڑ میں سے کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے مجھے ایک سوکھا ہوا مڑا تڑا سا غبارہ مل گیا۔میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا.... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھوپڑی اس غبارے میں موجود ہو اور وہ کھوپڑی مرے اپنے بیٹے کی ہو۔''

چوتھا درویش اس کی کہانی میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

پہلا درویش گلاب کی اس مسلسل بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا جس میں سے اب شاخیں بھی پھوٹنے

لگی تھیں۔

''میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے لگا میں نے اپنے بیٹے کو قتل کر کے اس کے سر کو محض کھوپڑی بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنا خوف بتایا۔ پہلے تو اس نے شور مچا دیا'' خاندانی منصوبہ بندی ختم نہیں کرنے دوں گی۔ مری صحت پھر تباہ ہو جائے گی'' لیکن بالآخر مرا خوف اس کی ضد پر غالب آ گیا۔

جس دن اس نے مجھے خوشخبری سنائی.... مجھے یوں لگا جیسے ہزاروں برس پہلے کھو جانے والی مری کوئی قیمتی چیز مجھے دوبارہ ملنے والی ہے۔''

تیسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم کی طرف اٹھ گئی جو اَب گلاب کے چھوٹے سے پودے میں ڈھل گئی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے گلاب کا پودا اس کے اندر ہے اور کوئی اُسے اُس کے حلق سے باہر کھینچ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ خوف سے چلّایا:''پانی....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کا پودا کچھ اور پھیل گیا اس کے سبز پتوں میں ایک اور سرخ پتہ ابھر آیا۔

تیسرے درویش نے خوفزدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی دونوں درویشوں نے دیکھا کے بے انت پھیلے ہوئی صحرا نے خود کو آدھا سمیٹ لیا ہے رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا۔

چوتھے درویش نے مشکوک نظروں سے پہلے درویش کو دیکھا اور قدرے چوکنا ہو کر اپنی کہانی بیان کرنے لگا:

''یہ کہانی دراصل مری نہیں۔ مرے ایک دوست کی ہے۔ میں اسے اسی کی زبان میں بیان کروں گا''

چوتھے درویش نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''مرا بھائی گہری نیند سویا ہوا تھا میں اس کے کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ مرے بھائی کی ناک سے شہد کی ایک مکھی نکلی.....قریب ہی پانی کا ایک ٹب پڑا تھا۔ جس میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تیر رہا تھا جو شاید کسی بچّے نے ڈال دیا تھا....شہد کی مکھی اڑ کر لکڑی کے اُس ٹکڑے پر جا بیٹھی۔ کچھ دیر بعد پھر اُڑی اور مرے بھائی کی ناک میں داخل ہو گئی.... میں یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا''۔

''اچھا۔ پھر کیا ہوا؟؟'' پہلے درویش کی مسکراہٹ بڑی سفّاک تھی، وہ اب بھی گلاب کے اُس پودے کو دیکھ رہا تھا جو مسلسل پھلتا پھولتا جا رہا تھا۔

''پھر۔۔پھر۔۔'' چوتھا درویش خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا:

''پھر میرا بھائی بیدار ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک حیرت انگیز خواب سنایا....اس نے بتایا کہ وہ کسی دریا کے کنارے کھڑا تھا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ تیرتا ہوا اس کے قدموں میں آ گیا، وہ اس پر سوار ہو گیا۔ جب وہ تختہ اسے دوسرے کنارے پر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جگہ خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر وہ اکیلا یہ خزانے نہ اٹھا سکتا تھا، اس لئے دوسرے ساتھیوں کو لینے کے لئے واپس آ گیا۔''

''حیرت ہے.....حیرت ہے!'' پہلا درویش بڑے مکّارانہ انداز میں بولا۔ اس کی نظریں اب بھی گلاب کے اس پودے پر گڑی تھیں جو اَب بڑی شان سے لہلہا رہا تھا، چوتھا درویش گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا:

''میں بھائی کا خواب سمجھ گیا۔ میں نے اسے قتل کر دیا اور وہ جگہ جہاں ٹب پڑا تھا اور شہد کی مکھی لکڑی کے ٹکڑے پر تیرتی رہی تھی، اسے کھود ڈالا...وہاں واقعی خزانے تھے...مگر....مگر.....''

''مگر کیا؟'' پہلے درویش کے لہجے میں تشویش کی ہلکی سی پرچھائیں ابھری۔

چوتھے درویش کی نظریں اس لہلہاتے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑیں۔

اور پھر وہی کیفیت.....

''پانی.....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔ مگر چوتھے درویش نے کوزہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پانی پیا۔

پھر گلاب کے پودے میں ایک اور سرخ پتے کو ابھرتے ہوئے دیکھا۔

خوف سے جھرجھری لی۔

''مگر کیا.....؟'' پہلے درویش نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''مگر......یہ کہانی مرے دوست کی نہیں.....مری اپنی ہے.....اپنی.....'' اور پھر چوتھے درویش نے بھی دم توڑ دیا۔

سارے صحرا نے خود کو سمیٹ کر پہلے درویش کے قدموں میں ڈال دیا۔

رات کا آخری پہر گزر چکا تھا۔

پو پھوٹ رہی تھی۔

پہلے درویش کے وحشیانہ قہقہے صحرا میں گونجنے لگے۔

''ہاہاہا.....اب اس صحرائی علاقے کی تیل کی دولت کا میں تنہا مالک ہوں۔ ایٹمی جنگ میں جتنے لوگ بھی بچ گئے ہوں گے سب مری رعایا ہیں.....اور میں اس نئے عہد کا حکمران.....عظیم حکمران.....ہاہاہا.....''

اچانک اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ اس نے کوزے کو دیکھا۔ کوزہ خالی ہو چکا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ اور پھر پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔

وہ دوڑتا رہا.....دوڑتا رہا.....

اور سمٹا ہوا صحرا پھیلتا رہا.....پھیلتا رہا.....

سورج نصف النہار تک پہنچ گیا۔

اس کے سامنے تیل کے چشموں کا ذخیرہ تھا، کنووں کی بجائے چشمے!

مگر پانی؟-----

پیاس کی شدّت،

شدید تھکاوٹ،

اور مسلسل پھیلتا ہوا صحرا،

وہ تیل کے چشمے پر ہی پیاس بجھانے کے لئے جھک گیا۔

☆☆

اس کا آدھا جسم باہر پڑا تھا۔ سر پانی کے چشمے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھیلی ہوئی بانہیں آدھی سے زیادہ چشمے میں اور باقی باہر اور..... لمبے لمبے بال پانی میں لہراتے تیر رہے تھے۔

اس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی تھیں۔

گلاب کے پودے پر ایک بڑا سا پھول اُگ آیا تھا۔

گلاب کے اس پھول کا رنگ غیر معمولی حد تک گہرا سیاہ تھا۔

گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔

مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا، نہ سننے والا!

☆☆☆

غریب بادشاہ

جو تجھ کو ملنے سے پہلے بچھڑ گیا حیدؔر
تو کس طرح اسے پانے کی آس رکھتا ہے

''تساں بادشاہ ہواساں کوں غریبی''

چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک دھوتی میں ملبوس، سجدہ ریز اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے، پسینے سے شرابور اس مجہول سے فقیر نے جس انداز میں یہ مصرعہ گاتے ہوئے پڑھا ہے اس کا ایک ایک لفظ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ میری روح میں اتر گیا ہے۔ میں رک گیا ہوں اور حیرت سے اس مجہول فقیر کو دیکھ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور ایک سرخ نوٹ اس کے جوڑے ہوئے ہاتھوں میں پھنسا دیتا ہوں.....ماہ رخ نے میری اس سخاوت کو حیرت سے دیکھا ہے لیکن بولی کچھ نہیں۔اس کے قرب سے مجھے لگتا ہے میں سچ مچ کا بادشاہ ہوں۔

☆☆

''میں جب بھی اس شہر میں آتا ہوں یہاں کی کوئی نہ کوئی شے مجھے متاثر کر لیتی ہے، ہلا کر رکھ دیتی ہے''

''مثلاً؟''

''مثلاً.....پہلی بار جب میں آیا تو اپنی فرم کی طرف سے کمرشیل وزٹ پر آیا تھا مگر یہاں تم سے نہ صرف ملاقات ہوگئی بلکہ پہلی ملاقات میں ہی اتنی فرینک نیس ہوگئی جیسے ہم ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی ہوں۔''

''ہوں!.....اور اس بار؟''

''اس بار.....اس مجہول فقیر کے گنگناتے ہوئے بول نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے''

''کیا واقعی تم اس سے متاثر ہوگئے ہو؟''

''یقین کرو نہایت عجیب اور انوکھا سرور محسوس کر رہا ہوں۔''

''شاید تمہیں فوک سانگس سے دلچسپی ہے!''

''ہاں شاید یہی وجہ ہو یا شاید.....''

''میں تمہارے لئے اس طرح کے گیتوں کی ایک کیسٹ تیار کروالوں گی لیکن تمہاری اتنی گہری دلچسپی کا آخر کوئی جواز بھی تو ہوگا؟''

میں ماہ رخ کی طرف دیکھتا ہوں وہ پورے انہماک سے میرے جواب کی منتظر ہے۔

''فوک سانگس سے میری دلچسپی کا پس منظر بڑا عجیب سا ہے۔

ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں بھٹہ واہن گیا۔ وہاں مجھے پتہ چلا کہ سسّی کی جنم بھومی بھٹہ واہن تھی۔ وہاں کے راجہ کی بیٹی، سسّی جسے راجہ نے نجومیوں کے مشورے کے بعد صندوق میں بند کر کے دریا کے دھاروں کے سپرد کر دیا تھا اور یوں وہ بھٹہ واہن سے بھنبھور پہنچ گئی۔''

میں سسّی کی طرف دیکھتا ہوں وہ پورے انہماک سے اپنی داستان سن رہی ہے:

''وہاں تمہاری پیدائش محل کے جس حصے میں ہوئی تھی اس کے کھنڈر ابھی تک موجود ہیں۔ میں اس جگہ گیا تو میرا دل بھر آیا۔ روشنی کی ایک لکیر میرے اندر سے پھوٹی اور مجھ پر منکشف ہوا کہ میں ہی پنوں تھا۔ جو تمہیں تلاش کرتے ہوئے اس کھنڈر تک پہنچ گیا ہوں لیکن روشنی کی لکیر جو میرے اندر

سے پھوٹی تھی وہ ایک دائرہ بن کر مجھے منور کرنے لگی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ہی پنوں تھا اور میں ہی مجنوں تھا، میں ہی فرہاد تھا اور میں ہی رانجھا تھا، میں ہی کرشن تھا اور میں ہی مہندرا تھا..... میں ہر روپ میں تمہیں ڈھونڈتا تھا اور تمہارے جتنے بھی نام تھے سسّی، لیلیٰ، شیریں، ہیر، رادھا۔ مومل سب ایک تھے اور میرے بھی جتنے نام ہیں سب ایک ہیں....لیکن ہم صدیوں سے ایک دوسرے کی تلاش اور جستجو میں حصے بخرے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہمارے ہر حصے میں دکھ کی ایک کہانی بنتی چلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔''

''بھئی! یہ کیا حماقت ہے؟.....ہم لوگ کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' ماہ رخ کی چہکار نے مجھے جاگتی نیند سے بیدار کر دیا ہے۔ میں بے جان مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر ڈائننگ روم کی طرف چلنے لگتا ہوں۔

کھانے کے دوران ماہ رخ کے پاپا نے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کا مسئلہ چھیڑا تو ماہ رخ نے کہا:

''اس کے لئے مزدور کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ جب تک اسے شرکت کا احساس نہ دلایا جائے گا تب تک کارخانوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ نہیں ہو سکتا''

''نوجوانی میں پڑھے لکھے ذہنوں کو سوشلزم کا طلسم متاثر ضرور کرتا ہے، پختگی آنے سے پہلے نوجوان ایسی ہی جوشیلی باتیں کرتے ہیں.....اس بحث سے ہٹ کر دیکھیں تو آج کے مزدوروں کی فطرت کا یہ عالم ہے کہ ان کی دائیں مٹھی میں نوٹ دے دیں تو بایاں ہاتھ آگے کر دیں گے، بائیں ہاتھ کو بھر دیں تو دایاں ہاتھ آگے کر دیں گے۔ جہاں نوٹ ملنے میں اسٹاپ آیا وہیں حق تلفی کے نعرے گونجنے لگیں گے۔''

ماہ رخ کے پاپا کے لفظوں سے ایک منجھے ہوئے کارخانہ دار کی شخصیت اپنی جھلک دکھا رہی تھی ۔

''میرا خیال ہے مل مالکان اور مزدوروں میں فاصلہ ملز انتظامیہ کی بد اندیشی سے پیدا ہوتا ہے۔ انتظامیہ کے افسران کی غلط پالیسیاں بھی نفاق کا باعث بنتی ہیں مثلاً میرے ادارہ کے میرے ایک کولیگ جو ایک دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں ان کی پالیسی یہ ہے کہ مہینے میں ایک دو بار ہر

مزدور کو کسی سبب سے یا بلا سبب جھاڑ ضرور پڑنی چاہئے اس طرح یہ لوگ اپنی اوقات میں رہتے ہیں''

''کتنی گھٹیا ذہنیت ہے ایسے لوگوں کی'' ماہ رخ اس وقت کسی کارخانہ دار کی بیٹی کی بجائے کسی مزدور یونین کی لیڈر لگ رہی تھی... ''برصغیر کی تاریخ میں.....''

لیکن اس سے پہلے کہ مزدوروں اور کارخانہ دار کا مسئلہ کوئی سنگین صورت اختیار کرتا ماہ رخ کے پاپا ہنستے ہوئے معذرت کر کے اٹھ گئے اور برصغیر کی تاریخ کے تذکرے سے بات کا رخ ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی طرف مڑ گیا،

''قدیم کلچر آج بھی کسی نہ کسی روپ میں ہمارے ساتھ ہے۔ جذباتی نعرے بازی کر کے اس سے فرار حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہماری پیدائش سے لے کر شادی، بیاہ اور مرگ تک کی رسومات پر قدیم ہندوستانی کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ کھرچنے سے بھی ختم نہ ہو۔''

''یہ ٹھیک ہے۔لیکن اب ہماری اپنی تہذیب کا رنگ جمتا جا رہا ہے، اور ہماری اپنی تہذیب اس سے زیادہ خوبصورت ہے''

''یہ تہذیب بھی اس کلچر کے اثرات سے خالی نہیں، کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آ جاتا ہے۔''

''بابا! اس میں کلچر کا کیا کمال ہے۔ یہ تو دھرتی کا کمال ہے۔جغرافیے کا کمال ہے۔ یہاں کی مٹی۔ یہاں کے دریا، پہاڑ، کھیت، جنگل، آب و ہوا، انہیں سے ہی تمہارے قدیم کلچر کی تشکیل ہوئی تھی اور انہیں عناصر ہی سے ہماری تہذیب بن رہی ہے اس میں جغرافیے کے ساتھ ساتھ ہماری ہسٹری بھی شامل ہو گئی ہے'' اور پھر بحث اس اتفاق پر ختم ہوئی کہ قدیم ہندوستانی کلچر کے ایک مخصوص موضوع ''رسم شادی'' پر ایک تازہ ویڈیو فلم دیکھی جائے۔

☆☆

گھنے جنگل کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان،

گہری تاریک رات،

میدان کے ایک سرے پر ایک چبوترے پر قبیلے کا سردار اپنی قبائلی آن بان کے ساتھ براجمان ہے۔اس کے پیچھے،دائیں بائیں جری کمان دار چوکس کھڑے ہیں۔میدان کے وسط میں آگ کا بہت بڑاالاؤروشن ہے۔سردار کے دائیں،بائیں دونوں اطراف سے لے کرمیدان کے دوسرے سرے تک الاؤ کے گرد لوگوں کا ایک دائرہ سا بن گیا ہے،لوگوں نے اپنے سیاہ چہروں پر چکناہٹ مل کرخود کو چمکایا ہوا ہے،ڈھولک کی تھاپ گونجتی ہے اور پھر گونجتی ہی چلی جاتی ہے۔ پھراس تھاپ کے ساتھ ایک عجیب سا ساز اُبھرتا ہے۔مجھے لگتا ہے میں اس ساز سے واقف ہوں لیکن کچھ یادنہیں پڑتا۔عجیب سا ساز ہے،ایک لمحے روح کی پاتال تک اتر جاتا ہے اور دوسرے لمحے میں خوفزدہ کر دیتا ہے۔مسرت اور خوف کی عجیب سی کشمکش.....اچانک قبیلے کے سردار کی پاٹ دار آواز گونجتی ہے اور ڈھولک اور ساز کی آواز قدرے مدھم ہو جاتی ہے۔سردار نے پتہ نہیں کیا کہا ہے۔ایک نوجوان لڑکی شرمائی شرمائی سی،اپنے ہاتھ میں موتیوں کی مالا لئے آگے بڑھنے لگتی ہے۔

قبیلے کے سردار نے پھر کچھ کہا ہے اور اب دو نوجوان لڑکے ایک ساتھ آگے بڑھ آئے ہیں۔ ڈھولک کی تھاپ اور اس مانوس سے ساز کی آواز ایک دم تیز ہو جاتی ہے۔جلتے ہوئے الاؤ کی سرخ زبانیں کچھ اور لمبی ہو گئی ہیں۔وہ نوجوان لڑکی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان نوجوانوں کی طرف بڑھ رہی ہے...اب وہ دونوں کے روبرو کھڑی ہے۔دونوں نوجوانوں کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے سانس نیچے رک گئے ہیں....ڈھولک کی تھاپ اور اس ساز کی آواز کچھ اور تیز ہو جاتی ہے۔

اور پھر...لڑکی نے ایک نوجوان کے گلے میں ہار ڈال دیا۔

مجھے پتہ نہیں کیا ہوا،میں نے تیزی سے اٹھ کر وی سی آر کا سوئچ آف کر دیا۔

''یہ کیا؟''ماہ رخ نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''بس۔اب آگے اس ہار جانے والے نوجوان کا حال نہیں دیکھا جائے گا۔بے چارہ!''

''اس میں بے چارگی کی کیا بات ہے۔قدیم ترین زمانوں میں تو لڑکی کے سارے امیدوار لڑتے تھے،ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔جو آخر میں فتح یاب ہوتا تھا وہ شادی کا حق دار بنتا تھا۔یہ تو اس زمانے کے بعد کی فلم ہے''

☆☆

ماہ رخ کے پاپا کی فیکٹری سے متعلق ہمارے ادارے کا کام آج مکمل ہو گیا ہے اور آج ہی میرا واپسی کا ارادہ ہے تاہم میں نے طے کیا ہے کہ جانے سے پہلے ماہ رخ سے شادی کے مسئلہ پر بات کر ہی لوں۔ہماری دوستی جتنی تیزی سے بڑھی ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہمیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہیے۔یوں بھی آج صبح سے ہی ماہ رخ خاصے خوشگوار موڈ میں ہے۔ اس پیش کش سے اس کا خوشگوار موڈ رومینٹک بھی ہو جائے گا۔

''کیا تمہیں پتہ ہے میں اپنے مذہبی تہوار منانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مذہبی تہوار بھی اسی عقیدت اور احترام کے ساتھ مناتی ہوں۔کرسمس،بیساکھی،دیوالی......''

''یہ بڑی اچھی بات ہے اگر ساری قومیں اسی طرح ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے لگیں تو دنیا میں مذہب کے نام پر کبھی کوئی فتنہ فساد پیدا نہ ہو''

''آج کا دن میرے لئے دوہری خوشی لایا ہے۔ایک تو یہ کہ آج بھی ایک تہوار ہے اور دوسری یہ کہ آج ہم ایک مقدس رشتے میں منسلک ہونے کا اقرار کریں گے''

(مقدس رشتے کی بات سن کر میرا دل مارے خوشی کے دھڑکنا بھول گیا ہے،واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔میں نے آج خود ماہ رخ سے رشتے کی بات چھیڑنی تھی مگر میرے بات کرنے سے پہلے وہ خود یہی بات طے کر چکی ہے)

''میں نے کئی نوجوان دیکھے ہیں مگر کوئی بھی میرے معیار پر پورا نہیں اُترا۔تم پہلے نوجوان ہو جس کی آنکھوں کی سچائی کو میرے دل نے تسلیم کیا ہے اور جو صحیح معنوں میں میرے کڑے معیار پر پورا اُترا ہے''

(میرے انگ انگ میں مسرّت بھر گئی ہے)

''میں نے ابھی ڈیڈی سے بات کی تھی وہ بھی میرے انتخاب پر بے حد خوش ہیں''

(مسرّت میرے انگ انگ میں لبالب بھرنے کے بعد اب ندی کے دھاروں کی طرح چھلکنے لگ گئی ہے)

''لاؤ اپنا ہاتھ اِدھر لاؤ''

میں نے آنکھیں موند کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا ہے۔ بے خودی اور سرشاری کی کیفیتیں مجھے شرابور کر رہی ہیں۔

''آج کے دن بہنیں اپنے بھائیوں کو راکھی باندھتی ہیں۔ میرا کوئی بھائی نہیں جسے میں راکھی باندھتی لیکن آج میری زندگی کا یہ ادھورا پن ختم ہو رہا ہے''

میرے دل، دماغ اور سماعت پر سینکڑوں ایٹم بم گر گئے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو آنکھوں پر بھی ہزاروں ایٹم بم گر گئے ہیں۔ اس نے مجھے راکھی کے بندھن میں باندھ لیا ہے،،

میرے اندر ایک گھنا جنگل اُگ آیا ہے اور جنگل کے درمیان ایک وسیع میدان میں (میرے سینے کے عین وسط میں) آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن ہے۔ سارا قبیلہ جمع ہے۔ ڈھولک کی تھاپ تیز ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس ساز کی آواز بھی تیز ہو جاتی ہے جو ایک لمحے میں روح کی پاتال تک اُتر جاتا ہے اور دوسرے لمحے میں خوفزدہ کر دیتا ہے، میں اس ساز کو اب پوری طرح جان گیا ہوں سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ لڑکی نے موتیوں کا ہار دوسرے نوجوان کے گلے میں ڈال دیا ہے، میں اپنی شکست کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا مگر اب وی سی آر کا سوئچ تو نہیں جسے آف کر کے فرار ممکن ہو سکتا ہے۔ میرے اندر اور باہر میری شکست کے منظر ہیں۔

ماہ رخ نے سچ کہا تھا ''کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آ جاتا ہے''

☆☆

چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک دھوتی میں ملبوس، سجدہ ریز اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے، پسینے سے شرابور وہ مجہول فقیر اب بھی وہی مصرعہ گاتا چلا جا رہا ہے:

''تساں بادشاہ ہو اساں کوں غریبی''

میں نے پرس میں صرف واپسی کے کرائے کے پیسے رکھے ہیں اور جیبوں تک سے نکال کر سارے چھوٹے بڑے نوٹ اس فقیر کو دے دیئے ہیں۔

ماہ رخ نے تعجب سے مجھے دیکھ کر پوچھا ہے ''یہ کیا؟''

''صرف واپسی کا کرایا''

''تساں بادشاہ ہو اساں کوں غریبی''

اس عارفانہ کلام کی ایک نئی معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے، ماہ رخ کے قرب سے میں اب بھی خود کو بادشاہ محسوس کرتا ہوں مگر غریب بادشاہ!

☆☆☆

دُھند کا سفر

کسی کا جھوٹ جب اس عہد کی سچائی کہلایا
ہمارا سچ تو خود ہی موردِ الزام ہونا تھا

"گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے۔
بلا وجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا۔"
میں ٹرین کے ڈبے میں لکھی یہ تحریر حیرت سے پڑھتا ہوں اور اس کے اوپر لٹکی ہوئی زنجیر کو دیکھتا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ زنجیر کھینچنے سے یہ گاڑی کیسے رک سکتی ہے۔
آپی اپنی سیٹ پر بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی ہے۔
بلو ساتھ والی مسافر خواتین کو مختلف چیزیں کھاتا دیکھ کر امی کو مخاطب کرتی ہے اور پھر ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔
"امی.... ہیں ہیں ہیں"
امّی اسے گھورتی ہیں مگر ڈھائی سال کی بچی کو کیا پتہ کہ ماں کیوں گھور رہی ہے۔ امی نے اپنے ساتھ موجود بڑے سے تھیلے سے کھانے کی کچھ چیزیں نکال کر بلو اور آپی کو دی ہیں۔ آپی میرے حصے کی چیز لا کر مجھے دینے لگتی ہے۔

دو سال پہلے کی بات ہے جب ہم چار سال اور تین سال کے تھے۔ تایا جی ہمارے ہاں

آئے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے کہیں باہر چلے گئے تو آپی نے اور میں نے مشترکہ طور پر سوچا کہ ہمارے تایا جی گم ہو گئے ہیں اور پھر صلاح کی کہ ہم دونوں چل کر انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ ہم بڑی خاموشی سے گھر سے نکل آئے۔ قریبی بازار تک آئے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ راستے گم ہونے لگے اور تایا جی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم خود گھر کا راستہ بھول گئے، نہ تایا جی ملے نہ گھر کا راستہ۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ہم دونوں نے رونا شروع کر دیا۔ کسی شریف دوکاندر نے ہمیں اپنی دوکان پر بٹھا لیا اور ڈھیر ساری مٹھائی بھی ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہم نے مٹھائی کھانے کے ساتھ رونے کا عمل بھی جاری رکھا تاوقتیکہ تایا جی اور ابا جی ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں تک نہ آ گئے۔ تب ہم مارے خوشی کے باقی مٹھائی اٹھانا بھی بھول گئے۔
"بھائی! یہ لو نا اپنی چیز۔" آپی کی آواز میں جھنجھلاہٹ ہے اور میں چونک اٹھتا ہوں۔
"جی۔ ہاں۔ آں۔" میں اپنے حصے کی چیز لیتا ہوں اور پھر اسے وہ زنجیر اور اس کے نیچے لکھی تحریر دکھاتا ہوں وہ بھی حیران ہوتی ہے مگر اس طرح ڈر کر امی کے پاس بھاگ جاتی ہے، جیسے اس کے دیکھنے سے ہی زنجیر کھنچ جائے گی اور گاڑی رک جائے گی.... بلو اپنے حصے کی چیز کھا کر پھر ان خواتین کی طرف دیکھتی ہے جو مسلسل کچھ نہ کچھ کھائے جاری ہیں اور پھر "امی..... ہیں ہیں ہیں" کی گردان شروع کر دیتی ہے۔ امی پھر تھیلے میں ہاتھ ڈالتی ہیں۔

میں ان خواتین کی طرف دیکھتا ہوں۔ ان میں سے ایک بے حد خوبصورت عورت مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی نگاہوں سے سورج کی کرنیں میری جسم پر اترنے لگتی ہیں اور میں جیسے ایک دم جوان ہونے لگتا ہوں۔ پانچ سے دس، دس سے پندرہ، پندرہ سے بیس اور بیس سے پچیس۔ اب میں پچیس سال کا بھرپور جوان ہو گیا ہوں۔ مگر گاڑی کا سارا منظر بدل چکا ہے۔ زنانہ ڈبہ کی بجائے مردانہ ڈبہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس سیٹ بھی نہیں ہے۔ فرش پر اکڑوں ہو کر بیٹھا ہوں اور سارے فرش پر بھی اتنا رش ہے کہ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنا مشکل ہے۔
ایک اسٹیشن پر مسافروں کا ایک بڑا تیز ریلا اندر آتا ہے۔ چھوٹے سے اسٹیشن پر اتنے مسافر!.....

شاید کوئی بارات ہو۔! گاڑی چلتی ہے تو مسافروں کے اوسان بحال ہونے لگتے ہیں۔ایک مسافر نے ٹرین کے چیکر کو ایک ایسی گالی دی ہے کہ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے ہیں۔ دوچار اور مسافروں نے بھی ایسی ہی گالیاں دیں تو پتہ چلا سارے بے چارے فرسٹ کلاس کے فرش پر بیٹھے تھے۔ سب سے دس دس روپے جرمانہ وصول کرکے بغیر رسید کے سب کو اس ڈبے میں دھکیل دیا گیا ہے۔

گالیوں کا سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔

گالیاں ریلوے کے مختلف افسران سے ہوتی ہوئی ریلوے کے چیئرمین تک پہنچ چکی ہیں۔

پھر وزیر ریلوے بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بالکل میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک ''یک چشم'' داڑھی والے نے دانت پیستے ہوئے بابائے قوم کو بھی گالی دے دی ہے۔

میں سناٹے میں آگیا ہوں۔

اس کی بدزبانی پر کوئی احتجاجی آواز بھی نہیں ابھری۔

مجھے لگتا ہے ہم سب زمین میں دھنستے جارہے ہیں۔

گردن تک ہم زمین میں دھنس گئے ہیں۔

میرے اندر کا وہ پانچ سالہ بچہ نکل کر زنجیر کے پاس جا کھڑا ہوا ہے اور میرے اشارے کا منتظر ہے۔

میں اس یک چشم داڑھی والے کو سخت لعن طعن کرتا ہوں۔

''بابائے قوم کا کیا قصور؟ یہی کہ اس نے تمہیں آزادی دلائی ہے..... میں لمبی چوڑی تقریر کرتا ہوں۔مگر وہ یک چشم داڑھی والا بڑی متانت سے پھر وہی گالی بابائے قوم کا نام لے کر دہراتا ہے۔

آخر میں اپنے اندر کے اس پانچ سالہ بچے کو اشارہ کرتا ہوں کہ وہ زنجیر کھینچ دے۔مگر اس دوران ہی ایک بے حد خوبصورت خاتون سے اس کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور وہ جوان ہونے لگتا ہے۔ پہلے وہ زنجیر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اب اس خوبصورت خاتون کو حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ میں خود آگے بڑھ کر زنجیر کھینچ دیتا ہوں۔

''اس خبیث کو ابھی گرفتار کراتا ہوں۔ذلیل انسان بابائے قوم کے دیس میں بابائے قوم کو گالیاں دیتا ہے۔''

گاڑی رک گئی ہے۔ ریلوے گارڈ، ٹکٹ چیکر اور کچھ پولیس والے آچکے ہیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ اس ذلیل شخص نے بابائے قوم کی شان میں گستاخی کی ہے۔مگر شاید ریلوے کے عملہ کو میری بات سمجھ نہیں آتی۔گارڈ اور چیکر میری بات سے جھلا گئے ہیں۔

اور پھر چیکر میرے جرمانے کی رسید کاٹنے لگتا ہے۔

پچاس روپے جرمانہ ادا کرتے ہوئے میرے ہونٹوں پر وہی گالی مچلتی ہے جو اس سے پہلے وہ یک چشم داڑھی والا بابائے قوم کے خلاف بکتا رہا تھا۔مگر میں گالی کو ہونٹوں پر اترنے سے پہلے ہی روک لیتا ہوں۔ پتہ نہیں بابائے قوم کے احترام کے باعث یا ان پولیس والوں کے باعث جو ریلوے گارڈ اور ٹکٹ چیکر کے ساتھ کھڑے ہیں۔

اتنا ضرور ہے کہ میں ایک دم چھوٹا ہوتا جارہا ہوں اور گھٹتے گھٹتے ایک نقطے میں ڈھل گیا ہوں۔زنجیر کے نیچے کھڑا پانچ سالہ ''میں'' پھر حیرت سے اس تحریر کو پڑھ رہا ہوں۔

''گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے

بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا''

بلوا اپنے حصہ کی چیز کھا کر پھر ''امی.... ہیں ہیں ہیں'' کی گردان کررہی ہے۔

آپی میرے حصے کی چیز لے کر پھر مجھے دے رہی ہے۔

مگر میں اب دانستہ آپی کی بات نہیں سن رہا۔کیونکہ مجھے معلوم ہے اس کے بعد ہی میری نظر اس خوبصورت خاتون کی طرف اٹھ جائے گی جو بڑی دیر سے مجھے دیکھ رہی ہے اور پھر.....اور پھر....

میں خوف سے اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں اور بند آنکھوں سے ہی پڑھنے لگتا ہوں:

''گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے

بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا۔''

☆☆☆

آپ بیتی

اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدؔر
اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں

(۱)

اس دن ماں نے مجھے معمول کے مطابق فجر کے وقت جگایا تھا مگر اس کا لہجہ معمول کے مطابق نہ تھا۔ میں نے تاروں کی روشنی میں ماں کی آنکھوں میں تشویش جھلکتی دیکھی۔ ماں مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں گہری سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا آسمان پر شفق پھوٹنے کی بجائے خون پھوٹ بہا ہے۔

اس دن سارا شہر خوفزدہ تھا لوگوں کی نظریں اخبارات کی خبروں پر جم کر رہ گئیں۔

ٹریفک کے حادثے میں بیس افراد ہلاک اور تیس شدید زخمی۔

ملزمان پندرہ روز تک مجھے مسلسل بے آبرو کرتے رہے۔ برآمد کی جانے والی مغویہ کا بیان۔

ایک نوجوان نے محبت میں ناکام ہو کر محبوبہ کو ہلاک کر دیا۔

سگے باپ، بھائی اور بھابھی کو قتل کر دیا، خانگی جھگڑے کا شاخسانہ۔

ساری خبریں معمول کے مطابق تھیں مگر اس دن یہ ساری خبریں غیر معمولی لگ رہی تھیں۔ لگتا تھا ہر خبر کا آسمان کی سرخی سے کوئی تعلق بنتا ہے۔

اس دن شہر میں بہت سی بھڑیں آ گئی تھیں۔ پہلے شہر میں جس طرح مکھیاں بھنبھناتی تھیں اب ویسے ہی بھڑیں اڑتی پھرتی تھیں۔

اس دن شدید گرمی کے باعث میں نے قمیص اتار رکھی تھی اور بنیان پہنے اپنی کرسی پر بیٹھا اس دن کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ ڈاک میں دیگر خطوط کے ساتھ میری ایک بہت ہی اچھی دوست کا خط بھی تھا۔ جونہی میں اس کا خط پڑھنے لگا مجھے اپنے سینے پر شدید جلن محسوس ہوئی۔ ایک بھڑ نے میرے سینے پر ڈنک مارا تھا۔ میں تکلیف کے عالم میں ماں کے پاس آیا تو اس نے لوہے کی کسی چیز کو ڈنک والی جگہ پر رگڑتے ہوئے دم کیا اور میری تکلیف بڑی حد تک دور ہو گئی پتہ نہیں اس دم کی وجہ سے یا ماں کی وجہ سے یا شاید دونوں کی وجہ سے!

اس دن شام کو غروب آفتاب کے بعد آسمان کی طرف پھر ویسی ہی گہری سرخی چھا گئی اور دن بھر کے پریشان لوگ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے یہ سارے واقعات صرف اس دن ہی غیر معمولی لگے۔ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب کے بعد اب بھی آسمان گہرا سرخ ہوتا ہے۔ بھڑیں اب بھی شہر میں دندناتی پھرتی ہیں۔ قتل، اغوا، ایکسیڈنٹ اور آبروریزی کے واقعات اب بھی ہوتے ہیں مگر لوگ اب پہلے کی طرح پریشان نہیں ہوتے۔ انہوں نے آسمان کی سرخی کو بھی معمولات زندگی میں شمار کر لیا ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میری ماں کی آنکھوں میں ابھی تک تشویش جھلک رہی ہے۔ وہ اپنی تشویش سے آگاہ کر کے مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتی لیکن میں نے راتوں کو دیکھا ہے کہ وہ کئی دفعہ اٹھ اٹھ کر، آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر، مجھے سوتا جان کر مجھ پر دم کرتی رہتی ہے۔ ایک دو دفعہ میں نے سنا وہ میرے باپ سے آہستہ آواز میں اپنی تشویش کا اظہار کر رہی تھی اور میرے باپ نے آسمان کی سرخی کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر کرتے ہوئے کہا تھا کہ دنیا پر عنقریب بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔ اپنی ماں اور باپ کی اس تشویش کو دیکھ کر مجھے بھی کبھی کبھی تشویش ہونے لگتی ہے۔

جب پہلے پہل لوگوں نے خوف کا اظہار کیا تھا تب وہ بھی اس آسمانی تبدیلی کو اجتماعی زاویے سے دیکھ رہے تھے اور میرے ماں باپ بھی اسے کسی اجتماعی تباہی کا پیش خیمہ سمجھ رہے

ہیں۔لیکن ماں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مجھے کیوں دَم کرتی رہتی ہے؟اس سوال نے مجھے اس سارے معاملے کو انفرادی زاویے سے دیکھنے کی تحریک کی ہے اور میں آسمان کی سرخی کو اپنی ذات کے حوالے سے سوچنے لگتا ہوں۔

(۲)

''رات دو بجے....عقبی دروازہ....ٹھیک!''

میں اس بے ربط مگر معنی خیز تحریر کو پڑھتا ہوں اور اس خوبصورت لڑکی کا سراپا مجھے اپنے پورے وجود میں خوشبو بکھیرتا محسوس ہوتا ہے جو ایک عرصے سے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔میری ایک بہت ہی اچھی دوست نے مجھے کئی دفعہ اس خوبصورت لڑکی سے لاتعلقی کی نصیحت کی تھی۔مگر میں نے ہمیشہ اس کی نصیحت کو نظر انداز کیا۔اور آج جب اس خوبصورت لڑکی نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا ہے تو میرے ذہن میں خود بخود گناہ کا تصوّر ابھرنے لگتا ہے۔ماں سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میں بیٹھک میں آ کر بظاہر سو جاتا ہوں۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں اور میں نے لیٹے ہی لیٹے دائیں طرف کروٹ بدل کر خیال ہی خیال میں اس خوبصورت لڑکی کو اپنے پہلو میں سلا لیا ہے۔میری سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔اور عین اس وقت جب میں کلائمکس پر پہنچنے لگا ہوں میں نے اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لینا چاہا ہے....مگر مجھے جیسے یکدم کرنٹ لگ گیا ہے۔میرے ہاتھوں میں جو چہرا ہے وہ ہو بہو میری بیٹی کا ہے۔میری ننھی بچی....جیسے ایک دم جوان ہو کر میرے ساتھ لیٹی ہو۔میں خوف زدہ ہو کر بیٹھک سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاتا ہوں۔اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں۔

کافی دیر بعد میں دوبارہ اندر آتا ہوں۔نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔میں پھر بستر پر لیٹ جاتا ہوں مگر خوف کے باعث اب بائیں کروٹ لیٹتا ہوں۔لیٹتے ہی وہ خوبصورت لڑکی پھر میرے پہلو میں آ گئی ہے اور.....اور....نہ چاہتے ہوئے بھی میں پھر اس کے جسم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے پورے وجود میں سمونے لگتا ہوں۔اپنے سارے عمل کے دوران میں

شعوری طور پر کوشش کرتا ہوں کہ اس کا چہرہ نہ دیکھوں۔مگر....اس نے اپنے ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام لیا ہے میں قدرے جھجکتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا ہوں۔یہ چہرہ میری بیوی کا ہے۔خیر کوئی بات نہیں۔میری بیوی ایک ماہ سے میکے گئی ہوئی ہے۔اس کی عدم موجودگی کے باوجود اس کی موجودگی میں کوئی حرج نہیں۔میں اس کے جسم کو اور بھینچ لیتا ہوں۔لیکن مجھے پھر کرنٹ لگتا ہے....
میں نے اپنے آپ کو دیکھا تو میری جگہ کوئی اور تھا۔

میں پھر خوفزدہ ہو کر سڑک پر نکل آتا ہوں اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کی خونی سرخی دراصل میرے اس ہونے والے ریپ کی گواہ اور اس خوبصورت لڑکی کے بہنے والے خون کا ثبوت ہے۔لیکن ہم دونوں میں اصل مجرم کون ہے؟

مری اس اچھی دوست نے ایک دفعہ جھلا کر مجھے کہا تھا''آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے مخلص نہیں ہیں صرف اپنے جذبات کی تسکین کے لئے ایک دوسرے سے فراڈ کر رہے ہیں''.....لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بڑے بڑے مخلص دوستوں کو بھی ذاتی مفاد کی خاطر انتہائی گھٹیا سطح پر اترتے دیکھا ہے خود میری اس اچھی دوست نے میرے ساتھ زبردست فراڈ کیا ہے۔ایسا فراڈ جو ابھی تک وہ خوبصورت لڑکی بھی میرے ساتھ نہیں کر سکی۔

☆☆☆

عشق کے روایتی قصوں میں ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں مگر رات کو کسی سے چوری چھپے ملنے جانا میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔گہری سیاہ رات میں پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں لیکن جب میں اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دینے لگتا ہوں تو اچانک روشنی میں نہا جاتا ہوں۔مجھے لگتا ہے سارا شہر میرے تعاقب میں نکل آیا ہے اور میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہوں۔میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔میرے چاروں طرف گھورا اندھیرا ہے، پھر میں کس روشنی میں نہا گیا ہوں؟ کہیں یہ مرے اندر کی روشنی تو نہیں؟....مرے شجرے کی روشنی؟

دروازہ کھل گیا ہے اور میں اپنے سوالوں کے جواب سوچے بغیر اندر داخل ہو گیا ہوں۔کمرے میں صرف ایک چار پائی اور ایک کرسی پڑی ہے، لیکن ہم دونوں چار پائی پر ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔

اس نے اپنی کمر کا بوجھ مرے اس بازو پر ڈال رکھا ہے جو میں نے اس کی کمر میں حمائل کر رکھا ہے۔
گپ شپ کرتے ہوئے اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری بیوی اور میری بیٹی دونوں میرے دائیں بائیں آن کھڑی ہیں۔ وہ دونوں مجھے میرے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیتی ہیں، سامنے میری وہ اچھی دوست اپنا منہ دوسری طرف پھیرے کھڑی ہے۔ میں عین موقعہ پر پکڑے جانے کی شرمندگی کے ساتھ باہر آنے لگتا ہوں۔ وہ خوبصورت لڑکی مجھے حیرت سے دیکھتی ہے۔

واپس آ کر میں ٹائم دیکھتا ہوں۔ تین بج رہے ہیں۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے گہری نیند آ جاتی ہے.....

ماں حسبِ معمول فجر کے وقت مجھے جگاتی ہے تو میں بمشکل آنکھیں کھول پاتا ہوں۔ ماں کے چہرے پر فکرمندی کے گہرے اثرات ہیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتاتی ہے کہ آج آسمان پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہے۔ میں کمرے سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر حیرت سے ماں کا چہرہ تکنے لگتا ہوں۔

''ماں! آج تو آسمان پر معمولی سرخی بھی نہیں ہے۔ بالکل صاف آسمان ہے''

ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر غالباً مجھ پر دَم کرنے کے لئے کوئی آیت پڑھنے لگتی ہے....میں کمرے میں آ کر بڑے آئینے کے سامنے اپنے بال درست کرنے لگتا ہوں، بال درست کرتے ہوئے مجھے اپنی آنکھیں لال انگاروں کی طرح نظر آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے آسمان کی ساری سرخی مری آنکھوں میں اتر آئی ہے۔ میں نے انفرادی زاویے سے آسمانی سرخی کا بھید پالیا ہے.... ماں کمرے میں آ کر مجھ پر پھونکیں مارتی ہے، مجھے لگتا ہے وہ کہنا چاہتی ہے کہ مجھے تمہارے رات کے سارے عمل کا پتہ ہے لیکن پھر میرے شرمندہ ہونے کا خیال کر کے چپ چاپ لوٹ جاتی ہے۔ میں وضو کرنے کے لئے باہر آنے لگتا ہوں تو ایک کتاب پر ایک بھڑ کو بیٹھا دیکھتا ہوں....ایک دوسری کتاب اٹھا کر میں نے اس بھڑ پر دے ماری ہے اور اسے اس کے ڈنک سمیت ختم کر دیا ہے....اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی اس اچھی دوست کا خیال آ جاتا ہے جس کی ایک زیادتی کے باعث میں اس سے ناراض ہوں۔

ممکن ہے وہ بھی اپنی زیادتی پر نادم ہو اور اس ندامت کا احساس آسمان کی ساری سرخی اس

کی آنکھوں میں بھی بھر دے....ممکن ہے آج شام کو غروب آفتاب کے بعد مری طرح اسے بھی آسمان خون آلود نظر نہ آئے اور وہ بھی میری طرح انفرادی زاویے سے آسمان کی سرخی کا بھید جان لے....اور ممکن ہے وہ بھی کسی بھڑ کو اس کے ڈنک سمیت مار دے۔

میں اس خوبصورت لڑکی کے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہتا ہوں لیکن فی الحال میں طے کرتا ہوں کہ آج ناشتے کے بعد تازہ اخبار کا مطالعہ نہیں کروں گا۔ قتل، اغوا، زنا، ایکسیڈنٹ کی خبریں تو روز کا معمول ہیں۔ آج میں ناشتے کے بعد اپنی اس اچھی دوست کا خط پڑھوں گا جس سے میں ناراض ہوں۔

وہی خط جسے پڑھتے وقت بھڑ نے میرے سینے پر ڈنک مارا تھا۔

☆☆☆

ایک کافر کہانی

صوفی، سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں
خود ہی اپنا رستہ، منزل اور سفر ہو جائیں

بڑی عجیب اذیّت ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں، رکوع تک تو نماز ٹھیک رہتی ہے لیکن سجدے میں کہیں اور پہنچ جاتا ہوں۔ اسٹین گن اٹھائے مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا ایک شخص میرے روبرو آجاتا ہے۔ میں سجدے میں خدا کو ڈھونڈتا ہوں۔ وہ کہتا ہے:''میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دوں گا''

میں سوچتا ہوں شاید خدا بھی اس کے سامنے بے بس ہو گیا ہے لیکن یہ کافرانہ خیال آتے ہی سجدے سے سر اٹھا لیتا ہوں۔

مجھے ابراہیم ادھم رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آتا ہے جب وہ ہر قدم پر سجدے کرتے ہوئے چودہ سال کی مسافت طے کر کے مکہ پہنچے تو کعبہ اپنے مقام پر موجود نہ تھا۔ تب غیب سے آواز آئی تھی۔

''کعبہ ایک ضعیفہ کے استقبال کے لئے گیا ہے جو ادھر آ رہی ہے۔

آپ پکار اٹھے کہ وہ کون ہے؟.... اتنے میں دیکھا کہ رابعہ بصریؒ عصا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہیں۔ پھر کعبہ بھی اپنے اصلی مقام پر آ گیا۔''*1

لیکن مجھے تو سجدے میں وہی مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا اسٹین گن اٹھائے نظر آتا ہے، تنگ آ کر میں جنگل کی طرف نکل جاتا ہوں اور اپنے اندر ہی اندر سفر کر کے ایک بزرگ سے ملتا ہوں اور انہیں اپنا روگ بتاتا ہوں۔ ان کے چہرے پر نورانی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے وہ کہتے ہیں:

''میں سو سال محراب میں رہا اور اپنے تئیں حیض والی عورت کی طرح جانتا تھا''*2

''تو کیا میں بھی حیض کی کیفیت میں ہوں؟'' میرے سوال کے جواب میں بزرگ کے چہرے پر اثباتی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اب میں ان سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ''سبحانی ما اعظم شانی''*3 کہا تو میں چونک اٹھتا ہوں۔ کہیں یہ بزرگ حضرت بایزید بسطامیؒ تو نہیں؟۔۔ میں ان سے سوال کرتا ہوں۔

''عرش کیا ہے؟''

فرمایا ''میں ہوں۔''

''لوح و قلم کیا ہے؟''

فرمایا ''میں ہوں۔''

''ابراہیم، موسیٰ، محمد علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں؟''

فرمایا ''میں ہی ہوں''

''اللہ کے بندے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل علیہم السلام کے سے بھی ہیں؟''

فرمایا ''میں ہوں''

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

تب فرمایا:

''جو شخص حق میں محو ہو جاتا ہے اور جو کچھ ہے حق ہے اگر ایسی صورت میں وہ سب کچھ ہو تو کوئی تعجب نہیں۔''*4

مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بزرگ حضرت بایزید بسطامی ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھوں

کو چوما اور کہا: ''قیامت کے دن ساری خلقت محمدیؐ جھنڈے تلے جمع ہوگی''

فرمایا: ''محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سے زیادہ ہیں۔ خلقت میرے جھنڈے تلے کھڑی ہوگی۔'' *5

میں فرطِ عقیدت سے انہیں لپٹ جاتا ہوں اور اپنی شفاعت کے لئے ان کی منّت کرتا ہوں لیکن تب ہی یکا یک وہ بھی غائب ہوگئے اور میں بھی غائب ہوگیا۔ اب پتہ نہیں میری جگہ کون ہے کیوں کہ یہ بہر حال میں نہیں ہوں۔ اب میں جو بھی ہوں ابھی تک یہی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں۔

یکا یک دیکھتا ہوں کہ:

''میں ماسوائے اللہ سے زائد ہوگیا پھر جب میں نے اپنے آپ کو بلایا تو حق تعالیٰ سے آواز آئی میں نے خیال کیا کہ اب میں خلقت سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ میں **لبیک اللھم لبیک** کہتے ہوئے محرم ہوگیا پھر تسبیح کرنے لگا اور وحدانیت میں جب طواف کرنے لگا تو بیت المعمور نے میری زیارت کی، کعبہ نے میری تسبیح پڑھی، ملائکہ نے میری تعریف کی۔ پھر ایک نور نمودار ہوا جس میں حق تعالیٰ کا مقام تھا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو میری ملکیت میں کوئی بھی چیز نہ رہی۔'' *6

اور پھر میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ:

''کبھی تو میں اُس کا ابوالحسن ہوں اور کبھی وہ ابوالحسن ہے۔ یعنی جب میں فنا ہوتا ہوں تو میں وہ ہوتا ہوں''۔ *7

یکا یک ایک مرقع پوش ہوا سے اُترتا ہے اور زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہتا ہے:

''میں جنیدؒ وقت ہوں
میں شبلیؒ وقت ہوں
میں بایزیدؒ وقت ہوں''
میں بھی اٹھ کر رقص کرنے لگتا ہوں
''میں خدائے وقت ہوں
مصطفائے وقت ہوں'' *8

بہت سے لوگ میرے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ یہ سب نجات کے طالب ہیں۔ میں انہیں کہتا ہوں ''جاؤ فلاں قبرستان میں دفن ہوجاؤ تمہاری نجات ہوجائے گی۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

نجات کے ایک طالب نے پورے خلوص سے اپنے شک کا اظہار کیا ہے۔

''تمہیں خبر نہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ بعض قبرستان ایسے ہوں گے کہ ان کے چاروں کونے پکڑ کر انہیں بغیر حساب کے بہشت میں ڈال دیں گے۔ ان میں سے ایک بقیع بھی ہے'' *9

میرا جواب سن کر شک کا اظہار کرنے والا کہتا ہے ''یہ کافر ہے اسے سنگسار کردو۔''

ایک اور کہتا ہے ''یہ بایزید بنتا ہے۔''

ایک اور بولتا ہے ''ابوالحسن خرقانی بنتا ہے۔''

تب ان سارے نجات کے طالبوں نے اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے تاکہ مجھے سنگسار کرکے نجات پالیں۔ میں نے پتھروں کے ڈھیر میں دبے ہوئے دیکھا: ''میں بایزید اور اویس قرنی ایک ہی کفن میں تھے'' *10

پھر میں اپنے اندر سے باہر نکلتا ہوں اور اپنے آپ کو پہچانتا ہوں اوان مقدّس ہستیوں کے فیوض اپنے آپ میں محسوس کرتا ہوں۔

لیکن جب نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں جاتا ہوں تو وہی مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا اسی طرح اسٹین گن لئے کھڑا ہے اور اسٹین گن کی طاقت کے نشے میں کہتا ہے۔

''میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دونگا۔''

میں اس کی احمقانہ بات پر دل ہی دل میں ہنستا ہوں۔ خدا تو خود مجھ تک پہنچ گیا ہے۔

لیکن پھر یہ مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا ابھی تک اسٹین گن کیوں اٹھائے کھڑا ہے؟

یہ سوال میں نے پتہ نہیں کس سے کیا ہے؟

اپنے آپ سے یا خدا سے؟
مگر مجھے اپنے سوال کے حتمی اور عملی جواب کا انتظار ہے!

---ماخذ---

''تذکرۃ الاولیاء'' تالیف حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ

اُردو ترجمہ مطبوعہ منزل نقشبندیہ لاہور - ۱۹۲۵ء

☆☆☆

روشنی کی بشارت

بدل جاتے ہیں اک لمحے میں ہی تاریخ کے دھارے
کبھی جو موج میں آ کر قلندر بول اُٹھتے ہیں

''دیوانہ خاموش ہو گیا اور اپنے سامعین کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی خاموش تھے اور حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اس نے چراغ زمین پر پٹخ دیا جو ریزے ریزے ہو کر بجھ گیا۔ تب اس نے کہا:
''میں بہت پہلے آ گیا ہوں میرا تعلق مستقبل سے ہے۔ یہ مہیب واقعہ ابھی فاصلے ہی طے کر رہا ہے'' **(نیطشے کی ایک تمثیل سے اقتباس)**

اپنی آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ، مٹی کا چراغ اپنے ہاتھوں پر اٹھائے جب میں شہر کے لوگوں کو روشنی کی بشارت دیتا ہوں تو وہ مجھے اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے میں ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ کچھ لوگ میری بات پر ہنستے ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے آگے چلے جاتے ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر دیکھے بغیر کچھ سوچتے چلے جاتے ہیں۔
میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ میرے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن کوئی بھی میری بشارت پر ایمان نہیں لا رہا۔ مجھے شک گزرتا ہے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔ یہ لوگ مجھ سے سولہ سو برس پیچھے ہیں۔ یہ میری بات نہیں سمجھ پائیں گے۔ پھر کچھ سوچ کر میں اپنی ماں کے پاس جاتا ہوں اور روشنی کی بشارت دیتے ہوئے اسے بتاتا ہوں کہ میری

آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ میری ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکوں سے دَم کرنے لگتی ہے۔ میری چھوٹی بہن مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہے اور دبک کر ماں کے قریب ہو جاتی ہے۔ ماں کی سادگی اور بہن کے بھولپن پر افسردہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میں مبارکہ کے پاس آتا ہوں اور اسے بتاتا ہوں کہ میں دنیا کو روشنی کی بشارت دینے کے لئے مامور کیا گیا ہوں۔ میری آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ مگر وہ میری بات پر توجہ دینے کی بجائے مجھے دوکانداروں کے بلوں اور بچوں کی فیسوں کے بارے میں بتانے لگتی ہے۔ میں مایوس ہو کر عفت کے پاس چلا آتا ہوں۔ پہلے تو وہ میری بات پر توجہ نہیں کرتی لیکن جب میں پوری سنجیدگی سے اپنی بات دہراتے ہوئے اصرار کرتا ہوں کہ اب روشنی صرف میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں سے ہی اترے گی۔ تو وہ میرے قریب آ جاتی ہے۔۔ میرے ہاتھوں میں مٹی کے چراغ کو چھو کر دیکھتی ہے اور پھر پوچھتی ہے۔۔ کہیں آپ افسانہ لکھنے کے موڈ میں تو نہیں ہیں؟۔۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے باوجود وہ مجھے اسی موضوع پر افسانہ لکھنے کی تحریک کرتی ہے۔

مجھے اب پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے اس سے پہلے ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آ گیا ہوں.... پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دوسو سال پہلے تھی۔ اور جب میں دوسو سال بعد آیا تو میری آمد میں چار سو سال رہتے تھے اور پھر جب میں چار سو سال بعد آیا تو میں اپنے وقت سے آٹھ سو سال پہلے آیا ہوا تھا۔ اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آ گیا ہوں۔

میں جو روشنی کی بشارت ہوں۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہو رہا ہوں وہ کون سی صفر مدّت

ہے۔ جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل از وقت نہ ہو گی۔ وہ صفر مدّت جب انسان نور کا انکار کر کے آگ کی بھینٹ نہیں چڑھے گا۔ مجھے اس مدّت کا انتظار کرنا ہو گا۔

اب جب میں سولہ سو برس کے بعد آؤں گا تو میری آمد میں بتیس سو سال رہتے ہوں گے۔ اور جب میں بتیس سو سال بعد آؤں گا تو میری آمد میں چونسٹھ سو سال رہتے ہوں گے۔ اور اسی طرح کئی ہزار برس بیت جائیں گے۔ لیکن وہ صفر مدت کب آئے گی جب میرا آنا بر وقت ہو گا۔ اور جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی انی پر آ جائیں گے۔ تب کوئی انکار کی جرأت نہ کر سکے گا۔ میں اپنے گزرے ہوئے اور آنے والے برسوں کا بوجھ اپنی روح پر اٹھائے پھر شہر میں آتا ہوں۔ شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر میں اعلان کرتا ہوں:

''لوگو! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لا کر خود کو روشنی سے محروم کر لیا ہے...''

میرا اعلان مکمل ہونے سے پہلے ہی لوگ تمسخر شروع کر دیتے ہیں۔ مختلف سمتوں سے گالیاں اور تضحیک آمیز فقرے میری طرف آ رہے ہیں۔ میں کمال ضبط سے تمام تمسخرانہ اور تضحیک آمیز فقرے برداشت کرتا ہوں۔ جب لوگ فقرے بازی سے خود ہی تھک جاتے ہیں تو میں اپنا پہلا اعلان ادھورا چھوڑ کر نیا اعلان کرتا ہوں:

''لوگو! تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے۔ نورِ بصیرت سے محروم لوگو! تم میں سے اب صرف وہی لوگ بچائے جائیں گے جو میرے گھر کی دیواروں کی اوٹ میں پناہ لیں گے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں لیکن آگ تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔''

یہ کہہ کر میں اپنا چراغ شہر کے چوراہے پر توڑ دیتا ہوں اور خود تیزی سے اپنے گھر کی طرف چلا آتا ہوں۔ لوگوں کے قہقہے گھر تک میرا تعاقب کرتے ہیں۔ لیکن میرے گھر پہنچنے تک وہ قہقہے چیخوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ مٹی کے اس چراغ سے سارے شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔

سارے شہر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اور لوگوں کی چیخیں ایک بھیانک شور

میں تبدیل ہوگئی ہیں میری ماں حیرت سے کبھی میرے کمرے میں آ کر مجھے دیکھتی ہے اور کبھی گھر کے صحن میں جا کر دھڑا دھڑ جلتے ہوئے شہر سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھتی ہے۔میری چھوٹی بہن اسی طرح خوفزدہ انداز میں ماں کے ساتھ ساتھ ہے۔ پھر وہ ماں کو کھینچ کر میرے کمرے میں بٹھا لیتی ہے اور خود دبک کر ماں کے اور بھی قریب ہو جاتی ہے۔

مبارکہ اور عفت دونوں میرے کمرے میں آتی ہیں۔دونوں کے چہروں سے حیرت جھلک رہی ہے۔ایک گھمبیر خاموشی کے بعد مبارکہ ہمت کرکے بولتی ہے،

’’باہر بہت سارے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں‘‘

’’اب ان کا ایمان لانا یا نہ لانا ایک برابر ہے...جو لوگ دیواروں کی اوٹ میں ہیں انہیں ویسے بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔میں اب بیعت نہیں لے سکتا۔میں اب سولہ سو برس کے بعد آؤں گا۔پھر بتیس سو برس کے بعد پھر چونسٹھ سو برس کے بعد۔۔پھر۔۔‘‘

مبارکہ اور عفت کے چہروں سے عقیدت کے ساتھ دہشت بھی ٹپکنے لگتی ہے۔

میری چھوٹی بہن دبک کر ماں کے کچھ اور قریب ہو جاتی ہے۔

میری ماں اپنی خالی آنکھوں میں ان لمحوں کو اتارنے کی کوشش کر رہی ہے جب اس نے مجھے جنم دیا تھا اور میں اس صفر مدت کا انتظار کرنے لگتا ہوں جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی اَنی پر اتر آئیں گے۔ جب وہ اپنے گواہ آپ ہوں گے اور جب مٹی کا کوئی چراغ گواہی کے لئے نہیں لانا ہوگا۔

☆☆☆

میری ماں اور چھوٹی بہن سامنے بینچ پر بیٹھے ہیں۔مبارکہ میری نبض دیکھتے ہوئے بتاتی ہے،’’ابھی تھوڑی دیر پہلے عفت آپ کی عیادت کے لئے آئی تھی۔مگر آپ سوئے ہوئے تھے۔ اب وہ پھر تھوڑی دیر بعد آئے گی۔‘‘

اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں کس صفر مدت کا انتظار کر رہا ہوں!

☆☆☆

مامتا

یہ ساری روشنی حیدرؔ ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس قمر میں جو نور خاک میں ہے

میں لان میں کھڑی جہاز کو پرواز کرتے دیکھ رہی ہو۔اس جہاز میں میری ممی گرمیاں گزارنے سوئٹزرلینڈ جا رہی ہیں۔ڈیڈی انہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ تک گئے ہوئے ہیں۔ زیبی اور روبی بھی ممی کے ساتھ گئی ہیں..... جہاز میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اور میں آہستہ آہستہ کوٹھی کے اندر جانے لگتی ہوں۔

ڈرائینگ روم میں آ کر میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی ہوں۔

اچانک مجھے آئینے میں ایک خوبصورت سا جہاز پرواز کرتا نظر آتا ہے.....میں تھوڑا غور سے دیکھتی ہوں.....اف فوہ.....(حیرت ہے!) اس میں اس میں.....تو میری امی کی روح پرواز کر رہی ہے۔

’’امی آپ نے تو زندگی بھر ہوائی جہاز کا سفر نہیں کیا تھا، پھر موت کے بعد یہ جہاز کا سفر کیسا؟‘‘

میں امی سے پوچھتی ہوں مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔

میں ڈرائینگ روم سے نکل کر ڈاڈر کے سینی ٹوریم میں پہنچ گئی ہوں۔

امی کو مختلف انجکشن لگائے جا رہے ہیں۔ہم سب بہن بھائی ان کے سرہانے کھڑے ہیں اور ڈیڈی۔(نہیں ڈیڈی نہیں ابو.....ڈیڈی ممی کے ساتھ ہوتے ہیں اور ابو، امی کے ساتھ.....)

ابو کے چہرے سے گہری تشویش جھلک رہی ہے۔ عجیب سے وسوسوں اور اندیشوں میں گھرا ابو کا چہرہ دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ مگر میں نے تو آج تک منہ در منہ کبھی ابو سے کوئی فرمائش تک نہیں کی۔ جو کچھ بھی مانگنا ہوتا امی کی معرفت مانگتی یا پھر چٹ لکھ کر مانگتی.....

پھر میں اتنی جرأت کیسے کرلوں..... میں نے گھبرا کر ابو کے چہرے سے نظریں ہٹالی ہیں اور امی کی طرف دیکھنے لگی ہوں۔ امی کی بجھی بجھی آنکھوں سے میری آنکھیں چار ہوئی ہیں اور میری آنکھوں میں روشنی بھر گئی ہے۔

میں سینی ٹوریم سے واپس ڈرائینگ روم میں آ گئی ہوں۔ آئینے میں اب وہ خوبصورت جہاز نظر نہیں آ رہا۔ ابو..... نہیں ڈیڈی..... ڈیڈی ائیر پورٹ سے واپس آ گئے ہیں۔ میں نے ریٹو کے ابو کو اپنے لاہور خیریت سے پہنچنے کا خط ابھی تک نہیں لکھا۔ اس لئے خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔

سوئیٹزرلینڈ سے زیبی کا خط آیا ہے۔ وہ بڑے مزے کی سیر کر رہے ہیں ممی نے ڈھیروں پیار بھیجے ہیں۔ آج ڈیڈی بھی ایک ہفتہ کے لئے سوئیٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔

ڈیڈی چلے گئے ہیں اور میرے ابو میرے پاس آ گئے ہیں۔

''چلو بیٹی تمہاری امی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی''

ڈاڈر کی خوبصورت وادی اور اس میں بہتا ہوا دریائے سرّن کا صاف وشفاف پانی..... یہ منظر سوئٹزرلینڈ کی کسی بھی وادی سے کم نہیں۔ لیکن ابو ان تمام نظاروں سے لاتعلق میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے سینی ٹوریم کی طرف تیزی سے چل رہے ہیں۔ میں دو تین دفعہ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے گرنے لگتی ہوں۔ مگر ابو نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے اس لئے بچ جاتی ہوں..... ہم امی کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ سارے بہن بھائی وہاں موجود ہیں صرف زیبی نہیں ہے۔

امی پوچھتی ہیں ''زیبی کہاں ہے؟''

ابو خاموش کھڑے ہیں۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ ''سوئٹزرلینڈ گئی ہوئی ہے'' مگر کہہ نہیں سکتی کیونکہ زیبی جو چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب کے آخر میں کھڑی تھی بڑھ کر آگے آ جاتی ہے۔

امی کے سرہانے پڑے ہوئے آکسیجن کے سلنڈر دیکھ کر مجھے اپنا دَم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

ابو کچھ دیر کے لئے ڈاکٹر کے ساتھ باہر جاتے ہیں اور میں پھر ڈیڈی کے ڈرائینگ روم میں واپس آ گئی ہو۔ یہاں ریٹو کے ابو میرے منتظر ہیں۔

''کہاں گئے سب گھر والے؟''

''ممی، زیبی اور روبی دو ماہ کے لئے اور ڈیڈی ایک ہفتہ کے لئے سوئٹزرلینڈ گئے ہیں''

''تمہیں کیوں نہیں ساتھ لے گئے؟'' ریٹو کے ابو کا لہجہ کچھ تیکھا سا ہو جاتا ہے۔

''ایک تو اس لئے کے لاہور سے سوئٹزرلینڈ، شیخوپورہ جتنی دور نہیں ہے۔ دوسرے اس لئے کہ گھر پر بھی تو کسی نے رہنا تھا''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری سگی ماں زندہ ہوتی اور تم اسے اس طرح ملنے آتیں تو وہ اگلے دن تمہیں گھر چھوڑ کر کہیں سیر کو چلی جاتی؟''

''دیکھئے مجھے میری ممی کے خلاف نہ بھڑکایئے، وہ بہت اچھی ہیں۔ ہم سب کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ آپ ایسی باتیں کر کے میرے دل میں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں''

''میں تو تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں''

''مرد ہمیشہ عورت کو بہکاتا ہے اور پھر اپنی ساری غلطیوں کی ذمہ داری بھی عورت پر ہی ڈال دیتا ہے، اور عورت..... وہ اپنی سادگی کے باعث ہر ناکردہ گناہ کو بھی اپنا گناہ تسلیم کر لیتی ہے۔ آدم اور حوا سے لے کر آج تک یہی ہو رہا ہے.....''

قلم گرنے کی آواز سن کر میں چونک اٹھتی ہوں۔ گرے ہوئے قلم کو اٹھا کر پھر سے ریٹو کے ابو کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ جاتی ہوں..... مگر یہ کاغذ پر اب تک کیا لکھتی رہی ہوں؟

ابو۔۔ابو۔۔امی۔۔ابو۔۔ڈیڈی۔۔امی۔۔ممی۔۔ڈیڈی۔

اپنی حماقت پر جھینپ کر پھر ریٹو کے ابو کو ان کے خط کا جواب لکھ رہی ہوں۔

ڈیڈی ایک ہفتہ سوئٹزرلینڈ گزارنے کے بعد واپس آ گئے ہیں۔ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈیڈی سے ہر حال میں یہ پوچھ کر رہوں گی کہ امی کی وفات کے بعد بھی آپ ایک عرصہ تک ابو

ہی رہے پھر محض ممی سے شادی کے بعد آپ ڈیڈی کیوں بن گئے؟ آپ پھر سے ابو کیوں نہیں بن جاتے؟.....مگر میں جانتی ہوں کہ میں اتنی جرأت کے ساتھ تو کبھی ابو کے سامنے بھی نہ بول سکی تھی پھر ڈیڈی کے سامنے بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....شاید امی اس سوال کا جواب دے سکیں!

یہ سوچ کر میں پھر سینی ٹوریم کی طرف چل پڑی ہوں۔

ابو ابھی تک ڈاکٹر سے کوئی مشورہ کر رہے ہیں۔

میں امی کے کمرے میں داخل ہوتی ہوں۔

امی اٹھ کر بیٹھ گئی ہیں۔ہڈیوں کا ڈھانچہ.....مہاتما بدھ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی ہے۔ہماری خاموش آنکھیں امی سے سوال کر رہی ہیں۔

امی نے بھیا کے سر پر ہاتھ پھیرا ہے۔بھیا کی آنکھوں میں آنسو ہیں.....اب رضیہ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہیں وہ بھی اشکبار ہے۔اب زیبی کو پیار کیا ہے۔مگر وہ حیران حیران سی، امی کو دیکھ رہی ہے۔سب سے آخر میں امی نے مجھے بلایا ہے۔میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں تو میں ان کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو ننھے ننھے قطرے دیکھتی ہوں۔راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں!

میں ''امی جی'' کہہ کر ان سے لپٹ جاتی ہوں۔مجھے احساس ہوتا ہے کہ راکھ کے اس ڈھیر میں کتنی حرارت موجود ہے۔شاید یہ ممتا کی حرارت ہے!

ابو ڈاکٹر سے مشورہ کر کے آ گئے ہیں.....

''تمہاری امی ٹھیک ہوگئی ہیں اب ہم انہیں گھر لے جائیں گے''

''امی ٹھیک ہوگئی ہیں؟''

''امی ٹھیک ہوگئی ہیں؟''

دنیا میں کتنی دفعہ معجزے ہوئے ہیں شاید اس دفعہ بھی کوئی معجزہ ہو جائے۔

ایک سپیشل ویگن آئی ہے۔امی کو اس میں لٹایا گیا ہے۔میں نے اپنے زانوؤں پر امی کا سر رکھ لیا ہے۔باقی سارے بہن بھائی بھی ویگن میں بیٹھ گئے ہیں۔ویگن ڈاڈر کے پہاڑی علاقے

کے نشیب و فراز سے گزر رہی ہے۔بلندیوں اور پستیوں کے کتنے چکر لگا رہی ہے۔ایک جگہ ویگن نے ہچکولا کھایا ہے اور میری چیخیں نکلنے لگتی ہیں لیکن میں انہیں دبا کر صرف سسک کر رہ گئی ہوں۔ معجزوں کی امید ختم ہوگئی ہے، میں امی کی ڈھلکی ہوئی گردن کو سیدھا کرتی ہوں۔

''یہ تمہاری ممی نے تمہارے لئے کچھ تحفے بھجوائے ہیں'' ڈیڈی نے دو خوبصورت سے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ہے۔

ریٹو نیند سے بیدار ہوگیا ہے میں اس کے لئے دودھ بنانے لگتی ہوں۔اسے دودھ پلا کر پیکٹ کھولتی ہوں۔ایک پیکٹ میں میرے اور بچوں کے لئے بے حد قیمتی کپڑے ہیں دوسرے پیکٹ میں بچوں کے لئے کھلونے ہیں۔

''ارے یہ جہاز!'' میں حیرت سے اس کھلونے کو دیکھتی ہوں.....یہ بالکل وہی ڈیزائن ہے جو مجھے آئینے میں نظر آیا تھا، جس میں میری امی کی روح پرواز کر رہی تھی۔میں پھر صوفے پر اسی زاویے سے جا کر بیٹھ گئی ہوں مگر آئینے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔میں اٹھ کر آئینے کے روبرو کھڑی ہوگئی ہوں.....

لیکن یہ کیا.....آئینے میں میری بجائے میری امی کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ٹی بی زدہ امی نہیں۔خوبصورت اور جوان سی۔۔۔۔بیماریوں کے روگ پالنے سے پہلے والی امی۔اس عمر کی امی جب میری عمر بمشکل چھ برس تھی.....

میں چاہتی ہوں پھر سے چھ برس کی بچی بن جاؤں پھر بچوں کی طرح شرارتیں کروں۔مار کھاؤں، ضد کروں، جھڑکیاں سنوں.....ارے ہاں میں چھ برس کی ہی تو تھی جب میں نے قرآن مجید ختم کر لیا تھا۔امی کتنی خوش تھیں اُس دن!۔۔سارے خاندان میں امی کا سر اونچا تھا کہ میری ننھی سی بچی نے اتنی چھوٹی عمر میں کلام پاک ختم کر لیا ہے۔جس دن میری ''آمین'' تھی امی مجھے بار بار چومتی تھیں اور پتہ نہیں کیا کیا پڑھ کر پھونکتی تھیں کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

امی ابو کو ''باؤجی'' کہا کرتی تھیں۔میں نے بھی ایک بار ریٹو کے ابو کو ''باؤجی'' کہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے.....میرے سوچتے سوچتے کتنے برسوں

کا فاصلہ طے ہوگیا ہے۔ آئینے میں اب امی کے خوبصورت اور جوان چہرے کی جگہ نحیف و لاغر چہرے نے لے لی ہے، مگر ٹی بی زدہ امی بھی مسکرا رہی ہیں۔

''امی آپ نے دکھ کے لمحوں کی ہر سانس میں ابو کا ساتھ دیا تھا پھر اب خوشی کے لمحوں میں کیوں منہ موڑ گئی ہیں؟''

''بیٹی! اسے مقدر کہتے ہیں''امی بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

''امی اگر اسے مقدر کہتے ہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟''

''مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے بیٹی!''

''میں ایسے ڈراؤنے مقدر کی آنکھیں پھوڑ دوں گی''میں چیخ اٹھتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی بے دم ہو کر نیچے گر جاتی ہوں۔ امی آئینے سے نکل کر باہر آتی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر مجھے مسہری پر لٹاتی ہیں اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دے کر واپس چلی جاتی ہیں۔ میں مسہری پر لیٹے ہوئے کروٹ بدلتی ہوں۔ پیشانی پر ابھی تک امی کے بوسے کا لمس جاگ رہا ہے۔ سامنے ریٹو، ممی کے بھجوائے ہوئے خوبصورت ہوائی جہاز والے کھلونے سے کھیل رہا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے میرے بڑے بچے روفی اور بڑی بچی نزہی کے کیرم کھیلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ڈیڈی کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ ڈیڈی کچھ دیر ریٹو کے ابو کے مستقبل کے سلسلے میں باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ امی کے بوسے کا لمس ابھی تک محسوس ہو رہا ہے۔ میں امی سے ملنے قبرستان پہنچ جاتی ہوں۔ امی کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر ابو کو تلاش کرتی ہوں۔ وہ یقیناً یہیں کہیں مجاور بن کر بیٹھے ہوں گے۔ شاید یہیں کہیں ہوں۔

میں زور سے پکارتی ہوں''ابو.....ابو''

دوسری طرف کھڑے پہاڑوں سے ٹکرا کر میری آواز گونجتی ہے''ابو.....وو.....ابو.....''

میں پھر پکارتی ہوں،

پہاڑوں سے ٹکرا کر صدا پھر گونجتی ہے۔

''ابو مجھے تھام لو میں گرنے لگی ہوں''

''ابو مجھے تھام لو میں گرنے لگی ہوں.....ں ں.....ں ں''

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اب اپنے ابو کو نہیں پکار رہی بلکہ پہاڑوں سے سر ٹکرا رہی ہوں۔ میں پہاڑوں کو پاش پاش کر دینا چاہتی ہوں،

''ابو.....ابو.....''

''ابو.....ابو.....وو''

میں چیختے چیختے بے دم ہو گئی ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکراتے ٹکراتے ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔

میں ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ مگر پہاڑ اپنی جگہ قائم کھڑے ہیں۔

''امی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے۔ امی آپ ٹھیک کہتی ہیں.....امی.....امی.....امی ابو.....''میں بالکل بکھر کر رہ گئی ہوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرے ریزوں کو جمع کر کے مجھے جوڑ رہا ہے۔ اس نے مجھے پھر سے جوڑ دیا ہے۔ اب وہ مجھے اپنے مضبوط بازوؤں پر اٹھائے قبرستان سے باہر نکل رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے''ابو''آ گئے ہیں۔ اور وہی مجھے اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ میں آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں''اف فوہ.....یہ تو ریٹو کے ابو ہیں''

☆☆☆

مجھے شدید بخار ہو گیا ہے۔ ڈیڈی کو ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنا تھی اس لئے وہ جا چکے ہیں۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوں۔ اسی عالم میں دیکھتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ میری ممی میرے سرہانے بیٹھی ہیں۔ انہوں نے اپنے زانوؤں پر میرا سر رکھا ہوا ہے اور بڑے پیار سے مرا سر دبا رہی ہیں۔ مجھے اپنے خیالات پر شدید ندامت محسوس ہوتی ہے۔ میں لفظوں کو جمع کر رہی ہوں:

''ممی.....آپ تو.....ممی.....اچھی سی.....'' لیکن لفظ صحیح طور پر جمع ہی نہیں ہو پا رہے۔ میرے چہرے پر دو گرم گرم آنسو گرتے ہیں (ممی رو بھی رہی ہیں) میں جذبات کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔

میں اپنی آنکھیں نہیں کھولنا چاہتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے سرہانے تو میری ننھی بچی نزہی بیٹھی ہے۔ پھر بھی میں لفظوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہی ہوں،

''ممی.....میری اچھی ممی.....مجھے معاف کر دیں.....''

☆☆☆

اندھی روشنی

کب تلک چھائی رہے گی یونہی اندھی روشنی
کب تلک حیدؔر رہیں گے ان اندھیروں کے عذاب

اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف روشنی کا سیلاب پھیلا ہوا ہے۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینے نصب ہیں جو روشنی کے سیلاب کی شدت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ میں نے عجیب سے خوفزدہ انداز میں اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔ جب بینائی کام نہ کرے تو اندھے پن کا احساس قدرتی بات ہے مگر میری تو آنکھیں بھی بالکل ٹھیک ہیں، ان کی بینائی بھی قائم ہے پھر مجھے اندھے پن کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟

وہ ایک میز پر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی ہے اور مجھے بھی بیٹھنے کے لئے کہہ رہی ہے۔ مجھے اپنی کرسی بھی نظر آ رہی ہے مگر اندھے پن کا احساس بھی بدستور موجود ہے۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا ہوں اور اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا ہوں۔

ہال میں اچانک موسیقی کا ایک شور سا اٹھا ہے۔ عجیب بے ہنگم سی موسیقی ہے۔ سارا ہال اس کی لے پر تھرک رہا ہے۔

وہ میری طرف دیکھتی ہے اور پھر مجھے جیسے گھسیٹتے ہوئے ہال کے وسط میں لے آتی ہے۔ یہاں اور

بھی کئی جوڑے ناچ رہے ہیں اور اب میں بھی اس کے اشاروں پر ناچ رہا ہوں۔لیکن ''میں'' تو ابھی تک اُس کرسی پر گم سم بیٹھا ہوا ہوں بلکہ ''میں'' نے کرسی کے بازوؤں کو اس طرح مضبوطی سے تھام رکھا ہے جیسے انہیں چھوڑ دیا تو ہوا میں اُڑ جاؤں گا۔ یا کسی بھیڑ میں گم ہو جاؤں گا، غالباً میں اندھیروں کا باسی ہوں اور شاید اسی لئے روشنی کے اس سیلاب میں ڈبکیاں کھا رہا ہوں.....میرے حواس کھو گئے ہیں...... مجھے اپنا دَم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے.....اب کرسی بھی ہچکولے کھا رہی ہے، جیسے اس نے بھی مجھے اس سیلاب میں ڈوبنے سے بچانے سے انکار کر دیا ہو۔ میرے چاروں طرف دائرے سے ناچ رہے ہیں۔

موسیقی کا شور بڑھ گیا ہے۔

دائروں کے رقص کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔روشنیوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی ہے اور میرے اندھے پن میں کچھ اور اضافہ ہوگیا ہے، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی تاریک غار میں دوڑتا جا رہا ہوں۔ ہزاروں آسیب میرے تعاقب میں ہیں، اچانک مجھے ٹھوکر سی لگتی ہے۔

''دیکھو احتیاط کرو۔ میرا مذاق نہ بناؤ''

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا ہے۔ میں غار سے نکل کر واپس ہال میں پہنچ گیا ہوں اور اب پھر سنبھل کر رقص میں اس کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ''میں'' تو ابھی تک اُس کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ رقص کون کر رہا ہے؟ رقص بھی میں ہی کر رہا ہوں۔

پھر میں کہاں ہوں؟

میں رقص کر رہا ہوں یا کرسی پر بیٹھا ہوں؟

کرسی پر بیٹھا ہوا ''میں'' کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ مجھے بلا رہا ہے۔

''واپس لوٹ آؤ

شجرِ ممنوعہ کی داستان نہ دہراؤ۔ واپس لوٹ آؤ۔ جنت سے نکل کر تو زمین پر آ گئے تھے۔ زمین سے نکال دیئے گئے تو کوئی ٹھکانہ نہیں ملے گا.....اس حوّا کو چھوڑ دو.....واپس لوٹ آؤ''

''میں'' پھر کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔

میں بے اختیار کرسی پر بیٹھے ہوئے ''میں'' کی طرف بڑھتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھا ہوا ''میں'' پھر کھڑا ہو گیا ہے۔ ہم دونوں بغل گیر ہوتے ہیں اور وہ میرے اندر چھپ جاتا ہے موسیقی کا بے ہنگم شور جاری ہے۔ رقص بھی جاری ہے۔

''وہ شاید کوئی دوسرا ساتھی ڈھونڈ چکی ہوگی'' میں یہ سوچتے ہوئے اُدھر دیکھتا ہوں۔

مگر وہ تو میرے سامنے بیٹھی ہے۔

اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور بے بسی کے اثرات ہیں۔

''میں تمہاری وجہ سے جنت بدر ہوا تھا مگر اب میں تمہاری وجہ سے زمین بدر نہیں ہو سکتا''

''میری وجہ سے.....؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت ہے

''تم شجرِ ممنوعہ تک لے جانے کی ذمہ دار ہو اور شجرِ ممنوعہ جنت سے نکلوانے کا ذمہ دار ہے''

''شجرِ ممنوعہ.....! گندم.....؟''

''گندم.....شاید.....!''

''کیا گندم اشجار پر اُگتی ہے؟''

''نہ میں عربی زبان جانتا ہوں نہ کسی تفسیری جھگڑے میں پڑنا چاہتا ہوں (جنت میں اشجار پر ہی اُگتی ہوگی)''

''تم روشنی سے خوفزدہ ہو'' اس کا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا ہے،

''پہلے بھی تمہارے ایسے ہی طعنوں نے مجھ سے گناہ کرایا تھا''

گندم میں نے نہیں کھلائی تھی'' وہ چیخ پڑتی ہے،

''میں پھر کہتا ہوں کہ میں جھگڑنا نہیں چاہتا''

''تم نے گندم کی تہمت میرے سر کیوں لگائی؟''

''میں دوبارہ فریب میں نہیں آنا چاہتا''

''فریب!.....مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا.....'' اس کے لہجے میں بلا کا طنز ہے.....'' اپنی عیاشی کا سامان بھی پورا کرتا ہے اور اپنی ساری غلطیوں کا بار بھی عورت ہی پر ڈالتا رہتا ہے''

‘‘لیکن گندم.....’’

‘‘سنو!’’.....وہ چلاّتے ہوئے بولتی ہے‘‘گندم کی ہیَت پر غور کرو اور اپنی اس کمزوری پر بھی غور کرو جس کے بغیر تم نہیں رہ سکتے۔ بڑے بڑے تجرد پسند بھی جس کے لئے بالآخر مجبور ہو گئے’’

‘‘تم فحش اور ننگی باتیں کر رہی ہو’’

‘‘سچ کا کوئی لباس نہیں ہوتا اسی لئے ننگا نظر آ رہا ہے’’

اس کا لہجہ بے حد زہریلا ہے اور میں ایک بار پھر اندھے پن کے احساس میں کھو گیا ہوں۔

‘‘اندھیروں کے باسی تم اب بولتے کیوں نہیں’’

اچانک ساری روشنیاں گل ہو گئی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے، وہ گھبرا کر میرے قریب ہو جاتی ہے۔

‘‘تم جس مصنوعی روشنی کی باسی ہو اس کا طلسم ٹوٹ جائے تو پھر دیکھ لو کیا ہوتا ہے’’

میں اس سے یہ کہنا چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا کیونکہ روشنیاں پھر آ گئی ہیں۔ میرا اندھا پن بھی آ گیا ہے۔

اب ہماری میز پر ایک اجنبی بھی موجود ہے اجنبیت کے باوجود ہمیں اس میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔‘‘شاید میں آپ لوگوں کی بحث کو کسی حتمی نتیجے تک پہنچا سکوں!’’ اجنبی پر خلوص لہجہ میں کہتا ہے۔

‘‘ہماری بحث کا موضوع جنت بدر ہونے کا سبب یعنی گندم ہے’’ میں وضاحت کرتا ہوں۔

‘‘کیا واقعی تمہیں جنت بدر کرنے کا سبب گندم ہی ہے؟’’

‘‘مجھے یاد تو کچھ ایسے ہی پڑتا ہے’’ میں ذہن پر زور دیتے ہوئے بتاتا ہوں۔

‘‘مولوی صاحبان بھی یہی بتاتے ہیں’’ وہ میرے موقف کی تائید کرتی ہے۔

‘‘مجھے شک پڑتا ہے آپ نے گندم کی بجائے اس کا بھوسہ کھا لیا ہوگا’’

اجنبی کی اس بات پر ہم احمقوں کی طرح ہنستے ہیں۔

‘‘ذہن پر زور دیجئے.....وہ گندم سرخ رنگ کی تو نہیں تھی؟’’ اجنبی سوال کرتا ہے.....پھر ایک بھرپور

قہقہہ لگاتا ہے اور خود بھی اس قہقہے میں گم ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ہی جیسے نیند سے بیدار ہو گئے ہیں۔‘‘سرخ گندم کا مطلب سمجھتی ہو؟’’

‘‘اوہ.....اب سمجھی.....اس کا اشارہ امریکی گندم کی طرف تھا’’

‘‘سالا کوئی کمیونسٹ معلوم ہوتا تھا’’

‘‘میں بھی یہی سوچ رہی ہوں’’

☆☆☆

آج صبح کے اخبارات میں قوم کو یہ نوید سنائی گئی ہے کہ قحط کے خطرے کے پیش نظر ایک دوست ملک سے طویل مدت قرض کی بنیاد پر کئی ہزار ٹن گندم خریدنے کے ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں۔

میرے اندر کا ‘‘میں’’ سورج نکلنے سے پہلے ہی مر گیا ہے۔

☆☆☆

میں پھر اپنی حوا کو ملنے چلا گیا ہوں

پھر وہی رشنیاں ہیں.....وہی موسیقی ہے اور وہی رقص ہیں۔ میری وہ کرسی اب خالی پڑی ہے۔

یہ روشنیاں اب مجھے راس آ گئی ہیں اور میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے۔

اب میں اس کے اشاروں پر نہیں ناچ رہا بلکہ اسے اپنے اشاروں پر نچا رہا ہوں.....لیکن یہ کیا.....؟

سامنے دیوار پر نصب آئینے میں میرے اندر کے ‘‘میں’’ کی بے کفن لاش مجھے گھور رہی ہے۔

میں گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہوں۔ لیکن ادھر بھی بڑا آئینہ نصب ہے اور اس میں بھی وہی منظر ہے میرے چاروں طرف میری لاشیں بکھری ہوئی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں:

‘‘کاش میرا وہ اندھا پن ہی لوٹ آئے’’

موسیقی کا شور کچھ اور بڑھ گیا ہے۔

ہمارے رقص کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔

لیکن ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ ہم بے زمین ہو گئے ہیں۔

صرف اپنی لاشوں پر کھڑے رقص کر رہے ہیں۔
روشنیاں تیز ہو گئی ہیں۔
موسیقی کا شور مزید بڑھ گیا ہے
اور رقص کی رفتار مزید تیز ہو گئی ہے۔
تیز.....تیز.....اور تیز
روشنیاں موسیقی اور رقص
بے زمین لوگوں کا اپنی لاشوں پر رقص!

☆☆☆

حوّا کی تلاش

مِرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں کس رُت میں کیسے خواب لگے

مجھے یقین نہیں آ رہا۔
میں عالم برزخ میں ہوں،
عالم خواب میں ہوں،
یا عالم حقیقت میں ہوں؟

''غالباً میں عالم حقیقت میں ہوں'' کسی وہم کی طرح مجھے یقین ہو جاتا ہے اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہتا ہوں پھر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

میرا مستقبل میرے داہنے ہاتھ پر اور میرا ماضی میرے بائیں ہاتھ پر ہمیشہ رقم رہتا تھا اور میں اپنے ماضی اور مستقبل کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ حال میں رواں رہتا تھا۔ مگر اب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو مجھے وہاں چاروں طرف دھند چھائی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو وہاں دھواں دھواں فضاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔۔۔ بے چارگی کے احساس کے ساتھ میں نے اپنے حال کی طرف دیکھنا چاہا تو مستقبل کی ساری دھند میری آنکھوں میں اُتر آئی اور ماضی کا سارا دھواں میرے چاروں طرف رقص کرنے لگا۔ اس

عذاب ناک حالت میں مجھے بچپن کی وہ دعائیں بھی بھول گئیں جو میری ماں نے مجھے یاد کرائی تھیں۔لیکن میں مایوس نہیں ہوا۔آخر دھوئیں کا رقص دھواں ہونے لگا۔روشنی کی ایک لکیرا بھری اور ابھرتی چلی گئی،

’’الم تر کیف فعل ربك با اصحاب الفیل‘‘

دھند میری آنکھوں سے چھٹنے لگی اور دھواں دور ہٹنے لگا۔مجھے اصحاب فیل کا انجام یاد آیا جو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ہو گئے تھے۔میں نے اپنے سامنے بکھرے ہوئے ایٹم بم کا شکار ہونے والے منظر کو دیکھا اور مجھے اصحاب فیل کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا جو صرف کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیئے گئے تھے۔

عالمگیر ایٹمی جنگ ہو چکی ہے اور میں پتہ نہیں کیسے زندہ بچ گیا ہوں۔میرے چاروں طرف اس بھیانک جنگ کے اندھیرے پھیلے ہوئے ہیں۔مجھے ان اندھیروں سے نکلنے کے لئے روشنی درکار ہے۔اور تب ہی جس قوت نے مجھے اس جنگ میں بھی زندہ رکھا تھا۔مجھے روشنی عطا کرنی شروع کر دی۔روشنی کی جو لکیر پہلے ابھری تھی وہ اب ایک روشن ہالے کی شکل اختیار کر گئی ہے اور مجھ پر کرن کرن اتر رہی ہے،

’’تجھے کیا معلوم ہے کہ حطم (ایٹم) کیا شے ہے؟ یہ اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کے اندر تک جا پہنچے گی تاکہ اس کی گرمی ان کو اور بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہو‘‘

’’دنیا پر ایک شدید مصیبت آنے والی ہے اور تجھے کیا معلوم ہے کہ وہ مصیبت کیسی ہے؟ اور ہم پھر کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ عظیم الشان مصیبت کیا چیز ہے؟ یہ مصیبت جب آئے گی تو اس وقت لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ اس پشم کی مانند ہو جائیں گے جو دھنکی ہوتی ہے۔‘‘

’’جب زمین کو پوری طرح ہلا دیا جائے گا۔اور زمین اپنے بوجھ نکال کر پھینک دے گی اور انسان کہہ اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟‘‘

مجھے یاد آتا ہے کہ میں ایک پہاڑی علاقہ میں ٹھہرا ہوا تھا جب ایٹمی جنگ چشم زدن میں چھڑ گئی تھی

مگر اب کہیں بھی کوئی پہاڑ نظر نہیں آ رہا۔میں خود ہی حیرت سے پکار اٹھتا ہوں’’ یہ کیا ہو گیا ہے؟‘‘ اور قرآن کی صداقت کا ایک گواہ بن جاتا ہوں۔

مجھے یاد آتا ہے۔دو بڑی قوتیں ساری دنیا پر پھیل رہی تھیں۔ان میں مشرقی قوت کا جال زیادہ پھیلا ہوا تھا لیکن مغربی قوت بھی کم نہ تھی۔عجیب عجیب نعرے تھے۔عجیب عجیب نظریات تھے۔دونوں ہی انسانیت کی فلاح کی باتیں کرتے تھے اور اب دونوں ہی انسانیت کی تباہی کا موجب ہو گئے تھے جنگ کی ابتدا مشرقِ وسطیٰ سے ہوئی تھی۔وہاں کی تیل کی دولت۔جسے دونوں بڑی قوتیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھیں۔پھر کیا ہوا؟۔۔مجھے واقعات کا علم نہیں۔لیکن روشنی کا جو ہالہ مجھ پر کرن کرن اتر رہا ہے وہ مجھے بتانے لگتا ہے۔اس کا اپنا انداز بیان ہے۔

’’خداوند کہتا ہے کہ میں نے اپنی غیرت سے اور قہر کی آتش سے کہا یقیناً اسی دن اسرائیل کی سرزمین میں ایک زلزلہ ہو گا۔یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے پرندے اور زمین کے چرندے اور سارے کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے پھرتے ہیں اور سارے انسان جو روئے زمین پر ہیں میرے سامنے تھرتھرا جائیں گے اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور کڑاڑے بیٹھ جائیں گے اور ہر ایک دیوار زمین پر گر پڑے گی.....ایک شدت کا مینہ اور بڑے بڑے اولے اور آگ اور گندھک برساؤں گا۔اسی طرح میں اپنی بزرگی اور تقدیس کراؤں گا اور بہتیری قوموں کی نظروں میں پہچانا جاؤں گا اور وہ جانیں گے کہ خداوند میں ہوں‘‘

’’دیکھ میں ترا مخالف ہوں اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار! میں تجھے پلٹ دوں گا.....
اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لئے دوں گا۔تو کھلے ہوئے میدان میں گر پڑے گا.....اور میں ماجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا.....اور آگے کو میں ہونے نہ دوں گا کہ وہ میرے پاک نام کو بے حرمت کریں‘‘

’’اور دنیا میں ایک حشر برپا ہو جائے گا اور وہ اول الحشر ہو گا اور تمام بادشاہ آپس میں ایک دوسرے پر چڑھائی کریں گے اور ایسا کشت و خون ہو گا کہ زمین خون سے بھر جائے گی اور ہر ایک بادشاہ کی

رعایا بھی آپس میں خوفناک لڑائی لڑے گی۔ایک عالمگیر تباہی آوے گی اوران تمام واقعات کا مرکز ملک شام ہوگا''

''اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اوراے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں اوراے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں''

میں خدا کی بزرگی اور تقدیس کا اقرار اوراپنے عجز کا اعتراف کرتا ہوں۔روشنی کی کرنیں میرے جسم پر تو اُتر رہی ہیں مگر روح تک نہیں پہنچ پاتیں۔شاید اسی وجہ سے میں صرف اپنے ماضی کی تحریریں ہی پڑھ سکا ہوں۔مستقبل کی تحریروں کی یا تو زبان بدل گئی ہے یا اُنہیں پڑھنے کی میری قوت سلب ہوگئی ہے۔

ایٹمی جنگ نے آدم کی نسل کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کردیا ہے اوراب ابن آدم ہونے کے ناطے اس وقت مجھے اپنا سب سے پہلا فریضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو آدم کی نسل کو اس دھرتی پر قائم رکھا جائے۔شاید میں اس نئے عہد کا آدم ہوں۔

مگر نئی حوا۔۔۔۔؟

میں خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہوئے نئی حوا کی تلاش کے سفر پر روانہ ہوتا ہوں راستے میں تباہیوں کے کئی بھیانک منظر آتے ہیں۔روشنی کا وہ ہالہ میرے ساتھ ہے اوراب بھی کرن کرن میرے جسم پر اتر رہا ہے۔میرا نامعلوم اوراَن دیکھا سفر جاری ہے۔ایک جگہ تو تباہی کا ایسا منظر آتا ہے جیسے یہاں ایک دم بیسیوں ایٹم بم گرادیئے گئے ہوں میں خوف زدہ ہوجاتا ہوں۔اوراس منظر سے چھپنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔

تب ہی روشنی کے ہالے کی کرنیں میری آنکھیں کھول دیتی ہیں،

''کیا یہ زمین میں نہیں پھرے کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا؟ وہ ملک میں ان سے تعداد اور طاقت میں بھی زیادہ تھے اورعمارت وغیرہ کے فنون میں بھی زیادہ ماہر تھے۔لیکن ان کے اعمال نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا تھا۔اور جب ان کے پاس ان کے رسول نشانات

لے کر آئے تو ان کے پاس جو تھوڑا بہت علم تھا اس پر فخر کرنے لگے اور جس عذاب کی ہنسی اُڑاتے تھے اسی نے ان کو گھیر لیا۔ پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہہ اٹھے ہم تو اللہ کو ایک قرار دیتے ہوئے اس پر ایمان لاتے ہیں اوراس کے ساتھ جن چیزوں کو ہم شریک قرار دیا کرتے تھے ان کا ہم انکار کرتے ہیں۔پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔یہی اللہ کی مقررہ سنّت ہے جو اس کے بندوں میں جاری چلی آتی ہے''۔

میں تہیہ کرتا ہوں کہ مجھ آدم سے جو نسل چلے گی اسے میں ان صحیفوں کی تعلیمات کے مطابق خود تربیت دوں گا اور میری نسل شیطان کے چنگل میں دوبارہ اس طرح نہیں آئے گی کہ خدا کے عذاب کا شکار ہوجائے۔نسل کی تربیت کے احساس کے ساتھ اپنے جیون ساتھی کی تلاش کا خیال پھر شدت سے ابھرتا ہے۔میرے لئے اب رات یا دن کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے کہ روشنی کا ہالہ اگر میرے ساتھ نہ ہو تو میرا دن بھی تاریک ہوجائے۔جب بھی کہیں تھکن کا احساس ہوتا ہے ٹھہر جاتا ہوں،ستا لیتا ہوں۔شاید نیند بھی کرلیتا ہوں یا صرف اونگھ لیتا ہوں۔میں بدترین تباہی کے اس علاقہ سے تیزی سے نکلنے لگتا ہوں پتہ نہیں ان دہشت ناک مناظر کے خوف سے یا جیون ساتھی کی تلاش کے خیال سے جو پہلے سے زیادہ شدید ہوگیا ہے۔

جب میں اس علاقہ سے باہر آتا ہوں تو مجھے پہلی دفعہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے کئی دنوں کی مسلسل مسافت کے باوجود کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔بھوک کا احساس بیدار ہوجائے تو اسے سلانا مشکل ہوجاتا ہے۔بھوک کا احساس میرے جسم کے ساتھ ذہن اور روح پر بھی تھکن طاری کرنے لگتا ہے۔

میں چل رہا ہوں مگر مجھ سے چلا نہیں جاتا۔میرا وجود شل ہونے لگتا ہے۔میں اپنی بے بسی کے اقرار کے ساتھ خدا کی عظمت اور بزرگی کا اقرار کرکے اس کی تسبیح اور تحمید کرتا ہوں۔تب ہی روشنی کے اس ہالے سے ایک کرن میرے جسم پر کسی تیر کی طرح اترتی ہے اور مجھ پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے،

''کیا انسان کو معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو ایک حقیر قطرہ سے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ سخت جھگڑالو

بن جاتا ہے اور ہماری ہستی کے متعلق باتیں بنانے لگ جاتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔''
میں خدا کے جلال کے آگے جھک جاتا ہوں۔ لبوں سے یا دل سے کوئی دعا نہیں نکلتی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک جھڑی ہے جو تسبیح کے دانوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہے۔۔ یہ آنسو اپنی بے بسی اور خدا کی عظمت کا خاموش اقرار ہیں۔

میں کتنی دیر تک اسی کیفیت میں سربسجود رہتا ہوں جب دل کا بوجھ کسی حد تک اتر جاتا ہے تو سجدے سے سر اٹھاتا ہوں۔ بھوک کی شدت میں بڑی حد تک کمی ہوگئی ہے اور تھکن کا احساس بھی ایک حد تک زائل ہو گیا ہے۔ میں پھر اپنے سفر پر روانہ ہوتا ہوں۔ چلتے چلتے مجھے دور کہیں ہریالی کا گمان ہوتا ہے۔ میں بے ترتیب راستوں سے اس سمت چل پڑتا ہوں۔

یہ تو کوئی خاصا زرخیز علاقہ ہے۔ دور دور تک ہرے بھرے کھیت ہیں اور کھیتوں کے ساتھ ہی ایک خوبصورت سا باغ بھی ہے۔ باغ بڑے جدید انداز میں آراستہ ہے۔ درمیان میں ایک خوبصورت فوارہ بھی لگا ہوا ہے۔ اس خوبصورت باغ میں پہنچ کر تھکن تو دور ہوگئی مگر بھوک نے مزید شدت اختیار کر لی لیکن فوارے کے ٹھہرے ہوئے پانی میں مچھلیاں دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا ہوں۔

کھیتوں کے ہرے بھرے راستے سے لے کر اس باغ تک مجھے کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ ذہن پر زور دیتا ہوں تو یاد آتا ہے راستے میں کچھ جانور مَرے پڑے تھے۔ مگر چونکہ میں اس سے زیادہ بھیانک تباہیوں سے گذر کر آیا تھا اس لئے میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقہ پر زہریلی گیس کے بم پھینکے گئے تھے۔ تمام ذی روح مر چکے ہیں اور ساری فصلیں اور پھل زہریلے ہو چکے ہیں۔

روشنی کا وہ ہالہ بدستور اپنی کرنیں میرے جسم پر اتار رہا ہے۔ میں عجب گومگو کی حالت میں ہوں۔ بھوک اب اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ مجھے لگتا ہے اگر میں نے کچھ نہ کھایا تو موت سے نہیں بچ پاؤں گا۔ مگر سارے پھل زہریلے ہو چکے ہیں۔

''مرنا ہی ہے تو بھوکے پیٹ کیوں مرا جائے'' یہ سوچ کر بالآخر میں نے پھلوں کو توڑ توڑ کر کھانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں میں کب تک پھل توڑ کر کھاتا رہا ہوں۔ ہوش تب آیا جب

میں فوارے کا زہریلا پانی پی کر باہر آیا۔
اب میں اطمینان سے اپنی موت کا منتظر ہوں۔ مگر مجھے تو حیرت انگیز طور پر اپنے اندر توانائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ روشنی کا ہالہ اب کتنی ہی کرنیں میرے جسم پر اتار رہا ہے،

''وہی ہے جو مایوسی کے بعد بارش اتارتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے''

''اے نفس مطمئنہ ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ اس حال میں کہ تو اسے پسند کرنے والا بھی ہے اور اس کا پسندیدہ بھی۔''

میں ایک بار پھر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں جہاں سے بچایا گیا ہوں وہاں کے تابکاری اثرات میرے اندر کچھ اس طرح سرایت کر چکے ہیں کہ وہ میری ہلاکت کی بجائے اس زہریلی گیس کی ہلاکت کا باعث بن گئے ہیں جو اس وقت موجود پھلوں اور پانی میں ہے۔ گویا وہ تابکاری اثرات اس طرح میری بقا کی ضمانت بن گئے ہیں۔ غالباً اسی لئے میں کتنے ہی متعفن مقامات سے گزرنے کے باوجود بیمار بھی نہیں ہوا اور یہ جو اتنی قوت مجھ میں آ گئی ہے کہ میں سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک آ پہنچا ہوں یہ بھی ان اثرات کے سبب سے ہی ہے۔

''پس تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

میں اپنی خوراک کے مسئلے سے اب بالکل مطمئن ہو جاتا ہوں۔ مجھے اب ان دو بڑی مشرقی اور مغربی قوتوں کے انجام کا خیال آتا ہے۔ دونوں قومیں ہی فتنے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں۔ روشنی کا ہالہ میرے قریب آ جاتا ہے اور پھر کرن کرن میرے جسم پر اترنے لگتا ہے۔
یکا یک روشنی کا ہالہ پورے کا پورا میرے جسم پر اتر آتا ہے،
''تم پر آگ کا ایک شعلہ گرایا جائے گا اور تانبا بھی گرایا جائے گا پس تم دونوں ہرگز غالب نہیں آ سکتے اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''
روشنی کا ہالہ پھر اپنے اصل فاصلے پر چلا جاتا ہے اور پھر کرن کرن میرے جسم پر اترنے لگتا ہے۔ میں دونوں بڑی قوتوں کی تباہی کا یقین کر لیتا ہوں۔

جیون ساتھی کی جستجو کا خیال پھر مجھے مستعد کر دیتا ہے۔ اور میں نیا آدم ہونے کے ناطے بقائے نسل انسانی کے مقدس فرض کی خاطر ایک نئے عزم کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔

باغ والے اس گاؤں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک شہر آباد ملتا ہے۔ ساری عمارتیں سلامت ہیں مگر شہر پر موت کی حکمرانی ہے۔ دوکانیں کھلی ہوئی ہیں مگر لوگ نیچے گرے ہوئے ہیں۔ کہیں دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے ہیں بیشتر دوکاندار کاؤنٹر پر یوں سر رکھے ہوئے ہیں جیسے آرام کر رہے ہوں۔

مجھے بچپن کی وہ کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک شہزادہ ایک ایسے شہر میں داخل ہوتا ہے جہاں ہر آدمی پتھر کا بت بنا ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے میں بھی کوئی شہزادہ ہوں۔ مگر کہانی والے شہزادے کو اُس شہر کو زندہ کر دینے میں اس لئے آسانی ہوتی ہے کہ وہ کسی جادوگر کے طلسم کے باعث ویسا ہوا ہوتا ہے۔ جب کہ یہ شہر تو انسان کے اپنے ہی طلسم کا شکار ہو گیا ہے۔ زہریلی گیس کے بموں نے سارے شہر میں کوئی ذی روح نہیں چھوڑا۔

میں کسی تھکے ہارے، افسردہ شہزادے کی طرح ایک خوبصورت ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہوتا ہوں۔ مگر ایک دم گھبرا کے پیچھے پلٹنے لگتا ہوں۔ سامنے کوئی وحشت زدہ آدمی کھڑا ہے۔ میں پیچھے ہٹتے ہوئے پھر رک جاتا ہوں۔ سامنے تو بڑا سا قدِ آدم آئینہ نصب ہے۔

''تو کیا.....؟ کیا.... یہ.... میں ہوں؟''

میں خود کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہوں۔ مگر بالآخر مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ میں ہی ہوں۔ اپنی پہچان کو تسلیم کرتے ہی مجھے پہلی دفعہ اپنی برہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں آئینے میں مجھے بالکل اپنے ہی جیسی ایک وحشت زدہ عورت نظر آتی ہے۔ میں تیزی سے پلٹتا ہوں۔ اپنی تمام تر وحشت کے باوجود اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ وہ مغربی عورت ہے۔ اس کی آنکھوں میں تلاش اور تجسس ہے۔ وہ مجھے حیرانی سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ پتہ نہیں اپنے باپ کو تلاش کر رہی ہے، بھائی کو تلاش کر رہی ہے یا بیٹے کو.... اس کی آنکھوں میں یکا یک چمک پیدا ہوتی ہے۔ جیسے اس نے پہچان لیا ہو۔ اور پھر وہ دوڑ کر مجھ سے بُری طرح چمٹ کر سسکنا شروع کر دیتی ہے۔ میں

نہیں جانتا اس نے مجھے باپ سمجھا ہے۔ بھائی سمجھا ہے۔ بیٹا سمجھا ہے یا کوئی اور۔۔ لیکن میں مطمئن ہوں کہ اب آدم کی نسل اس دھرتی سے ختم نہیں ہوگی۔

میرے ماضی اور مستقبل کی تحریریں میرے دائیں بائیں ادب کے ساتھ کھڑی ہیں۔ اور میرا ''برہنہ حال'' میرے برہنہ جسم سے چمٹا مشرق اور مغرب کی نفرتوں کو اپنے آنسوؤں سے صاف کر رہا ہے۔

روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے،

''اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

☆☆☆

اپنی تجرید کے کشف کا عذاب

راستے تو کھو چکے تھے اپنی ہر پہچان تک
ہم جنازے منزلوں کے خود اُٹھا کر آئے ہیں

میں ایک فنکار ہوں۔
ایک مصور ہوں۔
اپنی ذات کی دریافت کے لامتناہی عمل سے گزرتے ہوئے جب میں اپنی تجرید کے کیف آور لمس سے آگاہ ہوا تو اپنے اس کشف پر میں خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔
میں نے اس لمس کو اپنی روح میں اتار لینا چاہا۔مگر عجیب بات تھی کہ میں اس کے سرور میں بھیگا ہوا تھا پر اسے چھونے کی صلاحیت سے محروم تھا۔
''یہ کیسا کشف ہے......یہ کیسا گیان ہے؟''میں نے خود سے پوچھا۔
''خارجی دنیا کو بھی تمہارے اس کشف کا ادراک ہونا چاہئے''
ایک مقدس آواز ابھری اور پھر ڈوب گئی۔
میں ایک مصور ہوں۔
رنگوں کی دنیا کا بادشاہ۔
رنگ جو روشنی کا اظہار کرتے ہیں۔

لفظوں میں ڈھل جائیں تو عظمتوں کے مینار بنتے ہیں۔
تاروں پر گریں تو زندگی کے سارے راز آشکار ہوتے ہیں۔
رنگ۔۔جن سے آرٹ کے سوتے پھوٹتے ہیں۔
تب میں نے اپنے فن پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی سوچ کے کینوس پر ایک شاہکار بنانے کا فیصلہ کیا۔پہلے مرحلے میں،میں نے لفظوں کے سرخ رنگ سے اپنی تجرید کو پینٹ کرنا شروع کیا۔
گہرا سرخ،ہلکا سرخ،گلابی،عنابی۔۔۔
میں تصویر بنانے میں مگن تھا لیکن جب تصویر بنانے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ساری سرخی آہستہ آہستہ سفیدی میں ڈھل رہی تھی۔خون سفید ہونے کا محاورہ تو سننے میں آیا تھا مگر یہ رنگ؟۔۔لیکن خون بھی سفید کب ہوتا ہے۔خون تو سرخ ہی ہوتا ہے اور جو سفید ہوتا ہے اسے خون نہیں کہتے۔
رنگوں کی ساری سرخی سفیدی میں ڈھل چکی ہے اور مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ محاورتاً سہی (اور یہ محاورہ بھی غلط سہی) میرا خون سفید ہو چکا ہے۔میں اپنے جسم سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔مگر اس کی دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ جاتا ہوں....دہشت زدہ ہو کر خود کو دیکھنے لگتا ہوں۔
تب میری تجرید کے انکشاف کا وہی لمحہ دوبارہ میرے اندر جاگتا ہے۔حالانکہ یہ کشف بھی وہی ہے،لمس بھی وہی۔مگر اس دفعہ اس میں ایک نئے ذائقے،نئی لذت اور نئے سرور کا احساس ہوتا ہے۔شاید اسی احساس کے باعث میں اپنی تجرید کو پھر کینوس پر منتقل کرنے لگتا ہوں۔پہلی تصویر کے رنگ اگرچہ سفید ہو چکے ہیں تاہم ان رنگوں کی مہک ابھی تک موجود ہے اور کہیں کہیں مدھم مدھم مٹتے ہوئے سے سرخ نشان بھی موجود ہیں۔
اب میں سبز لفظوں کے رنگ سے پینٹ کر رہا ہوں،
گہرے سبز،آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے،ہرے بھرے کھیتوں جیسے رنگ،مقدس دھرتی پر بکھرے ہوئے بیسیوں مقدس مناظر جیسے مقدس رنگ۔میں ایک گونہ مسرت اور روحانی انبساط سے سرشار پینٹ کر رہا ہوں۔

مگر یہ کیا؟۔۔میں خوف سے اپنی آنکھیں میچ لیتا ہوں۔
اور وہ میری اندر کی آنکھوں سے میرے اندر اُتر آتی ہے۔
میں بے بس ہو کر آنکھیں کھول دیتا ہوں اور وہ میرے اندر سے نکل کر پھر سامنے آ جاتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں کلر ٹیوب کو چیک کرتا ہوں۔اس پر ’’سبز‘‘ لکھا ہوا ہے۔
’’پھر یہ کینوس پر ہریالی کی بجائے پیلاہٹ کہاں سے آ گئی؟‘‘ میں جیسے اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ پھر کلر ٹیوب کو ایک ہاتھ میں لے کر دباتا ہوں۔ ڈھیر سارا رنگ نکل کر فرش پر گرتا ہے اور میری خاموش چیخیں اس میں گھل جاتی ہیں۔ ٹیوب کے اندر سارا پیلا رنگ بھرا ہوا ہے۔
ہری ٹیوب میں پیلا رنگ مگر سرخ ٹیوب سے تو سرخ رنگ ہی نکلا تھا۔ پھر وہ کیسے سفید ہو گیا؟ میں اپنے کشف میں اس خارجی دنیا کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں مگر یہاں رنگ ہی میرا ساتھ نہیں دے پا رہے۔ مجھے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ بے چارگی اور مایوسی کے اندھیرے چاروں طرف رقص کر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے میرے اندر والے فنکار کو قتل کر دیا ہے اور میں اپنی لامتناہی تلاش کے سفر میں ایک ایسے ٹیلے پر کھڑا ہوں جس کے ایک طرف سربفلک دشوار گزار پہاڑ ہیں اور دوسری طرف گہرا ناقابل عبور سمندر۔ ایک طرف سینکڑوں اژدھوں اور عفریتوں کی پھنکاریں ہیں تو دوسری طرف آبی بلاؤں کی چیخیں۔ میں اپنے آپ کو پکارنا چاہتا ہوں مگر میری صدا بھی کہیں کھو گئی ہے۔
میں ٹیوبوں کو ایک ہی برتن میں خالی کر دیتا ہوں۔
سبز، سرخ، پیلا، نیلا، نسواری۔۔۔۔ پتہ نہیں کون کون سے رنگ ہیں۔
سارے رنگوں کو گھول کر میں اپنی انگلیوں کو کینوس پر وحشیانہ انداز میں پھیرنا شروع کر دیتا ہوں۔ سارے رنگ انتہائی بھونڈے طریقے سے کینوس پر مل دیتا ہوں۔
اس کے ساتھ ہی جیسے میری دیوانگی ختم ہو جاتی ہے۔ سارا وحشیانہ پن ختم ہو جاتا ہے۔
اب میری حیرت کا دوسرا رُخ بیدار ہوتا ہے
کینوس پر میری وہ تجرید کسی بھرپور شاہکار کی طرح موجود ہے۔

میں اس کا مفہوم ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں اور معنویت کے سرے بے معنویت سے ملاتا ہوں۔
تب میری تجرید کی ساری معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے۔۔ یہ معنویت اتنی گھناؤنی اور مکروہ ہے کہ میں کسی کو بھی اس سے آگاہ کر کے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ معنویت صرف میری نہیں۔۔۔ہم سب کی ہے۔
شاید اسی لئے وہ مقدس آواز بھی اب نہیں آ رہی ہے جس نے کہا تھا:
’’خارجی دنیا کو بھی تمہارے اس کشف کا ادراک ہونا چاہیے!‘‘

☆☆☆

بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

یہ کہانی اس عجیب وغریب لمحے سے شروع ہوتی ہے جب تقدیر کے بارے میں میرے شکوک یقین کی حد تک پختہ ہو چلے تھے۔اسی لمحے میں تقدیر کوایک ڈھونگ سمجھ کراسے سرمایہ داروں کا استحصالی ہتھکنڈہ قرار دینے ہی والا تھا کہ کسی نامعلوم قوت نے اس لمحے کومنجمد کر دیا اور میں شک اورایمان کے درمیان معلق ہوکررہ گیا۔

☆☆☆

ملک میں حکومت کی تبدیلی سے پالیسیوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ پہلے مزدوروں کوجتنی بے جا چھوٹ دی گئی تھی اب اس سے بھی زیادہ بے جا گرفت ہورہی تھی۔اس حد تک کہ میں جومزدوروں کی بے جا چھوٹ کے عہد میں اپنی مزدور یونین کا معتوب مزدور تھا، مجھے اس یونین کا سرگرم رکن بن جانا پڑا۔اس لئے کہ مسئلہ میری ذات کا نہ تھامزدور کے اجتماعی مفاد

کا تھا۔انہیں دنوں ایک اور صنعتی ادارے میں ایک معمولی سے بہانے کی آڑ میں سینکڑوں مزدوروں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ یہ حکومت کی طرف سے ملک کے تمام مزدوروں کو بھرپور عملی دھمکی تھی۔مزدوراس دھمکی سے مرعوب ہونے کی بجائے مزید اشتعال میں آ گئے۔تاہم سرمایہ داروں اوران کے ایجنٹوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے۔اس صورت حال میں جب میری اپنے چیف کے ساتھ ٹھن گئی تو غیر متوقع طور پرانہیں کئی دفعہ میرے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔میری ان غیر متوقع کامیابیوں نے میرے اس شک کومزید تقویت پہنچائی کہ تقدیر کا شوشہ سرمایہ داروں اوراستحصالی قوتوں کی اختراع ہے۔

میں شک اور ایمان کے درمیان اس منجمد لمحے میں معلق تھا جب روشنی کی ایک کرن مجھ پراُتاری گئی۔اس کرن نے مجھے مقدر کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔لیکن جب اس نے یہاں تک کہا کہ دانے دانے اور قطرے قطرے پرنام لکھ دیا جاتا ہے تو مجھے اپنے شدید اختلاف کا اظہار کرنا پڑا۔ تب اس کرن نے مجھے پانی کے ایک قطرے کی بابت علم دیا کہ اس پر میرا نام لکھا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی مجھے اس قطرے کی پہچان اوراس کے ذائقے سے آگاہی کی خاص قوت بھی گئی۔روشنی کی اس کرن نے واپس جاتے ہوئے کہا:

’’تمہیں اس امر کی کھلی چھٹی ہوگی کہ تم اس قطرے پرلکھی تحریر کومٹا سکو‘‘

☆☆☆

ملز کا صنعتی امن سخت خطرے میں ہے۔ملز انتظامیہ جھلاہٹ کا شکار ہے۔ادھر ہماری پے در پے کامیابیوں نے ہمارے حوصلے بھی بلند کررکھے ہیں نتیجتاً کسی مفاہمت کا کوئی امکان نظرنہیں آرہا۔اپنے چیف کو میں نے زچ کر کے رکھ دیا ہے۔ذاتی طور پر مجھے کئی خوشنما لالچ بھی دیئے گئے مگر میں لیڈری کی دھن میں مست چلا جارہاہوں۔لیکن ایک اچانک اور غیر متوقع حادثے نے مجھے منتشر کر کے رکھ دیا۔ملز انتظامیہ کا پورا بورڈ بیٹھا ہوا تھا جب مجھے بلایا گیا۔وہاں ملز کے جنرل منیجر نے صنعتی گڑبڑ کی تمام تر ذمہ داری مجھ پرڈالتے ہوئے مجھے انتہائی غلیظ اور لچر گالیاں دیں۔ میں اپنی ڈیوٹی کی جگہ پرنہیں تھااس لئے بہت کچھ کر سکنے کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکا۔صبر وتحمل سے

گالیاں کھا کر لوٹ آیا۔

ملز میں پے در پے کامیابیوں کے بعد یہ میری پہلی اور بھرپور ناکامی تھی۔

☆☆☆

ملز کے بیگنگ ہاؤس کے انچارج نے جو خود بھی یونین کا سرگرم رُکن تھا۔ میرے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ چائے منگوائی اور ہم آئیندہ لائحہ عمل کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہی میری ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ قطرہ جس پر میرا نام لکھا تھا اس چائے میں موجود تھا۔ میں نے کچھ دیر اسے غور سے دیکھا۔ سوچا۔ اور پھر چینی کی ایک بوری پر پورے کپ کو اس طرح انڈیل دیا کہ وہ قطرہ بھی اس میں جذب ہو جائے۔

میرا مزدور ساتھی مجھے ہونّقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔

یہ تقدیر کے مقابلہ میں میری پہلی کامیابی تھی۔

☆☆☆

ملز میں پے در پے کئی اہم واقعات ہو گئے ہیں۔ ملز انتظامیہ کی اشتعال انگیزیوں کے نتیجہ میں مزدوروں نے ایک دن چار پانچ افسروں کی زوردار پٹائی کر دی۔ مگر افسوس جنرل منیجر اس ہنگامے سے بچ نکلے۔

پولیس آئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ آخر پندرہ مزدوروں کے استعفوں پر مفاہمت ہو گئی۔ تمام جھوٹے سچے مقدمات بھی واپس لے لئے گئے۔ جس دن پندرہ مزدوروں کے استعفوں کا معاہدہ ہوا میرے چیف نے خاص طور پر فون کر کے میری خیریت دریافت کی۔ مجھے اس بھرپور شکست کا احساس تھا۔ مگر جب مزدوروں کے ہاتھوں افسروں کی زوردار بلکہ چٹخارے دار پٹائی کا خیال آتا تو اس شکست کا احساس زائل ہونے لگتا۔ یوں بھی پٹائی کرنے والے مزدوروں نے تو کوڑے کھانے اور قیدیں بھگتنے کی توقعات کے ساتھ یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ گویا محض استعفے دے کر وہ سستے چھوٹ گئے۔ پھر بھی سبکی کا ایک احساس ضرور موجود رہا۔ میں اور تو سب کچھ بھول سکتا تھا مگر جنرل منیجر کے گھٹیا سلوک کو فراموش کرنا میرے لئے بے حد مشکل تھا۔ اپنی توہین کا انتقام لینے کے لئے

میں کسی مقدر سے بھی ٹکرا جانے کے لئے تیار تھا۔

☆☆☆

ایک چھٹی کے موقعہ پر ہمارے پورے سٹاف نے ایک بھرپور پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ خاصی دلچسپ پارٹی تھی۔ مگر کوکا کولا کی ایک بوتل کھولتے ہی مجھے احساس ہوا کہ پانی کا وہ قطرہ اس بوتل میں موجود ہے۔ میں نے طنزیہ انداز میں اس قطرے کو دیکھا اور پوری بوتل نہر میں انڈیل دی۔ میری چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ مقدر کے مقابلہ میں میری دوسری کامیابی تھی۔

☆☆☆

میرے چیف کی سرگرمیاں میرے خلاف بڑھتی جا رہی تھیں۔ لگتا تھا وہ میرے سارے قرض یکمشت چکا دینا چاہتے ہیں مگر پھر ایک دن انہوں نے زندگی کے سارے قرض بھی چکا دیئے۔ اچانک اطلاع ملی کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ ملز انتظامیہ کا پورا بورڈ کنارے پر موجود تھا مگر کوئی بھی اپنے ڈوبتے ساتھی کی مدد نہ کر سکا۔

اس سانحہ کے کچھ عرصہ بعد چینی کی بلیک مارکیٹنگ کی تحقیق کے دوران کوکا کولا کی انتظامیہ نے حکام کو بتایا کہ انہوں نے چینی ہماری شوگر ملز سے خرید کی تھی۔ چنانچہ ملز پر چھاپہ پڑا اور تحقیقات کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا۔

☆☆☆

ایک عزیز کی شادی کے سلسلہ میں چند دنوں کے لئے کراچی جانا پڑا تو وہاں ایک دن سمندر کی سیر کا پروگرام بھی بن گیا۔ میں سمندر کی بل کھاتی اور لہراتی ہوئی لہروں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر خود بھی سمندر میں اتر آیا لہروں کا مجھے چھو کر دور تک چلے جانا اور پھر شریر انداز میں واپس ہونا مجھے بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں جیسے کھو سا گیا۔ ایسے میں ایک لہراتی ہوئی لہر کو آتے دیکھ کر میں نے اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں وا کیا اور اس لہر کا پانی اپنے منہ میں بھرنے کے لئے انتظار یہ حالت میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں جیسے نیند سے بیدار ہو گیا۔

اپنے ہونٹوں کے دائرے کی عین سیدھ میں آتی ہوئی لہر میں مجھے وہ قطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لئے اور جونہی وہ قطرہ میرے قریب پہنچا میں نے ایک زوردار ہاتھ مار کر اسے پرے پھینک دیا۔ یہ مقدر کے مقابلہ میں میری تیسری شاندار کامیابی تھی۔

☆☆☆

ملز انتظامیہ کی زیادتیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ میری تعلیم اور صلاحیتوں کو جانتے ہوئے بھی نہ صرف مسلسل نظر انداز کر رہی تھی بلکہ اس کا رویہ میرے خلاف خاصا جارحانہ تھا۔ جائز حقوق کی پامالی نے میرے اندر کے باغی کی حوصلہ افزائی کی۔ میں اب مقدر کو بڑی حد تک ڈھونگ سمجھنے لگا تھا۔لیکن ملز پر پڑنے والے چھاپے کے نتیجہ میں جب جنرل منیجر کے بجائے وہ افسر گرفت میں آیا جس نے ایک دفعہ ایک غریب مزدور کو ناجائز طور پر گرفتار کروا کے نہ صرف پولیس سے پٹوایا تھا بلکہ پھر اسے ملازمت سے بھی نکلوا دیا تھا۔۔۔تو مجھے قدرت کے نظام پر ازسرِ نو غور کرنا پڑا۔

☆☆☆

پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ قطرہ اس گلاس میں موجود تھا۔ میں نے اس گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ایک دوسرے گلاس میں پانی منگوایا۔ پھر دوسرے گلاس کو پہلے گلاس سے یوں ٹکرایا جیسے جام سے جام ٹکرائے جاتے ہیں۔دوسرے گلاس کا پانی پی کر اس پہلے گلاس کو پھر اٹھایا۔اس قطرے کو ایک فاتحانہ انداز سے دیکھا اور پھر ’’تقدیر کے نام جامِ صحت‘‘ کہہ کر اس گلاس کو فضا میں اچھال دیا۔ پانی زمین پر گر کر پھیلنے اور پھر اس میں جذب ہونے لگا۔
تقدیر کے مقابلہ میں یہ میری چوتھی کامیابی تھی۔ مجھے اپنے پاؤں زمین پر ٹکتے نہیں معلوم ہوتے تھے۔محسوس کر رہا تھا کہ میں اب ہر استحصالی قوت سے ٹکرا سکتا ہوں۔

☆☆☆

ملز میں چینی کی بلیک کے اسکینڈل کی تحقیقات کا کوئی واضح رخ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔تاہم افواہیں گرم ہیں کہ ملز کے منیجنگ ڈائریکٹر، جنرل منیجر اور کچھ افسروں کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے ہیں۔جبکہ یہ تمام افسران غائب ہیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ اس معاملہ میں کم از کم جنرل منیجر کا انجام ضرور ذلت آمیز ہو۔

☆☆☆

میں شہر سے ایک قریبی گاؤں میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تو وہیں گھرے گھرے بادلوں نے آ لیا۔اصولاً مجھے واپسی کی فکر کرنی چاہیے تھی لیکن موسم اتنا خوشگوار اور شاعرانہ تھا کہ میں اس سے بچوں کی طرح لطف اندوز ہونے لگا۔
ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی تو میں نے بارش کے ٹھنڈے اور میٹھے قطرے اپنے منہ میں ڈالنے کے لئے ہونٹ کھولے اور منہ اوپر کیا۔میری آنکھیں بارش کے باعث جھپک رہی تھیں۔ اچانک میں نے دیکھا وہی قطرہ سیدھا میرے منہ کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے ہونٹ بند کر لئے اور پھر اس قطرے کو زمین پر گرتا دیکھنے لگا۔ مجھے اس قطرے کی بے بسی پر رحم آنے لگا۔
میں نے تقدیر کو خشکی کے راستے سے بھی شکست دی۔ پانی کے راستے سے بھی شکست دی۔اور اب آسمان کے راستے سے بھی میں نے اسے شکست دے دی تھی۔
میں اپنی عظمت کو خود ہی حیرت سے دیکھنے لگا!

☆☆☆

اتنے دن غائب رہنے کے بعد آج جنرل منیجر ملز میں دیکھے گئے۔معلوم ہوتا ہے ضمانت کرا کے آئے ہیں۔لیکن سہ پہر تک اطلاع ملتی ہے کہ پولیس نے جنرل منیجر کی کوٹھی کو گھیرے میں لے کر، اس کی پچھلی کھڑکی کے شیشے توڑ کر، اس راستے سے اندر داخل ہو کر موصوف کو گرفتار کر لیا ہے۔
مجھے عجیب سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

☆☆☆

مسرت کی اس عجیب سی کیفیت کے ساتھ میں کین کیریئر کی طرف آتا ہوں۔ یہاں گنے سے لدے ہوئے کتنے ہی ٹرک، ٹرالیاں اور بیل گاڑیاں موجود ہیں۔ میں ایک ٹرالی سے ایک اچھا سا گنا نکال کر، اسے صاف کر کے دانتوں سے چھیلتا ہوں۔مگر پہلی گنڈیری چوستے ہی مجھے احساس

ہوتا ہے کہ وہ قطرہ میرے منہ میں پہنچ چکا ہے۔اس کے ذائقے سے آگاہی کی جو خاص قوت مجھے دی گئی تھی وہ اس کی تصدیق کر رہی تھی۔

وہ قطرہ پوری طرح میرے منہ میں گھل گیا تھا۔ میں نے تھوک کر اس قطرے کو پھینک دینا چاہا۔ لیکن پھر دانستہ طور پر اس قطرے کو حلق سے نیچے اتار لیا۔

اس قطرہ کے میرے اندر جاتے ہی میرے اندر روشنی سی بھر گئی۔ میری انا سے تکبر کی ساری گرد اُتر گئی اور پھر میری انا اس روشنی میں ڈوب گئی۔ اس روشنی میں، میں نے آنے والے تمام دنوں کو دیکھ لیا۔اور میرے چہرے پر اطمینان کا نور پھیل گیا۔

تب ہی وہ منجمد لمحہ پگھل گیا جس نے اس کہانی کی ابتدا کی تھی۔

☆☆☆

پتھر ہوتے وجود کا دکھ

بکھر گئے ہیں ملن کے تمام دن حیدؔر
ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں

میں ''جادو کے کھیل'' کتاب سے ایک کھیل پڑھ کر اس کا عملی تجربہ کرنے کے لئے اباجی کے صندوق سے مشک کافور کی ٹکیاں نکال کر لاتا ہوں۔تب ہی ہمارے گھر کے قریب والے گھر کی خوبصورت آنکھوں والی بچی آجاتی ہے۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں پانی میں آگ لگا سکتا ہوں۔ وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتی ہے۔ پھر جب میں مشک کافور کی ٹکیوں کو آگ لگا کر پانی میں آگ کا منظر دکھاتا ہوں تو وہ بے حد حیران ہوتی ہے۔اس کی خوبصورت اور حیران حیران آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوتی ہے۔اپنی آنکھیں کھولتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ پانی میں آگ کے کھیل کی بجائے مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہی ہے۔اس حیرت میں محبت کی مدھم مدھم پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔سحر انگیز پرچھائیاں!

☆☆☆

میں ابھی تک اس کے بچپن کے اس سحر سے ہی نہیں نکل پایا۔ مجھے معلوم ہے جونہی میں اس کے بچپن کے سحر سے نکلا اس کی جوانی کا طلسم مجھے پتھر بنا دے گا اور تب جادو کی کوئی کتاب کوئی علم

اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا۔

وہ مختلف موضوعات پر بے تکان بولے جا رہی ہے۔ اور میں اس سے آنکھیں چار کرنے کی بجائے اپنی لائبریری کی بڑی ٹیبل پر نظریں گاڑے اس کی باتیں سن رہا ہوں۔ اور صرف ''ہوں ہاں'' کر کے اپنا اخلاقی فرض پورا کر رہا ہوں۔

گرمیاں آ گئی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے چھت پر لگے ہوئے تیز بلب کی روشنی میں روشنی کے ڈھیر سارے کیڑے میری ٹیبل پر گر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے کیڑے کے ہلکی سی پھونک سے اُڑ جائیں، میں ایک کیڑے کو پنسل کے ہلکے سے دباؤ کے ساتھ مسل دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کیڑا مر چکا ہے، مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں مَرے ہوئے کیڑے کو بھی متحرک دیکھتا ہوں۔۔ میں نگاہیں جھکائے ہوئے اسے متوجہ کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ یہ کیڑا مرنے کے باوجود حرکت کر رہا ہے۔ وہ تھوڑا غور سے کیڑے کو دیکھتی ہے اور پھر ایک کھنکتا ہوا قہقہہ گونجتا ہے۔

میں اس کی طرف دیکھنے کے لئے سر اٹھاتا ہوں مگر پھر گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ میں اس کے بچپن کے خوبصورت سحر میں ہی گھرا رہنا چاہتا ہوں۔ اس کی جوانی کا طلسم مجھے پتھر بنا دے گا۔ اور پھر جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا۔

اس کے کھنکتے قہقہے کی گونج ابھی تک کمرے میں موجود ہے اور پھر اس گونج میں سے اس کی آواز سرسراتی ہے۔ وہ کہتی ہے،

''چھت پر لگے ہوئے پنکھے کی ہوا سے کیڑا متحرک نظر آ رہا ہے۔ ورنہ کیڑا تو بے چارہ مر چکا ہے۔'' میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں اور پھر اس مردہ کیڑے کو دیکھتا ہوں جو پنکھے کی ہوا سے متحرک نظر آتا ہے۔

وہ پھر کہتی ہے،

''لیکن جن کیڑوں کو تم نے نہیں مسلا وہ بھی مردہ ہی ہیں۔ یہ سارے کیڑے مردہ ہیں۔ صرف پنکھے کی ہوا سے زندہ معلوم پڑتے ہیں۔ یہ بھی جادو کے کھیل ہیں، قسمت کے کھیل ہیں.... ہم جو زندہ ہیں کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟''

وہ میرے بے حد قریب آ جاتی ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ وہ کہے جا رہی ہے:

''کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟۔۔نہیں۔۔ہم بھی قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں۔ جو صرف ہوا کے دباؤ سے متحرک ہو کر زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

وہ میرے بالکل قریب آ کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتی ہے، میں خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں موند لیتا ہوں۔

وہ کہتی ہے۔

''میری طرف دیکھو! میں بھی ایک مردہ کیڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور تم بھی..... مگر یہ تم نے آنکھیں کیوں موند رکھی ہیں؟''

''تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ہم سب قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں'' (۔۔۔ پھر جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا)

اور میں پتھرا جانے کے خوف سے بند آنکھوں پر ہاتھ بھی رکھ لیتا ہوں۔

وہ بڑی ملائمت سے میری آنکھوں پر سے میرے ہاتھ ہٹاتی ہے اور تب ہی میری اس سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔

اس کی غزالی آنکھوں سے روشنیاں طلوع ہوتی ہیں۔

میں پتھر نہیں ہوتا بلکہ میں تو مسلسل پگھلتا جاتا ہوں۔ خوشبوئیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ ایک عجیب سی لذت کا احساس جاگتا ہے۔ میں بے سبب اس سے خائف رہا۔ میں بھرپور نظروں سے اسے دیکھتا ہوں اور روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور اس کے جسم سے میری روح میں اتر کر رقص کرنے لگتی ہیں۔

میں اس نئے تجربے کی لذت میں گم ہوں۔

مجھے زندگی کا یقین ہونے لگتا ہے۔

وہ بھی خوش ہے مگر اس کی خوبصورت آنکھوں سے ایک انجانی اداسی جھلک رہی ہے۔

''ہم مردہ کیڑے نہیں ہیں۔ ہم زندگی کے گواہ ہیں۔ کم از کم تم اور میں''

میری بات سن کر وہ کچھ اور اُداس ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

شہنائیوں کی دُھن سے میرا وجود سن ہوتا جا رہا ہے۔

چہرے کے علاوہ مرا باقی جسم پتھر ہو گیا ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جس میں میں نے اپنے اور اس کے بچپن میں پانی میں آگ کا کھیل کھیلا تھا۔ وہ ابھی تک پانی میں آگ کو دیکھنے کے بعد مجھے حیرت سے دیکھ رہی ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جب روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور جسم سے اُتر کر میری روح میں رقص کرنے لگی تھیں۔

اس کی ڈولی روانہ ہونے والی ہے اور میں اپنے کہے لفظوں کی تردید کرتا ہوں:

''اس نے سچ کہا تھا۔ ہم سب مردہ کیڑے ہیں جو قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں متحرک ہونے کے سبب زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

اب مجھے اس کی انجانی اداسی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔

میرا چہرہ بھی پتھر ہونے لگتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میرا سارا چہرہ پتھر ہو جائے اس کے جسم سے میری روح میں اترنے والی خوشبوئیں میری سانسوں میں جم کر مشک کافور کی کئی ٹکیاں سی بن جاتی ہیں۔ اس کی غزالی آنکھوں سے طلوع ہونے والی روشنیوں سے ان میں آگ لگتی ہے اور پھر میری آنکھوں کے پانی میں آگ تیرنے لگتی ہے۔ اور میں اس پانی میں ڈوب کر اور اس آگ میں جل کر خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی آخری کوشش کرنے لگتا ہوں۔

تا کہ زندگی کا کچھ تو بھرم رہ جائے!

☆☆☆

روشنی کی بشارت کے افسانے

جوگندر پال

اگر کسی شخص کا چہرہ اس کے طبع زاد نقوش میں رچا بسا سا لگے اور اس کی شبیہ اور حرکات و سکنات پر کسی مصنوعی ڈیزائن کا گمان نہ گزرے تو اس سے مانوس ہوتے ہوئے کسی تامل کا احساس نہیں ہوتا۔ حیدر قریشی سے مل کر، اس سے بات چیت کر کے یا اسے پڑھ کر بھی ہم جھٹ ہی اس سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اس سے مل کر واقعی ہمارا اسی سے ملنا ہوتا ہے۔ اپنے اس بیان سے مجھے حیدر قریشی کی کوئی خارجی شناخت ٹھہرانا مقصود نہیں۔ وہ تو جیسے بھی ہے ویسے ہی ہمارے سامنے ہے۔ مجھے تو خارج کے شواہد میں مضمر اس کے ان امکانات کی ٹوہ ہے جن کی بدولت اس کی روشنی کی بشارت ناقابل یقین معلوم نہیں ہوتی۔ حیدر قریشی کے اس افسانوی مجموعے "روشنی کی بشارت" میں تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ تیرہ مختلف وارداتیں اسے ایک ہی راستے پر پیش آئی ہیں۔ ایک جادہ مستقیم، جہاں یکساں موسم ہیں، زمین اور آسمان کے ویسے ہی خطوط، وہی جھاڑ، جانور، پنچھی اور انسان، اور ان کی بود و باش کا وہی تلمیحی اور تمثیلی انداز، جس کے باعث زندگی پر داستان کا گمان ہونے لگے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ حیدر قریشی کے اس مخصوص ماحول میں جسے جہاں جو کچھ بھی پیش آتا ہے اسے وہاں وہی کچھ پیش آنا عین فطری معلوم ہوتا ہے۔ افسانوں میں واقعیت کا باب دراصل انہی کے سیاق و سباق سے منسوب ہوتا ہے۔ کوئی واقعہ یا کردار از خود جھوٹا یا سچا نہیں ہوتا۔ اس کی سچائیاں--- جزئیاتی سچائیاں بھی۔۔۔۔ کسی افسانے کی ایک خاص سچویشن سے وابستگی کے پیش نظر برمحل ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ سوال قطعی طور پر غیر اہم ہے کہ کیا رامائن کا رام چندر سچ مچ کا کوئی شخص تھا یا محض کوئی افسانوی کردار، یا کیا راون کے واقعی دس سر تھے

۔ اہم صرف یہ ہے کہ رام چندر رامائن کا ایک زندہ کردار ہے اور کہ راون کے دس سر نہ ہوتے تو وہ اپنا آپ لگنے کی بجائے کوئی اور معلوم ہوتا۔ زندہ کردار کتابوں میں ہو بہو ویسے ہی سانس لیتے ہیں اور واقعتاً ہوتے ہیں جیسے زندہ لوگ اپنی بستیوں میں زندگی کرتے ہیں۔

افسانہ نگار کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے کردار زندگی کر کر کے اپنی کہانیاں بناتے ہوئے محسوس ہوں اور ان کہانیوں کے تناظر میں اگر پانی میں آگ لگنا یا انسانی وجود کا پتھرا جانا ہی تخلیقی طور پر صحیح ہو تو ایسے سانحات کو انہونا قرار دے کر ان سے ہاتھ نہ کھینچ لیا جائے۔ ایسا کرنا افسانوی واقعیت کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔ حیدر قریشی کے یہاں ایمان کا کراماتی عمل کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ ایمان زندہ رہے تو معجزوں کا رونما ہوتے چلے جانا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ حیدر قریشی کے ایمان کی توانائی اسے انہدام کی ہیبت سے محفوظ رکھتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے انہدام کے انہدام کا پورا یقین ہے اور اس قیامت کا نظارہ کرنے کے لئے وہ اپنی آنکھیں وا کئے ہوئے ہے۔ ہر چہ بادا باد!

موجودہ آدمی بے چارہ اسی لئے اتنا ہراساں ہے کہ اپنی چھوٹی چھوٹی سہولتی اور نجی دلائل کی بھیڑ میں کھو کر وہ خود پارسا ہو کر رہ گیا ہے اور المناک مضحکہ خیزی سے اس ہمہ گیر زندگی بخش منطق کی بے ضمیر نفی پر تل گیا ہے جس سے بے ریا اجتماعی رفاقتوں کو تقویت پہنچی ہے۔ نمرود کا انکار فی الحقیقت اس کی ہراساں ذہنی کیفیت کا ہی آئینہ دار ہے۔ متوازی خدائیوں کے دعوے دار اپنی بوکھلاہٹوں کے محاصرے میں بالآخر خود آپ ہی اپنی تباہی کا سامان کر لیتے ہیں اور پھر کہیں روشنی کا ہالہ نمودار ہوتا ہے اور از سرِ نو منہدم زندگی کے وجود سے گزر کر ایک خوبصورت تر دور کی ابتداء کی بشارت دیتا ہے۔ "اب بتاؤ کہ تم دونوں رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے"۔

گناہ کو جب تک جرم قرار نہ دیا جائے، ہم اس سے باز نہیں آتے، حالانکہ صرف ہمارے گناہوں کی سزا میں قدرت ہمارے وجود کو ہی سمیٹ کر زنداں منتقل کر دیتی ہے جہاں پنجوں پر کھڑے ہو ہو کے بھی ہم ایک اپنی آنکھوں کے روزن تک نہیں پہنچ پاتے کہ باہری وسعتوں کو روح

میں اتار لیں نئے آدمی نے بہ فخر انانیت کو اپنی تربیتوں میں روا رکھا ہے اور اوروں کے دلوں میں بسنے کا خواہشمند ہونے کی بجائے اپنے دل کو بھی خون صاف کرنے کی مشین سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے اور سر سے پاؤں تک لڑھک لڑھک کر ہی ساری عمر بِتا دی ہے۔ ان حالات میں اسے محبت اور سپردگی کے ان کرشموں کا عرفان کیونکر ہو جن کی بدولت وہ کسی حقیر سے حقیر انسان کی بہبود کو اپنی ہی بہبود اور بقا کے اسباب پر محمول کرے۔ " تساں بادشاہ ہواساں کوں غریبی" کی طاعت جھیل کر ہی ہم بے لاگ محبتوں کے دروازوں پر پہنچ پاتے ہیں اور یہی دروازے وسیع تر زندگی کی جانب کھلتے ہیں۔

حیدر قریشی اسی وسیع تر زندگی کی دریافت کے لئے اپنی کہانیاں تخلیقتا ہے۔ اپنے اس کھلے کھلے راستے کو طے کر کے اسے دور یا نزدیک کسی شیشے کے محل میں اقامت نہیں اختیار کرنا ہے، بلکہ راستوں سے راستوں تک پہنچنا ہے اور ہر راستے پر تباہ حال زندگی کی باز آبادکاری کئے جانے ہے۔ وہ لکھ لکھ کر گویا کچھ بیان نہیں کر رہا ہوتا، بلکہ اپنے لکھے ہوئے کو کر رہا ہوتا ہے اور اسے ایسا کرتے ہوئے پا کر بے لوث انسانی رشتوں پر باور کر لینا غیر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقات میں تاکید اور اصرار کے عناصر کا شاید یہی جواز ہے کہ وہ تحریر کو بے ضرر آرائشوں کی حدود سے باہر لا کر اسے کارکردگی کا فعال ذریعہ بنا لینا چاہتا ہے۔ ایسی ہی تخلیقی شرکتیں گنجان ہو کر آخر کسی دیرپا آہنگ کی پیامبری کی اہل ہو جاتی ہیں۔

میں نے مندرجہ بالا سطور میں لکھا ہے کہ حیدر قریشی کو اپنی ساری وارداتیں اپنے جادۂ مستقیم پر پیش آئی ہیں۔ ایسا نہیں کہ سیدھے راستوں پر کوئی موڑ واقع نہ ہوں۔ اس مجموعے کی کئی کہانیوں میں راستے کہیں تمثیلی باریکی اختیار کر کے اور کہیں اچانک داستانوی پھیلاؤ میں بے ساختہ بل کھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور انہیں اس طرح مڑتی ہوئی سیدھ میں دیکھ کر دھیان بے اختیار دلوں کی گزرگاہوں کی طرف ہو لیتا ہے۔ "روشنی کی بشارت" کے آبادکار کی بے چینیاں گواہ ہیں کہ ابھی اسے کہانیوں کے کئی اور شہروں کو منور کرنا ہے۔ مجھے ابھی سے انتظار ہے کہ میرا ان روشن بستیوں میں بھی خوب گھومنا پھرنا ہو۔

☆☆☆

تاثرات

ڈاکٹر وزیر آغا: پتھر ہوتے وجود کا دکھ "بہت عمدہ افسانہ ہے۔ اگر آپ اسی رفتار اور انداز سے آگے بڑھتے رہے تو بہت جلد صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگیں گے"۔

ڈاکٹر قمر رئیس:" کہانیاں علامتی ہیں لیکن معاصر جدید کہانیوں سے الگ اور انوکھی۔ یہاں تاریخ گنگناتی ہے۔ انسانی تہذیب سرگوشیاں کرتی ہے اور ان کی کوکھ سے آج کے جلتے ہوئے مسائل پھنکار مارتے نکلتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ پرکشش کہانیاں جو سوچنے پر اکساتی ہیں"۔

ڈاکٹر انور سدید:" حیدر قریشی بظاہر ادب کی کئی اصناف میں ایک طویل عرصے سے بڑی پختہ کاری سے تخلیقی کام کر رہے ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ افسانے کے دیار میں قدم رکھتے ہیں تو فطرت اپنے اسرار کی گتھیاں ان پر بانداز دگر کھولتی ہے۔ "روشنی کی بشارت" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے لیکن وہ نئے افسانہ نگار نہیں۔ ان کا شمار ساتویں دہے کے ان افسانہ نگاروں میں کرنا مناسب ہوگا جو تجریدیت سے معنی کا نیا مدار طلوع کرتے اور سوچ کو نئی کروٹ دیتے ہیں۔ "روشنی کی بشارت" کے افسانوں میں حیدر قریشی کرنوں کے تعاقب میں سرگرداں نظر آتا ہے لیکن جب اسے سدھارتھ کا معصوم چہرہ نظر آجاتا ہے تو اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس کل جگ میں زندہ رہنے کا جواز موجود ہے۔

ڈاکٹر حمید سہروردی: حیدر قریشی کے افسانے پریم چند اور یلدرم کے اسلوب و مزاج کی آمیزش اور آویزش سے اپنا ایک نیا افسانوں مزاج اور ڈکشن تیار کرتے ہیں۔ ان کا تجربہ ہم سب کا تجربہ بن جاتا ہے۔ ان کی بصیرت تیز اور روشن ہے اور وہ افسانے کی میڈیم سے روزمرہ زندگی کے انگنت تجربوں کو کچھ اس طرح سے گرفت کرتے ہیں کہ زبان وقلب سے بے ساختہ حیرت اور استعجاب کے کلمات ادا ہوتے ہیں۔ حیدر قریشی اپنے رنگ ومزاج کو اپنے ہر افسانے میں افسانوی زبان کے تخلیقی واکتسابی امتزاج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کی خوبی نہ صرف ڈکشن میں ہے بلکہ موضوعات کے برتاؤ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

میں ذاتی طور پر حیدر قریشی کو جدید تر افسانوی میدان میں کامیاب وکامران سمجھتا

ہوں۔ ان کا یہی انداز توازن وتناسب کے ساتھ برتا جائے تو وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھیں گے اور وہ حضرات جو جدید اور جدید تر افسانے کے باب میں شاکی ہیں اطمینان حاصل کر لیں گے"۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی:" حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بیشتر کہانیوں میں میجر کردار خود کہانی کار کی ذات ہوتی ہے اور اس طرح حیدر قریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر رائے بھی دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

حیدر قریشی کی کہانیاں زمینی زندگی کے معمولی واقعات سے شروع ہوتی ہیں جنہیں فلو بیر کے لفظوں میں SLICES OF LIFE کہا جاسکتا ہے مگر ان میں جلد ہی مذہبی، عقیدتی اور رحانی رنگ بکھرنے لگتا ہے اور ان کی اٹھان عمودی ہو جاتی ہے۔ پھر ان کہانیوں کی فضا زمین اور آسمان کے بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اکثر کہانیوں کا اسلوب داستانی معلوم ہوتا ہے لیکن لہجہ کا دھیما پن، علامتوں، تمثیلوں اور تلازمے کا استعمال انہیں داستانی رنگ سے الگ بھی کرتا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی عقائد کا اظہار بھی ہوتا ہے مگر جمالیاتی طور پر ان میں نہ کوئی خطابیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کسی آئیڈیل یا انفرنل دنیا میں داخل ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔ حیدر قریشی کی کہانیوں میں زبان اور حوالہ جات اس وقت، زمانے اور علاقے کی حدوں کا تاثر ضرور دیتے ہیں جب اور جہاں ان کی کہانیوں نے جنم لیا کیونکہ اس سے کسی تخلیق کار کو مفر نہیں، لیکن ان کہانیوں کا مجموعی سپکٹرم زمان اور مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے کا قاری ان کہانیوں میں امکانی سچائی دیکھ سکتا ہے"۔

اکرم محمود (امریکہ): آپ کے پانچ افسانے پڑھے ہیں۔ کیا بات ہے۔ بتا نہیں سکتا کہ کیسا لطف آیا۔ بلا مبالغہ بار بار ایسا محسوس ہوا کہ کسی کیفیت نے میرے پورے جسم کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ افسانہ ختم ہونے پر بھی یہ گرفت ختم نہیں ہوئی۔

☆☆☆

''پس کہانیاں کہتے رہو کہ لوگ کچھ تو سوچ بچار کریں''

قصّے، کہانیاں

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

سرورق ڈیزائن: ارشد خالد

قصّے کہانیاں کا ای بک ایڈیشن

کتاب ''قصے کہانیاں'' پہلی بار ''**افسانے**'' کے نام سے شائع ہونے والی کتاب میں شامل تھی۔ ''**افسانے**'' میں **روشنی کی بشارت** اور **قصے کہانیاں** دونوں مجموعے ایک ساتھ شائع کیے گئے تھے۔

یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کی۔ اس کے بعد **قصے کہانیاں** دوسری بار ''**عمرِ لاحاصل کا حاصل**'' کے پہلے اور عوامی ایڈیشن مطبوعہ ۲۰۰۵ء میں شامل ہوئی۔ اسے بھی معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا تھا۔ تیسری بار یہ کتاب ''**عمرِ لاحاصل کا حاصل**'' کے لائبریری ایڈیشن میں ۲۰۰۹ء میں شامل رہی۔ یہ ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا تھا۔ اس ایڈیشن میں **روشنی کی بشارت** کے ۱۳، اور **قصے کہانیاں** کے ۱۲ افسانوں کے ساتھ ان مجموعوں کے بعد کے دو افسانے بھی شامل تھے۔ اور اب ۲۰۱۴ء میں میری تخلیقی نثر کے چھ مجموعے ایک ساتھ شائع ہو رہے ہیں تو اس میں افسانوں کے دونوں مجموعوں کے (۱۳+ ۱۲) ۲۵، افسانوں کے بعد کے تین افسانے بھی شامل کر دیئے ہیں۔

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

انتساب

اپنے پردادا حضور

میاں میر محمد قریشی گڑھی اختیار خاں والے

اور اپنے دادا جی

میاں اللہ رکھا قریشی کے نام

"اللہ کو اسی طرح یاد کرو جیسے اپنے
باپ دادوں کو یاد کرتے ہو۔
بلکہ اس سے بھی زیادہ۔۔۔۔"

اپنے اُن دیکھوں کی سوچوں میں گھرا رہتا ہوں میں
اُن کی آنکھیں، اُن کے چہرے، سوچتا رہتا ہوں میں

ترتیب

دونوں مجموعوں کے بعد لکھے گئے افسانے

کاکروچ

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی
زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی

''ایٹمی جنگ کے متوقع خطرات کے پیش نظر میں نے ایٹمی جنگ کے بعد انسان کے حوالے سے ایک کہانی سوچی ہے۔''

نصیر حبیب نے میری بات کو دلچسپی سے سنا اور کہا: ''کہانی کا خیال سناؤ''۔ لیکن اسی دوران مسعود شاہ بول اُٹھا۔ ''یار! تم اب تک اسی موضوع پر پہلے ہی دو کہانیاں لکھ چکے ہو۔ اس موضوع کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ لگتا ہے ایٹمی جنگ کرا کے ہی رہو گے''۔ مسعود شاہ اپنے مزاج کے لاابالی پن کے باعث جو منہ میں آئے بول دیتا ہے۔

''کہانی کا خیال سناؤ!'' نصیر حبیب نے پھر پہلے لہجے میں کہا۔

''چلو یار! اب کہانی سنا بھی چکو'' مسعود شاہ نے بے زاری کے ساتھ جیسے نصیر حبیب کا ساتھ دیا۔

''اس کہانی کا آغاز ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان سے ہوتا ہے۔ میں اور ایک عورت اس جنگ میں معجزانہ طور پر بچ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مل کر اس زمین پر آدم اور حوا کی نئی کہانی شروع کرتے ہیں۔ میں نہ صرف صاحبِ اولاد ہو گیا ہوں بلکہ میری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہو گئی ہے۔ تاہم کرۂ ارض پر ہماری حالت ایسے ہی ہے جیسے انسان ابھی ابھی غار کے زمانے سے نکل کر

جنگل میں جھونپڑے بنا رہا ہے۔ میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں نہیں جانتے کہ انسان کیسی عظیم تر ترقیات کے دور سے نکل کر جنگل کے دور میں آ گیا ہے‘‘

میں دیکھتا ہوں کہ نصیر حبیب ہی نہیں مسعود شاہ بھی میری کہانی کو سنجیدگی سے سن رہا ہے۔

’’ایک دن میرے پوتوں، پوتیوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں انہیں عام معمول سے ہٹ کر کوئی انوکھی سی کہانی سناؤں۔ تب میں انہیں اپنے ترقی یافتہ دور کے حالات بتانے لگتا ہوں۔

’میرے پیارے بچو! یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ اس کے باوجود کہانی سے زیادہ دلچسپ اور المناک ہے۔ آج سے چند عشرے پہلے سارے دنیا ہم جیسے انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔ انسان کو دنیا میں ہر طرح کی نعمتیں میسر تھیں۔ سفر پر جانا ہوتو کار سے لے کر ہوائی جہاز تک کی سہولتیں موجود تھیں۔‘

’دادا ابو! یہ کار اور ہوائی جہاز کیا ہوتے تھے؟‘

میری پوتی نے سوال کیا تو مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ کار ایک سواری تھی جس میں چار پانچ آدمی بیٹھ جاتے۔ اسے صرف ہینڈل کرنا ہوتا تھا وہ خود ہی سواریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی۔ یہاں سے دریا کے کنارے تک کا جو فاصلہ ہم آدھے دن میں طے کرتے ہیں۔ کار ہمیں پل بھر میں وہاں پہنچا دیتی تھی۔

بچوں کے چہروں سے تجسس اور دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

’اور دادا ابو ہوائی جہاز؟‘۔ میرے پوتے نے پوچھا۔

’ہوائی جہاز بہت بڑا ہوتا تھا۔ اس میں کئی سو افراد بیٹھ جاتے تھے تو وہ انہیں اتنی دور تک پہنچا دیتا جتنی دور تم اپنی ساری زندگی میں بھی نہیں جا سکو گے۔ اور ہاں۔ ہوائی جہاز پرندوں کی طرح اُڑ کر جاتا تھا۔ دریاؤں اور پہاڑوں کے بھی اوپر سے گزر جاتا تھا۔‘

میری بات سن کر بچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

’دادا ابو اور کیا ہوتا تھا آپ کے زمانے میں؟‘ اس بار میرے پوتے کے لہجے میں شرارت کی چمک تھی۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بتانے لگا اُس زمانے میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، فیکس...‘

’دادا ابو! یہ ریڈیو کیا ہوتا تھا؟‘

’یہ ایک چھوٹا سا بکس ہوتا تھا۔ اس کے بٹن گھمانے سے کبھی گیت سنائی دیتے۔ کبھی ساری دنیا کی خبریں، کبھی لوگوں کی گفتگو۔‘

’اور ٹیلی ویژن ؟‘

’ریڈیو والی ساری چیزیں ٹیلی ویژن پر سنائی بھی دیتی تھیں اور دکھائی بھی دیتی تھی۔ یعنی اگر کوئی آواز آرہی ہے تو اس کا چہرہ بھی دکھائی دیتا اور وہ شخص ہماری طرح ہی چلتا پھرتا اور بولتا نظر آتا تھا۔‘

ننھے منے معصوم بچوں نے میری بات سن کر اتنے زور سے قہقہے لگائے کہ میں خفیف سا ہو گیا۔ وہ مجھ سے پہلے زمانے کی اور دلچسپ باتیں سننا چاہتے ہیں مگر میں کہتا ہوں۔ پیارے بچو! میں اب تھک گیا ہوں اس لیے باقی باتیں کل سناؤں گا۔

پھر میں ان کے جھونپڑے سے نکل آتا ہوں۔ جھونپڑے سے باہر آ کر یونہی خیال آیا اور میں رُک کر بچوں کی آوازیں سننے لگا۔ میرا ایک پوتا کہہ رہا تھا: ’دادا ابو زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے اچھی اچھی کہانیوں کو اپنے زمانے کے واقعات سمجھنے لگ گئے ہیں۔‘

میرے باقی سارے پوتے پوتیاں اس کے تبصرے کی تائید میں ہنس رہے تھے۔‘‘

میں نے کہانی ختم کی تو مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ’’یار! اگر جنگ میں صرف تم اور ایک عورت ہی بچتے ہو تو بچوں کی شادیاں کیسے کیں؟ کیا پھر بہن بھائیوں کی شادیاں کرادیں؟‘‘

’’اگر آپ کو اس میں الجھن محسوس ہوتی ہے تو جنگل کے قریب دریا کے کنارے پر ایک اور مرد، عورت بھی جنگ سے بچا دیتا ہوں‘‘ میں نے وضاحت کی۔

’’یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تو کہانی لکھتے وقت خود اپنی راہ بناتی جائیں گی۔ میں ایک اور اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں‘‘ نصیر حبیب نے سنجیدگی سے کہا ’’ایٹمی جنگ کے بعد سطح زمین پر کسی انسان کا زندہ بچ رہنا سائنسی طور پر ممکن نہیں۔ اس لئے بچ رہنے والوں کو آپ کس بنیاد پر

بچا رہے ہیں؟''

''میری کہانی بنیادی طور پر فکشن ہے، اسے آپ سائنسی مضمون تو نہ سمجھیں'' میں نے نصیر حبیب کے اعتراض کے جواب میں کہا۔

''میں تو فکشن کی اہمیت کا معترف ہوں'' نصیر حبیب نے متانت سے کہا'' بلکہ میرے نزدیک سائنس کی بنیاد بھی فکشن پر ہے۔ ہر نیا سائنسی انکشاف پہلے فکشن ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے جو نکتہ اٹھایا ہے پہلے مجھے اس کی تفصیل بیان کر لینے دیں۔''

میں تو نصیر حبیب کی تفصیل سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا ہی۔ مسعود شاہ بھی خلاف توقع سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''سطح زمین پر ایٹمی جنگ کی صورت میں کوئی ذی روح مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔ صرف وہ مخلوق زندہ رہ سکتی ہے جس میں Nuclear Poison ہو۔ کیونکہ صرف یہی Element ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے۔ مثلاً Lead ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے لیکن اگر انسانی خون میں Lead شامل ہو تو پھر اسے ہلاک کرنے کے لئے ایٹمی جنگ کی بھی ضرورت نہیں، انسان ویسے ہی مر جائے گا''

آپ کا مقصد یہ ہے چونکہ انسانی خون شریانوں میں ہوتا ہے اس لیے اس کی موت واقع ہو جائے گی لیکن بعض ذی روح ایسے ہیں کہ ان کے ہاں شریانوں والا سسٹم نہیں ہے مثلاً مکھی کے جسم میں خون کی الگ تھیلی ہوتی ہے، اس لئے اگر اس کے جسم میں Nuclear Poison ہو تو اس کی موت واقع نہیں ہوگی''

میری بات سن کر نصیر حبیب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''آپ کی کہانی اب بنے گی۔ مکھی کی جگہ کاکروچ لے لیں۔ فرض کر لیں کہ کاکروچ کے وجود میں بھی ایسا سسٹم ہے کہ تابکاری اثرات اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ الٹا اس کی Growth کرتے ہیں۔ لہٰذا ایٹمی جنگ کے بعد سارے ذی روح مر جائیں گے سوائے کاکروچ کے۔ اور تابکاری اثرات سے جب ان کی Growth ہوگی تو آنے والے زمانے میں اس زمین کے حکمران اور مالک یہی کاکروچ ہوں گے جو انسانی قد کے

برابر ہو جائیں گے''۔

نصیر حبیب کی کہانی سن کر مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ٹھہریں!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے کہا'' کہانی تو ہزاروں سال پہلے بن چکی ہے''

نصیر حبیب نے مجھے الجھے ہوئے انداز سے دیکھا۔

''دوستو! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں''

''کیا؟'' نصیر حبیب اور مسعود شاہ کی آوازوں میں گھبراہٹ تھی اور پھر وہ اس طرح اپنے آپ کو دیکھنے لگے جیسے واقعی کسی پرانے زمانے کے کاکروچ ہوں۔

☆☆☆

روشن نقطہ

طور سے بڑھ کے اپنا حال ہوا
صرف اک بار من میں جھانکے تھے

''میں محبت کیا ہارا، دین اور دنیا بھی ہار گیا''
پیر سائیں نے میری بات سن کر مجھے غور سے دیکھا:
''محبت میں ہار جیت کوئی معنی نہیں رکھتی'' پیر سائیں کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی ''لیکن پہلے اپنا قصہ سناؤ''
''وہ مجھے چاہتی ہے۔ میں بھی اسے چاہتا ہوں مگر وہ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہے اور جان بوجھ کر بھٹکتی پھر رہی ہے''
''مجھے وہ خاصی ذہین لگتی ہے۔ جان بوجھ کر بھٹکنے والے لوگ غیر معمولی ہوتے ہیں'' پیر سائیں بھی شاید اس کے چاہنے والے نکلے۔
''محبت کی شدت کے باوجود اس نے آج تک حجاب قائم رکھا ہے'' میں نے اذیت کے ساتھ کہا۔
''**المحبة حجاب بين المحب والمحبوب**۔ محبت خود محبوب اور محبّ کے درمیان پردے کا نام ہے'' پیر سائیں نے آنکھیں موند کر عالم استغراق سے کہا۔
''اگر محبت خود پردہ ہے تو پھر یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟'' میں نے پیر سائیں سے سوال کیا۔
''پردہ ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے۔ اگر یکتائی کے سفر راست طور پر کئے جائیں تو سارے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔''

''پیر سائیں! مجھے وہ سفر بتائیں۔ میں پھر سے اپنا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا چاہتا ہوں''
میں نے ادب کے ساتھ درخواست کی۔
پیر سائیں نے گہری سانس لی اور بولے:
''محبت کے چار سفر ہیں۔ کامیابی کے لئے یہ سفر ضروری ہیں
محبّ سے محبوب کی طرف۔ محبوب سے محبّ کی طرف
محبّ سے محبّ کی طرف۔ محبوب سے محبوب کی طرف''
''پیر سائیں! کیا ان اسفار کے بعد گوہرِ مقصود مل جاتا ہے؟''
میں نے خوشی کے ساتھ سوال کیا۔

پیر سائیں نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے پھر ادب کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔ پیر سائیں نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ میں نے نظر اٹھا کر پیر سائیں کی طرف دیکھا۔ ان کا گلا رندھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور شدتِ غم سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پیر سائیں بھی محبت ہارے ہوئے تھے۔
''اللہ اکبر'' پیر سائیں کے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے ایک فقیر نے نعرہ لگایا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پیر سائیں نے بھی اسے حیرت سے اس طرح دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ اب وہ اپنی غم کی حالت پر بھی قابو پا چکے تھے۔
''پیر سائیں! آپ تو شاید صرف محبت ہارے ہوئے ہیں مگر میں تو دین وُ دنیا بھی ہار چکا ہوں''
''دین کو سمجھنے کے لئے دنیا کو سمجھنا ضروری ہے۔ تمام عوالمِ الٰہی کو سمجھ کر ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔''
''مگر مجھے تو کسی نتیجے کا انتظار نہیں۔ میں تو اپنی بازی ہار چکا ہوں'' میں نے مایوسی سے کہا۔
''محبت کے اسفار کی طرح عوالم الٰہی کو بھی چار حصّوں میں بیان کیا جا سکتا ہے''
پیر سائیں نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا
''یوں تو عوالمِ الٰہی لامتناہی ہیں مگر اپنی سہولت کے لئے ہم نے انہیں چار حصّوں میں تقسیم کر

رکھا ہے''۔

''پیر سائیں۔ میں اپنی دنیا ہارنے کی بات کر رہا ہوں، آپ کون و مکان کی باتیں فرما رہے ہیں'' میں نے پھر پیر سائیں کو اپنے مسئلے کی طرف لانے کی کوشش کی۔ مگر بے سود!

''پہلا عالم، عالمِ زمان ہے۔ یہ ایسا عالم ہے جس کی اِبتدا اور اِنتہا دونوں ہیں۔

دوسرا عالم، عالمِ دہر ہے۔ اس عالم کی ابتدا معلوم مگر انتہا نا معلوم ہے۔

تیسرا عالم، عالمِ سرمد ہے۔ اس کی ابتدا بالکل نظر نہیں آتی مگر انتہا سمجھ میں آتی ہے۔

چوتھا عالم، عالمِ ازل ہے۔ اس کی نہ ابتدا کا پتہ ہے نہ اِنتہا کی خبر ہے''

پیر سائیں چاروں عوالم بیان کر کے تھوڑا سا رُکے اور پھر بولے:

''اب بتاؤ تم کونسی دُنیا ہارے ہو؟''

مجھے پیر سائیں کی پہلی بات کی سمجھ آ گئی۔ ''دین کو سمجھنے کے لئے دنیا کو سمجھنا ضروری ہے۔'' واقعی ان دنیاؤں میں تو سب کچھ ہی آ گیا ہے اور میں اپنا آپ ہار چکا ہوں۔

''حضرت! کیا یہ وہی چار عوالم ہیں جنہیں لاہوت، جبروت، ملکوت اور ناسوت بھی کہا جاتا ہے؟''

''ہاں۔ یہ وہی دنیائیں ہیں۔ محبت کے چاروں اسفار ہوں یا عوالمِ الٰہی کے اسفار ہوں۔ طے ہونے پر آئیں تو ایک ہی جست میں طے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ سفر شروع کرنے سے پہلے طے ہو جاتے ہیں۔ اور طے نہ ہوں تو آدمی ساری زندگی چکراتا پھرے۔ بھول بھلیاں میں ہی رہے گا۔''

میں نے پیر سائیں کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہاں گہرے کرب کے آثار نمایاں تھے۔ لاحاصلی کا دکھ اپنے آپ ظاہر ہو رہا تھا۔ مجھے پیر سائیں بھی بھول بھلّیاں میں چکراتے نظر آئے۔

''اللہ اکبر''

مجذوب فقیر نے پھر نعرہ لگایا اور مجھے محسوس ہوا کہ پیر سائیں اس بار گھبرا گئے ہیں۔

''پیر سائیں! اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟''

مجھے بھی مجذوب فقیر سے کچھ خوف محسوس ہونے لگا۔

''توحیدِ خداوندی پہ کامل ایمان'' پیر سائیں نے مجذوب فقیر کو دیکھ کر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''تو پھر مجھے توحید کا بھید سمجھا دیں''

''توحید کا بھید!'' پیر سائیں کی آواز لرزی ''تم نے سنا نہیں۔ جو توحید کے بارے میں سوال کرتا ہے وہ جاہل ہے۔ اور جو کوئی جواب دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ مشرک ہے کیونکہ 'بے مثال' کے بارے میں بتانے کے لئے اسے کسی مثال کا سہارا لینا پڑے گا'' پیر سائیں کی لرزتی آواز اب جوش سے بھرنے لگی تھی۔ ''اور جو توحید کی معرفت کا دعویٰ کرے وہ ملحد ہے کیونکہ خدا لامحدود ہے اس لئے اس کا عرفان کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتا اور۔ جو توحید کو نہ سمجھے وہ کافر ہے'' پیر سائیں کے بیان سے میں جھومنے لگا۔

مجذوب فقیر نے بھی الا اللہ۔ الا اللہ کی صدائیں بلند کیں۔

''سائیں پھر تو ساری بات ایک الف پر ہی تمام ہوتی ہے'' مجھے بلھے شاہ یاد آ گئے۔

''تم نے الف سے آگے کا سبق نہیں پڑھا۔ الف بھی زیادہ ہے''

اس دفعہ پیر سائیں کی بجائے مجذوب فقیر بولا اور مجھے یوں لگا جیسے بھونچال سا آ گیا ہے۔ پیر سائیں بھی اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''علم ایک نقطہ ہے جسے جاہلوں نے بڑھا دیا ہے'' مجذوب فقیر اپنی لے میں بولا ''الف تو بہت زیادہ ہے۔ بات ایک نقطے میں تمام ہو چکی ہے۔''

پیر سائیں، مجذوب فقیر کی بات سن کر تڑپے اور بے ہوش ہو گئے۔

دور کہیں سے بلھے شاہ کی کافی گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اک نقطے وچ گل مُکدی اے.....

پیر سائیں اور مجذوب دونوں ایک نقطے میں ڈھل گئے تھے۔

اس نقطے سے عجیب سکون بخش روشنی پھوٹ رہی تھی۔

اور یہ روشنی میرے دل سے پھوٹ رہی تھی!

☆☆☆

دو کہانیوں کی ایک کہانی

مشینوں کے اس عہدِ ناروا کا میں ہی یوسف ہوں
مجھے اس نوکری کی شکل میں نیلام ہونا تھا

بچپن میں جب میں نے پہلی بار الٰہ دین کے چراغ والے جن کی کہانی سنی تھی تو جن کا نام سن کر ڈر جانے کے باوجود مجھے کہانی اچھی لگی تھی۔ آج کارخانے کی چمنی سے اٹھتے ہوئے گہرے سیاہ دھوئیں کو دیکھ کر میں نے سوچا ہے کہ ابھی اس میں سے ایک جن نمودار ہوگا اور میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر درخواست کرے گا۔ ''کیا حکم ہے میرے آقا۔۔؟''
اور پھر میرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ میرے چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ لیکن جن کی بجائے سامنے سے کارخانے کا سخت دل اور کرخت زبان مالک آ جاتا ہے۔ میں خوفزدہ ہو کر وہاں سے ہٹ جاتا ہوں۔

☆☆

شاہ جی سے ایک دفعہ ''منطق الطیر'' کے مسئلے پر بات ہوئی تو انہوں نے بُل اور بُلبُل کی ایک دن کی زندگی کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا پورا احوال سنا ڈالا۔ بعض جانوروں سے لے کر درختوں اور پودوں تک سے اپنی بات چیت کی کہانیاں سنا دیں۔ میں شاہ جی کا بہت احترام کرتا ہوں اس لئے ان کی باتوں کا یقین نہ کرنے کے باوجود چپ ہو رہا۔ شاہ جی میری خاموشی کو بھانپ گئے۔ اسی لمحے روشنی کا چھناکا سا ہوا اور عجیب سا نُور چاروں طرف بکھر گیا۔

میں نے دیکھا شاہ جی کی کلائی پر ایک مچھر آن بیٹھا ہے لیکن یہ مچھر محض مچھر نہیں تھا۔ وہ واضح طور پر ایک بوڑھا ڈاکٹر لگ رہا تھا جس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں سرنج لئے وہ شاہ جی کو انجکشن لگانے کے لئے ذرا سا جھکا۔
''جناب والا! کیوں مجھ غریب کے درپے ہیں؟ شاہ جی نے بڑی ملائمت کے ساتھ مچھر سے کہا۔
''یہ میری ڈیوٹی ہے جناب'' مچھر نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''لیکن جناب! میں زیادتی خون کا مریض نہیں ہوں'' شاہ جی نے کہا۔
''میں نے ایک قطرہ کا پتہ نہیں کتنا حصہ خون لینا ہے۔ کیا فرق پڑے گا اس سے.....'' مچھر نے کسی شفیق ڈاکٹر کی طرح مسکراتے ہوئے کہا، اپنی عینک کو ماتھے پر چڑھایا اور پھر کلائی کی طرف جھکتے ہوئے بولا'' اور ہاں...... یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ معمولی سا خون لینے کے عوض میں ایک ایسا مادہ بھی خارج کرتا ہوں جو آپ کے اندر فالج کے حملے کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرتا ہے'' اتنا کہہ کر مچھر نے شاہ جی کو انجکشن لگا دیا۔ شاہ جی صرف مسکرا کر رہ گئے۔ میں کسی معمول کی طرح کھویا کھویا سا اپنے آپ میں واپس آ گیا۔

☆☆

کارخانے کی چمنی سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی سیاہی دیکھ کر سوچتا ہوں اس میں میرا لہو شامل ہے تو پھر دھواں اتنا سیاہ کیوں ہے؟ جن کا خون سفید ہو چکا ہے وہ میری سلامتی کے علمبردار ہیں۔ چمنی سے نکلتا ہوا گہرا سیاہ دھواں ان کی طرف سے میری حمایت میں سوگ کی علامت ہے۔ لیکن میرے سفید و سیاہ پر سارا اختیار انہیں کو حاصل ہے۔ الٰہ دین کا چراغ میرے ہاتھ میں ہے لیکن اب اس کی روایت بدل چکی ہے۔ اب جن کے احکامات کی بجا آوری الٰہ دین کا فرض ہے۔
چمنی سے اٹھتے سیاہ دھوئیں کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ شاید چراغ کا جن ابھی حاضر ہونیوالا ہے۔ میں اسکے احکامات کی تعمیل کے لئے پہلے ہی مؤدب ہو کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

☆☆

''منطق الطیر'' والے تجربے کے بعد سے میں شاہ جی کا بہت زیادہ معتقد ہو گیا ہوں لیکن

آج شاہ جی نے ایک پیر جی کا احوال سنا کر حیران کر دیا۔شاہ جی اُن پیر جی سے بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے:

''میں نے پیر جی سے پوچھا یہ آپ نے اتنا بڑا مزار کیوں بنا رکھا ہے؟

میری بات سن کر مسکرائے اور بولے''یہ تو صرف لوگوں کو جمع کرنے کا بہانہ ہے کیونکہ من حیث القوم ہم مردہ پرست ہیں۔ زندوں کو مار ڈالتے ہیں اور مرے ہوؤں پر پھول چڑھاتے ہیں۔بس اسی وجہ سے مزار بنوانا پڑا۔''

میں پیر جی کی صاف گوئی سے بڑا متاثر ہوا۔پھر ان کے علم کا اندازہ لگانے کے لئے ان سے **الم** کے معنی پوچھے۔انہوں نے مجھے ششدر کر دیا۔

''یہ نفس کی تین حالتوں کا بیان ہے۔امّارہ۔لوّامہ۔مطمئنہ''

پیر جی نے علم و معرفت کی اتنی بڑی بات ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر دی۔میں تب سے اب تک اسی عارفانہ سرور میں بھیگا ہوا ہوں''

شاہ جی کی پیر جی سے ملاقات کی روداد نے مجھے بھی مسحور کر دیا۔

☆☆

کارخانے کی رہائشی کالونی میں میرے کوارٹر سے ملحقہ کوارٹر کی ایک زلیخا نے مجھے ایک عرصے سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ میں نہ یوسف ہوں نہ پیغمبر۔جبکہ زلیخا کے مقابلے کے لئے حسنِ یوسف اور شانِ پیغمبری دونوں کو یک جا کر دیا جاتا ہے۔ میں ان دونوں خوبیوں سے محروم، زلیخا کے سامنے کھڑا کانپ رہا ہوں۔آخر میں گنہگار کیوں اس کڑی آزمائش میں ڈال دیا گیا ہوں۔ میں شیطان سے لڑتا رہا۔ساری رات مقابلہ ہوتا رہا۔میں ہانپنے لگا جبکہ شیطان اسی طرح تازہ دم تھا۔آخر میں کوارٹر سے بھاگ نکلا۔کارخانے پہنچا تو وہاں کارخانے کے مالک کی شکل میں شیطان پھر میرا منتظر تھا۔اس کے چہرے پر بڑا سفّاک مسکراہٹ تھی اور وہ بالکل تازہ دم تھا جبکہ میں نڈھال ہو چکا تھا۔

☆☆

میں نے اپنا سارا دکھ شاہ جی کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ان کی آنکھوں میں ایک ملکوتی چمک پیدا ہوئی۔

''شیطان ہمارے اندر بھی ہوتا ہے اور باہر بھی۔جنّوں میں بھی،انسانوں میں بھی اور ان سے سوا بھی۔ شیطان کے لاکھوں روپ اور کروڑوں حربے ہیں۔ہم عاجز انسان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' شاہ جی ذرا دم لینے کو رُکے اور پھر گویا ہوئے''ہم شیطان کو مار نہیں سکتے اس لئے کبھی بھی شیطان کے ساتھ نہیں لڑنا۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔یاالٰہی! یہ شاہ جی کیا کہہ رہے ہیں؟۔میں نے پریشانی کے عالم میں سر اٹھا کر شاہ جی کو دیکھا۔ان کی آنکھوں میں وہی ملکوتی چمک تھی۔

''ہاں۔ہم شیطان کو ہلاک نہیں کر سکتے اس لئے کبھی بھی شیطان کے ساتھ نہیں لڑنا۔بس جتنا ہو سکے اس نامراد سے بچ کر رہو اور اِس سے دور بھاگو۔اس سے دور بھاگنے ہی میں عافیت ہے اور یہی تقویٰ ہے''

شاہ جی کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔

☆☆

آج شاہ جی سے پورے سات دن بعد ملاقات ہوئی۔وہ کچھ بجھے بجھے سے تھے۔میرے استفسار پر انہوں نے بتایا:

''میں پھر پیر جی کے ہاں گیا تھا''

''اچھا!''میں نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

''پیر جی کہنے لگے میں خدا سے براہ راست گفتگو کرا سکتا ہوں''

''خدا سے براہِ راست گفتگو۔مکالمہ الٰہیہ۔''خوشی سے میری آواز لرزنے لگی۔

''میرے لئے بھی یہ بڑی پُرکشش بات تھی''شاہ جی بھرائی ہوئی آواز میں بولے

''پھر۔؟''

''پیر جی کی شرط ہے کہ خدا سے بات کروانے کے عوض انہیں ایک سجدہ کیا جائے''

''خدا سے بات کرانے کے عوض پیر جی کو سجدہ!'' میرا دل بیٹھنے لگا ''پھر آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے پیر جی سے کہا کہ جناب سر تو ایک ہی ہے اور یہ جسے دینا تھا دے چکا ہوں۔ اگر دوسرا سر ہوتا تو ضرور سجدہ کرتا'' شاہ جی کی بھرائی ہوئی آواز پر جوش ہوگئی ''پیر جی سے اتنا کہہ کر میں واپس آ گیا۔''

''شاہ جی! اب میری کہانی بھی سُن لیں'' میں نے پھیکی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کہا۔

شاہ جی نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں ''سناؤ تمہاری کہانی کیا ہے؟''

''شاہ جی! آپ نے کہا تھا نا کہ شیطان جنّوں میں بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں بھی اور یہ کہ ہم شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سو کارخانے کے مالک اور کالونی کی زلیخا۔ میں دونوں میں سے کسی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور ان دونوں سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی، میں کارخانے کی نوکری چھوڑ دوں۔ اور شاہ جی! میں نے نوکری چھوڑ دی ہے''

''تو تم نے نوکری چھوڑ دی؟'' شاہ جی نے بے حد دکھی لہجے میں پوچھا۔

مجھے یوں لگا جیسے شاہ جی نوکری اور کوارٹر چھوڑ کر آئے ہیں اور میں پیر جی کو جواب دے کر آیا ہوں۔ اور ہم دونوں شیطان سے لڑ کر نہیں بھاگ کر آئے ہیں۔

☆☆☆

گھٹن کا احساس

ہم نے بھوگا ہے صرف اسے حیدرؔ
ہم نے کب زندگی گزاری ہے

بچپن میں اُس کی ماں اُسے نلکے کے نیچے بٹھا کر نہلایا کرتی تھی۔ اس کا بھائی نلکے کی ہتھی چلاتا، ماں اُس کے پورے جسم پر صابن مَل کر اسے اچھی طرح سے صاف کرتی۔ ماں کا نہلانا اُسے اچھا لگتا تھا لیکن جب وہ اس کے منہ پر صابن لگاتی اور اسے آنکھوں میں اس کی چبھن محسوس ہوتی تب وہ تکلیف کے باعث اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا۔ صابن سے بھی زیادہ گھبراہٹ اُسے اُس وقت ہوتی جب اُس کا سر نلکے کے پھن کے عین نیچے ہوتا۔ پانی سیدھا اُس کے سر اور چہرے پر امنڈتا چلا آتا اُسے ایسا لگتا جیسے وہ کسی گہرے پانی میں ڈوب رہا ہو۔ وہ گھبراہٹ کے مارے چیخنے لگتا۔ ایسے موقعہ پر اس کا بھائی شرارت سے نلکے کی ہتھی کو زیادہ تیزی سے چلانے لگتا۔ اُس کی گھبراہٹ تڑپنے جیسی حالت میں بدل جاتی۔ تب ماں اسے سینے سے لگا لیتی۔ ماں کے سینے سے لگتے ہی اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو جاتی۔

لڑکپن میں ایک بار اُسے اپنے باپ کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا موقعہ ملا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا تو خوفزدہ ہو گیا۔ وہ بلندی اور پانی دونوں سے ڈرنے لگا۔ اسے زمین سے جڑے رہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا بلندی اور

پانی سے اس کا خوف بڑھتا گیا۔ایک بار وہ ایک بائیس منزلہ عمارت کی آخری منزل پر گیا۔
بائیسویں منزل کے ایک فلیٹ کی بالکونی سے جب اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے لگا وہ ابھی
نیچے گر پڑے گا۔اس نے بالکونی سے پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ جڑ کر آہستہ آہستہ کمرے کی
طرف سرکنا شروع کیا اور جب وہ تین میٹر کا فاصلہ طے کر کے بالکونی کے ساتھ ملحقہ کمرے میں
گیا تو اس کا سانس ایسے پھولا ہوا تھا جیسے وہ ۳۰۰ میٹر کی دوڑ کے آخری پوائنٹ پر پہنچا ہو۔

جوانی میں ملازمت کے باعث اسے کئی گھر تبدیل کرنے پڑے۔اسے اتفاق کہیں کہ ہر
گھر کا باتھ روم بے حد مختصر ہوتا۔نہانے والا سمٹا کر شاور کے نیچے کھڑا ہو سکتا تھا۔کئی بار اس
نے سوچا اس سے تو بچپن کا وہ نلکا اور کھرّا بہتر تھا۔وہاں ایسی گھٹن تو نہیں تھی۔تنگ باتھ روم میں
جا کر کبھی کبھی اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی ملنگ ہے جو کسی شہزادی پر فریفتہ ہو گیا ہے اور بادشاہ
نے اسے سزا کے طور پر دیواروں میں زندہ چُن دینے کا حکم دے دیا ہے۔تب وہ نہائے بغیر ہی
گھبرا کر باہر نکل آتا۔نہاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی پوری کمر پر نہیں پھر سکتا تھا۔ماں کا کمر پر صابن
مَلنا یاد آتا تو اس کا جی چاہتا کاش ماں زندہ ہوتی اور اب بھی میری کمر پر صابن مَل دیتی۔ایسے ہی
خیالوں کے دورن ایک بار اُس نے اپنی بیوی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔اس کی بیوی نہ صرف
اس کی ماں کی بھتیجی تھی بلکہ بڑی حد تک اس کی ماں کی ہم شکل بھی تھی۔اس نے اپنی بیوی سے اس
خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نہاتے وقت اس کی کمر پر صابن مَل دیا کرے۔اس کی بیوی تھوڑا
سا شرمائی پھر کہنے لگی: ’’مجھ سے یہ فلموں والے باتھ روم کے سین نہیں ہو سکتے‘‘ وہ بیوی کے جملے پر
مسکرایا اور سوچا یہ پگلی کہاں جا پہنچی۔یوں بھی باتھ روم میں اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ وہ بھی میرے
ساتھ سما سکتی۔

ایک دن اس نے اخبار میں خبر پڑھی: ایک عورت جسے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا تھا دو دِن
کی مشقّت کے بعد اپنی قبر اُدھیڑ کر باہر نکل آئی یہ خبر پڑھ کر اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔کسی
زندہ انسان کو مردہ سمجھ کر دفن کر دینا۔لیکن قبر کے اندر لیٹا ہوا انسان کیسے اسے اُدھیڑ سکتا ہے؟ اس
نے خوف اور حیرت سے سوچا۔پھر اس نے فرض کیا کہ اسے بھی اسی طرح مردہ سمجھ کر دفن

کر دیا جائے تو وہ اپنی قبر اُدھیڑ سکے گا یا نہیں۔وہ تو سچ مچ وہیں دَم گھٹ کر مر جائے گا اور پھر
گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔رات کو جب سردی کے باعث اس نے کمبل اپنے منہ پر لیا،
اسے ایسے لگا جیسے وہ کفن میں لپٹا ہوا قبر میں پڑا ہے۔اس نے گھبرا کر کمبل کو چہرے سے ہی نہیں،
سینے سے بھی اُتار پھینکا اور بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔بعد میں اس نے اپنے ایک دوست کو اپنی گھبراہٹ
اور گھٹن کے احساس کے بارے میں بتایا تو اس نے اسے مشورہ دیا کہ تیراکی سیکھ لو۔اب وہ اپنے
دوست کو کیا بتاتا کہ وہ بچپن سے نلکے کے پانی سے بھی خائف ہے۔تیراکی کیسے سیکھ لے! سو اس
نے دوست کے مشورے کو مذاق کے رنگ میں ٹال دیا ’’کیا پتہ کل کلاں مجھے مہینوال
کا کردار کرنا پڑ جائے پھر دریا میں ڈوبنے کے بجائے تیر کر پار لگ جاؤں گا اور محبت کی رسوئی
ہو جائے گی‘‘

اس عرصہ میں اوزون کا مسئلہ، آلودگی کا مسئلہ اور ایٹمی جنگ کا امکانی خطرہ۔ان موضوعات
پر اس کا مطالعہ بڑھتا گا۔وہ سوچتا: انسان نے مختلف نظریات اور مزعومہ برتری کی لڑائیوں میں
نفرت کی آلودگی بڑھائی، بلندیوں کی آرزو میں اوزون میں شگاف ڈال دیئے، صنعتی ترقی اور
اسلحے کی دوڑ میں ماں جیسے مقدس پانی کو ناپاک کر دیا، جنگلوں کو اُجاڑ دیا، اتنے ہولناک نیوکلیائی
ہتھیار بنا لئے کہ دھرتی کا دم گھٹ کر رہ جائے۔یہ ساری بلندیاں انسانیت کو قبر میں گرانے والی
ہیں۔جیتے جی قبر میں گرانے والی۔اور پھر اس کا دم گھٹنے لگتا۔اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے
لگتی۔ایسے ہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ ایک بار ٹرین کا سفر کر رہا تھا۔جب سوچتے سوچتے اس کا دم
گھٹنے لگا وہ اٹھ کر ٹرین کے دروازے کے قریب آیا۔دروازہ کھلا ہوا تھا اس نے گیٹ کے
دائیں بائیں نصب شدہ دونوں ڈنڈوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔اندر آتی ہوئی تیز ہوا سے گھٹن کا
احساس کم ہونے لگا۔اسے قدرے سکون مل رہا تھا لیکن پھر یکا یک اس کے ذہن میں عجیب سا
خیال آیا۔چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دو۔پھر یوں لگا جیسے یہ خیال نہیں کوئی غیبی آواز ہے جو اسے
حکم دے رہی ہے: چھلانگ لگا دو۔وہ گھبرا کر اپنی سیٹ کی طرف لوٹ آیا۔اگر وہ مزید تھوڑی دیر
گیٹ پر کھڑا رہتا تو یقیناً چھلانگ لگا دیتا۔اس واقعہ کے بعد وہ کسی بھی بلندی والی جگہ جاتا، اسے

یہی آواز سنائی دینے لگتی: نیچے چھلانک لگادو۔ چھلانک لگادو۔ اور وہ گھبرا کے نیچے آجاتا۔

اُس دن وہ صوبائی دارالحکومت سے واپس آرہا تھا۔ رستے میں ماں، باپ کی قبروں پر جانے کی آرزو ہوئی اس لئے ان کے شہر کی طرف چل پڑا۔ وہاں ان دنوں رستے میں دریا کا پُل زیرِ مرمّت تھا۔ کام کی وجہ سے ساری رات پُل پر آمدورفت معطل رہتی تھی۔ اسے اس کا علم نہیں تھا۔لیکن اب دریا کے اِس طرف آ گیا تھا تو دوسری طرف جا کر ماں، باپ کی قبروں پر دعا کئے بغیر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے وہ دریا کے اس طرف مزے سے رات بسر کرسکتا تھا۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ صبح رستہ کھلتے ہی دریا کے پار چلا جائے گا۔لیکن رات دس بجے کے قریب ایک شخص اس کے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ دریا کے دوسری طرف والے شہر کا باسی ہے اور ایک چھوٹے سے پُل سے واقف ہے جہاں سے پیدل دریا پار کیا جاسکتا ہے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔ یہ بمشکل دوفٹ چوڑا پُل تھا جس کے ایک طرف لوہے کے پائپوں کا جنگلہ سا بنا تھا اور دوسری طرف سے بغیر جنگلے کے تھا۔ اس نے آدھا پُل بے خیالی میں پار کرلیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو پُل صراط پر چل رہا ہے۔ اس نے جنگلے کو پکڑے ہوئے اوپر دیکھا۔ ریلوے لائن والے پُل پر چندھیا دینے والی روشنی تھی۔ وہاں مزدور کام کررہے تھے۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نیچے نظر دوڑائی تو گرمیوں کا چڑھتا ہوا دریا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ تب اسے جتنی دعائیں یاد تھیں اس نے ان کا وِرد شروع کردیا ان میں علم میں اضافے سے لے کر والدین کی مغفرت تک کی کئی غیر متعلق دعائیں بھی شامل تھیں۔ نہ وہ اوپر دیکھ سکتا تھا نہ نیچے۔ تب اس نے اپنے آگے والے ہم سفر کو دیکھا تو وہ غائب تھا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کون تھا اور کیوں مجھے یہاں تک لاکر غائب ہوگیا۔ دریا کے دوسری طرف والے شہر کے رہنے والے نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟ ان خیالوں اور سوالوں کے ساتھ اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ ایک طرف گہری تاریکی تھی اور ایک طرف ٹرین کے پُل پر ہونے والی تیز روشنی۔ گھبراہٹ میں اس کا ایک ہاتھ جنگلے سے ہٹ گیا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں دریا کا چڑھتا ہوا پانی تھا، اضطراری طور پر اس کا دوسرا ہاتھ بھی جنگلے سے ہٹ گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے

تھے۔ پھر اسے وہی آواز سنائی دینے لگی: چھلانگ لگادو.... نیچے چھلانگ لگادو۔ پھر دریا میں گہری چھپاک کی آواز اس نے خود ہی سنی تھی۔ اس کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں اسے نہلا رہی ہے۔ اس نے اس کے منہ پر صابن مَل دیا ہے۔ بھائی نے نلکے کی ہتھی تیز چلانی شروع کردی ہے۔ گھبرا کر وہ تھوڑا سا تڑپا تو ماں نے بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگالیا۔

اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو چکی تھی۔

☆☆☆

بھولے کی پریشانی

ہماری بے خبری بھی بجا سہی حیدرؔ
پر اس کی برہمی بھی تو کسی سبب سے ہے

خدا کی قسم۔۔۔۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ میں چوہدری اللہ دتہ صاحب کے گھر اُس وقت سے نوکر ہوں جب میری عمر بمشکل سات سال کی تھی۔ تب میرے غریب ماں باپ کے لئے مہینے کے بیس روپے بڑی دولت تھے جو میری تنخواہ کے طور پر انہیں ملتے تھے اور میرے لئے چوہدری صاحب کے گھر کا مزیدار کھانا، جو میں جی بھر کے کھا سکتا تھا، بہت بڑی نعمت تھی۔ آج جب مجھے اس گھر کی خدمت کرتے اور اس کا نمک کھاتے اٹھارہ سال ہو گئے ہیں میں نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھ پر تو چوہدری صاحب اور اللہ بخشے چوہدرانی جی کو ہمیشہ بھروسہ رہا۔ جوان ہو جانے کے بعد بھی میں نے اس خاندان کی کسی لڑکی کو کبھی میلی نظروں سے نہیں دیکھا۔ نہ کبھی رقم کا کوئی ہیر پھیر کیا۔ پھر آج مجھ پر نمک حرامی کا الزام کیوں لگایا گیا ہے؟

اللہ بخشے چوہدرانی جی بڑے پیار سے کہا کرتی تھیں کہ بھولے تو سچ مچ بھولا ہے۔ پر ایمانداری کی بات ہے میں اتنا بھولا بھی نہیں ہوں یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات سب کچھ اچھی طرح جانتے ہوئے بھی بھولا بن جاتا ہوں۔ نمک حلالی کے لئے بھولپن بہت ضروری ہے۔ میں نے چوہدری اللہ دتہ صاحب کے گھر میں بہت کچھ دیکھا ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھا بھی ہے

اس کے باوجود مجال ہے میں نے کسی بات کی بھنک باہر پڑنے دی ہو۔ میں نے تو ہمیشہ پردہ پوشی کی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں پندرہ برس کا تھا۔ گھر پر چوہدری صاحب کی دونوں چھوٹی بیٹیاں رفیعہ بی بی اور ماجدہ بی بی ہوتی تھیں۔ باقی لوگ امریکہ گئے ہوئے تھے۔ تب ماجدہ بی بی اپنے کمرے کی بجائے بیٹھک میں سوتی تھیں۔ ہر رات دس بجے کے قریب ایک خاص طرز کی ہلکی سی دستک ہوتی تھی اور ماجدہ بی بی بیٹھک سے گلی میں ہوتی تھیں۔ مجھے علم ہے ان کے ہمسایوں کا لڑکا ڈاکٹر عبدالخالق ان سے چوری چھپے ملنے آتا تھا پر میں نے آج تک کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ہاں۔ ایک بار میں دل ہی دل میں ہنسا ضرور تھا۔ ماجدہ بی بی کی کہیں اور شادی ہو گئی۔ تین پیارے پیارے بیٹے ہو چکے تھے۔ تب لاہور سے ان کی بھتیجی کی شادی کی وڈیو فلم آئی تھی۔ اس میں گھر کی بچیوں نے خوب ناچ گانا کیا تھا۔ شادیوں کے موقعہ پر سارے گھروں میں ایسا ناچ گانا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے اللہ بخشے چوہدرانی جی موٹی تازی ہونے کے باوجود بیاہوں کے موقع پر خود ناچ گانے میں حصہ لیا کرتی تھیں۔۔۔۔ لیکن اپنی رشتے کی بھتیجی کی شادی کی وڈیو فلم دیکھ کر ماجدہ بی بی نے کہا تھا یہ کیسٹ بچوں کے سامنے نہیں چلانا، ان کی تربیت پر برا اثر پڑے گا۔ تب میں دل ہی دل میں بہت ہنسا تھا۔ پر میں نے آج تک ماجدہ بی بی کو بھی یہ خبر نہیں ہونے دی کہ مجھے ان کے ڈاکٹر عبدالخالق سے ملنے ملانے کے سارے چکروں کا پتہ ہے۔

سلیمہ بی بی کی ایک بیٹی رئیسہ نے جب محلے میں پر پُرزے نکالنے شروع کئے۔ مجھے ساری باتوں کا علم تھا پر کیا کرتا، نمک حلالی کا تقاضہ تھا کہ خاموش رہتا۔ یوں بھی ان کے ایک رشتہ دار نے جب سلیمہ بی بی کو ان کی بیٹی رئیسہ کی سرگرمیوں کے بارے میں تھوڑا سا آگاہ کیا تھا تاکہ کسی بڑی خرابی کے ہونے سے پہلے ہی بچ بچا کر لیا جائے تو سلیمہ بی بی خرابی دور کرنے کی بجائے الٹا اس رشتہ دار سے لڑنے چلی گئی تھیں۔ اپنی سب سے بڑی بہن حلیمہ بی بی کو بھی ساتھ لے گئیں۔ لڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس رشتہ دار نے جو بات پہلے پردے میں رکھ کر کہی تھی پھر کھول کر بیان کر دی اور اس کھول کر بیان کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ حلیمہ بی بی نے سلیمہ بی بی کی دوسری بیٹی راشدہ کا رشتہ لینے کی جو بات پکی کر رکھی تھی اسے توڑ دیا۔ اپنے بیٹے کا بیاہ کہیں اور کر دیا۔ حالانکہ اللہ جانتا ہے راشدہ

بی بی تو بہت ہی اچھی اور نیک بچی ہے۔ رئیسہ بی بی جیسی بالکل نہیں ہے۔ سلیمہ بی بی کا میاں جب اپنی بیٹی کے لچھنوں سے آگاہ ہوا تو دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ بڑا غیرت مند چوہدری تھا جی!۔ اس قسم کی ڈھیر ساری باتیں میرے علم میں ہیں پر میں نے آج تک اس خاندان کی پردہ پوشی کی ہے کیونکہ میں اس گھر کا نمک خوار ہوں۔

اللہ بخشے چوہدرانی جی بہت بڑے دل والی تھیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب کاروبار کے سلسلے میں ایک بار افریقہ گئے تو تین سال کے بعد واپس آئے۔ پھر گئے تو پانچ سال کے بعد واپس آئے۔ مجال ہے چوہدرانی جی کے جیتے جی کبھی ایسی کوئی بات ہوئی ہو۔ یہ ساری باتیں تو بڑی چوہدرانی جی کے اٹھ جانے کے بعد ہی ہونے لگی تھیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب ویسے بڑے متقی انسان ہیں۔ سچی بات ہے میں نے ان میں عیب اور گناہ والی کوئی بات نہیں دیکھی پر اب تہتر برس کی عمر میں انہوں نے نئی شادی کر کے بڑی زیادتی کی ہے۔ بوڑھوں میں ہی نہیں، جوانوں میں بھی ان کی ٹور تو بن گئی ہے کہ اس عمر میں بھی اتنا دم خم ہے کہ نئی شادی کر لی۔ پر ایسی ٹور کا فائدہ؟۔ اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ جب تہتر برس کی عمر میں بھی چوہدری اللہ دتہ صاحب سے صبر نہیں ہو سکا تو پھر اُس زمانے میں انہوں نے خاک صبر کیا ہوگا جب وہ کئی کئی برس بیرون ملک اکیلے گزار کر آتے تھے۔ تب وہ اچھے بھلے جوان تھے۔ ضرور اِدھر اُدھر منہ مارا ہوگا لیکن مہارت کے ساتھ۔

لوگ چوہدری صاحب کے منہ پر بے شک بات نہ کریں لیکن آپس میں سب باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے خود لوگوں کی باتیں سنی ہیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب نے دوسری شادی بھی کی تو کیسی فضول سی جگہ۔ یہ عورت عمر میں تو ان سے بیس سال چھوٹی ہے لیکن پہلے ایک جج کی بیوی رہ چکی ہے۔ جج نے اس پر برائی کا الزام لگا کر اسے طلاق دے دی تھی۔ اور وہ عورت ابراہیم کی بیٹی جوئی چوہدرانی کی گہری دوست ہے۔ منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔ اس نے شادی والے دن چوہدری اللہ دتہ صاحب کو سالی بن کر دودھ پلایا تھا اور دودھ پلائی کے پیسے لئے تھے۔ نئی چوہدرانی کی یہ منہ بولی بہن اپنے گاؤں کی وہ تاریخی لڑکی ہے جو اپنی جوانی میں گاؤں سے بھاگی تھی۔ کسی لڑکی کے اُس گاؤں سے بھاگنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ کم بخت بھاگی بھی غیر مذہب والے

کے ساتھ۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ چوہدری اللہ دتہ صاحب نے بڑی چوہدرانی جی کی جگہ پر ایک ایسی پَرکٹی کو لا بٹھایا ہے جو پاک دامنی کے معاملہ میں ہماری بڑی چوہدرانی جی کے قدموں میں بیٹھنے کے بھی لائق نہیں۔ یہ تو جی سراسر ظلم ہے!

یہ لوگ باگ بھی بڑے فنکار ہیں۔ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ ایک کہہ رہا تھا کہ نکاح کے چھوہاروں اور مکھانوں کے ساتھ ٹافیاں اور غبارے کیوں تقسیم کئے گئے؟ کیا پتہ کیوں تقسیم کئے گئے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ چوہدری اللہ دتہ صاحب اندر سے بالکل خالی ہیں۔ پھوکی ٹور بنانے کے لئے انہوں نے شادی کا تماشا کیا ہے۔ اگر واقعی چوہدری میں دم خم ہے تو پھر اس بیوی سے بھی اولاد پیدا کر کے دکھا دیں۔ وہ حرامی جب یہ بات کر رہا تھا مجھے ایسا لگا جیسے چوہدری اللہ دتہ صاحب نے یہ بات سن لی تھی۔

میں بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھا۔ میرا رونا تو صرف یہ ہے کہ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ دراصل کل رات چوہدری اللہ دتہ صاحب نے مجھے کہا تھا کہ ان کے بیڈروم کی سیٹنگ تھوڑی سی تبدیل کر دوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ ضروری ہدایات بھی دی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بیڈروم تک پہنچایا تھا اور دروازے سے ہی لوٹ گئے تھے۔ میں اندر گیا تو وہاں نئی چوہدرانی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے کمرے کی سیٹنگ تھوڑی سی تبدیل کرنی ہے اس لئے وہ ذرا باہر تشریف لے جائیں لیکن وہ باہر جانے کی بجائے میرے قریب آ گئیں۔ ان کی آنکھیں اور چہرہ عجیب سا ہوتا جا رہا تھا۔ اب میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا کرنے لگی تھیں۔ جب وہ مجھ سے بالکل ہی لپٹ گئیں تب میں گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگا لیکن بدحواسی میں مجھ سے دروازہ نہیں کھل سکا اور میں قریب کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا۔ باہر سے گھوم کر میں اندر آیا۔ چودھری اللہ دتہ صاحب کو تلاش کیا۔ پتہ نہیں وہ بتائے بنا کہاں چلے گئے تھے۔ مجبوراً میں پھر چوہدری صاحب کے بیڈروم کی طرف گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بیڈروم کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کنڈی کھولی تو نئی چوہدرانی سامنے کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ انہوں نے قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور ''نمک حرام'' کہہ کر بیڈروم کا دروازہ زور سے اندر سے

بند کرلیا۔

بتایئے بھلا میں نے نمک حرامی کہاں کی ہے۔ خدا کی قسم میں نمک حرام نہیں ہوں۔

چوہدری اللہ دتہ صاحب کل رات کے کہیں گئے ابھی تک واپس نہیں آئے۔ وہ آجاتے تو وہ خود گواہی دیتے کہ بھولا اور سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن نمک حرام نہیں ہوسکتا۔ پر یہ چوہدری اللہ دتہ صاحب کل رات سے اچانک کہاں چلے گئے ہیں اور ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟

اور وہ بیڈروم کی کنڈی باہر سے کس نے لگائی تھی؟

رب جانے یہ کیا چکر ہے!

☆☆☆

شناخت

زندگی کی ہر برہنہ شاخ پر تحریر ہیں
پھول چہروں پر جو ٹوٹے زرد لمحوں کے عذاب

''پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ''

''پاکستان۔ پلیدستان''

''لے کے رہیں گے پاکستان''

''ست سری اکال......''

''حیّ علی الصّلوٰۃ......''

''بانگ نئیں دین دیاں گے۔ ساڈیاں رتاں بانگیاں جاندیاں نیں''

''مسجد شہید گنج......''

''گوروگوبند سنگھ جی کے بچے......''

''ہندو مسلم بھائی بھائی''

جئے ہند۔ جئے ہند''

ایک زوردھماکہ ہوا۔ زندگی کانپنے لگی۔ پاکستان آزاد ہوگیا۔ اس کے ذہن میں سارے

منظر، ساری تاریخ اتھل پتھل ہوکر رہ گئی۔کوئی منظر ٹھیک طرح سے آنکھوں میں نہیں سما رہا۔تاریخ کا کوئی حصہ ڈھنگ سے ذہن میں نہیں آ رہا۔ چاروں طرف آگ اور خون کا کھیل تھا، ان کے قافلے پر حملہ کر دیا گیا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں سب گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں گہرا اندھیرا اُتر آیا تھا مگر اچانک اس اندھیرے میں روشنی کی ہلکی سی لکیر ابھری۔قریبی کھیتوں میں اسی روشنی کی لکیر کے سہارے وہ چھپتے چھپاتے ساتھ والے گاؤں جانکلی تھی مگر وہاں پہنچ کر اس کی آنکھوں میں اُترا ہوا اندھیرا اور گھنا ہو گیا تھا اور روشنی کی اس ہلکی لکیر نے بھی اس اندھیرے میں دم توڑ دیا تھا:

''کون ہو تم؟؟''

''جی۔مم۔میں۔رشیدہ ہوں''

''ہا۔۔ہاہاہا۔۔۔''شیطانی قہقہے اس طرح گونجے جیسے کسی ملک کو فتح کرنے کا آخری مرحلہ آ گیا ہو۔

''مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دیں۔خدا کے لئے!۔مجھے میرے پاکستان بھجوا دیں۔''وہ گڑگڑائی

''سنو!تم اب رشیدہ نہیں، پرکاش کور ہو''

بے بسی کی حالت کے باوجود پتہ نہیں اس میں کہاں سے اتنی قوت آ گئی۔اس نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا:

''میں مسلمان ہوں اور میرا نام رشیدہ ہے، رشیدہ!''

تب سکھ لیڈر کے اشارے پر سات سکھوں نے اسے دبوچ لیا اور اسے بازوؤں، ٹانگوں اور بالوں سے پکڑ کر کسی انجانی سمت لے جانے لگے۔رستے میں سکھ لیڈر نے طنزاً کہا:

''اب بتاؤ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟''

''لا الٰہ الا اللہ.....''انہوں نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا مگر پھر بھی اس نے جیسے تیسے پورا کلمہ پڑھ دیا''.....محمد الرسول اللہ''

وہ اسے ایک خالی مکان میں لے گئے اور وہاں جا کر ایک کمرے میں زور سے پٹخ دیا۔

''اسلام کے دشمنو!انسانیت کے دشمنو!ہماری اذانیں بند کرنے والے کتو اور درندو!''

رشیدہ کے منہ سے گالیوں کا طوفان بہہ نکلا۔لیڈر سکھ نے باقی سکھوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی۔تشدد کے باوجود اسے اصرار تھا کہ وہ رشیدہ ہے اور اسے اس کی ماں کے پاس یا پھر پاکستان پہنچایا جائے۔تب لیڈر سکھ نے نہ صرف اس کی آبروریزی کی بلکہ اس عمل کے دوران اسے باور کراتا رہا کہ وہ اب رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے کیونکہ اب وہ مسلمان نہیں سکھ ہے۔

تکلیف اور اذیت کے عالم میں ''لے کے رہیں گے پاکستان''''جے ہند''اور''ست سری اکال''کے سارے نعرے بھی اسے ریپ کرتے رہے اور اسے اس کا نیا نام یاد کراتے رہے۔وہ چیخی چلائی تو لیڈر سکھ نے دھمکی دی کہ اگر وہ درست نہ ہوئی تو وہ اپنے گروہ کے باقی سات جوانوں کو بھی اندر مدعو کر لے گا۔تب وہ نہایت بے بسی کے ساتھ سسک پڑی اور درست ہو گئی اور اسے یقین آ گیا کہ اس کا نام رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے اور پھر وہ سچ مچ پرکاش کور بن گئی۔لیڈر سکھ سریندر سنگھ کی بیوی!

اس کے اندر کی رشیدہ کبھی اس سے گزرے ہوئے، بھوگے ہوئے اور سنے ہوئے واقعات کی کوئی بات کرتی تو وہ اسے سختی سے ڈانٹ دیتی۔کسی نعرے کا مطلب پوچھتی تو اسے ٹوک دیتی۔سکھوں کے دور میں مسلمانوں کی اذانوں پر پابندی کی بات ہو یا مغلیہ دور میں گورو گوبند سنگھ جی کے بچوں کے قتل کا واقعہ، پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ ہو یا پلید ستان۔وہ تو اپنا مطلب، اپنے معانی گم کر بیٹھی تھی۔اس کے لئے اب ہر چیز بے معنی تھی۔پھر اس نے اپنی بے معنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا اور اس سمجھوتے نے بے معنویت سے ایک نئی معنویت پیدا کر دی۔دو گبھرو بیٹے اور ایک خوبصورت بیٹی۔لیکن وہ جب بھی اپنے ماحول سے مطمئن ہونے لگتی، اندر کی بے اطمینانی اور بڑھ جاتی۔اطمینان اور بے اطمینانی کی اسی حالت میں زندگی کو جھیلتے، بھوگتے وہ بڑھاپے کی منزل تک آ گئی۔

☆☆

تب یکا یک ایک اور دھاکہ ہوا۔ زندگی کانپنے لگی۔

’’اندرا گاندھی قتل ہوگئیں‘‘

انتہا پسند ہندوؤں کو کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ سکھوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا۔ اس کے ذہن میں خوفناک وسوسے اور اندیشے سر اٹھانے لگے، وہ اپنے کمزور اور بوڑھے ہاتھوں سے اپنی جوان بیٹی کو مضبوطی سے تھامنے لگی۔ فساد شدت اختیار کرنے لگا۔ سریندر سنگھ سرکاری حفاظتی کیمپوں میں رہائش کا بندوبست کرنے گیا ہوا تھا۔ تب اس کے گھر کی دہلیز پر ہی اس کے دونوں جوان بیٹے قتل کر دیئے گئے اور گھر کو آگ لگا دی گئی۔ وہ اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لے کر گھر کی پچھلی طرف سے دیوار پھاند گئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے گئی ہوں گی کہ پیچھے سے للکار سنائی دی:

’’ٹھہرو!۔۔۔کون ہو تم؟‘‘

’’جج....جی....‘‘ وہ ہکلائی۔ سینتیس ۳۷ سال پہلے کا زمانہ پھر اس کے سامنے آ گیا

’’کیا نام ہے تمہارا؟‘‘

’’پرکاش کور۔۔۔۔نہیں۔۔۔رشیدہ۔۔۔۔، جی ہاں رشیدہ‘‘

’’جھوٹ بولتی ہو۔ تم مسلمان نہیں ہو، سکھ ہو‘‘

’’گورو کی سوگند۔ بھگوان کی قسم۔ میں رشیدہ ہوں اور یہ میری بیٹی ہے۔۔ چترا۔۔۔نہیں اس کا نام چترا نہیں.....اس کا نام.....‘‘

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی، سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ اس کے سوچتے سوچتے اور دیکھتے دیکھتے سامنے کا منظر بدل چکا تھا۔۔۔۔ چترا ایک مکان کے کمرے میں مقید تھی اور وہ برآمدے میں بے بس بندھی کھڑی تھی۔ آٹھوں بدمعاش اس کی بیٹی کو باری باری ریپ کر رہے تھے۔ چترا بے ہوش ہو چکی تھی مگر بلوائیوں کے انتقام کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں سارے منظر، ساری تاریخ اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی حالت ایسے انسان کی طرح تھی جس کے چاروں طرف الگ الگ موضوعات کی کئی فلمیں پوری آواز کے ساتھ چل رہی ہوں اور اسے کچھ بھی نہ سوجھ رہا ہو۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کے سامنے چترا نہیں وہ خود پڑی ہوئی ہے اور وحشیوں کا یہ غول اسے اس کا نام یاد کرا رہا ہے۔ ہر آدمی اسے سریندر سنگھ نظر آتا ہے۔

’’رشیدہ نہیں پرکاش کور۔۔۔۔۔۔۔۔ پرکاش کور نہیں رشیدہ...‘‘

تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نام نہیں اور کوئی مذہب نہیں۔

وہ صرف ایک لڑکی ہے۔ ایک عورت ہے۔

یہی اس کا نام ہے۔

یہی اس کا مذہب ہے۔

☆☆☆

انکل انیس

باہر کے شیطان خرابی سی کر جاتے ہیں
ورنہ ہر انسان کی فطرت نوری ہوتی ہے

مسز توصیف انور میری دور کی رشتہ دار ہیں۔ بس نام کا رشتہ ہے البتہ ان کے شوہر انور صاحب سے میرا محبت کا گہرا رشتہ ہے۔ ان کی پہلی بیوی فوت ہوگئیں تو انہوں نے اپنی بہن کی مدد سے مسز توصیف سے شادی کرلی۔ تب انور صاحب ۴۵ سال کے تھے اور مسز توصیف ۲۵ سال کی۔ اگرچہ مسز توصیف نے شادی سے پہلے یہ بات چھپائی تھی کہ وہ طلاق یافتہ ہیں تاہم کچھ ان کی کم عمری نے اور کچھ انور صاحب کی طبعی شرافت نے اس اخفا کو مسئلہ نہیں بننے دیا۔

یہ لگ بھگ بیس برس پہلے کی بات ہے۔ انور صاحب کی پہلی بیوی سے چھوٹی بیٹی اپنی پھوپھی کے ہاں تھی۔ مجھے وہاں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ نو سال کی بچی کو لاہور انور صاحب کے گھر پہنچا آؤں۔ ٹرین سے رات بھر کا سفر کر کے جب میں لاہور پہنچا تو انور صاحب آفس جا چکے تھے۔ سفر کی تھکن کے باعث میں نہا کر اور ناشتہ کر کے سو گیا۔ پھر پتہ نہیں کیسے میری آنکھ کھلی، لیکن جب میں جاگا تو ڈرائینگ روم سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ انور صاحب کی بیٹی کسی مہمان کو انکل انیس کہہ رہی تھی۔ انکل انیس مُصر تھے کہ بچی باہر سے جا کر اسکنجبین کے لئے لیموں خرید آئے۔ بچی بھی اپنی معصومیت میں کہہ رہی تھی ہاں انکل! میں ابھی جا کر لے آتی ہوں لیکن مسز توصیف بار بار بچی کو باہر جانے سے روک رہی تھیں۔ آخر ان کی سرگوشی جیسی آواز سنائی دی:

”انیس! بے وقوفی مت کرو۔ اندر انور صاحب کا ایک عزیز سویا ہوا ہے“

اس سرگوشی کی آواز سن کر میں جان بوجھ کر سویا ہوا بنا رہا حالانکہ میرا پورا وجود جاگ گیا تھا۔

میں جنس کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھتا ہوں۔ معاشرتی حدود میں رہ کر اس کے تقاضے پورے ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر کوئی ان سماجی حدود کو باہمی رضامندی اور خاموشی سے پھلانگتا ہے تو میں اس پر بھی خاموش رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ہر کسی کی اپنی زندگی ہے۔ کوئی جیسے چاہے بسر کرے۔ میں دو دن لاہور رہا۔ اس دوران انکل انیس سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے مسز توصیف یا انکل انیس کو ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ مجھے ان کے ناجائز مراسم کا علم ہو گیا ہے۔ بعد میں جب کبھی کبھار لاہور جانا ہوتا، انور صاحب کے گھر پر انکل انیس سے بھی ایک آدھ ملاقات ہو جاتی۔ لیکن چند برسوں کے بعد مجھے یہ حیران کن خبر معلوم ہوئی کہ انور صاحب کے ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے دوستانہ مراسم تھے۔ انور صاحب کے گھر پر اس دن کوئی نہیں تھا چنانچہ انور صاحب اور وہ ہیڈ مسٹریس تنہائی کی موج میں دوستانہ مراسم سے آگے، کافی آگے تک چلے گئے۔ انور صاحب زندگی میں پہلی بار گناہ کی لذت سے آشنا ہوئے تھے جبکہ مسز توصیف اس میدان کی تجربہ کار کھلاڑی تھیں۔ انہوں نے ایک ہی جھٹکے میں انور صاحب سے سچ اگلوا لیا اور پھر قرآن اٹھوایا کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔ انور صاحب جو پہلے ہی عمروں کے نمایاں فرق کے باعث بیوی کے دباؤ میں تھے مزید دباؤ میں آگئے۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا، مجھے شدید دکھ ہوا۔ انور صاحب کا گناہ بے شک گناہ تھا۔ لیکن ان سے قرآن اٹھوانے والی مسز توصیف کو اس کا کیا حق پہنچتا تھا؟۔ چھاج تو بولے پر چھلنی کیوں بولے۔

ہماری دنیا، سارے معاشرے، سارے فرقے، سب کے نزدیک مجرم وہی ہے جو پکڑا جائے۔ جو مہارت کے ساتھ جی بھر کر گناہ کرے، جرائم کا مرتکب ہو لیکن پکڑا نہ جائے وہ متقی، پرہیزگار اور مومن ہے۔ بارہا یہ خیال آئے کہ انور صاحب کو جا کر ان کی بیگم کے کرتوت بتا دوں، پھر سوچتا چلو انور صاحب پر ایک قیامت تو گزر چکی اب انہیں ایک اور قیامت سے کیوں دوچار کروں۔ جیسی بھی سہی ان کی زندگی گزر تو رہی ہے، گھر بسا تو ہوا ہے۔ آخر میں نے راز افشا کرنے

کی بجائے پردہ پوشی کرنے کو ترجیح دی۔ایک عرصہ گزر جانے کے بعد آج مجھے یہ ساری باتیں پھر سے یاد آ گئی ہیں۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ میں ہوٹل پر لنچ کرنے گیا تھا۔وہاں اچانک انکل انیس دو معزز بیگمات شمیم خانم اور رضیہ بیگم کے ساتھ آن ٹپکے۔رسماً یا مروتاً ہی نہیں میں نے انکل انیس کو دلی طور پر اپنے ساتھ لنچ کی دعوت دی جو بخوشی قبول کر لی گئی۔دورانِ گفتگو پتہ چلا کہ لبرل سوچ رکھنے والے دوستوں نے مل کر خواتین کے حقوق کے سلسلے میں ایک نئی تنظیم قائم کی ہے۔اس تنظیم کی نئی شاخیں کھولنے کے لئے اور کارکردگی بڑھانے کے لئے مختلف شہروں کا دورہ کیا جا رہا ہے۔میرے ساتھ ان کی ملاقات اتفاقیہ تھی اور اسے کھانے کی میز پر ہلکی پھلکی گپ شپ تک ہی محدود رہنا چاہئے تھا لیکن تنظیم سازی کے جوش میں میرے سامنے بھی انہوں نے خواتین کے حقوق کے مسئلہ پر رٹی رٹائی جوشیلی باتیں شروع کر دیں۔میں خواتین کے حقوق کا مخالف نہیں ہوں۔خواتین کو معاشرے میں ان کا جائز مقام ملنا چاہئے۔صدیوں سے روا رکھی جانے والی ناانصافی کا خاتمہ ہونا چاہئے لیکن انکل انیس کے منہ سے خواتین کے حقوق کی باتیں مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ایک مرحلے پر میں نے ان سے پوچھا ’’اس انقلابی مہم میں مسز توصیف نے آپ کا ساتھ نہیں دیا؟‘‘

’’ارے وہ تو نری مولوانی ہے۔اسے ایسے انقلابی محاذ پر آنے کی ہمت ہی نہیں‘‘

انکل انیس کا جواب سن کر جی چاہا کہہ دوں ’’انکل! وہ مولوانی ہرگز نہیں ہیں۔انہوں نے نماز اور تسبیح کی آڑ لے کر آپ کے ساتھ ناجائز مراسم قائم کرنے کی ہمت کر لی تھی تو اس کارِ خیر میں آگے آنے کی ہمت کیوں نہیں کر سکتیں۔‘‘ لیکن میں یہ بات نہ کہہ سکا۔اس کی بجائے میں نے انہیں بتایا کہ ’’جن عورتوں پر ظلم ہوتے ہیں وہ زیادہ تر دیہاتوں میں رہتی ہیں،شہروں کے تنگ و تاریک محلّوں میں رہتی ہیں۔اس لئے اگر آپ واقعی خواتین کے حقوق کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنی تنظیم کی بیگمات کو کام کرنے کے لئے دیہاتوں میں بھیجئے،شہروں کے پرانے اور تنگ و تاریک محلوں میں بھیجئے۔سیٹلائٹ ٹاؤن اور اس طرح کی نئی آبادیوں میں مقیم خواتین بڑی حد تک اپنے حقوق سے آگاہ ہیں‘‘۔

تب انکل انیس کی بجائے شمیم خانم نے مجھے ٹوکا اور بتایا کہ ’’ماڈرن علاقے کی خواتین کے حقوق بھی پامال ہو رہے ہیں۔ہم نے اپنا کام ابھی شروع کیا ہے۔آہستہ آہستہ ہم پسماندہ محلوں اور دیہاتوں کی طرف بھی جائیں گے۔ہمیں اس غیر متوازن معاشرے کو متوازن بنانا ہے‘‘

’’آپ کے خیال میں یہ متوازن معاشرہ کیسے وجود میں آئے گا؟‘‘

’’جب مرد اور عورت کی تفریق کے بغیر صرف انسان کی بات کی جائے گی‘‘

’’اگر یہ بات ہے تو پھر انسان کے زمرہ میں صرف مرد اور عورت کو ہی نہیں سمجھیں۔مخنثوں کو بھی اس میں شامل کریں۔انسانی برادری میں سب سے زیادہ تضحیک،ظلم اور استحصال کا شکار تو پھر مخنث طبقہ ہے۔‘‘

’’یہ طبقہ بھی مردانہ چیرہ دستی کا شکار ہے‘‘اس بار رضیہ بیگم بولیں۔

’’تو پھر آپ لوگ اپنی جدوجہد انکل انیس کے بغیر شروع کریں‘‘میری بات سن کر انکل انیس نے قہقہہ لگایا لیکن ان کے چہرے سے خفت عیاں تھی۔

’’نہیں۔ابھی ہماری جدوجہد ابتدائی مرحلے میں ہے اس لئے ہمیں ابھی صرف خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنا ہے اور اس کارِ خیر میں جو مرد حضرات ہمارا ساتھ دیں گے ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے‘‘،شمیم خانم نے بڑے سلیقے سے جواب دیا۔

’’مرد ساری زندگی عیاشی کرتا رہے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔عورت سے زندگی میں ایک بار بھول ہو جائے تو اس کی ساری زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے‘‘ رضیہ بیگم کے لہجے میں تلخی تھی،انہوں نے جیسے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔میں بھی اسی سمت مڑ گیا:

’’تو کیا اس جدوجہد کا یہ مقصد ہے کہ چونکہ مرد عیاشی کرتے ہیں اس لئے عورتوں کو بھی عیاشی کرنے کا حق ملنا چاہئے‘‘

’’دیکھیں! اب آپ شدید زیادتی پر اُتر آئے ہیں‘‘انکل انیس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

’’آپ مجھے یہ بتائیں کہ جس طرح مرد اپنی کسی رشتہ دار عورت کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر غیرت کے نام پر قتل کر دیتا ہے۔عورت کو بھی آپ ایسی ہی غیرت کا مظاہرہ کرنے کا حق دیں گے

جب اسکا کوئی قریبی رشتہ دار ویسی ہی قابل اعتراض حالت میں پایا جائے؟'' رضیہ بیگم کی بات میں خاصا وزن تھا لیکن میرا اندر کا مسئلہ تو انکل انیس کو زچ کرنے کا تھا اس لئے میں نے پینترا بدل کر بات سنبھالنی چاہی،

''میں تمام معزز خواتین سے معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے بتائیں کہ خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے کی دعوے دار خواتین میں کتنی ہیں جو عاصمہ جہانگیر کی طرح ٹھوس اور عملی کام کر رہی ہیں اور کتنی ہیں جو سیمیناروں اور دَوروں کے ذریعے اپنے شوہروں کے بغیر دوسرے مردوں کے ساتھ پتہ نہیں کہاں کہاں کی سیاحت فرما رہی ہیں''

''یہ تو آپ براہ راست ہماری توہین کر رہے ہیں'' دونوں بیگمات ایک ساتھ بولیں۔

''خواتین کے حقوق کی چیمپئن ایک عورت کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔اس نے اپنے جسم کو زینہ بنایا اور ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ جب عمر ڈھل گئی تو اعلیٰ افسران کو لڑکیاں سپلائی کرنے لگی۔ بڑی معروف عورت ہے۔عورتوں کے حقوق کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں مزید بیٹھنا نہیں چاہئے'' انکل انیس یہ کہہ کر غصے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں بیگمات بھی جلالی شان کے ساتھ اٹھ گئیں۔

''انکل انیس! یہ سیدھی سادی بحث تھی لیکن آپ ناراض ہو ہی گئے ہیں تو جاتے جاتے یہ کڑوا سچ بھی سن لیجئے کہ خواتین کے لئے اتنے حقوق مانگیے جتنے آپ اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کو دے سکیں۔ کیا آپ اپنی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کو یہ حق دیں گے کہ وہ کسی اور انیس صاحب کے ساتھ اسی طرح دورے کریں''۔

میری بات مکمل ہو چکی تھی۔انکل انیس دونوں معزز خواتین کے ساتھ ہوٹل سے باہر جا چکے تھے۔

بیرا چار کھانوں کا جو بل لایا تھا خاصا بھاری تھا لیکن بل ادا کرتے وقت میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے مسز توصیف سے اس زیادتی کا تھوڑا سا بدلہ لے لیا ہے جو انہوں نے انور صاحب کے ساتھ کی تھی۔

☆☆☆

۲۷۵۰ سال بعد

اب آگے رُخ یہ کونسا کرتی ہے اختیار
حیدؔر یہ منحصر ہے مری داستان پر

میں وہ اوڈیس (odysseus) ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں اس لیے مجھے اپنے کردار کے علاوہ ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے۔ کئی صدیوں کے بعد جب تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے تو سب کچھ عین اسی طرح نہیں ہے جیسا پہلے تھا۔ تاہم تاریخ کے مرکزی کردار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بڑی حد پہلے جیسے ہیں۔ واقعات کی نوعیت میں بعض بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں اس کے باوجود واقعات کا انجام بہرحال پہلے سے کہیں بہتر ہونے کی امید ہے۔

اس بار ٹرائے کے بادشاہ Prime کے بیٹے شہزادہ پیرس نے مینی لیئس (MENELAUS) کی بیوی ہیلن کو اغوا نہیں کیا اس لئے ایگامیمنن (AGAMEMANON) کو دس سال تک ٹرائے کا محاصرہ کر کے بھائی کی اہانت کا انتقام لینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اس کی بیوی کلائی ٹمنسٹرا (CLYTAEMNESTRA) سے اس کے شدید اختلاف پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ اختلافات بڑی حد تک اجستھس (AEGISTHUS) کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ تاہم اس بار وہ ایگامیمنن کو قتل کرانے کی بجائے اس سے باضابطہ طلاق حاصل کر کے

اجستھس سے شادی کرلیتی ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی ہےلیکن کلائی ٹمنسٹرا کا کہنا ہے کہ اس نے کوئی جرم یا گناہ نہیں کیا۔جب ایگامیمنن سے نباہ نہیں ہوسکا تو اس سے علیحدگی اختیار کر کے کسی بہتر جگہ شادی کرلینا اس کا حق تھا۔سواس نے قانون کے دائرے کے اندر رہ کر قانونی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنا حق استعمال کیا ہے۔اس بار میری بیوی پینی لوپی (PENELOPE) رشتے میں کلائی ٹمنسٹرا کی سگی اور بڑی بہن ہے حسن وسیرت،شوہر پرستی،عفت و عصمت اور وفا پرستی کے سارے اوصاف پہلے کی طرح اب بھی اس میں موجود ہیں۔

سمندری دیوتا پوسی ڈان(POSEIDON)اس بار خود مصیبت میں گِھرا ہوا ہے۔دراصل اس نے سمندر کی بعض بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کو حد سے زیادہ اختیارات دے کر سر چڑھا دیا تھا۔اس سے بعض ایسی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ بعض بادشاہ بھی سمندری دیوتا کے مخالف ہوگئے اور اسے اپنے مرکز سے فرار ہوکر ایک محفوظ جگہ جا کر پناہ گزین ہونا پڑا۔اس کے باوجود اس نے اپنی بعض قوتوں کے زور سے سمندر پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھا ہے البتہ اس کی غیر موجودگی کے باعث اس کی سر پر چڑھائی ہوئی بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کو مزید کُھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

میں سمندری دیوتا کی صلاحیتوں، بالخصوص سیاسی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔شاید میرے دل میں کہیں ابھی بھی اس کے لئے تھوڑی بہت محبت کے جذبات موجود ہوں۔پوسی ڈان کے دادا سے تو میں اب بھی متاثر ہوں۔سمندری دیوتا سے میرے اختلاف کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ایک یہ کہ میں بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کے بے جا اختیارات اور ظالمانہ اقدامات کی مذمت کرتا ہوں۔جبکہ سمندری دیوتا کا خیال ہے کہ اسکے مقرر کردہ مشیروں کی مذمت کرنا خود دیوتا کی مذمت کرنے کے مترادف ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ سمندر کی گہرائی اور وسعت کے احساس کے باوجود میرا خیال ہے کہ سورج،سمندر سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔اسی لئے میں سمندری دیوتا کے مقابلہ میں سورج دیوتا کو کہیں زیادہ عظیم سمجھتا ہوں۔

بس ایسے اختلافات کی بنیاد پر سمندری دیوتا میرا مخالف ہوگیا ہے۔اس نے سمندری بلاؤں کو حکم دیا کہ مجھے ہلاک کردیں۔سمندر کی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ تو مجھ پر پہلے ہی اُدھار کھائے

بیٹھے تھے۔حکم ملتے ہی مجھے ہلاک کرنے کے لئے لپکے۔ان کے بڑے بڑے اور ہولناک جبڑوں سے پھسل کر میں ایک نوالے کی طرح ان کے حلق میں اتر جاتا لیکن شدید غصے کے باعث وہ میرے ٹکڑے کر کے اور مجھے چبا چبا کر کھانا چاہتے تھے۔شاید ان کے ذہن میں یہ خوف ہو کہ اگر مجھے سالم نگل لیا گیا تو ہوسکتا ہے یونس نبی کی طرح میں پھر زندہ نکل آؤں۔یوں بھی انہیں نہ صرف میری ذاتی مظلومیت اور سچائی کا اندر ہی اندر احساس تھا بلکہ اپنی بعض ظالمانہ حرکات کا قدرتی ردِّعمل بھی وہ دیکھ چکے تھے لیکن بجائے شرمندہ ہونے کے میرے خلاف ان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔بہرحال مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھانے کے شوق میں ان کا وارنا کام ہوا اور میں بحفاظت سمندر میں سے نکل آیا۔

اسی دوران سمندری دیوتا کی طرف سے اور اس کے متعدد پجاریوں کی طرف سے پینی لوپی کو پیار،محبت کے ساتھ یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی کہ چونکہ میں سمندری دیوتا کا باغی اور دھتکارا ہوا ہوں اس لئے وہ مجھ سے علیحدگی اختیار کرلے۔اس بار ستم ظریفی یہ ہے کہ پینی لوپی خود سمندری دیوتا سے گہری عقیدت رکھتی ہے۔اس کے خاندان کے سارے لوگ سمندری دیوتا کے پجاری ہیں۔تاہم پینی لوپی نے اس ساری صورت حال کے باوجود بڑی حکمت اور دانشمندی کے ساتھ اپنے اوڈیسس سے علیحدگی کا مطالبہ مسترد کردیا۔اس دوران تماشہ یہ ہوا کہ جن پجاریوں نے پینی لوپی کو مجھ سے علیحدگی کا مشورہ دیا تھا ان سب کے اپنے بیٹوں،بیٹیوں کے گھر اُجڑنے لگے۔ تب سمندری دیوتا نے غضب ناک ہوکر میرے خلاف فرمانِ عام جاری کیا لیکن اس فرمانِ عام کے جاری ہونے کے دو ماہ کے اندر سمندر کے بعض حصوں میں ایسا شدید طوفان آیا کہ سمندر کی پوری تاریخ میں کبھی ایسی تباہی نہیں مچی۔سمندر کا ایک چھوٹا سا حصہ اسکندریہ تو بالکل ہی برباد ہوگیا۔تب سمندری دیوتا مزید غضبناک ہوا اور اس نے اپنی قوت کے زور سے میری سلطنت اتھاکا کو اٹھایا اور اسے سات سمندر پار پہنچا دیا۔

پچھلی دفعہ میں رستہ بھٹک گیا تھا اور مجھے اتھاکا پہنچنے میں دس سال لگ گئے تھے۔اس بار اتھاکا کو مجھ سے دور کردیا گیا ہے۔بظاہر سات سمندر پار کرنے کے لئے مجھے سمندری دیوتا کی

خوشنودی حاصل کرلینی چاہیے لیکن میں جانتا ہوں کہ اب ہوائی جہاز کے ذریعے سات سمندر پار کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔اس دوران اگر سمندری دیوتا نے اپنے سیاسی اور سازشی ذہن سے کام لے کر کہیں مجھے مزید الجھانے یا بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو میں نے بھی ڈپلومیٹک رویہ اختیار کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔یوں بھی کسی کو بلیک میل کر کے جھکانے والوں کی انا کی تسکین تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔

پچھلے دنوں پھر سمندری دیوتا کے ایک بے حد اہم پجاری سے اطلاع ملی تھی کہ پینی لوپی کو مجھ سے علیحدگی کا مشورہ دینے کے لئے پھر ایک مشورت ہو رہی ہے۔لیکن یہ مشورہ جاری کرنے سے پہلے خود سمندری دیوتا کی بیوی کی موت واقع ہو گئی۔میرا خیال ہے پوسی ڈان کو اب کائنات کے سب سے بڑے مالک کے نظام کی کچھ کچھ سمجھ آ جانی چاہئے۔یوں بھی جس قسم کا وہ دیوتا ہے اس سے ملتی جلتی قوتیں تو خود میرے اندر بھی موجود ہیں۔بہرحال مجھے اب سمندری دیوتا کا کوئی ڈر نہیں لیکن نئے زمانے کی بادشاہتوں نے اپنے اپنے قانون بنا رکھے ہیں۔ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں جانے کے لئے قانونی مرحلوں کو طے کرنا ضروری ہے۔میرے نزدیک یہ انوکھے اور بے جا قوانین ہیں، تاہم مجھے اتھاکا پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔پچھلی بار میں دس سال بھٹکنے کے بعد اتھاکا پہنچا تھا، اس بار مجھے علم ہے کہ میں اس مدت سے کہیں پہلے اپنے اتھاکا پہنچ جاؤں گا۔لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، میں وہ اوڈیسس ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں۔اس لئے مجھے ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے ہومر کے برعکس میری پریشانی یہ ہے کہ میری دونوں آنکھیں سلامت ہیں۔اور مجھے کسی بادشاہ سے انعام واکرام بھی نہیں لینا ہے۔آنکھیں کھلی ہوں تو ''دیکھنے'' کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔ مجھے ابھی یہ عذاب جھیلنا ہے پھر اسے رقم کرنا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس کے بعد ایک قیامت ٹوٹ پڑے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اسی قیامت میں کوئی طوفانی لہر یا شدید تھپیڑا مجھے اتھاکا پہنچادے گا جہاں میرے عوام کے علاوہ میری پینی لوپی بھی شدت سے میرا انتظار کر رہی ہے۔

تاریخ اپنے آپ کو دُہراتے ہوئے اپنے منطقی انجام کے مرحلوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔

بے سروسامانی اور غیر یقینی حالات کے باوجود مجھے اب کوئی تشویش نہیں ہے، میں پیش آمدہ صورت حال کو اور تاریخ کے نتائج کو اب بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں ایسے دیوتاؤں یا ان کے ایسے پجاریوں کی طرح نہیں ہوں جنہوں نے تاریخ سے کبھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔

☆☆☆

بھید

بھید اپنے فقط ہمیں جانیں
اپنے منکر نکیر بھی ہم ہیں

میرے بچپن میں ہی میرے ابا جی نے ایک طرح سے میرے دل میں اس کا شوق پیدا کیا تھا۔ وہ مجھے قصّے، کہانیاں سنانے کی بجائے بزرگانِ دین کے حالات و واقعات دلچسپ پیرائے میں سناتے۔ ایسے واقعات میں بہت سی باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتی تھیں لیکن انہیں سننے میں انوکھا سا مزہ ضرور آتا تھا۔ ایک دفعہ ابا جی نے اپنے مرشد کی جڑواں بہن کے بچپن کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ سنایا:

''جنت بی بی بڑی اللہ والی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ اس نے خواب دیکھا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑی ہے۔ سمندر کی لہریں اس کی ٹانگوں تک آ آ کر لوٹ جاتی ہیں۔ بیدار ہونے پر جنت بی بی نے اپنی ماں کو اپنا خواب سنایا۔ ماں اس خواب کو سن کر بے حد حیران ہوئی کیونکہ جنت بی بی کی شلوار بھی گیلی تھی۔''

میں نے ابا جی کی بات سن کر بچپنے کی معصومانہ ہنسی کے ساتھ کہا: ''نیند میں ان کی پشی نکل گئی ہوگی۔''
ابا جی میری بات سن کر بے ساختہ مسکرا دئے۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ جنت بی بی کی شلوار

صرف گیلی ہی نہیں تھی۔ اس پر سمندر کی ریت بھی چپکی ہوئی تھی۔ اس واقعہ کی پراسراریت نے میرے دل میں یہ شوق پیدا کیا کہ میرے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آئے۔ بڑا ہوا تو کئی کہانیوں میں اس انداز کے فرضی قصے پڑھے لیکن میری خواہش تو ذاتی تجربے کی تھی۔ اس خواہش کے دوران مجھے دو بزرگوں کے ایسے روحانی تجربات پڑھنے کا موقعہ ملا:

حضرت ابو عبداللہ جلا رحمت اللہ علیہ مدینہ منورہ میں قیام فرماتے تھے۔ وہاں انہیں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ جب بھوک سے بے حال ہو گئے تو روضۂ نبویؐ پر حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں فاقے سے ہوں اور آپ کے ہاں مہمان ہوں۔ اپنی عرض کے بعد نڈھال ہو کر سو گئے تو دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اور اپنے دستِ مبارک سے آپ کو ایک روٹی عنایت فرمائی ہے۔ آپ نے آدھی روٹی کھا لی جب نیند سے جاگے تو باقی آدھی روٹی آپ کے ہاتھ میں موجود تھی۔

دوسرا واقعہ حضرت حسن بصریؒ کا تھا:

شمعون نامی ایک ستر سالہ غیر مسلم نے آپ سے کہا میری ساری زندگی تو کفر و ضلالت میں بسر ہو گئی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا اب مسلمان ہو جاؤ۔ شمعون نے کہا اگر آپ لکھ دیں کہ خدا مجھے عذاب نہیں دے گا تو میں ایمان لے آتا ہوں۔ آپ نے خط لکھ دیا۔ تب شمعون نے کہا کہ اس پر بصرہ کے معتبر افراد کی گواہی بھی کرا دیں۔ چنانچہ گواہی کرا کے خط شمعون کو دے دیا گیا۔ شمعون مسلمان ہو گیا اور اس نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو یہ خط میرے ہاتھ میں دے کر مجھے دفن کیا جائے۔ جب شمعون فوت ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق خط اس کے ہاتھ میں رکھ کر اس کی تدفین کر دی گئی۔ اُس رات حضرت حسن بصریؒ

سخت اضطراب کی حالت میں تھے۔ بار بار یہ خیال آئے کہ مجھے اپنی بخشش ہونے کا علم نہیں تو کسی اور کی بخشش کا خط کیوں لکھ دیا۔ اسی تشویش کے دوران آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھتے ہیں شمعون جنت میں پہنچا ہوا ہے اور حضرت حسن بصریؒ سے کہتا ہے میرے مولا نے ویسے ہی اتنے کرم کر دیئے ہیں کہ آپ کے خط کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس لئے اپنا یہ خط واپس لے لیں۔ حضرت حسن بصریؒ جب بیدار ہوئے تو وہ خط آپ کے ہاتھ میں موجود تھا۔

ان واقعات کو پڑھنے کے بعد بزرگانِ دین سے تمام تر عقیدت کے باوجود میں ذہنی شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گیا۔ تب میں شوگر ملز میں ملازم تھا۔ دسمبر کے آخری دن تھے۔ اس شام کو میری شام چھ بجے سے رات دو بجے تک والی شفٹ تھی۔ جب میں ڈیوٹی کے لئے جا رہا تھا تو مجھے ہلکا ہلکا سا بخار ہو رہا تھا۔ میں نے لیبارٹری میں بمشکل دو گھنٹے کام کیا تھا کہ بخار تیز ہو گیا۔ اپنے معاون کو اپنی ڈیوٹی سونپ کر میں لیبارٹری کے متروک ڈارک روم میں چلا گیا۔ وہاں فلٹر کلاتھ کا صرف ایک ٹکڑا پڑا تھا جسے میں نے بچھونا بنا لیا، سرہانے ایک اینٹ رکھی اور سکڑ کر لیٹ گیا۔ جیسے جیسے بخار چڑھ رہا تھا ٹھنڈک کا احساس بڑھ رہا تھا۔ اوپر کوئی رضائی، کمبل یا چادر نہ ہونے کے باعث کپکپی ہونے لگی تھی۔ اچانک ایسے لگا جیسے کسی نے آ کر میرے اوپر رضائی ڈال دی ہو اور پھر مجھے گہری نیند آ گئی۔ رات ڈیڑھ بجے جب چھٹی کا پہلا سائرن بجا تو میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے سے بھرا ہوا تھا، بخار ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اپنے اوپر پڑی ہوئی رضائی کو ایک طرف کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر یہ کیا؟ ڈارک روم میں کسی رضائی کا نام ونشان نہ تھا۔ یہ کیا بھید تھا؟ میں خوشی اور حیرت سے مغلوب ہو گیا۔ میں نے اپنی یہ واردات سارے عزیزوں اور دوستوں کو سنائی۔ کسی نے مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھا اور کسی نے اسے میرا وہم قرار دیا۔ ابا جی نے کہا کہ جو کچھ ہوا تھا اسے اپنے تک رکھنا تھا۔ تم اس اسرار کو برداشت نہیں کر سکے اس لئے اب آئندہ ایسے تجربے کی لذت سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ اور واقعی میں ایسے تجربے کی لذت سے محروم ہو گیا لیکن

روحانیت سے میرا لگاؤ بڑھ گیا۔ میرے شکوک وشبہات ختم ہو گئے۔ میں نے اولیائے کرام کی زندگیوں میں ایسے تجربات کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا کہ ان کے مطالعہ کی بھی اپنی ایک لذت تھی۔

☆☆

پہلے تجربے کے پورے بیس سال بعد کل رات پھر ایک انوکھی واردات ہو گئی ہے۔ مجھے ایک ہفتہ سے انفیکشن کی شکایت تھی۔ جب گلا بالکل بیٹھ گیا تب ڈاکٹر کے پاس گیا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے بیماری کے ایک ہفتہ بعد آنے پر سرزنش کی پھر پنسیلین کی گولیاں دیں۔ اس نے کہا کہ پورے سات دن تک صبح، دوپہر، شام باقاعدگی سے ان کے استعمال سے آرام آ جانے کی امید ہے لیکن ان سات دنوں میں ایک وقت کی بھی بے قاعدگی نہ ہو۔ ڈاکٹر کی اتنی تاکید کے باوجود پہلے ہی دن میں شام کی گولی کھانا بھول گیا۔ کچھ دن بھر کی تھکن تھی کچھ سستی۔ اٹھنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ بار بار ارادہ کرتا کہ ابھی اٹھ کر گولی لے لیتا ہوں لیکن نیند مجھ پر حاوی ہوتی گئی۔ پھر یوں لگا جیسے کسی نے کیپسول نما پینسلین کی موٹی سی گولی میرے منہ میں ڈال دی ہے، میں بغیر پانی کے اسے نگلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور بالآخر نگل گیا ہوں۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو اس تجربہ کی حیرت اور خوشی میرے انگ انگ میں بھری ہوئی تھی۔ پورے بیس سال بعد میں نے کائنات کے عظیم تر اسرار کو یا شاید اس کی پرچھائیں کو پھر ہلکا سا چھوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری پینسلین کی گولیوں میں سے ایک گولی ضرور کم ہو گی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ گولیوں کو چیک کیا تو کوئی گولی کم نہیں تھی۔ اتنی ہی گولیاں تھیں جتنی رات کو سونے سے پہلے موجود تھیں۔ میری حیرت اور خوشی کچھ بجھنے لگی لیکن ایک دم جیسے ان کی روشنی پہلے سے بڑھ گئی۔ گولیاں بے شک جوں کی توں موجود تھیں لیکن میرا اسرار بھرا تجربہ بھی سچ تھا۔ ڈاکٹر نے جس انفیکشن کے خاتمہ کے لئے سات دن کی میعاد بتائی تھی وہ پہلے ہی دن ختم ہو چکی تھی۔ میرا گلا بالکل ٹھیک تھا۔ کہیں ہلکی سی خراش کا احساس بھی نہیں تھا۔ میں نے زور سے آواز دے کر اپنی بیوی کو بلایا اور اسے اپنے رات کے تجربہ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس دوران میرے بچے بھی آ گئے تھے اور اور میرے قصے کو دلچسپی سے سن رہے تھے۔

جب میں اپنا تجربہ بیان کر چکا تب مجھے یاد آیا کہ مجھے تو اس بھید کو صرف اپنے تک رکھنا چاہئے تھا۔ اب مجھے اگلے تجربے کے لئے پھر بیس سال انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن میں اب ۴۴ سال کا ہو چکا ہوں اور ۶۳ سال سے آگے جانے کی تو خواہش ہی نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب ہے اب میں کسی اور روحانی تجربے سے آشنا نہ ہوسکوں گا۔

لیکن میں ۶۳ سال سے آگے جینے کی خواہش کیوں نہیں رکھتا؟

یہ بھی ایک بھید ہے، اور یہ بھید تو اب میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔

☆☆☆

اعتراف

شہرِ جاں کی دیکھ کر یخ بستگی
خواہشیں تک ہم جلانے لگ گئے

آج میں آپ کو کوئی کہانی نہیں سناؤں گا۔ آج تو مجھے اپنی ایک اُلجھن کے بارے میں بتانا ہے۔ یہ اُلجھن کچھ اتنی زیادہ الجھی ہوئی بھی نہیں ہے۔ بڑی سیدھی سادی سی الجھن ہے۔ مجھے بچپن سے ہی مکھیوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی۔ اب سوچتا ہوں ممکن ہے بچپن میں مجھے کس چھوٹی سی شہد کی مکھی نے کاٹ لیا ہو اور میں اسے بھی عام سی مکھی سمجھ کر مکھیوں سے الرجک ہونے لگ گیا۔ لڑکپن تک پہنچا تو میں نے دیکھا میرے کئی ہم عمر میز پر، کرسی کی ہتھی پر یا دیوار پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کو بآسانی مار لیتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی کئی بار دوستانہ ترغیب دی لیکن میں مکھی مارنے کے لئے کبھی بھی آمادہ نہ ہوسکا۔ میں نہیں کہہ سکتا میں مکھیوں سے خوفزدہ تھا یا مجھے ان سے کراہت محسوس ہوتی تھی یا میری الجھن کی کوئی اور وجہ تھی۔ میرے مسلسل انکار کے باعث میرے دوستوں نے مجھے بزدلی کا طعنہ دینا شروع کر دیا حالانکہ مکھی مارنا کہاں کی بہادری تھی کہ مجھے بزدل قرار دیا جاتا۔ اس کے باوجود میں نے کئی بار کوشش کی۔ چھپ چھپا کر کوشش کی کہ ایک آدھ دفعہ کسی مکھی کو مار لوں تاکہ اس معاملے میں جھجک یا خوف جو کچھ بھی ہے کسی حد تک دور ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے ہم عمروں نے میرے بارے میں یہ جملہ گھڑ لیا ''یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا''۔ جواباً میں نے

انہیں مکھی مار کہنا تو شروع کر دیا لیکن اندر ہی اندر میری الجھن اور وحشت بڑھتی گئی۔ ''یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا'' یہ جملہ کسی گرز کی طرح مجھ پر برستا اور میں اندر ہی اندر ٹوٹنے لگتا اور پھر اپنی الجھن اور دوستوں کے طعنوں کے باعث میں نے بہادری کے متبادل تلاش کرنا شروع کر دیئے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے میں نے تیرہ برس کی عمر میں جنس کے میدان میں پہلی فتح حاصل کر لی تھیں۔ میں اپنی جرأت اور بہادری پر خود ہی حیران بھی تھا اور نازاں بھی۔

لڑکپن میں پھر کئی چھوٹی چھوٹی فتوحات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ میرے ہم عمروں کو بھی ان کی کچھ کچھ بھنک سی پڑنے لگی لیکن انہوں نے یہ کہنا نہیں چھوڑا کہ یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا۔ ویسے ان کے لہجے سے اب طنز کی بجائے حسد کا اظہار ہونے لگا تھا اور ان کا یہی حسد مجھے جیسے اپنے طاقتور ہونے کا احساس دلانے لگا تھا۔ جوانی تک پہنچا تو میں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ بھرپور جوانی تک میں اپنے میدان کا اسکندر اعظم بن چکا تھا جو اپنے دائرہ کار میں آدھی سے زیادہ دنیا فتح کر چکا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کو پلٹ کر دیکھا میرے سارے ہم عمر دوست بہت پیچھے رہ گئے تھے سوائے دو دوستوں کے۔ ایک جو شاعر تھا اور لندن میں کسی میم سے شادی کر کے وہیں آباد ہو گیا تھا۔ دوسرا حمید۔ حمید میرا ہم رکاب تھا لیکن کسی ایسے جانور کی طرح جو شیر کے شکار کا ''جوٹھا'' ملنے کی امید میں حریص نظریں گاڑے بیٹھا ہو۔ لیکن اس شیر کے اپنے کچھ اصول تھے۔ چنانچہ حمید جب مجھ سے بالکل مایوس ہو گیا تو وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ جب وہ جانے لگا تو مجھے ایسے لگا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا ہو تم کہاں کے اسکندر اعظم ہو۔ تم تو مکھی بھی نہیں مار سکتے۔ اور میں اندر ہی اندر مزید ٹوٹنے لگا۔

میں نے ادھیڑ عمری میں بھی جوانی کے مزے لوٹے ہیں لیکن بڑھاپے میں اپنی باگیں اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھما دیں۔ جنس کے معاملے میں میرے اپنے اصول ہیں۔ کسی سے زبردستی ظلم ہے لیکن اگر میاں بیوی راضی ہوں تو قاضی کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ قاضی زیادہ مداخلت کرے تو بھگوان کو ساکھشی مان کر کام چلا لیجئے۔ اس طرح قاضی سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے ہمیشہ دوستی بڑھا کر اور اپنی دوست کو رضامندی سے بھی آگے راضی بہ رضا کے

مقام پر لا کر جھک ماری ہے۔ کبھی کسی سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ دھوکہ نہیں دیا۔ دو قدم کا ساتھ ہے، عمر بھر کا نہیں ہے۔ اصل میں جھوٹ، دھوکہ دہی، بلیک میلنگ، فریب کاری یہ سارے جوہر تو آج کے زمانے میں اخلاقیات اور سیاست کے نمبرداروں نے اپنا رکھے ہیں۔ بہرحال میری صاف گوئی یا حماقت کا اندازہ اسی بات سے کر لیں کہ میں نے اپنی بیوی سے اپنی کوئی فتح پوشیدہ نہیں رکھی حالانکہ ایسے معاملات کا بھلے ساری دنیا کو علم ہو جائے صرف بیوی کو علم نہیں ہونا چاہئے۔

مجھے اپنی ساری زندگی میں صرف دو دفعہ شدید پچھتاوا ہوا ہے۔ ایک دفعہ تب ہوا جب میرے بچپن کے دوست اور لندن میں مقیم شاعر کی میم بیوی میرے پیچھے پڑ گئی۔ اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا دوست جنسی لحاظ سے ناکارہ ہو گیا ہے اور اب نوجوان لڑکوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنا objective گزارا کر رہا ہے۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں مجھے دوست کا لحاظ مار گیا۔ میں نے اپنی جھولی میں خود بخود آ کر گرنے والے پھل کو اٹھا کر اپنے دوست کی فرج میں رکھ دیا۔ اپنی اس شرافت پر میں آج بھی شرمندہ ہوں۔ مجھے اس میم کو مایوس نہیں کرنا چاہئے تھا۔ دوسری دفعہ مجھے اس وقت پچھتاوا ہوا جب لاہور کی ایک بُری عورت کی خواہش میں نے پوری کر دی۔ مجھے اس عورت کی صورت کسی مکھی کی طرح لگنے لگی ہے اسی لئے میرے پچھتاوے میں کراہت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے یہ باتیں بھی اپنی بیوی کو بتا دی تھیں۔

بیوی سے یاد آیا۔ میرے نانا جی اور تایا جی کو بڑھاپے میں نئی بیوی لانے کا بہت شوق تھا۔ ان بے چاروں کے شوق تو پورے نہ ہوئے البتہ بڑے ماموں نے ستر سال کی حد پار کرنے کے بعد بھی بازی جیت لی۔ لوگوں نے بہت بکواس کی۔ ان کے بڑے بیٹے کی بیوی نے کئی برس پہلے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ لوگوں نے اسے ہی جواز بنا لیا: وہ بے چارہ ابھی تک دوسری شادی نہیں کر سکا اور اس بوڑھے کو دیکھو بیٹے کا رشتہ کرانے کی بجائے خود شادی رچا بیٹھا۔ مولوی، مولوی ہی ہوتا ہے چاہے کسی مسلک کا ہو۔ اپنی بیٹی کی ہم عمر عورت سے شادی رچا بیٹھا ہے اور اب دین سے اس کی سند اور جواز پیش کر رہا ہے۔ ارے ایک بیٹی بھی تو بیوہ ہے اس کی۔ اگر دین کا اتنا ہی پاس تھا تو پہلے اپنی بیوہ بیٹی کا کہیں رشتہ کراتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ پر مجھے اپنے ماموں کی یہی

ایک خوبی تو بھائی تھی۔بہتر سال کی عمر میں شادی۔جیئو بڑے ماموں زندہ باد!

صاحبان!۔۔۔۔۔۔۔اس وقت میں اسی برس سے اوپر کا ہو گیا ہوں۔اب اس عمر میں کہاں تک جھوٹ بولوں لیجئے آپ کو سچی بات بتا ہی دوں۔حمید نامی کوئی شخص کبھی بھی میرا دوست نہیں رہا۔میرے اندر ساٹھ سال تک تو بہر حال جنس کا طوفان سا مچا رہا لیکن یہ طوفان کبھی بھی کناروں سے باہر نہیں آیا۔میری فطرتی بزدلی نے میرے کناروں کو بہت بڑے بند میں تبدیل کر دیا تھا۔میری جنسی فتوحات کی ساری کہانیاں میری خواہشات کا لفظی بیان تھیں اور بس۔اس لفظی بیان کی جادوگری کام کرتی رہی۔مجھے بزدل کہنے والے مجھے حسد بھری نظروں سے دیکھتے اور جل کر من ہی من میں کہہ دیتے ہونہہ یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا۔اب وہ سارے دوست مر کھپ چکے ہیں تو پھر مزید جھوٹ بولنے سے فائدہ؟ یوں بھی جنس کا طوفان تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔اب تو میرے اندر اور باہر برف ہی برف ہے۔(پر یہ ''خواہش'' ابھی تک کیوں نہیں مری؟)

ابھی ابھی ایک انوکھی بات ہو گئی ہے۔ہلکی سی دھپ کی آواز کے ساتھ دو جُڑی ہوئی مکھیاں میرے میز پر آن گری ہیں۔ان کے ''طرزِ عمل'' سے مجھے علم ہو گیا ہے کہ ایک نر ہے اور ایک مادہ۔میں نے کسی وحشت یا کراہت کے بغیر انہیں دلچسپی سے دیکھا ہے۔کاش میرے سارے بچپن کے دوست اس وقت زندہ ہوتے اور یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

میں نے اخبار اٹھا کر اسے تھوڑا سا فولڈ کیا ہے اور اس کے ایک ہی وار سے نر اور مادہ دونوں مکھیوں کو ''دورانِ عمل'' ہی ختم کر دیا ہے۔

☆☆☆

بابا جمالی شاہ کا جلال

وادیٔ حیرت میں حیدؔر دیکھ لو
سارے فرزانے ٹھکانے لگ گئے

جو کچھ جیلے کے ساتھ ہو گیا ہے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!

لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اس پر اور اس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

مولوی عطاء الرحیم پہلے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔وہاں کی چھوٹی سی مسجد میں نمازیں پڑھاتے، گاؤں والوں کو خدا، رسولؐ کی باتیں سناتے۔گاؤں والوں کو ان کی باتیں سمجھ میں آتیں یا نہ آتیں لیکن سارے لوگ ان کی بہت عزت کرتے۔حالات نے پلٹا کھایا تو وہ گاؤں سے شہر آ گئے۔یہاں ترقی کرتے کرتے وہ شہر کی جامع مسجد کے امام بن گئے۔دیکھتے ہی دیکھتے پہلے موٹر سائیکل، پھر کار اور آخرکار پجارو کے مالک بن گئے۔اب اُن کا رعب دبدبہ بھی بہت ہو گیا تھا۔ہر شعبۂ حیات کے لوگ اُن کی خوشامد کرتے۔ان کے آگے آنکھیں بچھاتے چلے جاتے۔لوگوں کی خوشامد اور دولت کی ریل پیل نے انہیں وسیع المشرب اور راسخ العقیدہ عالم کی جگہ متعصّب اور کٹڑ پن کا شکار مولوی بنا دیا تھا۔

اب مجھے احسااس ہو رہا ہے کہ جیلے کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں شاید تھوڑا سا میرا بھی قصور ہے۔میں نے ایک دفعہ اسے ایک مجذوب کا قصّہ سنایا تھا۔مغلیہ دور میں جب ایک اہم

مغل بادشاہ کی تیار کرائی ہوئی عالی شان مسجد میں پہلی نماز ہونے لگی تو ایک مجذوب بھی نماز کے مقتدیوں میں شامل ہوگیا۔ مغلوں کے مقرر کردہ امام نے نماز شروع کی تو اُس مجذوب نے بلند آواز میں کہا: جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔ مغل بادشاہ، ان کے سرکاری امام اور سارے درباریوں کو مجذوب کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ نماز کے بعد اس مجذوب کو ڈانٹا گیا تو اُس نے بڑی سادگی سے کہا میرے قدموں کے نیچے کی زمین کھود کر دیکھ لو، میں نے جو کچھ کہا ہے، سچ کہا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے اسی وقت وہاں کھدائی کی گئی تو ایک تھیلی برآمد ہوئی جس میں سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔ سب لوگ اس واقعہ پر ابھی حیران ہی تھے کہ اس مجذوب نے کہا:

''نماز شروع کرتے ہی امام نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شاہی مسجد کی پہلی نماز پڑھا رہا ہوں۔ ظلِ الٰہی بہ نفس نفیس حاضر ہیں۔ کم سے کم سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تو ضرور انعام میں عطا کریں گے۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔''

جب میں نے جیلے کو یہ قصہ سنایا تھا، اس کی آنکھوں میں معصومانہ حیرت تھی۔ پھر وہ مجھ سے وقتاً فوقتاً صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے حالات پوچھتا اور سنتا رہتا۔ پھر کہیں ایک دن اس نے اپنے باپ مولوی عطاالرحیم کے سامنے بھی چند قصے دہرائے تو مولوی عطاالرحیم بھڑک اٹھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا بیٹا اس حد تک ''گمراہ'' ہو چکا ہے۔ انہوں نے بڑی مہارت سے جیلے کو کنٹرول کیا۔ چنانچہ ایک مختصر سے وقفہ کے بعد میری جیلے سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے مولوی باپ کے عطا کردہ علم کے باعث اپنی معصومیت اور حیرت کھو چکا تھا۔ اب وہ مجھے بتا رہا تھا کہ یہ سب مجذوب فقیر ڈھونگی ہوتے ہیں۔ اولیاء کو مجذوبوں کے ساتھ نہیں ملانا چاہئے۔ پھر وہ مجھے تصوف کی تعریف اور اس کے بعض مراحل کی بابت بتانے لگا جو ظاہر ہے مولوی عطاالرحیم نے اپنے کچے پکے علم کی بنیاد پر اسے رٹا دیا تھا۔ میں نے اسے توجہ دلائی کہ تصوف کے بارے میں جاننا اور صوفیانہ تجربے سے گزرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن میری بات اب جیلے کی نظر میں نچ نہیں رہی تھی۔ الٹا وہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ مغلیہ دور کے امام سے الجھنے والا مجذوب دراصل ملحد

تھا۔ پورا کلمہ نہیں پڑھتا تھا اسی لئے اسے قرآن و سنت کی روشنی میں قتل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ اس مجذوب کی شہادت میں مذکورہ امام کی سازش شامل تھی جس نے اپنی سبکی کا بدلہ لینے کے لئے مذہبی عقائد کا ڈرامہ کیا تھا۔ بس اسے اتنی نصیحت کر دی کہ وہ کسی بھی مسلک پر کاربند رہے لیکن کبھی کسی مجذوب فقیر سے نہ الجھے۔

☆☆

بابا جمالی شاہ شہر کے درمیان میں واقع قبرستان میں ہی اکثر دیکھے جاتے تھے۔ کبھی کبھار شہر کی سڑکوں پر بھی اپنی دُھن میں جاتے نظر آجاتے تھے۔ کسی کی دعا کی درخواست قبول کرنا ان کے موڈ پر منحصر تھا لیکن جس کی دعا کی درخواست قبول کرتے فوراً 'ہاں' یا 'نہ' میں جواب دے دیتے تھے۔ خود میں نے اپنے دسویں کے امتحان کے بعد ان سے کہا تھا کہ جمالی بابا دعا کریں میں دسویں میں پاس ہو جاؤں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ان کے بے آواز ہونٹ تھوڑی دیر کے لئے ہلے، جیسے خدا سے دعا کر رہے ہوں پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا: جا بچہ۔ تو پاس ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے خیال آگیا کہ فرسٹ ڈویژن بھی مانگ لوں۔ چنانچہ میں نے جمالی بابا سے پھر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کی دعا کے لئے بھی کہہ دیا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا پھر اُسی طرح بے آواز ہونٹ ہلانے لگے۔ جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ان میں مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگے یہ دعا بھی پوری ہوئی۔ قدرت خدا کی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ تاہم کسی کی دعا کی درخواست سننا بابا جمالی شاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔ عموماً وہ بڑے لوگوں کی درخواست پر دھیان نہیں دیتے تھے۔

ایک بار علاقے میں بارشیں نہیں ہوئیں۔ فصلوں کے نقصان اور قحط کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ تب مولوی عطاءالرحیم نے ایک دن پہلے سارے شہر میں نماز استسقاء کے لئے اعلان کرایا اور اگلے دن بڑی عیدگاہ میں نماز استسقاء پڑھائی، لیکن بے سود۔ لگ بھگ ایک ہفتے کے بعد بعض غریب غرباء بابا جمالی شاہ کے پاس بارش کی دعا کرانے کے لئے گئے۔ بابا جمالی شاہ نے اپنے معمول کے مطابق آنکھیں نہیں موندیں۔ مزاروں سے کھجور کی چند چھڑیاں اٹھائیں اور سڑک پر آ گئے۔ انہوں

نے وہ چھڑیاں زور زور سے سڑک پر مارنا شروع کر دیں۔سڑک پر دو تین بار چھڑی مارنے کے بعد
ایک بار آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتے اور پھر جیسے ڈانٹنے کے انداز میں کہتے:
:''اوئے! مینہ برساتا ہے یا نہیں؟۔میں کہتا ہوں مینہ برساؤ''

میرا خیال ہے کہ ہر بندے کی خدا کے ساتھ تعلق کی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔خدا تو اندر کے
سارے بھید جانتا ہے۔وہ کسی کی عاجزی میں بھی ریاکاری کی بُو پائے اور اسے دھتکار دے اور کسی
کی بے ادبی جیسی بے تکلفی میں بھی محبت کی خوشبو پائے اور اس کے ناز اٹھالے۔بابا جمالی شاہ
ساری چھڑیاں سڑک پر مار مار کر توڑ چکے تو پھر قبرستان واپس چلے گئے لیکن سارے شہر نے
دیکھا کہ گھنگھور گھٹائیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں۔پھر ایسی برسات ہوئی کہ قحط کے سارے خوف دُھل
گئے۔

ویسے تو مولوی عطاء الرحیم اس واقعہ کے بعد سے ہی بابا جمالی شاہ کے سخت خلاف ہو گئے
تھے لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک بار مولوی صاحب کو رات کی تاریکی میں بابا جمالی
شاہ کے پاس جاتے دیکھا تھا۔شاید مولوی صاحب نے انہیں دعا کی درخواست کی ہو اور بابا جمالی
شاہ نے انہیں جواب ہی نہ دیا ہو۔تھوڑے ہی دنوں کے بعد پتہ چلا کہ مولوی عطاء الرحیم کی
رپورٹ پر بابا جمالی شاہ کو پڑوسی ملک کے لئے جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے لیکن
گرفتاری کے تیسرے ہی روز پتہ چلا کہ بابا جمالی شاہ پر تشدد کرنے والا چھوٹا تھانے دار پاگل
ہو گیا ہے اور تھانے کے عملہ نے خوفزدہ ہو کر بابا جمالی شاہ کو چھوڑ دیا ہے۔اس واقعہ کے بعد مولوی
عطاء الرحیم کے غیض و غضب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ان کے اشارے پر ان کے بیٹے جیلے نے
بہت سارے بچوں کو ٹافیوں کا لالچ دے کر وقتاً فوقتاً بابا جمالی شاہ پر پتھراؤ کرنے اور انہیں پاگل
پاگل کہنے کی ڈیوٹی پر لگا دیا۔میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسے مجذوبوں کو ان کے حال پر
چھوڑ دینا چاہئے لیکن وہ بابا جمالی شاہ کو کوئی بہت بڑا چالباز اور مکار قرار دے رہا تھا۔اس کا کہنا
تھا کہ بابا جمالی شاہ مسمریزم کا عمل جانتا ہے اسی لئے تھانے والوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب
ہو گیا ہے۔

☆☆

آج بعد نماز عصر نوجوانوں کا ایک گروہ ایک جنازہ اٹھائے ہوئے بابا جمالی شاہ کے پاس
پہنچا تھا۔یہ سارے لڑکے جیلے کے دوست یا واقف کار تھے۔میّت کے طور پر جیلا لیٹا ہوا تھا۔ان کا
پروگرام تھا کہ پہلے بابا جمالی سے کہیں گے کہ یہ ایک میّت ہے اس کا جنازہ پڑھا دیں۔جب
بابا جنازہ پڑھا دیں گے تو پھر سب مل کر بابا کا مذاق اڑائیں گے۔اس پروگرام کا روحِ رواں جیلا
تھا اسی لئے وہ خود میّت بنا پڑا تھا۔لڑکوں نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ بابا جمالی شاہ سے کہا
کہ یہ ایک میّت ہے اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں۔بابا نے نماز جنازہ پڑھانی شروع کر دی حالانکہ
پیچھے کوئی صف بھی نہیں بنی تھی، نہ ہی کوئی اور نماز جنازہ میں شریک تھا، بابا جمالی اکیلے ہی لگے
ہوئے تھے، جب انہوں نے آخری سلام پھیرا تو لڑکوں نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع
کر دیئے اور کہنے لگے: بابا جمالی! یہ تو مولانا عطاء الرحیم کا بیٹا جیلا ہے اور زندہ ہے۔

تب بابا جمالی شاہ نے بڑے جلالی انداز میں کہا:

یہ جو کوئی بھی تھا اب صرف قیامت کے دن ہی اٹھے گا کیونکہ اس کا جنازہ جمالی شاہ نے
پڑھا دیا ہے۔

تمام حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔جیلا واقعی مر چکا تھا۔

☆☆

جو کچھ جیلے ساتھ ہو گیا ہے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!

لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اُس پر اُس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

☆☆☆

مسکراہٹ کا عکس

روشنی کا استعارہ کر لیا
دل نے ہر آنسو ستارہ کرلیا

ایک بہت بڑے فریم میں اباجی کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگا کے میں نے فریم کو اپنے ڈرائنگ روم میں آویزاں کر رکھا ہے۔ گھر کے باقی کمروں میں بھی ان کی چھوٹی چھوٹی تصویریں سجا رکھی ہیں اور یہ ساری تصویریں میرے من میں بھی سجی ہوئی ہیں۔ گو انہیں فوت ہوئے ایک زمانہ ہو گیا ہے لیکن ان تصویروں کے باعث مجھے گھر میں ان کی موجودگی کا گمان رہتا ہے۔ ڈرائینگ روم والی بڑی تصویر اس لحاظ سے باقی ساری تصویروں سے الگ ہے کہ اس میں اباجی کے چہرے پر ولیوں جیسی شان بے حد نمایاں ہے۔ میک اپ کر کے اپنے چہرے پر نُور ظاہر کرنے والے نام نہاد مقدس لیڈروں سے مختلف، اپنے اندر کی روشنی سے منوّر اباجی کا چہرہ۔ اور پھر اس چہرے میں دو جگمگاتی آنکھیں۔ ان جگمگاتی آنکھوں میں عجیب اسرار ہیں۔ میں کبھی کوئی بہت اچھا اور نیکی کا کام کرتا ہوں تو اباجی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔ میں سب سے بچ بچا کر اور چھُپ چھپا کر بھی کوئی برا کام کر بیٹھوں تو اباجی کی آنکھوں سے برہمی بلکہ تادیب کی لَو بھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔

کسی نے مجھ سے زیادتی کی۔۔۔ میں نے اس سے برابر کا بدلہ لے لیا۔ اباجی کی آنکھوں کی

اداسی جیسے بولنے لگتی ہے: اس نے تمہیں دُکھ پہنچایا، برا کیا۔ تم نے فوراً بدلہ لے لیا۔ کیا مل گیا بدلہ لے کر؟ کبھی دکھ کو سہہ جانے کا مزہ بھی چکھ کر دیکھو!

بعض بھائیوں نے میرے ساتھ ہاتھ کیا، میں نے انہیں سبق سکھانا چاہا تو اباجی کی دکھ سے بھری آنکھیں مجھے نصیحت کرنے لگیں: تم سارے بھائی میرے ہی وجود کی شناخت ہو۔ وہ چھوٹے ہیں، نادان ہیں۔ انہیں نقصان پہنچاؤ گے تو وہ بھی تمہارا نقصان ہوگا۔ تم جیتو یا ہارو، دونوں صورتوں میں خود ہی ہارو گے اور مجھے ہی ہراؤ گے۔

کبھی کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میں ٹین ایج میں ہوں اور اباجی ہمہ وقت جا، بے جا مداخلت کر کے مجھے اپنے بنائے ہوئے سیدھے رستے پر چلائے رکھنا چاہتے ہیں اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ فریم میں اباجی کی تصویر نہیں، ایک آئینہ ہے۔ میں اس کے روبرو ہوتا ہوں تو گویا اپنے روبرو ہوتا ہوں۔ مجھ پر میرے اندر سے اچھائی اور برائی کا فرق منکشف ہونے لگتا ہے۔ نیکی اور خیر کی تحریک ملنے لگتی ہے۔

ایک بار میں نے اپنے تینوں بیٹوں کی اباجی کے ساتھ تصویر کھینچی تھی۔ ٹیپو، اباجی کی گود میں تھا اور زلفی، شازی اُن کے دائیں، بائیں۔ مدت کے بعد اس تصویر کو دیکھا۔ میں تصویر میں موجود نہیں تھا لیکن میں نے ہی تو تصویر کھینچی تھی۔ سواِس تصویر میں اپنی موجودگی، اپنی شرکت کا احساس جاگا۔ اپنے تینوں بیٹوں اور اباجی کی گروپ تصویر کو دیکھ کر میں جیسے درجۂ شہود میں داخل ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود میں میرے ماضی، حال اور مستقبل کے تینوں زمانے یک جا ہو گئے ہیں۔ سارا زمان ایک نقطے میں ڈھل گیا ہے۔ شاہد و مشہود کی تفریق ختم ہو گئی ہے۔ لیکن اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اباجی مجھے روکتے، ٹوکتے کیوں رہتے ہیں؟۔ تب ہی نقطۂ زماں پھیلنے لگا اور میں اپنے لڑکپن سے جوانی کے دور میں داخل ہونے لگا۔ ہر نصیحت سے غافل اور بیگانہ۔ خواہشات کا اژدہام تھا اور میں تھا۔ میں منزلوں پر منزلیں مار رہا تھا۔ خواہشات کی نوعیت بدلتی گئی، عمر ڈھلتی گئی لیکن خواہشیں جہنم کی طرح **ھل من مزید** پکارتی رہیں۔ بے شک انسان حریص ہے کہ اسے سونے کا پہاڑ مل جائے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے ویسے ہی ایک اور پہاڑ کی خواہش

کرنے لگے گا۔خواہش کے جہنم کا کوئی انت نہیں ہے،اس سے نکل آنے میں عافیت ہے۔اور پھر میں اپنے گوتم کے پاس آ گیا۔خواہشوں کے جہنم سے نکل آنے کے بعد ابا جی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں بیک وقت خفگی اور خوشی کا تاثر تھا:

’’خواہش پوری ہونے پر تسکین نہیں ہوتی بلکہ حرص کا روپ دھار لیتی ہے۔جتنی خواہشیں پوری ہوتی جاتی ہیں اتنا ہی حرص بڑھتا جاتا ہے۔ یہ پیاس اور یہ آگ کبھی بھی نہیں بجھتی۔ خواہشیں بے انت سراب کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں ہیں!‘‘

’’ابا جی! میں جوگی نہیں ہوں۔صوفی اور تیاگی نہیں ہوں۔ان سب کی جی جان سے عزت کرتا ہوں لیکن ان جیسا بننا نہیں چاہتا، میں آپ جیسا ہی بننا چاہتا ہوں۔ زندگی کو بھوگتے ہوئے اپنی ریاضت، اپنی تپسّیا مکمل کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ کے برعکس میری خواہشیں،حرص میں ڈھلنے لگتی ہیں اور میری ساری ریاضت برباد ہو جاتی ہے،ساری تپسیا بھنگ ہو جاتی ہے۔اور ابا جی! آپ نے مجھے کبھی قناعت کا درس بھی تو نہیں دیا تھا۔شاید اسی لئے خواہشوں کو مکمل طور پر تیاگ دینا میرے لئے ممکن نہیں ہے‘‘

یہاں تک بات کرتے کرتے میری آنکھوں کا پانی پلکوں تک آ گیا تھا۔ پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسوؤں نے سارا منظر دھند میں لپیٹ دیا تھا۔لیکن یہ کیا؟

دراصل ہمارے اندر کی دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ باہر کی،ظاہر کی دنیا سے یہ سب کچھ الگ تھلگ ہوتا ہے۔اپنے اندر کی دنیا میں مگن رہنے کے باوجود میں اندر اور باہر کی دنیاؤں کے اس فرق کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ابا جی کی تصویر سے میرے تعلق کی نوعیت بھی حقیقتاً داخلی تھی۔ظاہر کی دنیا کے حساب سے تو شاید ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بھی پوری طرح دیکھا تھا کہ ابا جی سچ مچ تصویر کے فریم سے باہر نکلے، اور صوفے پر آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ اپنی پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے۔لیکن آنسو تو امڈتے ہی چلے آتے تھے۔جیسے سیلاب بن کر خواہشوں کے اژدہام کو بہالے جانا چاہتے تھے۔تب ابا جی نے بیٹھے ہی بیٹھے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا۔

شاید وہ بول نہیں سکتے تھے اور اسی طرح مجھے دلاسہ دے رہے تھے۔ پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے جانے اور ابا جی کا مجھے خود سے لپٹانے کا میرا تجربہ خیالی یا روحانی قطعاً نہیں تھا۔یہ مکمل طور پر جسمانی اور ظاہری وقوعہ تھا۔

میں نے آنکھوں کو اچھی طرح صاف کیا اور آنسوؤں کی دھند کو ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔میرے تینوں بیٹے میرے پاس تھے۔ٹیپو نے مجھے بانہوں میں بھینچ رکھا تھا، شازی میرا کندھا دبا رہا تھا سامنے زلفی کھڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں بھیگا ہوا رومال تھا۔

’’ابا جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ کو بیٹھے بیٹھے کچھ ہو گیا تھا۔کیا ڈاکٹر کو بلالیں؟‘‘

پتہ نہیں تینوں بیٹوں میں سے کون بول رہا تھا۔

مجھے ایسے لگا جیسے ابا جی کے ساتھ میرے دادا جی اور پردادا جی بھی میری عیادت کے لئے آئے ہوئے ہیں اور میرے پوتے اور پڑپوتے بھی میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔زمان کو پھر ایک نقطے میں سمٹتے دیکھ کر مرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ میں نے سامنے ٹنگی ہوئی ابا جی کی تصویر کی طرف دیکھا تو اُن کے ہونٹوں پر بھی مجھے اپنے جیسی مسکراہٹ دکھائی دی۔جلتی، بجھتی، چمکتی مسکراہٹ۔

پتہ نہیں ابا جی کی تصویر کے ہونٹوں پر میری مسکراہٹ کا عکس تھا یا میرے ہونٹوں پر ابا جی کی مسکراہٹ کا عکس تھا!

☆☆☆

”روشنی کی بشارت“اور”قصے کہانیاں“
دوافسانوی مجموعوں کے بعد لکھے گئے

افسانے

کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار

(اپنے پوتے شہریار حیدر کے نام جس نے اس کہانی کو مکمل کرایا)

داستاں گو کی ذات سے اُبھرے
جتنے کردار داستاں کے تھے

یہ ایسے کہانی کار کا قصہ ہے جس کے سامنے کہانیاں بار بار آتی ہیں کہ وہ انہیں اپنا تخلیقی لمس عطا کر کے ادبی دنیا کے سامنے پیش کرے لیکن کہانی کار ان کہانیوں سے بھاگا پھر رہا ہے۔اتنی ساری کہانیاں جو اس کا ایک نیا افسانوی مجموعہ تیار کر دیں۔ یہ کہانی کار صحافیانہ طرز کے افسانے اور ناول لکھنے والا ہوتا تو اب تک ایسی ہر کہانی کی دو دو تین تین کہانیاں بنا کر دو تین مجموعے چھپوا چکا ہوتا۔ دراصل کہانی کار کی جان ایک کہانی میں اٹکی ہوئی تھی اور وہ کہانی پوری طرح اس کی گرفت میں نہیں آرہی تھی۔بس فلمی عشق جیسی سچوئیشن ہو رہی تھی، جو کہانیاں کہانی کار کے پیچھے تھیں، وہ انہیں لفٹ نہیں کرا رہا تھا اور وہ جس کہانی کے تعاقب میں تھا وہ ٹھیک سے اس کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔

کہانی کار جس کہانی کے تعاقب میں تھا وہ دراصل ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کے موضوع سے متعلق تھی۔ایٹمی جنگ کے بعد چند انسان روئے زمین پر کسی طرح بچ گئے تھے اور بد قسمتی سے وہ سب الگ الگ مذاہب اور الگ الگ فرقوں کے لوگ تھے۔ پانی کے عظیم طوفان، طوفانِ نوح میں اچھے اچھے جوڑوں کو کشتی میں محفوظ کر کے بچا لیا گیا تھا تا کہ دنیا کو اس کے گناہوں

کی سزا دینے کے بعد پھر سے زندگی سے لبریز کیا جا سکے۔لیکن یہ کہانی جو کہانی کار کے قابو میں نہیں آ رہی،اس میں پانی کے طوفان سے زیادہ بڑا اور ہولناک ایٹمی طوفان آ چکا ہے۔اتنی ترقی یافتہ اور ہنستی بستی دنیا پتھر کے زمانے میں چلی گئی ہے لیکن پتھر کے زمانے جیسی بے خبری سے بھی محروم ہو چکی ہے۔پہلے پہل زندہ بچنے والے ایک فرقے کے فرد نے جب دیکھا کہ وہ زندہ بچ گیا ہے تو اُس نے اسے اپنے مسلک کی سچائی قرار دے کر خود کو خدا کا پسندیدہ بندہ سمجھ لیا۔لیکن جب معلوم ہوا کہ ایسے کتنے ہی ''خدا کے پسندیدہ بندے'' بچ گئے ہیں اور وہ سب کے سب متحارب مذاہب اور فرقوں کے افراد ہیں تو پھر ان سب کے درمیان مذہبی مخاصمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔سب ہی خدا کے نیک بندے ہیں اور سب ہی ایک دوسرے کی تکفیر و تکذیب کر کے اپنی صداقت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔اتنے بڑے پیمانے پر ہو جانے والی انسانی تباہی اور ساری دنیاوی ترقیات کے خاتمہ کی بھی ان لوگوں کو پرواہ نہیں ہے اور اب بھی یہ سارء بچے کھچے مذہبی لوگ ایک دوسرے کے خلاف اپنا اپنا زہر اگل رہے ہیں۔ایک دوسرے کی تکفیر و تکذیب کر رہے ہیں۔

کہانی کار جو ہمیشہ سے اس دھرتی پر انسانوں کے کے رہنے کی تمنا کیا کرتا تھا،اس منظر پر حیرت زدہ ہے اور سارے فرقہ پرستوں کی پرانی متعصّبانہ روش سے تنگ آ کر دھرتی سے انسانوں کے مکمل خاتمہ کی دعا کرنا چاہتا ہے لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی کہ کہانی کو کیسے مکمل کرے۔کیا بددعا پر کہانی کو ختم کیا جائے یا پھر کوئی آسمانی آفت لا کر سارے بچے کھچے متعصب انسانوں کو ختم کیا جائے۔اگر آسمانی آفت لائی جائے تو کیسی ہو؟ کہانی کار ابھی تک اس مسئلے میں الجھا ہوا ہے اور کہانی اسی وجہ سے اس کے قابو میں نہیں آ رہی۔

جو ڈھیر ساری کہانیاں کہانی کار کے پیچھے پڑی رہتی ہیں ان میں سے کئی واقعی بڑی عمدہ کہانیاں ہیں۔کہانی کار اپنے مخصوص انداز کے ساتھ انہیں بہترین کہانیوں کا روپ دے سکتا ہے لیکن اس کا دل تو اسی کہانی میں اٹکا ہوا ہے۔

ایک اولڈ ہوم میں ملازمت کے باعث کہانی کار کو اولڈ ہوم کے ہر کردار میں ایک جاندار کہانی ملتی ہے۔Frau Wells جب اس ہوم میں آئی تھی تو پوری طرح باہوش و حواس

تھی۔چلنے پھرنے،اٹھنے بیٹھنے،کھانے پینے میں ایک وقار جھلکتا تھا۔چند دنوں کے بعد ہی اس کی ذہنی حالت متغیر ہو گئی۔ایسے لگتا جیسے کوئی کوما کی حالت میں چل رہا ہو۔Frau Bongers تو جب ہوم میں آئی تب ہی سے گمشدہ دکھائی دی۔Frau Olbrisch, Frau Voss, اور Frau Hoppe کی سوئیاں جیسے اپنی اپنی زندگی کی کسی ایک ہی جگہ پر اٹکی ہوئی تھیں۔فراؤ اولبرِش وقفے وقفے سے بی بی مریم اور یوسف (نجار) کے رشتے پر کچھ ایسی بات کرتی کہ کچھ سننے والے ہنس پڑتے اور کچھ خاموشی میں ہی عافیت سمجھتے۔کہانی کار بھی کبھی اس کے اسٹیریوٹائپ جملے پر ہنس پڑتا اور کبھی بیزاری کی حد تک بیگانگی محسوس کرتا۔ایک بار یونہی اسے خیال آیا کہ اگر فراؤ اولبرش اس کے پرانے وطن میں ہوتی اور وہاں ایسی یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات کہتی تو اس کی غیر حاضر دماغی کے باوجود اور پچانوے سالہ عمر کے باوجود وہاں کے دینی غیور حضرات اسے ہلاک کر کے ثواب کما چکے ہوتے۔فراؤ فوس کی سوئی بھی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔وہ تین الفاظ باری باری بولتی اور بولتی ہی رہتی۔..Bitte mal kommen, hallo, aua (براہِ کرم ادھر آؤ،ہیلو،ہائے مجھے تکلیف ہو رہی ہے) یا پھر Hilfe کی صدا لگا کر مدد کے لئے پکارتی۔کئی بار ایسا ہوا کہ کہانی کار خود اس کی پہلی صدا پر اس کے پاس پہنچا۔اس کی خیریت دریافت کی۔سب خیر ہے نا؟ پوچھا۔فراؤ فوس اس کے باوجود اپنے جملے دہراتی رہی۔تب کہانی کار نے اس کے پہلے تین الفاظ کو ردھم کی صورت میں گنگنانا شروع کر دیا۔بِٹّے مال کومِن ،ہلّو۔اوّا۔۔۔ بِٹّے مال کومِن ،ہلّو۔اوّا۔۔۔فراؤ ہوپے کی سوئی بھی پہلے دن سے دو باتوں پر اٹک گئی۔میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور میں کہاں رہتی ہوں؟ جب بھی اسے کھانا دینے لگو وہ یہی کہتی کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔اور جب کھانا کھا لیتی تو پوچھنا شروع کر دیتی کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ایک دو بوڑھیاں تو کبھی کبھار کپڑوں سے بھی بے نیاز ہونے کی تگ و دو کرتیں۔وہ تو خدا بھلا کرے ان نرسوں کا جو ان کی نیپیز اتنی کس کر باندھتی تھیں کہ اسٹرپ ٹیز کا آخری مرحلہ آنے کی نوبت نہیں آ پاتی تھی۔ورنہ اپنی لہر میں آئی ہوئی نوے سالہ بی بیوں کو کوئی روک نہ سکتا۔یہ سب گمشدہ لوگ تھے۔اپنے آپ سے اور اپنے سارے پیاروں سے بچھڑے ہوئے لوگ۔ایسے پیاروں سے جو خود انہیں اس برزخ

میں لا کر چھوڑ گئے تھے اور منتظر تھے کہ کب ان کی وفات کی خبر آئے اور وہ دل گرفتہ سے ان کی آخری رسومات کا فرض ادا کر کے اس فرض سے سبک دوش ہو سکیں۔

اسی اولڈ ہوم میں ہی زندہ دلی کی کئی کہانیاں بھی موجود تھیں۔Herr Wirth نے اپنی عمر بھر کی کمائی اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر دی تو وہ بہلا پھسلا کر باپ کو اولڈ ہوم میں داخل کرا گئی۔ ہر وِرتھ تنومند بزرگ تھے۔ دراز قد ہونے کے ساتھ جسم بھی تنا ہوا تھا لیکن بیٹی کے طرزِ عمل نے انہیں گہرا زخم لگایا تھا۔اولڈ ہوم میں جب jasica داخل ہوئی تو اس نے ہر وِرتھ کی میز کا انتخاب کر لیا۔ ہوم کے ریستوران میں ان کی دوستی کی گہرائی کو ہر کوئی محسوس کر رہا تھا۔اس دوستی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہر ورِتھ اپنی بیٹی کے دیئے ہوئے دکھ کو بھول سے گئے اور نقصان یہ ہوا کہ وہ جیسیکا کی دوستی میں اس حد تک چلے گئے جس حد کی ان کی عمر اجازت نہیں دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔لیکن کہانی کار کا خیال ہے کہ اس نقصان میں بھی ان کا فائدہ ہی ہوا کہ دنیا کے ہر جھنجھٹ سے نجات پا گئے۔

Herr Rebsch، Frau Kruschel، Frau Meixner، Frau Muller اور کئی ایسے کردار جو وہیل چیئر پر ہوتے ہوئے بھی ہر وقت ہنستے اور ہنساتے رہتے ہیں۔فراؤ زالس گیبر بھی انہیں میں شامل ہے لیکن ایک دن پتہ نہیں اس بانوے سال کی خاتون کو کیا ہوا کہ بے ساختہ رونے لگ گئی۔ جب اس سے رونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگی کچھ نہیں بس مجھے تھوڑا سا رو لینے دو، ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔

Frau Grossman رکھ رکھاؤ والی لیکن زندہ دل خاتون تھی۔ ایک بار پتہ نہیں کیسے ایک عجیب سا واقعہ ہو گیا۔ اولڈ ہوم کی پانچویں منزل پر مرمت کا کچھ کام ہو رہا تھا۔ وقفہ کے دوران ایک مزدور نے ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ وہیں بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔ اتفاق سے اس کمرے کی رہائشی فراؤ برگ من ریستوران سے اپنے کمرے میں آئی تو اپنے بیڈ پر ایک مرد کو دیکھ کر اس نے ہنگامہ کر دیا۔ اس ساری صورتحال میں خرابی والی کوئی بات نہ تھی اس لئے معاملہ معمولی تفتیش کے بعد رفع دفع ہو گیا لیکن فراؤ گروس من کی زندہ دلی اگلے دن بھی جاری

تھی۔ ’’بھئی ایسا ہوتا رہا تو لگتا ہے کبھی میری پوتی مجھے ملنے آئے تو آگے اسے دادی کے ساتھ اپنا نیا چچا بھی دیکھنے کو ملے۔۔۔سچ تب تو بڑی شرمندگی ہوگی‘‘

Frau Wirth سے کہانی کار کو کچھ کوفت سی ہوتی تھی۔ اس کی اتنی خدمت کرنے کے باوجود ایک بار اس نے خود سنا کہ وہ کسی کے ساتھ اپنے ملک میں آ کر بس جانے والے غیر ملکیوں کے خلاف بات کر رہی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ لیکن یہ لوگ عمر کے ایسے مقام پر ہیں کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی بحث کرنا یا کسی ناراضی کا اظہار کرنا بجائے خود زیادتی ہے۔ ایک دن پتہ نہیں کیوں کہانی کار کا دل چاہا کہ آج فراؤ وِرتھ کے آنے سے پہلے اس کے لئے اس کا پرہیزی مگر پسندیدہ ناشتہ وہ خود تیار کر رکھے۔ اس نے اس کے لئے بریڈ کے ٹکڑوں کو اچھی طرح سے مارملیڈ لگایا اور جو کچھ وہ چاہا کرتی تھی ویسا کر کے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جونرس اسے وہیل چیئر پر لے کر آیا کرتی تھی۔ وہ آئی تو اس نے یہ خبر سنائی کہ فراؤ وِرتھ فوت ہو گئی ہے۔ وہ دیر تک فراؤ ورتھ کے لئے تیار کردہ ناشتے کو دیکھتا رہا اور پتہ نہیں کیا کچھ سوچتا رہ گیا۔

یہ تو صرف اولڈ ہوم کی بے شمار کہانیوں میں سے چند کہانیوں کی جھلکیاں ہیں جو ایک عرصہ سے کہانی کار سے تقاضہ کر رہی تھیں کہ وہ انہیں لکھے۔ انٹرنیٹ پر کہانی کار کو کئی کہانیوں نے الگ سے گھیرا ہوا تھا۔ chat اور cheat کے فرق کو مٹاتی ہوئی کہانیاں بھی اور محبت و اخلاص کی کہانیاں بھی۔ مختلف شناختی ناموں کے ساتھ اپنی عظمت کا پرچم خود ہی بلند کرنے والے ادیبوں کی کہانیاں بھی اور واقعتاً ادب کی خدمت کرنے والے تخلیق کاروں کہانیاں بھی انٹرنیٹ پر مل رہی تھیں۔ خود کہانی کار نے ایک نیک دل خاتون سے رابطہ ہونے پر اسی کے تعاون کے ساتھ اپنا ایک ادبی منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔ اس نیک دل خاتون کے اخلاص کی کہانی میں جان تھی۔ پھر ایک امریکن خاتون سے دوستی۔۔۔ جب اس نے اسے اپنا ایک مسئلہ بتایا تو وہ اس کے حل کے لئے نہ صرف راضی ہو گئی بلکہ جرمنی بھی پہنچ گئی، لیکن پھر وہ مسئلہ کوئی اور صورت اختیار کر گیا اور وہ امریکن خاتون اداس سی واپس چلی گئی۔

کہانی کار کے جعلی ادیبوں سے تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں تھے کہ ایسا کرنا کہانی کار کے

مزاج کے خلاف تھا۔اس کے مخالفین نے اس کے ساتھ کئی کھیل کھیلنے کی کوشش کی لیکن ہر بار منہ کی کھائی۔مخالفین کی انٹرنیٹ پر سرگرمیوں کی اپنی الگ کہانی تھی۔ایک بار انہوں غزالہ کے فرضی نام سے ای میل کی۔جس نے لکھا کہ میں میر پور خاص میں ریڈیو اناؤنسر ہوں،کہانیاں لکھنے کا شوق ہے،آپ کی مداح ہوں اور آپ سے کہانیوں پر نظر ثانی کرانا چاہتی ہوں۔کہانی کار پہلی نظر میں ہی ''عرفانِ سائبر'' سے آشنا ہو گیا۔اس نے جواب لکھا کہ ذرا اپنا ٹیلی فون نمبر بھیجئے۔آپ سے چند باتیں پوچھنی ہیں۔''ریڈیو اناؤنسر غزالہ'' نے جواب لکھا کہ ہمارا گھریلو ماحول ذرا سخت سا ہے اس لئے ٹیلی فون نمبر نہیں دے سکتی۔اور کہانی کار اس معصومانہ جواب پر زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

دوسری بار ڈٹسن باخ یا اوفن باخ سے کسی کومل بی بی نے رابطہ کیا۔میں آپ کی تحریروں کی مداح ہوں۔مجھے شاعری کا شوق ہے۔میری خالہ بھی میرے ساتھ ہیں(کہانی کار کی عمر کا خیال کرتے ہوئے مداح کے ساتھ کہانی کار کی سہولت کے لئے ہم عمر خالہ بھی شامل کر دی گئی)۔کومل بی بی انٹرنیٹ سے ٹیلی فون پر آ گئی۔گویا غزالہ والے ڈرامے میں جو کسر رہ گئی تھی اسے اب پورا کیا جا رہا تھا۔کہانی کار پر انٹرنیٹ سے ہونے والا یہ وار بھی خالی گیا۔کچھ عرصہ کی خاموشی کے بعد یار لوگوں نے خاصی محنت کے ساتھ انتظامات کئے۔اس بار فیصل آباد سے کسی بشریٰ سراج نے ڈائرکٹ ٹیلی فون کر دیا۔''سر! میں نے آپ کو پڑھا ہے،میں آپ کی بہت بڑی مداح ہوں۔۔۔میں نے آپ کو ابھی ای میل کی ہے لیکن پھر مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں نے آپ کو ٹیلی فون کر دیا۔اگر آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھار آپ کو فون کر لیا کروں؟''

کہانی کار نے اسے سمجھایا کہ مجھے آپ کے ٹیلی فون کے آنے سے خوشی ہو گی لیکن اس میں آپ کا کافی خرچہ ہو جایا کرے گا۔اس لئے بہتر ہے آپ انٹرنیٹ سے رابطہ رکھیں۔تب بشریٰ سراج نے پہلا جوش و جذبہ برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ ہم بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں اس لئے خرچے کی آپ فکر نہ کریں۔پہلی ای میل میں غیر شادی شدہ بشریٰ سراج نے خود کو قریشی ظاہر کیا جسے کہانی کار نے نظر انداز کر دیا۔البتہ اسے لکھا کہ آپ اپنا پوسٹل ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر بھیج دیں۔خوشحال اور کھاتے پیتے گھرانے والی بی بی نے دونوں چیزیں بھیج دیں لیکن ٹیلی فون کا نمبر پی

پی تھا اور پوسٹل ایڈریس میں والد کا نام رانا سراج درج تھا۔باپ رانا اور بیٹی قریشی۔پھر اسی پر بس نہیں ہوا،بشریٰ سراج یاہو کے چیٹ بکس میں جن اوقات میں آتی وہ جرمنی کے اوقات سے تو میل کھاتے تھے لیکن پاکستان کے اوقات سے ان کا کوئی میل نہیں تھا۔جرمنی میں رات کے دس بجے کوئی بھی آن لائن ہو سکتا ہے لیکن تب پاکستان میں رات کے دو بجے ہوتے ہیں اور بشریٰ سراج رات کے دو بجے آن لائن ہوتی تھی۔کہانی کار عرفانِ ذات کی بجائے عرفانِ سائبر سے مزید آشنا ہوا اور ان مخالفین پر پہلے ہنس دیا اور پھر رو دیا جو اس کے لئے اتنے پاپڑ بیل رہے تھے۔یہ واقعات بھی کہانی کار سے کچھ لکھنے کا تقاضہ کر رہے تھے۔

جرمنی میں بہت سارے ہم وطنوں کی بہت ساری انوکھی کہانیاں بھی اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔بالے نے جب پہلی بار جرمنی میں مزدوری کا کام شروع کیا اور اسے ایک کار والے نے تھوڑی سی رقم بطور ٹپ دے دی،اس دن وہ بہت دل گرفتہ تھا۔دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں کہ ہم جو اپنے وطن میں دوسروں کو ٹپ دیا کرتے تھے اب ہمیں یہاں ٹپ دی جا رہی ہے۔آخر اس نے ٹپ دینے والے کو ایک موٹی سی گالی دی اور پھر اسے کچھ قرار سا آ گیا۔ اور اب چند برسوں کے عرصہ میں ہی اسی بالے کا یہ حال ہے کہ جس دن اسے ٹپ نہیں ملتی یا کم ٹپ ملتی ہے،اس دن وہ ان سارے لوگوں کو گالیاں دے رہا ہوتا ہے جو کنجوس ہو گئے ہیں۔اس کہانی کی بہت ساری جزئیات ہیں جو پاکستان سے جرمنی تک پھیلی ہوئی ہیں۔کہانی کئی بار کہانی کار کا پیچھا کر چکی ہے لیکن کہانی کار کو اپنی اس محبوب کہانی کے علاوہ کسی کی فکر نہیں جو اس کے قابو میں نہیں آ رہی۔

جرمنی کے ظفری میاں کی کہانی تو بہت سارے چٹ پٹے مسالوں کے ساتھ درسِ عبرت بھی لئے پھرتی ہے لیکن کہانی کار اس کے لئے بھی وقت نہیں نکال رہا۔ظفری میاں جب جرمنی آئے تھے تو انہوں نے یہاں سیٹ ہونے کے لئے ایک جرمن لڑکی سے شادی کر لی۔ لڑکی ان کے ساتھ مخلص تھی لیکن ظفری میاں اپنی موج میں تھے۔جب خود کو سارے قانونی تحفظات مل گئے تو انہوں نے بیوی سے بات کی کہ میں چاہتا ہوں میرا چھوٹا بھائی بھی یہاں

آجائے اور سیٹ ہو جائے۔ بیوی تو تم میری ہی ہو۔ اسلامی نکاح ہمارا بحال رہے گا لیکن سرکاری شادی کو ہم ختم کراتے ہیں اور پھر تم میرے چھوٹے بھائی سے قانونی شادی کر لینا، اس طرح وہ آسانی سے جرمنی میں آجائے گا۔ چنانچہ منصوبے کے مطابق سب کچھ انجام پا گیا اور ظفری کا چھوٹا بھائی نہ صرف جرمنی میں آگیا بلکہ جرمنی میں سیٹ بھی ہو گیا۔ اس کے بعد ظفری نے اپنے ایک ماموں زاد کو اور پھر ایک پرانے دوست کو بھی باری باری اسی طرح جرمنی بلوایا اور یہاں سیٹ کرا دیا۔ یہاں تک تو کہانی ٹھیک رہتی ہے لیکن مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب ظفری کی جرمن بیوی خود کہانی کار کے پاس گئی اور اسے رو رو کر بتانے لگی کہ تمہارے دوست نے مجھ سے اس حد تک کام لئے اور میں اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی جسمانی اور ذہنی طور پر صرف اسی کے ساتھ رہی ہوں لیکن اب وہ مجھے اپنانے سے انکار کر رہا ہے۔ کہانی کار اس صورتحال پر کافی دکھی ہوا۔ اس سے ہمدردی کرتا رہا لیکن اس کی کہانی کو ابھی تک لکھ نہیں سکا۔

پھر ان مولوی صاحب کی کہانی جنہوں نے یورپ میں سیٹ ہونے کے لئے اپنے ایک مقتدی سے کہا کہ کسی میم سے صرف پیپر میرج کرا دو۔ میں ان مشرک اور فاحشہ عورتوں کے ساتھ کوئی جسمانی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ بس قانونی تحفظ کے لئے پیپر میرج کروں گا۔ جب کاغذی کاروائی کا بنیادی مرحلہ مکمل ہو گیا تو مولوی صاحب میم کی منت کرنے لگے کہ چلو جب تک یہ کاغذی کاروائی قائم ہے تب تک ہم مل بھی لیا کریں لیکن میم نے طے شدہ باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ اُس کی کافرانہ اداؤں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مولوی صاحب کے نورانی چہرے سے ذرہ بھر بھی متاثر نہیں ہوئی تھی، نہ ہی ان کی منت سماجت سے اس کا دل پسیجا تھا۔ حالانکہ مولوی صاحب کی اچھی خاصی رقم اس پروجیکٹ پر لگ چکی تھی اور ابھی مزید کافی خرچہ ہونا تھا۔ تب مولوی صاحب اپنے مقتدی کی منت کرنے لگے کہ اسے راضی کر دو۔ یہ کہانی خاصی عبرتناک تھی لیکن کہانی کار نے اس کو بھی نظر انداز کر دیا۔

پھر ان دو فنکار بھائیوں کی کہانی جو یہاں کے قوانین سے ٹیکنیکل فائدے اٹھانے کی ترکیبیں سوچتے اور ان پر عمل کرتے رہتے۔

ایک نسبتاً اچھی کار لیتا۔ اس کی اچھی انشورنس کراتا۔ پھر دوسرا بھائی اس گاڑی کو اپنی گاڑی سے ٹکر مارتا۔ پہلے بھائی کو انشورنس کی بڑی رقم مل جاتی جسے دونوں مل کر بانٹ لیتے۔ جب تین چار بار انہیں دو بھائیوں کے ہی ایک جیسے ایکسیڈنٹ ہونے لگے تب انشورنس کمپنی کا ماتھا ٹھنکا اور تب دونوں کا فراڈ پکڑا گیا۔

جرمن انتظامیہ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والی کہانیاں ۔۔۔۔ جب پاکستانی نئے نئے یہاں آتے تھے سب کو ہر طرح کی عزت دی جاتی۔ ان کی ہر بات کو سچ سمجھا جاتا۔ ڈرائیونگ لائسنس کے حصول کے لئے لوگوں نے اپنے پاکستانی راشن کارڈ یہ کہہ کر جمع کرائے کہ یہ ہمارے پاکستانی ڈرائیونگ لائسنس ہیں۔ انتظامیہ نے یقین کیا اور ایسے لوگوں کو لائسنس جاری کر دیئے۔ پھر کئی ایسے حادثات ہونے لگے کہ ون وے روڈ پر مخالف سمت سے گاڑی ڈال دی گئی۔ تب راشن کارڈوں کی جانچ پڑتال شروع ہوئی اور اب سب کو ڈرائیونگ لائسنس کے حصول کے لئے ایک جان لیوا ٹیسٹ سے گزرنا ہوتا ہے۔ اور اب ان کے ہر سچ کو بھی شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی کئی کہانیاں جو قوم کو احساس دلا سکتی ہیں کہ تم لوگ جو پہلے یہاں آتے تھے اور تمہاری اتنی عزت کی جاتی تھی تو اب جو تمہارے تئیں رویے بدلے ہیں تو اس میں خود تمہاری اپنی ہیرا پھیریوں اور فراڈ بازیوں کا قصور ہے۔ لیکن کہانی کار ان کہانیوں کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ رہا۔

کہانی کار کے بڑے پوتے کی عمر ساڑھے پانچ سال ہے۔ اگرچہ سارے بچے ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور ہفتہ میں ایک دو بار سب سے ملنا ملانا ہو جاتا تھا۔ تاہم سوتے سب اپنے اپنے گھر میں ہی تھے۔ اس دن پتہ نہیں دادا، پوتا دونوں ہی کس لہر میں تھے کہ دادا نے پوتے کو اپنے پاس رہنے کے لئے کہا اور پوتا فوراً راضی ہو گیا۔ رات کو دادا نے پوتے کو اپنے ساتھ لٹا لیا اور اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے اپنے پوتے سے کچھ مخصوص دعاؤں کے بارے میں پوچھا۔ بچے کو چند دعائیں یاد تھیں جو اس نے سنا دیں۔ پھر کہانی کار نے اپنے پوتے سے پوچھا ''کیا تمہیں کوئی حدیث شریف بھی یاد ہے؟'' ۔۔۔ پوتے نے فوراً کہا ''جی دادا ابو! مجھے

ایک حدیث شریف یاد ہے۔''اسے حیرت ہوئی کہ بچے کو حدیث کا بھی پتہ ہے اور کچھ یاد بھی ہے۔اس نے کہا اچھا شاباش حدیث شریف سناؤ!۔۔۔۔۔۔بچے نے بڑی روانی کے ساتھ بولنا شروع کیا:

''حدیث شریف ہیلپنگ ہینڈ کے تعاون سے پیش کی جا رہی ہے۔ ماماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے''

کہانی کار کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ نکلا۔ایک ٹی وی چینل پر اذان سے پہلے ایک خیراتی ادارہ ہیلپنگ ہینڈ کی جانب سے اشتہار دیتے ہوئے کوئی حدیث پیش کی جاتی تھی۔ یہ حدیث اس کے پوتے نے وہاں سے سنی تھی اور اپنی سادگی میں سپانسر کرنے والوں کا ذکر بھی روانی میں کر دیا تھا۔اور جہاں کچھ دقت محسوس ہوئی وہاں ترجمہ بھی بدل لیا تھا۔پوتا اپنے دادا کی ہنسی کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔کچھ دیر ہنسنے کے بعد کہانی کار کو خیال آیا کہ اپنے پوتے کو اپنے بچپن کی سنی ہوئی کہانیاں سنائی جائیں۔ چنانچہ دادا نے سب سے پہلے اپنی بوا سے سنی ہوئی ایک کہانی سنانی شروع کی۔لیکن کہانی کو بیان کرتے وقت اسے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ پوتے کو بات سمجھانے کے لئے اسے اصل کہانی میں کافی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

''ایک بوڑھی عورت بھٹی والی سے مکئی کے دانے بھنوا کر جا رہی تھی کہ رستے میں اسے ٹھوکر لگی اور اس کے دانے زمین پر بکھر گئے۔'' یہ کہنا مشکل لگ رہا تھا۔بچے کو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔

''ایک بوڑھی عورت ایک مارکیٹ سے پاپ کارن خرید کر نکلی۔۔۔۔'' کہانی کار نے پوتے کو سمجھانے کے لئے کچھ ایڈجسٹ منٹ کرنا شروع کی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ کہانی سنانے کی بجائے کہانی کا ترجمہ کرنے لگ گیا ہے۔وہ بوڑھی اماں کے مخالف کوّے کی بات سناتا تو پوتا اسے جرمنی میں دکھائے جانے والے مقبول کارٹونز کے کردار پیٹرک کی بات سنانے لگ جاتا۔وہ پوتے کو باتیں کرنے والی ڈانگ،نہر، وغیرہ کا بتاتا تو پوتا اسے sandy, Tadios, spongebob وغیرہ کی بات سنانے لگ جاتا۔وہ کہانی میں آنے والے بلی اور چوہے کا ذکر کرنے لگا تو پوتا چھلانگ مار کر ٹام اینڈ جیری کے کئی ایپی سوڈز اسے سنانے لگ گیا۔یوں اس کی بوا والی کہانی تو ادھوری رہ گئی

لیکن پوتے کی کہانیاں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔اسے خوشی بھی ہو رہی تھی اور افسوس بھی۔ بوا والی کہانی کے ادھورے رہ جانے سے زیادہ اسے اس بات کا دکھ تھا کہ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اگلی نسل کے ساتھ اتنے گہرے ربط کے باوجود ایک گہرا فاصلہ پیدا ہو رہا ہے لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ پوتا اسے خود سے اور اپنے عہد سے ہم آہنگ کر رہا تھا۔ بوا کی سنائی ہوئی کہانیوں کا اپنا مزہ تھا لیکن اب کارٹون کہانیوں میں بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان کہیں زیادہ ہے۔شاید اتنا زیادہ کہ پرانے بڑے بھی ٹی وی کے آگے بیٹھ جائیں تو بچوں کی طرح مزہ لینے لگیں۔

پھر وہ رات، جب تک دونوں جاگتے رہے، دادا نے پوتے سے کہانیاں سننے میں گزار دی۔اور اسی رات کہانی کار نے سوچا کہ اپنی ادھوری کہانی میں کسی امتیاز کے بغیر ہر مذہب و مسلک کے سارے کے سارے انتہا پسندوں کو ایٹمی جنگ سے ہلاک کر کے صرف اپنے پوتے جیسے انسانوں کو بچایا جائے اور انہیں کے ذریعے نسلِ انسانی کو پھر سے دھرتی پر آباد کیا جائے۔

لیکن ابھی یہ صرف کہانی کار نے سوچا ہے،
کہانی لکھتے وقت کیا روپ اختیار کر جائے!
اس کا تو خود کہانی کار کو بھی علم نہیں ہے۔

☆☆☆

نیک بندوں کی بستی

الجھے جو فقیروں سے
یوں سمجھو، الجھے
اپنی تقدیروں سے

یہ نیک بندوں کی انوکھی بستی تھی جہاں سارے نیک لوگ ہی بستے تھے۔ گناہ کے تصور سے ہی خوف کھانے والے اور گناہگاروں کے لیے غضب ناک نیک بندے۔ کسی کی معمولی سی لغزش کو معاف نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ معمولی غلطیوں کو نظر انداز کیا گیا تو بڑے گناہ جنم لینا شروع کر دیں گے اور دھرتی ناپاک ہو جائے گی۔ یہ نیک بندے اپنے عقائد میں کسی قسم کے اجتہاد کو اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں معمولی کوتاہی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

ایک بار ایک مجذوب فقیر اس گاؤں میں آ گیا۔ بستی کے لڑکوں، بالوں نے اس مجذوب سے باتیں کیں تو انہیں لگا کہ ان کے خدا کے محدود تصور کے برعکس اس مجذوب کی باتوں میں ایک ایسے خدا کا احساس ملتا ہے جو سچ مچ لامحدود ہے اور جس کی محبت بھی دل دہلا دینے والی ہے۔

مجذوب نوجوانوں کو بتا رہا تھا کہ خدا خود کہتا ہے کہ جو مجھے ڈھونڈتا ہے، وہ مجھے پا لیتا ہے۔ اور جو مجھے پالیتا ہے وہ مجھے دیکھ لیتا ہے۔ جو مجھے دیکھ لیتا ہے وہ میرا عاشق بن جاتا ہے۔ جو میرا عاشق ہو جاتا ہے، اُسے میں قتل کر دیتا ہوں اور جسے میں قتل کر دیتا ہوں، اُس کا خون بہا میں خود ہو جاتا ہوں۔

تب نیک بندوں کی اس بستی کی بڑی عبادت گاہ کا منتظم وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے مجذوب کی یہ بات سنی تو پہلے اسے بھی یہ بات بہت اچھی لگی لیکن پھر یکدم اسے خیال آیا کہ یہ تو اس کے پختہ عقائد اور ایمان سے ہٹ کر بات کی گئی ہے۔ صراطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی بات کتنی ہی خوبصورت اور دل کو بھانے والی کیوں نہ ہو وہ سراسر گمراہی اور ضلالت ہے۔ چنانچہ اس نے اسی وقت بستی کے بہت سارے نیک بندوں کو جمع کر کے صلاح مشورہ کیا اور اپنی نئی نسل کو کسی بھی طرح کی گمراہی اور ضلالت سے بچانے کے لیے فیصلہ کیا کہ یا تو یہ مجذوب نیک بندوں کی بستی کو چھوڑ دے یا پھر اسے قتل کر دیا جائے۔ فیصلہ بظاہر یہی تھا لیکن حقیقت میں یہ طے ہوا تھا کہ مجذوب کو قتل کر دیا جائے گا۔ اپنے فیصلے پر عملدر آمد کے لیے نیک بندوں کے سرپنچ مجذوب کے ٹھکانے پر پہنچے تو مجذوب غائب تھا۔ جیسے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

نیک بندے پھر سر جوڑ کر بیٹھے کہ اپنی نئی نسل کو کسی بھی طرح کی گمراہی سے بچانے کے لیے کیا کیا جائے۔ ایک نیک بندے نے مشورہ دیا کہ پار پرے کے ایک گاؤں میں خدا کے محبوب ایک بزرگ رہتے ہیں۔ ان کو اپنے ہاں بلایا جائے اور ان کے ذریعے دین کی وہ باتیں سنی جائیں جن کے نتیجہ میں مزید نیکیوں کی تحریک ہو۔ چنانچہ نیک بندوں کی بستی والوں نے دعوت دے کر خدا کے محبوب اس بزرگ کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ ان سے ایک عام خطاب کا پروگرام طے ہوا تھا۔ اتفاق سے یہ پروگرام ایسے ایام میں ہوا جب روزوں کا مہینہ چل رہا تھا۔ پار پرے کے گاؤں سے آئے ہوئے خدا کے محبوب بزرگ کچھ علیل تھے، دوسرا سفر کی حالت میں تھے اس لیے انہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا کہ خدا کی طرف سے ان دونوں حالتوں میں سے کسی ایک حالت کی صورت میں بھی روزہ نہ رکھنے کی رعائت دی گئی تھی، جبکہ انہیں دہرے طور پر یہ رعائت حاصل تھی۔

جب پار پرے کے گاؤں کے بزرگ خطاب کر رہے تھے، انہوں نے دورانِ خطاب نیم گرم پانی کا ایک گھونٹ سب کے سامنے پی لیا۔ حقیقتاً وہ ان سارے نیک بندوں کو بتانا چاہتے تھے کہ خدا کی طرف سے جو استثنائی رعائتیں دی جاتی ہیں، وہ بشری کمزوریوں اور سہولتوں کو مدِ نظر رکھ کر دی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ نیکی کے نام پر کٹّر پن کے رویے کو رد کرنا چاہتے تھے اور اپنے عمل

کے ذریعے اسے ظاہر کرنا چاہتے تھے۔لیکن خدا کے محبوب بزرگ کی نیک نیتی اور خدا کی دی ہوئی رعائت والی بات نیک بندوں کی سمجھ میں نہ آسکی۔انہوں نے فوراً بزرگ پر اعتراض جڑ دیا کہ آپ نے روزوں کے ایام میں روزہ نہیں رکھا۔تب بزرگ نے وضاحت کر دی کہ اپنی علالت اور مسافرت کے باعث انہیں روزہ نہ رکھنے کی رعائت خدا نے دی ہوئی ہے۔بزرگ کی دلیل نہایت معقول تھی لیکن نیک بندوں کے لیے یہ ان کی نئی نسل کے لیے مجذوب کی باتوں سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔انہوں نے روزوں کے ایام کے احترام کے نام پر ایمان افروز شور مچا دیا۔بزرگ اپنی طرف سے جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے وہ سب اس شور میں دب گیا۔نیک بندے یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ ایک بیمار اور مسافر جو خود ان کے مدعو کرنے پر اس بستی میں آیا تھا وہ روزوں کے ایام کی استثنائی رعائت کا حق دار ہے۔اس سارے ہنگامہ کا اثر نئی نسل پر ہو رہا تھا۔نئی نسل محسوس کر رہی تھی کہ ہمیں دیئے گئے احکامات کی روح کو مارا جا رہا ہے اور صرف ظاہری الفاظ پر تکیہ کر کے اپنی مخصوص نیکی کے عقائد مسلط کیے جا رہے ہیں۔بہرحال وہ بزرگ اپنا خطاب ادھورا چھوڑ کر چلے گئے اور نیک بندوں کی نئی نسل جو ابھی تک ایک جستجو کی کیفیت میں تھی اب باقاعدہ شبہات کا شکار ہونے لگی۔نیک بندوں کی بستی کے بڑے اپنی نئی نسل کی نئی سوچ سے مزید فکرمند ہوئے اور انہیں گمراہی اور ضلالت سے بچانے کے لیے کوئی اور ترکیب سوچنے لگے۔لیکن ان کے سوچتے سوچتے پورا ایک سال بیت گیا۔

نئے سال کے روزے شروع ہونے سے ایک دن پہلے نیک بندوں کی بستی میں وبائی ہیضہ پھیل گیا۔اور روزوں کے مہینہ کے پہلے دن ہی سے وہ سارے نیک بندے روزہ رکھے بغیر وبائی ہیضہ سے بچنے کے لیے مختلف دیسی دوائیاں پھانک رہے تھے اور ایک پھکی کے ساتھ نیم گرم پانی پی رہے تھے۔روزوں کے سارے ایام وبائی ہیضہ کی نذر ہو گئے۔ساری بستی دیسی دوائیں کھانے اور نیم گرم پانی پینے پر مجبور ہو گئی تھی۔اب کسی کو روزوں کے ایام کے احترام کا خود ساختہ فلسفہ نہیں سوجھ رہا تھا۔تب ایک نوجوان نے اپنی بستی کے سارے بزرگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

’’آپ بزرگوں نے مجذوب فقیر کی طریقت کی باتوں کی روح کو سمجھے بغیر اُسے معتوب قرار دے دیا اور خدا کے محبوب بزرگ کی شریعت کی باتوں کو بھی ان کی روح کے ساتھ سمجھنے کی بجائے اپنی من گھڑت تاویلوں کے ذریعے رد کیا اور گھر پر بلائے ہوئے مہمان کی اہانت کی۔کیا اس بار روزوں کے مہینے میں آپ خود خدائی سزا کا شکار نہیں ہوئے؟ کہ نہ کسی کو روزہ رکھنے کی توفیق ملی اور نہ کسی کو اب روزوں کے احترام کا وہ من گھڑت فلسفہ یاد رہا جو پچھلے سال خدا کے ایک محبوب بزرگ کی اہانت کرنے کے لئے آپ کو شدت سے یاد آ گیا تھا۔‘‘

نوجوان کی باتوں کی باقی سارے نوجوان بھی تائید کر رہے تھے۔اور نیک بندوں کی بستی کے سارے بزرگ یہی سوچ رہے تھے کہ ان کی نئی نسل ان کے ہاتھوں سے نکل کر گمراہ ہو گئی ہے۔وہ اپنی نئی نسل کی گمراہی پر افسردہ تھے لیکن ان میں سے کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ وہ خود خدا کی طرف سے کیسی کھلی کھلی سزا پا چکے ہیں۔اور سزا پانے کے بعد بھی مسلسل ایک سزا کی حالت میں گھرے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

خواہش تھی کہ اک بار کبھی خود سے بھی ملتے
فرصت کبھی اے گردشِ حالات عطا کر

جرمنی کی مصروف ترین زندگی میں معمولاتِ زندگی مشینی انداز سے گزر رہے ہیں۔ مجھے نہ صرف بہت سارے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات نہ ہو سکنے کی حسرت رہتی ہے بلکہ کبھی کبھار تو خود سے ملنے کی بھی شدید خواہش ہوتی ہے۔لیکن یہاں مکروہاتِ دنیا سے یا معمولاتِ زندگی سے مہلت ہی نہیں مل رہی۔ مجھے اتنا اندازہ ہے کہ میرے اندر میرے باہر سے زیادہ بہتر، کچھ ہے۔لیکن جہاں بدن کے تقاضوں سے ہی جان نہ چھوٹ رہی ہو وہاں اندر کی طرف دھیان کہاں جا سکتا ہے۔

ڈیوٹی پر آنے جانے سمیت دس گھنٹوں کی مشقت کے بعد ساڑھے نو بجے شب کو گھر پہنچتے ہی پہلے لباس تبدیل کرتا ہوں، باتھ روم سے فارغ ہوتا ہوں۔ پھر انٹرنیٹ پر آئی ہوئی ای میلز دیکھتا ہوں اور ان کے جواب لکھتا ہوں۔ دس بجے شب ٹیلی کاسٹ ہونے والے جیو ٹی وی کے خبرنامہ کے پہلے پندرہ بیس منٹ کی خبریں دیکھنا میرا معمول ہے اور اسی دوران ہی رات کا کھانا کھاتا ہوں۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے باہر سیر کرنے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ دس منٹ کی سیر کے بعد واپس آ کر مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے پڑھتا ہوں۔ گیارہ بجے کسی اہم

ٹاک شو کو دیکھتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے ہی صوفے پر سو جاتا ہوں۔ صبح فجر کی نماز کے وقت پر جاگ جاتا ہوں۔ حوائجاتِ ضروریہ کے بعد نماز، قرآن کی بچپن کی پڑی ہوئی عادت پوری کرتا ہوں۔ اس دوران بیوی بچے بھی جاگ جاتے ہیں۔ سب اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاریوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ بیوی ناشتہ تیار کرتی ہے تو ہم دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر میں کچھ دیر کے لئے سو جاتا ہوں۔

دس بجے کے لگ بھگ جاگ کر تازہ دَم ہوتا ہوں۔ کچھ وقت انٹرنیٹ پر گزارتا ہوں۔ پھر ملازمت پر جانے کی تیاری کرتا ہوں۔ سوا بارہ بجے والی بس مجھے میرے گھر کے پاس سے مل جاتی ہے۔بس پر بیٹھ کر اپنے شہر ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچتا ہوں۔ وہاں سے مجھے فرینکفرٹ شہر تک جانا ہوتا ہے۔ پلیٹ فارم نمبر۳ پر فرینکفرٹ جانے والی ٹرین آتی ہے جبکہ پلیٹ فارم نمبر۲ پر فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آتی ہے۔ میں سیڑھیوں کے قریب اپنی ٹرین کا انتظار کرتا ہوں۔ میری ٹرین سے تین منٹ پہلے فرینکفرٹ سے ٹرین آ جاتی ہے اور اس کے آگے جانے تک میری اپنی ٹرین پہنچ جاتی ہے۔ میں اپنی ٹرین کے آگے والے ڈبے میں بیٹھا کرتا ہوں کہ وہاں سے مجھے اپنی اگلی منزل کی طرف جانے میں چند قدموں کے چلنے کی بچت ہو جاتی ہے۔اس حساب سے چونکہ میں فرینکفرٹ جانے والی ٹرین کے پہلے ڈبے کے مقام پر کھڑا ہوتا ہوں، اس لئے فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کا آخری ڈبہ میرے قریب آ کر رُکتا ہے۔ یوں میں تین منٹ کے عرصہ میں اس ٹرین سے اترنے والی سواریوں کو سرسری سا دیکھ لیا کرتا ہوں۔ ہم سب آنے اور جانے والے مزدور اور دفتر پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے تقریباً سارے چہرے عام طور پر جانے پہچانے سے ہوتے ہیں۔ایک دن میں نے معمول کے مطابق فرینکفرٹ کی طرف سے آنے والی سواریوں کو دیکھنے کی بجائے ویسے ہی اپنے پلیٹ فارم پر اپنی ٹرین کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھوں کو تھپتھپایا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو میرا چھوٹا بیٹا تھا جو طبیعت تھوڑی سی خراب ہونے کی وجہ سے دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔ اس کو ڈاکٹر سے فوری رجوع کرنے کی ہدایت کرنے کے باوجود مجھے اپنے بیٹے سے اس طرح کی اچانک ملاقات خوشگوار سی

لگی۔اور پھر عجیب سا معاملہ ہوا۔تب سے جب بھی میں فرینکفرٹ کی طرف جانے والی ٹرین کے
لئے جاتا ہوں،فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو صرف اس وجہ سے دیکھتا ہوں کہ شاید میرا چھوٹا بیٹا
پھر اس ٹرین سے اترے۔ایک بار سنیچر کا دن تھا۔آفس میں چھٹی کے باعث بیٹا گھر پر ہی تھا لیکن
مجھے اپنے اولڈ ہوم میں معمول کے مطابق کام پر جانا تھا۔میں گھر کے دوسرے افراد کی طرح بیٹے
سے بھی ہاتھ ملا کر اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلا۔لیکن شہر ہیڑس ہائم کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر
جیسے ہی فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آئی ، میں اس طرح اسے دیکھنے لگا جیسے ابھی اس میں سے
میرا بیٹا اُترے گا۔پھر مجھے خیال آیا کہ بیٹا تو گھر پر ہے، میں کس کا انتظار کر رہا ہوں!اب بیٹے نے
اپنی کار لے لی ہے اور وہ کار پر ہی آفس آتا جاتا ہے لیکن میں پھر بھی ہر بار فرینکفرٹ سے آنے والی
ٹرین کو ایسے دیکھتا ہوں جیسے میرا چھوٹا بیٹا اس میں سے اترے گا اور میں اس سے ہونے والی ہلکی سی
ملاقات کی خوشگواری کو محسوس کروں گا۔جاب پر جا کر سب سے پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ ظہر اور عصر
کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیتا ہوں۔

پچھلے دنوں جرمنی کی سب سے زیادہ مالیت ۳۵ ملین یورو کی لاٹری کے بخار نے پورے
جرمنی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔لاٹریوں کے چکر میں نہ پڑنے کے باوجود ۳۵ ملین اتنی بڑی
رقم تھی کہ میں نے بھی اسے کھیلنے کا ارادہ کر لیا۔کچھ خاص دعائیں پڑھ کر حصہ لے لیا۔۳۵ ملین یورو
کا مطلب ہے ساڑھے تین کروڑ یورو۔اور اس رقم کو پاکستانی مالیت میں تبدیل کیا جائے تو پونے
تین ارب روپے بنتے ہیں۔

لاٹری کھیلنے کے بعد میں نے اس کا فیصلہ ہونے سے پہلے بہت سارے منصوبے بنا لئے
تھے۔جرمنی میں ہی ایک بڑا رہائشی منصوبہ،جس میں میرے سارے بچے اپنے اپنے گھروں میں
ایک ساتھ ہوں گے۔جرمنی میں ایک کمپنی کا قیام اور پاکستان اور انڈیا میں اس کمپنی کی طرف سے
انویسٹمنٹ کے پروجیکٹس۔بچوں کے لئے ان کے ذہنی میلانات کے مطابق جرمنی میں مناسب
کاروبار۔پاکستان میں اپنے پرانے گاؤں کے آس پاس ایک بڑی حویلی کی تعمیر۔پھر بہت
سارے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے لئے بعض منصوبے،جن کے مطابق انہیں مالی امداد دینے

کی بجائے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا کرنے کے منصوبے شامل تھے۔اسی طرح بعض فلاحی
پروگرام شروع کرنے کے خاکے۔بہت ساری باتیں میرے ذہن میں آ گئی تھیں اور میں نے خود کو
ذہنی طور پر ان ساری ذمہ داریوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔جس دن شام کو قرعہ اندازی ہونا تھی اس
دن میری معمول کی تلاوت کے دوران سورۃ انفال کی آیت **انما اموالکم واولاد کم**
فتنة نے مجھے ہلکا سا جھٹکا لگایا۔یہ آیت آج کے دن ہی کیوں پڑھنے میں آئی اور پڑھتے وقت
اتنی توجہ کیوں کھینچ گئی؟۔لیکن پھر میں نے اسے ایک اتفاق سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

قرعہ اندازی کا شفاف عمل ٹی وی پر میں نے اور میرے بیٹے نے براہِ راست ایک ساتھ
دیکھا۔میرا بیٹا کافی جذباتی ہو رہا تھا۔تب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر انعام نکل آئے تو تب بھی
اپنی حیثیت سے باہر نہیں ہونا۔انعام نہیں نکلتا تو غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔دونوں
صورتوں میں خود کو نارمل رکھنا ہے۔قرعہ اندازی ہوئی تو ہمارا انعام نہیں نکلا۔۳۵ ملین کا انعام کسی
اور کو مل گیا۔بیٹا میرے سمجھانے کے باوجود کافی افسردہ ہوا۔میں اسے تسلی دیتا رہا۔مجھے لاٹری کا بڑا
انعام حاصل نہ کر پانے کا افسوس نہیں تھا لیکن اپنے کئی منصوبوں کے ادھورے رہ جانے کی تھوڑی
سی حسرت دل میں ضرور ہونے لگی تھی۔انعام نکل آنے کی صورت میں اگلے دن میں نے اپنی
مزدوری والی جاب پر نہ جانے کا طے کر لیا تھا۔انعام نہیں نکلا تو اگلے دن میں معمول کے مطابق
اپنی جاب پر چلا گیا۔جاب سے واپسی پر روز کے معمولات سے گزرتا ہوا،رات کا کھانا کھا کر چند
منٹ کی سیر کے لئے نکلا۔

اپنے گھر کے قریب کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے عجیب سی روشنی محسوس
ہوئی،سٹریٹ لائٹس سے بالکل مختلف،جیسے مستقبل کے کسی دَور کی کوئی روشنی ہو۔اسی روشنی میں
یکا یک ایک نوجوان دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔اس نے ایک بریف کیس مجھے تھماتے ہوئے
کہا اس میں ۳۵ ملین یورو مالیت کے قیمتی ہیرے اور سونے کے بسکٹ ہیں۔پولیس میرے پیچھے لگی
ہوئی ہے۔آپ اسے لے لیں،میری طرف سے آپ کے لئے تحفہ ہوا۔اور پھر وہ نوجوان آناً فاناً
غائب ہو گیا۔مجھے لگا جیسے میرے سارے منصوبے پورے کرنے کے لئے خدا نے کوئی آسمانی مدد

بھیج دی ہے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔میرے دل کی دھڑکن ایک دَم تیز ہوگئی۔ میں اپنی سیر کوادھورا چھوڑ کر گھر کی طرف واپس پلٹا لیکن ابھی میں اپنی بلڈنگ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ سائرن بجاتی ایک پولیس کار میرے قریب آ کر رُک گئی۔پولیس والے مجھ سے اُسی نوجوان کی بابت پوچھ رہے تھے لیکن میرے جواب دینے سے پہلے ہی اُن کی نظر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر پڑ گئی۔تب مجھے بائبل کی ایک آیت یاد آئی:

''ہم سونے کو آگ سے اور انسان کو سونے سے آزماتے ہیں''

پولیس مجھے گرفتار کر رہی تھی،اسی لمحے مستقبل کے کسی دَور جیسی عجیب سی روشنی غائب ہوگئی اور میں نے سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے دوسری طرف پولیس نے ایک نوجوان کو گرفتار کیا ہوا ہے۔اس کا بریف کیس پولیس کی تحویل میں ہے۔وہ نوجوان بالکل وہی تھا جو کچھ دیر پہلے مجھے اپنا بریف کیس دے گیا تھا۔لیکن اب نہ تو میرے پاس کوئی بریف کیس تھا اور نہ ہی پولیس نے مجھے کوئی ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرا،یا میں نے محسوس کیا وہ سب کیا تھا؟ کیا میں نے کوئی کشفی نظارہ سا دیکھا تھا یا کسی روشنی نے مجھے اپنے وقت سے چند منٹ پہلے کا سفر کرا کے پھر واپس اپنے مقام پر چھوڑ دیا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔لیکن کچھ سمجھ آ بھی رہی تھی۔

کل رات والے نظارے یا تجربے کے بعد ساری رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آسکی تھی اور آج جب میں جاب پر جانے لگا ہوں تو طبیعت کافی بوجھل ہے۔گھر سے باہر نکلا تو گہرے بادل اور دھند ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیئے۔ہیٹرس ہائم ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ریلوے کے عملہ کی طرف سے اعلان ہو رہا تھا کہ ویزبادن سے فرینکفرٹ جانے والی ٹرین دس منٹ لیٹ آ رہی ہے۔دھندلی فضا نے ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کو بھی مدھم کر رکھا ہے۔اس دوران فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین اپنے ٹھیک وقت پر آ گئی اور میں اپنی عجیب سی عادت کے مطابق دیکھنے لگتا ہوں کہ شاید میرا بیٹا اس میں سے اُتر کر آ رہا ہو۔فضا کی دھندلاہٹ کے باوجود واقعی میرا چھوٹا بیٹا انجن کے ساتھ والے ڈبے سے نیچے اُترا ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔میرے

ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔لیکن جیسے جیسے میرا بیٹا قریب آتا جا رہا ہے،میری مسکراہٹ،حیرت آمیز ہوتی جا رہی ہے۔کیونکہ اب وہ میرا بیٹا نہیں لگ رہا بلکہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ میرے ابا جی میری طرف آ رہے ہیں۔میں ابا جی کا استقبال کرنے کے لئے ان کی طرف آگے بڑھ کر جاتا ہوں۔لیکن جب ان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔یہ تو میں خود ہوں!

میں اپنے آپ سے گلے مل رہا ہوں اور ایسے لگ رہا ہے کہ میں خود سے نہیں بلکہ اپنے سارے آباواجداد اور اپنی ساری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو گلے مل رہا ہوں۔اسی حالت میں دیکھتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آ رہی ہے۔دور سے اس کی ہیڈ لائٹ کی چمک اسٹیشن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

مجھے رات والا واقعہ یاد آ جاتا ہے اور میں مزید کسی حیرت میں پڑے بغیر یقین کر لیتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی جو ٹرین کچھ دیر پہلے آ چکی تھی،وہ دراصل اب آ رہی ہے،ٹرین اسٹیشن پر رُک رہی ہے اور میں اس کے سب سے اگلے ڈبے میں سے اپنے اترنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں!

☆☆☆

تاثرات

Haider Qureshi's splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation. Qureshi is a philosophical story teller who ranges from the Ramayana to ecological fables and reflections on the experience of immigrant workers in Germany.His is a singular voice which deserves a wider audience. These stories are thoughtful and full of interest.

Dr. Derek Littlewood, Birmingham City University

حیدرقریشی کوفکری طور پر میں ایک جدید ترقی پسند افسانہ نگار سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے افسانے سماجی زندگی کے خمیر سے تیار ہوتے ہیں اور معاشرے کے دکھ اور مظلوم کی بے بسی ان میں موجود ہے اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے موضوعات ترقی پسند ہیں اور معاشرے کو بدلنے کا آدرش رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی کہانیوں کو سیدھے بیانیہ میں پیش نہیں کیا بلکہ تخلیقی تجربے سے گزر کر ان کے لیے اظہار کی ایسی زبان وضع کی ہے جس میں استعارہ اور علامت دونوں موجود ہیں بلکہ اکثر انہوں نے تصوف کی اصطلاحات اور اساطیری حوالوں سے بھی کام لیا ہے جو انہیں جدید بناتے ہیں۔حلقہ اربابِ ذوق نے موضوع کے ساتھ ساتھ فن پارے کی ادبی حیثیت کو بھی ضروری قرار دیا تھا۔ سات اور بعد کی ادبی نسلوں کی تربیت زیادہ تر حلقہ ہی میں ہوئی ہے۔ حیدر قریشی بھی فکری طور پر حلقہ ہی کے پروردہ ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں موضوع کی وسعت کے ساتھ ساتھ فنی حوالے بھی موجود ہیں اور وہ فنی جمالیات کے پوری طرح قائل ہیں۔۔۔۔۔۔۔حیدرقریشی کے دونوں افسانوی مجموعے ان کے فنکارانہ سفر کے دو مرحلے ہیں ان میں ایک فنی اور فکری ارتقاء ہے جو ان کی اگلی منزل کی نشاندہی کر رہا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے مجموعی سفر میں بھی یہ دونوں مجموعے اپنی اہمیت اور پہچان رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر رشید امجد(اسلام آباد)

حیدرقریشی تاریخ کے جھروکے میں جھانکتے ہیں، تہذیبوں کی سرحدوں کو عبور کرتے

ہیں، مذہبی صحیفوں کی نظریاتی اور روحانی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔انسان کی روح میں اترتے ہیں، اسکے دل کو بلوتے ہیں، اس کے تصور کے ساتھ اڑان بھرتے ہیں اور جسم کی لذت سے بھی آشنا ہوتے ہیں اور یوں کہانیاں روپ بدل بدل کر شیشا گھر میں اترتی چلی جاتی ہیں۔حیدرقریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔۔۔۔ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے، روح کا سارا آکاش ہے، جسم کی حدوں کو توڑتا ہوا تفکر اور قوت متخیلہ ہے---انسان اپنی کل ثقافت، جامع تاریخ، اپنے تمام گناہ وثواب کی پونجی لئے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر جا رہا ہوں؟---یہ ایسے سوالات ہیں جو مجھے بھی مسلسل ستاتے رہتے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ میں کیوں ہوں؟ یہ جیون کیا ہے؟ میں کیوں زندہ ہوں؟ موت کیا ہے؟ روح، غیر روح، وجود، عدم وجود، انسان، خدا، خلا!! حیدرقریشی کی کہانیاں ایسے ہی سوالوں سے پریشان ہیں اسی لئے ان کی کہانیوں میں مجسم وارداتوں کی بجائے تفکر اور احساس کی لطافت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حیدرقریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں جو واقعاتی تسلسل اور کہانی پن پر مبنی ہو کر سوال، شک اور فکر کی بنیاد پر کہانی کا شفاف شیشا گھر تعمیر کرتی ہیں۔اس شیشا گھر میں ہم داخل ہونے کے لئے آزاد ہیں لیکن اس سے باہر نکلنے کے رستے بند ہیں، صرف ایک چھوٹا سا روشن دان کھلا ہے، ہمارے دل کا---جس میں نہ جانے کہاں سے روشنی کی کرن چھٹک کر آرہی ہے جس کے ساتھ ساتھ چل کر ہم وقت کے اس نقطہ پر پہنچتے ہیں جہاں سچ ہمارا منتظر ہے۔ جہاں سچ سے ہم معانقہ کرتے ہیں!

دیویندر اسر(دہلی)

'عمر لاحاصل کا حاصل' میں درج شدہ سارے افسانے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے اردو افسانے کی مروجہ حدوں کو پار کرنے کی ہمت جٹائی ہے۔اس سے قبل ہمت، جسارت اور بغاوت کے القاب ان افسانہ نگاروں کے لیے استعمال کیے جاتے رہے ہیں جو روایتی موضوعِ ممنوعہ یعنی جنس کو اپناتے تھے۔جنس کے بعد سیاسی اور مزاحمتی موضوعات کا معاملہ آتا ہے۔ حیدرقریشی ان موضوعات کے دلدادہ نکلے جو مجذوبوں کو ساجتے ہیں۔ وہ ایسے سوالات کے

جوابات کے متلاشی معلوم ہوتے ہیں جو قریب قریب لا جواب ٹھہرائے جاتے رہے ہیں۔ یہ بڑا کام ہے اور شاید اسی سبب سے ان کے مختصر لیکن 'بڑے افسانے' قاری کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ آخری سطر پڑھنے پر بھی جان نہیں چھوڑتے سوچنے پر مائل اور دہرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدر قریشی کا افسانہ پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے ذاتی زندگی کے کسی تجربے سے گزرنا۔ ایسے تجربے سے جو سوچ، کشف اور بشارت سے عبارت ہے۔ **عبداللہ جاوید** (کینیڈا)

یورپ میں مقیم اردو قلم کاروں کی فہرست میں حیدر قریشی صاحب کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے تو انہوں نے مختلف اصناف ادب میں اپنی محنت و ریاضت سے ممتاز جگہ حاصل کی ہے لیکن افسانے کے میدان میں ان کی مساعی واقعی بہت قابلِ لحاظ ہیں بعض بالکل ہی منفرد خصوصیات کی وجہ سے عصری کہانی کاروں میں ان کا ایک بالکل ہی علاحدہ اور ناقابلِ انکار تشخص متعین ہو چکا ہے۔ **قیصر تمکین** (انگلینڈ)

حیدر قریشی جہاں شاعری میں اپنے فن کو مکمل طور پر منوا چکے ہیں وہاں اُن کے افسانے بھی اُردو ادب میں اپنے منفرد اور جدت و ندرت سے بھرپور ہونے کی بناء پر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

منزہ یاسمین (بھاول پور)

۶۰ء اور ۷۰ء کے عشرے میں جہاں دیگر افسانہ نگار خارجی حقائق سے دلبرداشتہ ہو کر باطنی تجربہ کو کہانی میں وقوعہ بنا رہے تھے وہاں حیدر قریشی خارج سے کٹ کر گیان دھیان کے فلسفے کو عمل میں لا کر کہانی کی نئی جہت کی تلاش میں مگن تھا۔ حیدر قریشی کا بنیادی فلسفہ 'ہمہ اوست' ہے۔ وہ کائنات اور دیگر تمام مظاہر کو ایک بڑے نامیاتی کل کا جزو مانتے ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے 'جزو' کہا ہے عموماً وحدۃ الوجود کی تعریف کرتے ہوئے بعض دانشور 'ایک بڑے کل کے حصے' خیال کرتے ہیں۔ 'حصہ' ہونے سے وجود کی وحدانیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ جبکہ 'جزو' اس کل کا ایسا حصہ ہوتا ہے جو دوبارہ اپنی جگہ پر قائم ہو سکتا ہے۔

حیدر قریشی کا نظریہ حیات یہ ہے کہ کائنات ایک 'کل' کی حیثیت سے وجود رکھتی ہے گویا وہ تمام اشیاء میں وحدت کی کارفرمائی کو بنیادی عنصر خیال کرتے ہیں۔ وحدۃ الوجود کا یہ تصور ہند سے فارس

اور فارس سے اسلام کا حصہ بنا ہو یا صوفیا کے باطنی تجربہ کی اختراع ہو یہ امر طے شدہ ہے کہ اس نے حیات انسانی پر متنوع اثرات مرتب کیے ہیں۔ حیدر قریشی کا نمایاں وصف مذہبی اساطیر کو کہانی کا حصہ بنا کر ان کے ذریعے سے سماجی مسائل کا اظہار ہے۔ ان کی کہانیوں کا داستانوی رنگ تقاضا کرتا ہے کہ موضوعاتی سطح پر ایک ایسا تلمیحاتی و استعاراتی نظام وضع کیا جائے جو انسان کے لیے نہ صرف یہ کہ تاریخی حیثیت کا حامل ہو بلکہ عصر حاضر میں اس کی اہم ضرورت بھی ہو۔ مذہب کسی معاشرت کا فعال حصہ ہوتا ہے۔ گو کہ ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ ثقافت مذہب کے بطن سے پھوٹتی ہے یا مذہب مقامی ثقافت میں ڈھل جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ حیدر قریشی بلاشبہ اپنے عہد کا نباض افسانہ نگار ہے۔ جو تلخ سماجی حقیقتوں کے گھونٹ پیتا ہے اور پھر اپنے قاری کو کہانی سنانے بیٹھ جاتا ہے تو اس کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ان حقائق سے بھی آگاہ کر دیتا ہے جن سے قاری بے خبر ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کا کہانی کہنے کا انداز تیکھا مگر دلنشیں ہے وہ قاری کو حیرتوں میں گم کر دیتے ہیں تو ساتھ ہی اسے نئی دنیاؤں کے راستے بھی سجھاتے ہیں۔ گویا ان کا فلسفۂ عمل کا فلسفہ ہے۔ اور وہ سب سے پہلے انسانوں کے درمیان مذہب کی دیوار، سماج کی دیوار اور طبقے کی دیوار گرا کر اسے اس بے گانگی سے نجات دلانا چاہتا ہے جس نے اس کی زندگی کی شہزادی کو سامری جادوگر کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ حیدر قریشی تمام انسانوں کو ایک شمار کرتے ہیں اور بلاشبہ انسان دوستی کے بہت بڑے پرچارک ہیں۔ **کامران کاظمی** (اسلام آباد)

آپ کی کہانیوں سے مجھے کوئی بیتی خوشبو آئی ہے۔ ٹھہریئے میں اگر جلالوں--- میں اگر جلا آیا ہوں اور خوشبو میں بھیگتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ مجھے آپ کا کہانی بننے کا ڈھنگ نویکلا لگا ہے"۔

مسعود منور (ناروے)

(روشن نقطہ) اپنی نوعیت کا بہت خوبصورت اور حیدر قریشی صاحب کی مخصوص چھاپ لگا افسانہ ہے۔ میرے محدود علم کے مطابق اس رنگ میں ابھی تک حیدر صاحب سے اچھا افسانہ کسی نے نہیں لکھا۔ تصوف اور روحانی واردات کا حسین امتزاج۔ **جمیل الرحمن** (انگلینڈ)

☆☆☆

میری محبتیں

(خاکے،یادیں)

حیدرقریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

میری محبتیں کاای بک ایڈیشن

میری محبتیں کا پہلا ایڈیشن نایاب پبلی کیشنز خان پور کی جانب سے۱۹۹۵ء میں شائع کیا گیا تھا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا تھا۔میری گیارہ کتابوں کے مجموعہ ''عمرِ لاحاصل کا حاصل''میں بھی ''میری محبتیں'' شامل ہے۔اس کلیات کا پہلا ایڈیشن معیار پبلی کیشنز دہلی نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا تھا۔یہ عوامی ایڈیشن تھا۔پھر۲۰۰۹ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اس کلیات کا لائبریری ایڈیشن شائع کیا۔۲۰۱۲ء میں اس کلیات کا مزید اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ پرای بک ایڈیشن شائع کیا گیا۔جواِن لائبریری لنکس پر دستیاب ہے۔

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/2012/09/blog-post_15.html

https://docs.google.com/file/d/0B_xQnk75odj9TjNicHdudXBFblU/edit

http://haider-qureshi.blogspot.de/2013/12/blog-post_6582.html

''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کی گیارہ کتابوں میں شامل رہنے کے ساتھ اب ''میری محبتیں'' کو الگ سے ای بک کی صورت میں بھی شائع کیا جارہا ہے اور یہ کتاب ''خواب کے اندرخواب'' کے اس انٹرنیٹ ایڈیشن میں بھی شامل ہے۔

انتساب

دونوں بیٹیوں

رضوانہ اور دُرِّ ثمین کے نام

مِری چڑیوں کی جوڑی ہے
اک پہلوٹھی کی
اک پیٹ کھروڑی ہے

فہرست

اول خویش:

بعد درویش:

برگد کا پیڑ

(اباجی)

گلابوں کی مہک تھی یا کسی کی یاد کی خوشبو
ابھی تک روح میں مہکار کا احساس باقی ہے

باپ بیٹے کے مابین اوّلین تعارف کا کوئی واقعہ بیان کرنا اس لحاظ سے بے معنی سی بات ہے کہ یہ تعارف تو خون کے اجزا میں سے ڈھونڈ نکالنا بھی مشکل ہے۔ صدیوں پہلے ہم اپنے آباؤ اجداد کے لہو میں موجزن تھے۔ اپنی پیدائش سے پہلے میں اباجی کے لہو میں رواں تھا تو اباجی اپنی وفات کے بعد بھی میرے دل میں دھڑک رہے ہیں۔ اس کے باوجود شعوری سطح پر اباجی سے میرا پہلا معانقہ اس وقت ہوا جب میری عمر تقریباً تین سال تھی۔ یہ واقعہ آج بھی میرے شعور میں ایک ہیُولے کی طرح موجود ہے۔ یوں تو ہر انسان اپنے بچپن میں فطرت سے بہت قریب ہوتا ہے لیکن مجھے بچپن میں فطرت سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ چنانچہ جیسے ہی موقعہ ملتا الاسٹک والی نیکر اور بٹنوں والی شرٹ اتار کر فطری لباس پہن لیتا۔ ایسا ایک موقعہ مجھے اُس وقت ملا جب امی جی سامنے والے گھر کی بُوا زیبو کے ہاں گئیں اور میں فطری لباس پہنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ رحیم یار خاں کے محلّہ قاضیاں سے (موجودہ) جدید بازار تک کئی پیچ دار رستوں سے نجانے میں کس طرح گزرتا چلا گیا۔ اباجی وہاں اپنے ایک دوست ممتاز صاحب کی دوکان پر کھڑے تھے۔ میں جا کر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ انہوں نے سمجھا کسی کا بچہ ہے جو خوامخواہ ان سے

چمٹ گیا ہے۔ چنانچہ میرے معانقہ کے جواب میں انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھے اپنے سے الگ کر کے پرے کر دیا۔ میں پھر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اس بار پھر انہوں نے دیکھے بغیر مجھے پرے دھکیل دیا اور میں اپنے حواس درست کئے بغیر تیسری بار پھر ''ابوا'' کہہ کر ان کی ٹانگوں سے معانقہ کرنے لگا۔ لیکن اب اس سے پہلے کہ اباجی مجھے پھر پرے دھکیلتے ممتاز صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے حیران ہوتے ہوئے اباجی سے کہا: قریشی صاحب! یہ تو حیدر ہے۔ اب جو اَباجی نے پلٹ کر دیکھا تو میری میلی کچیلی، ننگ دھڑنگ حالت ہی میں مجھے اٹھا لیا۔ پھر سب کچھ بھول بھال کر گھر کی طرف چل دیئے۔ راستہ بھر بار بار مجھے خود سے لپٹاتے اور چومتے جاتے۔ گھر پہنچے تو وہاں میری گمشدگی پر کہرام برپا تھا، یہ اباجی سے گویا شعوری سطح پر میرا پہلا تعارف تھا۔

اباجی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے تھے۔ ۱۹۶۰ء تک پھندنے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔ اس ٹوپی کو ترکی ٹوپی بھی کہتے تھے۔ پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔ آج اباجی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام میں دراوڑ حاوی رہا۔ عالم شباب میں نواب بھاولپور تک رسائی حاصل کر کے انہیں بھاول نگر محکمہ پولیس میں محرر لگوایا گیا جب سارا سامان باندھ کر روانہ ہونے کا وقت آیا تو داداجی نے دبی زبان سے کہا: بیٹا!۔ تو پھر جا رہے ہو؟۔ اچھا جاؤ، ویسے دل نہیں کرتا کہ جاؤ۔

اباجی نے فوراً کہا: دل تو میرا بھی نہیں کرتا کہ جاؤں، اس لئے نہیں جاتا۔ یہ کہہ کر بندھا ہوا سامان کھول ڈالا۔

اباجی نے یہ قصہ بڑے مزے لے کر ہمیں سنایا تھا اور پھر کہا تھا: بھئی ہم سرائیکی لوگ تو اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر ہی پردیسی ہو جاتے تھے۔ یہ واقعہ تقسیم برصغیر سے پہلے کا ہے۔ اگر ان پر ان کے اندر کا دراوڑ حاوی نہ ہوتا تو وہ کم از کم ایس پی کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے۔ بعد

میں جب خراب حالات بار بار حملہ آور ہونے لگے تو یوں لگا جیسے دراوڑ مغلوب ہو گیا ہے اور اباجی کے اندر کا آریا فاتح ہو گیا ہے۔ رحیم یار خاں والا گھر فروخت کیا گیا تو اباجی کے چہرے پر کوئی کرب نہیں تھا۔ میں تب صرف دس برس کا تھا مگر وہ گھر آج بھی نہ صرف میرے نہاں خانۂ دل میں آباد ہے بلکہ مجھے جب بھی رحیم یار خاں جانے کا موقعہ ملتا ہے، اس گھر کو دیکھنے کے لئے ضرور جاتا ہوں اور وہاں دیر تک بچپن کی یادوں میں گھرا رہتا ہوں۔ خانپور والا گھر فروخت ہوا تو اباجی کے چہرے پر کوئی اداسی نہ تھی۔ یوں ان کے اندر کا آریا فتح یاب ہو گیا۔ مگر دراوڑ مغلوب کہاں ہوا؟ اس نے بیوی بچوں کو دھرتی کا متبادل بنالیا، ایک معمولی سی مدت کے علاوہ بیوی بچوں کو خود سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔

اندر کے آریا اور دراوڑ کی کشمکش سے بے نیاز ایک عرب درویش ہمیشہ اباجی کے اندر موجود رہا۔ یہ درویش خواب بین، دعا گو اور صاحبِ کشف و کرامت تھا۔ عرب درویش کا کمال یہ تھا کہ نیل آرمسٹرانگ سے دس سال پہلے اس نے چاند کی سرزمین پر قدم رکھ دیا تھا۔ اباجی نے ۱۹۵۹ء میں خواب دیکھا کہ وہ چاند کی سرزمین پر اترے ہوئے ہیں۔ وہاں کے پہاڑ دیکھنے میں ایسے لگتے ہیں جیسے راکھ کے ہوں اور پاؤں رکھتے ہی راکھ میں دھنس جائیں گے۔ لیکن اباجی پہاڑ پر پاؤں رکھتے ہیں تو وہ پتھر کے ہی ہوتے ہیں۔

Rain Makers اور Rain Breakers کے چند قصے تو اب پڑھنے کو ملے ہیں۔ مگر اباجی کی ''وِل پاور'' اور ''ارتکاز'' کا کرشمہ تو ہم نے خود دیکھا تھا۔ اباجی اور امی جی میں ''بزرگی'' کے مسئلہ پر مذاق چلتا رہتا تھا۔ اباجی نے کہا: اگر میں اللہ میاں سے دعا کر کے اسی وقت بارش کروادوں تو میری بزرگی کو مان لوگی؟۔۔ رحیم یار خاں میں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بادلوں کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ اس لئے امی جی نے للکارتے ہوئے شرط منظور کر لی۔ اباجی مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب چھت سے نیچے آئے، چاروں جانب سے گھنگھور گھٹائیں امڈی چلی آ رہی تھیں۔ موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ لیکن امی جی نے اباجی کی بزرگی کو نہیں ماننا تھا نہیں مانیں۔

مریضوں پر دم کرنا اور کسی کی خاص غرض کے لئے خصوصی دعا کرنا ان کی روحانیت یا وِل پاور کا عام سا کرشمہ تھا۔ میری ایک بہن زبیدہ کو جب بھی بخار ہوا اور دوا سے فرق نہیں پڑا، اباجی نے اسے بھینچ کر گلے سے لگایا اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ میرے نزدیک ایسے متعدد واقعات کے باوجود اباجی کی سب بڑی کرامت یہ تھی کہ انہوں نے دکھوں سے بھری ہوئی زندگی کو ہنسی خوشی گزار لیا۔ کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلر ماسٹر تک کا تکلیف دہ سفر طے کیا۔ پھر شوگر مل میں نوکری کر لی اور مجھے بھی شوگر مل میں جھونک دیا۔ حیٔ سنز شوگر ملز خانپور کے جنرل منیجر عزیز حسین کی بیگم بڑی نیک دل خاتون تھیں (اگر ابھی تک زندہ ہیں تو اللہ انہیں مزید زندگی عطا کرے) اباجی کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ اپنے بہت سے خانگی معاملات اباجی کو بتا کر ''دعا'' اور ''دوا'' دونوں کے لئے کہتیں۔ بیگم عزیز حسین کی نیکی کے سبب مجھے پندرہ (سولہ) برس کی عمر میں شوگر مل میں مزدوری مل گئی۔ میں نے اپنی زندگی کے بے حد قیمتی انیس سال اس شوگر مل میں برباد کئے۔ بیگم عزیز حسین کی نیک نیتی اور نیکی کے باوجود مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے لئے نیکی نہ کی ہوتی تو میں زیادہ بہتر حالت میں ہوتا۔

شوگر مل کی ملازمت کے حوالے سے ہی یاد آیا کہ ملز انتظامیہ کے مزدور دشمن رویے کے باعث مجھے ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑا۔ ملز میں تصادم ہوا۔ بعض اہم افسروں کی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہوئی۔ مقدمات بنے۔ اسی دوران مجھے بار بار دھمکیوں کے ساتھ خوشنما آفرز بھی ہوئیں مگر میں جوشِ جوانی اور بغاوت کی دُھن میں ہر آفر کو ٹھکراتا چلا گیا۔ ایک مرحلے پر اباجی سے بھی کہا گیا کہ مجھے مفاہمت کے لئے راضی کریں۔ اباجی نے مجھے بتایا کہ مجھے اس طرح کہا گیا ہے مگر تم جو فیصلہ اپنے طور پر کرنا چاہو، وہی کرو۔ میں نے کہا کہ اگر آپ مفاہمت کا حکم دیتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ مگر انہوں نے کہا میں ایسا کوئی حکم نہیں دوں گا۔ تم خود فیصلہ کرو گے اور جو بھی فیصلہ کرو گے وہی درست ہوگا۔ چنانچہ میں نے مفاہمت کی بجائے بغاوت کا فیصلہ کیا۔ اس واقعہ سے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اباجی اپنی وضع داری کی روایت پر تو قائم تھے مگر میرے باغیانہ رویے کو وہ بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کا لازمی تقاضا سمجھتے تھے۔ اسی لئے مجھے اس

سے روکنے کے بجائے انہوں نے بالواسطہ میری حوصلہ افزائی کی۔ جب ہماری یونین کو معطل کرادیا گیا تب ہم سے ملنے والے ہر مزدور سے باز پرس کی جاتی تھی مگر اباجی کی اپنی شخصیت اتنی مضبوط تھی کہ نہ صرف انہیں ملز انتظامیہ کی طرف سے تنگ نہیں کیا گیا بلکہ ان کا اسی طرح احترام کیا جاتا رہا جیسا میری بغاوت سے پہلے ہوتا تھا۔

اباجی بتاتے تھے کہ ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے بیٹوں کی کمی چلی آرہی تھی۔ ایک بزرگ کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ ان بیٹوں میں سے ایک کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔ ان میں سے بھی ایک کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔ میاں میر محمد کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے۔ میاں سعید بے اولاد رہے۔ میاں غوث محمد کے ہاں ایک بیٹا ہوا مگر اگلے مرحلے میں ان کی نسل بھی ختم ہوگئی۔ میاں اللہ رکھا کے ہاں دو بیٹے ہوئے، باباجی اور اباجی۔۔ باباجی کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور اباجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

اباجی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی عزیز بی بی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لی کہ یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ پھر اباجی کی شادی ہماری امی جی سے ہوئی اور یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔ پانچ بیٹے، پانچ بیٹیاں۔۔ عزیز بی بی نے دوسری جگہ شادی کر لی مگر اولاد سے محروم رہی۔

ایک دفعہ بوا حیات خاتوں ہماری چھوٹی بہن بے بی کو لے کر ایک رشتہ دار کے یہاں گئیں۔ وہیں اباجی کی پہلی بیوی آ گئی۔ بے بی کو دیکھتے ہی چونکی۔ اس کے استفسار پر بوا حیات خاتوں نے بتایا کہ قریشی غلام سرور کی بیٹی ہے۔ اسی وقت بے بی کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی ۔اباجی کی اولاد کی تفصیل پوچھی۔ بوا حیات خاتوں نے تفصیل بتادی۔ سن کر سارے بچوں کو درازیٔ عمر کی دعائیں دینے لگی اور پھر حسرت سے کہنے لگی مجھے میری زیادتی کی سزا مل گئی ہے۔۔ چند دنوں کے بعد اباجی کی پہلی بیوی کی طرف سے کھانے کی چند اشیاء کا تحفہ ہمارے گھر آیا۔ مگر اباجی نے ساری چیزیں تلف کرادیں۔ کسی کو چکھنے نہیں دیں ان کا خیال تھا کہ ان اشیاء پر کوئی منفی قسم کا دَم کیا گیا ہے۔۔ پہلی بیوی کی بے وفائی کے بعد اباجی کی امی جی سے شادی ہوئی تو دونوں کی عمروں

میں بارہ سال سے زائد کا فرق تھا مگر اس بُعد نے محبت میں اضافہ کیا۔ اباجی اور امی جی کی محبت اور خوشگوار ازدواجی زندگی سارے خاندان کے لئے آج بھی ایک مثال ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے عزیزوں میں اباجی کا گھر سب سے زیادہ خوش حال تھا، پھر وہ وقت آیا کہ اباجی کا گھر انتہائی غربت کا شکار ہوگیا۔ بے حد قریب رہنے والے عزیز دور ہوگئے مگر اباجی کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اباجی بے حد قناعت پسند تھے مگر انہوں نے ہمیں کبھی قناعت کا درس نہیں دیا۔ دراصل وہ اس لئے سارے دکھ خوشی خوشی برداشت کر رہے تھے کہ پچھلی کئی پشتوں سے ''پل صراط'' پر چلتے ہوئے ان کے خاندان کو پانچ بیٹوں کو سنبھالا مل گیا تھا۔ حالانکہ یہ پانچوں بیٹے ان کے کسی کام نہ آسکے۔ نہ کوئی خدمت کرنے کا اہل ہوسکا نہ کوئی خدمت کر سکا۔ ان کی اپنی ساری زندگی ہی مشقت کرتے گزر گئی۔۔۔ اباجی کو کبھی کبھی غصہ بھی آتا اور یہ غصہ عام طور پر گھر کے گھڑوں اور برتنوں پر اترتا تھا۔ لیکن جب شام کو اباجی گھر آتے، ان کے ایک ہاتھ میں نیا گھڑا اور دوسرے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کے ہار ہوتے اور جھگڑا ختم۔

۱۹۵۰ء میں اباجی اچانک بیمار ہوئے تھے۔ اس علالت میں عجیب و غریب قسم کے دورے پڑتے تھے۔ باباجی کے بیان کے مطابق اباجی کو چار چار پانچ پانچ کڑیل جوانوں نے دبایا ہوتا تھا مگر اباجی اس طرح اٹھ بیٹھتے کہ انہیں دبانے والے لڑھکتے ہوئے اِدھر اُدھر جا پڑتے۔ اباجی نے اس سلسلہ میں جو احوال سنایا، اس کے مطابق ان کے اوپر ایک بہت بڑا فانوس نصب تھا، حالانکہ تب ہمارے گھر میں بجلی ہی نہیں آئی تھی۔ اس فانوس سے سبز رنگ کی روشنی نکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ اسی روشنی کے ذریعے ان کی بہت سے بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ اباجی کے بقول ایک مرحلے پر انہیں خود علم ہوگیا تھا کہ ان کی جان نکل رہی ہے۔ ٹانگوں سے بالکل جان نکل چکی تھی مگر پھر انہیں دنیا میں مزید (۳۶ سال) جینے کی اجازت مل گئی۔ اباجی کی زندگی کی یہ سنگین بیماری، جس کے باعث سارے عزیز ان کی زندگی سے مایوس ہوچکے تھے حقیقتاً کوئی بیماری تھی یا کوئی روحانی تجربہ تھا، میں اس بارے میں تو کوئی حتمی بات نہیں کرسکتا تاہم بعد میں ان کی زندگی میں خواب بینی، دم درود اور کشوف کا جو سلسلہ نظر آتا ہے وہ اسی تجربے سے ہی مربوط محسوس

ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

میری پیدائش سے چند ماہ پہلے ابا جی نے یکے بعد دیگر دو خواب دیکھے تھے۔ پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا اور گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ابا جی اس درخت کے اوپر عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ خواب سن کر ابا جی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو.....

دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کر کے ''حیدر۔ حیدر'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔ ابا جی نے اپنے مرشد کو خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرمادیں۔ مرشد کو ابا جی کے خواب کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے حیدر بنا دیا۔ مگر ابا جی کے دونوں خوابوں کی تعبیر کا ابھی تو دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔ شاید حسنِ اتفاق تھا کہ میں پیدا ہوگیا اور حیدر نام رکھا گیا۔

میں بچپن میں شرارتیں بہت کرتا تھا۔ دوسروں کو ڈرانے میں مزہ آتا تھا۔ اسی وجہ سے بچپن میں ابا جی سے بڑی مار کھائی۔ سب سے زیادہ مار بھی میں نے کھائی اور ابا جی کی توجہ بھی سب سے زیادہ مجھے ملی۔ یہ ابا جی کی ذاتی توجہ ہی تھی جس کے باعث اسکول میں داخلہ کے وقت مجھے کچی، پکی کی بجائے براہ راست دوسری جماعت میں داخل کرلیا گیا۔ شادی کے بعد بھی ایک دفعہ ابا جی سے تھپڑ کھایا۔ یوں تو والدین کی محبت ساری اولاد کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ابا جی کو آپی سے اور مجھ سے سب سے زیادہ پیار تھا۔ زبیدہ کے لئے فکرمندی زیادہ رہی جبکہ اعجاز سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا رہا۔

موسیقی سے ابا جی کو رغبت نہیں تھی لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک پرانا گانا ''ڈاچی والیا موڑ مہار وے'' سن کر کہتے یہ تمہارے دادا کو بہت پسند تھا۔ ابا جی کو حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں پسند تھیں۔ عام طور پر تحت اللفظ کے ساتھ پڑھتے۔ کبھی کبھار اپنے آپ میں گنگنا بھی لیتے۔ عنایت حسین بھٹی کی آواز میں خواجہ صاحب کی کافی ''ساکوں سجناں دے ملن دی تانگ اے'' سن کر جھوم سے اٹھتے۔ انھی کی وجہ سے ہی شاید مجھے لوک گیتوں اور صوفیانہ شاعری

سے دلچسپی ہوئی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ عموماً ابا جی کے چہرے پر رہتی تھی۔ جملے باز نہیں تھے مگر اچھے جملے پر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ ہنسی کی کسی بات پر اگر کھل کر ہنستے تو اتنا ہنستے کہ آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ ان کی اس کیفیت پر میرا جی کا شعر یاد آ گیا ہے:

نہیں گریہ و خنداں میں فرق کچھ بھی جو ہنستا گیا دل تو روتا گیا دل

ابا جی کی شخصیت کا جادو ایسا ہے کہ آج بھی رحیم یار خاں کے ان کے پرانے احباب سے ان کا ذکر کریں تو ان کی باتیں سناتے سناتے آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ رحیم یار خاں کے پرانے محلے سے جا کر پتہ کریں تو ابا جی کا نام سنتے ہی ان کے چہروں پر محبت کی چمک آ جاتی ہے۔ میں تقریباً دس سال کے بعد پہلی دفعہ پرانا مکان دیکھنے گیا تو نہ صرف اڑوس پڑوس کے سارے لوگ جمع ہو گئے بلکہ اتنی محبت سے اپنے گھروں میں لے گئے کہ میں ان محبتوں پر حیران رہ گیا۔ گھر کی لڑکیوں، عورتوں میں سے کسی نے پردہ نہ کیا، بوڑھیوں نے سر منہ چوم لیا۔ یہ ساری محبتیں حقیقتاً ابا جی کے وسیلے سے نصیب ہوئیں۔ شوگرمل میں آج بھی ان کی بات کی جائے تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو شرارتاً ہی ان کے کردار پر انگلی اٹھا سکے۔ دراصل ابا جی صراطِ مستقیمی آدمی تھے۔ ایسا بننے کے لئے بڑی کٹھن ریاضت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی صراطِ مستقیمی بننے کی کوشش کرتا ہوں مگر زگ زیگ چلتا ہوں کیونکہ مجھے احساس رہتا ہے کہ لکیریں اپنے فقیروں کو کھا جاتی ہیں۔

شروع میں ابا جی کے ساتھ تعلق میں احترام کے باعث ایک حجاب یا فاصلہ سا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ حجاب کم ہوتا گیا۔ یکسر ختم تو نہیں ہوا مگر ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی ضرور ہوگئی کہ انسانی زندگی کے بعض حساس موضوعات پر ہم اطمینان سے گفتگو کرلیتے تھے۔ بعض مسائل میں انہوں نے میری رہنمائی بھی کی۔ میرے مقابلے میں ابا جی اپنے پوتوں سے زیادہ بے تکلف تھے۔ زلفی، شازی، ٹیپو تینوں ان کے ساتھ فری تھے۔ ابا جی ان کے ساتھ مختلف گیمز کھیلتے، مزے سے ہارتے اور پھر پوتوں کی بے تکلف ہوٹنگ سے لطف اندوز ہوتے۔ پہلے پہل جب میں نے شازی کو ہوٹنگ کرتے دیکھا تو اس کی بدتمیزی کو محسوس کرتے ہوئے اسے سختی سے ڈانٹا مگر اسی وقت ابا جی کی

جوابی ڈانٹ مجھے پڑی کہ جیسے کرتے ہیں کرنے دو۔۔تو میں نے دادا، پوتوں کی بے تکلفی سے خود کو الگ کرلیا۔

علالت کی حالت میں اباجی بار بار مجھے اور آپی کو یاد کرتے رہے یا پھر ٹیپو، مانو اورانس (چھوٹے پوتوں اور پوتی) کو یاد کرتے رہے۔آپی نے کراچی میں کوئی خواب دیکھااور گھبرا کرازخود اباجی کے پاس پہنچ گئی۔اباجی نے آپی کو گلے سے لگالیا۔دیر تک روتے رہےاور پھر کومے کی حالت میں چلے گئے۔جب میں پہنچا کومے کی حالت میں تھے۔باقی بہن بھائی بھی جمع ہونے لگے۔شاہدہ، بے بی، اکبر، طاہر، اعجاز سب آ گئے۔زبیدہ امریکہ میں تھی اس کا آنا ممکن نہ تھا۔نوید نے پہنچنے میں تھوڑی دیر کردی۔۔نوید آ گیا تو پانچوں بیٹے باپ کے سرہانے کھڑے ہوگئے۔باری باری سب نے سامنے آ کر اپنا نام لیا۔ ہرآواز پراباجی نے آنکھیں کھولیں اوران کی آنکھوں میں غروب ہوتے ہوئے زندگی کے سورج نے ہر بیٹے، بیٹی اورعزیز کوخدا حافظ کہااور پھروہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔

اباجی کی وفات کے بعدایک دوست نے تعزیتی خط میں لکھا کہ میں جب بھی خانپور میں قیام کے دنوں میں آپ کے گھر پر دستک دیتا۔اگرآپ کےاباجی آتے اور میں ان سے آپ کا پوچھتا تو آپ کا نام سنتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوتی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔

رحیم یارخاں کےقریب ایک گاؤں ''بستی قندھاراسنگھ'' (یاشاید بستی گندھاراسنگھ) کی ایک فیملی سے ہمارے رشتہ داروں جیسے تعلقات ہیں۔اباجی کی وفات کے بعد خالہ فاطمہ وہاں سے تعزیت کے لئے آئیں تو انہوں نے بتایا کہ ان کے بھائی شاہ محمد صاحب پورے خاندان سمیت بھارتی پنجاب سے سیدھے اسی گاؤں میں آئے تھے۔عید سے چند دن پہلے اباجی کی دکان پر گئے اورانہیں سونے کے کڑے دے کر کہنے لگے کہ اسے گروی رکھ کر ہمیں کپڑا اُدھار دے دیں تا کہ بچوں کی عید ہو جائے۔اباجی ان کی پسند کے مطابق کپڑا دیتے چلے گئے۔جب ان کا مطلوبہ سارا کپڑا دے دیا تو اباجی نے سیف سے سو روپے کا نوٹ نکالا اورشاہ محمد صاحب سے کہا یہ میری طرف سے آپ کے بچوں کے لئے عیدی ہے۔سونے کے کڑے واپس لے جایئے اور کپڑوں کی

رقم جب سہولت کے ساتھ دے سکیں، دے جایئے۔۔کسی شناسائی کے بغیر اس سلوک پر شاہ محمد صاحب پہلے حیران ہوئے پھر آبدیدہ ہو گئے۔نتیجتاً ان کے خاندان کے افراد سے آج بھی ایسا گہرا تعلق بنا ہوا ہے جو بعض رشتہ داروں کے ساتھ بھی نہیں ہے۔البتہ خالہ فاطمہ کے اس انکشاف کے بعد مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اباجی کا کپڑے کا اچھا بھلا کاروبار زوال کا شکار کیوں ہوا۔

اباجی کی وفات کے بعد ہم نے ان کی میّت کو سر سے پیروں تک گلاب کے پھولوں سے بھر دیا تھا اور پھولوں سمیت ہی دفن کیا تھا۔وفات کے تیئسویں دن، رات کے نو بجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جو اباجی کا ذاتی کمرہ تھا۔یہ خوشبو پہلے امی جی نے محسوس کی اور مجھے کمرے میں بلایا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیئے۔ میری ایک کزن خالدہ کے دیور شاہد حسین بھی اس وقت ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔میں نے انہیں بھی کمرے میں بلالیا۔انہوں نے بھی حیرانی کے ساتھ خوشبو کی موجودگی کی تصدیق کی۔ خوشبو اتنی تیز تھی کہ باہر کی گلی میں بھی ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی جبکہ کھڑکی سے تو خوشبو کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ایک دن کے وقفے کے بعد دوپہر کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اسی کمرے میں پھر گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو پھیل گئی۔اس خوشبو کو میں نے کمرے میں آ کر محسوس کیا اور پھر آوازیں دے کر سارے افراد خانہ کو جمع کر لیا۔سب نے ہی خوشبو کو محسوس کیا۔ چند منٹ کے بعد خوشبو غائب ہوتی چلی گئی۔ دونوں دفعہ خوشبو کا جانا ایسے لگا جیسے کوئی انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل رہا ہو۔

باباجی نے مجھے کہا کہ اگر تم اس معاملے میں دوسروں سے بات نہ کرتے تو یہ خوشبو وقتاً فوقتاً تمہاری ماں کو اور تمہیں ملتی رہتی۔شاید خوشبو سے بڑھ کر بھی کچھ رونما ہو جاتا۔مگر تم نے اس کا بھید افشا کر کے خود کو اس سے محروم کرلیا ہے۔باباجی کی باتیں باباجی جانیں۔لیکن یہ خوشبو کیا تھی؟۔۔ اتنی سی بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کرسکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کرسکتی ہے۔

☆☆☆

مائے نی میں کنوں آکھاں

(امی جی)

ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

''راج دلارے!
او میری اکھیوں کے تارے
میں تو واری واری جاؤں۔۔راج دلارے.....''

یہ مشہور لوری میں نے کوثر پروین کی آواز سے پہلے اپنی امی جی کی آواز میں سنی۔امی جی نے یہ لوری اپنے سارے بیٹوں میں سے صرف میرے لئے گائی۔ماں کی محبت اور دعاؤں سے بھری اس لوری نے مجھے پروان چڑھایا۔امی جی کی وفات سے کوئی سال بھر پہلے مجھے چند ماہ گوجرانوالہ میں گزارنے پڑے۔وہیں ایک روز شام کا کھانا ایک ہوٹل میں کھا رہا تھا۔اچانک یہ لوری کیسٹ پلیئر سے نشر ہونے لگی۔لوری شروع ہوتے ہی میں جیسے بچہ بن گیا اور میں نے دیکھا کہ امی جی نے مجھے۔۔چھ ماہ کے بچے کو۔۔گود میں اٹھایا ہوا ہے اور لوری سنا رہی ہیں لوری ختم ہوگئی۔۔میں بچپن عبور کر کے اپنی اصل عمر تک پہنچا تو دیکھا کہ، میں جو ابھی ماں کی گود میں کھلکھلا رہا تھا، میری آنکھیں بھیگی ہوئیں تھیں۔عجیب سا تجربہ تھا۔کئی بار سوچا امی جی کو اس تجربے سے آگاہ کروں گا مگر پہلی محبت کے اظہار کی طرح اس تجربہ سے امی جی کو آگاہ نہ کر سکا یہاں تک کہ وہ وفات پا گئیں۔

پہلی محبت سے یاد آیا کہ میری پہلی محبت بھی میری امی جی ہیں اور آخری محبت بھی امی جی ہیں۔اس اوّل اور آخر کے بیچ میں بہت سی محبتیں آئیں مگر درحقیقت وہ سب میری پہلی اور آخری محبت کا عکس تھیں۔امی جی کا چہرہ کتابی اور گول چہرے کے بین بین تھا۔چنانچہ بیچ میں آنے والی میری ساری محبتیں بھی کتابی چہرے والی تھیں۔اپنی بیوی سے میری گہری دوستی کی وجہ شاید یہی ہے کہ امی جی کی بھتیجی ہونے کے ساتھ امی جی سے کافی مشابہت بھی رکھتی ہے۔ماہرین نفسیات اس کی جو چاہیں توجیہہ کرلیں، مجھے اعترافِ جرم سے عار نہیں۔

امی جی کی شادی کم عمری میں ہوئی۔چودہ پندرہ برس کی عمر میں، تب ابا جی کی عمر تقریباً ستائیس برس تھی۔ابا جی سرائیکی تھے،امی جی پنجابی۔عمروں اور کلچر کے واضح فرق کے باوجود میاں بیوی کی محبت کا کمال یوں ظاہر ہوا کہ ابا جی دیکھنے میں پنجابی لگتے تھے اور امی جی سرائیکی لگتی تھیں۔دونوں نے خود کو ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔من تو شدم تو من شدی والا حال تھا۔

ہمارے معاشرے میں لگائی بجھائی کرنے والے ''پھاپھے کٹنی'' قسم کے کردار جا بجا نظر آتے ہیں۔ہمارے عزیزوں میں بھی بعض ایسی خواتین موجود ہیں۔امی جی کی حالت یہ تھی کہ فساد کرانا تو ایک طرف، کوئی فساد کرنا چاہتا تو اس سے بھی کوسوں دور بھاگتیں۔کوئی آکر فساد کی تیلی لگا جاتا تو خود ہی رو دھو کر چپ ہو جاتیں۔بعد میں آپی اور بے بی بھی امی کی طرح نکلیں۔زبیدہ تو صبر جمیل میں امی جی سے بھی دو قدم آگے نکل گئی (اللہ اسے اپنی حفظ و امان میں رکھے) البتہ شاہدہ نے ہمت سے کام لیا۔اس معاملہ میں امی جی کی پیروی نہیں کی۔نہ صرف خود بولنے میں مہارت حاصل کی بلکہ بے بی جیسی بے زبان کو بھی زبان عطا کر دی۔اللہ کرے زور زباں اور زیادہ!

امی جی محبت، وفا اور ایثار کی روشن مشرقی مثال تھیں۔شادی کے ابتدائی چند برسوں کے بعد ابا جی کا کاروبار زوال کا شکار ہوتا گیا۔انتہائی تنگ دستی تک نوبت پہنچی۔امی جی نے خدا سے تو شکوہ کر لیا مگر مجازی خدا سے کبھی شکایت نہیں کی بلکہ ہر رنگ میں ہمت بندھاتی رہیں۔خدا سے شکوہ بھی اپنی جگہ ایک اہم واقعہ ہے۔امی جی نے بے حد تنگ دستی کے باعث ایک بار انتہائی دکھ کے ساتھ کہا: خدایا! تو کہیں ہے بھی سہی یا نہیں؟۔۔اسی رات امی جی نے خواب دیکھا: نہایت تیز

روشنی ہے۔ جب اس کا منبع ڈھونڈنا چاہتی ہیں تو بڑی پُر ہیبت آواز آتی ہے۔۔ ’’حمیدہ! ادھر دیکھو میں تمہارا خدا ہوں‘‘۔ خوف اور رعبِ خداوندی سے امی جی کی آنکھ کھل گئی۔ سخت سردی کے موسم میں پسینے سے شرابور ہو گئیں۔ اُس دن سے لے کر موت کے دن تک پھر امی جی کو خدا کے وجود کے بارے میں کبھی شک نہیں ہوا۔

ابا جی کی ’’وِل پاور‘‘ کے کئی کرشمے دیکھنے کے باوجود امی جی نے انہیں بزرگ تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ اس معاملہ میں ہمیشہ ہی ابا جی کو چھیڑتی رہیں اور ہار کر بھی ہار نہیں مانتی رہیں۔۔ ایک دفعہ کسی اَٹکے ہوئے کام کی وجہ سے امی جی فکرمند تھیں۔ میں نے ازراہ مذاق کہا چلیں اگر آپ کا یہ کام ہو جائے تو پھر مجھے بزرگ مانیں گی؟۔ فوراً بولیں: میں نے تمہارے باپ کو ساری زندگی بزرگ نہیں مانا تمہیں کیسے مان لوں گی۔ چل بھاگ جا۔ انگریز کی ولایت کا ویزا لگوا نہیں سکتا اور چلا ہے خدائی ولایت کی طرف۔

میرے چھوٹے بیٹے ٹیپو کی عمر پانچ سال تھی۔ جب اس نے مجھ سے سوال کیا کہ اللہ میاں کہاں ہے؟ میں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا! ہم اللہ میاں کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس نے فوراً اعتراض کیا کیوں نہیں دیکھ سکتے؟۔۔ میں نے سوچا چھوٹا بچہ ہے اسے اس کے ذہن کے مطابق سمجھاتا ہوں۔ چنانچہ میں اسے سورج کے سامنے لے گیا اور کہا سورج کی طرف دیکھو۔۔۔
اس نے دیکھنے کی کوشش کی اور پھر بے بسی سے کہا میں نہیں دیکھ سکتا۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ اللہ میاں کا نور اس سے بھی زیادہ تیز ہے اس لئے ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے یہ قصہ امی جی کو بتایا وہ ہنس کر چپ ہو گئیں۔ اگلے دن ٹیپو نے اپنے چھوٹے چچا اعجاز کی گہری سیاہ عینک پہنی، سورج کی طرف دیکھنے کی پریکٹس کی اور پھر میرے پاس آیا۔ ’’میں اب سورج کی طرف دیکھ سکتا ہوں‘‘۔ یہ کہہ کر اس نے عینک پہنی اور سورج کو دیکھنے کا مظاہرہ دکھایا اور پھر مطالبہ کیا کہ اب اللہ میاں بھی دکھائیے۔ میں ٹیپو کے مطالبے پر چکرا گیا مگر امی جی نے ٹیپو کو پیار سے گود میں اٹھا لیا اور کہنے لگیں بیٹے اگر تم اس مقام تک آ گئے ہو تو ایک نہ ایک دن اللہ میاں کو بھی دیکھ لو گے۔ پھر مجھے کہنے لگیں پہلے انوکھے لاڈلے چاند مانگتے تھے مگر یہ تو اللہ میاں سے کم پر راضی ہی نہیں ہوتا۔

امی جی میں جمالیاتی ذوق کی فراوانی تھی۔ ستم ہائے زمانہ نے اسے کجلا تو دیا مگر ختم نہ کر سکا۔ امی جی نے ایک زمانے میں پنجابی میں ایک طویل دعائیہ نظم کہی تھی اس کی ردیف ’’مولا‘‘ اور قافیہ دعا، صدا وغیرہ تھا۔ اتنا ہی مجھے یاد ہے۔ افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق بھی انہیں ایک عرصہ تک رہا۔ میری ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ کسی اہم پیشرفت کی خبر سن کر خوش ہوتیں۔ میرے متعدد افسانوں میں امی جی کا کردار اپنی توانائیوں کے ساتھ براہ راست موجود ہے۔ ’’دھند کا سفر‘‘۔ ’’آپ بیتی‘‘ اور ’’روشنی کی بشارت‘‘ یہ تینوں افسانے ان کی زندگی میں ہی ’’نگار پاکستان‘‘ اوراق‘‘ اور ’’جدید ادب‘‘ میں چھپ گئے تھے۔ ’’روشنی کی بشارت‘‘ پڑھ کر کہنے لگیں کبھی میں تمہیں کہانیاں سنایا کرتی تھی اور اب تم میری کہانیاں بنانے لگ گئے ہو۔ چہرے پر مسّرت تھی۔ امی جی کے تبصرے نے بچپن کے کتنے ہی حسین مناظر کی فلم آن کر دی:

نصف شب
جیسے خوشبو بھری گود
رِستے ہوئے زخم پر جیسے پھاہا / بدن کو تھپکتی ہوئی چاندنی
سر کے ژولیدہ بالوں میں پھرتی ہوئی / ریشمی انگلیاں
ماں کے ہونٹوں کی لَو پر
سلگتی ہوئی اک کہانی کے پر
سات رنگوں کے پر
قاف کی اُس پری کے
جسے ڈھونڈنے کے لئے شاہزادہ
پہاڑوں کی جانب روانہ ہوا!

وفات کے بعد امی جی میری شاعری میں بھی آنے لگیں:

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی   کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ وفات پا گئیں اور حضرت موسیٰ

علیہ السلام حسبِ عادت دربارِ خداوندی میں بے تکلفی سے جانے لگے تو آواز آئی: موسیٰ! احترام کو ملحوظ رکھو۔ وہ فوت ہوگئی جو ہر وقت تمہارے لئے دعائیں کرتی رہتی تھی اور جس کی دعاؤں کے طفیل تمہاری بے تکلفی برداشت کرلی جاتی تھی۔ وہ دعائیں کرنے والی نہیں رہی تو اب پورے احترام کے ساتھ آؤ۔ خدا جانے یہ روایت کس حد تک درست ہے تاہم اس سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر، عالی مقام اور کلیم اللہ کے لقب کے حامل پیغمبر کے گرد بھی ماں کی دعاؤں کا بہت بڑا حفاظتی حصار تھا۔۔ میں نہایت کمزور، عاجز اور گنہگار انسان ہوں۔ مجھے بھی امی جی کی زندگی تک ان کی دعاؤں کا بڑا سہارا رہا۔ زندگی میں جب بھی کچھ ٹھان لیا، کرگزرا۔ اس میں کامیاب نہیں ہوا تو نقصان سے بھی بچتا رہا۔ امی جی کی وفات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب قدرت کی طرف سے پہلے جیسی رعائت نہیں مل رہی۔ اس حقیقت کو محسوس کرکے میں نے کہا تھا:

حیدر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابا بھی چل بسے تری ماں بھی نہیں رہی

بچپن میں۔۔ امی جی نے ایک دفعہ میری شرارتوں سے تنگ آکر مجھے ابا جی کے ساتھ دوکان پر بھجوا دیا۔ ابا جی نے وہاں سزا کے طور پر میری ٹنڈ کرادی۔ میں خوشی سے چھلانگیں مارتا ہوا گھر آیا اور امی جی سے کہا: امی جی، امی جی۔۔ میں بھی ابو کی طرح ہوگیا ہوں اب میں بھی ابو بن جاؤں گا اور پھر اپنے بچوں کو ڈانٹا کروں گا۔

رحیم یار خاں میں ہماری ایک ہمسائی بوا زیبو ہوتی تھیں۔ ان کے بیٹے ظفر سے ہم عمری کے باعث دوستی تھی۔ اس سے میں نے سرائیکی زبان میں ایک سلیس قسم کی گالی سنی جو اس نے اپنے گدھے کو دی تھی۔ مجھے وہ گالی بہت اچھی لگی۔ ایک اور موقعہ پر میں نے بھی ان کے گدھے کی شان میں وہی گالی 'ارشاد' کردی۔ امی جی کو پتہ چلا تو میری خوب مرمت ہوئی۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر وہ گالی میرے منہ پر چڑھ ہی نہیں سکی۔

ہم خانپور میں تھے۔ میں غالباً ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ امی جی کو کسی کام کے سلسلے

میں کراچی میں مقیم خالہ سعیدہ اور ماموں کوثر کے ہاں جانا پڑ گیا۔ امی جی کو گئے ابھی تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ میں نے دوپہر کے وقت بآوازِ بلند رونا شروع کردیا۔ ابو جی پریشان۔۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ مجھ سے بار بار پوچھیں کیا ہوا ہے؟ مگر شدّتِ غم سے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکلتے تھے۔ بڑی مشکل سے ہچکیوں کے دوران ایک دو دفعہ امی۔ امی کہہ سکا۔ ابا جی بھی شاید اداس بیٹھے تھے۔ میرے رونے کا بہانہ ان کے ہاتھ لگ گیا، جھٹ امی جی کو تار بھیج دیا اور امی جی واپس آگئیں۔

امی جی فوت ہوئیں تو میں ساکت ہوگیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر ساون بھادوں کی وہ برسات نہ ہوئی جو دو سال پہلے ابا جی کی وفات پر ہوئی تھی۔ اس بارے میں مجھے ابھی تک ایک مجرمانہ سا احساس ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ابا جی کو امی جی کی ہم سے زیادہ ضرورت تھی۔ شاید اسی لئے موسلا دھار بارش نہیں ہوئی۔ کبھی خیال آتا ہے کہ میں تو امی جی کے حصے کا بھی ابا جی کی وفات پر ہی رو چکا ہوں کیونکہ امی جی تو ابا جی کی وفات کے ساتھ ہی فوت ہوگئیں تھیں۔ وہ تو صرف دعاؤں کا ایک مجسمہ تھا جو ہمارے ساتھ تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔۔ لیکن کبھی کبھی جب ماں کے سمندر وجود اور اپنے جزیرے پن کا احساس جاگتا ہے تو مجرمانہ احساس جیسے زائل ہونے لگتا ہے:

کبھی جب رات ڈھلتی ہے
فلک سے قطرہ قطرہ اوس کی برکھا اترتی ہے
کبھی جب پیاس کی شدت میں زخمی ہونٹ
بہتی تیز ندی کے سجل سینے پہ جھکتے ہیں
کبھی جب آنکھ رِستی ہے۔
تو یوں لگتا ہے جیسے ہم کبھی بچھڑے نہیں اس سے
کہ جیسے ہم جزیرے ہیں
تھپکتے، لوریاں دیتے سمندر کے
بلکتے زرد رُو بیمار بچوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں
ہماری ہجرتوں کی داستاں جھوٹا فسانہ ہے!

امی جی بیک وقت باحوصلہ بھی تھیں اور کمزور دل بھی۔۔باحوصلہ اس طرح کہ نہایت کٹھن اور دکھ بھری زندگی کو ہمت اور صبر کے ساتھ بسر کیا۔کمزور دل اس طرح کہ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے بھی سہم جاتیں۔رحیم یار خاں قیام کے زمانے میں ایک بار ابا جی دوکان سے جلد واپس نہ آسکے۔امی جی نے سرِشام ایک ہمسائی نانی اللہ وسائی کو گھر پر بلالیا۔نانی اللہ وسائی امی جی سے بھی زیادہ کمزور دل تھیں۔اچانک بادل زور سے گرجے اور بجلی کڑکتی چلی گئی۔نانی اللہ وسائی اور امی جی نے بیک وقت زور سے چیخ ماری اور ایک دوسری سے چمٹ گئیں۔ابا جی جب بھیگتے بھاگتے گھر پہنچے،امی جی نے رو رو کر بُرا حال کرلیا۔پھر ابا جی سرِشام ہی گھر آجایا کرتے تھے،لیٹ نہ ہوتے تھے۔

امی جی کو جب شوگر کی شکایت ہوگئی تو میں نے احتیاطی تدابیر کی طرف توجہ دلائی مگر ان کا ایک ہی جواب تھا،اگر میٹھی چیزیں کھانے سے موت آتی ہے تو آنے دو۔میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو امی جی نے دودھ بغیر چینی کے پینا شروع کر دیا مگر مٹھائی کو پرہیزی لسٹ میں شامل کرنے کے لئے وہ آخر دم تک تیار نہ ہوئیں۔بالآخر میٹھی چیزیں کھا کر ہی جان،جانِ آفریں کے سپرد کردی۔۔ابا جی کی وفات کے بعد دراصل امی جی میں زندہ رہنے کی خواہش ختم ہوگئی تھی۔یوں لگتا ہے جیسے وہ مٹھائی کو جان بوجھ کر بطور زہر کھا رہی تھیں۔اسی لئے ابا جی کی وفات کے بعد دو سال کے عرصے کے اندر ہی امی جی فوت ہوگئیں۔

امی جی مجھے ڈاکٹر بنانے کی خواہش مند تھیں۔میرا ذہن شروع سے ہی''نان میڈیکل'' بلکہ ''نان سائینس''تھا۔ایک مرحلہ پر سوچا کہ اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے لوں۔نام کے ساتھ ڈاکٹر تو لکھا جاسکے گا۔پھر دیکھا کہ ایسے ایسے لوگ بھی ڈاکٹریٹ کر گئے ہیں کہ پی ایچ ڈی کہلانا باعث افتخار نہیں،باعث ندامت محسوس ہونے لگا ہے۔اس سے بہتر ہے آدمی''گھر بیٹھے ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنئے''کورس کرلے۔اس سے خلقِ خدا کو فائدہ بھی نہیں ہوگا تو نقصان بھی نہیں ہوگا۔آخر یہ طے ہوا کہ جہاں میں امی جی کی اور بہت سی خواہشیں اور خوشیاں پوری نہیں کر سکا وہیں اس خواہش کی عدم تکمیل پر بھی ہلکے سے دکھ اور افسوس کے ساتھ ماندہ زندگی گزار لوں گا۔

امی جی کی گائی ہوئی لوری کا ایک ایک لفظ الٹ ہوگیا ہے۔ان کی اکھیوں کے تارے کی اپنی قسمت کا ستارہ ہی کہیں گم ہوگیا ہے۔امی کے باغ کا البیلا پھول وقت کے صحرا میں خود دھول ہو رہا ہے۔جس کے مکھڑے کے آگے چاندنی میلی لگتی تھی اس کا رنگ روپ بگڑ چکا ہے۔حالات کا تپتا،دہکتا سورج سوا نیزے کے فاصلے پر آن کھڑا ہے۔اب تو صرف اُس جنت کی امید ہے جو ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے:

ماں!ترے قدموں تلے جب راکھ اُڑتی ہے
تو سینے میں خلا جیسی کوئی شے گونجتی ہے
وہ گیت اب کھو گیا ہے
تو بھی اب چپ ہوگئی ہے اور خلا ویسے کا ویسا ہے
مرے سینے میں تیری ماِمتا کا نور اُترتا ہے
مگر کچھ بولتا بھی تو نہیں
اقرار کی ساعت ہمیشہ سے ادھوری ہے
نہ جانے کونسا کوہِ گراں ہے تیرے ہاتھوں پر.....
یہ تو ہے یا کوئی خیمہ طنابوں کی شکست آثار مٹی سے نکل کر
زرد موسم کی ہوا میں لڑکھڑاتا ہے۔
یہ میں ہوں یا کوئی سایہ تری ممتا کی ٹھنڈی روشنی سے ٹوٹ کر
پاتال اندر ڈوبتا جاتا ہے
ہم دونوں
محبت کی گواہی کی طلب میں
اپنے اپنے دل کی جانب رُخ کئے اپنے خدا سے پوچھتے ہیں
حشر کب تک آئے گا۔۔!

☆☆☆

ڈاچی والیا موڑ مُہار وے

(داداجی)

ایک اَن دیکھے کی سوچوں میں گھرا رہتا ہوں میں
اُس کی آنکھیں اُس کا چہرہ سوچتا رہتا ہوں میں

میرے داداجی قیام پاکستان سے کئی برس پہلے فوت ہوگئے تھے۔ میں نے داداجی کو نہیں دیکھا مگر ان کے بارے میں اپنے دل میں ہمیشہ ایک انوکھی سی محبت محسوس کی۔ ان کے والد اور میرے پردادا حضرت میاں میر محمد گڑھی اختیار خاں کے پیروں میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے روحانی دوست میاں درّ محمد (درّن سئیں) کے ساتھ رشتہ داری کا کچھ تعلق بھی تھا۔ پیری مریدی کا سلسلہ حضرت میاں میر محمد کو وراثت میں ملا تھا اور یہی ان کی زندگی تھا۔ داداجی اپنے آباء واجداد کے پیری مریدی کے مروّجہ سلسلے سے بیزاری سی محسوس کرتے تھے۔ اباجی اس سلسلے میں داداجی کی جوانی کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے۔ داداجی کے ایک رشتہ کے کزن نے ایک دن داداجی سے کہا ایک کام کے سلسلے میں میرے ساتھ چلو۔ کئی کوس کا سفر کرکے دونوں ایک خستہ جھگی تک پہنچے۔ وہاں ایک مفلوک الحال شخص اپنی بیوی، بچوں اور ایک گدھی کے ساتھ موجود تھا۔ داداجی کے کزن نے اس سے اپنا تعارف کرایا کہ میں تمہارے پیر گھرانے کا فرزند ہوں۔ وہ غریب بال بچوں سمیت ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور عقیدت کا جاہلانہ اظہار کرنے لگا۔ اس پرداداجی کے کزن نے اسے کہنا شروع کیا:

''دیکھو۔ تمہاری اس جھگی میں میرا حصہ ہے''

''سئیں''

''تمہارے بیوی بچوں میں میرا حصہ ہے''

''سئیں''

''تمہاری گدھی میں بھی میرا حصہ ہے''

''سئیں''

وہ غریب پیر سائیں کی ہر بات پر''سئیں''(بجاارشاد!) کا اقرار کرتا گیا۔ آخر ان کے کزن نے کہا جاؤ نذرانہ لے کر آؤ۔ اس غربت زدہ نے جھگی کے اندر سے کچھ مصری لاکر پیر جی کی خدمت میں پیش کی اور داداجی اپنے کزن کے ساتھ لوٹ آئے۔۔ واپسی پر رستے میں داداجی نے اپنے کزن کو لعنت ملامت کی کہ اتنی سی مصری کے لئے مجھے اتنا لمبا سفر کرایا۔ جواباً کزن نے کہا: یار! مسئلہ مصری کا نہیں تھا مرید پکا کرنے کا تھا سو مرید پکا ہوگیا ہے۔ میرا خیال ہے اس طرح کے پیروں کو مریدوں کا ظالمانہ استحصال کرتے دیکھ کر ہی داداجی پیری مریدی کے سلسلے سے بیزار ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ پھرانہوں نے گڑھی اختیار خاں میں اپنے والد کی وراثت نہیں سنبھالی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خانپور چلے آئے اور یہاں فقیری زندگی بسر کی۔ گڑھی اختیار خاں کے پرانے کاغذات میں شاید میرے پردادا میاں میر محمد کے نام کی زمینیں ابھی بھی موجود ہوں مگر داداجی نے نہ اپنی زمینوں کی طرف پلٹ کر دیکھا، نہ مریدوں کو قابو کرنے کا سوچا۔ آفرین ہے اباجی اور باباجی پر بھی کہ انہوں نے بھی اپنی پرانی زمینیں تلاش کرنے کی زحمت نہیں کی۔

خانپور میں داداجی نے ایک شریف گھرانے کی لڑکی ''صاحب خاتون'' سے شادی کی۔ یہ میری دادی تھیں۔ اباجی بتاتے تھے کہ وہ بمشکل چھ سال کے تھے جب ہماری دادی فوت ہوگئیں۔ اباجی نے ایک لمبی سی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ قمیص کی طوالت کے باعث نیچے کسی شلوار یا جانگیہ کی اُس زمانے میں ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ قمیص کی جیب میں ریوڑیاں اور مکھانے بھر دیئے گئے تھے۔ اباجی بتاتے تھے میں نے اپنی اماں کی تدفین کا سارا منظر دیکھا تھا۔ زیادہ تر ریوڑیاں مکھانے کھا کر دیکھتا رہا۔ کبھی کبھار رونے بھی لگ جاتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دادی جان

رحیم یار خاں میں فوت ہوئی تھیں۔ جب تک ہم وہاں رہے ابا جی ہر محرّم کی دس تاریخ کو ہمیں ساتھ لے کر قبرستان جاتے۔ دادی جان کی قبر پر پھول پتے اور خاص طور پر کھجور کے پتوں کی چھڑیاں چڑھاتے۔ خیرات کرتے، دعا کرتے۔ خان پور چلے گئے تو پھر کبھی کبھار رحیم یار خاں دعا کے لئے چلے جاتے۔ ایک دفعہ رحیم یار خاں سے آئے تو اُداس اُداس تھے۔ خود ہی بتانے لگے میں ماں کی قبر بھول گیا ہوں۔ بہت تلاش کی، نہیں ملی۔ قبرستان بہت پھیل گیا ہے۔ قبرستان کے مین گیٹ پر ہی کھڑے ہو کر دعا کر آیا ہوں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہم نے خانپور میں موجود دادا جی کی قبر پختہ کرالی تاکہ بعد میں یہ بھی گم نہ ہو جائے۔۔ دادا جی نے ابا جی اور بابا جی کو ماں بن کر بھی پالا اور باپ بن کر بھی پالا۔ جب کچھ بڑے ہو گئے تو ابا جی کو رحیم یار خاں میں ان کے ماموں کے سپرد کر دیا اور بابا جی کو ان کی پھوپھی بوا نور خاتون کو سونپ دیا۔

دادا جی معمولی سا بیمار ہوئے اور فوت ہو گئے۔ گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ سارے عزیز و اقارب جمع ہو گئے۔ دادا جی کو غسل دے دیا گیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وفات کی خبر سن کر آئے ہوئے سارے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ کچھ چیختے چلاتے گھر سے نکل بھاگے، ایک دو عزیز دہشت سے بے ہوش ہو گئے۔ ابا جی کو ''شادیٔ مرگ'' کا مطلب پوری طرح سمجھ میں آ گیا۔ دادا جی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فوراً کہنے لگے دوسری گلی سے اللہ رکھا کمہار کا پتہ کراؤ۔ وہاں سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی بیٹھے بیٹھے ہی فوت ہو گیا ہے۔۔ دادا جی نے ایک انوکھی کہانی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے دو سفید کپڑوں والے کہیں لئے جا رہے تھے کہ ایک مقام پر رُکنا پڑا۔ وہاں موجود کچھ اور سفید کپڑوں والوں نے ایک رجسٹر چیک کیا (اسے عالم بالا کا شناختی کارڈ آفس سمجھ لیں) دادا جی کو لے جانے والوں کو، چیکنگ کرنے والوں نے کہا: باری تو اللہ رکھا کمہار کی تھی تم لوگ اللہ رکھا قریشی کو لے آئے ہو۔ چنانچہ غلطی معلوم ہو جانے کے بعد دادا جی کو پھر اس دنیا میں واپس لایا گیا اور اسی وقت اللہ رکھا کمہار کی موت واقع ہو گئی۔ جہاں تک اس واقعہ کی صحت کا تعلق ہے ابا جی، بابا جی، بوا حیات خاتون۔۔ سب نے یہ واقعہ اپنی چشم دید گواہی پر بیان کیا۔ چاچڑاں شریف اور کوٹ شہباز کے بعض دُور کے اور بوڑھے عزیزوں نے بھی تصدیق کی کہ ہم بھاگ نکلنے

والوں میں شامل تھے۔ اس قصے کا اصل بھید کیا تھا؟ یہ تو شاید کوہ ندا کی دوسری سمت جا کر ہی معلوم ہو سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید کپڑوں والے سارے فرشتے سرائیکی زبان بول رہے تھے۔ ظاہر ہے انہیں علم تھا کہ ہمارے دادا جی صرف سرائیکی زبان ہی جانتے ہیں۔

دادا جی کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔ ابا جی نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ دادا جی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک سائل آ گیا۔ دادا جی نے کچھ سوچا اور پھر اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے فوراً بعد کوئی اور سائل نہیں آ گیا کیونکہ اس وقت دادا جی کے جسم پر صرف ایک چادر تھی جو انہوں نے نیچے باندھی ہوئی تھی اور یہ تو طے ہے کہ انہوں نے سائل کو بہر حال خالی ہاتھ نہیں جانے دینا تھا۔ یہ جملہ لکھتے ہوئے مجھے ایسا لگا ہے جیسے دادا جی عالم بالا سے ہی میری شرارت پر مسکرا رہے ہیں اور ابا جی سے کہہ رہے ہیں: ''غلام سرور! ڈیکھ گھِن اپنڑے پتر دے لقا'' (غلام سرور! اپنے بیٹے کی شرارت دیکھ لو)۔

دادا جی کو باز پالنے کا بہت شوق تھا۔ شکار کے شوقین تھے۔ باز کے ساتھ شکار کھیلتے۔ گھر پر زیادہ تر شکار کا گوشت پکتا جو عموماً تیتر کا ہوتا تھا۔ شکار کے لئے کمان نما غلیل بھی استعمال کرتے تھے۔ یہ غلیل ایک عرصہ تک خانپور میں ہمارے پاس محفوظ رہی۔ میں اسے کمان سمجھتا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں خانپور میں قیامت خیز سیلاب آیا تو ہمارا گھر گر گیا۔ وہ غلیل اسی سیلاب کی نذر ہو گئی۔

دادا جی کے دور میں ان کے علاقے میں زندگی محدود تھی، وژن محدود تھا، دادا جی ان حدود سے کچھ آگے نکلنا چاہتے تھے سو محدود زندگی کی قید سے نکل کر لامحدود کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے لئے کبھی کبھی افیون استعمال کر لیتے تھے۔ میں دادا جی کو انقلابی آدمی سمجھتا ہوں کیونکہ اُس زمانے میں بنے بنائے، بندھے بندھائے مرید چھوڑ کر آزاد نکل جانا بہت بڑا انقلابی قدم تھا۔ وہ روحانیت کا ڈھونگ رچا کر سادہ لوح لوگوں کے جذبوں کا استحصال نہیں کرنا چاہتے تھے۔۔ دادا جی جسمانی لحاظ سے دبلے پتلے تھے مگر ان کا جسم کسرتی تھا۔ شکار کے شوق کے باعث ان میں پھرتیلا پن بہت تھا۔ رنگ سانولا مگر نقش تیکھے تھے۔ ہماری بہن شاہدہ کو دیکھ کر بابا جی اکثر کہا کرتے تھے یہ ہمارا ابا ہے۔

امی جی نے دادا جی کو نہیں دیکھا تھا۔امی جی بتاتی تھیں کہ ایک دفعہ ابا جی کسی بات پر امی جی سے ناراض ہوئے۔پھر حسبِ عادت صلح بھی کر لی مگر ابا جی کی ناراضگی کے باعث امی جی کے دل پر گہرا اثر تھا۔اسی حالت میں سو گئیں۔خواب میں دیکھا کہ ہمارے دادا جی آئے ہیں۔انہوں نے امی جی کے سر پر دستِ شفقت رکھا، پیار کیا۔امی جی کو کچھ نقدی دی اور کہا: میں غلام سرور کو ڈانٹوں گا آئندہ تمہیں رنج نہیں دے گا۔امی جی کی آنکھ کھلی تو بے حد حیران ہوئیں۔ابا جی کو سارا خواب سنا کر دادا جی کا حلیہ بھی بتایا۔ابا جی بھی حیران ہوئے کیونکہ امی جی کا بیان کردہ حلیہ سو فیصد درست تھا۔اس خواب کے تھوڑا عرصہ بعد دادا جی کی دی ہوئی نقدی کے نتیجہ میں ہماری بڑی بہن آپی پیدا ہوئی۔

دادا جی کو پرانی طرز کا گایا ہوا ایک گیت بہت پسند تھا۔شاید انہیں دنوں میں اس گیت کا پہلا ریکارڈ ریلیز ہوا ہو۔''ڈاچی والیا موڑ مہار وے!''۔مگر صحرا کی وسعتوں میں بڑھتے چلے جانے والے مہاراں کہاں موڑتے ہیں۔دادا جی گڑھی اختیار خاں سے چند کوس کے فاصلے پر تھے مگر وہ بھی پھر خانپور سے ڈاچی کی مہار موڑ کر گڑھی کی طرف کبھی نہیں گئے۔

ابا جی بتاتے تھے: دادا جی آخری ایام میں معمولی سا علیل ہوئے پھر ٹھیک ہو گئے۔ان دنوں میں ابا جی انہیں رات کو دیر تک دباتے رہتے اور جب تک دادا جی خود نہ کہتے کہ بیٹا بس کرو، تب تک دباتے رہتے۔۔اُس رات اتفاق سے دادا جی گہری نیند سو گئے اور ابا جی اپنی دُھن میں ساری رات دادا جی کو دباتے رہے یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔تب دادا جی چونک کر بیدار ہوئے اور کہنے لگے غلام سرور! تم ساری رات دباتے رہے ہو۔۔پھر دعائیں دیتے ہوئے کہنے لگے اب بس کرو۔ابا جی وہاں سے اٹھ کر محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔واپس آئے تو بابا جی نے کہا: غلام سرور! ابا فوت ہو گئے ہیں۔۔ڈاچی والے عرب اور چولستان کے صحراؤں سے بھی آگے کائنات کے وسیع تر صحرا کی طرف چلے گئے اور کتنے اطمینان و سکون کے ساتھ چلے گئے۔

بچپن میں میری خواہش ہوتی تھی کہ جلدی سے بڑا ہو کر ابو بن جاؤں اور اپنے بچوں کو ڈانٹا کروں۔اب میری خواہش ہے کہ بچوں کی شادیاں کر کے دادا بن جاؤں۔پھر دادا بن کر اپنے

پوتوں میں اپنے بچپن کو اور اپنے آپ میں اپنے دادا جی کو دیکھوں۔اپنے دادا جی کے بارے میں مجھے علم ہے کہ:

وہ بڑ

کب کا صحرا کے سینے میں گم ہو چکا ہے

مگر آج میں جانتا ہوں

وہ میری ہی تصویر تھا

میرا اوتار تھا

میرا چہرہ تھا وہ

میں نے خود اُس کو بھیجا تھا

اپنی طرف

اسے خود بلاتا ہوں اپنی طرف!

میری دادا بننے کی خواہش دراصل اپنے دادا جی کو بلانے کی خواہش ہے۔

ڈاچی والیا موڑ مہار وے!

مجھے یقین ہے ڈاچی والا میری آواز پر اس بار ضرور مہاراں موڑے گا۔کیونکہ یہ اسی کی اپنی آواز ہے۔

☆☆☆

مظلُوم متشدّد

(ناناجی)

زندگی! دیکھ بجھتے ہوئے لوگ ہم
بزمِ جاں میں چمکتے رہے رات بھر

ناناجی بنیادی طور پر ایک محنتی، جفاکش اور سیلف میڈ انسان تھے۔اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ عالم شباب میں ہی ناناجی نے اپنا مسلک تبدیل کرلیا تو ان کے دو بڑے بھائیوں نے ان پر شدید تشدد کیا۔کئی دن تک بھوکا پیاسا رکھا۔تشدد کے نتیجہ میں جب ناناجی بے ہوش ہوجاتے تو ان کے منہ میں گندہ پانی ڈالا جاتا۔ بڑے بھائیوں کے اس ظلم اور تشدد کے ردِّعمل کے طور پر ناناجی کا مزاج بھی متشددانہ ہوگیا۔ بعد میں انہوں نے اپنی اولاد پر سختی کی۔یوں تو ان کی ہر بیٹی، بیٹے نے حسبِ توفیق مار کھائی تاہم بیٹوں میں ماموں کوثر اور ماموں صادق اس مار کے زیادہ شکار ہوئے۔جبکہ بیٹیوں میں خالہ حبیبہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔خالہ حبیبہ کو اس لحاظ سے اپنے سارے بہن بھائیوں پر فوقیت حاصل ہے کہ باقی سب کی مار پٹائی ایک طرف اور اکیلی خالہ حبیبہ کی پٹائی ایک طرف۔۔۔ایک دفعہ کسی معمولی سی بات پر ناناجی کو اتنا طیش آیا کہ خالہ حبیبہ کو باقاعدہ طور پر الٹا لٹکا دیا اور دیر تک لٹکائے رکھا۔خالہ حبیبہ پر جو تشدد ہوا اس کا نفسیاتی اثر ان کے مزاج پر پڑا۔ لہجے میں چڑچڑاہٹ، انتقام اور اذیت پسندی کے تمام اوصاف ان کی ذات میں جمع ہوگئے۔ چنانچہ اپنے پہلے بیٹے کو خالہ نے بچپن میں ہی مار مار کر نیم پاگل بنادیا۔ جب خالہ کو اس زیادتی کا احساس دلایا گیا تو پھر دوسرا انتہا پسندانہ ردِّعمل سامنے آیا۔ باقی اولاد کو خالہ نے بے مہار چھوڑ دیا اور خود بعض رشتہ داروں پر اپنے مزاج کی کڑواہٹ

نچھاور کرنے لگیں۔ان رشتہ داروں نے شکایت کی تو میں نے انہیں کہا کہ ان ساری زیادتیوں کو ناناجی کی ''عطا'' سمجھ کر برداشت کرلیں۔

نانی جی اور ناناجی کی عمروں میں خاصا فرق تھا۔نانی جی ساری زندگی ناناجی کے شدید دباؤ میں رہیں اور ناناجی کی سخت گیری نے انہیں مزید نرم بنادیا۔وہ اپنا غصہ کسی پر بھی نہ اتار سکیں، خود میں گھلتی رہیں اور ۵۳ سال کی عمر میں ہی وفات پاگئیں۔زندگی بھر تو ناناجی کا تختہ مشق بنی رہیں۔ بیماری کے آخری ایام میں بھی ناناجی نے ان کا علاج کہیں اور کرانے سے روک دیا اور اپنی حکمت کے مختلف نسخے اس وقت تک اُن پر آزماتے رہے جب تک وہ فوت نہ ہوگئیں۔وفات سے چند گھنٹے پہلے نانی جی نے ناناجی سے فرمائش کی کہ ریوڑیاں کھانے کو جی کرتا ہے۔ناناجی خود عمدہ قسم کی ریوڑیاں لے کر آئے اور اپنے ہاتھوں سے نانی جی کو کھلاتے رہے۔ناناجی جیسے سخت گیر شوہر کے ہاتھ سے اتنی محبت کے ساتھ ریوڑیاں کھانا نانی جی کے لئے ناقابل یقین خوشی تھی۔اس واقعہ کے چند گھنٹے بعد نانی جی کو نیند آگئی۔ممانی مجیدہ نے دیکھا کہ نانی جی بڑے سکون کی نیند سو رہی ہیں۔ ان کا ماتھا ٹھنکا۔آج کے دور کے انسان کو خواب میں بھی ایسا سکون کہاں نصیب ہوتا ہے۔ممانی مجیدہ نے امی جی کو بلایا اور پھر سارا گھر جمع ہوگیا۔نانی جی فوت ہوچکی تھیں۔۔میرا خیال ہے وہ ناناجی جیسے سخت گیر شوہر کی محبت سے حیرت زدہ ہوئیں اور پھر اسی حیرت اور بے انتہا خوشی کے نتیجہ میں فوت ہوگئیں۔

ناناجی کی سخت گیری کا ایک تاریخی واقعہ میرے ساتھ بھی رونما ہوا۔ میں دس گیارہ سال کا تھا۔ مجھے پندرہ سیر گندم آٹے کی چکی سے پسوانے کے لئے دی گئی۔چکی والے نے گندم رکھ لی اور کہا کل آکر لے جانا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ گھر والوں کو بتائے بغیر ساتھ کی گراؤنڈ میں کھیلنے چلا گیا۔ گھر میں غالبًا آٹا ختم تھا اس لئے میرا انتظار ہو رہا تھا۔گھر آیا تو ڈانٹ پڑی لیکن میری وضاحت سے سب کی تسلّی ہوگئی۔ بدقسمتی سے اس وقت ناناجی موجود نہیں تھے رات کو جب ناناجی گھر آئے میں سوچکا تھا۔صبح سویرے مجھے ناناجی نے جگایا اور پوچھا رات آٹا کیوں نہیں لائے؟ میں نے تسلّی بخش جواب دے دیا۔ اب انہوں نے پوچھا پسوائی کی چوّنی کہاں ہے؟۔ ایک تو

نیند کا خمار، پھر صبح کا ملگجاسماں ۔۔ جیب میں دیکھا تو چوّنی نہیں تھی ۔ نانا جی کے ہاتھ میں بڑے سائز کا ایک درویشی عصا رہتا تھا۔ بس اسی سے میری مرمت شروع کر دی۔ اس دن نانا جی کے سونٹے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ''موسوی عصا'' میں کتنی طاقت ہوتی ہوگی۔ امی جی میں تو ہمت نہیں تھی کہ مجھے چھڑاتیں۔ اتفاق سے ممانی مجیدہ نے میرے بستر کو چیک کیا تو وہاں سے چونی مل گئی۔ ممانی مجیدہ جیسی مظلوم عورت میں اس دن نجانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی۔ میرے اور نانا جی کے بیچ آ کر ان کا عصا پکڑ لیا۔ یہ بہت بڑی جسارت تھی۔ چڑیا کا شہباز پر جھپٹنا تھا۔ ''یہ لیں اپنی چونی ۔۔ اس کے بستر پر گری پڑی تھی ۔۔ ناحق بچے کی اتنی دھنائی کر دی''۔ اس دن ممانی مجیدہ کی ایسی محبت مجھ پر منکشف ہوئی جس کا عشر عشیر بھی پھر کسی ممانی کے ہاں نظر نہیں آیا۔ اس دن چڑیا، شہباز سے جیت گئی تھی۔ نانا جی ڈھیلے پڑ گئے۔

ان واقعات سے یہ بھی نہ سمجھ لیں کہ نانا جی کوئی ''ہلاکو خاں'' قسم کی چیز تھے۔ ان میں بلا کی ذہانت اور حسّ مزاح تھی۔ میرے باباجی اور اباجی کی ساری خوبیوں اور خامیوں کو اگر جمع کر دیا جائے تو نانا جی بن جائیں گے۔ تنگ دستی کی حالت میں بھی بچوں کی بنیادی ضروریات کا پورا خیال رکھتے۔ گرمیوں میں شربت کی بوتلیں اور سردیوں میں وسیع پیمانے پر پنجیری تیار کراتے۔ دونوں موسموں میں یہ چیزیں بچوں کو باقاعدگی سے فراہم کی جاتیں۔ نانا جی کی اپنی خوراک بہت کم تھی لیکن شرط لگائی تو ایک دفعہ دس کلو گوشت کھا گئے اور ایک دفعہ گنے کے رس کی پوری بالٹی پی گئے۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر نانا جی کے اندر کا ''میاں سراجدین'' باہر آ جاتا۔ اپنی اولاد، دامادوں، پوتوں، پوتیوں، نواسوں نواسیوں، سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے۔ سب سے گانے سنتے۔ خود بھی پنجابی کے لوک گیت بڑے اچھے ترنم کے ساتھ سناتے۔ جوں جوں بڑھاپا بڑھتا گیا نانا جی کی کرختگی ختم ہوتی گئی اور حسِ مزاح نمایاں ہوتی گئی۔ نانی جی کی وفات کے بعد نانا جی نے لگ بھگ ۲۰ سال زندگی گزاری۔ دوسری شادی کا نام لیا جاتا تو پہلے ایک گالی دیتے پھر ہنس پڑتے۔ کہتے اگر میں اس عمر میں بھی شادی کر لوں تو تمہارا ایک اور ماموں پیدا ہو سکتا ہے۔ اس پر میں شرارت سے کہتا کہ نانا جی یہ خطرہ مول لینے والی بات ہوگی۔ اگر نیا ماموں، ماموں کوثر جیسا

پیدا ہو گیا تو پھر کیا بنے گا؟ اس پر مزید موج میں آ جاتے۔۔ نانا جی نہانے سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ صرف عید کے عید نہاتے۔ ایک دفعہ مجھے کہنے لگے نلکا چلاؤ میں نے وضو کرنا ہے۔ نانا جی نے صرف چادر اور واسکٹ نما پھتوئی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے نلکا چلانا روک کر کہا نانا جی! نہا کیوں نہیں لیتے؟ ۔۔ سر اٹھا کر میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہنے لگے:

''بیٹے! جب سے تمہاری نانی مری ہے مجھے نہانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ چلو تم نلکا چلاؤ اور وضو کراؤ''

نانا جی کی ذہانت نے انہیں اپنے زمانے کا جیمز بانڈ بنا دیا تھا۔ اہلِ حدیث تھے تو اہلِ تشیع کی جاسوسی کے لئے کچھ عرصہ ذاکر بنے رہے۔ اہلِ حدیث مسلک ترک کیا تو پھر کچھ عرصہ کے لئے بتوں میں ''الّو وَں والا پیر'' بنے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد نانا جی اور نانی جی ہندوستان میں ہی رہے۔ وہاں ان پر پاکستان کا جاسوس ہونے کا شبہ کیا جاتا رہا۔ رہی سہی کسر میں نے پوری کر دی۔ میں غالباً پانچ سال کا تھا جب امی جی ہمیں لے کر نانا جی سے ملنے ہندوستان گئیں۔ وہاں میں نے پاکستانی طریق کار کے مطابق بہت سارے بچوں کو جمع کیا۔ انہیں ایک قطار میں کھڑا کیا اور ہدایت کی کہ سب بچے اپنے سے اگلے بچے کی قمیص کا پیچھے کا حصہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیں۔ میں خود سب سے آگے تھا۔ یہ ایک طرح کی گاڑی بن گئی تھی جس کا انجن، ڈرائیور اور گارڈ بھی میں ہی تھا۔ میں نے بچوں کو چند ہدایات دیں اور پھر ہماری گاڑی چلنے لگی۔ یہ گاڑی چھک چھک کے نعرے لگانے کے بجائے ''پاکستان زندہ باد۔۔ ہندوستان مردہ باد'' کے نعرے لگا رہی تھی۔ حالانکہ مجھے اس وقت ان لفظوں کے مفہوم کا بھی پتہ نہیں تھا۔ میری دانست میں یہ صرف ایک کھیل تھا۔ نانا جی کو علم ہوا تو نہایت بدحواسی کے عالم میں مجھے گود میں اٹھا کر گھر لے گئے۔ امی جی کی گود میں پٹخ کر پتہ نہیں کیا کچھ کہا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ نانا جی کو سچ مچ دو دن بخار چڑھا رہا۔ یہ غالباً ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ اس کے بعد نانا جی بھی جلد پاکستان آ گئے۔

نانا جی نے عملی زندگی میں ہر طرح کی محنت کی۔ مسجد کے موذن رہے۔ چارپائیاں بُننے کا کام بھی کیا۔ منیاری کا کام بھی کیا (منیاری سے مراد صرف گوٹہ کناری کی فروخت سمجھیں) حکمت

کا کام بھی کرتے رہے۔ یہ کام عمر کے آخری حصے تک کرتے رہے اور اس سے انہیں اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ گویا کسی کے محتاج نہیں تھے۔ نانا جی کے بعض نسخے میں نے ان سے ان کی زندگی میں ہی لئے تھے۔ بعض حسّاس قسم کے نسخے ان کی وفات کے بعد ان کی کاپی سے نوٹ کئے۔ انہوں نے اپنی دوائیوں کے نام بھی خود ہی بنا رکھے تھے مثلاً قبض کشا گولیوں کا نام تھا ''پیٹ کا جھاڑو''۔ اسی طرح مردانہ کمزوری کے ایک نسخے کا نام ''ایٹم بم'' تھا اور دوسرے نسخے کا نام تھا ''ہائیڈروجن بم۔۔عرف مردہ کو زندہ کرنا''۔۔امرت دھارا ایک ایسی دوا ہے جو نزلہ، زکام، ہیضہ، قے، سردرد، دانت کے درد، کان کے درد، غرض بیسیوں بیماریوں کا فوری علاج ہے۔ کسی ہنگامی صورتحال میں پریشانی سے بچنے کے لئے یہ دوا ہر گھر میں ہونی چاہیے۔ آجکل Vicks اور بام کی صورت میں بھی امرت دھارا کو محدود استعمال کی چیز بنایا جا رہا ہے۔ اصل امرت دھارا گھر پر ہی پچیس تیس روپے میں تیار کیا جا سکتا ہے۔ افادۂ عام کے لئے یہ نسخہ پوری گارنٹی کے ساتھ پیش ہے۔ ست اجوائن، ست سنڈھ، ست دارچینی، ست الائچی، ست پودینہ۔۔ یہ پانچوں ست ایک ایک تولہ لے کر بوتل میں ڈالتے جائیں۔ ان کے ساتھ پانچ تولہ مشک کافور ملا دیں۔ ساری اشیا باہم ملنے پر خود بخود سیّال صورت اختیار کر لیں گی۔ یہ نسخہ میرا آزمودہ ہے۔۔۔۔۔ایٹم بم کا نسخہ بغیر گارنٹی کے پیش ہے۔ مستگی رومی ایک تولہ، دودھ بڑ ایک تولہ، شنگرف رومی ایک ماشہ، انڈے کی زردی ایک عدد، افیون تین ماشے، سم الفار ایک ماشہ، تمام چیزوں کو کونڈی میں ڈال کر خوب رگڑیں۔ چنے کے برابر گولی بنائیں۔ ایک گولی کے ساتھ ایک چھٹانک دیسی گھی یا آدھ کلو دودھ لیں۔ فراغت کے لئے نمک چاٹنا ضروری ہے۔ اس نسخے کو آزمانے والے اپنی ذمہ داری پر آزمائیں البتہ گولیاں مفید ثابت ہوں تو مجھے بھی پندرہ بیس گولیاں ضرور بھیج دیں۔

نانا جی سے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دیسی طریق علاج کو ہمارے پرانے حکماء نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے کیونکہ انہوں نے بیشتر نسخے اپنے سینوں میں بند رکھے اور اپنے ساتھ ہی قبروں میں لے گئے۔ نانا جی نے شکستہ دلی سے میرے موقف کو مان لیا تھا۔

نانا جی پر ان کے جو بھائی اور عزیز تشدد کرتے تھے، ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ اس بد بخت کو مار کر

اس کا بیج ہی ختم کر دو۔ قدرت خدا کی ان لوگوں کی اپنی نسلیں ختم ہو گئیں۔ نانا جی نے اپنے پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں ہی نہیں ان کی اولادیں بھی دیکھیں۔ رضوانہ کو شروع میں ہم روزی کہتے تھے نانا جی نے ایک سال کی اپنی پڑنواسی کو گود میں لیا۔ اتفاق سے بچی کو فراک بھی گلابی پہنا رکھی تھی۔ نانا جی نے بچی کا نام پوچھا۔ روزی کا لفظ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے یہ تو ''مس گلابو'' ہے۔ گویا روزی کا پنجابی میں عمدہ ترجمہ کر دیا۔ نانا جی سے کبھی ہم پوچھتے کہ نانا جی آپ کہاں تک پڑھے ہیں؟ پنجابی لہجے میں اس طرح کہتے ''اینویں پاس ہوں'' جیسے کہہ رہے ہوں ''ایم۔اے پاس ہوں''۔

نانی جی کی وفات کے بعد تقریباً بیس سال نانا جی نے اکلاپے کی زندگی بسر کی۔ بیٹے، بیٹیاں اور ان کی اولادیں ہونے کے باوجود شریک زندگی کے بغیر بڑھاپا بسر کرنا خاصا کٹھن کام ہے۔ آخر آخر تک تو نانا جی اتنے نرم مزاج اور گداز طبیعت کے مالک ہو گئے کہ ان کے رویے پر حیرت ہوتی تھی اپنی زندگی کے ۸۶ سال پورے کر چکے تھے۔ بڑھاپے کی کمزوری آڑے آ رہی تھی۔ ایک دن نانا جی نے بڑی بہو سے کہا: مجھے ریوڑیاں منگا دو، سارے عزیز چونک اٹھے۔ نانی جی نے بھی وفات سے پہلے ریوڑیاں کھانے کی خواہش کی تھی۔ تو کیا نانا جی بھی۔۔؟۔۔۔سب کے دل میں خدشات گھر کر رہے تھے۔

ریوڑیاں منگائی گئیں۔ نانا جی کمزوری کے باوجود مزے لے لے کر ریوڑیاں کھاتے رہے اور پھر سو گئے۔

ہمارے اکثر خدشات ہمارے وہم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نانا جی کے بارے میں ہمارے خدشات بھی دراصل ہمارے وہم کا نتیجہ تھے۔

اس کے باوجود خدشات درست نکلے، وہم سچ ثابت ہوا۔

نانا جی فوت ہو چکے تھے۔

کبھی کبھی ہمارے وہم کتنے سچ ثابت ہوتے ہیں!

☆☆☆

مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ

(تایاجی)

نظر سے دور ہے لیکن نظر میں ہے پھر بھی
کہ عکس اپنے مرے آئنوں میں چھوڑ گیا

اباجی کے بھائی۔۔جنہیں ہم سب باباجی کہتے تھے، اباجی سے عمر میں بڑے تھے۔
اباجی نے زندگی ایک مقالہ نگار کی طرح بسر کی تو باباجی نے انشائیہ نگار کی طرح زندگی گزاری۔ وہ صراط مستقیم کی صداقت کے قائل تھے مگر ٹیڑھی میڑھی اور اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلنا اور ارد گرد بکھرے ہوئے رنگوں اور خوشبوؤں سے لطف اٹھانا انہیں پسند تھا۔ باباجی نے بھر پور جوانی بسر کی۔
اباجی اور باباجی دونوں ایک دوسرے کے نیگیٹو تھے۔ اباجی کے مزاج کے برعکس باباجی خواتین کی محفلوں میں بیٹھ کر ہمیشہ خوش ہوتے۔ نماز کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ کبھی زور لگا کر فجر کی نماز پڑھا دی تو سارا دن بہانے بنا بنا کر لڑتے۔ جمعہ کا دن آتا تو صبح سویرے ہی ان کی طبیعت خراب ہو جاتی اور عید کے موقعوں پر تو احتیاطاً ایک دن پہلے ہی بیمار ہو جاتے۔ روزوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک دفعہ میں نے انہیں کہا: ''باباجی تین دن بعد رمضان شریف کے روزے شروع ہو رہے ہیں'' باباجی میری شرارت کو بھانپ گئے۔ پورے اعتماد کے ساتھ بولے: ''ہاں بھئی۔۔ اللہ کے نیک بندے روزے رکھیں گے۔ ہم تو بڑے گنہگار ہیں''۔۔ ایک آدھ دفعہ انہیں مجبور کر کے روزہ رکھوا دیا گیا تو عصر کے وقت ہی افطاری کے سارے لوازمات سجا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد بولے: ''آج دن کی رفتار خاصی سست ہے''۔ کسی نے مذاقاً کہہ

دیا: ''آج دن کو بھی پتہ ہے کہ باباجی نے روزہ رکھا ہوا ہے اسی لئے سلوموشن میں چل رہا ہے''۔ باباجی کا پارہ چڑھ گیا۔ مؤذن کے بارے میں گرم ہونے لگ گئے وہ بھی کہیں سو گیا ہے یا مر گیا ہے۔ دراصل روزے کے معاملے میں باباجی غالب کے ہم خیال تھے ؂

روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن   خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

باباجی کے ''خس خانہ و برفاب'' سے مراد ''روزہ رکھنے کا حوصلہ'' ہے۔ اس کے باوجود باباجی خدا کی بے پایاں رحمت اور اپنے آقا حضرت محمد ﷺ کی شفاعت پر کامل ایمان رکھتے تھے۔ سیدھے سادے مسلمان تھے۔ کبھی کبھی موج میں ہوتے تو کہتے: ہم خدا کی اپنی بنائی ہوئی مخلوق ہیں۔ ہماری ساری غلطیاں اور گناہ وہ بخش دے گا۔ ویسے بھی کون ہے جو محض اپنی نیکیوں اور عبادتوں کے بل پر اپنی بخشش ہو جانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ قوالی سننے کے رسیا تھے۔ عزیز میاں اور صابری برادران کی قوالیاں سن کر باقاعدہ جھومنے لگتے۔
آزادہ روی باباجی کے مزاج میں بچپن سے ہی تھی۔ داداجی نے انہیں سکول میں داخل کرایا۔ پہلے دن ہی قاعدہ اور تختی کنویں میں پھینک آئے۔ داداجی نے تین دفعہ قاعدہ لے کر دیا۔۔ باباجی تینوں دفعہ کنویں میں پھینک آئے۔ آخر داداجی نے حقائق کو تسلیم کر لیا اور باباجی کو پڑھائی میں الجھانے کی کوشش ترک کر دی۔
باباجی ہمارے اباجی سے عمر میں پندرہ سال بڑے تھے۔ اباجی جب پرائمری سکول میں پڑھنے جاتے تو واپسی پر ایک درخت کے نیچے لیٹ کر سو جاتے۔ باباجی باقاعدگی سے اباجی کو گود میں اٹھا کر گھر لاتے۔ بڑے بھائی ہونے کے ناطے باباجی احترام کے لائق تھے مگر ہم نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ باباجی ہمارے اباجی کا ایسے احترام کرتے جیسے سعادت مند چھوٹے بھائی اپنے بڑے بھائی کا احترام کرتے ہیں۔ اباجی جب پینتالیس سال کے تھے باباجی ساٹھ سال کے تھے۔ اباجی پچاس سال کے ہوئے باباجی ساٹھ سال کے رہے۔ اباجی چونسٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ باباجی پھر بھی ساٹھ سال سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھے۔ ہم نے منت سماجت کی تو بمشکل پینسٹھ سال کے ہوئے اور پھر جب بیاسی سال کی عمر میں فوت ہوئے تب بھی پینسٹھ

سال کے تھے۔ دراصل باباجی کو گزرتی ہوئی عمر کو روکنے کا ہنر آتا تھا۔ مرتے دم تک باباجی نے ورزش کو ہی اپنی عبادت بنائے رکھا اور اس ورزش کی برکت سے بیاسی سال کی عمر تک بالکل ہشاش بشاش رہے۔

باباجی کو پہلوانی کا شوق تھا، خانپور کے علاقہ میں اپنے زمانے میں اچھے پہلوان مانے جاتے تھے۔ عمر ڈھل گئی تو انہوں نے شاگرد پالنے شروع کر دیئے۔ کشتی کے داؤ پیچ سکھانے میں باباجی ماہر تھے۔ ''استاد جی'' کہلوا کر خوش ہوتے۔ جہاں بھی رہے اپنے شاگردوں کا حلقہ پیدا کیا۔ جب وہ انہیں ''استاد جی'' کہہ کر پکارتے تو بے حد خوش ہوتے۔ ہم پانچ بھائی ہیں اور پانچوں فری اسٹائل ریسلنگ دیکھنے کے شوقین۔ ہم بھائی جب بھی اکٹھے ہوتے تھے ہماری اہم ترین مصروفیت ریسلنگ کی تازہ ترین فلمیں دیکھنا اور پرانی کشتیوں پر تبصرہ کرنا ہوتی تھی۔ ہم ہوگن، اینڈ ردی جائنٹ، میچومین، کمالا، رِک فلیئر، روڈی پائپر جیسے پہلوانوں کی باتیں کرتے تو باباجی کو شدید غصہ آتا۔ فری اسٹائل کشتی کے فن کو صلواتیں سناتے اور پھر دیسی کشتی کے محاسن اور فضائل پر طویل لیکچر دے ڈالتے۔ باباجی بلب کے مقابلے میں تیل کے چراغ، فرج کے مقابلے میں گھڑے اور نئے دور کے مقابلے میں پرانی روایات کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے ہزار بحثوں کے بعد بھی زمانے کے ارتقاء کا اعتراف کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔

اباجی اور باباجی دو بھائی تھے۔ اس خاندان میں پچھلی کئی پشتوں سے یہ ہو رہا تھا کہ دو بیٹے پیدا ہوتے، ایک اولاد سے محروم رہتا اور ایک کے ہاں پھر دو بیٹے ہو جاتے۔۔ چنانچہ باباجی بھی اولاد کی نعمت سے محروم رہے لیکن ان کی وفات کے ساتھ ہی ہمارے خاندان کی اس نسل در نسل روایت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ شروع شروع میں باباجی کو اولاد سے محرومی کا قلق رہا پھر پتہ نہیں انہوں نے قسمت کے لکھے سے سمجھوتہ کر لیا یا انہیں اتنی بڑی کائنات میں انسان کی بے وقعتی کا احساس ہو گیا کیونکہ پھر انہوں نے زندگی سے مسرت کشید کرنے کا عمل تیز کر دیا۔

باباجی کی آنکھ میں موتیا اتر آیا۔ آپریشن ہوا، کامیاب رہا مگر نظر مزید کمزور ہو گئی۔ انہوں نے ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا۔ ٹی وی دیکھنا چھوڑ کر بھی باباجی کے ''حُسنِ نظر'' میں کمی نہیں آئی۔ جیسے

ہی ملکۂ ترنم نور جہاں کا کوئی نغمہ سنائی دیتا، نغمہ سننے اور ملکہ ترنم کی زیارت کے لئے ٹی وی والے کمرے میں آ جاتے۔ نور جہاں کا نغمہ بڑی محویت سے سنتے بلکہ بڑی محویت سے دیکھتے۔ ایک موقعہ پر تو عالمِ محویت میں ان کی عینک ہی گر گئی تھی۔۔ پھر یوں ہوا کہ مسرت نذیر یکایک ٹی وی پر نمودار ہو گئی۔ بچوں نے اپنی عمر سے آگے بڑھ کر جوان ہونا شروع کر دیا اور بوڑھوں نے ریورس گیئر میں جوان ہونا شروع کر دیا۔ باباجی بھی مزید جوان ہو گئے۔ مسرت نذیر کے گائیکی کے انداز نے باباجی کی توجہ کھینچ لی تھی۔ اس کے باوجود باباجی نے ملکۂ ترنم نور جہاں سے تعلق خاطر کوٹوٹنے نہیں دیا۔ البتہ یہ تعلق کمزور ضرور پڑ گیا۔ مثلاً ایک بقرعید پر ملکۂ ترنم کا نغمہ دکھایا گیا۔ باباجی محبت کا بھرم رکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر ٹی وی والے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اتنی دیر ہو گئی کہ گانا ختم ہو گیا اور باباجی الٹے پاؤں یوں لوٹ گئے جیسے ملکہ ترنم سے کہہ رہے ہوں: ''اچھا اگلی بقرعید پر سہی!''۔

ہمارے بچپن میں باباجی ایک دفعہ مجھے اور آپی کو اپنے اکھاڑے میں لے گئے۔ ہم دوسری کشتیاں دیکھتے رہے لیکن جیسے ہی باباجی اکھاڑے میں اترے اور اپنے حریف سے پنجہ آزمائی کرنے لگے ہم نے یہ سمجھا کہ دوسرا آدمی ہمارے باباجی کو مارے گا۔ چنانچہ ہم نے رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔ ہماری چیخ و پکار سے مجبور ہو کر باباجی کو کشتی ادھوری چھوڑنا پڑی۔ آ کر ہمیں تسلّی دیتے رہے کہ میں اپنے حریف کو پچھاڑ دوں گا مگر ہم نے انہیں کشتی نہیں لڑنے دی۔

باباجی نے دو شادیاں کیں مگر دونوں ناکام ہوئیں۔ بوا حیات خاتون بتایا کرتی تھیں کہ پہلی بیوی کے ساتھ باباجی زیادتیاں کرتے تھے۔ باباجی اس الزام پر ہمیشہ برہم ہو جاتے۔ دوسری بیوی کا حال ہم نے خود دیکھا۔ اس نے ہمیشہ باباجی کے ساتھ زیادتی کی۔ باباجی جہاں تک برداشت کر سکتے تھے، کرتے رہے۔ جب قوت برداشت جواب دے گئی تو علیٰحدگی ہو گئی۔ ممکن ہے اولاد ہوتی تو باباجی کی قوّتِ برداشت بڑھ جاتی اور دونوں میں علیحدگی کی نوبت نہ آتی۔ باباجی کی بیویوں نے باباجی کا ساتھ نہیں دیا تھا یا باباجی اپنے ساتھ نہیں نبھا پائے، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ باباجی نے اباجی کا زندگی بھر ساتھ دیا۔۔ بُرے وقتوں میں کام آئے،

بھلے وقتوں میں کام آئے۔ان کی جائیداد بے شک ان کی موت کے بعد ہمارے حصے میں ہی آتی مگر اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد بھائی، بھتیجوں کے سپرد کر دینا بڑے حوصلے اور دل جگرے کا کام ہے۔بابا جی نے یہ کام کیا۔ہمارے ساتھ نیکی کی احسان کیا۔اس کا اجر انہیں خدا سے ملے گا۔

میرے بچوں سے بابا جی بہت مانوس تھے۔رضوانہ، زلفی، شازی، ٹیپو، مانو پانچوں سے انہیں محبت تھی۔بابا جی کالی مرچ، سونف، مصری، بادام اور الائچی وغیرہ کا وافر اسٹاک اپنے پاس رکھتے اور انہیں عام طور پر استعمال کرتے رہتے۔بچوں کو مصری اور بادام دیا کرتے تھے۔محلے کے بچوں میں بھی مصری بانٹا کرتے تھے۔چنانچہ محلے میں ''مصری والے بابا'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بابا جی صاف دل اور سادہ مزاج انسان تھے۔انہوں نے کبھی خود کو نیک اور متقی باور کرانے کی کوشش نہیں کی۔غصہ آتا تو پینے کی کوشش نہیں کرتے تھے، برملا اظہار کر دیتے تھے۔چنانچہ آخری پانچ برسوں میں مہینے میں ایک آدھ بار جھگڑا ضرور کر لیتے۔دراصل اپنی صاف دلی اور سادہ مزاجی کے باعث ''لائی لگ'' تھے۔جھگڑا اُس وقت کرتے جب بعض رشتہ دار انہیں بھڑکاتے۔جب جھگڑا کر چکتے پھر خود ہی بتا دیتے کہ مجھے فلاں فلاں نے اس طرح غصہ دلایا تھا۔چنانچہ ہم کسی عزیز سے تلخی پیدا کئے بغیر فساد پھیلانے والے رشتہ داروں سے واقف ہو گئے اور خود ہی محتاط رہنے لگے، مگر بابا جی کا کمال یہ تھا کہ کچھ عرصہ ٹھنڈا رہنے کے بعد پھر انہیں رشتہ داروں کے ہاں آنے جانے لگتے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

بابا جی کو مٹی سے بڑی محبت تھی۔شروع شروع میں گھر کے کچے صحن میں آلتی پالتی مار کے بیٹھے رہتے۔پھر گھر کے باہر بھی اسی طرح بیٹھنے لگے، بلکہ بعض دفعہ خاک پر نیم دراز ہو جاتے۔میں نے ان سے ایک دو بار مؤدبانہ درخواست کی کہ اس طرح سرِ راہ نہ بیٹھا کریں۔ان کا جواب تھا مجھے مٹی سے محبت ہے، اس کی خوشبو اچھی لگتی ہے۔۔میں نے گذارش کی کہ صحن کی مٹی کی خوشبو سے ہی محبت پوری کر لیجئے مگر وہ تو شاید ''تمنا'' کا دوسرا قدم ڈھونڈنے کے چکر میں تھے۔آخر میں

نے انہیں اپنی اور ان کی قریشیت کا واسطہ دے کر کہا آپ جس طرح سرِ راہ مٹی سے اظہار محبت فرما رہے ہیں اس میں محبت کی بھی رسوائی ہے اور مجھے خدشہ ہے کہیں راہ گیر آپ کے سامنے پیسے نہ ڈالنے شروع کر دیں۔۔میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور بابا جی لاحول ولاقوۃ پڑھتے ہوئے ایک دم چھلانگ مار کر کھڑے ہو گئے۔اس کے بعد بابا جی گھر کے صحن میں ہی مٹی سے اظہار محبت کرتے رہے۔

دراصل بابا جی کے اندر ایک بڑا مضبوط دراوڑ موجود تھا۔مٹی سے جڑا ہوا، ماضی اور اس کی روایات سے چمٹا ہوا۔ہم لوگ بابا جی کے لئے آریائی ثابت ہوئے کہ انہیں خانپور سے دھکیلتے ہوئے بالائی پنجاب تک لے آئے لیکن بابا جی کے من میں جو دنیا آباد تھی وہ ویسے ہی آباد رہی۔خانپور چھوڑنے کے بعد وہ کیسٹ پلیئر پر اکثر یہ گانا سنا کرتے ''چل اُڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بیگانہ''۔گانا سن کر اداس ہو جاتے۔مگر کیسٹ پلیئر کے مقابلے میں گراموفون مشین کی آواز انہیں زیادہ فطری لگتی رہی۔وہ جدید ٹیکنالوجی سے کبھی مرعوب نہ ہوئے۔حالانکہ گراموفون مشین اسی جدید ٹیکنالوجی کی ابتدائی صورت تھی، مگر میرا خیال ہے بابا جی اس معاملے کو کسی اور زاویے سے دیکھتے اور سوچتے تھے۔۔کبھی کبھی ایسے لگتا ہے جیسے بابا جی نے جو دنیا اپنے من میں آباد کر رکھی تھی وہ دنیا تو میرے من میں بھی آباد ہے۔اور اب تو بابا جی کی بہت سی ایسی باتیں بامعنی لگنے لگی ہیں جو ان کی زندگی میں بے معنی لگتی تھیں۔

بابا جی ایک اچھے دراوڑ کی طرح مٹی سے محبت بھی کرتے تھے اور موت سے خائف بھی رہتے تھے۔موت کا کوئی قصّہ کبھی ہم لے بیٹھتے تو بابا جی ناراض ہو جاتے اور کہتے موضوع تبدیل کرو۔ہم انہیں تنگ کرنے کے لئے کہتے بابا جی جب ہر کسی نے ایک نہ ایک دن مرنا ہے تو پھر موت سے ڈر کیسا۔۔پہلے بابا جی کچھ گھبراتے پھر جی کڑا کر کے کہتے میں پہلوان ہوں آسانی سے جان نہیں دوں گا۔۔لگتا ہے فرشتۂ اجل کو بھی بابا جی کے خوف پر رحم آ گیا ہو گا کیونکہ موت ان کی طرف ایسے آئی کہ نہ انہیں پتہ چل سکا، نہ ہمیں پتہ چل سکا۔بازار سے گھوم پھر کر، اپنے شاگردوں سے مل کر آئے، گھر کے صحن سے برآمدے تک پہنچے اور چلتے چلتے ہی جان دے دی۔۔میرے دادا جی

کے بڑے بیٹے قریشی غلام حسین۔۔میرے اباجی کے بڑے بھائی،ہم سب کے تایاجی فوت ہوگئے۔مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ دونوں ایک ساتھ کھوگئے۔

باباجی کی زندگی میں ہی میراایک افسانہ ''دھند کا سفر''۔نگار پاکستان کراچی میں چھپا تھا۔اس افسانے میں باباجی اور میرے تعلق سے ایک واقعہ بھی درج تھا جوافسانہ نہیں حقیقت ہے۔

وہ حقیقت اپنے افسانے سے نقل کرتا ہوں۔

(آپی اور میں)''جب ہم دونوں چار سال اور تین سال کے تھے،تایاجی ہمارے ہاں آئے تھے، پھرتھوڑی دیر کے لئے کہیں باہر چلے گئے تو آپی نے اور میں نے مشترکہ طور پرسوچا کہ ہمارے تایاجی گم ہوگئے ہیں اور پھر صلاح کی کہ ہم دونوں چل کرانہیں ڈھونڈتے ہیں۔ہم بڑی خاموشی سے گھر سے نکل آئے۔قریبی بازار تک آئے پھر پتہ نہیں کیا ہوا،راستے گم ہونے لگےاور تایاجی کوڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم خود گھر کا راستہ بھول گئے۔نہ تایاجی ملے،نہ گھر کا راستہ۔سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر ہم دونوں نے رونا شروع کردیا۔کسی شریف دوکاندار نے ہمیں اپنی دوکان پر بٹھالیااور ڈھیر ساری مٹھائی بھی ہمارے سامنے رکھ دی۔ہم نے مٹھائی کھانے کے ساتھ ساتھ رونے کا عمل بھی جاری رکھا تاوقتیکہ تایاجی اور اباجی ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں تک نہ آ گئے۔تب ہم مارے خوشی کے باقی مٹھائی اٹھانا بھی بھول گئے''

اب جبکہ اباجی اور باباجی دونوں اس جہان میں نہیں رہے تو مجھے خود احتیاط کرنا پڑتی ہے کہ گھر سے زیادہ دور نہ نکل جاؤں اور گھر کا راستہ نہ بھول جاؤں کیونکہ اب اباجی اور باباجی میں سے کوئی بھی مجھے ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔اب اچھے دوکاندار بھی بہت کم ہیں اور اغوا کرنے والے زیادہ۔اسی لئے مجھے ہرقدم سوچ سوچ کراور پھونک پھونک کراٹھانا ہے۔

مجھے یقین ہے مٹی سے محبت رکھنے والے باباجی، جوموت سے بھی ڈرتے تھے،اب موت کے بعد کسی خوف کے بغیر مٹی سے ہم آغوش ہوکراپنی محبت کوکمال تک پہنچارہے ہوں گے۔

☆☆☆

رانجھے کے ماموں

(ماموں ناصر)

ہراسکتا نہ تھا ویسے تو کوئی بھی مگر مجھ کو
کسی کی کامیابی کے لئے ناکام ہونا تھا

میرے والد سرائیکی تھے سو میں نسلاً سرائیکی ہوں۔میری والدہ پنجابی تھیں اس لحاظ سے سرائیکی النسل ہونے کے باوجود میری مادری زبان پنجابی ہے۔پنجابی زبان میں ماں کا نام دوبار لینے سے ماموں کا رشتہ بنتا ہے یعنی ''ماں ماں''(لکھنے میں تو شاید ماماں سے ہی کام چل جاتا ہے لیکن الفاظ کی ادائیگی میں ماں ماں کہنا ہوتا ہے) سو ماموں کا رشتہ بڑا اہم اور معتبر رشتہ ہے۔میرے پانچ ماموں ہیں۔عمروں کے لحاظ سے ان کی ترتیب یوں ہے: پہلا نمبر عطاء اللہ کلیم صاحب۔دوسرا نمبر پروفیسر ناصر احمد صاحب۔تیسرا نمبر حمید اللہ کوثر باجوہ صاحب۔چوتھا نمبر ڈاکٹر سمیع اللہ ریاض صاحب۔پانچواں نمبر حبیب اللہ صادق صاحب۔اگر مجھ سے میری ذاتی پسند کے بارے میں پوچھا جائے تو پھر میرے ماموؤں کی ترتیب یوں ہوگی: پہلا نمبر ماموں ناصر۔دوسرا نمبر ماموں ناصر۔تیسرا نمبر ماموں ناصر۔چوتھا نمبر ماموں سمیع اور پانچواں نمبر ماموں صادق۔

یہ قطعاً میری ذاتی پسند کی ترتیب ہے جس سے اختلاف کا ہر عزیز کو حق حاصل ہے۔اس ترتیب سے یہ ظاہر ہورہا ہے کہ ماموں ناصر میرے لئے ایسے ماموں ہیں جو ماں کا نام دوبار لینے سے نہیں بلکہ چھ بار لینے سے پورے ہوتے ہیں اس سے میرے لئے ان کی محبت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔لیکن ماموں ناصر کی محبت بڑی ظالم شے ہے اس کی وضاحت ذرا آگے چل

کر ہوگی۔

ماموں ناصر کے ساتھ میری محبت دراصل ''بچپن کی محبت'' ہے میں نے ابتدائی عمر میں ہی دیکھا کہ ماموں ناصر کو اپنی بہنوں میں میری امی جی سے خاص محبت تھی۔ اتنی خاص کہ دوسری بہنوں کے لئے بھی بعض اوقات غصے کا موجب بن جاتی۔ بے جی (نانی جان) بھی کبھی کبھی جھلا جاتیں۔ امی جی کے تعلق سے یہ محبت اباجی تک بھی پہنچی ماموں ناصر اباجی کا بے حد احترام کرتے۔ رحیم یارخان میں تنگی کے دنوں میں جب بھی ماموں ناصر سے قرض مانگا انہوں نے فوراً فراہم کیا، چاہے خود بھی کہیں سے قرض ہی کیوں نہ لیا ہولیکن اباجی کے کام میں تاخیر نہیں ہونے دی۔۔ایک موقعہ پر بہت سارے عزیز واقارب جمع تھے۔اباجی اپنے جوتوں کی مرمت اور پالش کرانے کے لئے کسی بچے کوڈھونڈ رہے تھے۔جب تک کوئی بچہ ملتا ماموں ناصر بتائے بنا خود اباجی کے جوتے لے کر چلے گئے اور مرمت کراکے، پالش کراکے لے آئے۔۔امی جی اور اباجی کے ساتھ ماموں ناصر کے ایسے محبتی رویّے کی متعدد مثالیں ہیں۔اسی وجہ سے بچپن میں ہی مجھے ماموں ناصر سے محبت ہوگئی۔مبارکہ کے ساتھ میری شادی ہونے میں میری پسند کے علاوہ امی جی اور ماموں ناصر کی گہری محبت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

ماموں ناصر بنیادی طور پر سیلف میڈ انسان ہیں کم عمری میں میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی انہوں نے سارے خاندان کا بوجھ اٹھانے کے لئے نوکری کرلی۔نوکری کے ساتھ پرائیویٹ طور پر تعلیم کے حصول کا سلسلہ جاری رکھا۔ریلوے کی ملازمت سے لے کر انگلش کی پروفیسری تک انہوں نے ان تھک محنت کی۔خاندان کے تقریباً ہر فرد پر احسانات کئے اور تقریباً ہر فرد سے ان احسانات کی مناسب سزا پائی۔ ماموں ناصر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنوں میں سے جو انہیں زیادہ عزیز ہوتے ہیں ان کی سفارش پر دوسروں کے مشکل کام کروادیتے ہیں مگر خود اس عزیز کا کام کبھی نہیں کرائیں گے جس سے انہیں محبت ہوگی۔اس لئے میں نے کہا تھا کہ ماموں ناصر کی محبت بڑی ظالم شے ہے اور اس محبت کے بڑے شکاروں میں سے ایک میں ہوں۔

ماموں جی کی پہلی شادی ماں کی اطاعت میں ہوئی اس خاندانی فیصلے کی قیمت ممانی مجیدہ

نے ادا کی۔سرخ وسفید رنگت والی ممانی مجیدہ سے لے کر ٹی بی کا شکار ممانی مجیدہ تک دکھوں کا ایک سفر تھا۔ممانی مجیدہ نے ۳۲ برس کی عمر میں یہ سفر طے کرلیا اور اپنی یادگار ایک بیٹا اور تین بیٹیاں چھوڑ گئیں۔

میری شادی اپریل ۱۹۷۱ء میں ہوئی اسی سال میں اور مبارکہ گرمیوں کے دنوں میں ماموں ناصر کے پاس مانسہرہ گئے۔وہاں ایک دن ریڈیو پر مہندر کپور کا گیت نشر ہوا:

تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو میں یونہی مست نغمے لٹاتا رہوں

میں نے دیکھا ماموں ناصر عالم جذب میں پہنچے ہوئے تھے۔ممانی مجیدہ کو فوت ہوئے چار برس ہو چکے تھے اور ان کی زندگی کے آخری تین برس بھی سنگین بیماری کے باعث شجر ممنوعہ کے طور پر بسر ہوئے تھے۔گویا سات برس کا وقفہ تھا۔بیٹیوں کی شادی کے بعد جیسے ہی انہیں سبکساری کا احساس ہوا زندگی پھر سے انگڑائیاں لینے لگی۔مہندر کپور گارہا تھا:

میں اکیلا بہت دیر چلتا رہا
اب سفر زندگانی کا کٹتا نہیں
جب تلک کوئی رنگیں سہارا نہ ہو
وقت کافر جوانی کا کٹتا نہیں

میں نے اس دن مہندر کپور کے گیت کا لفظ لفظ ماموں ناصر کے روم روم میں اترتے دیکھا۔

خانپور واپس آ کر امی جی کو اپنے ''مشاہدہ'' کا حال سنایا۔امی جی نے فوراً رشتوں کی تلاش شروع کردی۔دوسال کی دوڑ دھوپ کے بعد مطلوبہ رشتہ ملا۔چندے آفتاب چندے ماہتاب۔۔ممانی آصفہ کو ملتان سے بیاہ کر خانپور لایا گیا۔دوچار دن شادی کی گہما گہمی رہی پھر ماموں،ممانی پشاور چلے گئے۔گھر آباد ہوگیا۔

ماموں ناصر انگریزی ادبیات کے استاد ہیں مگر اُردو ادب سے بے خبر نہیں ہیں اردو کے کلاسیکی ادب سے تو گہری واقفیت رکھتے ہیں۔برجستہ اشعار پڑھنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ ایک دفعہ مرحومہ ممانی مجیدہ نے کہا کہ مجھے تھوڑا سا دبا دیں۔فوراً غالب کا یہ شعر پڑھنے لگے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ، ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ہزارہ میں ڈاڈر کے علاقے سے دریائے سرّن گزرتا ہے۔ دریا کا صاف پانی اور چاروں طرف ہریالی۔۔ میں اس منظر کو حیرت اور مسرت سے دیکھ رہا تھا کہ ماموں ناصر نے معمولی سے تصرف کے ساتھ علامہ اقبال کے یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہیں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہے
ہے دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہے
پانی کو چھو رہی ہے جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہے

دل کی ایسی جادوئی حالت تھی جیسے علامہ اقبال کے اشعار الہام کی طرح نازل ہو رہے ہوں یہ ماموں ناصر کی برجستگی کا کمال بھی تھا۔

گھر کی شادی بیاہ کی محفلوں میں جب صرف خاندان کے افراد موجود ہوتے ماموں ناصر کوئی نہ کوئی غزل اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ سناتے ۔ بہادر شاہ ظفر کی غزل ’’تا در جاناں ہمیں اول تو جانا ہے منع‘‘ اور سراج دکنی کی غزل ’’خبر تحیّر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی‘‘ ۔۔ ماموں ناصر ایسی خوبصورتی سے سناتے کہ یہ اصل شاعروں کی بجائے ماموں ناصر کا کلام لگنے لگا۔

طبعاً ماموں ناصر مذہبی انسان ہیں مگر مذہبی تعصّبات سے دور۔۔ حالانکہ میرے عزیزوں میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے کٹڑ پن کے باعث اپنے تعصّبات سے پاک نہیں ہو سکے۔ یورپ اور امریکہ کا کشادہ ماحول بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔۔ مذہبی ہونے کے باوجود ماموں ناصر خلاف شرع تھوک لینے کو عیب نہیں سمجھتے اسی لئے اندھیرا، اجالا ان کا مسئلہ نہیں ہے۔۔ ماموں ناصر کی خوش ذوقی اور شگفتہ مزاجی کے باعث مجھے ہمیشہ ٹوہ رہی کہ ماموں ناصر کی کسی پرانی محبت کو

دریافت کروں اس میں کوئی واضح کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن اتنا سرا ضرور ہاتھ آیا ہے کہ کسی زمانے میں ماموں ناصر کی فیصل آباد کے ایک میر صاحب سے بہت دوستی تھی۔ ان کی بیگم، بہن، بچے۔۔ گھر کے سب افراد ماموں ناصر کے لئے چشم براہ رہتے۔ انہیں دیکھ کر ماموں ناصر کے چہرے پر بھی شگفتگی پھیل جاتی۔ بعد میں یکا یک یہ تعلق ٹوٹ گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ ماموں ناصر کی موجودہ شگفتہ مزاجی اسی دور کی عطا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

مجھے شاعری کا شوق ہوا تو ماموں ناصر نے میری اصلاح کے لئے ایک استاد قسم کے شاعر جناب اختر بے خود رام پوری (یا کوئی اور پوری) کو بلالیا۔ انہوں نے میری وہ اصلاح فرمائی کہ شاعری سے تائب ہونے میں بس تھوڑی سی کسر رہ گئی۔ عام زندگی میں مجھے راہ راست پر لانے کے لئے ماموں ناصر کسی نہ کسی جناب اختر بے خود رام پوری کو مجھ پر مسلّط کر دیتے ہیں۔ شاید انہیں میری اصلاح کا گر معلوم ہو گیا ہے۔

ہر انسان کی زندگی عام معمولات کے مطابق بسر ہوتی ہے لیکن ایک ڈگر پر چلتے چلتے اس میں کبھی کبھار کوئی موڑ بھی آ جاتا ہے۔ کوئی پراسرار، محیر العقول یا روحانی تجربہ یا پھر کوئی ایسا واقعہ، سانحہ ہو جاتا ہے جس سے زندگی عام ڈگر سے ہٹ جاتی ہے۔ ماموں ناصر کی زندگی میں بعض ایسے واقعات رونما ہوئے۔ قیام پاکستان کے ایّام میں مشرقی پنجاب میں بم کے ایک دھماکے کے نتیجہ میں ماموں ناصر زخمی ہو گئے۔ موت انہیں چھو کر گزر گئی۔ بم کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی ضرب کا نشان ماموں ناصر کے جسم پر آج بھی موجود ہے۔ اس تجربے سے انہیں زندگی کی اہمیت اور موت کی حقیقت دونوں کا ادراک ہوا۔

ریلوے ملازمت کے دوران ماموں ناصر غالباً کوہاٹ میں مقیم تھے۔ وہاں ایک دفعہ موسم بہار میں ایک سانپ نکل آیا۔ ریلوے کے ایک دو ملازموں نے مل کر سانپ کو ہلاک کر دیا۔ ماموں ناصر کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بھی جائے واردات پر تماشائی کی حیثیت سے موجود تھے۔ فلمی کہانیوں کے عین مطابق مردہ سانپ کی آنکھوں میں ماموں ناصر کا عکس بھی محفوظ ہو گیا۔ پھر اس سانپ کی مادہ کے انتقام کی سٹوری شروع ہو گئی ماموں ناصر سے اس ناگن نے عجیب انتقام

لیا۔ ہر سال بہار کے موسم میں آتی اور ان کے پیروں کو سونگھ کر چلی جاتی۔ اگلی صبح پاؤں اس طرح ہوتے جیسے کسی نے ساری کھال اتار لی ہو۔ ماموں ناصر اس دوران ریلوے کی ملازمت چھوڑ کر محکمہ تعلیم میں آ گئے مگر محکمے کی تبدیلی کا بھی اس ناگن نے کوئی اثر نہیں لیا۔ ماموں اس موسم میں پشاور میں ہوتے یا کوہاٹ میں، میران شاہ میں ہوتے یا ڈیرہ اسماعیل خاں میں۔۔ اپنے پیار کی آگ میں جلتی اور انتقام کی آگ میں سلگتی، غلط فہمی کی ماری وہ ناگن وہیں پہنچ جاتی، ان کے پاؤں سونگھتی اور انہیں اذیت میں مبتلا کر کے لوٹ جاتی۔ آفرین ہے اس ناگن کی اخلاقیات پر کہ اس نے ماموں کے پاؤں سونگھنے سے کبھی تجاوز نہیں کیا یہ الگ بات کہ اسی حرکت سے ہی ماموں کے پیروں کا ماس الگ ہو جاتا تھا۔ شاید وہ ان کے ماس ہی کو ان کے جسم سے الگ کرنا چاہتی تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خاں میں قیام کے دوران جب وہ ناگن اپنے مُقرّرہ وقت پر پہنچی تو اتفاق سے ماموں صادق اور چند سٹوڈنٹس بھی وہیں موجود تھے۔ ماموں ناصر تو اس ناگن کو دیکھتے ہی سحر زدہ سے ہو گئے مگر ان کے شاگردوں اور ماموں صادق نے مل کر اس ناگن کا کام تمام کر دیا۔ یوں ''ناگن کا انتقام'' کی کہانی اپنے انجام کو پہنچی لیکن یہ کہانی کسی فلم کی سٹوری یا کسی قدیم مائتھالوجی سے اخذ کی ہوئی نہیں تھی۔ ماموں ناصر نے فلمی ہیرو کے برعکس زندگی کے ہیرو کی طرح اپنا پارٹ پلے کیا۔ فلمی ہیرو کی طرح مصنوعی کرب خود پر طاری نہیں کیا بلکہ واقعہ کی پوری اذیّت بھوگی اور سالہا سال موت سے معانقہ کر کے نیا جنم لیتے رہے۔۔ بم دھماکے اور غلط فہمی کی شکار منتقم مزاج ناگن کے واقعات کے بعد تیسرا اہم واقعہ ماموں ناصر کی ممانی آصفہ کے ساتھ شادی کا ہوا۔ یہ شادی ان کی زندگی کی ڈگر کو یکسر تبدیل کر گئی۔ ممانی آصفہ کے ذریعہ ہمارے ننھال میں زندگی کا ایسا طریقہ سامنے آیا جس کی پہلے ہمارے ننھال میں کوئی مثال موجود نہ تھی۔ ممانی آصفہ کے پاس بیٹھے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ''شیدا پستول'' جینٹری میں آ گیا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی تو ماموں ناصر کی حالت بھی کچھ ایسی ہی دکھائی دینے لگتی ہے۔

مرحومہ ممانی مجیدہ سے ماموں ناصر کے چار بچے ہیں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔۔ مُبارکہ، وحیدہ، غزالہ☆ ، مُبشّر احمد خالد۔۔ ممانی آصفہ سے دو بیٹیاں ہیں۔۔ عائشہ، بُشریٰ۔۔ ممانی مجیدہ

کی ساری اولاد شادی شدہ ہے بڑی بیٹی مبارکہ میری بیوی ہے۔ اس سے چھوٹی وحیدہ کے شوہر بشیر احمد شاہد عمر میں مجھ سے چھ ماہ بڑے ہیں اور سب سے چھوٹی غزالہ کے شوہر محمود عمر میں مجھ سے دو سال بڑے ہیں۔ یوں میں رشتہ کے لحاظ سے اس طرح ماموں ناصر کا سب سے بڑا داماد ہوں کہ ان کی بڑی بیٹی کا شوہر ہوں اور اس لحاظ سے اب تک کا سب سے چھوٹا داماد ہوں کہ دونوں چھوٹے داماد عمر میں مجھ سے بڑے ہیں ؎ ایں سعادت بزور بازو نیست

میرے بعض بھائیوں کو ایک دو ماموؤں سے شدید شکایتیں ہیں۔ ایک دفعہ میں انہیں سمجھا رہا تھا کہ ہر شخص کے اپنے حالات ہوتے ہیں، اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں، ترجیحات ہوتی ہیں۔ اب ہمیں کسی ماموں کا شکوہ کرنے کی بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنے بھانجوں بھانجیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ تاکہ ہمیں بھی کل کلاں ان سے ویسے ہی ریمارکس نہ سننا پڑیں جیسے آج بعض ماموؤں کے بارے میں ہم دے رہے ہیں۔ شکوے شکایتیں تو رشتہ داری کا حصہ ہیں۔ ایک حد تک رہیں تو ان سے بھی محبت گہری ہوتی ہے۔ ویسے بحیثیت رشتہ ماموں کا رشتہ ماموں کا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے بھانجوں کا ماموں ہو یا ہمارا ماموں، ہیر کا ماموں ہو یا رانجھے کا ماموں۔۔ بہن کو بھائی سے اور بھائی کو بہن سے سچی محبت ہو تو سارے ''مامے'' ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ماموں ناصر میرے لئے ''رانجھے کا ماموں'' ثابت ہوئے ہیں۔ رانجھے کا ماموں باقی دنیا کے ماموؤں جیسا ہوتے ہوئے بھی ان سے تھوڑا مختلف ہے۔ رانجھے کا ماموں اسے خود بانسری لے کر دیتا ہے۔ بھینسیں پلے سے خرید کر دیتا ہے۔ رومینٹک فضا پیدا کرنے میں ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ کھیڑوں سے مقابلہ کرتا ہے اور پھر رانجھے کی ساری مشقتیں خود اٹھا کر اسے ہیر عطا کراتا ہے۔ مجھے یقین ہے اگر ماموں ناصر پہلے رانجھے کے دور میں اس کے ماموں ہوتے تو ہیر سے اس کی شادی کرا کے رہتے۔ دراصل ماموں ناصر طبعاً مذہبی ہونے کے باوجود صلح جو، انسان دوست اور محبتی انسان ہیں۔

عالمی امن کے لئے موجودہ دور کے بڑے ممالک جس طرح ''ہیر کے مامے'' بن کر دہائی دے رہے ہیں اگر رانجھے کے ماموں کو موقعہ دیں تو بہت سے جھگڑے فوراً ختم ہو سکتے ہیں، مثلاً اگر

افغان مسئلہ پر مفاہمت کے لئے ماموں ناصر کو ذمہ داری سونپی جائے تو ماموں، جنرل نجیب سے یوں بات کریں گے: افغان عبوری حکومت کے تمام ارکان ذاتی طور پر آپ سے دلی محبت رکھتے ہیں مگر بین الاقوامی مداخلت کے باعث مجبور ہیں۔۔ پھر افغان عبوری حکومت سے یوں بات کریں گے: جنرل نجیب تو آپ سب کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بیان سے باہر ہے مگر روسی دباؤ کے باعث ان کی پیش نہیں جارہی۔اس لئے آپ اپنے رویے میں تھوڑی لچک پیدا کر کے ان کی مدد کریں۔۔ یوں چند ملاقاتوں کے بعد افغان مجاہدین اور جنرل نجیب کی مشترکہ حکومت قائم ہوجاتی۔افغانستان میں امن وامان ہوجاتا اور ساری بیرونی طاقتیں منہ دیکھتی رہ جاتیں۔

اس مثال سے ماموں ناصر کی ہمدرد، صلح جو اور محبتی طبیعت کو واضح کرنا مقصود تھا۔اس وقت عالمی امن کی خرابی میں سارا قصور ان بڑے ملکوں کا ہے جو خواہ مخواہ ''ہیر کے مامے'' بنے پھرتے ہیں جبکہ دنیا کو اس وقت خاص طور پر رانجھے کے ماموؤں کی ضرورت ہے۔ماموں ناصر جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

☆افسوس یہ خاکہ رسالہ ''صریر'' میں چھپنے کے بعد غزالہ اور محمود میں علیحدگی ہوگئی۔پتہ نہیں یہ اس خاکے کا اثر تھا یا محمود کی اپنی خاک کا۔۔

غزالہ اب محمد اجمل پاشا کی بیوی ہے خدا ان دونوں کو خوش رکھے آباد رکھے ۔

اور درویش کی دعا کیا ہے۔

محبت کی نمناک خوشبو

(آپی)

بنی ہوئی ہے ڈھال وہ میری خاطر حیدرؔ
مِرے مخالف کو جو کماں جیسی لگتی ہے

عام طور پر ماہرین کا خیال ہے کہ کسی بچے کے بعد جو بچہ پیدا ہوتا ہے ان دونوں میں خواہ مخواہ کی مخاصمت پیدا ہوجاتی ہے۔دراصل پہلا بچہ یہ سمجھتا ہے کہ بعد میں آنے والے نے اس سے اس کی ماں کی محبت چھین لی ہے۔۔اسی طرح ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلوٹھی کی اولاد اور باپ میں بھی ایک اندرونی مخاصمت ہوتی ہے کیونکہ عورت کی توجہ شوہر سے ہٹ کر پہلے بچے پر مرکوز ہوجاتی ہے۔یہ دونوں باتیں عمومی طور پر بڑی درست پائی جاتی ہیں لیکن آپی کی حد تک یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہوچکی ہیں۔پہلی اولاد ہونے کے باوجود اباجی کو ہمیشہ آپی سے بے حد محبت رہی۔میں آپی کے بعد پیدا ہوا مگر ہم دونوں میں جو محبت ہے وہ شاید کسی اور بہن بھائی کے حصے میں نہیں آسکی۔ماہرین کی دونوں باتیں غلط ثابت ہوئی ہیں تو یہ سراسر آپی کی اپنی خوبی ہے۔

امی جی بتایا کرتی تھیں کہ پیدائش کے وقت آپی انتہائی کمزور اور لاغر تھی۔ثبوت کے طور پر امی جی نے آپی کو پہنائی جانے والی پہلی قمیص سنبھال رکھی تھی جو شاید اب آپی کے پاس ہی محفوظ ہے لیکن اس وقت ہم سارے بہن بھائیوں میں جسامت کے لحاظ سے آپی اول نمبر پر ہے۔ایک دفعہ آپی نے مجھے کہا تم اتنے دبلے کیوں ہو۔مرد کا رعب اس میں ہوتا ہے کہ اس کا پیٹ تھوڑا سا بڑھا ہوا ہو۔بس پھر ایسا ''فیضانِ نظر'' ہوا کہ مِرے پیٹ کا رعب و

دبدبہ مسلسل بڑھتا ہی جارہا ہے۔

آپی کی اور میری عمر میں ایک سال، ایک مہینہ اور ایک دن کا فرق ہے۔بچپن میں جب کوئی ہم سے عمر کا فرق پوچھتا تو ہم بڑے مزے سے کہتے ایک سال، ایک مہینہ، ایک دن، ایک گھنٹہ، ایک منٹ ایک سیکنڈ۔۔میری پیدائش پر آپی کمزور ہونے کے باوجود مجھے گود میں لے کر بیٹھتی۔ کاکا۔۔کاکا۔۔کہہ کر باتیں کرتی۔بچپن میں اکثر میں آپی کو ڈرایا کرتا تھا اور زیادہ تر ڈرانے کی وجہ سے ہی اباجی سے مار کھایا کرتا تھا۔کبھی آپی کا کوئی قصور ثابت ہوجاتا تو اسے صرف ایک تھپڑ پڑتا۔ ایک دفعہ کسی عزیز نے اباجی سے کہا کہ آپ حیدر کو زیادہ مارتے ہیں مگر بیٹی کو بس ایک تھپڑ مار کر چھوڑ دیتے ہیں۔اباجی نے کہا بیٹی کو مارنے لگتا ہوں تو وہ مٹی کی دیوار بن جاتی ہے پھر اسے کیا ماروں۔ حیدر کو لگتی کم ہیں اچھل کود زیادہ کرتا ہے اس لئے اسے مارنے میں بھی مزہ آتا ہے۔۔پڑھائی سے آپی کو شروع سے ہی چڑ رہی ہے۔ایسے لگتا ہے جیسے آپی کو بچپن میں ہی بلھے شاہ کے ’’علموں بس کریں او یار‘‘ والے تصور کا ادراک ہوگیا تھا۔شروع شروع میں آپی کو زبردستی سکول بھیجنا پڑتا تھا۔ کچی جماعت کا امتحان ہوا۔نتیجہ نکلا۔آپی فیل ہوگئی۔گھر آئی تو بڑی خوشی سے کہنے لگی: امی۔امی۔ گدھے گدھے جتنی لڑکیاں فیل ہوکر رو رہی تھیں۔میں فیل ہوکر بھی ہنس رہی ہوں۔۔گویا یہ بھی ایک بہادری تھی۔اپنی شکست کو مسکرا کر تسلیم کرنا تھا۔

بچپن کے واقعات میں سے مجھے یاد آرہا ہے۔جب نانا جی ابھی ہندوستان میں ہی تھے، ہم نانا جی سے ملنے گئے۔وہاں شہر کے چوک سے گلی کے موڑ پر ایک کنواں تھا جہاں سکھ حضرات کھلے عام نہایا کرتے تھے۔ہم دونوں ایک دیوار کی اوٹ سے انہیں دیکھتے۔بیک سائڈ سے لمبے بالوں کے باعث ہم انہیں عورتیں سمجھتے اور سوچتے کہ کتنی بے شرم عورتیں ہیں مگر جب ان کے چہرے سامنے آتے تو داڑھیوں کا ماجرا ہماری سمجھ میں نہ آتا اور ہم پریشان ہوکر گھر کی طرف دوڑ جاتے۔۔باباجی کی گراموفون مشین کو ہم ہمیشہ حیرت سے دیکھتے۔ریکارڈ بجتا تو ہم گانے کی طرف توجہ کرنے سے زیادہ گانے والوں کی تلاش شروع کردیتے۔کبھی بھونپو میں سے جھانکتے، کبھی لکڑی کے بکس کو کھٹکھٹاتے۔ہم یہی سمجھتے تھے کہ گیت گانے والے یہیں کہیں چھپ کر گارہے

ہیں۔۔میں سادگی اور بھولپن میں آپی کا زیادہ دیر تک ساتھ نہ دے سکا۔خانپور میں ہمارے گھر کے سامنے محکمہ صحت کی طرف سے حفظان صحت کے سلسلے میں فلم دکھائی گئی۔فلم کے دوران دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے وقفے وقفے سے فلمی گیت بھی دکھائے، سنائے گئے۔’’رم جھم رم جھم پڑے پھوار۔تیرا میرا نت کا پیار‘‘

اس گیت کا سین دیکھا۔ہیرو ہیروئن دو جھولوں پر بیٹھے جھولا جھول رہے ہیں۔ہلکی ہلکی برسات ہو رہی ہے اور یہ گیت گایا جارہا ہے۔۔آپی بعد میں کہنے لگی: ہائے اللہ وہ بہن بھائی جھولا جھولتے ہوئے کتنے پیارے لگ رہے تھے۔بس یہاں سے سادگی اور بھولپن کے معاملے میں ہماری راہیں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں۔

رحیم یارخاں میں ہمارے ایج گروپ میں بڑے پیارے پیارے بچے شامل تھے۔آپا حفیظ، رضیہ(لجو) صفیہ(تپو)، سعیدہ، بشیراں، نسیم، ظفر، بشیر حقہ۔۔بعد میں آپا حفیظ زچگی کے کیس کے دوران فوت ہوگئی۔رضیہ ایئر ہوسٹس بن گئی مگر اچانک(؟) فوت ہوگئی۔سعیدہ بے چاری ویسے ہی رسموں رواجوں کی بھینٹ چڑھ کر زندہ درگور ہوگئی۔صفیہ اب لاہور میں ایک اچھی جاب پر ہے۔بشیراں اور نسیم گھریلو زندگی نبھا رہی ہیں۔ظفر ڈرائیور بن کر امارات کی طرف نکل گیا ہے۔بشیر حقے کا پتہ نہیں چلا کہ اب کہاں ہے۔ہم شام کے وقت گھر والی گلی میں سٹریٹ لائٹ کے نیچے مختلف قسم کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔خاص طور پر ایک کھیل۔۔’’مائی نی مائی تنور تپیا کہ نائیں‘‘۔ایک اوٹ پٹانگ سا گیت بھی ہم نے بنایا ہوا تھا:

اللہ ڈوایا۔۔چکی تلوں آیا(اللہ ڈوایا۔۔چکی کے نیچے آیا)

اُتوں ماریا کھلا تلوں نکل آیا(اوپر سے جوتا رسید کیا گیا تو نیچے سے نکل آیا)

جس دوست کے ساتھ جھگڑا ہوجاتا۔اللہ ڈوایا کا نام کاٹ کر اس دوست کے نام کو اللہ ڈوایا کے وزن تک کھینچ کھانچ کے لے آتے اور گیت شروع کردیتے۔ناراض دوست مارنے کو لپکتا اور یوں پھر سے صلح ہوجاتی۔ان سب بچوں میں آپا حفیظ سے آپی کی دوستی بہت گہری تھی۔ زبیدہ جسے بچپن میں ہم بلو کہتے تھے ایک دفعہ اباجی کی دوکان پر آئی اور کہیں دوکان کے اندر ہی

جا کرسوگئی۔ابا جی نے سمجھا بیٹی گھر چلی گئی ہے۔شام کو دوکان بند کر کے آئے تو امی جی نے پوچھا:
بلو کہاں ہے؟۔ابا جی نے سمجھا امی جی نے بلو کو چھپایا ہوا ہے اور جان بوجھ کر مذاق کر رہی ہیں لیکن
جب پتہ چلا کہ بلو واقعی موجود نہیں تو پھر ہمارے گھر میں ہی نہیں سارے محلے میں افراتفری مچ گئی۔
تب آپی، میں اور ہمارے ایج گروپ کے بچے بلو کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔محلّہ قاضیاں
سے لے کر ریلوے اسٹیشن تک گئے۔سب باری باری ایک ہی صدا لگاتے ''اے بلو۔اے.....''
جب ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تو گھر لوٹ آئے۔اس دوران ابا جی کو اچانک دوکان چیک کرنے
کا خیال آ گیا تھا اور وہ بلو کو وہاں سے گھر لا چکے تھے۔اس رات آپی اور میں دیر تک بلو کو پیار
کرتے رہے۔

بچپن میں آٹا پسوانے، کنویں سے پانی بھر کر لانے اور ٹال سے لکڑیاں لانے کے کام ہم
دونوں بھائی بہن نے مل کر کئے۔بعد میں زبیدہ اور شاہدہ نے بھی ان مشقتوں میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔
جب آپی کو کم عمری میں ہی برقعہ پہنا دیا گیا تو آپی نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔میرا خیال ہے گھر
کے کام کاج میں امی جی کو جتنا آرام ملا، آپی کی وجہ سے ملا، یا پھر مبارکہ کی وجہ سے۔۔وگرنہ ایک
بیٹی نے تو اپنے سسرال سے بھی کپڑے دھلنے کے لئے امی جی کو بھیجنے شروع کر دیئے تھے اور ایک
بہو نے چارپائی پر بیٹھ کر امی جی سے خدمت کرائی ہے۔ماں، باپ اور بابا جی کی جو خدمت آپی
نے کی اس کی توفیق اور کسی بہن بھائی کو نہ مل سکی۔ابا جی کی محبت ہم دونوں کے لئے یکساں تھی۔امی
جی کی محبت میں پلڑا میری طرف تھوڑا سا زیادہ تھا جبکہ بابا جی کی محبت آپی کے لئے زیادہ بلکہ بہت
زیادہ تھی۔گویا ماں، باپ اور بابا جی کی محبتوں کو جمع کریں تو ہم دونوں کا دامن برابر بھرا ہوا ہے اور
اس میں کوئی تیسرا بھائی، بہن ہمارا حریف ہی نہیں۔

والدین کی خدمت کے بعد آپی کو سسرال جا کر اپنے سسر کی خدمت کا موقعہ ملا۔یہ بزرگوں
کی دعائیں ہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپی کو پانچ بیٹے اور ایک بیٹی کی دولت عطا کی۔سارے بچے
خوبصورت اور صحت مند ہیں۔عرفان، عمران، کامران، صائمہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے
پھر لقمان اور نعمان (جنہیں ہم پیار سے چوچو اور نوما کہتے ہیں) جڑواں پیدا ہوئے۔پی اے

ایف کے رہائشی ایریا میں دونوں بچوں کی وجہ سے بڑی شہرت ہوئی۔آپی جہاں بھی جاتی بچوں کو
ایک ٹوکری میں فٹ کر کے بٹھا دیتی اور مزے مزے سے ٹوکری اٹھائے شاپنگ سنٹر یا ہسپتال سے
ہو آتی۔جڑواں بچوں کی ٹوکری دیکھ کے لوگ لطف اندوز ہوتے اور باری آنے سے پہلے آپی کو
باری مل جاتی۔

بھائی عبدالرحیم ہنس مکھ اور خوش مزاج انسان ہیں۔محنتی اور مشقتی بھی بہت ہیں۔محنت کے
نتیجہ میں ان کا جسم خاصا مضبوط ہے۔یہی مضبوطی ان کی اولاد میں بھی منتقل ہوئی ہے۔ایک دفعہ
ٹرین کے سفر میں آپی کا منجھلا بیٹا کامران میرے ساتھ تھا۔رات کو میں نے اسے اوپر کی برتھ پر
سلا دیا۔رات کے کسی لمحے میں کامران لڑھک کر نیچے آن گرا۔میں گھبرا گیا کہ بچے کا کوئی ہاتھ،
پاؤں فریکچر نہ ہو گیا ہو۔کامران نے بولائی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سو گیا۔منزلِ مقصود
پر پہنچ کر میں نے کامران سے پوچھا:

''بیٹے! کہیں ٹانگ یا بازو میں تکلیف تو نہیں ہے؟''

''نہیں تو۔۔ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' کامران نے الٹا مجھ سے
سوال کیا تو میں نے اسے بتایا کہ رات تم برتھ سے نیچے گر گئے تھے۔یہ بات سن کر کامران نے
لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا اور میں اس کی حیرت پر حیرت زدہ رہ گیا۔گھر آ کر عزیزوں کو یہ بات
بتائی تو ایک عزیز نے کہا: آپی کے سارے بچے ماشاءاللہ پتھر اور لوہے کے بنے ہیں۔اگر چھوٹے
چوچو کو مکان کی چھت سے نیچے پھینکیں تو فرش اکھڑ جائے گا، چوچو کو کچھ نہیں ہو گا۔ہر چند یہ بات
مذاق میں کہی گئی تھی تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپی کے بچے جتنے خوبصورت اور سمارٹ ہیں اتنے ہی
مضبوط جسم کے مالک بھی ہیں۔

ابا جی کی روحانی قوتیں تھوڑی سی آپی میں بھی منتقل ہوئیں۔خانپور میں ہمارے ایک
ہمسائے میاں احمد بخش سیال بڑے اچھے آدمی تھے۔ہمارے دادا جی کے دوست بھی رہے تھے مگر
ایک مرحلے پر ہمیں محسوس ہوا کہ وہ بابا جی اور ابا جی کو لڑانے کا چکر چلا رہے ہیں۔آپی نے گھر میں
ایک خاص مسنون دعا کا وِرد شروع کر دیا اور ان کے گھر پیغام بھجوا دیا کہ میں قریشی کی بیٹی ہوں۔

میں نے وِردشروع کردیا ہے جو کوئی بھی ہمارے گھر میں بے سکونی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ اب نہیں بچے گا۔۔اسے دعا کا اثر کہیں یا نفسیاتی اثر لیکن دوسرے ہی دن میاں احمد بخش سیال شدید بیمار پڑ گئے۔علالت کی حالت میں ہی انہوں نے اپنی ایک بہو کے ذریعے آپی کو معذرت کا پیغام بھیجا اور اپنی صحت یابی کے لئے دعا کرنے کو بھی کہا۔

آپی کو تنہائی میں خود کلامی کی عادت ہے۔اگر آپی میں بھولپن زیادہ نہ ہوتا تو قریشیت کے روحانی اثرات اور تنہائی میں خود کلامی کی عادت کے باعث آپی بھی گوتم بدھ کی طرح کسی جنگل کی راہ لیتی اور اسے بھی گوتم جیسے گیان کی روشنی مل جاتی۔لیکن اس زمانے میں ایسا کیسے ہوسکتا؟۔۔ اچھا ہوا آپی کا بھولپن آڑے آ گیا ورنہ خواہ مخواہ محکمہ جنگلات والوں نے چالان کر دینا تھا۔بلکہ خدا کا شکر ہے کہ گوتم بدھ جیسی عظیم ہستی اس زمانے میں نہیں ہے ورنہ محکمہ جنگلات والوں نے تو شاید.....

آپی فطرتاً نیک دل اور رحم دل ہے۔دوسروں کا دکھ سن کر رونے بیٹھ جائے گی۔گھر میں جو کچھ ہوگا (حسب توفیق) سائل کو دے دے گی۔البتہ اپنی معصومیت اور بھولپن کی وجہ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے تو پھر اسے دور کرنے میں بھی خاصا وقت لگتا ہے۔میرے ایک عزیز کو جو مجھے بے حد عزیز ہے۔اس کی سوتیلی والدہ نے آدھی رات کے وقت گھر سے نکلوا دیا۔اس عزیز کو سارے شہر میں آپی کے گھر کے سوائے کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔آپی اور بھائی عبدالرحیم نے اس عزیز کو ٹھکانہ دیا۔اس سے ہمدردی کی۔اور جب وہ عزیز کسی باہر کے ملک چلا گیا تو اس سے اپنی نیکی کی پوری پوری سزا پائی۔اس عزیز کی زیادتی کسی غلط فہمی کا نتیجہ سہی۔مجھے اس سے محبت سہی لیکن میں اسے آج بھی اس معاملے میں قصوروار سمجھتا ہوں۔

ایک اور بہت ہی قریبی عزیز کو آپی اپنے ہاں لے گئی۔وہاں اسے جو کام بھی سکھانے پر لگاتے اس کی شہزادگی آڑے آجاتی۔میں نے خود دیکھا کہ آپی نے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر، اپنے شوہر سے چھپا کر اس قریبی عزیز شہزادے کی خواہشیں پوری کیں۔آج آپی کے بارے میں سب سے زیادہ تضحیک آمیز باتیں کرنے کا شرف بھی اسی شہزادے کو حاصل ہے۔اس شہزادے

کے کردار میں بڑی جان ہے۔میں اس پر تفصیل سے لکھنے کا آرزومند ہوں لیکن شاید ابھی اس کردار پر لکھنے میں کچھ وقت لگے۔

میں اپنے پیچیدہ حالات کے باعث سنگین مسائل میں گھرا ہوا تھا۔میرے بعض سوتیلے عزیز جنہیں بعض دوسروں پر اپنے سوتیلے پن کا زہر نکالنا تھا مگر وہ ان کی دسترس میں نہیں تھے انہوں نے ان کے متبادل کے طور پر مجھے ہی نشانہ بنا لیا، گھات ایسے لگائی کہ میرے ماں جایوں کو آگے کر دیا۔قریبی عزیز دشمن بن گئے۔خون کے رشتے ''خونی رشتے'' بن گئے۔سوتیلے عزیز اپنی فتح مندی پر نازاں تھے۔میری مجبوری کچھ اور تھی

احباب کے تیروں کے تو ہم عادی تھے حیدرؔ
اس بار مگر بھائی تھے، احباب نہیں تھے

ہر چند اب میں سنبھل گیا ہوں اور اس پوزیشن میں ہوں کہ سارے کرم فرماؤں کے قرض سود سمیت انہیں واپس کر دوں۔تاہم اس سارے تماشے میں آپی کا کردار بڑا مضبوط، توانا اور مثالی رہا۔ایک بھائی اور بھابھی۔۔آپی کو میرے خلاف بھڑکانے گئے۔آپی کو جتنی باتیں معلوم تھیں انہیں کی حد تک جواب دیتی رہی۔جب وہ چرب زبانی سے چالاکی دکھانے لگے تو آپی نے انہیں دوٹوک لفظوں میں کہا: میں حیدر اور مبارکہ سے تعلق نہیں توڑ سکتی۔تم سمجھتے ہو میں حیدر سے تعلق توڑ لوں گی۔اگر حیدر خود بھی مجھے چھوڑ دے میں تب بھی اسے نہیں چھوڑوں گی۔

جب مجھے اپنے ذرائع سے اس بات کا علم ہوا مجھے یوں لگا جیسے میں چار دن کا بچہ ہوں جسے ایک سال، ایک مہینہ اور پانچ دن کی کمزور سی آپی نے اپنی گود میں اٹھایا ہوا ہے۔مجھے اٹھائے اٹھائے وہ تھک گئی ہے مگر پھر بھی پیار سے ''کاکا۔۔۔کاکا'' کہے جا رہی ہے۔پھر کاکا۔۔کاکا۔ کہتے ہی وہ بڑی ہوتی جا رہی ہے۔اتنی بڑی کہ صرف میرے چہرے پر بیٹھنے والی مکھیوں کو ہی نہیں اڑا سکتی بلکہ مجھے کوّوں، چیلوں اور گِدھوں کے حملوں سے بھی محفوظ رکھ سکتی ہے۔اسی لمحے مجھے جیسے محسوس ہوتا ہے کہ میری مری ہوئی ماں دوبارہ جی اٹھی ہے۔
یہ محسوس ہوتا ہے جیسے

کوئی غم زدہ، بے نشاں چاپ

میرے تعاقب میں

اک نرم جھونکے کی صورت چلی آ رہی ہے

کوئی ہے۔۔جو میرے عقب میں

محبت کی نمناک خوشبو بکھیرے

اڈتے ہوئے تیز شعلوں سے مجھ کو بچائے

مرے ہر قدم کی سلامت روی کے لئے

التجاؤں، دعاؤں کی برکھا میں خود کو بھگوئے

مرے سر پہ آنچل کا سایہ کئے/آ رہا ہے!

☆☆☆

پسلی کی ٹیڑھ

(مبارکہ)

پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا

وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

بیوی۔۔بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کو داؤ پر لگانے اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔بہرحال میں اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ سچ لکھوں گا۔سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں گا۔اللہ میری حفاظت فرمائے۔(آمین)

مبارکہ میری ماموں زاد ہے۔میں غالباً چھ سال کا تھا، مبارکہ دو سال کی تھی۔ہمارے بیشتر رشتہ دار ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔کسی تقریب کے باعث اور بہت سارے عزیز بھی جمع تھے۔بڑی ممانی نے لاڈ سے پوچھا فلاں سے شادی کرو گے؟ میں نے صاف انکار کر دیا۔پھر پوچھا گیا کس سے شادی کرو گے؟۔۔میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ مبارکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کے ساتھ کروں گا۔شاید بڑی ممانی کو میری پسند پر کوئی اعتراض تھا یا اپنی تجویز رد کئے جانے کا افسوس، فوراً بولیں: ''ہم ریاستیوں (سرائیکیوں) کو ایک رشتہ دے کر ہی بھولے ہیں۔اور کسی ریاستی کو اب رشتہ نہیں دینا''۔۔اس کا جواب مجھے اپنی یادداشت میں کہیں نہیں ملتا البتہ خاندان میں بڑی مستحکم روایت موجود ہے کہ میں نے جواباً کہا تھا: اگر آپ مبارکہ سے شادی نہیں کرو گے تو جب یہ روٹیاں پکا رہی ہوگی جیپ لے کر آؤں گا اور اسے اس میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔۔ماموں ناصر جو پاس ہی بیٹھے تھے، میرا جواب سن کر بڑی ملائمت

سے بولے: بیٹا! تم شرافت سے آنا میں خود ہی تمہیں بیٹی دے دوں گا۔

بچپن میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر کہی ہوئی مذاق کی ایک بات اتنی سنجیدگی اختیار کر گئی کہ اب وہ سارا مذاق وجدانی معلوم ہوتا ہے۔ ممانی مجیدہ فوت ہو گئیں تو ماموں ناصر کے لئے بچوں کو سنبھالنا مسئلہ بن گیا۔ انہوں نے اپنے بیان کے مطابق خود ہی رشتے کا انتظام کر دیا۔ یعنی اس زبانی مذاق کے ٹھیک بارہ سال بعد ہمارے ساتھ عملی مذاق ہو گیا۔ میں اٹھارہ سال کا تھا، مبارکہ چودہ سال کی تھی جب ہماری شادی ہو گئی۔ ہماری شادی کیا تھی گڈی، گڈے کا بیاہ تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہ اسے کچھ خبر! بے خبری کے عالم میں ولیمہ بھی ہو گیا۔ کئی دن گزر گئے اور ہم بے خبری کی جنت میں سوتے رہے۔ پھر یکا یک، از خود آگہی کا کوندا لپکا۔ اور پھر ہم پتوں سے اپنے تن ڈھانپنے لگے۔ آدم اور حوا کی کہانی آگے بڑھنے لگی۔

بچپن کے اس واقعہ کے حوالے سے میں نے ایک دفعہ مبارکہ سے کہا: بچپن کی معمولی غلطی کی کتنی بڑی سزا ملی ہے۔۔ اس نے فوراً کہا: غلطی آپ کی تھی، سزا میں بھگت رہی ہوں۔۔ خیر بات ہو رہی تھی آدم اور حوا کی کہانی کی۔ اس کہانی میں اتوار کے دن کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں اتوار کے دن پیدا ہوا، مبارکہ بھی اتوار کے دن پیدا ہوئی، ہمارا نکاح بھی اتوار کے دن ہوا۔ پہلی بیٹی رضوانہ اتوار کے دن پیدا ہوئی۔ پہلا بیٹا شعیب اتوار کے دن پیدا ہوا۔ آخر حکومت پاکستان نے تنگ آکر اتوار کی سرکاری چھٹی ختم کر دی اور چھٹی کے لئے جمعہ کا دن مقرر کر دیا۔

لڑکپن کے دو سال ہم نے اکٹھے گزارے تھے۔ پتہ نہیں یہ بچپن کی نامزدگی اور لڑکپن کی انڈرسٹینڈنگ تھی یا کچھ اور۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج شناس بن گئے۔ پھر بات مزاج شناسی سے بڑھ کر محبت اور دوستی کی سطح تک پہنچی اور وہاں سے بھی آگے بڑھی تو اس مقام کے بیان کے لئے کوئی لفظ نہیں ملا۔ بیوی، دوستی اور محبت۔۔ یہ سارے مقدس رشتے اب مبارکہ کے سامنے چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ (خدا کرے مبارکہ پر اس جملے کا کچھ اثر ہو)

میں نے کتابی سلسلہ ''جدید ادب'' جاری کیا۔ اس میں مبارکہ کی تمناؤں کا لہو شامل تھا۔ ہر شمارے کے ساتھ اس کا ایک آدھ زیور بک جاتا۔ اس اللہ کی بندی نے ایک دفعہ بھی تکرار نہیں

کی۔ جب تک اس کا زیور ساتھ دیتا رہا ''جدید ادب'' جاری رہا۔ زیور ختم ہو گئے تو ''جدید ادب'' بھی بند ہو گیا۔ اب سوچتا ہوں میں نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ لیکن مبارکہ نے بھی تو میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ میرے اچھے برے ہر طرح کے کاموں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ کسی نازک موڑ پر آکر اگر ساتھ دینا ممکن نہیں رہا تو اس نے کنارے پر کھڑے ہو کر نظارہ کیا مگر مجھے دباؤ ڈال کر روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے اس طرز عمل نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ میری ''گمراہیاں'' اسے معلوم ہیں میرے ''گناہ'' اس کے علم میں ہیں لیکن مجال ہے اس نے کبھی مجھے شرمندگی کا ہلکا سا احساس بھی دلایا ہو۔

امی جی اور مبارکہ میں گہری انڈرسٹینڈنگ تھی۔ ساس بہو میں کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوتی مگر ایسی نہیں جس میں ابا جی کو یا مجھے مداخلت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جلد ہی ساس، بہو کی جگہ پھوپھی، بھتیجی آگے آجاتیں اور خود ہی سارا معاملہ سنبھال لیتیں۔ آخر دم تک امی جی اور مبارکہ ایک ساتھ رہیں، صرف ایک سال کا عرصہ دونوں کو الگ رہنا پڑا کیونکہ خانپور چھوڑ کر ابا جی اور امی جی نے بالائی پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ملازمت کے باعث ہم شوگر ملز کی کالونی میں شفٹ ہو گئے تھے۔ اس ایک سال کے عرصہ میں بھی مبارکہ، امی جی سے ملنے کے لئے دو دفعہ گئی۔۔ اسی دوران ابا جی وفات پا گئے۔ شدید صدمے کا اثر زائل ہونے لگا تو سارے عزیز اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے لگے۔ اکبر اور طاہر بھی امی جی سے اجازت لئے بغیر اپنی بیگمات کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے امی سے اتنا کہہ گئے کہ عدت پوری کر کے ہمارے ہاں آجایئے گا۔ مبارکہ جانتی تھی کہ امی جی اس طرح تو کسی بیٹے کے پاس بھی نہیں جائیں گی۔ اس نے مجھے الگ کر کے سارے صورتحال سے آگاہ کر کے کہا میں ایسی حالت میں پھوپھی کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ جا کر بچوں کے سکول چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ بھجوا دیں۔ میں اب پھوپھی کے پاس ہی رہوں گی۔ چنانچہ پھر مبارکہ اور بچے امی جی کے پاس ہی رک گئے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میاں بیوی میں محبت بہت زیادہ ہو تو دونوں کی شباہت یکساں ہو جاتی ہے۔ فیض اور ایلس کی تصویریں دیکھ کر یہ بات سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے

میری اور مبارکہ کی شکلوں میں بھی کچھ ایسا تغیر رونما ہو رہا ہے۔''من تو شدم تو من شدی'' کی حد تک تو محبت ٹھیک تھی لیکن جب اس مقام سے آگے بڑھی تو پھر دونوں کی شکلیں بگڑنے لگیں اور بگڑتے بگڑتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ''تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم''۔۔۔۔۔۔اچھی بھلی شکلیں بگڑ گئیں مگر ہماری محبت کی شدت تو ثابت ہوگئی۔

میں اپنی فکری آزادہ روی کے باعث مبارکہ کے لئے بہت تکلیف کے سامان پیدا کر بیٹھا ۔ مذہبی تعصّب رکھنے والے عزیزوں نے طوفان اٹھالیا۔ مبارکہ دوہرے عذاب میں تھی۔اپنی سوسائٹی کو چھوڑنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا اور مجھ سے علیحدگی کا بھی وہ سوچ نہیں سکتی تھی۔میرا خیال ہے انسان کی مظلومیت بجائے خود ایک طرح کا مقام ولایت ہے۔مبارکہ مظلومیت کی حالت میں تھی۔ محلے کی ایک پردھان عورت نے کہا: مبارکہ کو حیدر سے طلاق لے لینی چاہئے۔۔ چند ماہ کے اندر اسی عورت کی اپنی نو بیاہتا لیڈی ڈاکٹر بیٹی کو طلاق ہوگئی۔ ہمارے ایک ''بزرگ'' نے امریکہ سے دباؤ ڈالا اور میرے ساتھ مبارکہ کے سماجی بائیکاٹ کا حکم صادر کر دیا۔حکم نامے کے ایک ماہ کے اندر ان کے اپنے خاندان میں بیٹے بہو میں پھوٹ پڑ گئی جو بالآخر دونوں میں علیحدگی پر منتج ہوئی۔اسے مکافاتِ عمل کہئے۔نظامِ فطرت کہئے یا مظلوم پر جبر کا انجام۔رہے نام اللہ کا!

مبارکہ صاف دل اور صاف گو عورت ہے۔محبتی بیوی اور بے تکلف ماں ہے۔رضوانہ کو دیکھ کر عام طور پر ناواقف خواتین یہی سمجھتی ہیں کہ مبارکہ کی چھوٹی بہن یا نند ہوگی مگر جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی بڑی بیٹی ہے تو حیران ہوتی ہیں۔ماں بیٹی میں صرف ساڑھے سولہ سال کا فرق ہے جبکہ میرے سب سے چھوٹے بھائی اعجاز اور میری عمر میں انیس سال کا فرق ہے۔(پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے)۔اپنے پانچوں بچوں رضوانہ،شعیب،عثمان، طارق اور درِثمین کے ساتھ مبارکہ نے دوستی کر رکھی ہے۔ماں والی دھونس نہیں جماتی البتہ دوستانہ دھونس ضرور جمالیتی ہے۔

کسی کی شادی ہو۔۔مبارکہ شادی بیاہ کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ جب لڑکی کی رخصتی کا وقت آتا ہے دلہن سے زیادہ اس کے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ میں اس کی اس

رقیق القلبی سے خاصا تنگ تھا۔خدا بھلا کرے ماموں سمیع کی بڑی بیٹی نوشی کا۔۔نوشی کی رخصتی ہونے لگی تو ممانی راشدہ پرسکون تھیں۔چھوٹی بہنیں مطمئن۔مگر ان کی کزن مبارکہ بیگم حسب معمول رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔اتفاق سے میری نظر نوشی کی طرف اٹھ گئی۔دولہا کے ساتھ گھر سے باہر آتے ہوئے بی بی مسکرا رہی تھی۔۔گاڑیاں رخصت ہوتے ہی میں نے مبارکہ بیگم کو پکڑ لیا۔یہ کیا شرافت ہے۔جس کی شادی ہے وہ مسکرا رہی ہے۔اس کی ماں بہنوں کے چہروں پر اطمینان ہے اور آنجناب رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔اللہ اس کا بھلا کرے کہ تب سے اس نے شادی بیاہوں پر رونے دھونے کا سلسلہ فی الحال ترک کر دیا ہے۔(فی الحال اس لئے کہ اپنی بیٹیوں کی شادی پر وہ ساری کسر نکالے گی☆)

مبارکہ کو مشرقی پنجاب سے غائبانہ انسیت ہے۔اس کی ظاہر وجہ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے کئی برس بعد ممانی مجیدہ ہندوستان گئیں تو وہیں مبارکہ کی پیدائش ہوگئی۔ممانی مجیدہ سے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کی زچگی کرانے والی خاتون کا نام پیاری دیوی تھا۔سواسے مشرقی پنجاب سے بھی ایک لگاؤ ہے اور ''پیاری دیوی'' نام بھی بہت پیارا لگتا ہے۔اس انسیت کی بعض لاشعوری وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔مثلاً مبارکہ کے ددھیال ننھیال سب مشرقی پنجاب سے پاکستان آئے تھے اور کئی جانوں کا نذرانہ دے کر پاکستان پہنچ پائے تھے۔ ہوسکتا ہے آباؤ اجداد کی سرزمین سے اسے لاشعوری طور پر محبت ہو۔پھر مبارکہ ذات کے لحاظ سے باجوہ جٹ ہے جو پنجابی جٹوں کی ایک اعلیٰ ذات ہے۔پانچویں چھٹی پشت سے یہ لوگ سکھ تھے۔اب جو مشرقی پنجاب میں سکھوں کی تحریک چل رہی ہے ممکن ہے مبارکہ کے اندر کی چھپی ہوئی سکھنی کو مشرقی پنجاب کی موجودہ حالت کے باعث بھی اس علاقے سے انسیت محسوس ہوتی ہو۔۱۹۸۷ء میں ہم بھارت گئے تو مبارکہ کی شدید خواہش تھی کہ مشرقی پنجاب کے علاقے دیکھے جائیں مگر دہلی میں بعض دوستوں نے سمجھایا کہ وہاں کے حالات بے حد خراب ہیں۔ایک دوست نے کہا ویزہ میں کل لگوا دیتا ہوں مگر آپ لوگوں کو ادھر جانے نہیں دوں گا۔دراصل انہی دنوں میں پنجاب میں ایک بس روک کر اس کے تمام مسافروں کو بغیر کسی تخصیص کے ہلاک کر دیا گیا تھا۔اسی وجہ سے دلی کے دوستوں نے ہمیں مشرقی پنجاب نہیں

جانے دیا اور اس علاقے کو دیکھنے کی مبارکہ کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

میری شاعری کو اس کے پورے پس منظر کے ساتھ جاننے والی واحد قاری مبارکہ ہے۔ اسے علم ہے کہ میری کون سی غزل یا نظم کب کہی گئی اور کیوں کہی گئی۔۔اسے یہ بھی علم ہے کہ میں کس کس کو یہ باور کرا چکا ہوں کہ فلاں غزل درحقیقت آپ کے لئے کہی گئی اور یہ بھی علم ہے کہ اصلاً کس کے لئے کہی گئی۔ میری شاعری سے باہر کے اس سارے کھیل تماشے کو مبارکہ نے مزے لے کر دیکھا ہے۔ میری دوستوں سے اس نے کبھی خار نہیں کھائی، الٹا محبت کی۔

ایک دفعہ میری ایک بہت اچھی دوست نے مبارکہ کی موجودگی میں بتایا کہ ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والے ایک ماہر نے بتایا ہے کہ تمہاری شادی کسی میرڈ Married سے ہوگی۔کوئی اور شاعر ہوتا تو اس کی بیوی نے جو طوفان اٹھایا ہوتا اس کی لہریں اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں تک پہنچتیں مگر مبارکہ نے زوردار قہقہے میں ساری بات اڑادی۔ ایک دفعہ بعض عزیزوں نے اسے سمجھایا کہ مرد کا اتنا اعتبار کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا (گویا تھوڑا بہت شک کرتے رہنا چاہیے) مگر مبارکہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جھلا کر ایک عزیز نے یہاں تک کہہ دیا: اب تمہاری آنکھیں اسی وقت کھلیں گی جب وہ بچوں سے بھرا ٹوکرا لے کر گھر آئے گا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے مبارکہ کے اندر وہی دو سال کی بچی بیٹھی ہے جسے دیکھ کر میں نے کہا تھا اسی کے ساتھ شادی کروں گا۔ معصوم، بھالی بھالی ایسے کبوتر (بلکہ کبوتری) کی طرح جو بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلے اور خود کو محفوظ سمجھ لے۔ مگر نہیں۔۔ مبارکہ نے تو آنکھیں بھی ہمیشہ کھلی رکھی ہیں اور بلیوں کو دیکھ کر بھی خود کو محفوظ سمجھتی رہی ہے۔ قدرت خدا کی۔ ہر خطرے سے محفوظ بھی گزر جاتی رہی ہے۔ ہر چند اس میں خدا کی قدرت کے ساتھ میری شرافت کا بھی دخل ہے۔

ایک دفعہ میں نے مبارکہ سے پوچھا: تمہیں مجھ پر اتنا اعتماد کیوں ہے؟

''اعتماد''؟۔۔مبارکہ نے حیرت سے کہا اور پھر رواں ہوگئی ''تمہارے ساتھ شادی کون کرے گی؟ کس کا دماغ خراب ہے؟ شکر کرو کہ میں مل گئی ہوں اور وہ بھی اس لئے کہ تمہارے ماموں کی بیٹی ہوں''

ان جملوں سے ہمارے درمیان پائی جانے والی (یک طرفہ) بے تکلفی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس سے زیادہ مبارکہ کے بارے میں لکھنے کی جرأت نہیں۔ اس خاکے کا دوسرا حصہ مبارکہ کی وفات کے بعد لکھوں یا میری وفات کے بعد وہ لکھے گی۔

☆☆☆

☆ رضوانہ کی شادی پر ساری کسر نکال دی ہے۔ جزاک اللہ

اُجلے دل والا

(چھوٹا بھائی)

لڑائی جھگڑا تو حیدرؔ نہ تھا مزاج ان کا
وہ گھونٹ زہر کے بس پی کے رہ گئے ہوں گے

وہ پڑھائی میں تھوڑا کمزور تھا۔ رہی سہی کسر کلاس ٹیچر نے پوری کر دی۔ سبق نہیں سنا سکا تو بچے کے مذہبی فرقے کے حوالے سے اس پر تضحیک آمیز طنز کر دیا۔ گھریلو تنگ دستی کے باعث کبھی فیس بروقت ادا نہیں ہو سکی یا کوئی کاپی نہیں خریدی جا سکی تو اس کی سزا یہی ہوتی کہ اسے اس کے فرقے کے نام پر گالی دے دی جاتی۔ ایسے سفاک اور نفرت انگیز تعلیمی ماحول میں اس بچے نے کلاس ٹیچر کی کلاسز مس کرنا شروع کر دیں پھر سکول سے بھی غائب رہنے لگا۔ ایک طرف اسے کلاس میں کلاس ٹیچر کے اذیت ناک جملوں کا خوف تھا تو دوسری طرف اس بات کا ڈر کہ اگر ابا جی کو سکول سے غائب ہونے کا علم ہو گیا تو مرمت ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے کھیلنے کے چند ٹھکانے بنا لئے جہاں وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ گولیاں اور اخروٹ کھیلتا۔ اسکول میں چھٹی کا وقت ہوتا تو گھر آ جاتا۔ تاہم سکول سے مستقل طور پر غیر حاضر نہیں رہتا کہ نام خارج نہ ہونے پائے۔ ایسی صورتحال میں اس نے پتہ نہیں کیسے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا۔ آٹھویں پاس کرتے ہی اس نے والدین سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایسے تعلیمی ماحول میں مزید علم حاصل کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ شاید ایسے پڑھے لکھے معاشرے میں اسے اپنا اَن پڑھ رہنا زیادہ بہتر لگا۔ والدین سے صلاح مشورے کے بعد چودہ سال کے اس

دبلے پتلے سانولے سے لڑکے نے اپنے شہر کو چھوڑ کر کراچی کی راہ لی۔ چھوٹی موٹی مزدوری سے کام کا آغاز کیا۔ ابتدائی ایک مہینہ خالہ کے ہاں قیام کیا۔ جیسے ہی پہلی تنخواہ ملی اس نے اپنی الگ رہائش کا انتظام کر لیا۔ متعصب معاشرے کی سفاکی کا شکار ہونے والا یہ چودہ سالہ لڑکا میرے ماں باپ کا منجھلا بیٹا اور میرا چھوٹا بھائی طاہر ہے۔

کہتے ہیں انسان کے دست و بازو اس کے بھائی ہوتے ہیں۔ ہم پانچ بھائی ہیں۔ پانچوں اپنی اپنی جگہ بے دست و پا۔۔ میں نے پندرہ برس کی عمر میں ملازمت کر لی تھی محض اس خیال سے کہ والدین کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔۔ چنانچہ ابتدائی محدود دائرے میں جتنا ہو سکا والدین کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔ ایک دفعہ ایک بھائی نے (جو اُس وقت پیدا ہوا تھا جب میں نے شوگر ملز کی نوکری شروع کی تھی) آپی سے گفتگو کے دوران میرے ذکر پر بڑے تلخ لہجے میں کہا کہ: ہم پر کسی نے کوئی احسان نہیں کیا۔ ہم نے اپنے ماں باپ کا کھایا ہے۔۔ مجھے اس بات کا پتہ چلا تو بے حد شرمندگی ہوئی۔ میں نے تو احسان جتایا ہی نہیں تھا بس والدین کی خدمت کرنے کی ایک تمنا تھی، قدرت نے ان کے جیتے جی اتنا دیا ہی نہیں کہ ڈھنگ سے ان کی خدمت کر سکتا۔ خیر بات یہ ہو رہی تھی کہ انسان کے دست و بازو اس کے بھائی ہوتے ہیں۔ میرے چار چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک نے کوشش کی کہ میرے بازو کاٹ ڈالے دوسرے نے زور لگایا کہ میرے پیر باندھ دے۔ ڈھیٹ آدمی ہوں اس لیے سخت وار ہونے کے باوجود بچ نکلا ہوں۔ طاہر اور اعجاز دونوں بھائیوں کی مہربانی ہے کہ وہ اس کھیل تماشے میں غیر جانبدار رہے۔ میں ان کی غیر جانبداری کو بھی اپنی حمایت اور خود پر احسان مانتا ہوں۔۔ طاہر کو اس لحاظ سے میں خود سے بڑا سمجھتا ہوں کہ اس نے چودہ سال کی عمر میں ملازمت کر کے میرا کم عمری میں نوکری کرنے کا ریکارڈ توڑ دیا۔

طاہر بیس سال کا ہو چکا تھا لیکن وہ مجھے اس وقت پانچ چھ سال کا بچہ دکھائی دیا۔۔ اس عمر میں ہمارے خانپور کے ماحول میں ریوڑیاں، چنے، ڈرکو، اور میٹھی گولیاں کھانے کی خواہش ہوتی ہے۔ طاہر کو بھی اس عمر میں یہ ساری چیزیں کھانے کی خواہش ہوتی تھی لیکن گھر کی ہولناک غربت یہ خواہش پوری نہیں ہونے دیتی تھی۔۔ اب جو میں نے بیس سالہ طاہر کو دیکھا تو اس کی قمیص کی سائڈ

والی جیب میں ریوڑیاں، چنے اور ٹافیاں بھری ہوئی تھیں۔ گویا بیس سال کی عمر میں وہ اپنے اندر کے پانچ چھ سالہ بچے کی معصوم خواہشیں پوری کر رہا تھا۔

طاہر لوہے کی مشینوں پر کام کرتا ہے۔ان مشینوں کی سختی اس کے ہاتھوں میں بھی منتقل ہوئی لیکن جس طرح لوہے کی سخت مشینیں بڑا نفیس قسم کا ریشم کا کپڑا تیار کر دیتی ہیں اسی طرح مجھے سخت ہاتھوں والا طاہر ہمیشہ ایسا نوجوان دکھائی دیا ہے جس کا دل ریشم کی طرح نرم اور ملائم ہے۔ اس ریشم جیسے دل کا کمال تھا کہ اسے نسرین نامی ایک گوری چٹی لڑکی دکھائی دی اور اس نے طاہر کے سانولے رنگ کی تلافی کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ وہ لڑکی کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی اور ہماری بھابھی بن گئی۔ شادی کی تقریب کے معاملے میں اتفاق سے تھوڑی سی گڑ بڑ ہو گئی۔ امی جی اس انتظار میں تھیں کہ بارات اپنے گھر سے لے کر چلیں گے۔ اُدھر ماموں صادق نے نیک نیتی سے خیال کیا کہ کراچی سے ہی بارات لے جا کر شادی کر لیں کچھ رابطے میں کمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امی جی شادی میں شریک نہ ہو سکیں۔ ابا جی اور میں بھاگم بھاگ پہنچے۔ شادی کے موقعہ پر ایک عزیز طنزیہ قسم کے جملے بول رہے تھے۔ شادی ہوتے ہی طاہر اپنی دلہن کو لے کر امی جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ امی جی اتنے میں ہی خوش ہو گئیں۔ البتہ جب انہیں مذکورہ عزیز کے طنزیہ جملوں کا علم ہوا تو کچھ رنجیدہ سی ہو گئیں۔ پھر غم کی حالت میں ہی اتنا کہہ دیا کہ خدا اسے بھی اس کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی توفیق نہ دے۔ قدرت خدا کی بعد میں اُسی عزیز کے بیٹے کی شادی پر صورتحال ایسی پیچیدہ ہو گئی کہ وہ اپنی عزت کا سوال بنا کر اپنے ہی بیٹے کی شادی میں شرکت سے محروم رہے۔

امی جی کا مبارکہ سے جو تعلق تھا۔ اس کی کوئی مثال لانا تو ممکن نہیں البتہ باقی بہوؤں میں امی جی کو طاہر کی بیوی نسرین زیادہ پسند تھی۔ خصوصاً امی جی اپنی زندگی کے آخری ایام میں کراچی کا سفر کر کے واپس آئیں تو طاہر اور نسرین سے بے حد خوش تھیں۔ طاہر کے تین پیارے پیارے سے بچے ہیں۔ نازیہ، دانش اور کرن۔۔ دانش کی پیدائش کے معاً بعد طاہر اور اس کے سسرال کے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ صورتحال تشویش ناک حد تک پیچیدہ تھی۔ مبارکہ نے چند دنوں کے دانش کو یوں سینے سے لگایا جیسے اسی کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ تب میں نے آپی اور اکبر کے ساتھ مل

کر مداخلت کی۔ فیصلہ بھابھی نسرین پر چھوڑ دیا گیا تو پیچیدہ صورتحال کے سارے پیچ خود بخود کھلتے گئے۔ سیتا جی ساری دنیا کو چھوڑ کر اپنے رام جی کے پاس آ گئیں۔ تب سے اب تک دونوں کے درمیان پھر کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوئی بلکہ پہلی غلط فہمی نے میاں بیوی کی محبت کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔۔ اس جھگڑے کو نمٹانے میں اکبر نے خاصی دانشمندی اور مہارت دکھائی۔

اکبر کی دانشمندی کے اعتراف کے ساتھ اس کی دو اور دانشمندانہ باتیں بھی یاد آ گئیں۔ میں باری باری سارے بھائی بہنوں کو یورپ میں آباد کرنے کا متمنی تھا۔ اکبر نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کہنے لگا بھائی جان! اپنے گھر بار کی فکر کریں۔ پہلے خود آباد ہوں۔ پھر وہاں سے سب کو پاکستانی کرنسی میں عیدیاں اور امداد بھیج کر اپنا زیرِ احسان رکھیں۔ لاکھوں خرچ کر کے انہیں اپنے برابر لائیں گے تو وہ آپ کے ہی گلے پکڑیں گے۔ ایک بہن کو اس کے سارے بچوں سمیت مبارکہ کے ساتھ بھیجنا تھا مگر وہ صبر کے ساتھ انتظار بھی نہ کر سکی۔ فروری میں جھگڑا کر کے چلی گئی جبکہ مئی کے شروع میں مبارکہ کا کام بن گیا۔ تب مجھے اکبر کی دانشمندانہ بات شدت سے یاد آئی۔ ایک رشتہ دار کی بیٹیوں نے محلے میں ''تصوف کے مسائل'' پیدا کر رکھے تھے۔ ہم نے نیکی کے جذبہ کے تحت لڑکیوں کی ماں کو حالات سے احسن طور پر باخبر کرنے کی کوشش کی۔ وہ رشتہ دار بی بی الٹا لڑنے مرنے پر تل گئی۔ تب اکبر نے بتایا کہ مجھے ان لڑکیوں کے حالات کا علم ہے۔ ان کے خاندان کی فلاں فلاں بی بیوں کے احوال بھی معلوم ہیں۔ مگر سمجھانے کی ضرورت نہیں، سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھتے بھی رہئے اور انجان بھی بنے رہیے۔ اسی میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اکبر کی یہ بات بھی ٹھیک تھی۔ اس وقت ہماری ان رشتہ داروں سے علیک سلیک بھی نہیں ہے جبکہ اکبر کے گہرے مراسم ہیں۔

اکبر کی دانشمندی جملہ معترضہ کے طور پر بیچ میں آن ٹپکی، بات ہو رہی تھی طاہر کی۔ سماجی حالات کی بے رحمی نے طاہر کو اچھی تعلیم حاصل نہیں کرنے دی لیکن اپنے بچوں کے تعلیمی معاملات کی طاہر خود نگرانی کرتا ہے۔ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلا کر گویا وہ خود تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اپنی زندگی میں طاہر سیدھا سادہ اور دیہاتی مزاج کا جوان ہے۔ کراچی شہر کی روشنیاں اس کی آنکھوں

میں چکا چوند پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔زندگی کو اس نے بِتایا نہیں بلکہ بھوگا ہے۔کئی بار ایسے وقت آئے کہ اسے فاقے کرنے پڑے،کبھی مسجد میں تو کبھی کسی دوکان کے تھڑے پر رات بسر کرنا پڑی۔اس نے سارے دکھ خاموشی سے جھیلے۔محنت مشقت کر کے حالات کا مقابلہ کیا۔آج وہ کراچی جیسے شہر میں اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ عزت کی روٹی کھا رہا ہے۔عام طور پر تلخ حالات کا مقابلہ کرتے کرتے انسان کے لہجے میں کڑواہٹ آجاتی ہے۔مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہوجاتا ہے۔طاہر کا کمال ہے کہ اس نے تلخ ترین حالات سے گزر کر بھی اپنے باطن کی مٹھاس قائم رکھی ہے اور اپنے لہجے میں مزید نرماہٹ پیدا کر لی ہے۔

اپنے باپ کے بیٹے اور ماں جائے اس اجلے دل والے چھوٹے بھائی کو میں محبت کے ساتھ سیلوٹ کرتا ہوں!

☆☆☆

زندگی کا تسلسل

(پانچوں بچے)

میں نے اپنی دیانت کی سب دولتیں اپنی اولاد کو دیں فقط
اور باقی عزیزوں کو صرف اور صرف اپنے حصے کا گھر لکھ دیا

بعض والدین کی اولاد نالائق ہوتی ہے۔میں وہ خوش قسمت ہوں جو پانچ اچھے بچوں کا نالائق باپ ہوں۔میرے بچوں کی عالی ظرفی ہے کہ انہوں نے میری تمام تر نالائقیوں کے باوجود مجھے باپ کا پورا احترام دے رکھا ہے۔یہ بات میں نے مزاح پیدا کرنے کے لئے نہیں لکھی بلکہ واقعتاً ایک حقیقت بیان کی ہے۔زندگی بھر میں ادب اور کچھ اور فضول سے چکروں میں ایسا الجھا رہا کہ بچوں کی پرورش کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ویسے اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ مبارکہ نے بچوں کو بخوبی سنبھال رکھا تھا۔پھر ابا جی اور امی جی بھی زندہ تھے اس لئے مجھے بچوں کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔

رضوانہ میری پہلی بیٹی ہے۔ابھی میں خود کو بچہ ہی سمجھتا تھا کہ باپ بن گیا۔باپ کہلانے کی خوشی میں رضوانہ کی پیدائش پر میں نے اسے گود میں اٹھایا اور پیار سے اس کا منہ چومنے لگا۔اس پر ایک بزرگ نے مجھے ٹوکا کہ بیٹیوں کی پیدائش پر ایسی خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔چونکہ مجھے ایسے رواجوں کی کچھ خبر نہ تھی اس لئے ان بزرگ کے احترام کو تو ملحوظ رکھا لیکن رضوانہ کو اسی طرح پیار کرتا رہا۔اس کے لئے کئی کھلونے خریدے لیکن اس کے کھیلنے سے پہلے ہی وہ کھلونے میرے چھوٹے بھائیوں چنّو،منّو کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جاتے رہے۔

رضوانہ تھوڑی بڑی ہوئی تو اس کے لئے ایک ٹرائیسکل خریدی لیکن اس سے پہلے کہ رضوانہ اسے چلانا سیکھتی، یہ ٹرائیسکل بھی چنے، منے کے ہاتھوں اپنے انجام تک جا پہنچی۔ رضوانہ نے اس نقصان کی تلافی یوں کی کہ بڑی ہو کر بائیسکل چلانا سیکھی۔ پاکستان میں بھی اور جرمنی آ کر بھی، سکول جانا ہوتا یا کوئی چھوٹی موٹی شاپنگ کرنی ہوتی وہ اپنے بچپن کا سائیکلنگ کا شوق پورا کر لیتی تھی۔ اب تو خیر سے کار ڈرائیونگ بھی سیکھ چکی ہے۔

میں مار پیٹ کو اچھا نہیں سمجھتا لیکن ناتجربہ کار باپ ہونے کے زمانے میں بچوں کے ساتھ تھوڑی سی مار دھاڑ (مار کم اور دھاڑ زیادہ) ضرور کی تھی۔ بیٹوں کی مرمت کرنے میں تو خیر کوئی خاص حرج نہیں لیکن بیٹی کو مارنا زیادتی ہے۔ میں نے رضوانہ کو اس کے بچپن میں تین دفعہ مارا۔ اب سوچتا ہوں تو دو باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ رضوانہ میں مجھے آپی کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ آپی پہلوٹھی کی تھی، رضوانہ بھی پہلوٹھی کی ہے۔ بچپن میں شرارتیں کرنے پر مجھے خاصی مار پڑتی تھی مگر قصور ثابت ہو جانے کے باوجود آپی کو ایک تھپڑ یا چپت سے زیادہ سزا نہیں ملتی تھی۔ آپی سے محبت کے باوجود ہو سکتا ہے لاشعور میں غصے کی کوئی لہر دبی ہوئی ہو، پھر جب رضوانہ میں مجھے آپی کی جھلک نظر آئی تو رضوانہ کو پیٹ کر میں نے آپی کا غصہ اتار لیا۔ دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بچپن میں اکثر یہ خواہش ہوا کرتی تھی کہ جلدی سے بڑا ہو کر ابو بن جاؤں اور پھر اپنے بچوں کی پٹائی کیا کروں۔ سو اس خواہش کی زد میں بھی پہلے رضوانہ ہی آئی۔ اب جو اُن تین پٹائیوں کو یاد کرتا ہوں تو اس کے سر اور کندھوں پر پڑے ہوئے سارے تھپڑ مجھے اپنے دل پر پڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ رضوانہ کو تو شاید وہ مار یاد بھی نہ ہو مگر میں ابھی تک اپنے دل پر وہ مار سہہ رہا ہوں۔

سب سے چھوٹی بیٹی درِثمین (مانو) رضوانہ سے گیارہ سال چھوٹی ہے۔ ایک دفعہ مانو اپنی موج میں محمد رفیع کا ایک گیت توتلی زبان میں گا رہی تھی۔ بابل تی دعائیں لیتی جا، جا تجھ تو سُکھی سنسار ملے۔۔ رضوانہ نے مانو سے پوچھا: بابل کا مطلب جانتی ہو؟۔۔ مانو نے کہا: نہیں۔۔ اس پر رضوانہ نے اسے بتایا کہ بابل، ابو کو کہتے ہیں اور گیت کا مطلب یہ ہے کہ باپ اپنی بیٹی کی شادی کر کے اسے رخصت کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی کہہ دیا کہ جب تمہاری شادی ہوگی تو تمہیں

رخصت کرتے وقت ابو یہی کسیٹ لگائیں گے۔ یہ بات سن کر مانو نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ میں نے اور مبارکہ نے اسے سمجھایا کہ بیٹیاں تو ہمیشہ دوسرے گھروں میں بیاہی جاتی ہیں۔ یہ سن اس نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ میں نے امی ابو کو نہیں چھوڑنا۔ آخر ہم نے کہا اچھا بابا جیسا تم چاہو گی ویسا کریں گے، بس اب چپ کر جاؤ۔ بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا تو رضوانہ کہنے لگی: ''چندری ماری! اتنا تو تم اپنی شادی پر بھی نہیں روؤ گی جتنا اب رو رہی ہو''۔

امی ابو نے جس طرح ہمیں مروّجہ اخلاقیات کی خوفناک حد تک تلقین کی تھی کچھ ایسا ہی رضوانہ کے ذہن میں بھی بٹھا دیا تھا۔ ''دیانت داری'' کا ایک دلچسپ واقعہ رضوانہ سے سرزد ہوا۔ رضوانہ اپنے بھائی عثمان کے ساتھ جا رہی تھی۔ رستے میں عثمان کو کرنسی نوٹوں والا ایک ہار ملا۔ اس نے اٹھا لیا۔ رضوانہ نے ایمانداری کے جذبے سے سرشار ہونے کے باعث عثمان کو سختی سے کہا کہ یہ ہار ہمارا نہیں ہے اس لئے اسے فوراً پھینک دو۔ عثمان چھوٹا ہونے کے باعث بڑی بہن کی بات ماننے پر مجبور تھا چنانچہ اس نے ہار پھینک دیا۔ مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے بچوں کو سمجھایا کہ اصل دیانت داری کیا ہوتی ہے۔ رضوانہ کو اپنی حماقت کا احساس ہو چکا تھا۔ جلد ہی اس نے پہلی حماقت کی تلافی کر دی۔ اس بار بھی عثمان اس کے ساتھ تھا۔ رضوانہ کو چیونگم کا ایک پیکٹ سر راہ ملا جو اس نے اٹھا لیا۔ اب عثمان نے اسے کہا کہ اسے پھینک دو۔ لیکن میں نے بچوں کو اصل دیانتداری کا جو مفہوم بتایا تھا وہ رضوانہ کو یاد تھا اور وہ اپنی پہلی حماقت کی تلافی بھی کرنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے چیونگم نہیں پھینکی۔ عثمان کو آج تک اپنے کرنسی نوٹوں کے زیاں کا غم ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دو تین سو روپوں والا وہ ہار ہمارے پاس ہوتا تو ہم بے حد امیر ہو گئے ہوتے۔

جب میں ابھی پاکستان میں تھا، رضوانہ نے مجھے جرمنی سے خط لکھا کہ میں نے مختلف مضامین میں اتنے اچھے نمبر لئے ہیں۔ ساتھ ہی لکھا ہمارے انگلش کے ٹیچر کہتے ہیں کہ تمہاری انگریزی اتنی اچھی ہے کہ اندازہ نہیں ہوتا تم برصغیر کے کسی ملک سے تعلق رکھتی ہو۔ اس پر میں نے اسے لکھا کہ آپ کے ٹیچر کے ریمارکس سے یہ یقین کرنے کی بجائے کہ آپ کی انگلش واقعی اچھی ہو گئی ہے، مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے انگلش کے ٹیچر کی اپنی انگلش خاصی کمزور ہے۔ یوں

بھی جرمنوں جیسی انگریزی تو میں خود بھی بول لیتا ہوں جسے انگریزی آتی ہی نہیں۔

رضوانہ،شعیب اور دُرِ ثمین کی زبان بچپن سے ہی صاف تھی، تتلاہٹ نہیں تھی۔عثمان 'ش' کو 'س' بولتا تھا۔اس نے بھی اس کمی کو جلد کور کر لیا۔ایک دن باہر سے کھیل کر آیا تو کہنے لگا میں اب ش بول سکتا ہوں۔ہم نے کہا کوئی لفظ بولو۔اس پر اس نے کہا ''شبنم'' (تب فلمی اداکارہ شبنم خاصی مشہور تھیں) ٹیپو (طارق محمود) کاف کو تاف اور گاف کو داف بولتا تھا۔چار سال کی عمر میں اس نے مجھے بتایا کہ مجھے یہ گانا بہت اچھا لگتا ہے: تبھی نہ تبھی، تہیں نہ تہیں، توئی نہ توئی تو آئے دا (کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی تو آئے گا)

مانو (دُرِ ثمین) ٹیپو کے توتلے پن کا مذاق اڑاتی۔اس کی نقل اتارتے اتارتے خود توتلی ہوگئی۔شروع میں تو ہم اس کے توتلے پن کو اس کا مذاق سمجھتے رہے لیکن جب یہ اس کی عادت بن گئی تب پریشانی ہوئی۔گیت گانے کا مانو کو بہت شوق ہے۔اپنی موج میں گاتے ہوئے اس نے کئی گیتوں کا حلیہ درست کر کے رکھ دیا تھا: تٹ تٹ باجرہ میں توٹھے اتے پانی آں (کٹ کٹ باجرہ میں کوٹھے اتے پانی آں)

تبھی تبھی مرے دل میں تھیال آتا ہے (کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے)

کبھی کسی بھائی یا بہن سے تنگ آتی تو بڑا ایکشن بنا کر ماتھے پر ہاتھ مارتی اور کہتی:

''اومائی داڈ'' (اومائی گاڈ)۔

اب مانو کا توتلا پن ختم ہو چکا ہے لیکن فکرمندی کے باوجود اس کی توتلی زبان ایک عرصہ تک ہم سب کی دلچسپی اور تفریح کا سامان بنی رہی۔رضوانہ سے سب سے زیادہ محبت بھی اسی کو ہے اور سب سے زیادہ جھگڑا بھی اسی کے ساتھ کرتی ہے۔ایک دفعہ میں نے دیکھا دونوں میں کوئی اختلاف تھا۔رضوانہ نے اس کے سر پر ایک چپت رسید کر دی۔مانو نے پہلے تو بڑی بیبیوں کی طرح بے حد سنجیدگی سے رضوانہ کو دیکھا اور پھر اپنے سے گیارہ سال بڑی بہن کو ڈانٹتے ہوئی بولی ''شرم نہیں آتی۔۔بڑی باجی سے بدتمیزی کرتی ہو''۔یہ ڈرامائی ڈائیلاگ سن کر رضوانہ نے اپنی پانچ سالہ ''بڑی باجی'' کو پیار سے گود میں اٹھا لیا۔

مانو خواب دیکھنے سے زیادہ خواب سوچتی ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ سو کر اٹھی اور کہنے لگی ابو۔ابو میں نے ایک خواب سوچا ہے۔ اس پر سارے بہن بھائی اس کا مذاق اڑاتے لیکن میں پوری سنجیدگی سے اس کا خواب سنتا۔اس کے دیکھے ہوئے یا سوچے ہوئے خوابوں میں مجھے ننھی منی کہانیاں دکھائی دیتی ہیں۔یہ ننھی منی کہانیاں مانو کے ساتھ کھیلتی رہتی ہیں اور لگتا ہے کہ کھیلتے کھیلتے مانو کے ساتھ ہی بڑی ہوتی جائیں گی۔جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں میرے باقی سارے بچے سائنٹیفک اور حقیقت پسند قسم کے ذہن رکھتے ہیں۔میرا ادبی ورثہ شاید مانو سنبھالے گی۔مانو میں مستقبل کی ادیبہ کی جھلکی مجھے کئی بار دکھائی دی ہے میں نے اباجی کا خاکہ لکھا تو پانچوں بچوں اور مبارکہ کو بٹھا کر سنایا۔سب نے اسے پسند کیا۔بعد میں جتنے عزیزوں کے خاکے لکھے سب سے پہلے پانچوں بچوں اور مبارکہ کو سنائے۔باباجی کا خاکہ سب نے پسند کیا لیکن مانو نے فوراً کہا: ہائے ابو! آپ نے باباجی کا وہ نور جہاں کے گانے والا واقعہ تو لکھا ہی نہیں۔تب مجھے مانو میں مستقبل کی ادیبہ کی جھلک پہلی بار دکھائی دی۔اسی دن سارا خاکہ دوبارہ لکھا اور اس میں مانو کے یاد کرائے گئے واقعہ کا اضافہ کیا اور پھر اسے مانو سے OK! کرایا۔

ایبٹ آباد کی ملازمت کے دوران میں سکول کی لائبریری سے ٹیپو اور مانو کے لئے بچوں کی کہانیاں لے آیا کرتا تھا۔آٹھ دس کہانیاں ایک ساتھ لے آتا بعد میں وہ کہانیاں واپس کر کے اور کہانیاں لے آتا۔ایک بار مانو میرے پاس آئی اور کہنے لگی: ابو! آپ کو لیلیٰ مجنوں کی کہانی کا پتہ ہے؟۔۔میرے کان کھڑے ہو گئے۔سات سال کی بچی اور لیلیٰ مجنوں کی کہانی۔۔یا اللہ خیر!۔۔ میں نے ملائمت سے پوچھا بیٹا! آپ نے یہ نام کس سے سنے ہیں؟ جواب ملا کہ کل آپ جو کہانیاں لائے تھے ان میں یہ کہانی تھی۔میں نے کہانیاں چیک کیں تو واقعی ان میں سولہ صفحات کی ایک چھوٹی سی کہانی موجود تھی۔اب مانو نے مجھے بتانا شروع کیا کہ یہ کہانی بہت اچھی ہے۔مجنوں کی امی نے اسے بھیجا کہ لیلیٰ کے گھر سے گھی لے آؤ۔لیلیٰ کی امی نے لیلیٰ سے کہا کہ مجنوں کو گھی دے دو۔لیلیٰ نے کنستر اٹھا کر گھی انڈیلنا شروع کیا تو لیلیٰ اور مجنوں دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور کنستر کا سارا گھی زمین پر گر کر ضائع ہو گیا۔اس پر لیلیٰ کی امی نے مجنوں اور لیلیٰ کو

ڈانٹا تو مجنوں ڈر کے مارے جنگل کی طرف بھاگ گیا۔لیلیٰ کی امی نے ٹھیک ہی تو ڈانٹا تھا۔اتنا سارا گھی گرا کر کتنا نقصان کر دیا تھا۔کہانی کے اس بیچ پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔پھر مانو کہانی سناتی رہی مگر میں اس وقت چونکا جب اس نے کہا کہ آخر میں لیلیٰ اور مجنوں مر کر دونوں ایک ہی قبر میں بند ہو گئے اور پھر وہاں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

ایک بار گھر میں بات ہو رہی تھی کہ ہاشم اور اُمیہ☆ جڑواں بھائی تھے۔پیدائش کے وقت دونوں کی پیٹھ آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔جنہیں تلوار سے آپریشن کر کے الگ کیا گیا۔سو ہاشم اور امیہ کی نسلوں میں بھی دیر تک تلوار چلتی رہی۔اس دوران میرے دو چھوٹے بھائی اعجاز اور نوید باہر سے گھر میں داخل ہوئے بچپن میں اعجاز کو چتّا اور نوید کو منّا کہتے تھے۔دونوں چاچوں کو ایک ساتھ دیکھ کر مانو نے بے ساختہ کہا: چُتّی مُنّی چُتّی مُنّی ۔۔۔دو بھرانواں دی اِکو پُنی (پنجابی میں بچے کی پیٹھ کو پُنی بھی کہتے ہیں)۔بس ایسے ہی واقعات سے میرا قیاس ہے کہ درِّ ثمین (مانو) مستقبل میں ادیبہ بنے گی۔واللہ اعلم

رضوانہ کے بعد پہلا بیٹا شعیب (زلفی) تقریباً سوا دو سال کے وقفے سے پیدا ہوا۔شعیب سے ٹھیک ایک سال اور آٹھ دن کے بعد عثمان پیدا ہوا۔عثمان کی جلد بازی کے باعث شعیب نے ماں کا دودھ بہت کم پیا۔اس کا اثر اس کی صحت پر پڑا۔تاہم اب اس نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر لیا ہے۔عثمان کے بعد لمبا وقفہ دینا پڑا کیونکہ شعیب کے علاوہ خود مبارکہ کی صحت بھی خراب ہو رہی تھی۔ساڑھے چھ سال کے بعد طارق (ٹیپو) پیدا ہوا اور اس سے ایک سال چار ماہ کے بعد مانو پیدا ہوئی۔

میں نے شروع میں بحیثیت باپ اپنی نالائقی کا اعتراف کیا ہے۔شعیب کے معاملے میں ایک بار یہ نالائقی حد سے گزر گئی۔ میرے بھائی اکبر کی شادی تھی۔ شعیب تقریباً چھ سال کا تھا۔اسے اکبر کا شہ بالا بنایا گیا۔کراچی سے شادی کر کے واپس آئے۔خانپور ریلوے اسٹیشن پر ساری بارات اتر آئی۔اسٹیشن سے اتر کر تانگوں پر آ بیٹھے۔اچانک مبارکہ چلائی زلفی کہاں ہے؟ دراصل شعیب گاڑی میں سویا رہ گیا تھا۔گاڑی نے آخری وسل دے کر رینگنا شروع کر دیا تھا۔

چھوٹے بھائی طاہر نے دوڑ لگائی۔چلتی گاڑی میں چھلانگ لگا کر سوار ہوا،زنجیر کھینچی۔گاڑی رُک گئی۔شعیب بدستور برتھ پر سویا ہوا تھا۔طاہر اسے سوئے ہوئے کو اٹھا لایا۔اب بھی کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو اپنی نالائقی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔اگر گاڑی نکل گئی ہوتی تو کیا ہوتا.....!

شعیب پڑھائی میں تیز ہے جبکہ عثمان جسمانی طور پر تیز ہے۔ایک بار طاہر نے اپنے بھتیجے عثمان سے کہا کہ اگر شعیب اور رضوانہ دونوں کو ہرا دو تو تمہیں دو قلفیاں کھلاؤں گا۔کھانے پینے کی چیزیں تو ویسے بھی عثمان کے اندر ایک نئی روح پھونک دیتی ہیں۔اس نے بڑی بہن اور بڑے بھائی کا اکیلے مقابلہ کیا۔جب بھی دبنے لگتا قلفیوں کے ذائقے کا احساس اس میں طاقت بھر دیتا۔ آخر اس نے دونوں کو ہرا کر اپنے چچا سے دو قلفیاں کھائیں۔ چونکہ شعیب ذہنی طور پر اور عثمان جسمانی طور پر تیز ہے اس لئے میں نے کئی بار من ہی من میں خواہش کی ہے کہ دونوں زندگی میں ایک ساتھ مل کر چلیں۔میرا خیال ہے اس طرح دونوں زندگی کی کئی منزلیں آسانی سے سر کر لیں گے اور باقی بھائی بہنوں کا بھی خیال رکھ سکیں گے لیکن اگر دونوں نے الگ الگ رستے اختیار کر لئے تو شاید دونوں کو زندگی کی مشکلات سے نمٹنے میں قدرے وقت کا سامنا کرنا پڑے۔ دونوں زندگی میں کس طرح ایک ساتھ مل کر چلیں،اس کا کوئی واضح نقشہ میرے ذہن میں نہیں آتا۔ویسے ایک ساتھ مل کر چلنے سے میری مراد جائنٹ فیملی سسٹم ہرگز نہیں ہے۔

رضوانہ،شعیب اور مانو اسکول میں پڑھنے کے لئے شوق سے داخل ہوئے تھے۔ٹیپو بھی مانو کے ساتھ کی وجہ سے ہنسی خوشی چلا جاتا تھا۔البتہ کبھی بیماری کی وجہ سے مانو سکول نہیں گئی تو ٹیپو اکیلا اسکول جانے سے انکار کر دیتا۔صرف عثمان پہلے پہل سکول جانے سے گھبراتا تھا۔روتے ہوئے سکول جاتا اور وہاں بھی وقفے وقفے سے روتا رہتا۔ایک دن سکول سے آیا تو سلام کرنے کے بجائے اس نے دروازے سے ہی خوشی سے پکار کر کہا: آج میں سکول میں رویا بھی نہیں۔۔ بس پھر اس کے بعد تعلیم کے ساتھ اس کا تعلق جڑتا چلا گیا۔میرے بچے میری شاعری میں بھی آئے ہیں۔''پھاگن کی سفاک ہوا'' اور ''نصف سلور جوبلی'' دونوں نظموں میں میرے پانچوں بچے موجود ہیں۔ایک ماہیے میں دونوں بیٹیاں آئی ہیں:

مِری چڑیوں کی جوڑی ہے
اک پہلوٹھی کی
اک پیٹ کھروڑی ہے

میرا ایک ماہیا تھا:

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹے میں
مری گزری جوانی ہے

اس پر عثمان نے پوچھا اس میں کس بیٹے کا ذکر ہے؟۔۔میں نے کہا اصولاً تو بڑا بیٹا ولی عہد ہوتا ہے اس لئے شعیب ہی ہونا چاہئے۔عثمان نے تحریک استحقاق پیش کرتے ہوئے کہا: آپ تو جمہوری نظام کے مدّاح ہیں۔ بادشاہت اور کسی بھی طرح کی آمریّت کے خلاف ہیں اس لئے یہ ولی عہد کا شاہانہ خیال غور طلب ہے۔عثمان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے اور اپنے موقف کو مستحکم کرتے ہوئے کہا کہ ویسے میں بھی جوان ہو چکا ہوں۔ چنانچہ مجھے اس ماہیے میں تبدیلی کر کے جمع کا صیغہ لانا پڑا:

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
مری گزری جوانی ہے

اس طرح اب پانچ چھ سال کے بعد ٹیپو کو بھی شکایت کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔
ماہیے میں ترمیم کرا لینے کے بعد عثمان نے پھر میری ایک غزل کا شعر بھی ایسی ہی ترمیم کے لئے پیش کر دیا۔

کاروبارِ عشق سے مل جائیں گی پھر فرصتیں ۔۔۔ چند برسوں تک مرا بیٹا جواں ہونے کو ہے

یہاں جمع کا صیغہ لانے کی صورت میں ردیف میں گڑبڑ ہوتی تھی اس لئے میں نے اسے سمجھایا کہ اس شعر میں تیکنیکی وجوہ کی بنا پر تبدیلی کرنا ممکن نہیں البتہ آپ تینوں بیٹے اسے یکساں

طور پر اپنے اپنے لئے سمجھ لیں لیکن اپنا اپنا کاروبار ایک دوسرے سے الگ رکھیں۔ یہ شعر میں نے شعیب اور عثمان کے جوان ہونے سے بہت پہلے کہا تھا لیکن اب دونوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے ہیں۔تو مجھے ایک لطیفہ شدت سے یاد آنے لگا ہے۔

ایک صاحب اپنے دوست سے شکایت کر رہے تھے کہ میرا بیٹا پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دے رہا۔ زیادہ تر یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔کبھی یونیورسٹی کے لان میں، کبھی کنٹین میں، حتیٰ کہ یونیورسٹی سے باہر بھی۔اگر مجھے علم ہوتا کہ یونیورسٹی میں یہی کچھ ہوتا ہے تو اسے دوکان پر بٹھا کر بزنس میں لگا دیتا اور خود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا۔

شعیب اور عثمان دونوں کو کرکٹ کھیلنے اور گیت گانے کا شوق ہے۔شعیب کی گیم بہت اچھی ہے میرے کالج کے طلبہ نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ سر! آپ کا بیٹا شعیب تو کرکٹ کا زبردست کھلاڑی ہے لیکن عثمان نے اس کی گیم کو کبھی اچھا تسلیم نہیں کیا۔اسی طرح عثمان نسبتاً گیت بہت اچھے گا لیتا ہے لیکن شعیب نے اس کی آواز کا ہمیشہ مذاق اڑایا ہے۔عثمان کی گلوکاری سے یاد آیا کہ رفیع، لتا، مکیش، مہدی حسن، نور جہاں، آشا، نسیم بیگم، مالا، سمن کلیان پورا اور کشور کمار جیسے مقبول گلوکار تو ہر خاص و عام کی پسند ہیں۔عثمان کو بھی یہ سارے گلوکار پسند ہیں لیکن اس کے پسندیدہ گلوکاروں میں سہگل، سی ایچ آتما، ہیمنت کمار، طلعت محمود، گیتادت اور مناڈے زیادہ اہم ہیں اور اس کے پاس ان سب کے گیتوں کی بہترین کیسٹس موجود ہیں۔ایک بار کیسٹ پلیئر پر شعیب کا کوئی پسندیدہ گانا لگا ہوا تھا۔ عثمان کی طبیعت جولہرائی تو اس نے گلوکار کے ساتھ سُر ملانا شروع کر دیا مگر شعیب نے اسے براہِ راست روکنے کی بجائے احتجاج کا انوکھا طریقہ نکالا۔گانے کی دھن کے مطابق سینہ کوبی شروع کر دی۔

ٹیپو کو اللہ میاں کو دیکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔اس کے اس شوق کا ایک واقعہ امی جی والے خاکے میں آچکا ہے جس سے اس کے تجسّس اور تگ و دو کا اندازہ ہوتا ہے۔ٹیپو کے ایک اور ایکشن نے میری ایک پرانی الجھن دور کر دی تھی۔اباجی کو یوں تو میرے پانچوں بچوں سے بے حد محبت تھی تاہم ٹیپو اور مانو چونکہ سب سے چھوٹے تھے اس لئے ان دونوں سے کچھ زیادہ ہی پیار کرتے تھے۔

نتیجتاً وہ محبت ان بچوں میں بھی ظاہر ہوئی۔ اباجی کی وفات پر ٹیپو پریشان تھا کہ دادا ابو جاگتے کیوں نہیں؟۔ اسے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب نہیں جاگیں گے کیونکہ اللہ میاں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔ ٹیپو نے غصے سے کہا میں اللہ میاں کو ماردوں گا۔ تب چار سال کے اس بچے کو مزید سمجھانا پڑا کہ اللہ میاں کے بارے میں ایسی بات نہیں کہتے کیونکہ وہ بہت بڑا ہے۔ ٹیپو کے نزدیک تو سارے خاندان میں دادا ابو ہی سب سے بڑے تھے چنانچہ اس نے پوچھا کیا اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں؟ اس پر اسے یقین دلانا پڑا کہ اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں اور ہر کسی سے بڑے ہیں۔ کوئی زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا ہوسکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ میاں کتنا بڑا ہے؟ یہ جاننے کے لئے ٹیپو نے اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں جس حد تک پیچھے لے جاسکتا تھا، لے جاکر پوچھا: کیا اللہ میاں اتنے بڑے ہیں؟۔۔ بس اسی لمحے میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے خدا کے بارے میں عقائد اور تصورات مجھ پر آئینہ ہوگئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ سارے مذہبی لوگ ننھے منے معصوم بچوں کی طرح اپنی اپنی بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔ جس کی بانہیں جہاں تک جاسکی ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو بڑا سمجھ رکھا ہے کیونکہ اس سے زیادہ بڑائی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی۔ تاہم اس سے مجھے تمام مذاہب کی خدا کے معاملے میں سچی جستجو اور محبت کا احساس ضرور ہوا۔ یہ الگ بات کہ اس کی ہستی کسی بھی عقیدے اور تصور سے بڑھ کر ہے۔

نام اور روپ سے جو بالا ہے   کس قیامت کے نقش والا ہے

وہ تو ایک مقدس بھید ہے۔ اس کی جستجو میں جتنا سفر کرلیں اس سفر کی لذت ہی اس کا اجر ہے لیکن اس سفر کا کوئی اختتام نہیں۔ بس کوئی جتنا سفر کرکے لذت کشید کرسکتا ہے کرلے۔۔ مذہب میں خدا کے نام پر نفرت پھیلانے کا کام تو تنظیمی قسم کے ادارے کرتے ہیں۔ جنہوں نے مذہب کو بندے اور خدا کا معاملہ سمجھنے کی بجائے خود اپنا معاملہ سمجھ لیا ہے اور یوں مذہب کو دوکانداری بنا کر رکھ دیا ہے۔

جس طرح شعیب کے فوراً بعد عثمان کی پیدائش سے شعیب کی جسمانی صحت پر اثر پڑا اسی طرح ٹیپو کے فوراً بعد مانو کی پیدائش سے ٹیپو کی صحت پر اثر پڑا۔ مانو، ٹیپو سے سوا سال چھوٹی ہے

لیکن ٹیپو سے پہلے اس نے چلنا سیکھ لیا۔ پھر مانو کی دیکھا دیکھی ٹیپو نے چھوٹے چھوٹے پاؤں اٹھانا شروع کردیئے۔ اور اب تو اس نے شعیب کی طرح اپنی جسمانی کمزوری کو بھی کور کرلیا ہے۔
ٹیپو کو بولنا سکھانے اور نام یاد کرانے میں بڑی دلچسپ صورت بنتی تھی۔ میں اپنے بچپن میں اپنے ابو کو ''ابوا'' کہتا تھا۔ ٹیپو مجھے ''ابوبا'' کہتا تھا شعیب اسے ہجے سکھا رہا تھا: ''کہو۔ اب''

ٹیپو نے کہا ''اب''

پھر شعیب نے کہا ''بو''۔۔   ٹیپو نے کہا ''بو''

لیکن جیسے ہی جوڑ کرانے کے بعد شعیب کہتا ''ابو''۔ ٹیپو بولتا ''ابوبا''۔ اپنا نک نیم اس نے ریورس گیئر میں لیا:

''کہو۔ ٹی''   ''ٹی''
''پو''   ''پو''
''ٹیپو''   ''پوٹی''

اب بھی کبھی کبھار میں اسے پیار سے ٹیپو کی بجائے پوٹی کہہ کر مخاطب کرلیتا ہوں۔ ٹیپو اپنے لسانی اصول کے مطابق مانو کو نوما کہتا۔ ٹیپو کی اس ذاتی گرائمر سے ہمارے ادب میں نئی لسانی تشکیلات والے پرانے ادباء شاید اپنے بعض بنیادی اصول وضع کرسکیں۔ ایک بار میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور دو سال کے چھوٹے سے ٹیپو کو اپنے سینے پر بٹھایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا آپ کو باتیں کرنا آتی ہیں؟ ٹیپو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا پھر ابو سے باتیں کرو۔ ٹیپو نے بڑی معصومیت کے ساتھ وقفے وقفے سے بولنا شروع کیا:

''باتیں۔۔ باتیں۔۔ باتیں۔۔ باتیں۔۔''

ایبٹ آباد میں قیام کے دوران سعید شباب بچوں سمیت خانپور سے آیا ہوا تھا۔ آپی کے بچے عرفان اور عمران بھی کراچی سے آئے ہوئے تھے۔ ہم سب ایبٹ آباد کے قریب واقع ایک مقام ٹھنڈیانی کی سیر کے لئے گئے۔ یہ مقام نتھیا گلی سے بھی زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ یہاں بچوں نے گھڑسواری بھی کی۔ پہلا راؤنڈ مکمل کرکے شعیب، عثمان، عرفان، عمران واپس آئے تو شعیب

کے چہرے پر غصے اور کرب کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے سوچا پتہ نہیں بھائی سے یا کسی کزن سے کوئی جھگڑا کر بیٹھا ہے۔لیکن جیسے ہی پکنک پوائنٹ پر پہنچا، گھوڑے کی باگ کھینچ کر بڑے ایکشن کے ساتھ کہا ’’گھبر سنگھ! باہر نکل۔۔‘‘ تب اندازہ ہوا کہ چہرے پر غصے اور کرب کے آثار اپنی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے طاری کئے تھے۔ڈائیلاگ ایسے بے ساختہ انداز میں بولا گیا تھا کہ ہم دیر تک ہنستے رہے۔

شعیب بچپن میں مبارکہ کی ایک سہیلی سعیدہ کو بہت پیارا لگتا تھا۔امی جی کو عثمان سے نسبتاً زیادہ پیار تھا۔جبکہ خانپور کی ایک شاعرہ غزالہ طلعت ٹیپو سے بہت پیار کرتی تھی۔میرے پانچوں بچوں کو اپنے دادا، دادی کی گود میں کھیلنے کا اعزاز حاصل ہے اور کسی بھائی کی ساری اولاد یہ سعادت حاصل نہیں کر سکی۔رضوانہ کا بیاہ ایک پاکستانی نوجوان حفیظ کوثر سے ہو گیا ہے۔منگنی سے پہلے میں نے رضوانہ سے بار بار کہا کہ لڑکے کو ایک نظر دیکھ لو۔مگر اس کا ایک ہی جواب تھا آپ کو پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے۔شعیب نے جرمنی پہنچتے ہی ایک عشق فرما لیا اور عشق کی ایک ہی جست میں سارے مرحلے طے کر کے فارغ ہو گیا۔ یہ عشق کیا تھا۔ ہیر، رانجھا۔۔سوہنی، مہینوال۔۔ شیریں، فرہاد۔۔ان سب کی داستانیں یک جا ہو گئی تھیں۔ میں نے شعیب کو مشورہ دیا ہے کہ آئندہ پرانی داستانوں کو دہرانے کی بجائے اپنی اوریجنل داستان بنائے۔دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔

عثمان نے پہلے سے ہی واضح کر دیا ہے کہ میں تمام کزنز کو اپنی بہنیں سمجھتا ہوں۔شادی خاندان سے باہر کروں گا۔ ٹیپو ابھی بارہ سال کا ہے لیکن اس نے سات برس پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ بڑا ہو کر ابو بنوں گا۔ بیٹے کا نام رکھوں گا چوزہ اور بیٹی کا نام رکھوں گا نور خاتون۔۔مانو کے بارے میں کچھ لکھ دیا تو وہ پھر زار و قطار رونا شروع کر دے گی کہ میں نے امی ابو کو نہیں چھوڑنا اور پھر اسے چپ کرانا مسئلہ بن جائے گا۔

مشرقی تہذیب کی دولت کے ساتھ میرے بچے اس وقت مغرب کے کشادہ نظر ماحول میں اپنی عملی زندگی کی بنیادیں استوار کر رہے ہیں۔اباجی کی شدید خواہش تھی کہ ان کے پانچوں بیٹے اور

ہو سکے تو چاروں بیٹیاں بھی، مل جل کر رہیں۔ میں اباجی کا یہ خواب پورا کرنا چاہتا تھا مگر ایک بھائی اور ایک بہن کی بے صبری اور ایک سوتیلی رشتہ دار کی مہربانی نے میرے باپ کے خاندان کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔اب میری خواہش ہے کہ جب میرے پانچوں بچے اپنے اپنے آباد گھروں والے ہو جائیں تب حالات کی مناسبت سے کوئی مدت مقرر کر کے ہفتے، مہینے یا سہ ماہی میں سارے بہن بھائی مل کر سچی محبت اور خوشی سے گیٹ ٹوگیدر کر لیا کریں تو میں سمجھوں گا اباجی کا خواب بھی پورا ہو گیا اور میری خواہش بھی۔اپنے پانچوں بچوں کے لئے خوشحالی اور خیر و برکت کی دعا کے ساتھ مستقبل میں پانچوں کی خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگیوں کی دعا میری طرف سے میرے بچوں کے لئے تحفہ ہے۔اپنے بچوں کو دو عذابوں سے ہمیشہ بچنے کی تلقین کرتا ہوں۔ان سے بچنے کی کوشش بھی کرتے رہیں اور دعا بھی کرتے رہیں۔ایک عذاب غربت کی وہ سطح ہے جو انسان کو دنیا کے جھوٹے خداؤں کے سامنے محتاجی کی ذلت کی حد تک گرا دے۔دوسرا عذاب تکبر کی لعنت ہے۔ایسا تکبر جو ناحق دوسروں کو ذلیل کرائے۔اگر بچے ان دونوں عذابوں سے بچ گئے تو بے شک ان کی زندگیاں کامیاب ہوں گی۔انسان کا مقام خلیفۃ اللہ فی الارض کا مقام ہے۔اس سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں انسانیت ہی خدا کی اصل نیابت ہے۔

آدم اور حوا کی کہانی میں شجرِ ممنوعہ کے تعلق سے مختلف روایات میں گندم اور سیب کا ذکر ملتا ہے۔اسی طرح ایک روایت میں شیطان کا سانپ بن کر گناہ پر اکسانا بھی مذکور ہے۔ گندم، سیب اور سانپ درحقیقت تینوں جنسی علامتیں ہیں۔ابلیس کا تکبّر بے شک غلط تھا مگر اس کی یہ بات درست تھی کہ شجرِ ممنوعہ کھا کر آدم اور حوا ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیں گے اور واقعی آدم اور حوّا نے ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لی۔موت سے پہلے اپنی زندگی اپنی اگلی نسل کو سونپ دینا اور پھر اپنی موت کے بعد اپنی اگلی نسلوں میں جیتے چلے جانا، یہی تو ہمیشہ کی زندگی ہے۔ابنِ آدم ہونے کے ناطے میں بھی اس زندگی کے تسلسل کا حصہ ہوں جو مر کر بھی نہیں مرتی۔لاہور میں ایک بار ایک امریکی خاتون سے ملاقات ہوئی تھی۔(احتیاطاً واضح کر دوں کہ یہ خاتون نیگریس تھیں) دورانِ گفتگو محترمہ نے میرے بچوں کی تعداد پوچھی تو میں نے کہا:

"Two daughters and three sons.Toatal five sins"

"but Holy sins"اس خاتون نے میری بات کالطف لیتے ہوئے جملہ مکمل کردیا۔ مجھے خوشی ہے کہ پاپولیشن پلاننگ کے اس دور میں بھی میں اپنے جدِّ اعلیٰ کے گناہ کو پانچ بار دہرانے میں کامیاب رہا ہوں۔ وماتوفیقی الاّ باللہ

☆☆☆

☆ایک قاری نے توجہ دلائی ہے کہ ہاشم کے بھائی کا نام عبدالشمّس تھا۔امیہ ان کے بیٹے تھے اور ہاشم کے بھتیجے تھے۔ہاشم اور عبدالشمّس جڑواں بھائی تھے۔گھر میں گفتگو ویسے ہی ناموں سے ہوئی تھی تاہم تاریخی طور پر درستی ذہن میں رہے۔

اُردوادب کے نوبل پرائز

(میرزاادیب)

خاموشیوں کے لب پہ کوئی گیت تھا رواں
گہری اداسیوں کے کنول جھومتے رہے

میرزاادیب سے مل کر مجھے ہمیشہ ایک روحانی خوشی کا احساس ہوا۔اتنے بڑے اور سینئر ادیب ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ اتنی محبت دی کہ مجھ سے مارے خوشی کے سنبھالی ہی نہیں جاسکی۔میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا،انہوں نے بڑھ کر گلے لگایا۔دردمند دل رکھنے کے باعث دوسروں کے دکھ درد کو ازخود محسوس کرلیتے ہیں۔میرزاادیب بحیثیت ادیب کئی جہات کے حامل ہیں۔رومان نگار،افسانہ نگار،ڈرامہ نگار،خاکہ نگار،کالم نگار،سوانح نگار۔اس نگارخانے سے ہٹ کر میرزاادیب بچوں کے لئے لکھنے والے ادیب بھی ہیں اور''ادبِ لطیف'' کے درخشندہ دور میں اس کے مدیر بھی رہے ہیں۔میرزاادیب کے ساتھ ان کے تمام دوستوں نے یہ زیادتی کی کہ ان کی طبعی شرافت کے باعث انہیں تواتر کے ساتھ بے حد شریف انسان کہنا شروع کردیا اس کا نقصان یہ ہوا کہ جس طرح بعض لوگ کمینگی کی آخری حد پار کرجاتے ہیں،میرزاادیب شرافت کی آخری حد پار کرگئے۔آخر شرافت کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے!

میرزاادیب کی ذاتی زندگی کا جوعکس''صحرانورد کے خطوط''اور''صحرانورد کے رومان''میں نظر آتا ہے اور جو ایک رومانوی رویے کے طور پر ان کے افسانوں اور ڈراموں میں بھی صاف دکھائی دیتا ہے ان کی خودنوشت سوانح میں نمایاں ہوکر ابھر آیا ہے۔خاکہ

نگاری اور کالم نگاری میرزا ادیب ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت کرتے ہیں تاہم اس میں بھی وہ اپنے ادبی آئین کی روح کو پامال نہیں ہونے دیتے۔ بچوں کے لئے لکھے ہوئے میرزا ادیب کے ادب کو پڑھ کر مجھے وہ بچہ دلاور علی بار بار نظر آیا جسے گھر والوں نے کبھی بڑھئی بنانے کی کوشش کی تو کبھی لوہار بنانے کی سعی فرمائی مگر دلاور علی نے بڑھئی اور لوہار کے کام پر آوارہ گردی کو ترجیح دی۔ یوں اس کے بچپن کی آوارہ گردی اسے اپنے اندر کے صحراؤں میں لے گئی اور پھر ''صحرا نورد کے خطوط'' سے وہ بچہ دلاور علی۔۔ میرزا ادیب بن کر ابھرا۔ میرزا ادیب نے بچوں کے لئے کہانیاں اور ڈرامے لکھ کر اس بچے کو زندہ رکھا ہوا ہے جو ان کے اندر موجود ہے اور جو انہیں میرزا ادیب بنانے کا موجب بنا ہے۔ میرے نزدیک وہ بچہ تخلیقی قوت کا استعارہ ہے۔

''ادبِ لطیف'' کے دورِ ادارت میں میرزا ادیب نے متعدد ایسے نئے ادیبوں کو متعارف کرایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی جو آج اردو ادب کے معتبر نام ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا کہ میرزا ادیب صرف ادیب ہی نہیں، ادیب گر اور ادیب ساز بھی ہیں ''ادبِ لطیف'' کی ادارت کے زمانہ میں میرزا ادیب کی قابلِ قدر خدمات کے پیشِ نظر انہوں نے ازراہِ تفنّن میرزا ادیب کا نام ہی عبداللطیف رکھ دیا۔ ''ادبِ لطیف'' کے دورِ ادارت میں میرزا ادیب کے دو اہم کارنامے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اردو انشائیہ جب ابھی نوزائیدہ تھا اور اس صنف کا ابھی کوئی نام ہی نہیں رکھا گیا تھا تب میرزا ادیب نے اس نئی صنف کی حوصلہ افزائی کی۔ انشائیہ نام تجویز ہونے پر اسے رائج کرنے اور فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

میرزا ادیب کا بحیثیت مدیر دوسرا یادگار کارنامہ یہ ہے کہ جب ترقی پسند تحریک کے جنرل سکریٹری مغلوب الغضب ہو رہے تھے اور انہوں نے ایک قرارداد کے ذریعے منٹو، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، صمد شاہین اور متعدد دیگر ادباء کے خلاف ادبی بائیکاٹ کی مہم شروع کر کے ادب میں چھوت چھات کے نظام کی بنیاد رکھ دی تھی، تب میرزا ادیب نے بائیکاٹ کے اس غیر ادبی اور غیر اخلاقی حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک ترقی پسند یا غیر ترقی پسند کی بجائے ادب محترم تھا۔ وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ غیر ترقی پسند مگر اوریجنل اور اچھے ادیبوں کی تخلیقات

کا بائیکاٹ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بائیکاٹ کے فیصلے کی خلاف ورزی کی۔ ادارت چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے مگر اوریجنل ادیبوں کے بائیکاٹ کو انہوں نے اوچھی حرکت ہی سمجھا۔

ایک ادیب نے ایک بار مذاق کے طور پر کہا تھا: ''لاہور نے ایک ہی ادیب پیدا کیا ہے۔ میرزا ادیب''۔۔ اس جملے پر غور کرتا ہوں تو بڑا سچ معلوم ہوتا ہے لاہور میں جتنے نامور ادباء ہیں دوسرے شہروں سے چل کر لاہور آئے اور پھر لاہوری ہو گئے لیکن میرزا ادیب اوریجنل ''لاہوری'' ہیں کرشن نگر اور بھاٹی گیٹ کی مٹی سے اُگے ہوئے اور جڑے ہوئے۔ لاہور کی ثقافت کے بیشتر شریفانہ اجزاء میرزا ادیب نے اپنے پاس رکھ لئے اور بے مروتی جوڑ توڑ، شرارت وغیرہ کے منفی اجزاء دوسروں کے لئے چھوڑ دیئے تاکہ جو چاہے بقدرِ ظرف یا حسبِ ضرورت حاصل کرتا رہے۔

رومانویت کے اثرات میرزا ادیب کی تمام اصناف میں ہی نہیں ان کی شخصیت میں بھی موجود ہیں۔ ایک دفعہ ایک ٹی وی پروگرام کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں میرا اور فرحت نواز کا لاہور آنا ہوا۔ فرحت کی ایک عزیز سہیلی بھی ساتھ تھی۔ ہم میرزا ادیب کے پاس پہنچے۔ میں نے ان سے کہا ان دونوں بیبیوں میں ایک فرحت نواز ہے اور ایک اس کی سہیلی ہے۔ بوجھیئے کونسی فرحت نواز ہے؟ میرزا ادیب شش پنج میں پڑ گئے۔ دونوں چہروں کو کافی غور و خوض سے دیکھنے کے بعد انہوں نے فرحت کی سہیلی کو فرحت نواز قرار دے دیا۔ شاید انہوں نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ مرد ادیبوں کی طرح شاعرات بھی بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہوسکتیں۔ لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا ہے تو بہت خوش ہوئے اور اسی خوشی میں دیر تک فرحت کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے رہے۔ تب مجھے شدت سے یہ خواہش ہونے لگی کہ کاش میں بھی میرزا ادیب کا ہم عمر ہوتا!۔۔ پھر میرزا ادیب اٹھے اور اپنی تازہ کتاب ''مٹی کا دیا'' لے آئے۔ اس پر فرحت کا نام لکھا اور مجھے کہا۔ اوئے حیدر قریشی! اس وقت یہ ایک نسخہ ہے اس لئے یہ فرحت کو دے رہا ہوں، یہ پہلی بار میرے ہاں آئی ہے۔ تمہارا کیا ہے تم آتے ہی رہتے ہو، بعد میں لے لینا۔۔ ڈاکٹر انور سدید نے بعد میں ''غالب کے نئے خطوط'' میں مورخہ ۸۲۔۱۔۷ کے خط میں اس واقعہ کا دلچسپ انداز میں ذکر کیا تھا۔

میرزاادیب سادہ دل اور سادہ مزاج کے انسان ہیں۔ اپنے اوپر کوئی دوسرا روپ نہیں چڑھاتے۔ میں نے کئی ایسے ادیبوں کو دیکھا ہے جن کی اتنی ادبی حیثیت نہیں ہوتی جتنی وہ اپنی اداکاری سے ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ایسے ادیبوں نے اداکاری کی بجائے ادب پر اتنی توجہ کی ہوتی تو شاید اپنی موجودہ بہروپیا حالت سے بہتر ہوتے۔ میرزاادیب کی سادگی اور صاف گوئی کی انتہا یہ ہے کہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس بات کے کرنے سے میری کم علمی تو ظاہر نہیں ہوگی۔ صحرانورد کے خطوط کے حوالے سے بات چلی۔ رحیم یار خاں کے چولستان تک پہنچی۔ میرزاادیب نے چولستان کے سحر انگیز واقعات سنے تو بے حد حیران ہوئے پھر معصومیت کے ساتھ کہنے لگے کبھی موقعہ ملا تو میں آؤں گا مجھے چولستان کی سیر ضرور کرانا۔ حالانکہ اگر میرزاادیب چاہتے تو اپنی حیرت کو اس خیال سے ہی چھپا لیتے کہ یہ نوجوان ادیب کیا سوچیں گے، ''صحرانورد کے خطوط'' لکھ ڈالے مگر صحرا کی شکل تک نہیں دیکھی۔ سادگی اور معصومیت کے یہ انداز اب ادیبوں میں کہاں ملتے ہیں۔ اب تو ہر شخص تیز تلوار ہے اور موقعہ کی تاک میں۔

میرزا ادیب نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ ادب والوں نے اس کا صلہ صرف اتنا دیا کہ ان کی بعض کتابوں پر مختلف انعامات دے دیئے۔ لیکن میرزاادیب کی ادبی خدمات کا ابھی تک صحیح طور پر اعتراف نہیں کیا گیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ادباءکرام اور ادبی ادارے اس طرف توجہ کریں۔ میرزاادیب کی ادبی خدمات نصف صدی کا قصہ نہیں ہیں اس سے بھی زیادہ مدت کا قصہ ہیں۔ ہماری مجموعی عمر پچاس سال سے کوسوں دور ہے جبکہ میرزاادیب اپنی ادبی زندگی کے پچپن سال بھی کبھی کے پورے کر چکے ہیں۔ کیا ہمارے ادبی اداروں کو کم از کم اتنی توفیق بھی نہیں ہے کہ میرزاادیب کی ''ادبی گولڈن جوبلی'' منا ڈالیں؟

اگر ''نوبل پرائز'' عالمی سیاست کی بھینٹ نہ چڑھ گیا ہوتا اور نوبل صاحب خود بھی زندہ ہوتے تو میں خود نوبل صاحب کو خط لکھتا، میرزاادیب کی کل کتابیں انہیں بھجواتا۔ مجھے یقین ہے انہیں نوبل پرائز ضرور دے دیا جاتا۔۔ ویسے میرزاادیب اتنے شریف، محبتی، سادہ اور نوبل انسان ہیں کہ ان کا وجود خود اُردو ادب کے لئے نوبل پرائز کا درجہ رکھتا ہے۔

☆☆☆

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

(فیض احمد فیض)

چند لمحے وہ ان سے ملاقات کے
میری سانسوں میں برسوں مہکتے رہے

فیض احمد فیض اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہیں۔ شخصی حوالے سے دیکھا جائے تو ایک ملاقات اور چند خطوط کے تبادلے ہمارے درمیان تعلق کی وہ صورت پیدا نہیں کر سکے جو اجنبیت کو دور کرنے والی ہوتی ہے۔ یوں کہہ سکتا ہوں کہ میں فیض کے معاملے میں اجنبی کا اجنبی ہوں، لیکن فیض کی شاعری اور شخصیت دونوں میں اتنا جادو ہے کہ دور بیٹھے ہوؤں کو بھی اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ سو میں فیض کے ایسے اسیروں میں سے ہوں اور اس لحاظ سے ان کا شناسا بھی ہوں۔

فیض نے بچپن میں والدہ سے قرآن شریف پڑھا۔ کچھ حصہ قرآن شریف کا حفظ کیا۔ ایم اے انگریزی کیا۔ ایم اے عربی کیا۔ امرتسر کالج میں پڑھایا۔ برطانوی ہند کی فوج میں بھرتی ہوئے اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ پاکستان بننے سے پہلے قائداعظم کی منظوری سے پاکستان ٹائمز اور روزنامہ امروز کے چیف ایڈیٹر بنے۔ بے باکانہ صحافت کے جرم میں ۱۹۴۸ء میں پہلی بار گرفتار ہوئے، مشہور راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے۔ مجموعی طور پر تین بار گرفتار ہوئے۔ فیض نے ادب کا لینن پرائز حاصل کیا جسے ''یارلوگوں'' نے ان کی شہرت سے زیادہ رسوائی کا موجب بنا دیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے اولین دور حکومت میں وزیراعظم کے مشیر برائے تعلیمی و ثقافتی امور بنے۔ اسی دوران بیوروکریسی سے اختلافات کے

باعث مشیر کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔مارشل لاء کا تیسرا دور آیا تو فیض کچھ عرصہ بعد ملک سے باہر چلے گئے۔ بیروت میں فلسطینی کاز کو تقویت پہنچانے کے لئے کام کیا۔لوٹس کے مدیر بنے۔وطن کی کشش پاکستان واپس لائی لیکن شاید یہ مٹی کا بلاوا تھا۔ پاکستان واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۹۸۴ء میں فیض فوت ہو گئے۔فیض کی زندگی کا یہ بے حد مختصر سا اشاریہ تھا۔

نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہہ سنگ، سروادیٔ سینا، شام شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر اور غبارِ ایام یہ آٹھ شعری مجموعے شاعری کی دنیا میں فیض کی یادگار ہیں۔ان مجموعوں پر مشتمل کلیات فیض ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔''صلیبیں مرے دریچے میں''۔متاع لوح و قلم'' اور ''ہماری قومی ثقافت'' فیض کی نثری کتابیں ہیں۔

فیض کے ناقدین دو طرح کے ہیں۔ایک تو وہ جو اُن کے ہاں ایک دور تک تازگی اور شعری توانائی کو تسلیم کرتے ہیں مگر بعد میں ان کے ہاں انجماد کا احساس دلاتے ہیں۔ایسے ناقدین میں ڈاکٹر وزیر آغا، انیس ناگی اور خورشید الاسلام جیسے معتبر لوگ شامل ہیں۔ اپنا موقف دلائل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں تاہم اس کا اعتراف تینوں کو ہے کہ فیض ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی عطا ہیں اور ان کے ابتدائی مجموعے انہیں بطور شاعر زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ دوسرے ناقدین جناب احمد ندیم قاسمی کے زیر اثر لکھنے والے ہیں اور ان کا اختلاف علمی و ادبی سے زیادہ ذاتی ہے۔ چنانچہ ایسے ناقدین نے کبھی فیض اور قاسمی کو ہم پلہ ثابت کرنا چاہا تو کبھی کسی حیلے سے جناب قاسمی کو فیض سے بھی بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی۔فیض کی وفات کے بعد خیال تھا کہ معاصرانہ چشمک ختم ہو جائے گی۔لیکن جناب احمد ندیم قاسمی نے اخبار ''جنگ'' لاہور کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں خود کو درباری شاعر ہونے کے الزام سے بچانے کے لئے فیض کو بھی درباری شاعر ہونے کا طعنہ دے دیا ہے۔ یہ طعنہ اور الزام حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔فیض نے گرفتاری کے طویل تر زمانے کاٹے مگر جناب احمد ندیم قاسمی کی طرح حکومت کو پہلی اور آخری گرفتاری پر ایسی پیش کش کبھی نہیں کی کہ سرکار ہم پر اعتماد کریں ہم آپ کو ایسا ادب پیش کریں گے جو پولیس رپورٹوں کا متبادل ہوگا۔۔فیض بھٹو دور میں مشیر رہے تو جوڑ توڑ کے ذریعے نہیں بنے بلکہ

ان کی صلاحیتوں کے اعتراف میں انہیں یہ عہدہ دیا گیا۔اس میں بھی انہیں خلاف مزاج کام کرنے کے باعث الجھن محسوس ہوئی تو انہوں نے بلا تاخیر استعفیٰ دے دیا۔

فیض سے میری ملاقات ان ایام میں ہوئی جب وہ وزیر اعظم کے مشیر تھے۔لاہور میں ان کے آفس میں سادہ سے کمرے، عام فرنیچر اور سخت گرمیوں کے باوجود چھت کے پنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔نہ اعلیٰ فرنیچر، نہ خوبصورت قالین، نہ ایئر کنڈیشنڈ۔۔میں ادب میں نو وارد تھا۔خانپور میں ہماری محدود ادبی سرگرمیاں تھیں۔روزنامہ ''مغربی پاکستان'' لاہور کا ایک شمارہ میرے پاس تھا جس میں خانپور کی ادبی ڈائری چھپی تھی۔اس میں بیک وقت فیض اور نثری نظم کی تحریک کا ذکرِ خیر تھا۔ میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔اخبار پیش کیا۔فیض نے ہلکے سے انداز میں حوصلہ افزائی کی پھر کہنے لگے آپ نوجوان لوگ ہیں نثری نظم کے جھمیلے میں کہاں پڑ رہے ہیں۔ سو میں فیض کے پاس سے ہی نثری نظم سے تائب ہو کر اٹھا۔۔رسمی گفتگو کے بعد میں نے اپنا ذاتی مسئلہ پیش کیا۔ایک عرصہ سے مناسب جاب کی تلاش میں سرگرداں ہوں مگر بغیر سفارش کے کہیں بھی دال نہیں گلتی۔فیض تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں ڈوبے، پھر سر اٹھایا۔میرے ضروری کوائف معلوم کئے اور کہا ریڈیو کے اسسٹنٹ پروڈیوسر کی جاب کے لئے درخواست لکھ دو۔میں نے وہیں درخواست لکھ کر ان کے حوالے کی اور گھر آ گیا۔تقریباً ایک ماہ انتظار کے بعد میں نے انہیں ٹیلی گرام بھیجا۔ جواباً ان کا ٹیلی گرام آیا کہ درخواست آگے بھیج رکھی ہے بہتر امید رکھیں۔۔تھوڑے عرصے بعد خبر سننے میں آئی ،فیض نے وزیر اعظم کے مشیر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔میری قسمت میں تو مستقل بے روزگاری لکھی تھی میں نے فیض کو بھی بے روزگار کر دیا۔

تیسرے مارشل لاء کے کچھ عرصہ بعد فیض بیروت چلے گئے۔مرزا ظفر الحسن سے ان کا پتہ حاصل کر کے ان سے ''جدید ادب'' کے لئے تازہ غزل منگائی:

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا سبھی راحتیں سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں، کبھی قربتیں

یہ غزل سب سے پہلے ''جدید ادب'' میں چھپی۔ بعد میں اسے ''افکار'' اور ''سیپ'' نے بھی

شائع کیا۔ پھران کی نظم ''آج شب کوئی نہیں'' منگا کر شائع کی۔ ''جدید ادب'' سے لے کر جاپان
کے پروفیسر کتاؤ کا نے اسے جاپانی میں ترجمہ کیا۔اس بارے میں فیض نے مجھے خط لکھا کہ پروفیسر
کتاؤ کا کو پاکستانی رسائل بہت کم پہنچتے ہیں آپ جدید ادب انہیں بھیجتے رہا کریں۔

بھارت میں برادرم مناظر عاشق ہرگانوی آزاد غزل کی تحریک کو بڑھانے میں سرگرم ہیں۔
ایک بار انہوں نے مجھے آزاد غزلوں کا ایک انتخاب بھجوایا جس میں فیض کی ایک آزاد غزل بھی
شامل تھی۔ مجھے حیرت ہوئی تاہم میں نے فیض کی آزاد غزل سمیت انتخاب چھاپ دیا۔یہی آزاد
غزل پھر ماہنامہ شاعر بمبئی کے آزاد غزل و نثری نظم نمبر میں بھی شائع ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ
تو فیض کی ''شام شہر یاراں'' کی ایک نظم تھی جسے قطع و برید کر کے بڑی عمدگی سے آزاد غزل
بنا دیا گیا تھا فیض صاحب نے کسی محفل میں وضاحت کی کہ میں آزاد غزل اور نثری نظم دونوں
''خوبیوں'' سے پاک ہوں۔ کچھ عرصہ بعد فیض کی آزاد غزل کے سلسلہ میں آزاد غزل کے بانی
مظہر امام سے جنگ لاہور میں چھپنے والے انٹرویو میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کمال محبت سے
فیض کی آزاد غزل کی دریافت و اشاعت کا سہرا ''جدید ادب'' کے سر باندھ دیا۔ممکن ہے انہیں
واقعی علم نہ ہو لیکن ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی زندہ ہیں وہ یقیناً اعتراف کریں گے کہ فیض کی آزاد
غزل مجھے انہوں نے بھجوائی تھی سو اس کی دریافت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

فیض کم گو انسان تھے۔ کہتے ہیں کہ کم گو لوگ یا بہت چالاک ہوتے ہیں یا بہت بے
وقوف۔فیض یقیناً ہوشیار آدمی تھے۔ پاکستان کے ماحول میں ان کی کم گوئی ان کے لئے سوشکھ کا
موجب بنی۔فیض بہت اچھے انسان تھے لیکن فرشتہ نہیں تھے۔راولپنڈی سے ایک ممتاز ادیبہ ابھری
تھیں۔آج وہ تباہی کے دہانے پر کھڑی ہیں۔انہوں نے فیض کے مقام و مرتبہ کے باعث انہیں
اپنے گھر پر مدعو کیا۔فیض ''ہم مشربوں'' کے ساتھ پہنچے۔ وہاں ایک دو دفعہ محفل ناؤ و نوش جمائی۔
پھر فیض اپنی دیگر مصروفیات میں الجھ گئے مگر ان کے بعض ''ہم مشرب'' تواتر سے وہاں جاتے رہے
اور اپنی ثابت قدمی سے اس خاتون کو بھی اپنی محفل میں شریک کر لیا۔ ملک کا سیاسی منظر نامہ تبدیل
ہوا۔شراب مہنگی ہوئی تو یار لوگ تتر بتر ہو گئے۔ خاتون نشہ کی عادی ہو چکی تھیں۔ آخر ستے نشے کی

طرف راغب ہوئیں۔ادبی تنقید کی متوقع ہیروئن۔۔نشہ آور ہیروئن کی بھینٹ چڑھ گئی۔ یہ زندہ
لاش ابھی بھی راولپنڈی میں موجود ہے۔رشیدین (رشید امجد اور رشید نثار) سے تفصیلات معلوم کی
جاسکتی ہیں۔ یہ لاش بزبان حال آج بھی اپنے مہربانوں سے کہہ رہی ہے:

ویسے تو تمہیں نے مجھے برباد کیا ہے

الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا

فیض بہت بڑے شاعر تھے لیکن ان کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ انہیں ایسے مدّاح مل گئے جن
کے نزدیک فیض کی شاعری سے زیادہ ان کا ''پائے جامہ'' باعث افتخار رہے۔ مریدان
باصفا شاید فیض کے کپڑوں سے برکت ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ وہ تو خدا بھلا کرے ایلس فیض کا
جنہوں نے قصۂ زمین برسر زمین ہی نمٹا دیا وگرنہ ''پائے جامہ'' کے بعد ''زیر جامہ'' کی باری بھی
آتی۔ غالبؔ کے ہاں تار تار گریباں اور دامن تار تار تو بہت ملتا ہے مگر پائے جامہ کا کوئی ذکر ہی
نہیں ہے۔

میں فیض مرحوم کو دُور سے دیکھنے والوں میں سے ہوں لیکن میری دعا ہے کہ خدا انہیں قریب
کے ان ساتھیوں کے شر سے محفوظ رکھے جن کے ہوتے ہوئے فلک ناہنجار کو ان سے دشمنی کی کوئی
ضرورت نہیں رہتی۔

☆☆☆

عہد ساز شخصیت

(ڈاکٹر وزیر آغا)

جو اپنی ذات میں سمٹا ہوا تھا
سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا

میرا پہلا مضمون ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ ''نگار پاکستان'' کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا۔مضمون کا عنوان تھا ''موجودہ ادبی بے راہ روی'' اس مضمون میں، میں نے ''ادب میں نیک مقصدیت'' کے تصور کو ادب کے لئے مضر سمجھا تھا اور ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب دونوں کے درمیان توازن قائم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔تب میں ادبی دنیا میں نووارد تھا اور جدید اردو ادب کا میرا مطالعہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ تاہم ادب کے بارے میں میرے تصورات مبہم اور غیر واضح ہونے کے باوجود میرے اندر کی کسی طلب کے ترجمان تھے۔اسی دوران مجھے ''تنقید اور احتساب'' پڑھنے کا موقعہ ملا تو یوں لگا میرے مبہم اور غیر واضح تصورات کو اصل صورت ملنے لگی ہے۔ یہ ڈاکٹر وزیر آغا سے علمی سطح پر میری پہلی ملاقات تھی۔اس کے بعد ''نظم جدید کی کروٹیں''،اور'' نئے مقالات'' کے ذریعے ڈاکٹر وزیر آغا سے مزید دو ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے احساس ہوا کہ ادب کے بارے میں جو کچھ میں سوچتا ہوں مگر میری گرفت میں نہیں آپاتا وہ سب ڈاکٹر وزیر آغا کی گرفت میں ہے۔ بقول غالب:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۷۸ء کے آخر میں ''جدید ادب'' کتابی سلسلے کے اجراء کا

پروگرام بنا۔ میں خانپور سے چل کر لاہور آیا۔علی اکبر عباس پہلے ادیب تھے جو بڑی محبت سے ملے۔میری حوصلہ افزائی کی۔ٹی وی سنٹر اور پاک ٹی ہاؤس کی یاترا کرائی۔لاہور کے ادیبوں سے نگارشات لے کر دیں۔''جدید ادب'' کے اولین کرم فرماؤں میں سراج منیر، اقبال ساجد، اسلام عظمی، خالد احمد اور بعض دیگر ادباء شامل تھے۔علی اکبر عباس کے توسط سے ہی ان ادباء نے اپنی تخلیقات عطا کی تھیں۔''جدید ادب'' کا پہلا شمارہ چھپا۔ ادباء کی خدمت میں بھیجا گیا مگر اہل لاہور نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اسی دوران ڈاکٹر انور سدید کا ایک انٹرویو روزنامہ ''جسارت'' کراچی کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا۔اس انٹرویو کے ساتھ ان کا پتہ بھی درج تھا۔میں نے انہیں خط لکھا اور ممکنہ حد تک قلمی معاونت کی درخواست کی۔ میں نے انور سدید کو خط کیا لکھا گویا دبستاں کھل گیا۔

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

ڈاکٹر انور سدید نے مجھے لاہور کے چکروں سے نجات دلادی۔ادبی تحریروں کے حصول کے لئے اچھے اچھے ادیبوں کے پتے فراہم کئے۔ ان میں وزیر آغا بھی شامل تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے میری معمولی سی درخواست پر جس محبت کے ساتھ اپنی نگارشات عطا کیں مجھے اس پر خوشگوار حیرت کا احساس ہوا۔''جدید ادب'' کے اجراء کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بڑے شہروں کے ادیبوں کی اجارہ داری کے باوجود چھوٹے شہروں کے ٹیلنٹ کو بھی سامنے آنے کا موقعہ ملنا چاہئے۔بعد میں پتہ چلا کہ اہل سرگودھا بھی ہماری طرح لاہوری ادیبوں کی اجارہ دارانہ ذہنیت کا شکار ہیں اور کئی برس سے علمی اور تخلیقی سطح پر مصروف جہاد ہیں۔

اس تمہید طولانی سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے میرا تعلق کسی تعارف کے بغیر فکری سطح پر پہلے قائم ہوا تھا۔ذاتی رابطہ اور شخصی سطح پر تعلق بہت بعد میں قائم ہوا۔میں نے وزیر آغا سے اپنے تعلق اور نیازمندی کو دو خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ایک خانہ علمی اور فکری تعلق کا ہے۔ ایک خانہ شخصی اور ذاتی تعلق کا ہے۔علمی لحاظ سے میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنا استاد اور

رہنما سمجھتا ہوں۔ان کی تنقید اور فکر سے میں نے ادبی رہنمائی حاصل کی ہے۔ میں نے افسانے لکھے تو انہوں نے قدم قدم پر مجھے شاباش دی۔حوصلہ افزائی کی۔مفید مشورے دیئے۔کبھی کبھی بعض مشوروں سے مجھے الجھن بھی ہوتی تھی۔ ابھی میں نے چند افسانے لکھے تھے جو زیادہ تر ''اوراق'' میں چھپ جاتے تھے۔افسانہ ''پتھر ہوتے وجود کا دکھ'' میں نے ''اوراق'' کے لئے بھیجا تو وزیر آغا نے مجھے خط لکھا: اگر آپ اسی انداز سے آگے بڑھتے رہے تو بہت جلد صف اول کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو جائیں گے۔ چنانچہ میں نے احتیاطاً اپنا انداز بدل لیا تا کہ صف اول کے جدید افسانہ نگاروں میں شامل ہو کر اپنا حشر بھی ان جیسا نہ کرالوں۔ وزیر آغا نے مجھے انشائیے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز غزل سے کیا تھا۔وزیر آغا سے رابطہ ہوا تو مجھے پہلی بار ماہنامہ ''اردو زبان'' میں شائع شدہ نظم ''دھوپ'' کے ذریعے شاعر وزیر آغا سے ملاقات کا موقعہ ملا۔سردیوں کے موسم میں یہ نظم پڑھی تھی۔مسرت اور حیرت کی ایک انوکھی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔میں شاعری کے ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوا۔ پھر ''واپسی'' اور ''سمندر اگر میرے اندر گرے''، نظمیں پڑھیں اور میں وزیر آغا کی نظموں کا ہمیشہ منتظر رہنے والا قاری بن گیا۔ میرے نزدیک وزیر آغا کی نظم میں جو جہانِ دیگر ہے وہ اس عہد کے کسی بھی دوسرے نظم نگار کو نصیب نہیں ہوا۔

شخصی سطح پر قلمی رابطے کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا ۱۹۷۹ء کے اواخر میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے رحیم یار خاں تشریف لائے۔خانپور بھی آئے۔تب ان سے ملاقاتیں ہوئی۔پہلی ملاقات کے وقت میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ میں اس عہد کی اک بہت بڑی ادبی اور علمی شخصیت سے ملنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں۔ پھر کبھی بہاولپور، کبھی لاہور اور کبھی سرگودھا میں ان سے ملاقاتیں ہوئی اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا میں ایک خوبی یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں۔عالمی ادب اور بالخصوص انگریزی ادب کی رفتار سے باخبر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔شروع شروع میں انہوں نے مجھے بھی انگریزی کتب پڑھانے کی کوشش کی لیکن ان کے چکر میں آئے بغیر

میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ انگریز کی برصغیر پر سو سالہ غاصبانہ اور ظالمانہ حکمرانی کے باعث میں انگریزی زبان سے محبت نہیں رکھتا (انگریز خواتین اس سے مستثنیٰ ہیں)۔دوسرے یہ کہ میری انگریزی اسکول کے زمانہ سے ہی اتنی خراب رہی ہے کہ انگریزی کتب پڑھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ سو انہیں اندازہ ہو گیا کہ انگریزی زبان سے میری واقفیت کا حال ان کے ''بھائیے'' جیسا ہے۔ چنانچہ پھر انہوں نے مجھے اس چکر میں الجھانا مناسب نہیں سمجھا۔۔۔وزیر آغا سے دوستی اور فکری ہم آہنگی نے مجھے عملی زندگی میں شدید نقصان بھی پہنچایا ہے۔ میں پہلے ہی سے کچھ صوفیانہ فکر و خیال کا آدمی تھا، اوپر سے وزیر آغا نے دنیا سے بے نیازی اور ادب کو ہی اولیت دینے کا اتنا اظہار کیا کہ میں نے دنیا اور اس کی محبت کو بہت ہی حقیر سمجھ لیا۔۔ بچے بڑے ہوئے۔سکول، کالج تک پہنچے۔اخراجات بڑھے۔مہنگائی بڑھی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔تب پتہ چلا کہ دنیا سے اتنی بے نیازی بھی اچھی نہیں۔۔۔ دنیا سے بے نیازی اسی وقت اچھی لگتی ہے جب گھر میں کھانے پینے کے وافر اسباب موجود ہوں ورنہ انسان کا وہی حشر ہوتا ہے جو میرا ہوا۔

وزیر آغا کے بہت سے دوست بنے۔کچھ چند قدم چل کر جدا ہو گئے۔بعض نے لمبی رفاقت کے بعد جدائی اختیار کر لی۔۔بعض دوست غلام جیلانی اصغر، انور سدید، غلام الثقلین نقوی، صابر لودھی اور سجاد نقوی کی طرح دوستی نبھانے والے نکلے۔۔ جدا ہونے والوں میں سے کچھ لوگ جدا ہو کر خاموش ہو گئے۔۔کچھ نے مخالفت پہ کمر باندھ لی۔۔ایسا کیوں ہوا؟

میں یک طرفہ بے لوث اور بے غرض محبت کو نہیں مانتا۔محبت ہمیشہ دو طرفہ ہوتی ہے۔محبت بجائے خود ایک ایسا جذبہ ہے جو تسکین کی غرض رکھتا ہے۔ اس لئے میں یہ نہیں مانتا کہ وزیر آغا کو چھوڑ جانے والے لوگ محض اغراض کے بندے تھے۔اصل خرابی یہ تھی کہ شدید محبت کے باعث وزیر آغا سے ان کی توقعات بہت بڑھ گئی تھیں۔چنانچہ جب ان توقعات کو ٹھیس پہنچی تو جدائی واقع ہو گئی۔۔جدائی کے بعد بعض صاحبان خاموش ہو گئے اور بعض نے مخالفت پر کمر باندھ لی یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

وزیر آغا دشمن کے تیر سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر دوستوں کے مارے ہوئے پھول نہیں سہہ سکتے۔ ہاں اگر دوست کھل کر دشمن بن جائے تو پھر اس کی زہریلی مخالفت کو بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گھول کر پی جاتے ہیں۔سطحی قسم کے مخالفین کے انداز مخالفت پر انہیں غصہ نہیں آتا بلکہ مخالفوں کی ذہنیت پر رحم آتا ہے۔البتہ جو لوگ مکارانہ اور سازشی انداز اختیار کرتے ہیں ان کے رویّے پر وزیر آغا کو افسوس بھی ہوتا ہے اور رنجیدہ بھی ہوتے ہیں۔۔علمی اور فکری اختلاف رائے کو وزیر آغا نے ہمیشہ کشادہ بازؤں کے ساتھ سینے سے لگایا ہے۔مخالفت کی آندھیوں اور دشمنی کے سیلابوں کے پے در پے حملے سہنے کے باوجود اور اپنی عمر کے ستر برس عبور کر لینے کے بعد بھی وزیر آغا باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔شگفتگی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔۔لطیفہ بازی، ہنسنے ہنسانے کا اکتسابی عمل ہے۔لطیفہ باز ادیبوں پر بعض اوقات اس کا اتنا گہرا اثر پڑتا ہے کہ ان کی تخلیقات بھی اکتسابی عمل دکھائی دینے لگتی ہیں۔لطیفہ بازی کی کئی عبرتناک مثالیں لاہور میں موجود ہیں۔وزیر آغا لطیفہ باز ہیں نہ جملہ باز۔۔وہ تو جملہ تخلیق کرتے ہیں اور اس میں ایسا بے ساختہ پن ہوتا ہے کہ نشانہ بننے والا بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔شاید اس لئے بھی کہ ان کے جملے میں ڈنک نہیں ہوتا۔

عام طور پر مجلسوں میں ہنسنے ہنسانے والوں کا علم کا خانہ خالی ہوتا ہے مگر وزیر آغا ایک طرف شگفتگی اور خوش مزاجی کا سمندر ہیں تو دوسری طرف علم کا بحر ذخار ہیں۔ میں نے نجی گفتگو میں بھی وزیر آغا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔الٰہیاتی مسائل، روح کی حقیقت، انسان کی مخفی قوتیں اور کائنات کی بے پناہ وسعتیں۔۔ان موضوعات پر ان سے کھل کر باتیں کی ہیں۔بعض ایسی باتیں جو اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی کبھی کبھار خوف محسوس ہوتا ہے وزیر آغا سے بے خوف ہو کر کی ہیں اور ان کی گفتگو سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ان کے گاؤں وزیر کوٹ میں کھیتوں کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے بھی دیکھے ہیں اور آسمان پر ڈوبتے سورج کا منظر بھی دیکھا ہے۔۔طویل وعریض کھیتوں میں کھڑے ہو کر میں نے یہ تجربہ بھی کیا کہ کس طرح معمولی سا زاویہ بدلنے سے سامنے کا سارا منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔اس سے کائنات کی نیرنگیوں کا اندازہ ہوا۔

وزیر آغا نے ایک دو بار میرے گھر کو بھی اپنی آمد سے رونق بخشی۔ایک دفعہ اباجی کی زندگی میں آئے۔اباجی اور وزیر آغا کی مختصر سی ملاقات ہوئی۔ اباجی کسی اور لائن کے آدمی تھے لیکن وزیر آغا کے جانے کے بعد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے بھئی تمہارے وزیر آغا کی آنکھوں میں بڑی انوکھی چمک ہے اور اس کے چہرے پر کسی روشنی کا ہالہ سا محسوس ہوتا ہے اباجی کی ملاقات و۔ع۔خ سے ہوتی تو شاید کچھ ایسی صورت بنتی:

اس نے کاغذ پہ لکھا روگ تمہارا یہ ہے
میں نے کاغذ پہ لکھا روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئینہ ہے
اور پھر آئینے اک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے!

وزیر آغا کو سائنسی انکشافات اور طبیعات کے مضمون سے بڑی دلچسپی ہے۔طبعیات پر ان کی معلومات اتنی تازہ ترین ہے کہ میرے ایک عزیز اور طبیعات کے پروفیسر ادریس احمد اس بارے میں بار بار حیرت کا اظہار کرتے رہے ہیں اور تاحال ان کی حیرت ختم نہیں ہوئی۔

جو لوگ مختلف علوم کے ادب کے ساتھ ربط کی نوعیت کو جاننا چاہتے ہیں انہیں وزیر آغا کی کتب ضرور پڑھنی چاہئیں اور طلب زیادہ ہو تو ملاقات بھی کرنی چاہئے۔علم کے جو ایسے دلدادہ تاحال وزیر آغا کی کتابیں نہیں پڑھ سکے یا ان سے ملاقات نہیں کر سکے ان کے بارے میں یہی کہوں گا: افسوس تم کو میؔر سے صحبت نہیں رہی

اردو انشائیہ کے بانی، جدید تر نظم کے پیش رو، اردو تنقید کی منفرد اور عالمانہ آواز۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت ہیں۔اپنی بعض بشری کمزوریوں کے باوجود ہمارے ادب اور ہمارے عہد کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے ان سے اکتساب علم اور نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔

☆☆☆

ایک اُدھورا خاکہ

(غلام جیلانی اصغر)

مجھے ہر گنہ کی جزا ملی
وہ شرافتوں کی سزا میں ہے

پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے میری پہلی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ بھرپور جوانی گزار کے لڑکپن کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ان سے ملاقات کے پہلے مرحلے میں ہی ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' والی بات مجھے پہلی بار صحیح طور پر سمجھ میں آئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جیلانی صاحب جوانی کے بعد مزید جوان ہوئے، بڑھاپے کو ان کے دل پر قبضہ کرنے کی جراُت نہیں ہوئی۔ہم دونوں میں سب سے اہم قدر مشترک یہ تھی کہ ہم ذہنی طور پر ہمیشہ ٹین ایج میں رہے اور انشاءاللہ تادمِ مرگ ایسے ہی رہیں گے۔ذہنی عمر کی ہم آہنگی کے باعث ہم ان باتوں میں ہمیشہ ایک دوسرے کے رازدار رہے جو ایسی عمروں کا خاصہ ہوتی ہیں۔مثلاً جیلانی صاحب کو انٹر کی ایک طالبہ سے محبت ہوگئی بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس طالبہ کو جیلانی صاحب سے محبت ہوگئی (دراصل لڑکی بچپن سے باپ کی شفقت سے محروم تھی)۔۔ان دنوں میں جیلانی صاحب نے نہایت خشوع و خضوع سے نمازیں پڑھنا شروع کر دیں، گویا:

اس کو پانے کی تمنا یہ یقیں کب ہے مگر

ہاتھ جب اٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگوں

سو جیلانی صاحب دعائیں مانگتے رہے اور مجھے بھی اس محبت کے احوال سے آگاہ کرتے رہے۔۔ میں ان دنوں میں جو بھی دعا کرتا تھا، رد ہو جاتی تھی اس لئے میں زور شور سے ان کی کامیابی کے لئے دعائیں کرنے لگا۔نتیجہ میری توقعات کے عین مطابق نکلا۔۔اسی محبت کے دوران جب لڑکی انٹر کا امتحان دے رہی تھی ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ جیلانی صاحب کو امتحانات کے دوران چیکنگ کے خصوصی اختیارات حاصل تھے انہوں نے وزیر آغا سے کار مانگی تاکہ امتحان گاہ کا دورہ کر آئیں۔ آغا صاحب نے یہ شرط عائد کر دی کہ حیدر قریشی کو ساتھ لے جائیں بے شک سارا دن کار اپنے پاس رکھیں۔ جیلانی صاحب نے کہا حیدر قریشی کو ساتھ لے جانے سے بہتر ہے میں خود ہی نہ جاؤں۔ مجھے اپنے بھید بتانے کے بعد انہیں اب یہ احساس ہونے لگا تھا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

غلام جیلانی اصغر کی محبت کے ساتھ مجھے جوش ملیح آبادی اور قدرت اللہ شہاب دونوں یاد آتے ہیں۔ جوش نے اپنی محبتوں کے اشتہار خود آویزاں کئے تھے بلکہ ان میں ڈھیر ساری رنگ آمیزی بھی کی تھی جبکہ غلام جیلانی اصغر نے اپنی محبتوں کو کبھی مشتہر نہیں کیا۔قریبی دوستوں سے بے اختیاری میں کچھ باتیں کہہ گئے تو یہ محبت کا اپنا زور ہوتا ہے مگر دوستوں سے بھی سارے رنگ چھپائے رکھے صرف بلیک اینڈ وائٹ ہی ظاہر کئے۔قدرت اللہ شہاب چندراوتی کے عشق میں مسجد تک چلے گئے۔ گناہ کی توفیق مانگنے کے لئے لفظوں کے بہانے ڈھونڈتے رہے اور پھر وہاں سے بھاگ نکلے۔۔غلام جیلانی اصغر نے خدا سے ہیرا پھیری کی کوشش نہیں کی۔ بڑے صاف، سلیس اور سادہ لفظوں میں بے تکلفی سے خدا سے کچھ یوں دعا مانگی:

مولا! مجھ میں گناہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ مجھے یہ صلاحیت عطا کر، پھر گناہ کرنے کی توفیق دے اور اس کے بعد میرے گناہ کو معاف بھی کر دے۔ بے شک تو غفور الرحیم ہے!

ادبی لحاظ سے جیلانی صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔شاعر،انشائیہ نگار،مزاح نگار۔۔ان تمام اصناف میں جیلانی صاحب کی شخصیت کا ایک وصف بہت نمایاں ہے اور وہ ہے ان کے مزاج کی شگفتگی اور تازگی۔۔ان کے انشائیوں میں شگفتگی کا عنصر قدرے زیادہ ہوتا ہے اس لئے انشائیہ کے مخالفین نے ان کے انشائیوں کو حوالہ بنانا چاہا لیکن جیلانی صاحب نے الگ سے طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھ کر طنز ومزاح اور انشائیہ کے بنیادی فرق کو خود ہی واضح کر دیا۔

جیلانی صاحب کا شعری مجموعہ ''میں اور میں'' شائع ہوا تو ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔اس مجموعے کی فروخت کے سلسلے میں بعض لطیفے بھی مشہور ہوئے جن میں سب سے عمدہ لطیفہ مشفق خواجہ نے گھڑا تھا۔اس لطیفے کے مطابق جیلانی صاحب نے اپنے پرانے شاگردوں کو اپنا شعری مجموعہ حکماً فروخت کیا۔اس لطیفے میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ جب کتاب کی ایک ہی جلد باقی رہ گئی،وہ ہمیشہ جیلانی صاحب کی بغل میں رہتی۔جہاں کوئی پرانا شاگرد نظر آتا اس سے پوچھتے تم نے میرا شعری مجموعہ دیکھا ہے۔جواب نفی میں ملتا تو کتاب اس کے ہاتھ میں تھماتے اور کہتے چلو نکالو ایک سو روپیہ۔۔جب رقم وصول کر لیتے تو پھر کہتے میاں تم تو شاعری سے کوئی رغبت ہی نہیں رکھتے پھر یہ کتاب تمہارے کس کام کی۔لاؤ کتاب مجھے واپس کر دو۔۔بقول کسے جیلانی صاحب نے ۹۹۹ کتابوں سے اتنی رقم نہیں کمائی جتنی اپنے مجموعہ کی آخری جلد سے کمالی۔۔خیر یہ لطیفہ تو لطیفے کی حد تک تھا۔حقیقت یہ ہے کہ جیلانی صاحب اپنی ادبی کتابوں کی اشاعت کے معاملے سے ہی لاتعلق ہیں۔اسکے برعکس وہ ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابوں کی اشاعت میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ اس میں انہیں مناسب معاوضہ اور خاطر خواہ رائلٹی مل جاتی ہے۔دراصل غلام جیلانی اصغر اپنے دو بزرگوں کی دو مختلف نصیحتوں کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔ماں نے تاکید کی تھی کہ لفظ خون کی صداقت کے سچے امین ہونے چاہئیں۔باپ نے سمجھایا تھا کہ اگر لفظ لکھو گے تو بھوکے مرو گے۔سو جیلانی صاحب نے اپنی ادبی تخلیقات کی صورت میں ماں کی نصیحت پر عمل جاری رکھا اور ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابوں کی صورت میں باپ کی تنبیہ کو مدِنظر رکھا۔یوں ماں باپ کے الگ الگ اور متضاد فکر کے تھپیڑوں میں پرورش پانے والا ننھا جیلانی آج بھی کشمکش میں مبتلا ہے

اور ماں باپ دونوں کو راضی رکھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

جیلانی صاحب میں جو ذہانت،حاضر جوابی اور شگفتگی پائی جاتی ہے وہ عصر حاضر کے اردو کے چند ادیبوں کو ہی نصیب ہوئی ہے۔ان کے طنز میں زہریلا پن اور مزاح میں پھکڑ پن نہیں ہوتا۔کئی بار خود کو ہی اپنے جملوں کی زد پر رکھ لیتے ہیں۔ایک دفعہ وزیر آغا کے ہاں قدرے تاخیر سے پہنچے۔آتے ہی معذرت کرنے لگے کہ خضاب لگا رکھا تھا اس لئے دیر ہو گئی۔پھر خود ہی کہنے لگے یار داڑھی سیاہ ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔بس بندے کا دل سیاہ ہونا چاہئے۔

جب جیلانی صاحب تلہ گنگ کالج کے پرنسپل بن کر گئے وہاں اسلامیات کے ایک پروفیسر کو ان کی آمد گراں گزری کیونکہ وہ خود پرنسپل بننے کے خواہاں تھے۔جیلانی صاحب کی خوبصورت اور چھوٹی سی داڑھی کے باعث پروفیسر صاحب مذکور نے طلبہ میں یہ بات پھیلا دی کہ جیلانی صاحب قادیانی ہیں۔طلبہ کی کھسر پھسر جیلانی صاحب تک پہنچی تو انہوں نے دو لڑکوں کو روک لیا اور پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے؟لڑکوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

سر!سنا ہے آپ قادیانی ہیں؟

جیلانی صاحب نے شگفتگی کے ساتھ جواب دیا:''میں قادیانی نہیں ہوں۔سکھ ہوں بس ذرا داڑھی چھوٹی کرالی ہے''۔دونوں طالب علم یہ سن کر ہنسنے لگے اور اسی لمحے جیلانی صاحب کے اندر کا بارعب پرنسپل باہر آ گیا''تمہیں یہ بات کس نے کہی ہے؟''

لڑکوں کی ہنسی کو بریک لگ گئی اور بوکھلاہٹ میں انہوں نے پروفیسر موصوف کا نام بتا دیا۔چنانچہ دوسرے دن پھر وہ پروفیسر کالج میں نہیں آسکے۔ان کے ٹرانسفر آرڈر سرگودھا سے منگوا کر راتوں رات ان کے گھر پہنچا دیئے گئے۔

ایک دفعہ میں وطن عزیز کی تشویشناک صورتحال کا ذکر کر کے دکھ کا اظہار کر رہا تھا۔اسی دوران میں نے جیلانی صاحب سے پوچھا جیلانی صاحب اس ملک کا کیا بنے گا؟۔۔جیلانی صاحب بولے یہ سوال صرف تمہارے جیسے بے روزگار یا میرے جیسے ریٹائرڈ لوگ ہی کر سکتے ہیں ورنہ ہر شخص یہاں جائز ناجائز ہر طریقے سے جائیداد بنانے میں لگا ہوا ہے اور اس کار خیر میں

اتنا منہمک ہے کہ اسے یہ سوال سننے کی بھی فرصت نہیں ہے۔۔من حیث القوم ہم جس حرص و ہوس میں مبتلا ہیں جیلانی صاحب کی بات میں اس کی واضح نشاندہی موجود ہے لیکن کسی کو اس پر غور کرنے کی فرصت بھی ہو۔اب تو مجھے بھی مزید غور کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

میں نے جیلانی صاحب کو کبھی افسردہ اور غمگین نہیں دیکھا۔محفلیں ادبی ہوں یا نجی۔۔جیلانی صاحب روح رواں کا درجہ رکھتے ہیں۔ان سے مل کر، ان کی باتیں سن کر زندہ رہنے کا حوصلہ ملتا ہے۔۔ان کا جواں سال بیٹا اپنی شادی کے دسویں دن فوت ہو گیا ہم لوگ سکتے میں آ گئے مگر جیلانی صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔میں نے تنہائی میں ان کے دکھ کو کریدنا چاہا مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا اپنے اندر کے دکھ کے طوفان کو اندر ہی سمیٹے ہوئے وہ کسی شانت سمندر کی طرح لگ رہے تھے۔میں نے زخموں کو چھیڑا تو صرف اتنا کہا: مجھے بیٹے کی موت سے زیادہ اپنی بیوہ بہو کا دکھ ہے۔میرا بیٹا خدا کی امانت تھا،اس نے لے لیا مگر اس بے چاری کو خدا نے کیوں سزا دی ہے۔میرے بیٹے کو خدا شادی کے دس دن بعد بلانے کی بجائے شادی سے پہلے ہی بلا لیتا۔اس لڑکی کو تو روگ نہ لگتا۔

بات پرانی اور پامال سہی مگر پھر بھی حقیقت ہے کہ عموماً محفلوں میں زیادہ ہنسنے ہنسانے والے لوگ اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں۔اپنے دکھوں کو چھپانے کی کوشش میں وہ لوگوں میں مسرّتیں بانٹتے چلے جاتے ہیں۔جیلانی صاحب بھی ایسے ہی دکھی مگر زندہ دل انسان ہیں۔علم وفضل کے لحاظ سے ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کا فرمایا ہوا مستند ہے۔ان کے ادبی مرتبے کو مخالفین بھی احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ان کے متعدد شاگرد ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔اگر لاہور کے بعض ادیبوں کی طرح غلام جیلانی اصغر اپنے وسائل کو بروئے کار لائیں، اپنی پبلک ریلیشننگ سے فائدہ اٹھائیں تو ملک کا سینیٹر بننا ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں اور کچھ بھی نہیں تو اکادمی ادبیات کی چیئرمین شپ تو گویا گھر کی بات ہے مگر افسوس کہ وزیر آغا کی طرح غلام جیلانی اصغر بھی بڑے ہی بے نیاز قسم کے انسان ہیں۔مزید افسوس یہ کہ دونوں صاحبان نے اپنے مزاج کے اثرات مجھ پر بھی مرتب کئے اور یوں مجھے بھی بے

نیازی کی دولت بخش کر دنیا وآخرت میں خوار کرایا ہے۔

جیلانی صاحب کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے دراصل لکھنے کی کوشش کرنا ہے۔یہ ایک ادھورا سا خاکہ ہے۔بہت ہی ادھورا سا۔۔مجھے خود احساس ہے کہ جیلانی صاحب کی شخصیت کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکا۔جیلانی صاحب قلم کی گرفت میں آئیں تو ان کی شخصیت منعکس ہو سکے۔وہ تو بس ہوا کے جھونکے کی طرح ہیں۔اپنے ہونے کا، اپنی موجودگی کا، اپنی خنکی کا احساس تو دلاتے ہیں مگر ہاتھوں میں ہاتھ نہیں دیتے۔

شاید میں کبھی اس ادھورے خاکے کو پورا کر سکوں!

☆☆☆

بلند قامت ادیب

(اکبر حمیدی)

تیری لگن میں تجھ سے بھی آگے نکل گئے
تیرے مسافروں کو ٹھہرنا نہ آسکا

اکبر حمیدی سے میری ملاقات اور تعلق کی نوعیت تھوڑی پیچیدہ ہے۔ یہ پیچیدگی میری اپنی پیدا کردہ ہے۔ میں اکبر حمیدی کے بنائے ہوئے یا دکھائے ہوئے سیدھے رستے پر چلتا ہوں پھر اس رستے کو، سیدھے سادے رستے کو الجھا کر بھول بھلیّاں سی بنالیتا ہوں یوں میرے لئے اچھی بھلی بامعنی منزلیں بھی بے معنی ہوجاتی ہیں۔ اکبر حمیدی کی تقلید کا سلسلہ پتہ نہیں کہاں سے شروع ہوا تھا۔ فی الوقت جو سرا ہاتھ آ رہا ہے اس کے مطابق اکبر حمیدی کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہوچکی تھی اور میرے ہاں بھی پہلی بیٹی پیدا ہوچکی تھی۔ پھر اکبر حمیدی کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے شعیب رکھا۔ چنانچہ میں بھی جلد ہی ایک بیٹے کا باپ بن گیا اور اس کا نام شعیب رکھ دیا۔ پھر اگلے برس ایک اور بیٹا ہوا اس کا نام عثمان رکھ دیا اسی دوران اکبر حمیدی کے ہاں ایک بیٹا ہوگیا جسے وہ پیار سے ٹیپو کہتے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنے بیٹے کا نام عثمان رکھ لیا ہوتا تو ہمارا کوئی جھگڑا نہ تھا لیکن جب انہوں نے ٹیپو نام رکھ لیا تو مجھے بھی رواں ہونا پڑا۔ چنانچہ میرے ہاں تیسرا بیٹا پیدا ہوا جسے ہم سب پیار سے ٹیپو کہتے ہیں۔ چونکہ میں رواں ہو چکا تھا اس لئے بریکیں لگنے تک ایک اور بیٹی پیدا ہوگئی۔ اب اکبر حمیدی ایک بیٹی اور دو بیٹوں کے باپ ہیں اور میں دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کا باپ ہوں۔ اکبر حمیدی نے ایک عرصہ تک اپنے آبائی علاقے میں رہ کر چھوٹی موٹی نوکری کی۔ میں نے بھی انیس سال اپنے آبائی علاقے میں مزدوری کرکے

گزار دیئے۔ پھر اکبر حمیدی درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہوکر اسلام آباد جیسے صحت افزا مقام پر چلے گئے تو میں بھی درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہوکر اسلام آباد سے بھی ساٹھ ستر میل آگے ایبٹ آباد جیسے صحت افزا مقام پر پہنچ گیا اور صحت افزا مقام کے حوالے سے جب وہاں بھی چین نہ آیا تو یورپ کے ایک ملک جرمنی میں پہنچ گیا۔

یہ نجی زندگی سے چند مثالیں تھیں ادبی زندگی کی طرف دیکھتا ہوں تو وہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔ اکبر حمیدی نے غزلیں کہیں۔۔ میں نے بھی غزلیں کہنا شروع کردیں۔ اکبر حمیدی نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے چند نظمیں کہیں تو میں بھی نظم نگاری کی طرف مائل ہوگیا۔ اکبر حمیدی نے انشائیہ نگاری شروع کی تو میں نے بھی دھیمی رفتار سے سہی، انشائیے لکھنے شروع کردیئے۔ اکبر حمیدی نے غلطی سے ایک دو افسانے لکھ لئے۔ میں نے جوابی کارروائی کے طور پر افسانوں کا ایک مجموعہ چھپوالیا اور دوسرا مجموعہ ترتیب دے رہا ہوں۔ اکبر حمیدی نے اپنے چند بزرگوں کے خاکے لکھے تو میں نے بھی اپنے بزرگوں کے خاکے لکھنے شروع کردیئے۔ یہ خاکے کیا تھے قبیلہ قریش اور جاٹوں کے درمیان جنگ کا اعلان تھا۔ اکبر حمیدی نے اپنے بعض عزیزوں کی چند خوبیاں بیان کیں، میں نے اپنے عزیزوں میں ان سے دس گنا زیادہ کمالات دکھادیئے۔ اکبر حمیدی نے اپنے بعض عزیزوں کی چند خامیاں بڑے سلیقے سے بیان کیں، میں نے اپنے بعض عزیزوں میں اس سے زیادہ سلیقے کے ساتھ ہزار کیڑے ڈال دیئے۔ آخر اکبر حمیدی کو ہار ماننا پڑی انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کے خاکے لکھنے بند کردیئے، ویسے اب سوچتا ہوں کہ قبیلہ قریش اور جاٹوں کی جنگ تو شاید جاٹ ہی جیت گئے ہیں کیونکہ میرا اپنا ننہال جاٹ باجوہ خاندان ہے اور اپنے عزیزوں کے دس خاکوں میں سے چار خاکے تو خود میں نے جاٹوں کے لکھ دیئے ہیں۔

اس قبائلی جنگ اور اس کے نتیجہ سے قطع نظر اکبر حمیدی اور میں تقریباً تمام اصناف ادب میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں اس کے باوجود ہماری دوستی نہ صرف قائم ہے بلکہ بے حد مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ ''انجمن ستائش باہمی'' کے اس دور میں مجھ سے بارہا زیادتیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً ''اوراق'' میں اکبر حمیدی کا خصوصی گوشہ شائع ہوا تو مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ اس کے مندرجات کے

حوالے سے میں مدیر ''اوراق'' کو سچے دل سے ایک توصیفی خط لکھنا چاہتا تھا لیکن پھر خیال آیا کہ یار لوگ کہیں گے دونوں دوست ہیں اس لئے تعریف کی جا رہی ہے۔ چنانچہ میں نے اکبر حمیدی کو اپنے تاثرات سے آگاہ کر دیا لیکن ''اوراق'' میں چپ ہو رہا۔ مختلف جرائد میں ان کی تخلیقات چھپتی ہیں تو ان کے بارے میں انہیں جرائد ہی میں۔۔ میں نے اپنے تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے مواقع پر حجاب مانع رہا۔

ایک رسالہ میں اکبر حمیدی کی ایک خوبصورت غزل چھپی۔ (تب) پشاور سے چھپنے والے اس رسالے کی خوبی یہ رہی ہے کہ اس میں جتنے صفحات ادبی تخلیقات کے لئے ہوتے ہیں لگ بھگ اتنے صفحات قارئین کے خطوط کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ اکبر حمیدی کی غزل چھپنے کے بعد رسالہ مذکور کا اگلا شمارہ آیا تو مدیران کی تعریف سے لبریز خطوط میں سے کسی میں بھی اکبر حمیدی کی اس غزل کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔۔ میں ایبٹ آباد سے اسلام آباد گیا تو اکبر حمیدی کی اس غزل کی تعریف کی اور خاص طور پر یہ شعر دہرایا:

علم نے یوں نہ کیا تھا مرے دل کو پتھر
کوئی سچ کہتا تو میں مان لیا کرتا تھا

اکبر حمیدی کہنے لگے یار! اس رسالے میں تو لگتا ہے کسی کو بھی غزل پسند نہیں آئی۔ تب میں نے انہیں کہا کہ خاص طور پر اس رسالے کے قارئین کی رائے سے کبھی اثر نہیں لیں، بلکہ اس کے قارئین کی اکثریت جس غزل کو زیادہ پسند کرے اس پر احتیاطاً نظر ثانی کر لیا کریں۔۔ بحیثیت، شاعر مجھے اکبر حمیدی کی غزلیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ایک خاص زاویۂ نگاہ سے بات کروں تو عبید اللہ علیم، صابر ظفر اور اکبر حمیدی میں سے عبید اللہ علیم کی شاعری over confidence کا شکار ہو چکی ہے۔ صابر ظفر جذبہ اور تخیل کی اہمیت کو فراموش کر کے عروضی تجربات کی شاعری کرنے لگے ہیں جبکہ اکبر حمیدی کے ہاں جذبہ، تخیل اور عروضی مہارت کے امتزاج سے شاعری جنم لیتی ہے اور اکبر حمیدی اپنی سادگی اور انکساری کے باعث مسلسل خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں۔

بحیثیت انشائیہ نگار اکبر حمیدی نے انشائیہ کے مزاج کو پوری طرح سے سمجھا ہے۔ ان کے

انشائیے، انشائیہ کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہونے کے باوجود مروّجہ انشائیہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انشائیہ اور مزاحیہ کے فرق کو واضح کرنے کے لئے اور کچھ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے انہوں نے مزاحیہ ریڈیو کالم بھی لکھے۔ ان کے خاکوں کی اپنی ایک شان ہے۔ مولوی عبدالحق سے محمد طفیل تک خاکہ نگاری کا ایک دور رہا۔ پھر یہ صنف ادیب نما صحافیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ انہوں نے شخصیت کی خاک اڑانے کو ہی خاکہ نگاری سمجھ لیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ خاکہ نگاری کی ایسی آلودہ فضا میں اکبر حمیدی کے خاکے سرسبز پیڑوں کی طرح ادبی آلودگی کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ خاکہ نگاری نہ تو شخصیت کی خاک اڑانے کا نام ہے اور نہ شخصیت پر خاک ڈالنے کا۔۔ بلکہ یہ تو پل صراط پر سے گزرنے کا عمل ہے جبکہ ادیب نما صحافیوں کے خاکے سرکس کے رسوں پر چلنے کا منظر دکھاتے ہیں۔ شاعر، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، مزاح نگار۔۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اکبر حمیدی نے تنقید کا خانہ بھی خالی نہیں رہنے دیا۔ حال ہی میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مضامین غیب'' چھپ کر آیا ہے۔ یہ کتاب ابھی مجھ تک نہیں پہنچی تاہم مروّجہ تبصرہ نگاری کے مطابق میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علم غیب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اکبر حمیدی طبعاً ایک سیدھے سادے، سچے، کھرے اور صاف گو دیہاتی ہیں۔ انہیں ہیرا پھیری اور چالاکی نہیں آتی تھی۔ کھلی دوستی اور کھلی دشمنی۔ لیکن شہر کے بعض دوستوں اور مہربانوں کی مکاریوں اور ہیرا پھیریوں کا شکار ہوتے ہوتے آخر انہیں بھی تھوڑی بہت ہیرا پھیری اور چالاکی کرنا آ گئی ہے۔۔ میں سمجھتا ہوں کسی مکّار کی مکّاری کا مقابلہ کرنے کے لئے تھوڑی بہت دھوکہ دہی اور مکّاری سے کام لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ سو اکبر حمیدی نے اگر کہیں تھوڑی بہت چالاکی سے کام لیا ہے تو صرف مکار لوگوں کے سامنے۔ اپنے دوستوں کے لئے تو وہ ہمیشہ سے سیدھے، سچے اور صاف اکبر حمیدی ہیں۔

ایک دفعہ اکبر حمیدی مجھ سے کہا:

یار حیدر قریشی! ادب کو تمہارے شر سے کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟۔۔

میں نے کہا آپ لکھنا چھوڑ دیں، میں بھی لکھنا چھوڑ دوں گا۔صرف اسی صورت میں ہی ادب کو میرے شر سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ میں نے ادب کی مختلف اصناف میں اکبر حمیدی سے اتنا اثر لیا ہے کہ اب باقاعدہ طور پر ان کے ''متاثرین'' میں شمار کیا جانا چاہتا ہوں۔

☆☆☆

صاف گو ادیبہ

(عذرا اصغر)

ہم تہی دست آبروئے فقر
سود دے کر زیاں مانگتے ہیں

لڑکپن کے جذبات میں گھری ہوئی ایک لڑکی کا قصہ ہے۔وہ لڑکی اپنے اردگرد موجود زندگی کے کرداروں کو غور سے دیکھتی پھر اپنے کچے پکے احساسات میں ان کرداروں کو گوندھ کر ان کی کہانیاں بنانے کی کوشش کرتی۔اس کوشش میں کبھی اس لڑکی کے اپنے آنسوؤں کا پانی اتنا زیادہ پڑ جاتا کہ کہانی کے نقش ہی نہ بن پاتے اور کبھی پانی اتنا کم ہوتا کہ کہانی بھربھرا کر رہ جاتی۔اس کے باوجود اس لڑکی نے سیکھنے کا عمل اور ریاضت جاری رکھی اور آخر کار ایک دن اپنے والد کی شخصیت کو سامنے رکھ کر ایک کہانی بنانے میں کامیاب ہوگئی۔حوصلہ افزائی کی امید کے ساتھ یہ کہانی بڑی بہن کو دکھائی لیکن وہاں سے سخت ڈانٹ پڑی۔ بھائی سے شاباش ملنے کی توقع تھی وہ بھی پوری نہ ہوئی۔حوصلہ شکن حالات کے باوجود اس لڑکی نے ہار نہیں مانی۔آنکھیں جو کچھ دیکھتیں اسے ذہن اور دل کے حوالے کر دیتی اور کچھ عرصہ کے بعد اسے اپنے اندر سے کہانی کی صورت میں نکال لیتی۔اس طرح اس نے کئی کہانیاں لکھیں، یہی اس کے لڑکپن کی محبت تھی۔اپنی کہانیوں کو سب سے چھپا کر رکھنا شروع کر دیا۔اسی دوران وہ لڑکی لڑکپن کی دہلیز عبور کر کے جوان ہوئی اور پھر خاندان کے دستور کے مطابق پیا کے دیس سدھار گئی۔ پیا کے دیس جا کر اسے پتہ چلا کہ اس کے پیا کو شاعری کا شوق ہے۔اس خبر نے جیسے لڑکپن کی محبت کو پھر سے بیدار کر دیا۔حوصلہ کر کے اس لڑکی نے اپنے پیا جی کو دبے دبے لفظوں میں اپنی افسانہ نگاری کی

اطلاع دی۔شاعر پیا اس خبر سے نہال ہوگئے گویا ان کے گھر میں شاعری اور افسانے کا ملن ہو رہا تھا۔انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔اس کے اندر کی افسانہ نگار کو ابھارا،سنوارا۔۔اور پھر وہ لڑکی اردو ادب میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آنے لگی۔اس لڑکی کا نام عذرا تھا اور اس کے پیا جی اصغر مہدی تھے،سو یوں اردو دنیا کو اصغر مہدی کے وسیلے سے عذرا اصغر جیسی افسانہ نگار ملی۔

عذرا اصغر کو افسانہ نگاری کے سلسلے میں مائیکے میں جس گھٹن کا شکار ہونا پڑا اسکے نتیجے میں انہوں نے اپنے گھریلو ماحول کو بالکل ہی ادبی بنا کر رکھ دیا۔ادبی یوں کہ گھر،گھر نہیں لگتا کسی ادبی انجمن کا دفتر لگتا ہے۔عذرا افسانہ نگار، اصغر مہدی شاعر، شبہ طراز شاعرہ بھی اور مصورہ بھی۔ بیٹا امبر بھی فکشن سے دلچسپی رکھتا ہے۔ایک سفر نامہ اور چند کہانیاں لکھ چکا ہے۔اس خاندانی صورتحال کے باوجود بھی گھر تھوڑا سا گھر دِکھتا تھا۔سو اس کمی کو دور کرنے کے لئے یا پورا کرنے کے لئے انہوں نے ''تجدید نو'' کے نام سے ادبی رسالہ نکال لیا اور مزید احتیاط کے طور پر''تجدید اشاعت گھر'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کر لیا تا کہ گھر اشاعت گھر لگے،یوں عذرا اصغر نے اپنے گھر کو ادب کے گودام میں بدل دیا۔تجدید اشاعت گھر ایسا ادارہ ہے جہاں میرے جیسے لوگوں کی کتابیں چھپتی ہیں۔ مجھے علم ہے کہ راولپنڈی اور لاہور کے بعض ناشر ادیبوں سے پچاس پچاس ہزار روپے (بعض اوقات اس سے زیادہ بھی) نقد لے کر ان کی کتابیں چھاپتے ہیں۔ یوں مجھے اپنے ناشر کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے تھا لیکن وہ ادب کی بے لوث خدمت کرنے پر تُلی ہوئی تھیں تو مجھے ان کے خلوص کو خراب کرنے کا کیا حق پہنچتا تھا۔ بلکہ میری تو دعا ہے کہ''ادب کی بے لوث خدمت'' کرنے کا انکا یہ جذبہ ہمیشہ سلامت رہے۔

عذرا اصغر ایک عرصہ تک ''تخلیق'' لاہور کی مجلس ادارت میں شامل رہیں اس زمانے میں ہی میں نے خانپور سے ''جدید ادب'' کا اجرا کیا۔تب خانپور کے ایک نیم پاگل افسانہ نگار نے اپنی طرف سے بنا کر پتہ نہیں ایڈیٹر تخلیق کو میرے حوالے سے کیا کچھ لکھ مارا۔ایک مرحلے پر مجھے معلوم ہوا کہ ادارہ تخلیق مجھ سے ناراض ہے۔میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کسی مخالف نے ایسا پاگل

پن کیا ہوگا۔ مدت بعد اس شرارت کا علم ہوا۔ میں نے وضاحت کرنا چاہی تو عذرا اصغر نے فوراً کہا وضاحت کی ضرورت ہی نہیں۔''اُن حضرت'' کی کارستانیاں تو ساری ادبی دنیا جاتی ہے اور ان کے کئی لطیفے بھی مشہور ہو چکے ہیں۔

اظہر جاوید سے اصغر مہدی اور عذرا اصغر کے گھریلو مراسم ہیں۔شِبہ کو لاہور میں کوئی پرابلم ہو تو اظہر جاوید سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ادھر اظہر کی بیٹی جو اسلام آباد کے قریب ہی مقیم ہے اس کی دیکھ بھال کا فریضہ اصغر کو ادا کرنا ہوتا ہے۔''تخلیق'' کے زمانہ ادارت میں اظہر جاوید اور عذرا اصغر میں ایک دوستانہ اختلاف رہتا تھا۔ عذرا اصغر کا خیال تھا کہ کوئی خاتون اگر افسانہ نگار یا شاعرہ نہیں ہے تو اسے خود لکھ لکھ کر دینے اور چھاپنے کا عمل ادبی زیادتی اور ظلم ہے جبکہ اظہر جاوید کے نزدیک یہ غالبًا اظہارِ محبت یا اشتہارِ محبت ہوتا ہے۔ایک دفعہ میں نے عذرا سے کہا اظہر کی فلاں نظم سے سندھ کی ایک بی بی چھلکی پڑ رہی ہے۔جواب ملا: اظہر کا تو یہ حال ہے کہ کوئی لڑکی اس کے دفتر کے سامنے سے گزر جائے ، اچھی لگ گئی تو اس پر بھی غزل ہو جائے گی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میرے اور اظہر جاوید کے معاملات بہت ملتے جلتے ہیں لیکن بعد میں پتہ چلا وہ مجھ سے زیادہ مظلوم ہیں کیونکہ خانم کی خ کا نقطہ نیچے لانے میں انہوں نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر بِتا دی۔

اسلام آباد آنے کے بعد عذرا اصغر نے ''تخلیق'' کی نمائشی ادارت کرنے کی بجائے اپنا رسالہ ''تجدید نو'' جاری کیا۔''تخلیق'' پر اظہر جاوید کی چھاپ تھی۔اب ''تجدید نو'' پر عذرا اصغر کی اپنی چھاپ ہے۔''تخلیق'' اور''تجدید نو'' کے فرق سے اظہر جاوید اور عذرا اصغر کے مزاجوں کا فرق معلوم کیا جا سکتا ہے۔ عذرا صاف گو، دوٹوک بات کرنے والی اور سیدھی سادی ہیں۔ جسے سچ سمجھا بے دھڑک کہہ دیا۔ جس طرح ''تجدید نو'' اپنی اچھائیوں اور کتابت کی غلطیوں سمیت اپنا ایک تاثر رکھتا ہے۔ایسا ہی عذرا اصغر اپنی سادگی اور صاف گوئی کا ایک تاثر رکھتی ہیں۔ان کے برعکس اظہر جاوید ادبی دنیا کی اونچ نیچ سے بخوبی واقف ہیں۔''تخلیق'' کے صفحات پر متحارب دھڑوں کو ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔زندگی کے وار سہتے سہتے انہوں نے زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ

لیا ہے۔عذرا اصغر یہ ہنر کبھی نہیں سیکھ سکیں گی۔

عذرا اصغر کی سادگی اور صاف گوئی کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔فیصل آباد سے کسی لڑکی نے تجدید کے لئے ایک مضمون بھیجا یہ مضمون ایک ایسے صاحب کے بارے میں تھا جنہوں نے ادب کو صحافت کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔اچھے بھلے ادیب ان صاحب کا نام آتے ہی محتاط ہو جاتے ہیں۔کوئی بھی ان کی صحافیانہ دہشت گردی کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔اسی لئے بعض معتبر قسم کے ادیب بھی اپنی سطح سے گر کر اس ادیب نما صحافی کی تعریف بلکہ خوشامد کرتے ہیں اصولاً عذرا اصغر کو اس صحافی کی شان میں لکھا گیا مضمون چھاپ کر اس کی خوشنودی حاصل کرنی چاہئے تھی لیکن انہوں نے مضمون بھیجنے والی لڑکی کو خط لکھ دیا کہ جن صاحب کے بارے میں آپ نے مضمون بھیجا ہے وہ سرے سے ادیب ہی نہیں ہیں۔ڈنڈے کے زور سے وہ بے شک ادیب کہلاتے رہیں۔آپ کسی بھی ادیب پر مضمون بھیجیں میں ضرور چھاپوں گی لیکن میں غیر ادیبوں کو ادیب بنا کر پیش نہیں کر سکتی۔اس صاف گوئی کا نقصان عذرا اصغر کو آخری دم تک اٹھاتے رہنا ہے۔

صاف گوئی سے بے مروّتی کا تاثر بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن عذرا اصغر بے مروّت نہیں ہیں۔ پرانے تعلقات کی ممکنہ حد تک پاسداری کرتی ہیں۔سیدہ حنا سے ان کی پرانی دوستی ہے۔''تجدید نو'' چھپنا شروع ہوا تو سیدہ حنا کی طرف سے تعلقات میں کھچاؤ پیدا ہو گیا۔لیکن پہلے ایک اور ضمنی بات۔۔سیدہ حنا نے پہلے تین یکساں مصرعوں کے ہائیکو لکھے تھے۔بعد میں بھید کھلا کہ ہائیکو کا اصل وزن کچھ اور ہے۔اسی دوران سیدہ حنا نے تین یکساں مصرعوں کے ماہیۓ لکھنے شروع کر دیئے بدقسمتی سے مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ ماہیۓ کا اصل وزن بھی کچھ اور ہے۔یہ ایک ادبی معاملہ تھا اسے ادبی سطح پر ہی طے ہونا چاہئے تھا لیکن شاید یہ سیدہ حنا کی انا کا مسئلہ بن گیا۔اسی دوران ''سلگتے خواب'' چھپ گئی۔میں نے کتاب کا ایک سادہ سا اشتہار بنا کر ادارہ ''ابلاغ'' کی خدمت میں کتاب کے ساتھ بھیج دیا۔ساتھ ہی لکھا کہ آپ کتاب پر تبصرہ مت چھاپیں صرف اشتہار چھاپ دیں۔کسی دوست کا دل پسیج گیا تو شاید کبھی کوئی مضمون بھی لکھ دے۔۔سیدہ حنا کو اصل غصّہ تو ماہیے کے وزن کے مسئلہ پر تھا مگر انہوں نے غلط طور پر میرے خط کو آڑ بنا کر اداریے میں میری

مذمت کر ڈالی اور لکھا کہ ہم اتنی محنت کر کے تبصرے لکھتے ہیں اور آپ کو مختصر تبصرے پسند ہی نہیں آتے۔میں نے اسکے جواب میں پھر انہیں تفصیلی خط لکھا جسے انہوں نے اس طرح سنسر کر کے چھاپا کہ ان کی اصل نیت ظاہر نہ ہونے پائے۔۔جب عذرا اصغر کو یہ احوال معلوم ہوئے تو وہ خاصی حیران ہوئیں۔پھر کہنے لگیں اداریے کا اصل پس منظر تو آپ سے معلوم ہوا ہے لیکن اگر صرف اداریے کو ہی مد نظر رکھیں تب بھی سیدہ حنا نے آپ پر جو الزام لگایا ہے بالکل وہی جرم تو وہ خود کر چکی ہیں۔''تجدید نو'' میں ان کی ارسال کردہ کتب پر مختصر تبصرے چھپے تو ان کا شدید برہمی کا خط آیا کہ یہ تبصرہ چھاپنے سے بہتر تھا آپ کچھ نہ چھاپتیں۔۔یہ قصہ بتا کر عذرا اصغر مسکرائیں پھر بولیں چاہوں تو میں بھی ان کا وہی برہمی والا خط چھاپ سکتی ہوں لیکن مجھے پھر بھی پرانی دوستی کا لحاظ ہے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صاف گوئی کے باوجود عذرا اصغر پرانی دوستی کا لحاظ بھی کر جاتی ہیں۔

ادیبوں اور پروفیسروں کے بھلکڑ پن کے کئی لطیفے مشہور ہیں۔کسی حد تک یہ خوبی اس طبقے میں قدرتی طور پر ہوتی ہے۔عذرا اصغر کو قدرت نے اس نعمت سے کچھ زیادہ ہی نوازا ہے اس کا سب سے زیادہ فائدہ خود عذرا کو اور نقصان اصغر مہدی کو ہوا ہے۔

صاف گو ادیبوں کو اپنی صاف گوئی کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔پی آر شپ کے اس دور میں انہیں ان کے جائز حق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے لیکن عذرا اصغر اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ بحیثیت افسانہ نگار پاکستان میں ہی نہیں بھارت میں بھی مسلسل نمایاں ہو رہی ہیں۔متعدد معیاری افسانوی انتخاب چھپے ہیں جن میں عذرا اصغر کے افسانے شامل ہیں۔جن دنوں میں عذرا اصغر ''تخلیق'' کے ادارہ میں شامل تھیں تب ''تخلیق'' میں کچھ اس قسم کا اشتہار چھپا کرتا تھا کہ اب ادب کی جو بھی تاریخ چھپے گی اس میں عذرا کا نام نمایاں ہوگا۔''تخلیق'' سے الگ ہونے کے بعد اب پتہ نہیں یہ اشتہار کیوں نہیں چھپتا۔۔لیکن اس اشتہار کے نہ چھپنے کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے اب عذرا اصغر کا نام سچ مچ افسانوی ادب کی تاریخ میں آنے لگا ہے۔

☆☆☆

دوستی کا کمبل

(سعید شباب)

جو دعا کرتے تھے الٹا ہی اثر ہوتا تھا
تیری چاہت کی دعا رب سے بچالی ہم نے

خانپور کی محدود ادبی فضا میں میرے دو ابتدائی دوست تھے، جمیل محسن اور اے کے ماجد۔۔ دونوں میرے ہم جماعت بھی رہے تھے۔ دونوں سے میری دوستی قائم رہی۔ جمیل محسن کے مجھ پر دو احسان ہیں۔ ایک احسان یہ کہ اس نے مجھے بزم فرید خانپور کے پلیٹ فارم سے اپنی ادبی زندگی کے آغاز کا موقعہ دیا اور دوسرا احسان یہ کہ مجھے سعید شباب جیسے دوست سے متعارف کرایا۔

جمیل محسن کبھی کبھار ''اُس بازار'' بھی چلا جایا کرتا تھا۔ اس کے ذریعے کئی اوٹ پٹانگ قسم کے دوستوں سے ملنا پڑا۔ ایسے ہی ایک نوجوان صراف سے بھی تعارف ہوا۔ ان دنوں گولڈن سنیما خانپور کے سامنے ایک سرکس شو ہو رہا تھا۔ اس صراف نوجوان نے مجھے سرکس چلنے کی دعوت دی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی اکبر کو بھی ساتھ لے لیا۔ وہاں پہنچ کر اس دوست نے کسی بہانے ہمیں سرکس کی بجائے اس کے عین سامنے واقع بازارِ حسن کی سیر کرادی۔ میں ان دنوں مروّجہ اخلاقیات کا سخت پابند تھا جس کی وجہ سے حد درجہ کا بزدل بھی تھا۔ اس بزدلی کو ہمارے سماج نے خوامخواہ شرافت کا نام دے رکھا ہے۔ چند گلیاں گھومنے تک میں خوف اور شرمندگی کے باعث پسینے پسینے ہو چکا تھا۔ اکبر کم عمری کے باعث کچھ زیادہ جانتا تو نہیں تھا لیکن ہر دروازے کو وہ پُر اشتیاق نظروں سے لپک لپک کر دیکھتا تھا۔ میرے خوف اور اصرار کے باعث ہم جلد ہی وہاں سے نکل آئے۔

میں نے بعد میں جمیل محسن سے ناراضی کا اظہار کیا کہ کیسے گندے دوست سے متعارف کرا دیا۔ اس سیاحت کے نتیجہ میں آگے چل کر مجھے ایک بڑا فائدہ اور ایک نقصان ہوا۔ فائدہ یہ ہوا کہ جمیل محسن نے اس صراف کی دوستی کی خرابی کی تلافی کے لئے سعید شباب سے متعارف کرایا۔ اور نقصان یہ ہوا کہ ایک عمر کے بعد جب اکبر کو میں نے اس کی بعض سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی تو اس نے دوٹوک لفظوں میں کہا کہ مجھے اس بازار میں پہلی بار لے جانے والے آپ ہی تھے۔ تب مجھے پہلی بار یہ دکھ ہوا کہ میری زندگی اس قسم کے گناہوں سے محروم کیوں رہی۔ میری بزدلی نے شرافت کا نقاب اوڑھ کر مجھے کسی گناہ کا نہ رکھا۔

سعید شباب جب پہلی بار جمیل محسن کے ساتھ مجھے ملنے آیا تو جمیل کے بیشتر اوٹ پٹانگ دوست میرے ذہن میں تھے۔ چنانچہ میں نے ان سارے دوستوں کی برہمی سعید پر اتارنے کے لئے اسے جملوں کی زد پر رکھ لیا۔ ایسے تند و تیز جملے تھے کہ سعید ان کی تاب نہ لا سکا اور اٹھ بھاگا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چند دن گزرے تھے کہ سعید پھر آن ٹپکا۔ اس بار میں نے جملوں میں مزید شدت پیدا کی اور سعید ایک بار پھر اٹھ بھاگا لیکن ہفتہ بھر کے بعد پھر آ گیا۔ میں نے ابھی پہلا جملہ ہی چھوڑا تھا کہ سعید ہاتھ اٹھا کر بولا: حیدر صاحب! میں نے آپ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ آپ جتنی جملہ بازی کر سکتے ہیں کر لیں لیکن اب میں یہ دوستی نہیں چھوڑوں گا۔۔ بس پھر سعید کی دوستی مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ باقی سارے دوست اور ان کی دوستیاں دھندلاتی گئیں اور سعید کی دوستی واضح اور روشن ہوتی چلی گئی۔ پھر دوست ہی نہیں میرے بھائی بھی پیچھے ہٹتے چلے گئے اور ان کا بدل بھی سعید شباب بنتا چلا گیا۔ ایک بار میں نے ایک چھوٹے بھائی کو کسی بات پر ڈانٹا تو اس نے ترکی بہ ترکی ایسا جواب دیا کہ پھر میں کسی بھائی کو کبھی کوئی نصیحت نہ کر سکا لیکن سعید کو میں نے ایک دو بار کسی معمولی سی غلطی کی بنا پر ڈانٹا تو اس نے اس طرح سر جھکا لیا جیسے کوئی چھوٹا بھائی، باپ جیسے بڑے بھائی کی بے جا ڈانٹ کو سعادت سمجھ کر قبول کر رہا ہو۔

سعید نے خانپور کے ادبی ماحول میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میں ایک معمولی مزدور تھا اور سعید بھی میرے جیسا ہی تھا۔ ہمارے مقابلے میں جو شعرائے کرام تھے ان میں کوئی

پروفیسر تھا، کوئی بینکر، کوئی ایڈووکیٹ تھا تو کوئی کچھ اور، سماجی لحاظ سے ایسی معزز قسم کی چیزوں کے مقابلے میں ہماری کوئی حیثیت نہیں تھی۔اس کے باوجود ہم نے جم کر مقابلہ کیا۔مخالفین کی ساری سازشیں اور سیاستیں انہیں پر الٹ کر پڑیں۔ اگرچہ اس مقابلے میں بعض اور دوستوں نے بھی خلوص دل کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ سعید باقی سارے دوستوں سے زیادہ فعال رہا۔ بینک والے شاعر دوست سے میری گہری دوستی تھی۔ دوسرے لوگ زیادہ تر اس لئے میرے مخالف ہوئے تھے کہ میں بینک والے دوست کا اتنا خیال کیوں رکھتا ہوں لیکن پھر وہی بینک والا دوست دوسروں کے ساتھ مل کر میرے خلاف محاذ کھول بیٹھا تو مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ میں دل گرفتہ بیٹھا تھا۔سعید آ گیا۔ میں نے اس سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے۔ میرے بات سن کر سعید نے فوراً کہا کہ اگر گل گھر ہی سات ہوں تو کیا ڈائن بے چاری بھوکی مر جائے؟

جمیل محسن کے دادا محسن بریلوی اپنے زمانہ کے ریختی گو شاعر تھے۔جمیل نے شروع میں اپنے دادا کی نسبت سے اپنا نام جمیل بریلوی رکھا۔ ایک بار سعید نے جملہ کسا: الٹے بانس بریلی کو۔۔والی بات جمیل بریلوی کے نام سے اب سمجھ میں آئی ہے۔۔جمیل کا موقف یہ تھا کہ وہ اپنے دادا کی نسبت قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس پر سعید نے اسے مشورہ دیا کہ بریلوی کے بجائے محسن کی نسبت اپنالو۔ چنانچہ پھر جمیل بریلوی نے اپنا نام جمیل محسن رکھ لیا۔

ایک بار مسجد کے لئے چندہ وصول کرنے والے پیشہ ور قسم کے ایک مولوی صاحب میری داڑھی سے دھوکہ کھا کر میرے سر ہو گئے۔ میں نے انہیں سلیقے سے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے ایک اینٹ کے بدلے میں جنت میں ایک گھر کی بشارت دے کر چندہ وصول کرنے کا تہیّہ کئے ہوئے تھے۔تب سعید نے ان صاحب سے سنجیدگی کے ساتھ کہا: مولوی صاحب! آپ کس سے چندہ مانگ رہے ہیں۔ یہ بندہ تو خود یہی کاروبار کرتا ہے۔ان صاحب سے تو میری جان چھوٹ گئی لیکن مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میری داڑھی نے میرا حلیہ مسجد کے لئے چندہ جمع کرنے والوں جیسا بنا دیا ہے۔

سعید کو گلوکاری کا شوق ہے۔غزل کی گائیکی میں اس نے خاصی مہارت حاصل کی تھی۔ایک ہارمونیم بھی خرید رکھا تھا ایک بار سعید نے بتایا کہ اس نے موسیقی کی جو تھوڑی بہت تربیت حاصل کی ہے اس کے لئے مجبوراً خانپور کے ''اُس بازار'' میں ہی جانا پڑتا تھا اور یہ کہ وہ اب بھی کبھی کبھار اُدھر چلا جاتا ہے۔ چونکہ میں اس وقت تک مخصوص سماجی اخلاقیات کا اسیر تھا اس لئے میں نے سعید کو گناہ کے باب میں عذاب قبر سے لے کر جہنم تک ایک طویل لیکچر دے ڈالا۔اس لیکچر کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعید نے ہارمونیم بیچ دیا اور ''اس بازار'' میں جانے سے تائب ہو گیا۔کبھی دوستوں نے فرمائش کی تو میز کو بجا کر ہی گانا سنا دیا۔۔بعد میں ایک وقت آیا جب میرے دل میں کہیں اندر دبی ہوئی خواہش نے سر اٹھایا۔اس کے لئے میں نے سعید کے پرانے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا سوچا لیکن وہ اتنا سدھر چکا تھا کہ اس سے اس موضوع پر بات کرنا بھی کمینگی محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ گناہ کی خواہش خود بخود حسرت میں تبدیل ہو کر اندر ہی اندر دم توڑ گئی۔

ہمارے نامۂ عمل میں کچھ بھی تو نہیں ملا
کہ بے نصیب دل اسے سیاہ بھی نہ کر سکا

اب کبھی کبھی خود کو ملامت کر لیتا ہوں۔ کاش میں نے سعید کو نیکی کا لیکچر دے کر گمراہ نہ کیا ہوتا۔سعید شباب سرائیکی کاز سے بے حد مخلص ہے۔سرائیکی عوام کی سیاسی اور سماجی پسماندگی دور کرنے کی جدوجہد میں سعید شباب کے جذبات سے میں بخوبی آگاہ ہوں۔تاہم سرائیکی سے اس کی محبت پنجابی یا اردو سے نفرت کی زائیدہ نہیں ہے۔اسے پاکستان کی ساری زبانوں سے محبت ہے۔البتہ سرائیکی اس کی ماں بولی ہونے کے باعث اس کی پہلی محبت ہے۔سعید نے سرائیکی میں بھی تھوڑا بہت لکھا ہے۔ ٹیلی ویژن کے سرائیکی ادبی پروگراموں میں شرکت کی ہے۔اس کے باوجود اس کا بنیادی ادبی کام اردو میں ہوا ہے۔کچی پکی غزلوں سے لے کر اچھی اچھی غزلیں کہنے تک سعید شباب نے اپنا سفر دھیمے دھیمے طے کیا۔شہرت کے حصول کے لئے احمقانہ اور اوچھی حرکتیں کرنے کی بجائے اس نے خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رکھی۔اردو ماہیا نگاری کی جو روش پنجابی ماہیے کی روایت سے بے خبری کے باعث غلط طور پر پنپ رہی تھی اس کی نشاندہی کرنے اور

اردو میں ماہیے کے اصل وزن کے نمونے پیش کرنے میں سعید نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔مختلف ادبی جرائد میں ہونے والے ادبی ہنگاموں میں سعید نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مجھے اس وقت شدید حیرت ہوئی جب بھارت کے ایک شاعر مظفر ایرج کا دوسرا شعری مجموعہ چھپ کر آیا۔اس میں اہم ادیبوں کے ساتھ سعید شباب کے تاثرات بھی چھپے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے سعید سے پوچھا بھائی! یہ فلیپ نگار قسم کی چیز کب سے بن گئے ہو؟۔۔سعید کی جوابی مسکراہٹ ایسی لگی جیسے کہہ رہا ہو آپ تو گھر کے مرغے کو دال برابر ہی سمجھیں گے۔تب ہی میں نے طے کیا کہ اپنے شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' اور افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' کے لئے سعید سے فلیپ کی رائے ضرور حاصل کروں گا۔ چنانچہ سعید نے دونوں کتابوں پر اپنی رائے لکھی اور جی کھول کر لکھی۔ایسی رائے جسے پڑھ کر بعض کرم فرماؤں کا خون کھول اٹھا اور میں جی ہی جی میں شرمندہ ہوتا رہا۔

''جدید ادب'' خانپور کے چند آخری شماروں میں سعید بھی مجلس ادارت میں شامل تھا۔اب اس نے نایاب پبلی کیشنز کے نام سے خانپور میں ایک ادبی اشاعتی ادارہ قائم کیا ہے۔اس کا ارادہ ہے کہ ادب کے قارئین کو سچ مچ سستی قیمت پر ادبی کتابیں فراہم کی جائیں۔

سعید نہایت وجیہہ نوجوان ہے۔حسن نظر کے ساتھ خوبصورتی کو پرکھنے کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہے۔ پہلے اس کی شادی اپنی کزن سے ہوئی مگر بدقسمتی سے یہ شادی کامیاب نہ ہوسکی۔دوسری شادی کے لئے میں نے بھی تھوڑی سی تگ ودو کی تھی۔ملتان کی ایک فیملی کی لڑکی تھی۔سعید کی طرح وہ لوگ سرائیکی بھی تھے اور اعوان بھی۔لڑکی اچھی تھی اور پڑھی لکھی تھی۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا تھا،سگھڑ بچی تھی لیکن فرقہ کا اختلاف تھا۔سعید نے کاغذی کاروائی کے طور پر فرقہ کی تبدیلی کے لئے بھی رضامندی ظاہر کردی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ لڑکی میں قدرتی طور پر ایک معمولی سا نقص ہے تو اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں نے کہا: قدرت کی طرف سے ملے ہوئے کسی عیب پر اعتراض کرنا ظلم ہے۔سعید نے اپنے دونوں کان پکڑ کر کہا خدا کی قسم میں اس کے عیب پر اعتراض نہیں کر رہا۔ میں نے کہا پھر شادی کرلو۔ثواب ہوگا۔سعید نے کہا میں تو ویسے

ہی بڑا گنہگار آدمی ہوں لیکن اس نیکی کے لئے مجھے مجبور نہ کریں۔میں نے سوچا شاید فرقہ کی تبدیلی سے گھبرا رہا ہے لیکن سعید کہنے لگا بے شک مجھے سکھ بنوالیں مگر اس ثواب سے مجھے بچالیں۔آخر مجھے اس کی حالتِ زار پر ترس آ گیا اور لڑکی والوں کو بہانہ بنا کر جواب دے دیا۔بعد میں سعید نے اپنے واقف کاروں میں ایک اچھی لڑکی شازیہ سے شادی کرلی۔اب دونوں بیوی اپنے بچوں سمیت ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔

سعید نے میرے ساتھ دوست اور بھائی کے دونوں رشتوں کو نبھایا ہے۔اس دوستی کی وجہ سے امی جی اور مبارکہ کا تعلق سعید کی امی، بہنوں اور شازیہ بھابھی سے قائم ہوا۔اباجی کو سعید نے ہمیشہ اپنے والد جیسا احترام دیا۔باباجی سے اس کی گپ شپ زیادہ تھی۔باباجی کو بھی سعید سے ایک خاص اُنسیت تھی۔میرے داداجی اور سعید کے والد خانپور کے ایک ہی قبرستان میں دفن ہیں۔میرا خیال ہے کہ سعید سے دوستی ہمارے بزرگوں کی قبروں سے لے کر ہماری اپنی قبروں تک قائم رہنے والی ہے۔سعید نے میرے ساتھ بڑی دور تک دوستی نبھائی ہے۔ میں خانپور سے جغرافیائی طور پر جتنا دور ہوتا گیا سعید کی دوستی مزید پکی ہوتی گئی۔

''از دیدہ دور از دل دور'' والی بات سعید نے عملاً غلط ثابت کردی ہے۔

☆☆☆

عاجزی کا اعجاز

(محمد اکبر)

مرجھا چکے ہیں پھول تری یاد کے مگر
محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

مدّت ہوئی گوجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں ایک لڑکا اپنے غریب ماں باپ کے زیرِ سایہ پل رہا تھا۔اس لڑکے کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔گاؤں سے کئی میل کے فاصلے پر ایک سکول تھا۔ یہ لڑکا ایک سیکنڈ ہینڈ بائیسکل پر روزانہ اسکول آیا کرتا تھا۔ایک دفعہ اس کی بائیسکل خراب ہوگئی۔مرمت کے لئے کل خرچہ دو روپے بنتا تھا۔دس دن تک کچھ رقم پس انداز کی گئی اور یہ دس دن وہ لڑکا کئی میل کا سفر روزانہ پیدل طے کرتا رہا۔سائیکل مرمت کرائی گئی اور مرمت کا کل خرچہ چھوٹی چھوٹی قسطوں کی صورت میں دو ماہ میں جا کر ادا ہوا۔وہ لڑکا بھیانک غربت کے دُکھ سہتا رہا لیکن اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ایک دن آیا جب اسے فوج میں کمیشن مل گیا۔کمیشن ملنے پر اسے اتنی خوشی ہوئی کہ بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ گیا۔اگر ایک ذہین فوجی آفیسر نے اسے بروقت سنبھال نہ لیا ہوتا تو یہ خوشی جان لیوا ثابت ہوتی۔اس لڑکے کا نام اعجاز اکبر تھا۔جو اَب بریگیڈیئر محمد اعجاز اکبر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ان کے نام اعجاز کا مادہ معجزے سے بھی ہے اور عاجزی سے بھی۔معجزہ سے اس طرح کہ انتہائی عُسرت کی زندگی بسر کرنے والا لڑکا اب ایک ماہر تعلیم بھی ہے اور کروڑ پتی بھی۔لیکن ان کے نام اعجاز کا تعلق عاجزی سے بہت گہرا ہے۔طبیعت کی عاجزی اور انکسار نے ہی شاید یہ معجزہ دکھایا ہے کہ وہ اب ایک

کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

آرمی برن ہال پبلک سکول ایبٹ آباد میں انہیں پرنسپل بنا کر بھیجا گیا۔یہیں بریگیڈیئر کا عہدہ ملا۔جب ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آیا،ان کے سامنے ایک پرکشش پیش کش موجود تھی۔ایک اہم سرکاری ادارہ میں انہیں ڈائریکٹر بنایا جا رہا تھا۔انہوں نے اس عہدے کو اپنی خوش قسمتی تصوّر کیا لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے ایبٹ آباد کے ایک ملنگ سے مشورہ کر لیا۔ملنگ نے اپنی ترنگ میں کہہ دیا ادھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔چنانچہ بریگیڈیئر اعجاز اکبر نے اتنی بڑی پیش کش رد کر دی۔پھر انہوں نے آرمی برن ہال سکول سے اپنی ریٹائرمنٹ سے ایک سال پہلے اپنا تعلیمی ادارہ بنوالیا۔پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول ایبٹ آباد کرائے کی عمارت میں قائم کیا گیا۔اُس برس آرمی برن ہال سکول سے مسترد کردہ کئی بچوں کو نئے سکول میں داخلہ مل گیا۔یوں ناکام بچوں کے مایوس والدین کے لئے اعجاز اکبر اور اعجاز اکبر کے لئے مایوس والدین سہارا بن گئے۔بریگیڈیئر اعجاز اکبر کی زندگی کا یہ نیا دور صبر آزما دور تھا۔دن رات محنت کر کے انہوں نے اپنے تعلیمی ادارہ کو مستحکم کیا۔اس کی ساکھ بنائی۔اب یہ عالم ہے کہ ادارہ کی اپنی عالی شان عمارت ہے اور ایک بڑے تعلیمی کمپلیکس کی تعمیر کا منصوبہ تکمیل کی طرف گامزن ہے۔اسکول و کالج کا سالانہ بجٹ دو کروڑ روپے سے زیادہ ہوتا ہے۔

بریگیڈیئر صاحب بے حد خوش مزاج اور زندہ دل انسان ہیں۔طبیعت روانی پر آئی ہوئی ہو تو پھر وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔لیکن افسوس اس خوش مزاج محمد اعجاز اکبر کو ''فوجی آدمی'' اور کاروباری مصروفیات دبا دیتی ہیں۔ان کے پاس فی الوقت اتنی دولت اور اتنے وسائل ہیں کہ ان کو بے دردی سے نہ لٹایا جائے تو ان کی آنے والی سات پُشتیں آسائش کی زندگی بسر کر سکتی ہیں۔پھر پتہ نہیں کیوں یہ اب آرام نہیں کرتے۔انسان دولت اپنے سکھ اور آرام کے لئے کماتا ہے لیکن اگر آرام نہیں کرنا تو پھر اس دولت کا کیا فائدہ۔۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جس لڑکے نے انتہائی غربت اور افلاس کے سائے میں ابتدائی زندگی گزاری تھی،حالات کی بے یقینی سے نکل آنے کے باوجود حالات کی بے یقینی اور خدشات کا شکار رہے۔اسی لڑکے نے شاید بریگیڈیئر محمد اعجاز اکبر کو

ابھی تک کاروباری مصروفیات میں الجھا رکھا ہے۔

پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول اینڈ کالج ایبٹ آباد بلاشبہ ایک معیاری درسگاہ ہے جس کا مقابلہ ''آرمی برن ہال'' اور ''اے پی ایس'' جیسی اعلیٰ درسگاہوں سے ہے۔عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جن طلبہ کو مذکورہ دونوں درسگاہوں میں داخلہ نہیں مل پاتا انہیں PIPS میں داخلہ مل جاتا ہے۔اس کے باوجود امتحانی نتائج میں مقابلہ ہمیشہ سخت رہتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بریگیڈیئر صاحب اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت ان کے علمی معیار اور پیشہ ورانہ صلاحیت کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور بندے کو پرکھنے میں بہت کم دھوکہ کھاتے ہیں۔PIPS کے نسبتاً کمزور ٹیچروں کو برن ہال اور اے پی ایس میں ملازمت مل جاتی ہے۔ایک بار تینوں تعلیمی اداروں کے چند اساتذہ جمع تھے۔گپ شپ کے دوران برن ہال کے ایک ٹیچر نے مذاق کرتے ہوئے کہا: جس لڑکے کو ہم نکما سمجھ کر داخلہ نہیں دیتے اسے PIPS میں داخلہ مل جاتا ہے۔اس پر PIPS کے ایک ٹیچر نے اسی انداز میں جواب دیا آپ کی بات درست ہے لیکن اس میں یہ اضافہ کرلیں کہ جس ٹیچر کو PIPS والے ناکارہ سمجھ کر نکال دیتے ہیں آپ انہیں ٹیچر رکھ لیتے ہیں۔یہ باتیں خوشگوار موڈ میں ہوئی تھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ دونوں اداروں کے ٹیچرز کی دونوں باتیں عمومی طور پر درست ہیں۔

بریگیڈیئر صاحب کو ان کی ایک خوبی یا کمزوری کے باعث بآسانی دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔کسی کی دکھ بھری داستان سن کر آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ایک صاحب نے اس طرح انہیں اپنی دکھ بھری داستان سنائی کہ انٹرویو لینے والا اور دینے والا دونوں زاروقطار رو رہے تھے۔ پھر ان صاحب کو گریڈ اٹھارہ میں ملازمت مل گئی لیکن تین ماہ کے اندر ان کی داستان کا جھوٹ اور بحثیت ٹیچر اصلیت ظاہر ہوگئی چنانچہ انہیں باعزت اور قانونی طریقے سے فارغ کر دیا گیا۔۔ ایک اور صاحب جو طالب علم بننے کے لائق بھی نہیں تھے، ٹیچر بن گئے۔پھر انہوں نے سیاست بازی بھی شروع کر دی چنانچہ انہیں بھی قانونی طریقے سے فارغ کر دیا گیا۔موصوف سیاسی اثر رسوخ رکھتے تھے اس لئے ایسی اونچی سفارش لے آئے کہ بریگیڈیئر صاحب کے لئے انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔لیکن وہ ادارے کے طلبہ کو خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ انہوں نے

سفارش کرنے والی ہستی سے مودبانہ طور پر گذارش کی کہ میں ان صاحب کو کلاسز تو نہیں دے سکتا البتہ انہیں گھر بیٹھے پوری تنخواہ ماہ بماہ بھجوادیا کروں گا۔اس گذارش کے نتیجہ میں ان کی باآسانی گلوخلاصی ہوگئی۔۔ان واقعات سے یہ بھی نہ سمجھیں کہ بریگیڈیئر صاحب کسی کارخانہ دار کی طرح اپنے ٹیچروں کی چھٹی کراتے رہتے ہیں۔اول تو ایسی مثالیں دو چار ہیں پھر ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ اگر کوئی ٹیچر بڑی کلاسز کو ٹھیک طرح سے پڑھا نہیں سکتا تو پہلے اسے طریقے سے سمجھاتے ہیں۔طرزِ عمل میں تبدیلی نہ آئے تو اسے چھوٹی کلاسیں دے دی جاتی ہیں۔وہ کلاسیں بھی نہ سنبھالی جائیں تو پھر اس سے بھی چھوٹی کلاسیں دے دی جاتی ہیں۔مقصد یہی ہوتا ہے کہ ممکنہ حد تک کوشش کی جائے کہ کوئی شخص بے روزگار نہ ہونے پائے۔۔ایک ٹیچر ایم۔اے اسلامیات تھے۔اسلامیات پڑھاتے تھے۔ہوم ورک چیک کئے بغیر دستخط کر دیتے تھے۔امتحانی پرچے جانچے بغیر نمبر دے دیتے تھے۔جونیئر کیمبرج کے ایک طالب علم نے اسلامیات کے پرچہ میں حدیث شریف افضل الذکر لا الہ الا اللہ کا ترجمہ یوں کیا

AFZAL SAID THAT LA ILAHA ILLALLAH:

یہ جواب درست سمجھا گیا اور پورے نمبر دیئے گئے تب اس ٹیچر کو بلا کر بریگیڈیئر صاحب نے سمجھایا کہ رزق حلال کر کے کھانا چاہئے۔آنکھیں بند کر کے نمبر دے دینے سے تعلیمی معیار بہتر نہیں ہوجائے گا۔حالانکہ ایسے ٹیچر کو کھڑے کھڑے فارغ کیا جاسکتا تھا۔لیکن انہوں نے اصلاح کا موقعہ ضرور دیا۔

جب میں نے اکتوبر ۱۹۹۰ء میں PIPS کو جائن کیا، میرا قیام ٹیچرز کے بیچلر ہاسٹل میں تھا۔فیملی ہاؤس تو مارچ میں جا کر ملنا تھا لیکن دسمبر کے وسط میں مبارکہ اور بچوں کو بھی میں نے بلالیا۔ایک اور دوست کا کمرہ لے لینے سے ہمارا الگ پورشن بن گیا تھا۔اس عمارت میں پانچ اور اساتذہ بھی مقیم تھے۔فزکس کے ایک استاد دن رات ہیٹر چلاتے تھے۔جب دسمبر کے مہینے کا بجلی کا بل آیا تو غیر معمولی حد تک زیادہ تھا۔مجھے پتہ بھی نہیں تھا اور فزکس کے انہی استاد صاحب نے استادی دکھائی۔بریگیڈیئر صاحب سے جا کر کہہ دیا حیدر قریشی اپنی فیملی کو لے آیا ہے اور اسی نے

ہی بجلی کا اتنا استعمال کیا ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے کسی طرح کیئر ٹیکر کو بھی ساتھ ملا لیا۔اگلے روز بریگیڈ یئر صاحب نے برہمی کے ساتھ مجھے کہا کہ بجلی کے استعمال میں کچھ تو احتیاط کریں۔میں چکرا گیا۔اس وقت تو کچھ نہ کہا۔گھر آ کر تفصیلی خط لکھ کر انہیں بھجوا دیا۔اس سے اگلے روز میں بازار کی طرف جا رہا تھا،ایک کار میرے قریب آ کر رکی،دیکھا تو بریگیڈ یئر صاحب تھے۔گاڑی میں بٹھا لیا اور کہنے لگے:رات گئی بات گئی۔آپ تو خوامخواہ جذباتی ہو گئے۔میرے لئے اتنی دلجوئی کافی تھی۔فزکس کے مذکورہ استاد چونکہ بجلی کے بے محابا استعمال کے عادی تھے اس لئے اگلے سال دسمبر میں دسمبر ۱۹۹۰ء سے بھی ہزار ڈیڑھ ہزار روپے زیادہ کا بل آ گیا۔اتفاق سے اب اس عمارت میں صرف تین اساتذہ ہی مقیم تھے چنانچہ بریگیڈ یئر صاحب نے سٹاف میٹنگ کے دوران بڑے اچھے طریقے سے انہیں بجلی کے بل کی زیادتی سے آگاہ کیا اور وہ صاحب سب کے سامنے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔

بریگیڈ یئر صاحب اچھے ادبی ذوق کے مالک ہیں۔مجھے انہوں نے کئی بار محبت کے ساتھ اور ایک بار ڈانٹ کر داد دی۔میں کبھی اپنی کوئی تازہ غزل،افسانہ یا خاکہ انہیں برائے مطالعہ دیتا تو اس کی تعریف کے ساتھ تجزیاتی نوٹ بھی ساتھ ہی لکھا آتا۔ایک بار ایک غزل کے ساتھ ان کی ''جواب آں غزل'' موصول ہوئی تو پتہ چلا کہ انہیں شعر کے وزن کا بھی علم ہے۔افسانہ ''کاکروچ'' پڑھنے کے بعد ایک دفعہ بعض اساتذہ سے کہنے لگے:میں حیران ہوں یہ اردو کے ٹیچر ہیں یا سائنس کے۔ایک بار میری کلاس میں آئے اور کالج کے طلبہ سے کہنے لگے:آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ایسا...ادیب آپ کا استاد ہے...ان سے علم حاصل کرنے کے لئے انہیں نچوڑ لیں۔پھر مسکرا کر بولے لیکن بلی کی طرح نہلا کر نہیں نچوڑیں۔PIPS کی وائس پرنسپل مس روزلین کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ان سے ان کی والدہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔دوران گفتگو میں نے انہیں اپنی والدہ کا خاکہ ''مائی نی میں کنوں آکھاں'' کے بارے میں بتایا۔انہوں نے وہ خاکہ پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔میں نے ''اوراق'' کا وہ شمارہ انہیں بھیج دیا جس میں وہ خاکہ چھپا تھا۔اگلے دن بریگیڈ یئر صاحب ملے تو برہمی سے کہنے لگے:یہ آپ نے کیا زیادتی بلکہ حماقت

کر دی ہے؟۔۔میں پریشان،یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔پھر کہنے لگے مس روزلین کو اپنی والدہ والا خاکہ کیوں دیا تھا۔والدہ کی وفات کے بعد دو ماہ میں بمشکل ان کی طبیعت سنبھلی تھی لیکن آپ کا دیا ہوا خاکہ پڑھ کر انہوں نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔میرے لئے انہیں چپ کرانا مسئلہ بن گیا ہے۔پھر تھوڑا سا رُکے اور کہنے لگے ان کی والدہ تو ابھی فوت ہوئی ہیں،میری ماں کو فوت ہوئے مدت گذر چکی ہے لیکن خاکہ پڑھ کر تو میرے بھی آنسو نکل آئے تھے۔یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے اپنے آفس میں چلے گئے۔ان کی ڈانٹ والی اس داد کو میں آج بھی اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔

بریگیڈ یئر صاحب اسلام سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔چونکہ صوفیائے کرام سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اسی وجہ سے وسیع المشرب اور کشادہ نظر ہیں۔شروع میں ایک ملنگ کا ذکر آیا ہے جس نے بریگیڈ یئر صاحب کو ڈائریکٹر کی پیش کش قبول کرنے سے روکا تھا۔بعد میں اس ملنگ کا روکنا بے حد مفید ثابت ہوا۔چنانچہ صوفیاء،فقیروں اور ملنگوں سے ان کی عقیدت اور بھی بڑھ گئی۔ایبٹ آباد کے مذکورہ ملنگ ایک ننگ دھڑنگ مجذوب ہیں۔بریگیڈ یئر صاحب انہیں جہاں کہیں بھی دیکھ لیں اپنی کار میں بیٹھنے کی درخواست کر دیتے ہیں۔اکثر یوں ہوا کہ ملنگ بابا عالمِ جذب سے حکم صادر کرتے راولپنڈی چلو۔گاڑی حسن ابدال تک پہنچتی تو صدا آتی اب مانسہرہ چلو۔چنانچہ وہیں سے پھر واپس ہو کر مانسہرہ کا سفر شروع ہو جاتا۔ایک بار تو رات کے دو بج گئے۔اہل خانہ پریشان کہ بریگیڈ یئر صاحب بتائے بغیر کہاں چلے گئے۔بعد میں پتہ چلا ملنگ بابا کے حکم کی تعمیل ہو رہی تھی۔میں نے بھی ایک بار ان ملنگ بابا کو ننگ دھڑنگ حالت میں بریگیڈ یئر صاحب کے ساتھ ان کی کار کی اگلی سیٹ پر تشریف فرما دیکھا ہے۔ان کے بیٹھنے کے انداز سے مجھے ایک ہلکی سی تشویش ضرور ہوئی کہ دوران سفر گیئر تبدیل کرتے ہوئے بریگیڈ یئر صاحب کا ہاتھ کہیں چوک نہ جائے۔مسائل تصوف سے مجھے بھی تھوڑی بہت رغبت ہے،تاہم میں انسانی لاشعور میں ہزاروں برس پرانے کلچر کی کارفرمائی کو بھی تلاش کرتا رہتا ہوں۔بریگیڈ یئر صاحب کے ملنگ بابا کو دیکھ کر کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ لنگ پوجا کے قدیم تصور نے صورت بدل کر کیسا شاندار روپ

اختیار کرلیا ہے۔

میرے اور بریگیڈیئر صاحب کے مزاج اور عادات میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔لیکن یہ ہم آہنگی میرے لئے سودمند ہونے سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ دوشیر ایک کچھار میں نہیں رہ سکتے۔حسن کے معاملے میں ہم دونوں کا ذوق بالکل ایک جیسا تھا۔جیسے چہرے مجھے اچھے لگتے ہیں ویسے ہی انہیں اچھے لگتے ہیں ایک دوجھٹکوں کے بعد جب مجھے اس ''حُسنِ توارد'' کا احساس ہوا تو میں نے خود ہی محتاط رویہ اختیار کرلیا کہ آخر مجھے نوکری بھی کرنا تھی۔

بریگیڈیئر صاحب کی درسگاہ میں ملازمت کا مجھے ایک فائدہ یہ ہوا کہ طاہر احمد، میجر اظہر علی، محمد منیر، سید مختار شاہ، سید طیب علی، ارشد عادل اور مرتضٰی جمال جیسے خوبصورت اور پیارے اساتذہ سے میرا دوستی او رمحبت کا تعلق قائم ہوا۔ نیز مولوی محمد یونس، میجر شاہجہاں اور مسٹر ایڈون جیسے ''صاحبانِ علم'' لوگوں کو دیکھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول اینڈ کالج ایبٹ آباد ایک مستحکم تعلیمی ادارہ بن چکا ہے۔اس کی شاخیں گجرات اور گوجرانولہ میں بھی قائم کردی گئی ہیں۔بعض عرب ممالک میں پاکستانیوں کے بچوں کو جو تعلیمی مسائل درپیش ہیں ان کے پیشِ نظر بریگیڈیئر صاحب کسی عرب ملک میں بھی PIPS کا سکول شروع کرنے کے آرزومند تھے۔میں ان کی کامیابیوں کے لئے دعاگو ہوں لیکن میری دلی خواہش ہے کہ وہ اپنی دفتری مصروفیات کو آدھا کم کردیں۔ان کی بیٹی رخسانہ اور دونوں بیٹے ان کے حصّے کی ساری ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ویسے مجھے علم ہے کہ میری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے والی، ان کے اندر کا فوجی اور لڑکپن کا غریب اور محنتی اعجاز، دونوں مل کر انہیں کبھی آرام سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔

☆☆☆

میرا فیثا غورث

(طاہر احمد)

خوشی کے لمحے لکھو، عمرِ اضطراب لکھو
نکالو وقت کبھی عشق کا حساب لکھو

ایبٹ آباد میں ہم دونوں ایک ہی تعلیمی ادارے میں پڑھاتے تھے۔طاہر کا مضمون ریاضی تھا۔لائبریری میں ایک بار اسے چند ادبی کتابیں اشو کراتے اور جمع کراتے دیکھا تو تھوڑی سی حیرت ہوئی۔استفسار کیا تو پتہ چلا اچھا ادب پڑھنے کا شوق ہے۔گفتگو کی تو معلوم ہوا آپ کرشن چندر سے لے کر بانو قدسیہ تک اور فیض سے لے کر وزیر آغا تک ادیبوں پر بھی بات کر سکتے ہیں اور ان کے ادب پر بھی۔اس وقت تو مجھے شدید حیرت ہوئی جب اس جوان نے بتایا کہ وزیر آغا کی غزلوں اور نظموں میں سیاسی اثرات بہت نمایاں ہیں اور ثبوت کے طور پر شعری حوالے بھی دے دیئے۔دوستی کچھ اور بڑھی تو پتہ چلا طاہر کو کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور لوک موسیقی سے گہرا شغف ہے۔فوٹوگرافی کا شوق ہے، پاک محبت کرنے کا جذبہ ہے۔ان چیزوں کا کچھ کچھ شوق مجھے بھی ہے اس لئے اس طرح ہماری دوستی مزید بڑھی۔ایبٹ آباد کی خوبصورت وادی نے ہم دونوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ہم روزانہ لمبی سیر کے لئے نکلتے۔آبادی سے باہر نکل کر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔گفتگو سے تھک جاتے تو شوقیہ گلوکاری شروع کردیتے۔ہماری دوستی اتنی گہری ہوتی گئی کہ اچھا ذہن رکھنے والوں نے کہنا شروع کردیا: خدا دوستوں کی یہ جوڑی

سلامت رکھے اور کم ظرفوں کے لئے یہ دوستی حسد کا موجب بن گئی۔ موسیقی، فوٹوگرافی اور ''پاک محبت'' کے مشترکہ شوق ایک طرف تھے تو دوسری طرف الٰہیات، ادبیات اور سیاسیات کے موضوعات ہمیں مزید قریب لاتے گئے۔ دوستی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔ مکمل اتفاق رائے ہوتا تو میں یقیناً یہ سمجھ لیتا کہ میرا موقف ہی غلط ہے۔ ہم میں ڈھیروں ڈھیر اختلاف رائے تھا لیکن اس اختلاف رائے میں ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے اور سمجھانے کا انداز ہوتا تھا۔

میں تصوف کے مضمون سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ طاہر کے نزدیک تصوف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مایوسی کا زائیدہ ہے، دوسرا وہ جو اپنے دور کی آمریتوں کے خلاف کلمۂ حق بن کر ابھرا اور جس نے مذہبی رواداری کو فروغ دیا۔ ادب میں طاہر ترقی پسند مسلک کا حامی ہے۔ فیض کی شاعری کا دیوانہ لیکن وزیر آغا کی جدید شاعری بھی اسے پسند ہے اور اس میں سے ترقی پسند تصورات اس طرح نکال کر دکھاتا ہے جیسے رومال میں سے کبوتر نکال کر دکھائے جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے لئے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا لیکن جس دن جنگ میگزین میں قاسمی صاحب کا وہ ''معرکۃ الآراء'' انٹرویو شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے دھمکیاں دیتے ہوئے کہا تھا میرے مداح اتنے زیادہ ہیں کہ اگر میں انہیں اشارہ کر دوں تو وہ میرے مخالفین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ طاہر بجھے ہوئے دل کے ساتھ میرے پاس آیا اور کہنے لگا میں اب تک قاسمی صاحب کے حق میں جو کچھ کہتا رہا ہوں اس پر شرمندہ ہوں۔ اس معاملے میں مجھے آپ کا موقف اب کافی درست لگنے لگا ہے۔

طاہر نے بی ایس سی کرنے کے بعد کچھ عرصہ ایک میڈیکل کمپنی کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کیا۔ اچھی خاصی آمدنی تھی لیکن پھر اس پر ایم ایس سی کرنے کی دھن سوار ہوگئی۔ چنانچہ اس نے ریاضی میں ایم ایس سی کرلیا۔ میرے ایبٹ آباد آنے سے تھوڑا عرصہ پہلے طاہر نے PIPS کو جائن کرلیا تھا اور جب میں نے ایبٹ آباد کو چھوڑا تو اس کے معاً بعد طاہر نے بھی ایبٹ آباد کو چھوڑ کر لارنس کالج گھوڑا گلی مری میں ملازمت کر لی۔ طاہر کی بہت سی اچھی عادتوں سے میں بہت تنگ آیا ہوا تھا۔ مثلاً کہیں جانا ہے تو طاہر کہتا بس میں پانچ منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں اور پھر یہ پانچ

منٹ آدھے گھنٹے سے پہلے مکمل نہیں ہوتے تھے۔ لباس کے رکھ رکھاؤ کے سلسلے میں جتنا میں غیر ذمہ دار ہوں، طاہر اتنا ہی نفاست پسند ہے۔ خط لکھنے کے معاملے میں طاہر انتہا درجے کا سست واقع ہوا ہے۔ پہلے تو خط ہی نہیں لکھ پاتا۔ اگر غلطی سے کبھی کوئی خط لکھ لیا تو کم از کم ایک ہفتہ کے بعد جا کر اسے پوسٹ کر پاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے ملک چھوڑنے کے نتیجہ میں طاہر کی کاہلی کسی حد تک ختم ہو رہی ہے۔ میرے خطوط کے بروقت جواب دے کر طاہر نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ اللہ کرے میری یہ حیرت قائم رہے۔

ہمارے تعلیمی ادارے پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول اینڈ کالج ایبٹ آباد کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد کی تقریب تھی۔ بریگیڈئیر صاحب نے اپنے مرشد کو مدعو کیا ہوا تھا۔ انہوں نے مختصر سا خطاب فرمایا اور بتایا کہ وہ چودہ سال یورپ میں گذار کر آئے ہیں۔ وہاں کی زندگی ایک سراب ہے۔ بعد میں طاہر کہنے لگا مجھے دس سال یورپ میں گزارنے کا موقعہ مل جائے تو میں بعد میں پیر صاحب سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مغربی زندگی کی مذمت کروں گا لیکن پہلے اسے چکھنے کا موقعہ تو ملے۔ اس تقریب میں نماز عصر بھی ادا کی گئی۔ بعد میں میجر اظہر کہنے لگے۔ ہم نے تو محض بریگیڈئیر صاحب کی وجہ سے یہاں نماز پڑھی ہے۔ کیا مجبوراً پڑھی گئی نماز کا ثواب ملے گا؟ میں نے کہا جو نماز آپ اپنی مرضی سے پڑھتے ہیں کیا اس کا ثواب ملے گا؟۔۔ میری بات پر میجر اظہر اور طاہر نے بھرپور قہقہے لگائے۔ طاہر نے تو اتنی باردادی کہ مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ حضرت رابعہ بصریؒ، دعا فرمایا کرتی تھیں: اے خدا اگر میں اس لالچ کی وجہ سے تیری عبادت کرتی ہوں کہ تو مجھے جنت میں داخل کرے تو مجھے ہرگز جنت میں داخل نہ کرنا۔ اور اگر میں اس خوف سے تیری عبادت کرتی ہوں کہ کہیں تو مجھے جہنم میں نہ ڈال دے تو مجھے ضرور جہنم میں ڈالنا۔ لیکن اگر میں تیری عبادت تیری محبت میں کرتی ہوں تو پھر تو مجھ سے جو چاہے سلوک کر۔ میں خوش ہوں۔۔ یہ بات بتا کر میں نے کہا کہ عبادت تو ثواب اور عذاب کی مقصدیت سے بالاتر ہوتی ہے۔ سچی عبادت اپنا اجر آپ ہوتی ہے۔ میری بات سن کر طاہر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور کہنے لگا اب آپ بالواسطہ طور پر اپنا ادبی موقف بیان کرنے لگے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں سچا ادب بھی سچی عبادت

کی طرح اپنا اجر آپ ہوتا ہے۔

کالج کی ایک اور دعائیہ تقریب میں بھی مذکورہ پیر صاحب آئے ہوئے تھے۔ درود شریف کی فضیلت پر انہوں نے بڑا عمدہ لیکچر دیا۔ دوران تقریر انہوں نے فرمایا کہ مسلمان کو درود شریف پڑھنے کا اجر دنیا میں ملے نہ ملے آخرت میں ضرور ملتا ہے لیکن اگر کوئی کافر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے تو اسے آخرت میں تو نہیں لیکن اسی دنیا میں ہی اس کا اجر مل جاتا ہے۔ تقریب کے بعد جب لڈو تقسیم ہونے لگے تو طاہر آہستہ سے مجھے کہنے لگا زیادہ سے زیادہ لڈو لے لیں چونکہ ہمیں درود شریف پڑھنے کا جو اجر ملنا ہے اسی دنیا میں ملنا ہے۔ طاہر کا جملہ سنتے ہی فارسی کا ایک شعر یاد آ گیا:

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

امام غزالی کی طرح طاہر نے بھی کوچۂ الحاد کی سیر کی ہے۔ مذہب کے نام لیواؤں کی نفرت انگیز اور انسانیت سوز حرکات نے اسے مذہب سے بدظن کر دیا تھا۔ پھر پرویز صاحب کا مطالعہ کرنے سے اسے دوبارہ دین سے رغبت ہوئی۔ خود سیدھا سادہ مسلمان ہے لیکن پرویز صاحب کی دینی خدمات کا مداح ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی حالت زار پر میں نے اسے کڑھتے دیکھا ہے۔ ایک بار کہنے لگا مسلمانوں کے تنزل کا سبب ان کی فرقہ پرستی اور خوش عقیدگی ہے۔ ہلاکو خاں کے بغداد پر حملہ کے وقت بڑے بڑے علماء ان ایمان افروز موضوعات پر مناظرہ بازی میں مشغول تھے کہ سوئی کے ناکے میں سے ستر ہزار فرشتے بیک وقت گزر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور حضرت آدم کی ناف تھی یا نہیں تھی؟۔ ایک طرف یہ مناظرہ بازی تھی، دوسری طرف یہ خوش عقیدگی کہ خلیفہ کو خدا نے بنایا ہے کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ چنانچہ جب ہلاکو خاں نے پورے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تب خلیفہ کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کی۔ بس ایک قالین میں اسے رول کر کے، اس پر گھوڑے دوڑا دوڑا کر اسے ہلاک کرایا۔ طاہر کا خیال ہے کہ جب تک مسلمان متحد ہو کر سچے دل سے قرآن پر عمل پیرا نہیں ہوتے ان کے اچھے دن نہیں آ سکتے۔ قرآن پر عمل

کرنے کے لئے ان تمام روایات کو چھوڑنا ہوگا جن کی وجہ سے مسلمان گروہ در گروہ ہوتے چلے گئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

طاہر نے سبطِ حسن کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ میں نے اسے ''مزید گمراہ'' کرنے کے لئے سید علی عباس جلالپوری کی کتابیں پڑھنے کی راہ پر لگا دیا۔ سید صاحب کو پڑھتے پڑھتے اسے فلاسفروں کو پڑھنے کا شوق چرایا۔ طاہر نے اپنے شوق سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے یہ شکایت کی کہ یونانی فلاسفر خاصے مشکل ہیں۔ ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں نے علیگڑھ کے مشہور اسٹائل میں کہا:

کہا ہم فلسفہ پڑھ لیں   کہا تم فلسفہ پڑھ لو
کہا یونان کا ڈر ہے   کہا یونان تو ہوگا

طاہر دیر تک اس ''تک بندی'' کا لطف لیتا رہا پھر کہنے لگا یونان تو ہمارے ہر شعبۂ علم پر چھایا ہوا ہے۔ اس سے نجات ممکن نہیں۔

اپنے بھائی سے اسے محبت ہے۔ بہنوں سے بے حد محبت ہے۔ بھانجیوں سے دوستی ہے۔ بھتیجے سے یاری ہے (اور اب تو شادی شدہ بھی ہو گیا ہے) لیکن والد اور والدہ کے معاملے میں بے حد جذباتی ہے۔ ایک بار اطلاع ملی کہ والدہ کو سر پر چوٹ لگی ہے۔ طاہر فوراً سرگودھا جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ پہلے فون پر معلوم کر لو پھر جیسے جی چاہے کرنا۔ طاہر نے فون کیا تو دوسری طرف سے والدہ نے ہی فون اٹھایا اور طاہر کو اپنی خیریت بتائی، تسلی دی۔ اس وقت مجھے ایسے لگا جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ ماں کے سینے سے چمٹا ہوا اس کا سارا درد اپنے سینے میں اتار رہا ہو۔ طاہر کی حالت ایسی جذباتی ہو رہی تھی کہ فون پر بات ہو جانے کے بعد ہم دونوں دیر تک خاموش رہے۔

اُس جذباتی حالت کے حوالے سے تو ہم آج تک خاموش ہیں۔

☆☆☆

پرانے ادبی دوست

(خان پور کے احباب)

شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر
جب ترے شہر سے، یہ شہر بدر آئے تھے

چھوٹی موٹی تک بندی تو دو تین سال پہلے سے جاری تھی لیکن میں نے باقاعدہ طور پر شاعری کا آغاز ۱۹۷۱ء میں کیا۔ اس شوق کو چھپا چھپا کر رکھا۔ کسی ہفت روزہ کو غزل بھیج دی۔ چھپ گئی تو کئی دن تک خوشی کے نشے میں رہا، مگر کسی محفل میں کلام سنانے کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ جمیل محسن اسکول کے زمانے کا میرا دوست تھا۔ ۱۹۷۳ء کا کوئی دن تھا۔ جمیل محسن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ہم نے ایک ادبی انجمن ''بزمِ فرید'' قائم کی ہے۔ آج شام کو اس کے زیرِ اہتمام ایک شعری نشست ہو رہی ہے آپ بھی اس میں شرکت کریں۔ میں نے جمیل سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے مشاعرے پڑھنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اگر اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو جانے کی ہمت کر لوں گا چنانچہ وقت مقررہ پر جمیل مجھے لینے آ گیا۔ خانپور کے جیٹھ بھٹہ بازار میں ایک بڑی سی دوکان کے اندر فرشی نشست تھی۔ بیس کے لگ بھگ حاضرین موجود تھے۔ بڑے احترام کے ساتھ میرا استقبال کیا گیا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ جب مجھے کلام سنانے کی دعوت دی گئی مجھ پر شدید گھبراہٹ طاری تھی۔ پتہ نہیں میں نے غزل کیسے پڑھنی شروع کی اور

کیسے مکمل کی اتنا یاد ہے کہ غزل ختم ہونے پر دوکان داد سے گونج رہی تھی اور میں پسینے سے تر بتر تھا۔ یہ بزمِ فرید میں میری پہلی آمد تھی۔ یہ بزم ریاست بہاولپور کی عظیم رحانی شخصیت اور سرائیکی شاعری کی عظیم ہستی حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے نامِ نامی اسمِ گرامی سے منسوب تھی۔

اگلے ہفتے بزم کا انتظامی اجلاس تھا۔ اس میں مجھے جائنٹ سکریٹری کا عہدہ دیا گیا جسے میں نے اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔ جنرل سکریٹری جمیل محسن تھا اور بزم کے صدر ملک غلام رسول سندر تھے۔ مزید اگلے دو ہفتوں تک جمیل محسن نے جنرل سکریٹری کا عہدہ مجھے سونپ دیا اور خود مجلس عاملہ کی رکنیت پر قناعت کر لی۔ بحیثیت جنرل سکریٹری میں نے بزمِ فرید کی پریس رپورٹنگ پر خاص توجہ دی۔ اس سلسلہ میں بہاولپور کے ہفت روزہ ''مدینہ'' کے ایڈیٹر علامہ منظور احمد رحمت کی خصوصی توجہ، محبت اور حوصلہ افزائی کا اعتراف نہ کروں تو احسان فراموشی ہوگی۔ یہ وہ دور تھا جب میں ابھی قلم پکڑنا سیکھ رہا تھا۔ علامہ منظور احمد رحمت نے ہفت روزہ ''مدینہ'' میں نہ صرف بزمِ فرید کی ادبی رپورٹیں شائع کیں بلکہ مجھے مختلف ادبی اور سماجی موضوعات پر لکھنے کی تحریک کر کے نثر نگاری کی طرف راغب کیا۔ میری ابتدائی دور کی ڈھیروں ڈھیر غزلیں ''مدینہ'' میں چھپتی رہیں۔ اگرچہ اب وہ غزلیں میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں لیکن آج میں جتنا بھی چھوٹا موٹا ادیب ہوں اس میں ہفت روزہ مدینہ بہاولپور کی حوصلہ افزائی اور علامہ منظور احمد رحمت کی محبت کا بہت حصہ ہے۔۔ بزمِ فرید خانپور کے بیشتر شعراء واجبی سی تعلیم کے حامل تھے۔ ملک غلام رسول سندر، امیر بخش حاذق، بابا علی بخش سیف فریدی، عبدالرحیم خوشدل، عبدالرشید گابلہ۔۔ یہ لوگ سرائیکی کے شاعر تھے۔ رئیس گل دل سرائیکی اور اردو دونوں میں شاعری کرتا تھا جمیل محسن اور رشید ایاز صرف اردو غزلیں سناتے تھے۔

مذکورہ بالا دوستوں نے سماجی لحاظ سے معزز شاعروں کی ادبی انجمن کو چھوڑ کر اپنی الگ بزم سجائی تھی۔ حاذق، بابا سیف اور گابلہ تینوں مکانات کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔ خوشدل کی اپنے تیار کردہ جوتوں کی دکان تھی۔ رئیس گل دل ریڈیو مکینک کا کام کرتا تھا۔ جمیل غالباً اسکول ٹیچر ہو چکا تھا اور رشید ایاز کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ جمیل محسن کے والد عبدالرحمٰن آزاد خانپور کے مشہور

شاعر تھے،اس کے دادامحسن بریلوی بھی اپنے زمانے میں ریختی،قصیدے اورمثنویاں لکھ چکے تھے
والد کی وفات کے بعد جمیل محسن نے والد کے کلام پر ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا۔رشید ایاز اس
کا گہرادوست تھااس لئے اسے غزل مہیا کرنا بھی جمیل کا فرض تھا۔ایک دفعہ دونوں نے آزاد
صاحب کی بیاض سے اپنی پسند کی غزلیں نکالیں۔مقطع میں اپنے اپنے تخلص فٹ کئے اور مشاعرے
کے لئے روانہ ہوگئے۔رستے میں کہیں رشید ایاز کو خیال آیا کہ جمیل کی غزل زیادہ اچھی ہے اس نے
ضد کی کہ جمیل اس سے غزل تبدیل کرلے چنانچہ غزلوں کا تبادلہ ہوگیااور مشاعرہ میں یہ
تماشاہوا کہ جمیل محسن اپنی غزل کا مقطع ایازتخلص کے ساتھ سنا گیااور رشید ایاز اپنی غزل کا مقطع
''جمیل'' تخلص کے ساتھ پیش کرگیا۔ ایک اور مشاعرہ میں جمیل نے غزل کا مطلع ہی
'عرض' کیا تھا کہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ اس غزل کے اگلے دوشعر میں
سناتا ہوں۔ان صاحب سے دوشعرسن لینے کے باوجود جمیل محسن نے پورے اعتماد کے ساتھ غزل
سنائی۔غزل کے اختتام پر اسی معترض نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ یہ غزل تو آزادصاحب مرحوم
کی ہے۔اس پر جمیل نے بڑی جرأت سے کہا کہ میں اپنے باپ کا جائز وارث ہوں اور پھر وہاں
سے کھسک گیا۔کچھ میرے سمجھانے بجھانے پر اور کچھ ''انجمن انسدادِ شعراء خانپور'' کی تگ ودو کے
نتیجہ میں آخرکار جمیل نے شاعر کی حیثیت سے دستبردار ہونے کا اعلان کردیا۔شاعر بننے کے شوق
سے قطع نظر جمیل محسن ذاتی طور پر ایک بہت اچھادوست تھا۔اس میں صرف ایک خرابی تھی کہ مسلسل
ملتا رہتااور پھر یکا یک لمبے وقفے کے ساتھ غائب ہوجاتا۔ وقفے کے بعد پھر ملتا تو سارے دنوں
کی غیر حاضری کی کسر نکال دیتا۔جمیل کے ذریعے مجھے کئی انٹ شنٹ قسم کے لوگوں سے
ملنا پڑا لیکن اس کے ذریعے بزم فرید اور سعید شباب سے تعارف میری زندگی کے اہم موڑ ثابت
ہوئے۔

امیر بخش حاذق مستری کا کام کرتے تھے۔نفیس شخصیت کے مالک، انہیں دیکھ کر مغل
شہزادوں کا حلیہ ذہن میں آتا۔شخصیت میں ایسی نفاست جونسوانیت کی حدوں کو ہلکا سا چھو رہی ہو۔
بزم کے سرائیکی شعراء میں حاذق میرے سب سے زیادہ قریبی دوست تھے۔ بزم میں جب بھی

کوئی اختلاف ہوا،حاذق نے ہمیشہ میرے موقف کی حمایت کی۔سرائیکی میں کافی اورغزل کہتے
تھے۔شعر کہنے کا سلیقہ تھا۔ بزم کے بعد بھی میری ان سے دوستی قائم رہی۔۔عبدالرحیم خوشدل اور
عبدالرشید گاہلہ گزارے لائق شاعر تھے۔ باباعلی بخش سیف فریدی پہلے کریانے کی چھوٹی سی
دوکان چلاتے تھے۔ان کی دوکان ہمارے باباجی کی دوکان سے ملحق تھی۔ جب ہم ابھی رحیم یار
خاں میں رہتے تھے،بچپن کا زمانہ تھا،تب باباجی سے ملنے کے لئے خانپور آتے تو مجھے اچھی طرح
یاد ہے میں باباسیف فریدی کی دوکان سے ڈرکو،چنے اورمکھانے وغیرہ خرید کر کھایا کرتا تھا۔ بزم
فرید کے زمانے تک باباسیف نے مستری کا کام شروع کردیا تھا۔بس بے چارے گزارہ کرتے
تھے۔ان کے بارے میں ایک روایت بزم کے دوستوں سے سننے میں آئی۔آپ دیوار تعمیر کرتے تو
دائیں بائیں ٹانگیں لٹکا کر، دیوار پر بیٹھ کر اُساری کرتے۔ساتھ ساتھ پیچھے سرکتے جاتے۔دیوار
آدھی سے زیادہ بن چکی تھی۔مزدوری کا وقت ختم ہواتو باباسیف نے دیوار پر بیٹھے بیٹھے دیہاڑی
وصول کی پھر نیچے چھلانگ لگائی۔ باباسیف مشرقی جانب زمین پر اترے تو دیوار اسی وقت مغربی
جانب زمیں بوس ہوگئی۔ مالک مکان نے کہا مستری جی یہ کیا ہوا؟ باباسیف نے کہا اللہ کی
مرضی!انسان بھی مرجاتے ہیں یہ تو پھر دیوار ہے۔لیکن رفتہ رفتہ باباسیف اپنے کام میں تجربہ
کار ہوتے گئے۔ان کی شاعری داخلی سے زیادہ خارجی موسیقی سے لبریز ہوتی تھی۔کلام سنانے
سے پہلے اس کی دھن بتاتے مثلاً یہ کلام بطرز''اک پردیسی میرا دل لے گیا'' پیش ہے۔اور پھر اسی
گیت کی طرز پر اپنا کلام پیش کرتے۔افسوس کہ باباسیف وفات پا چکے ہیں۔رئیس گل دل میں
شعر کہنے کی عمدہ صلاحیت تھی۔میری خواہش تھی کہ وہ ادبی جرائد کا مطالعہ کرے تا کہ شاعری کی تازہ
صورتحال سے باخبر ہوسکے لیکن پتہ نہیں کیوں وہ نئے ادب کی بات سننا بھی پسند نہ کرتا تھا۔افسو
س کہ اس جوان رعنا کو اس کے بے رحم سسر نے قتل کردیا۔

بزم فرید کے روحِ رواں ملک غلام رسول سندر تھے۔آپ سرائیکی کے بہت اچھے شاعر
تھے۔صدرایوب کے زمانے میں بی ڈی ممبر کا الیکشن جیتے تو محلے میں ممبر صاحب کے نام سے
مشہور ہوگئے۔غالباً بچپن میں انہیں پیار سے لالو کہتے تھے۔چنانچہ ان کے بے تکلف دوست انہیں

لالوقصاب بھی کہتے ۔ پہلوانی کا شوق بھی پورا کرتے رہے۔ ایک بار آپ نے پنسار کی دوکان کھول لی۔ ایک بار دیکھا تو ان کی دوکان پر ڈاکٹر ملک غلام رسول سندر کا بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔ پنساری سے ڈاکٹری تک کے سفر پر حیرت ہوئی۔ بھید کھلا کہ ملک صاحب نے ’’گھر بیٹھے ڈاکٹر بنئے‘‘ والوں کا ہومیو پیتھک کورس کر کے یہ ڈاکٹری شرع کی ہے۔ ڈاکٹری شروع کئے چند دن گزرے تھے، محلے کا ایک مریض آیا۔ ملک صاحب نے احوال پوچھ کر کوئی مرکب پڑیا بنادی اور مریض کو ہدایت کی کہ گھر جا کر یہ پڑیا کھالینا۔ مریض نے کہا کہ گھر کی کیا ضرورت ہے یہیں کھالیتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ پڑیا کھولنے لگا۔ ملک صاحب نے اصرار کیا کہ پڑیا گھر جا کر ہی کھانا۔لیکن مریض پڑیا کھول چکا تھا، اس نے اللہ کا نام لیا اور پڑیا پھانک لی۔ یکا یک نجانے کیا ہوا۔ مریض پہلے تو جھومنے لگا اور پھر لہرا کر زمین پر آ رہا۔ مریض بے ہوش ہو چکا تھا اور ملک صاحب اس کے پیروں کے تلوے مل رہے تھے۔ جب مریض نے ہلکی سی ڈکار لی تو ملک صاحب قریبی ہوٹل کی طرف بھاگے۔ وہاں سے آدھ کلو گرم دودھ پیالے میں لیا اور آ کر مریض کو پلانے لگے۔ مریض نے دودھ پی کر کپڑے جھاڑے اور لڑکھڑاتے ہوئے گھر کی راہ لی۔ غالباً اس کے بعد ملک صاحب نے حساب کیا ہوگا کہ اس ڈاکٹری میں آمدن تو ہے ہی نہیں بس خرچ ہی خرچ ہے۔ چنانچہ چند دن بعد جب جیٹھ بھٹہ بازار سے گزر ہوا تو دیکھا کہ ڈاکٹری والا بورڈ اتر چکا ہے اور ملک صاحب نے کبوتر خانہ کھول لیا ہے۔

یہ سارے دوست میری کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا یہی بڑا کریڈٹ تھا کہ واجبی سی تعلیم ہونے کے باوجود ادب سے مخلصانہ طور پر وابستہ تھے۔ ان میں جتنی ادبی صلاحیت تھی اسے بروئے کار لائے اور اپنی استطاعت سے بڑھ کر بزمِ فرید کی خدمت کی۔ ملک غلام رسول سندر کی دوکان ہی بزم کا دفتر تھا۔ بزم کی محفلیں اپنے عروج پر تھیں جب ملک صاحب کی دوکان کے سامنے ایک لڑکے خلیل قیصر نے دوکان کھولی۔ یہ لڑکا ایک دن بزم فرید کے اجلاس میں چلا آیا اور کہنے لگا میں بھی شاعر ہوں۔ امیر بخش حاذق نے پوچھا اگر آپ شاعر ہیں تو آپ کا تخلص کیا ہے؟ خلیل قیصر نے فکرمندی سے کہا تخلص تو ابھی نہیں سوچا۔ ملک صاحب کہنے لگے آپ فکر نہ

کریں ہم خود تخلص تجویز کئے لیتے ہیں۔ پھر ملک صاحب، حاذق اور جمیل محسن نے مل کر اس کا تخلص چاند تجویز کیا چونکہ خلیل قیصر کی رنگت گہری سیاہ تھی اس لئے دوستوں نے تو مذاق کیا تھا لیکن خلیل قیصر سچ مچ چاند بن گیا۔ اب سنا ہے اس نے چاند تخلص ترک کر دیا ہے۔ اے کے ماجد چھٹی جماعت سے میرا کلاس فیلو تھا۔ جب بھی خانپور کی ادبی فضا میں مجھے بالکل تنہا کر دینے کی سازش کی گئی تب اے کے ماجد لازماً میرے ساتھ ہوا۔ خانپور کی ادبی دنیا میں پاؤں جمانے کے لئے اے کے ماجد اور جمیل محسن نے میری خاصی مدد کی۔ سعید شباب کی دوستی ایک الگ مضمون کی متقاضی ہے۔ ایک اور دوست ارشد خالد قدرے تاخیر سے ملا۔ اس نے خانپور سے رسالہ عکاس جاری کیا۔ یہ رسالہ اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں میں ادبی تحریریں چھاپتا تھا۔ رسالے کا مواد معیاری اور ہنگامہ خیز ہوتا تھا۔ یہ پرچہ تھوڑے عرصہ کے لئے نکلا لیکن خانپور کی ادبی فضا پر اس کا گہرا نقش ابھی تک موجود ہوگا۔ ارشد خالد دیہاتی مزاج کا یار باش آدمی تھا۔ بینک آفیسر ہونے کے باوجود اس کی شخصیت میں سادگی تھی سنا ہے ہمارا یار مزید ترقی کر گیا ہے۔

بزم فرید کی سرگرمیوں کے اثرات ایسے تھے کہ جو شعراء سماجی لحاظ سے ’’معزز‘‘ ہونے کے باعث بزمِ فرید کے غریب شاعروں کو ساتھ بٹھانا پسند نہیں کرتے تھے پھر بزم فرید کی تقریبات میں شرکت کے لئے خود چل کر آنے لگے۔ ان شعراء میں پروفیسر نردوش ترابی، آسی خانپوری، رانا پٹیالوی اور حفیظ شاہد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حفیظ شاہد سے مسلسل ملاقاتیں ہوئیں تو پتہ چلا کہ ان کا مزاج اپنے حلقۂ احباب سے یکسر مختلف ہے۔ پُرخلوص، بے لوث، محبتی اور دوستی نبھانے والے۔ ’’معزز شعراء‘‘ کی انجمن میں ان کی شمولیت کا اصل سبب صرف آسی خانپوری اور نردوش ترابی سے دوستی نبھانا تھا، یہ الگ بات کہ خود ان دوستوں نے بعد میں حفیظ شاہد کی بے لوث دوستی کی ناقدری کی۔ جب میرے خلاف بے جا طور پر ’’متحدہ محاذ‘‘ بنایا گیا تب حفیظ شاہد نے دوستی اور اصول ساتھ ساتھ نبھائے۔ دوستی نبھانے کے لئے وہ دوستوں کے کیمپ میں شامل رہے لیکن اس کیمپ میں میرے حق میں ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ دراصل انہوں نے اصل شرارتی کو جان لیا تھا۔ اپنے دوستوں کو بار بار سمجھاتے کہ اس شرارتی کی سازش کا شکار نہ بنو۔ بائیکاٹ کر کے کسی

ادیب کی صلاحیتوں کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔انہیں دنوں میں جب بھی میں نے کوئی چھوٹا موٹا فنکشن ترتیب دیا حفیظ شاہد نے اس میں ضرور شرکت کی۔شرکت سے پہلے اپنے دوستوں کو بتا کرآتے کہ میں حیدر کے فنکشن میں شرکت کرنے جارہا ہوں۔

آسی خانپوری اردو اور پنجابی کے خوبصورت شاعر ہیں۔ایڈووکیٹ بھی اور زمیندار بھی۔زود رنج بہت تھے۔ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے لگتے۔انہوں نے پہلے نردوش ترابی کے مشوروں پر عمل کیا پھر صفدر صدیق رضی پر انحصار کیا۔نتیجہ صاف ظاہر ہے۔اگر انہوں نے حفیظ شاہد کے طرز زندگی سے استفادہ کیا ہوتا تو شاید اب بہتر پوزیشن میں ہوتے۔

خورشید احمد ٹمی ڈائجسٹوں میں کہانیاں لکھتے ہیں۔میں نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں ادب کی طرف راغب کیا۔ٹمی نے ادبی دنیا کے طور طریقے دیکھے، سمجھے اور پہلا حملہ مجھی پر کردیا(تفصیل لکھتے ہوئے خود مجھے شرم آتی ہے) پھر کوئی بھی ان کی زد سے نہ بچا۔اپنے والد کو بھی ٹمی نے نہیں بخشا،ٹمی میں اچھا افسانہ نگار بننے کی صلاحیت تھی لیکن اپنے بعض نفسیاتی مسائل کے باعث ٹمی کی صلاحیتوں کا زیاں ہوا۔اُس زمانے میں مجھے بھی غصہ جلد آجاتا تھا اگر میں اُس زمانے میں حفیظ شاہد جیسے مزاج کا مالک ہوتا تو شاید ٹمی کی زیادتیوں کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا جس سے اس کی اندرونی اذیتوں کا ازالہ ہوتا اور وہ ایک اچھا افسانہ نگار بن پاتا۔اس کے باوجود ٹمی نے بلاشبہ اپنی استطاعت کے مطابق کئی اچھے افسانے لکھے۔

صفدر صدیق رضی سے جب دوستی ہوئی تو چند دنوں میں ہی برسوں کے یارانے جیسی کیفیت ہوگئی۔رضی کی ایک غزل چھپی اس کا ایک شعر تھا:

لذتیں دفن کر گیا کوئی
روح میں جسم کی دراڑوں سے

میں نے جب''جسم کی دراڑوں'' کی نشاندہی کی تو رضی نے زوردار قہقہے کے ساتھ کہا''مارے گئے''۔

میں نے فوراً کہا مارے نہیں گئے، پکڑے گئے۔

اس سے ہماری بے تکلفی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔آسی خانپوری اور نردوش ترابی کی مجھ سے ناراضگی کی اصل وجہ یہ تھی کہ میں ان سے زیادہ رضی کا دوست ہوں لیکن افسوس رضی نے ایک حقیر سے مفاد کی خاطر نہ صرف دوستی ختم کی بلکہ ایسا انداز اختیار کیا کہ میں حیران رہ گیا۔میرے خلاف جو کچھ کیا گیا اور جس طرح کیا گیا اس کے لئے ایک الگ مضمون درکار ہے۔رضی سے دوستی گہری تھی شاید اسی لئے اس کے غلط طرز عمل پر شدید دکھ کے باوجود ابھی بھی دل میں کہیں اس کی محبت کی لہر محسوس ہوتی ہے۔

اظہر ادیب اچھے شاعر ہیں۔ادب کے دھارے سے کٹے ہوئے تھے۔میں نے انہیں ادبی جرائد سے متعارف کرایا۔ان کے ساتھ مل کر ایک کتاب''کرنیں'' مرتب کی ایک عرصہ تک ان سے پیار محبت کا سلسلہ رہا۔ہمارے بیشتر دکھ مشترک تھے اس بنا پر ہماری دوستی زندگی بھر قائم رہنا چاہئے تھی ہماری دوستی کسی ناراضی کے باعث ٹوٹی بھی نہیں لیکن قائم بھی نہیں رہی۔مجھے ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ ہمارے درمیان خلا کیسے پیدا ہوا اور پھر اس خلا میں اتنا سناٹا کہاں سے آگیا؟رضی کی شدید ترین مخالفت کے زمانے میں اظہر ادیب کی میرے لئے محبتیں اب بھی میری یادوں میں تروتازہ ہیں۔

ظفر اقبال ماچھے بنک آفیسر تھے۔ادیب نہیں تھے لیکن ادبی دنیا کے حالات سے خاصے باخبر رہتے تھے۔جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے زمانے میں ہی مواد جمع کرتے رہے تھے اور ان کی ہلاکت کے ساتھ ہی انہوں نے مارشل لاء اور عدلیہ کے تعلق سے ایک کتاب لکھ لی تھی۔مکتبہ دانیال کراچی سے ان کا تحریری معاہدہ بھی ہوگیا تھا۔شاید کتاب اب تک چھپ چکی ہو☆ خانپور کے ادبی ہنگاموں میں شامل نہیں تھے لیکن پورے ادبی منظر نامہ کے بارے میں ایک نپی تلی رائے رکھتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ان کی رائے غیر جانبدارانہ ہے جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے تقویت پہنچا رہے ہیں۔معتدل لبرل تھے۔ادب اور سیاست میں معتدل لبرل ازم کے قائل تھے۔انتہا پسندوں سے بیزار تھے خواہ وہ کسی کیمپ کے ہوں۔

محمد اکبر بابر ایڈووکیٹ ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔''جدید ادب'' کے لئے انہوں نے

متعدد اشتہارات کے حصول میں مدددی، خانپور کے کامیاب وکلاء میں شمار ہوتے تھے۔ کھلی ڈلی گفتگو کرتے۔ ترقی پسندوں میں صرف فیض احمد فیض اور ظہور نظر کو پسند کرتے تھے۔ ادب اور سیاست کے ساتھ فلسفے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہیگل کی جدلیات اور مغربی فلسفۂ وجودیت سے میری پہلی شناسائی اکبر بابر کے ذریعے ہوئی۔ اکبر بابر کے مزاج میں اکبر بادشاہ کا جلال اور شہنشاہ بابر کا جمال دونوں شامل تھے اسی لئے کسی اور کے جلال و جمال کو اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔

خانپور میں شعری ذوق رکھنے والے چند نوجوانوں نے تک بند شاعروں کی حوصلہ شکنی کے لئے ایک ''انجمن انسدادِ شعراء'' قائم کی۔ اس کارِ خیر میں شیخ فیاض الدین، سلطان خاں، رب نواز قریشی اور خواجہ ادریس پیش پیش تھے۔ ان کا طریقہ واردات بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ کسی شاعر کو بلا کر اچھی طرح کھلاتے پلاتے، پھر دروازے بند کر کے شاعر کا کلام سننے پر تل جاتے۔ کلام سن سن کر شاعر کو زچ کر دیتے۔ مُیں پہلے شاعری بھی کرتا تھا اسی انجمن نے اسے شاعری سے تائب کرایا۔ اچھے شعر پر اچھی داد اور برے شعر پر بری داد دیتے۔ کسی مشاعرے کا انہیں پتہ چل جائے، بن بلائے جا پہنچتے اور مشاعرے کو چار چاند لگا دیتے۔ میں خود تو اس تقریب میں شامل نہیں تھا لیکن باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ بلدیہ خانپور کے ایک مشاعرے میں باہر سے کوئی پختون شاعر بھی آئے تھے۔ انجمن انسدادِ شعراء کے اراکین کی ہوٹنگ کا جب انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تو انجمن کے صدر نے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ لئے کہ حضور! اب بس کریں۔ شاعر صاحب پختون تھے، موصوف نے اسی وقت ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کے زور پر کلام سنایا اور بعد میں انجمن کے صدر کو شوٹ کرنے پر تل گئے۔ بڑی مشکل سے، منت سماجت کر کے انہیں ٹھنڈا کیا گیا اور پھر دونوں کی صلح کرائی گئی۔ اس بدمزگی کے بعد انجمن انسدادِ شعراء کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ بہر حال یہ زندہ دل لوگوں کی بے قاعدہ مگر دلچسپ انجمن تھی۔

☆☆☆

☆ خوشی کی بات ہے کہ یہ کتاب ''آئین سے انحراف'' کے نام سے چھپ گئی ہے۔

چند ادیبوں کے تاثرات

ولایتی زبانوں میں ایسے سکیچ اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے ہیں لیکن اردو میں ''میری محبتیں'' اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ **اشفاق احمد** (لاہور)

••••••••••••••••••••

حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے اور منہ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز۔ حیدر قریشی چونکہ پورا منہ کھول کر جی جان سے بات کرتا ہے اس لئے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے اور قاری اس میں شامل ہو کر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے خاکے میں ممدوح اسی کی جان پہچان والوں میں سے ہے اور یوں وہ مطالعہ کو بے تامل اپنی مرضی اور خواہش سے گھٹاتے بڑھاتے گویا اس کے بارے میں پڑھ نہیں رہا ہوتا بلکہ اپنے معمول کے دوران اس سے عین مین مل کر اپنے نتائج اخذ کر رہا ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کی اس خوبی نے اس کے خاکوں کو واقعی بہت جاندار اور قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ حیدر قریشی کی اس کتاب کے بیس خاکے دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پہلے دس کے لئے تو وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں ہی تا کا کیا ہے اور باقی دس کے لئے گھر سے باہر نکل آیا ہے۔ اوّل خویش، بعد درویش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گھر والوں کے تو کلوز اپ تیار ہو گئے ہیں اور درویشوں کے پروفائل، اور ہر دو پر سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ آج کے مشینی دور کی مصروفیت میں سچ مچ کی ملاقاتوں کی گنجائش خطرناک حد تک سکڑتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں یہ بھی غنیمت ہے کہ اوروں کے خاکے پڑھ پڑھ کر ہی ہماری ان سے ملنے کی چاہ پوری ہوتی رہے۔ یوں نہیں تو یونہی سہی، جیسے بھی انسان اپنے آپ کو ''انسانیا'' لے۔ مجھے یقین ہے کہ حیدر قریشی کی محبتوں کی یہ کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی! **جوگندر پال** (دہلی)

••••••••••••••••••••

''میری محبتیں'' کے ابتدائی پانچ چھ مضامین میں نے پوری طرح پڑھے 'بقیہ کو سرسری دیکھا۔ دوسرے حصہ میں پہلے چار خاکے نیز آخری مضمون پرانے ادبی دوست پڑھا۔ خوب لکھتے

ہیں،آپ نے اپنے بزرگوں کے محیرالعقول واقعات لکھے ہیں'ان سے میں متاثر ہوا۔تمام مضامین بہت دلچسپ اور دلکش ہیں۔ **ڈاکٹر گیان چند جین**(امریکہ)

....

حیدرقریشی نے اپنی والدہ،دادا،والد،بیوی،بہن اور بچوں کو انسانی زاویے سے دیکھا اور ان کی صرف انسانی خوبیوں کا تذکرہ کیا لیکن یہ تذکرہ اتنا دلچسپ ہے کہ یہ سب کردار حقیقی معاشرے کی غیر معمولی شخصیات نظر آتی ہیں۔''برگد کا پیڑ'' ''اجلے دل والا'' ''زندگی کا تسلسل'' ''پسلی کی ٹیڑھ'' بے حد معنی خیز خاکے ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ جن لوگوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہے وہ حقیقی معنوں میں عظیم تھے۔ان کی عظمت اشتہاری نہیں تھی۔

ڈاکٹر انور سدید(لاہور)

....

حیدرقریشی شاعر،افسانہ نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں اور ان کی یہ تینوں خصوصیات ان خاکوں میں جمع ہوگئی ہیں۔ان میں جا بجا بہت سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور خیال انگیز افسانے بھی مل جاتے ہیں ۔۔ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے کثرت سے شعروں کا موزوں اور برمحل استعمال کیا ہے اور ہر خاکے یا مضمون کے آغاز میں ان کا اپنا ایک شعر درج ہے۔۔ایک انشائیہ نگار کے طور پر ان کے خاکوں میں بہت سے انشائی ٹکڑے موجود ہیں ۔بلکہ یہ خاکے ان کے شوخ اور شگفتہ جملوں سے ہی دلچسپ بنے ہیں۔۔حیدرقریشی نے خاکہ نگاری کے فن کو محض شوخی،شگفتگی اور تعارف وتبصرہ تک محدود نہیں رکھا۔ان میں نہایت سنجیدہ معاملات اور دانشورانہ نکتے بھی پیدا کئے ہیں۔ان سب خصوصیات کی روشنی میں میری محبتیں'' خاکوں کا ایک بہت ہی خوبصورت اور خیال انگیز مجموعہ اور خاکہ نگاری کے فن میں ایک اہم اضافہ ہے۔**منشا یاد** (اسلام آباد)

....

معاصر اردو ادب کی بہت سی شخصیات اپنی داخلیت زدگی کی وجہ سے اپنے عہد کے تجربہ کردہ انسانوں کے مسائل کو گرفت میں لانے سے قاصر رہی ہیں۔حیدرقریشی نے اپنی نثری اور شعری تخلیقات میں ذات اور سماج کے معاملات کو یکجا کرنے کے لئے جدید اسالیبی تنوع سے بھر پور کام

لیا ہے۔ان کا ادبی کام باسی کڑھی میں ابال کی مثال نہیں ہے۔حیدرقریشی نے جدید اردو نثر کو تازہ کاری کی ایک پُر تاثیر لہر سے آشنا کیا ہے۔ **ڈاکٹر سعادت سعید** (انقرہ،ترکی)

....

آپ کی بھیجی ہوئی ''میری محبتیں'' مجھے مل گئی ہے۔یقیناً یہ کتاب کا کمال ہے کہ اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی گیا۔اور اس وقت تک کسی اور طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہ رہا جب تک کہ وہ ختم نہ ہوگئی۔آپ کی ''محبتیں'' پڑھی تو آپ کے قلم اور مشاہدہ کا قائل ہونا پڑا۔

محمود ہاشمی (برمنگھم،انگلینڈ)

....

'میری محبتیں' کئی مرتبہ پڑھ چکی ہوں اور اگر یہی حال رہا تو میں اس کی حافظ ضرور ہو جاؤں گی۔آپ کی تحریر میں بلا کی سادگی اور قاری کو باندھ رکھنے کی طاقت ہے۔درد کی پوشیدہ لہریں دل ودماغ میں اندر تک اتر جاتی ہیں اور قاری اپنے کو قاری نہ سمجھ کر حیدرقریشی بن جاتا ہے،یہ آپ کی تحریر کا کمال ہے۔ **ڈاکٹر رضیہ حامد**(بھوپال)

....

''میری محبتیں''میری نظر میں اردو خاکہ نگاری میں ہی نہیں مجموعی اردو ادب کی بھی ایک بڑی اہم کتاب ہے۔اس کتاب کا پہلا حصہ اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اسے حیدر صاحب نے اپنے اہل و اقارب کی نذر کیا ہے اور یہ بات اردو ادب میں بہت ہی نادر ہے۔انہوں نے اس حصے کا ''اول خویش'' نام رکھا اور ایسے خوبصورت خاکے نقش کیے جن میں خاکہ نگاری،افسانہ نگاری،سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح نگاری کا امتزاج دل نشیں صورت سے ظاہر ہوتا ہے۔ان خاکوں میں ادب مصوری سے قریب تر ہوتا ہے کہ ہم ان خاکوں/پورٹریٹس کو پڑھ کر ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کے رشتے داروں کی ایسی صاف صاف تصویریں دیکھ رہے ہیں جن کے نقشے ایک خاص اور معتبر زاویۂ نگاہ نے کھینچ لیے ہیں۔جن میں ان شخصیات کے ساتھ ساتھ حیدر صاحب کے جوہر بھی سامنے آتے ہیں۔یوں ظاہر ہوتا ہے کہ قریشی صاحب نے ''اپنے اندر کی آواز بڑے دھیان سے سن کر'' یہ خاکے تراشے ہیں۔اسی لیے ہر خاکہ ایک معیاری پورٹریٹ کی

طرح دکھائی دیتا ہے۔دورانِ مطالعہ ہمیشہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے نہیں بلکہ اپنے دل سے لکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھی دورانِ مطالعہ اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم ان خاکوں کے افراد کو پڑھ نہیں رہے بلکہ ان سب سے مل رہے ہیں۔ **ھانی السعید**(مصر)

....

''میری محبتیں'' تو کمال کی کتاب ہے سیدھی، سنجیدہ باتیں لکھتے ہوئے آپ جو ہلکا سا مزاحیہ رنگ دے کر جملہ مکمل کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قہوہ پیتے پیتے الائچی کا کوئی دانہ دانت تلے آ کر ذہن و دہن کو خوشبو سے معطر کر جائے۔ **ترنّم ریاض** (دہلی)

....

آپ کی کتاب ''میری محبتیں'' دیکھنی شروع کی ہے۔لگتا ہے آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا یارا بھی ہے۔میرا دل چاہا کہ آپ کو بتاؤں کہ جو پڑھا ہے' پسند آیا۔آپ نے بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے لکھ دی ہیں' آپ کو اس کی داد ملے گی۔۔۔بڑی بے ساختگی ہے، روانی ہے اور گندھی ہوئی خوشگواریت لاجواب ہے۔۔۔آپ کی نثر میں شاعروں سے اچھی اور زیادہ شعریت ہے۔ **مقصود الٰہی شیخ**(انگلینڈ)

....

نرم اسلوب سے جھانکتی ہوئی تصویریں جاذبِ نظر ہی نہیں قابلِ تقلید بھی بن گئی ہیں۔خاکہ نگاری نہ ہی کارگہ شیشہ گری ہے اور نہ ہی فن بت تراشی یا مصوری اور فوٹو گرافی' بلکہ یہ تو ایک طرح کی کلوننگ ہے۔آپ نے جن ہستیوں کی کلوننگ کی ہے ان میں ہر ہستی اپنے مکمل وجود کے ساتھ اُبھر آئی ہے۔یہی آپ کے اسلوب اور فن کی بڑی کامیابی ہے۔ **اسلم حنیف**(انڈیا)

....

آپ کے خاکے ''میری محبتیں'' ماشاءاللہ زبردست ہیں۔یہ نہ صرف آپ کی محبت کی غمازی کرتے ہیں بلکہ اس ثقافتی پس منظر اور روایات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں آپ کی تربیت اور ذہنی نشوونما ہوئی ہے۔آپ کے دیکھنے پرکھنے کے انداز کا اچھوتا پن اور یوں ایک مخصوص زاویے سے زندگی کرنے کی دعوت' ان خاکوں کا نمایاں پہلو ہیں۔اپنی خوشگوار تحریروں سے آپ نے ایسی قدروں

کو بے نقاب کیا ہے جن سے نئی نسل کے جیالے آشنا نہیں ہیں۔

نیاز احمد صوفی(لاہور)

....

حیدر قریشی سے غائبانہ تعارف اس دور میں ہوا جب ''بالمشافہ'' تعلق کسی بلائے ناگہانی کو دعوت دینے کا باعث بن سکتا تھا-بلا کوئی اتنی ناگہانی بھی نہیں بلکہ کسی مارنے والے بیل کی طرح ''قابل دید'' بھی تھی-اس تعارف میں حیدر قریشی کی شخصیت کا غالب پہلو اس کی ''مومنانہ شان'' تھی-وہ والی مومنانہ شان جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن-بعد ازاں متعدد معرکہ آرائیوں کے تذکرے سننے اور پڑھنے کے بعد یہ حسن ظن مزید مستحکم ہوا-

مار دھاڑ سے بھرپور اس منظر نامے سے باطن میں چھپے کسی ''چھوٹے سے مومن بچے'' کی آنکھوں میں تراوت تو ضرور پیدا ہوتی لیکن دل کو اس ''آہنی ہاتھ'' کے پیچھے موجود حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم شخصیت کی موجودگی کا یقین بھی رہا اور جستجو بھی-چند ماہ قبل جب ''عمر لا حاصل کا حاصل'' پڑھنے کا موقع ملا تو لطیف تر حسیات رکھنے والے اس منکسر المزاج اور رقیق القلب شخص سے ملاقات ہوئی تو لطف دوآتشہ ہو گیا-آج مدرز ڈے کے حوالے سے حیدر قریشی کی تحریر پڑھ کر مجھے اپنی ماں یاد آ گئی اور ایک ایک لفظ کے ساتھ جہاں حیدر قریشی کی امی جی کو تصور (ویژولائز) کرتا رہا وہیں اپنی امی جی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے لا کر اشکبار ہوتا رہا-ماؤں کے سانجھا ہونے کا ایک یہ مفہوم بھی تو ہے۔ **محمد اکرم** (امریکہ)

....

خاکوں پر مشتمل آپ کی کتاب **میری محبتیں** مجھے ملی۔اس عنائت کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ! **روشنی کی بشارت** کے افسانے پڑھنے کے بعد آپ کے ساتھ جو تعارف ہوا تھا' اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس نے ایک اور منزل طے کر لی ہے۔آپ سے شناسائی کی سمت ''میری محبتیں'' ایک دلگداز پھاٹک کی مانند ہے۔

سعید انجم(ناروے)

....

کھٹی میٹھی یادیں

حیدر قریشی

عکاس انٹرنیشنل۔اسلام آباد
بہ اشتراک
نایاب پبلی کیشنز۔خان پور

جملہ حقوق بحق حیدر قریشی محفوظ

KHATTI MEETHI YADEN
(Memories)
By: Haider Qureshi
From Pakistan Year of 1st Edition: 2013
Price: Rs. 250/-

نام کتاب: کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری)
مصنف: حیدر قریشی

مصنف کا پتہ: Rossertstr.6, Okriftel,
65795 Hattersheim,Germany
E-Mail: haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: ارشد خالد
سنِ اشاعت اول: ۲۰۱۳ء
قیمت: دوسو پچاس روپے
مطبع: احمد دین پرنٹنگ پریس،نزد داتا دربار، لاہور

ناشر

ارشد خالد
عکاس انٹرنیشنل۔اسلام آباد
مکان نمبر 1164، گلی نمبر 2، بلاک سی
نیشنل پولیس فاؤنڈیشن سیکٹر O-9۔لوہی بھیر، اسلام آباد

بہ اشتراک

سعید شباب
نایاب پبلی کیشنز۔خان پور
ایف ۱۸۳ ر۔محلّہ کھوکھراں۔خان پور۔ضلع رحیم یار خان

انتساب

آپی کے نام

اُس کے ہونٹوں کی محراب دعاؤں والی
اُس کی خاموشی بھی اذاں جیسی لگتی ہے

بچپن کے خزانے میں
کتنے زمانے تھے
اُس ایک زمانے میں

بہت سی بے نیازی اور اک یادوں بھری گٹھڑی
بڑا سامان اپنی خستہ سامانی میں رکھا ہے

زندگی! دیکھ بجھتے ہوئے لوگ ہم
بزمِ جاں میں چمکتے رہے رات بھر

فہرست

عرضِ حال

کھٹی میٹھی یادیں لکھنے کا سلسلہ میں نے ۱۹۹۶ء کے اواخر میں شروع کیا تھا۔ پہلے یورپ میں ہی کہیں ادھر اُدھر چھپوانا چاہا۔لیکن جلد احساس ہو گیا کہ انہیں پاکستان یا انڈیا کے کسی ادبی رسالے میں چھپوانا زیادہ مناسب رہے گا۔۱۹۹۸ء میں انڈیا کے رسالہ گلبن احمد آباد میں اس کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ اس کے بارہ باب گلبن میں شائع ہوتے رہے۔چار باب عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد میں اور باقی جدید ادب جرمنی میں چھپتے رہے۔

کتاب کی صورت میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' کو الگ سے شائع نہیں کرایا لیکن ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کے پہلے عوامی ایڈیشن میں اس کتاب کو الگ طور پر شامل کیا گیا۔۲۰۰۵ء میں مطبوعہ اس ایڈیشن میں یادوں کے چودہ باب شامل تھے۔اس کے بعد ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کا لائبریری ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں شائع کیا گیا تو اس میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے اٹھارہ باب شامل تھے۔گویا گیارہ کتابوں کے مجموعے میں شامل ہو کر ''کھٹی میٹھی یادیں'' ایک الگ کتاب کے طور پر موجود رہی۔

''کھٹی میٹھی یادیں'' اصل میں میرے لکھے خاکوں کے مجموعہ ''میری محبتیں'' کا تسلسل ہے۔ صنف کی حیثیت میں خاکوں سے الگ ہو کر بھی یادوں کا یہ مجموعہ ''میری محبتیں'' والے سفر ہی کا حصہ ہے۔''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کے دونوں ایڈیشن دہلی سے شائع ہوئے تھے،اس لیے انٹرنیٹ پر مکمل طور پر دستیاب ہونے کے باوجود پاکستان میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' کی اشاعت کی ضرورت تھی،خصوصاً اس لیے بھی کہ ''میری محبتیں'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں پاکستان ہی سے شائع ہوا تھا۔اور میری بیشتر یادوں کا تعلق وطنِ عزیز پاکستان سے ہے اور جو پاکستان سے باہر کی یادیں ہیں ان کا منبع بھی پاکستان ہی ہے۔ اب اس کتاب کو پاکستان سے شائع کیا جا رہا ہے تو یہ پہلے دونوں ایڈیشنوں سے زیادہ ابواب پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں یادوں کے اکیس باب شامل ہیں۔

پاکستان سے اس کتاب کو شائع کرنے کا ایک بنیادی مقصد تو یہی ہے کہ ان یادوں کا بیشتر تعلق پاکستان سے ہے اور بیرون پاکستان کی یادوں کا منبع بھی پاکستان ہی ہے۔تاہم اس دوران ایک دلچسپ

صورتِ حال دیکھنے میں آئی۔پاکستان میں بعض بڑے نام والوں کی نگارشات میں کچھ ایسی باتیں پڑھنے کو ملیں جو کسی نہ کسی رنگ میں میری یادوں میں لکھی جا چکی تھیں۔ایک ہی خطہ کے رہنے والوں کے بعض تجربات اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی سوچ میں ہم آہنگی پائی جا سکتی ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔لیکن مجھے لگا کہ میری کمزور حیثیت کے باعث ایسی کسی ہم آہنگی کو میرے لیے ''حسنِ توارد'' قرار دیا جا سکتا ہے۔سو مجھے مناسب لگا کہ کسی سے کوئی الجھاؤ پیدا کیے بغیر اپنی یادوں کی اشاعت کرنے والے رسالوں کے شماروں کی نشان دہی کر دوں۔اس سے میرے لکھے ہوئے کو تھوڑا تحفظ مل جائے گا۔چنانچہ یادوں کے ہر باب کے آخر میں اس رسالے کا پورا حوالہ دے دیا گیا ہے جس میں وہ باب شائع ہوا تھا۔''کھٹی میٹھی یادیں'' میں ایسا پہلی بار کیا جا رہا ہے۔اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ ان ساری یادوں کو ان کے مقامی اور زمانی تناظر میں بھی آسانی سے دیکھا جا سکے گا۔

یادوں کے یہ ابواب جب ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے،تب بھی بہت سارے احباب ان پر اپنی پسندیدگی کا برملا اظہار کرتے رہے۔یک جا صورت میں انہیں پڑھ کر بھی تفصیلی اظہار خیال کرتے رہے۔اب جب یہ کتاب تقریباً مکمل صورت میں پاکستان سے شائع ہو رہی ہے تو مجھے امید ہے کہ پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔یادوں کا یہ سارا کھٹا میٹھا سلسلہ میری زندگی کا حصہ ہے۔

برادرم سعید شباب اور برادرم ارشد خالد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مل کر اس کتاب کی اشاعت کا ذمہ اُٹھایا ہے۔مخالفین کا معاملہ تو الگ ہے،حالیہ چند برسوں میں مجھے جب اپنے بعض قریبی ساتھیوں نے بھی اکیلا کر دینا چاہا،تب بھی ان دوستوں نے مجھے اکیلا نہیں ہونے دیا۔
اللہ دونوں دوستوں کو خوش رکھے!

آخر میں اپنے بھائی نوید انجم مقیم امریکہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔نوید کی تحریک پر اس کتاب کو مرتب کرنے اور ٹائٹل کو فائنل کرنے میں خاصی سہولت ہوئی۔

حیدر قریشی

(جرمنی سے) ۲۳/مارچ ۲۰۱۳ء

بزمِ جاں

''میری محبتیں'' کی اشاعت سے پہلے ہی مجھے احساس تھا کہ اس میں شامل بعض شخصیات ایسی تھیں کہ ان پر مزید لکھا جانا چاہئے تھا۔بعض لوگ جن کا بیچ بیچ میں کہیں برسبیلِ تذکرہ نام آ گیا ہے،ان کی زندگی کے بعض خوبصورت انسانی رُخ بھی سامنے آنے چاہئیں تھے۔بہت سارے عزیز اوراحباب ایسے ہیں جن کا پورا خاکہ نہیں لکھا جا سکتا لیکن ان کے ذکر کے بغیر میری زندگی کی رُوداد بھی ادھوری رہے گی اور میری محبتیں بھی۔۔۔۔۔مزید خاکہ نگاری تو جب بھی ہوئی اپنے وقت پر ہو گی۔فی الوقت میں اپنی زندگی۔۔۔گزاری ہوئی زندگی کی طرف تو پلٹ کر دیکھ سکتا ہوں۔اپنے بہت سارے پیاروں،رشتہ داروں،دوستوں اور''کرم فرماؤں'' سے تجدیدِ ملاقات تو کرسکتا ہوں۔سوبکھری ہوئی یادوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

جرمنی پہنچنے کے بعد بچپن میں امّی جی سے سنی ہوئی کئی کہانیاں یاد آئیں۔مبارکہ جس کی سادگی کا میں پاکستان میں مذاق اڑایا کرتا تھا،جرمنی میں اب اس کے سامنے میں ایک پاکستانی ''پینڈو'' تھا۔مبارکہ بچوں سمیت مجھ سے اڑھائی سال پہلے جرمنی میں آ چکی تھی اس لئے یہ ملک اس کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا جبکہ میں ''کثرتِ نظّارہ'' سے ایسے رُک رُک جاتا تھا جیسے شہر کے چوراہے پر''گوا چی گاں'' کھڑی ہوتی ہے۔پہلی بار ایک مارکیٹ میں داخل ہونا تھا۔میں دروازے کے قریب پہنچا تو آٹو میٹک دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔امی جی سے سنی ہوئی''علی بابا اور چالیس چور'' والی کہانی یاد آ گئی۔اُس کہانی میں''کھل جا سم سم'' کہنے سے دروازہ کھلتا تھا۔یہاں تو مجھے''کھل جا سم سم'' کہنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔زمین دوز ریلوے اسٹیشنوں میں،مارکیٹوں میں،اُوپر نیچے آنے جانے کے لئے خودکار سیڑھیاں لگی ہوئی ہیں۔میں نے پہلی بار جھجک کے ساتھ بجلی کی سیڑھی پر قدم رکھا،ہلکا سا چکر آیا۔میں نے لحظہ بھر کے لئے آنکھیں موندلیں،جیسے ہی آنکھیں کھولیں اُوپر کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔کسی اناڑی کی طرح سیڑھی کی حد سے باہر آیا تو امی جی کی سنائی ہوئی کئی کہانیاں یاد

آنے لگیں۔کہیں کوئی نیک دل دیو ہے،کہیں سبز پری اور کہیں کوئی درویش ہے جو مہم جُو شہزادے کو کسی لمبی مسافت کی کوفت سے بچانے کے لئے،اس کی مدد کرتے ہوئے اُسے آنکھیں مُوندنے کے لئے کہتے ہیں،پھر جب شہزادہ آنکھیں کھولتا ہے تو منزلِ مقصود پر پہنچا ہوتا ہے۔میں اُوپری منزل پر پہنچا تو میرے ساتھ نہ کوئی نیک دل دیو تھا،نہ کوئی درویش اور نہ ہی کوئی سبز پری۔۔۔۔صرف مبارکہ میرے ساتھ تھی۔اس نے اگر سبز سوٹ پہنا بھی ہوا تھا تو وہ اس کے برقعہ کے کوٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔اس کے باوجود میں نے مبارکہ کو من ہی من میں سبز پری سمجھا اور خود کو شہزادہ گلفام سمجھ کر خوش ہولیا۔

یہاں کے گھروں میں کھڑکیوں کا شیشہ ایسا ہے کہ آپ اندر بیٹھے ہوئے باہر کی ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں جبکہ باہر کھڑا ہوا کوئی آدمی آپ کو بالکل نہیں دیکھ سکتا۔جب مجھے پہلے پہل اس کا علم ہوا دھیان فوراً سلیمانی ٹوپی والی کہانی کی طرف چلا گیا۔مجھے ایسے لگنے لگا جیسے میں امی جی کی سُنائی ہوئی ڈھیر ساری کہانیوں کا جیتا جاگتا کردار بن گیا ہوں۔ساری کہانیاں جیسے اپنے آپ کو میرے وجود میں دُہرانے لگی ہیں۔کاش!امی جی زندہ ہوتیں اور میں انہیں اُن کی سنائی ہوئی کہانیوں کا حقیقی رُوپ دکھا سکتا۔اب تو وہ خود ہی کہانی بن گئی ہیں۔

اپنے ہاں تو غالبؔ اُس چارگرہ کپڑے کا افسوس کرتے رہے جس کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہونا لکھا ہوتا ہے۔اِدھر مغرب میں اُس تین گرہ کپڑے کی قسمت پر رشک آتا ہے جو گرمیوں میں حسینانِ مغرب نے زیب تن کر رکھا ہوتا ہے۔ایک طرف ایسا توبہ شکن منظر ہوتا ہے،دوسری طرف برقعہ میں لپٹی لپٹائی مبارکہ بیگم۔۔۔۔۔میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے،پردہ کا مطلب خود کو دوسروں کی نظروں سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔پاکستان میں تو چلو ٹھیک ہے لیکن یہاں جرمنی میں اس قسم کا برقعہ تو پردے کے تقاضے پورے کرنے کی بجائے ہر کسی کو متجسّس کر دیتا ہے کہ یہ کیا شے جا رہی ہے؟میں نے دو تین دفعہ اسے تجربہ کرایا کہ عام آنے جانے والی گوریوں کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن مبارکہ کے بھاری بھر کم پردے کی وجہ سے ہر گزرنے والا ہمیں تعجب سے دیکھتا ہے اور ضرور دیکھتا ہے۔یوں مبارکہ کی بے پردگی ہو نہ ہو میری اچھی خاصی بے پردگی ہو جاتی ہے۔لیکن اس پر میری کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔

ایبٹ آباد میں قیام کے دوران طاہر احمد کے بعد ایک اور صاحب سے میری گہری دوستی تھی۔یہ سرگودھا کے مسعود انور تھے۔ڈاکٹر انور سدید کے صاحبزادے۔۔۔۔ان کے ساتھ انور سدید صاحب والی نسبت سے تو دوستی تھی ہی،لیکن ہماری ایک حد تک ہم عمری بھی اس کے استحکام کا باعث بنی۔ادب اور

سیاست کی تازہ صورتحال پر ہم کھل کر گفتگو کرتے تھے۔موسیقی سے مسعود انور کو خاصا لگاؤ تھا۔انہوں نے آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کا نایاب ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔کسی لائبریری کی کتابوں کی طرح انہیں ترتیب سے رکھا تھا۔امید ہے ابھی تک اُن کا شوق سلامت ہوگا۔اُن دنوں وہ ذاتی طور پر ویڈیو کیسٹس میں ادیبوں کے انٹرویوز ریکارڈ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔خدا جانے وہ منصوبہ کہاں تک پہنچا۔ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی تھی کہ ہم ایک دوسرے کا مذاق اڑا لیتے تھے لیکن ایک دن مسعود نے ایک بات اتنی سنجیدگی اور عقیدت سے کہی کہ ہمیں بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

انہیں کسی زمانے میں سوتے وقت سینے پر بوجھ اور گھبراہٹ کی شکایت ہو جاتی تھی۔معدے کی خرابی، سینے کی جلن اور دیگر امکانی بیماریوں کے سارے علاج کرا لئے، کوئی افاقہ نہیں ہوا۔اس دوران ان کی ایک پیر سائیں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مسعود کو ہدایت کی کہ گھر کے کمروں کی دیواروں سے ساری تصویریں اتار دیں کیونکہ تصویروں کی اصل رُوحیں رات کو آپ کے سینے پر چلتی ہیں۔مسعود نے ایسا ہی کیا اور حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہو گئے۔ہو سکتا ہے یہ پیر سائیں کا فیضانِ نظر ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نفسیاتی اثر ہوا ہو۔نتیجہ بہر حال اچھا رہا۔تب مجھے بھی اُن پیر سائیں سے ملنے کی خواہش ہوئی، لیکن رابطہ ہونے سے پہلے مجھے وطنِ عزیز کو خیر باد کہنا پڑ گیا۔۔۔۔اس قصہ کو سننے کے بعد ایک دن میں اور طاہر شاپنگ کرنے گئے۔وہاں طاہر بڑے شوق سے ریکھا، سری دیوی، مادھوری اور دوسری مقبول فلمی اداکاراؤں کے پوسٹرز کی قیمتیں معلوم کرنے لگا۔میں نے حیرانی سے اس کا سبب پوچھا، کیونکہ طاہر کو فلمیریا کی کوئی شکایت نہیں تھی۔سنجیدگی سے کہنے لگا میں چاہتا ہوں راتوں کو ان سب کی رُوحیں میرے سینے پر چلتی رہیں کیونکہ رُوح کا ملن، جسم کے ملن سے زیادہ اہم ہے۔اس لئے ان کے پوسٹرز اپنے کمرے میں لگاؤں گا۔

ایبٹ آباد میں ہمارے کالج کے بعض اساتذہ ''مریضانِ محبت'' بنے ہوئے تھے۔ایک دفعہ یونہی اُوٹ پٹانگ باتیں ہو رہی تھیں۔میں نے ان سے کہا کہ خواہش کی شدت خواب کا رُوپ دھار لیتی ہے۔اگر کبھی کسی کو خواب میں اپنی کوئی پسندیدہ شخصیت کسی من پسند حالت میں دکھائی دے تو بیدار ہونے پر بستر کی پائینتی کی طرف سرک کے سو جائیں۔اُسی رات آپ کی وہ پسندیدہ شخصیت اپنی نیند میں وہی خواب عین اُسی حالت میں دیکھ لے گی۔''مریضانِ محبت'' نے اس فارمولے پر تھوڑی سی بے یقینی اور زیادہ خوشی اور حیرت کا اظہار کیا۔اگلے دن دونو جوان اساتذہ ڈیوٹی پر آئے تو اُن کی آنکھیں سُرخ اور طبیعت بوجھل

بوجھل سی تھی۔ملتے ہی کہنے لگے یار قریشی صاحب! ہم تو ساری رات پائینتیاں ہی بدلتے رہے ہیں۔

خواب کی اس مزاحیہ بات سے اپنی زندگی کے دو واقعات یاد آ گئے۔سنجیدہ اور حیران کُن۔۔۔خانپور میں شوگر ملز کی ملازمت کے دوران ایک دفعہ میری شام ۶ بجے سے رات ۲ بجے تک والی شفٹ تھی۔گھر سے چلا تو ہلکے سے ٹمپریچر کا احساس ہو رہا تھا، فیکٹری پہنچتے تک بخار ہو گیا۔میں نے ساتھیوں کو اپنا کام سونپا اور خود لیبارٹری کے ڈارک رُوم میں جا کر لیٹ گیا۔فرش پر فلٹر کلاتھ کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا تھا، ایک اینٹ کا تکیہ بنا لیا لیکن اُوپر لینے کے لئے کوئی کپڑا نہیں تھا۔بخار کی وجہ سے ٹھنڈ بھی لگ رہی تھی۔میں اپنے آپ میں سمٹ کر ٹھنڈ سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔اسی دوران بخار کی غنودگی کی حالت میں ایسے لگا جیسے کسی نے آ کر گرم رضائی میرے اُوپر ڈال دی ہو۔کسی کے آنے، اپنے اُوپر رضائی ڈالے جانے اور پھر اس رضائی کو اپنے دائیں، بائیں اچھی طرح لپیٹنے کا عمل مجھے صاف صاف محسوس ہوا تھا۔پھر مجھے گہری نیند آ گئی۔رضائی کی گرمائش سے کھل کر پسینہ آیا۔

چھٹی کے پہلے سائرن کے ساتھ میری آنکھ کھلی تو مجھے محسوس ہوا بخار اُتر چکا ہے۔میں نے رضائی کو اپنے اُوپر سے ہٹا کر اُٹھنا چاہا۔لیکن میرے اُوپر تو کوئی رضائی نہیں تھی۔پھر یہ سب کیا تھا؟۔۔۔۔میں نے ابا جی کو یہ بات بتائی تو انہوں نے کہا ایسے واقعات کو کسی کے آگے بیان نہیں کرنا چاہئے ورنہ انسان ایسے تجربات کی لذّت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔(ابا جی کی وفات کے بعد ابا جی کے تعلق سے ایک تجربے کے بعد مجھے بابا جی نے بھی ایسی ہی نصیحت کی تھی۔لیکن شاید مجھ میں اخفاء کی برداشت کی قوت نہیں ہے)۔

لگ بھگ بیس سال کے بعد یہاں جرمنی میں پھر ایک انوکھا واقعہ ہوا۔مجھے انفیکشن کی شکایت تھی۔ایک ہفتہ گزر گیا لیکن سستی کے مارے اپنے فیملی ڈاکٹر Herr Ehrhardt کے پاس نہیں جا سکا۔جب گلا بالکل بیٹھ گیا تب ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ڈاکٹر پہلے تو اس بات پر ناراض ہوا کہ میں اتنی دیر کر کے کیوں آیا ہوں جب حالت اتنی بگڑ گئی ہے۔اب اسے کیا بتاتا کہ یہی تو ہمارے پاکستانی ہونے کا ثبوت ہے۔جب تک پانی ہمارے گلے تک نہ آ جائے ہمیں بے فکری رہتی ہے۔بہر حال ڈاکٹر نے صبح، دوپہر، شام تینوں وقت بلا ناغہ سات دن تک کھانے کے لئے گولیاں دیں اور سخت تاکید کی کہ سات دنوں میں ایک وقت کا بھی ناغہ نہیں کرنا۔لیکن ہوا یوں کہ اسی دن میرے ماموں زاد مبشر اور ان کی بیگم ہمیں لینے کے لئے آ گئے۔وہ ہمبرگ سائڈ کو چھوڑ کر ہمارے قریب ایک شہر لمبرگ میں نئے نئے آئے

تھے۔ان کے مکان کی سیٹنگ کرنی تھی۔اسی کام کے لئے غزالہ اور اجمل بھی آ گئے تھے۔میں صبح کی گولی کھا چکا تھا۔دوپہر کی گولی بھی کھا لی۔کام نمٹانے کے بعد غزالہ اور اجمل اپنے گھر چلے گئے۔مبارکہ اور میں وہیں رہ پڑے۔دن بھر کی تھکن کے باعث مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔اسی حالت میں بار بار یہ احساس ستا رہا تھا کہ پہلے ہی دن گولی کا ناغہ نہ ہو جائے اسے کھا کر ہی سونا چاہئے۔لیکن تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں سوچتا ہی رہ گیا اور نیند نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔پھر میں نے نیند میں ہی محسوس کیا کہ وہی انفیکشن کے علاج والی ایک موٹی سی گولی کسی نے میرے منہ میں ڈال دی ہے۔میں پانی کے بغیر اسے نگلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور بالآخر نگل گیا ہوں۔

صبح بیدار ہوا تو ایسے لگتا تھا میرے ساتھ کوئی پُر اَسرار واقعہ ہو گیا ہے۔مجھے یقین تھا کہ میری گولیوں کے پیکٹ میں سے لازماً ایک گولی کم ہو چکی ہو گی۔میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ گولیوں کو چیک کیا' گولیاں جُوں کی تُوں موجود تھیں'ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔لیکن یکا یک مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر نے جس بیٹھے ہوئے گلے کے ٹھیک ہونے کے لئے سات دن کی دوا دی تھی اور ایک وقت کا ناغہ بھی نہ کرنے کی تاکید کی تھی' وہ گلا بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔تب میں نے خوشی کے مارے مبارکہ کو زور زور سے پکارنا شروع کر دیا۔جب وہ آئی تو اسے رات کے خواب جیسے تجربے سے آگاہ کیا۔جب سارا قصہ سنا چکا تب مجھے ابا جی کی نصیحت یاد آئی لیکن تیر تو کمان سے نکل چکا تھا اور پھر مجھے ابا جی بہت یاد آئے۔ہو سکتا ہے خواہش کی شدت خواب میں کسی نفسیاتی طریقے سے علاج بھی کر دیتی ہو۔ایسا ہے تو تب بھی یہ ایک سائنسی بھید ہے۔ویسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کیا بھید ہے لیکن ان دو تجربات سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے اپنی کہانی ''بھید'' لکھنے کی تحریک ہوئی۔

میرا چھوٹا بھائی اکبر کراچی میں سیٹ ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔وہیں ماموں کوثر پہلے سے سیٹ تھے۔ان کا بیٹا شکور باجوہ' اکبر کا ہم عمر تھا اور دوست بھی۔سانگلہ ہل میں مقیم میری ماموں زاد آپا حلیمہ کا بڑا بیٹا محمود'رشتے میں ہمارا بھانجہ ہے۔اکبر اور شکور کے ایج گروپ میں ہونے کے باعث ان کا بھانجہ کم اور دوست زیادہ تھا۔اپنی خوش مزاجی کی وجہ سے عمروں کے واضح فرق کے باوجود میرے ساتھ بھی بے تکلفی کر جاتا تھا۔محمود تلاش معاش کے سلسلے میں کراچی پہنچا تو تین خوش مزاج نوجوانوں کی مثلث بن گئی۔جہاں یہ تینوں پہنچتے' شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا۔شکور کی گپ بازی' اکبر کا پُر لطف طنز اور محمود کی جُگت بازی' ۔۔یوں سمجھیں معین اختر' عمر شریف اور امان اللہ خان تینوں کامیڈین ایک ساتھ آ گئے ہیں۔تینوں مل کر

اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتے۔ایک دوسرے سے بھی ہاتھ کر لیتے تھے۔اکبر گھر پر نہیں تھا۔محمود نے آ کر اکبر کی بیوی زاہدہ سے کہا کہ ماموں حیدر کے دوست اظہر ادیب خانپور سے آئے ہیں۔اکبر سے ملنا چاہتے ہیں۔زاہدہ نے کہا اکبر تو دیر سے آئیں گے۔تم انہیں بیٹھک میں بٹھاؤ' میں کھانے پینے کو کچھ بھجواتی ہوں۔محمود خود ہی اظہر ادیب بن کر بیٹھک میں بیٹھ گیا۔پھر اُٹھ کر ریفریشمنٹ لے کر آیا اور خود ہی کھا پی گیا۔اس کے بعد زاہدہ کو آ کر بتایا کہ وہ ذرا جلدی میں ہیں اس لئے اب جانا چاہتے ہیں۔شاید پھر کبھی چکر لگائیں لیکن وہ پھر کبھی چکر نہ لگا سکے کیونکہ تھوڑی دیر بعد محمود نے خود ہی اصل بات بتا دی۔

فی الوقت مجھے ان تینوں کے جو کارنامے یاد آ رہے ہیں' انہیں خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ ہی رہنے دینا چاہتا ہوں۔تینوں پاکستانی نوجوان بے روزگار تھے۔تینوں ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔اکبر لندن چلا گیا' شکور جرمنی آ گیا اور محمود امریکہ پہنچ گیا۔اس کے باوجود بھانڈوں کا یہ گروپ ایک دوسرے سے جُڑا ہوا تھا۔زندگی کی مزاحیہ فلم کے ان تین مرکزی کرداروں کے ساتھ ایک اور کامیڈی کردار ذکیہ کا ہے۔ذکیہ میری ماموں زاد بہن ہے۔دس سال پہلے ٹُن ٹُن (اوما دیوی) جیسی لگتی تھی' چہرہ عابدہ پروین جیسا۔۔۔۔اب تو ضخامت میں بہت ترقی کر گئی ہے۔تکلیف دہ موٹاپے کے باوجود اس کی خوش مزاجی اور زندہ دلی سلامت تھی۔یہاں ''تھی'' کا لفظ میں نے سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔۱۹۹۶ء میں شکور ۳۹ سال کی عمر میں فوت ہو گیا تو زندگی کی مزاحیہ فلم المیہ سے دوچار ہو گئی۔ہر دَم خوش رہنے اور ہنسنے' ہنسانے والوں کو چُپ سی لگ گئی۔

جرمنی میں مقیم ہونے کے باعث شکور کا ہم سے گہرا رابطہ تھا۔ہمبرگ سے کسی نہ کسی بہانے ہر مہینے فرینکفرٹ کا چکر لگا جاتا تھا۔اس کا قیام ہمیشہ ہمارے گھر میں رہا۔حالانکہ بھابی رعنا کے بہن بھائی بھی اِدھر ہی رہتے ہیں اور ہمارے اپنے دو کزنز بھی قریب ہی رہتے ہیں لیکن شکور فیملی ہمیشہ ہمارے گھر میں ہی قیام پذیر ہوتی۔ان کے چاروں بچے ہمارے ہاں آنے کے بعد کہیں اور جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔شکور کے مزید ذکر سے پہلے ایک ہلکا سا دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔۔۔کراچی میں ماموں صادق کے گھر کے ساتھ والے گھر سے بھی اس قصے کا تعلق بنتا ہے۔

ایک دفعہ میں کراچی گیا' ماموں صادق کے ہاں ٹھہرا تھا۔گرمیوں کے دن تھے لیکن راتیں ٹھنڈی ہو جاتی تھیں۔میں رات کو بیٹھک میں سویا۔چھت کا پنکھا چل رہا تھا۔آدھی رات کو مجھے ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا تو میں نے اُٹھ کر چھت کا پنکھا بند کر دیا اور پھر لیٹ گیا۔مجھے محسوس ہوا کہ سوئچ آف کرنے کے

باوجود پنکھا چل رہا ہے۔ بلب جلا کر چیک کرنے کی بجائے میں نے نیچے کی چادر اوپر لے کر گزارہ کرلیا۔ پھر بھی مجھے رات بھر ٹھنڈ لگتی رہی۔ صبح اُٹھ کر دیکھا تو پنکھا بند تھا۔ ممانی زاہدہ سے پوچھا پنکھا آپ نے بند کیا تھا؟ انہوں نے کہا ''نہیں''۔

میں نے کہا رات تو یہ بند کرنے کے باوجود بند نہیں ہوا تھا پھر اب کیسے بند ہو گیا؟ جبکہ میں رات بھر ٹھٹھرتا رہا ہوں۔ ممانی زاہدہ سارا ماجرا جان گئی تھیں۔ انہوں نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا ساتھ والے ہمسایوں کے ملحقہ کمرے کا پنکھا رات بھر چلتا رہا تھا۔ اس کی گڑگڑاہٹ سے تم سمجھتے رہے کہ تمہارے کمرے کا پنکھا چلتا رہا ہے۔

لیکن پھر مجھے ٹھنڈ کیوں لگتی رہی؟ میں نے پوچھا تو ممانی زاہدہ نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بتایا کہ یہ پہاڑی کے رُخ والی کھڑکی کھلی تھی جس سے ہوا آتی رہی۔ اُسی دن ممانی زاہدہ نے ہمسایوں سے شکایت کی کہ آپ کے پنکھے کی وجہ سے ہمارا بھانجہ ساری رات پالے سے ٹھرتا رہا ہے۔ اس شکایت پر غور کرنے کے بعد ہمسایوں نے مطالبہ کیا کہ چونکہ ہمارے پنکھے سے آپ کے بھانجے کو ہوا محسوس ہوتی رہی ہے اس لئے رات بھر کا بجلی کا بِل آپ ادا کریں۔ انہیں ہمسایوں کی چھوٹی بہن رعنا رفعت بعد میں شکور سے شادی کر کے رعنا شکور بنیں۔

ماموں کوثر اور ممانی شمیم نے اس رشتے کی شدید مخالفت کی پھر یکا یک ماموں کوثر اس شادی کے لئے راضی ہو گئے۔ میں نے شکور سے پوچھا کہ ماموں کوثر اس رشتے کے لئے یکدم کیسے راضی ہو گئے تھے؟۔۔۔۔ شکور کہنے لگا: اُس دن گھر میں بہت سارے مہمان آ گئے تھے۔ بستر کم پڑ رہے تھے۔ سو مجھے رات کو ابا جی کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر سونا پڑا۔ تب مجھے دن میں بھی رعنا کے خواب نظر آتے تھے، رات کو تو آتے ہی آتے تھے۔ چنانچہ پتہ نہیں کس پَل میں، مَیں کس کیفیت سے دوچار تھا جبکہ چارپائی پر تو ساتھ ابا جی سوئے ہوئے تھے۔ اُس رات ابا جی تہجد کے وقت سے بھی پہلے اُٹھ گئے۔ میرے بیدار ہونے پر انہوں نے مجھے بُرا بھلا کہا اور ساتھ ہی رعنا سے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔

ماموں کوثر بنیادی طور پر سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی محنت سے بے شمار کمایا اور شوبازی سے گنوا بھی دیا۔ مجھے یاد ہے ہمارے رحیم یار خاں میں قیام کے زمانے میں رحیم یار خاں آئے تھے۔ یہاں ابا جی سے پیسے مانگنے کی بجائے انہوں نے 'لیور برادرز' میں دیہاڑی والی مزدوری کی۔ تھوڑی سی رقم جوڑی اور تلاشِ رزق میں کراچی جا پہنچے۔ وہاں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر پنسلیں، قلم وغیرہ فروخت

کرنے سے کام کا آغاز کیا۔ خدا کے فضل اور اپنی محنت سے ایک ہوزری کے مالک بن گئے۔ عروج تک پہنچے تو کچھ ان کی ''شوبازی'' کی عادت نے اور کچھ ممانی شمیم کی ''میں'' نے پھر زوال سے ہمکنار کر دیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا، پھر سے فٹ پاتھ پر آ گئے لیکن حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ نئے سرے سے محنت کی۔

دوسری بار جب ابھی تگ ودو میں مصروف تھے، میرا کراچی جانا ہوا۔ ایک دن مجھے افسانہ نگار فردوس حیدر کے ہاں جانا تھا، ماموں بھی ساتھ ہو لئے۔ میری پہلی ملاقات تھی لیکن ماموں کوثر نے کچھ سوچے سمجھے بغیر وہاں بھی لمبی لمبی چھوڑنی شروع کر دیں۔ خود کو پی آئی اے کے ایک پراجیکٹ کا کنٹریکٹر ظاہر کیا۔ مجھے خاصی شرمندگی ہو رہی تھی۔ یہ شرمندگی اس وقت اور بڑھ گئی جب فردوس حیدر ہمیں خدا حافظ کہنے کے لئے باہر تک آ گئیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پی آئی اے کے اتنے بڑے کنٹریکٹر کے پاس گاڑی نہیں ہے، تب انہوں نے اپنی گاڑی نکال کر گھر تک پہنچا دینے کی پیش کش کی۔ میں تو زمین میں گڑا جا رہا تھا مگر ماموں کوثر کو معمولی سی خفّت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے حوصلے اور جرأت کا میں تب سے معترف ہوں۔ ممانی شمیم کی ''میں'' اور ماموں کوثر کی بے جا ''شوبازی'' کے عیب کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی یہ خوبی اُبھر آتی ہے کہ وہ سخت محنت اور لگن والے انسان ہیں۔ انہوں نے دوسری بار فٹ پاتھ سے ایک کامیاب فرم قائم کرنے تک کا سفر کر لیا ہے۔ اب تو ان کے پاس سچ مچ گاڑیاں بھی آ گئی ہیں۔ اب جب کبھی کراچی جانا ہوا فردوس حیدر کے ہاں ماموں کوثر کے ساتھ ہی جاؤں گا اور اس بار مجھے خفّت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ اس بار سچ مچ ماموں کوثر کے پاس گاڑی ہو گی۔

شکور کو جب پہلے پہل ہسپتال میں داخل کیا گیا، مَیں، اجمل، شعیب اور عثمان فوراً ہمبرگ پہنچے۔ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بھابی رعنا سے کہنے لگا: دیکھو! بھائی ایسے ہوتے ہیں۔ اس کا اصرار تھا کہ ہم سب عید اُس کے ہاں آ کے کریں۔ میں نے ایک خصوصی پیش کش کے ساتھ اسے کہا کہ آپ سب لوگ عید پر ہمارے ہاں آ جائیں۔ شکور راضی ہو گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ عید پر ضرور آؤں گا۔

جب ہم واپس آنے لگے، شکور نے مجھے اکیلے کو روک لیا۔ کچھ گھریلو باتوں کے علاوہ اس نے ایک دُکھ کا اظہار کیا۔ کہنے لگا: میں ستمبر (۱۹۹۵ء) میں پاکستان جا کر والدین سے مل کر آیا ہوں۔ ابھی اُس سفر کے قرضے نہیں اترے۔ اس غیر حاضری کی وجہ سے نوکری بھی جاتی رہی۔ جنوری (۱۹۹۶ء) میں چھوٹی بہن کی شادی پر جانا میرے لئے ممکن نہیں تھا تب سے ابا جی (ماموں کوثر) سخت ناراض ہیں۔ جب

بھی میں نے ٹیلی فون کیا ہے میری آواز سنتے ہی ٹیلی فون بند کر دیتے ہیں۔ یہ بات بتاتے ہوئے اس کے اندر کا سارا کرب اس کی آواز اور اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔ میرے ساتھ اس ملاقات کے بعد بھابی رعنا کی اس سے ایک بار ملاقات ہوئی اور پھر وہ آپریشن رُوم میں چلا گیا۔ جگر کی تبدیلی کا آپریشن تھا۔ نازک صورتحال تھی۔ جرمنی میں مقیم سارے عزیز ہمبرگ پہنچنے لگے۔ مبارکہ، رضوانہ، حفیظ، شعیب، عثمان، ٹیپو، اویس، غزالہ، اجمل، مبشر، بھابی نوشی، عارفہ، منان، سب مضطرب تھے۔ بھابی رعنا کی حالت تو ناقابلِ بیان تھی۔ دھڑکتے دلوں کے ساتھ دعائیں ہو رہی تھیں۔ لیکن کوئی دعا کارگر نہ ہوئی۔ شکور فوت ہو گیا۔ اس کی میّت پاکستان بھجوانے کا انتظام کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ اجمل کو جزائے خیر دے جس کی ہمت اور تگ و دو کے نتیجہ میں میّت کو پاکستان بھجوانے کا انتظام ہو سکا۔

عید سے ایک دن پہلے شکور کی میّت ہمبرگ سے فرینکفرٹ پہنچی۔

زندگی بھر گپیں ہانکنے والا میرا کزن مرنے کے بعد وعدے کا اتنا پکا نکلے گا۔

یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد

شمارہ اگست، ستمبر ۱۹۹۸ء

ددھیال کے رشتہ دار

میرے ددھیال میں اباجی اور باباجی صرف دو ہی بھائی تھے، بہن کوئی نہ تھی، سو ہماری کوئی پھوپھی نہ تھیں۔ تاہم اباجی اور باباجی کی دو کزنز تھیں۔ بُوا حیات خاتون اور بُوا لال خاتون۔ دونوں سے ہمیں پھوپھیوں کا اتنا پیار ملا کہ کسی حد تک پھوپھیوں کی عدم موجودگی کی تلافی ہوگئی۔ بُوا حیات خاتون چاچڑاں شریف میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ہمارے رحیم یار خاں میں قیام کے دوران، اور پھر خانپور میں قیام کے دوران بھی ان کا ہمارے ہاں مسلسل آنا جانا رہا۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ مجھے امی جی کے بعد بچپن میں سب سے زیادہ کہانیاں بُوا حیات خاتون نے سُنائیں۔ ان کی کہانیوں میں انسانوں، پرندوں اور جانوروں کے کردار مل جل کر رہتے تھے۔

بُوڑھی مائی نے کوّے سے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

چڑیا شہزادے سے کہنے لگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک کہانی جو مجھے آج بھی بہت اچھی طرح یاد ہے اس میں توچُوہا، بلّی، کتا، ڈانگ، آگ، چھوٹی نہر، بڑی نہر، درخت۔۔۔۔ یہ ساری چیزیں بھی باتیں کرتی تھیں۔ شاید ایسی کہانیاں انسان اور فطرت میں مغائرت سے پہلے کے، پرانے زمانے کی یادوں کی بازگشت ہوتی ہیں جو کچھ ہمارے شعور میں اور کچھ لاشعور میں ہمیں ورثہ در ورثہ ملتی رہتی ہیں۔

بوا حیات خاتوں بڑھاپے میں بھی بے حد خوبصورت تھیں۔ ذہین لیکن دل کی سادہ۔۔۔ زمانے کی رفتار پر حیران لیکن اس کے حیرت انگیز ارتقا کو جانتی بھی تھیں اور مانتی بھی تھیں۔ ان کے برعکس بُوا لال خاتوں بہت ہی بھولی بھالی تھیں۔ بُوا لال خاتوں کوٹ شہباز میں بیاہی ہوئی تھیں۔ کوٹ شہباز قریشیوں کی اپنی بستی ہے۔ پہلے تو ایک ہی بڑی ساری حویلی تھی جس کے اندر سب کے اپنے اپنے گھر تھے۔ اب حویلی سے باہر بھی مکانات کی تعمیر ہوگئی ہے تاہم اصل حویلی ابھی بھی قائم ہے۔۔۔ اگر رحیم یار خاں سے ظاہر پیر کی طرف جائیں تو رستے میں ''شیخ واہن'' کا اسٹاپ آتا ہے۔ یہاں سے اندازاً دو میل کے فاصلے پر ''کوٹ شہباز'' ہے۔

بچپن میں ہم نے جب بھی کوٹ شہباز جانا ہوتا تھا شیخ واہن کے بس اڈے پر ہمیشہ پہلے سے ایک تانگہ موجود ہوتا تھا جو ہمیں کوٹ شہباز لے جاتا تھا۔معروف سیاستدان مخدوم حمیدالدین ہاشمی اور مخدوم نور محمد ہاشمی صاحبان کا گاؤں ''میانوالی قریشیاں'' کوٹ شہباز سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہے۔دونوں بستیوں میں قریشی برادری کا رشتہ تھا۔شادی اور مَرگ پر آنا جانا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔خیر بات ہو رہی تھی بُوا لال خاتوں کے بھولپن کی۔کسی عزیز کی بیماری کے باعث بُوا رحیم یارخاں آئیں۔ہسپتال میں عیادت کے لئے گئیں۔یہ ۶۰۔۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ہسپتال میں مریض کے قریب ایک پیڈسٹل فین رکھا ہوا تھا جو دائیں' بائیں گھوم رہا تھا۔بُوا لال خاتوں نے ایک دو بار یہ منظر حیرت سے دیکھا پھر خوفزدہ ہوکر کہنے لگیں:

یہ کیا اَسرار ہے؟ یہ تو کوئی طلسماتی شے ہے۔خود بخود کبھی اِس طرف ہوا دینے لگتی ہے کبھی اُس طرف ہوا دینے لگتی ہے۔۔۔۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی رحیم یارخاں میں ہمارے گھر میں بھی بجلی نہیں آئی تھی۔لکڑی کے تختے سے بھاری بھرکم کپڑا الٹکا کر اسے چھت پر لٹکا دیا جاتا تھا۔تختے سے ایک مضبوط ڈوری باندھی جاتی پھر اسے ایک چرخی سے گزار کر کھینچا جاتا۔بجلی آنے سے پہلے ایسے پنکھے ہوا کرتے تھے۔کوٹ شہباز میں بھی ایسے ہی پنکھے تھے۔اب تو کوٹ شہباز بھی بجلی کی برکتوں سے فیض یاب ہو رہا ہے۔

بُوا لال خاتوں پہلی بار لاہور گئیں۔ایک تو لاہور ریلوے اسٹیشن کی پُرشکوہ عمارت' پھر ہجومِ خلق۔اور اس ہجوم میں سُرخ وردی میں ملبوس قلیوں کی فوج ظفر موج۔اوپر سے قلیوں کا 'فرطِ محبت' سے سامان اُٹھانے میں سبقت لے جانے کی کوشش' اور اس کوشش میں سامان کی کھینچا تانی۔۔۔۔بُوا لال خاتوں نے سمجھا ڈاکوؤں نے ہلّہ بول دیا ہے۔چنانچہ انہوں نے بچاؤ۔۔۔بچاؤ۔۔۔کا شور مچا دیا۔

یہ بھولپن تو سن پچاس اور ساٹھ کے درمیانی عرصہ کا ہے۔اَسّی کی دَہائی میں جبکہ گھر گھر ٹی وی پہنچ چکا تھا' اس زمانے میں بھی بھولے بھالے لوگ مل جاتے تھے۔خانپور میں مبارکہ کی ایک سہیلی تھی سعیدہ۔۔۔سعیدہ کی والدہ کنیز بی بی نے ساری زندگی فلم نہیں دیکھی تھی۔ان کے گھر ٹی وی آیا تو ماسی کنیز نے ٹی وی پر مَردوں کو دیکھ کر پردہ کرلیا تاکہ ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے مَرد انہیں بے پردہ نہ دیکھ لیں۔سعیدہ اور ماسی کنیز ابھی بھی خانپور میں مقیم ہیں۔اللہ انہیں خوش رکھے۔۔ہمارا معاشرہ جب تک ایسے معصوم لوگوں سے بسا ہوا تھا تب تک قناعت پسند اور آسودہ تھا۔علم کی برکات سے انکار نہیں لیکن جب

سے ہمارے معاشرے میں معصومیت کی جگہ چالاکی آ گئی ہے' قناعت کی جگہ حرص نے لے لی ہے۔رزق کی فراوانی کے باوجود معاشرہ بےسکون اور بےچین ہے۔اس کے ذمہ دار بلاامتیاز ہم سب ہیں۔

کوٹ شہباز کے اہلِ قریش رحیم یارخاں جب بھی آتے' ہمارے ہاں قیام کرتے۔خانپور میں بھی ہمارا گھر ان کے قیام کا مرکز رہا۔رحیم یارخاں میں رہائش کے دنوں کی بات ہے میرا چھوٹا بھائی اکبر (جو اَب لندن میں مقیم ہے) گھر کے صحن میں بیٹھا مٹی سے کھیل رہا تھا۔تب اس کی عمر چار سال کے لگ بھگ تھی۔کھیلتے کھیلتے اچانک چونک کر بولا: ''اوہ!'' امی جی اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو کہنے لگا: کوٹ شہباز والے آرہے ہیں۔۔۔امی جی نے خیال کیا کہ بچے کو بعض عزیزوں کا خیال آ گیا ہوگا اس لئے ایسی بات کردی ہے۔کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد اکبر نے پھر ویسی ہی ''اوہ!'' کی اور پھر بتانے لگا: ان کی جیپ خراب ہوگئی ہے۔امی جی تو ابا جی کی بزرگی اور روحانیت سے بھی الجھتی رہتی تھیں' کچھ کچھ معاملہ بھانپ گئیں اور کہنے لگیں: بڑے میاں سو بڑے میاں' چھوٹے میاں سبحان اللہ۔۔۔ابھی ان کے باپ کی بزرگی مانی نہیں گئی اور یہ بیٹا بھی بزرگی جتانے لگا ہے۔تھوڑے وقفہ کے بعد اکبر نے پھر ''اوہ'' کی اور کہا: جیپ ٹھیک ہوگئی ہے۔اب وہ ہمارے گھر آ رہے ہیں۔۔۔۔اور پھر سچ مچ تھوڑی دیر کے بعد کوٹ شہباز والے آ گئے۔امی جی نے ان کے آتے ہی پوچھا: کیا آپ لوگوں کی جیپ رستے میں خراب ہوگئی تھی؟۔۔۔۔وہ سب کے سب ہکا بکا رہ گئے کہ یہ خبر ہمارے گھر کیسے پہنچ گئی۔اکبر جو اپنے آپ میں مگن بدستور مٹی سے کھیل رہا تھا' امی جی نے اس کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ ہمیں تو ساری رپورٹ یہی دیتا رہا ہے۔

بوا لال خاتوں کے بعد بھی کوٹ شہباز کے عزیزوں سے پیار محبت کا تعلق قائم رہا۔یہ تعلق ختم تو نہیں ہوا لیکن اس میں تھوڑی سی دراڑ ضرور پیدا ہوگئی۔ہم لوگ قریشی ہونے کے باوجود ذات پات کو اہمیت نہیں دیتے۔میری والدہ باجوہ خاندان سے ہیں۔میری بیوی بھی باجوی ہے کہ میری ماموں زاد ہے۔رشتے ناطے میں ہم صرف ''موزوں رشتے'' کو اہمیت دیتے ہیں۔میری ایک بھابی جاٹ خاندان کی ہے' ایک ارائیں اور ایک اعوان۔ایک بہنوئی سید ہے' ایک راجپوت ہے اور دو جاٹ۔۔۔میری بڑی بہن کی شادی ہوئی۔کوٹ شہباز والے عزیز بڑے چاؤ سے شریک ہوئے۔شادی سے پہلے آ کر رونق لگائی۔رخصتی والے دن جب بارات آئی تو انہوں نے دیکھا کہ بارات میں اونچے اونچے طرّوں والے پنجابی جاٹ موجود ہیں۔اِدھر اُدھر سے سن گن لی۔جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ دولہا کا نام چوہدری عبدالرّحیم

ہے اور قریشیوں کی بیٹی کا بیاہ ایک جاٹ سے ہو رہا ہے‘ اُن کی قریشی شان کو دھچکا سا لگا۔ خاموشی سے ایک بس بُک کرا کے لائے اور تمام مرد‘ خواتین اور بچے بس میں بیٹھ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ شادی کے ہنگامے میں ہمیں پتہ بھی نہ چل سکا۔ وہ تو جب رخصتی کا وقت آیا اور اُن میں سے بعض عزیزوں کو آگے لانے کی ضرورت پڑی‘ تب پتہ چلا کہ وہ تو سب کے سب خاموش احتجاج کرتے ہوئے جا چکے ہیں۔ تب ابا جی کو اپنے ان عزیزوں پر افسوس ہوا۔ ان سے ملنا ملانا تو ترک نہیں کیا لیکن انہیں پھر کسی بچے کی شادی پر مدعو نہیں کیا۔

کوٹ شہباز کے عزیزوں کی بڑی بڑی زمینیں تھیں لیکن زیادہ تر غیر آباد۔۔۔۱۹۷۰ء کے لگ بھگ انہوں نے زمینوں کا صحیح استعمال کرنا شروع کیا۔ بھاولپور ڈویژن کے مختلف دیہاتوں میں ان کے مُرید موجود تھے۔ ہر چھ ماہ بعد پیر صاحبان اپنا دورہ کرتے‘ سادہ لوح عقیدت مندوں سے ڈھیروں ڈھیر اناج‘ دوسری چیزیں اور نقدی سمیٹ لاتے۔ ان سادہ لوح عقیدت مندوں کی دینی حالت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کرلیں: ہم سارے گھر والے کوٹ شہباز گئے ہوئے تھے‘ وہاں بھائی شہان کے گھر (بوا لال خاتوں اپنے اسی بیٹے کے ہاں رہتی تھیں) پنجاب کی سندھ سے ملحقہ سرحد کے کسی گاؤں سے چند مُرید خواتین آئیں (مُرید مَردوں کو باہر ڈیرے پر ٹھہرایا جاتا تھا)۔ گھر کے دروازے سے باہر ہی وہ خواتین فرطِ عقیدت سے زمین پر بیٹھ گئیں۔ وہاں سے کمرے تک کا فاصلہ جو لگ بھگ ۳۰ میٹر تھا‘ انہوں نے زمین پر گھسٹ گھسٹ کر طے کیا۔ تمام بیبیوں کے پَیروں کو عقیدت سے چھُوا اور زمین پر ہی بیٹھی رہیں۔۔۔اسی دوران قریب کی مسجد سے ظہر کی اذان شروع ہوئی۔۔۔سب خاموش ہو گئے۔۔۔اذان ختم ہوئی تو سب نے کلمہ شریف پڑھا‘ مُریدنیاں حیرانی سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ آخر ان میں سے ایک نے جو نسبتاً بڑی عمر کی تھی‘ بڑی ہی عاجزی سے بوا لال خاتوں سے پوچھا: ’’بی بی پہلے وہ جوان رُوڑ رہا تھا۔ وہ چُپ ہوا تو آپ سب رُوڑنے لگ گئیں۔ یہ کیا معاملہ تھا؟‘‘

اگر یہ واقعہ ہمارا چشم دید نہ ہوتا تو میں کبھی بھی نہ مانتا کہ وطنِ عزیز کے کسی دیہات میں ایسے مسلمان بھی موجود ہیں جن بے چاروں کو نہ کلمے کا پتہ ہے نہ اذان کا علم ہے۔ کوٹ شہباز میں مُلیر درّن‘ مُلیر مِیم اور ادی بالن بفضلہٖ تعالیٰ زندہ ہیں‘ وہ یقیناً اپنی مخصوص مسکراہٹوں کے ساتھ اس واقعہ کی تصدیق کریں گی۔

ہم جب بھی کوٹ شہباز جاتے ہماری اس طرح آؤ بھگت کی جاتی جیسے ہم ان کے پِیر

ہوں۔ حویلی کا ہر گھر ہمیں اپنے ہاں ٹھہرانے پر مُصر ہوتا تھا۔ لیکن ہم نے ہمیشہ بوا لال خاتوں کی بڑی بیٹی مُلیر دُرّن کے ہاں ہی قیام کیا۔ میزبانی پر تُلے ہوئے اتنے گھر تھے کہ صبح‘ دوپہر‘ شام کے کھانے کے لئے ہمیں مشکل پڑ جاتی۔ پھر باقاعدہ ٹائم ٹیبل بناتے تاکہ ایک ہی وقت میں دو دو‘ تین تین گھروں میں کھانا تیار نہ ہو۔ کوٹ شہباز کے قریشی اپنے مُریدوں سے مال سمیٹ لاتے تھے لیکن جب ہم واپس آنے لگتے‘ ساری حویلی کے گھروں سے اس طرح تحائف آنا شروع ہو جاتے جیسے مُریدانِ باصفا اپنے پِیروں کے سامنے نذرانے پیش کر رہے ہوں۔ گندم‘ چاول‘ پیاز‘ آلو‘ لہسن‘ چینی‘ گُڑ وغیرہا چیزوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ پھلوں سے لے کر کپڑوں تک اتنی چیزیں ہوتیں کہ ہمارے لئے انہیں گھر لے جانا مشکل ہو جاتا۔ یہ مشکل بھی پھر انہیں عزیزوں میں سے کوئی دور کرتا اور سارا سامان بحفاظت ہمارے گھر پہنچ جاتا۔ وہ سارے تحائف اب بظاہر عجیب سے لگتے ہیں لیکن ان کے ساتھ جو رشتوں کا تقدس‘ محبت اور خلوص کی دولت ہوتی تھی وہ اتنی قیمتی تھی کہ اس کے مقابلے میں آج کی زندگی کی ساری آسائشیں اور نعمتیں بے معنی لگنے لگتی ہیں۔

اوپر میں نے بعض ناموں کے ساتھ مُلیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ سرائیکی لفظ ہے۔ ماموں زاد رشتوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ خالہ زاد کے لئے مُسات‘ پھوپھی زاد کے لئے پھوپھیر اور تایا زاد‘ چچا زاد کے لئے سوتر بولا جاتا ہے۔ کوٹ شہباز کے عزیزوں کو یاد کرنے لگا ہوں تو کئی خوبصورت نام ستاروں کی طرح میری یادوں میں کہکشاں سی بنانے لگے ہیں۔ بوا لال خاتوں کی اولاد میں میاں پِیرن دِتہ‘ میاں شہان‘ مُلیر درّن‘ مُلیر مِیم‘ ادی بالن‘۔ پھر چاچا قادر بخش‘ چاچا گومے شاہ‘ میاں نواز شاہ‘۔ ان سب کی اولادوں میں میاں شہبازن‘ میاں مجیدن‘ میاں رؤف‘ میاں کریم بخش‘ میاں سرفراز‘ میاں بھورل شاہ‘ میاں حبیبن‘ میاں فیضن‘ میاں ارشاد‘ میاں وڈا‘ میاں شیر‘ بی بی صغریٰ‘ بی بی رئیسہ‘ بی بی مکھنی‘ بی بی حرباب‘ بی بی اشفاق‘ بی بی پروین‘ بی بی مقصود‘ بی بی حاکم‘ بی بی ہوتن‘۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کے علاوہ متعدد اور چہرے ہیں جو اس وقت پوری طرح میرے ذہن اور دل میں آئے ہوئے ہیں لیکن میری بدقسمتی ہے کہ مجھے ان کے نام یاد نہیں آ رہے۔ چاچا گومے شاہ اور چاچا قادر بخش ہم سے ہمیشہ اس بات پر شاکی رہے کہ ہم نے چچا کا رشتہ پسِ پشت ڈال دیا ہے اور بوا کے رشتے کو معتبر کر دیا ہے۔ وہ ایک جملہ بھی بولا کرتے تھے: ’’وو میاں! مُنڈھ کُوں چھوڑ تے پاندکوں پکڑی پے او۔ مُنڈھ تاں اساں نال اے‘‘ ان کی اس شکایت میں بھی محبت ہی تھی۔

بی بی رئیسہ مُلیر دُرّن کی بیٹی ہونے کی وجہ سے مجھے ہمیشہ عزیز رہی ہے۔ پھر وہ میاں پِیرن دِتہ کے بیٹے وڈے میاں کی دلہن بن گئی تو مجھے اور عزیز ہوگئی۔ بی بی اشفاق بچپن میں بہت ہی پیاری بچی تھی۔ پتہ نہیں اسے کس کی نظر کھا گئی۔ ۱۹۹۱ء میں مبارکہ نے اور میں نے اب تک کا کوٹ شہباز کا آخری سفر کیا۔ بی بی اشفاق کو دیکھا تو دل پر گھونسہ سا لگا۔ بی بی رئیسہ اور بی بی حُر باب بھی اس کی حالت پر دُکھ کا اظہار کر رہی تھیں۔ سارے کوٹ شہباز میں سب سے خوبصورت بچی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

کوٹ شہباز میں وٹہ سٹہ (بدلے کی شادی) کا رواج تھا' وہ بھی برابر کی قریشی برادری میں۔ جس لڑکی کا وٹہ لینے کے لئے لڑکا نہیں ہوا' اُسے زندگی بھر شادی کے بغیر رہنا ہے۔ میاں نواز شاہ کی بہن (نام یاد نہیں رہا) اور ادی بالن اسی رسم کا شکار ہوئیں۔ ان کے بجھے ہوئے چہرے یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ قریشِ مکّہ جو نام نہاد غیرت کے نام پر بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے' شاید اس لحاظ سے بہتر تھے کہ ایک ہی بار مار ڈالتے تھے جبکہ زندگی بھر کنواری بٹھا دی جانے والی بیٹیاں تو ہر پَل میں ایک نئی موت کا شکار ہوتی چلی جاتی ہیں۔

کوٹ شہباز میں تو صرف وٹے سٹے کا رواج تھا جبکہ باقی سرائیکی علاقے میں وٹے سٹے کا متبادل ٹکا کہلاتا ہے۔ یعنی اگر رشتہ کے بدلے میں رشتہ نہیں ہے تو ایک معقول رقم ادا کر کے لڑکی کا رشتہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وٹہ سٹہ میں ایسے بھی ہوا کہ باپ نے اپنی بیٹی بیاہی اور اس کے بدلہ میں دولہا والوں کی بہن سے اپنی دوسری شادی رچالی۔ ایسا مفاہمانہ رویّہ بھی دیکھنے میں آیا کہ لڑکی بیاہتے وقت فریق ثانی کے پاس وٹہ نہیں تھا تو اس نے اپنے ہاں ہونے والی پہلی بیٹی وٹہ میں لکھ دی۔ اسے ''پیٹ لکھوالینا'' کہا جاتا ہے۔ ٹکے والی شادی میں صرف رقم بھی چلتی ہے اور رقم کے ساتھ دوسری چیزیں بھی۔۔۔۔۔ مثلاً ایک بکری' دو مُرغیاں' ایک سیکنڈ ہینڈ سائیکل اور ۵۰۰ روپے دے کر لڑکی کا رشتہ حاصل کیا گیا۔ تاہم قریشیوں میں صرف وٹہ سٹہ ہی کا رواج تھا' وہ بھی صرف قریشیوں کے ساتھ۔ امی جی پنجابی تھیں۔ ان کے خاندان میں وٹہ سٹہ جیسی کوئی قبیح رسم رائج نہیں تھی۔ ابا جی سے ان کی شادی ہوئی۔ پہلی دفعہ سرائیکی ماحول میں آئیں۔ پندرہ برس کی عمر۔۔۔ اتنی خوبصورت لڑکی۔۔۔۔ دلہن کو دیکھنے کے لئے آنے والیاں پوچھتیں:

بہن! وٹہ تو قریشیوں کا تھا نہیں۔۔۔ پھر ٹکا دیا ہوگا؟

کوئی رشتہ دار خاتون جو امی جی کا خیال رکھنے کے لئے موجود ہوتیں' جواب دیتیں: نہیں بہن ٹکا نہیں لیا' اللہ

واسطے دی ہے۔

جب دس بارہ خواتین نے یہی بات کی اور ہر بار یہی وضاحت کی گئی تو امی جی نے رونا شروع کر دیا۔ تب ابا جی نے انہیں سمجھایا کہ علم کی کمی کے باعث ہمارے علاقے میں بہت ساری غیر اخلاقی اور غیر اسلامی رسمیں رائج ہیں۔ آپ ایسی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں کہ ہماری شادی تو درست اسلامی طریق سے ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ ویسے کوٹ شہباز کے قریشیوں میں بھی اب بیٹیوں کے رشتے کی اہمیت واضح ہونے لگی ہے۔ رشتے تو بے شک قریبی رشتہ داروں میں کئے ہیں لیکن اب وٹے سٹے کے بغیر بھی رشتے کرنے لگے ہیں۔ اس معاملے میں میاں نواز شاہ' میاں کریم بخش' میاں ارشاد' میاں فیضن اا اور مُلیر دُرّن کو وہاں کے ابتدائی انقلابی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان چراغوں سے مزید چراغ جلے ہوں گے اور قبیح رسموں کا اندھیرا مسلسل کم ہوتا جا رہا ہوگا۔

ایک زمانہ تھا جب کوٹ شہباز میں اسکول نہیں کھلنے دیا جاتا تھا۔ نوکری کرنے کو اپنی توہین سمجھا جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے ایک اسکول کھولا گیا تو صرف لڑکوں کے لئے۔۔۔۔ لڑکیوں کو پڑھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہی زمانۂ جاہلیت کے قریشِ مکّہ والی باتیں۔۔۔ لیکن آس پاس کے علاقوں میں تو علم کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سو پیروں کے مُرید باغی ہونے لگے۔ ان کی تعداد کم ہونے لگی۔ فارغ بیٹھ کر روٹی کھانے کا امکان ختم ہونے لگا تو علم کے حصول کا احساس بھی ہونے لگا۔ چنانچہ اب بعض لڑکے پڑھ لکھ کر نوکریاں کرنے لگے ہیں۔ بالآخر لڑکیوں کا اسکول بھی کھول دیا گیا ہے۔ بعض قریشیوں نے خود کاشتکاری کی طرف توجہ کی ہے۔ باغات لگائے ہیں۔ بعض نے تجارت کا پیشہ اپنا لیا ہے۔ خدا ان سب کے کاروبار کو ترقی عطا کرے' ان کے اموال میں برکت بھر دے اور انہیں خوش رکھے۔ ہمارے ددھیال کے ان دور کے رشتہ داروں نے ہمیں کبھی دل سے دوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ اتنی محبت دی کہ ہماری جھولیاں چھوٹی پڑ گئیں۔

آپی کی رخصتی سے پہلے ان لوگوں کا خاموشی سے رُوٹھ کر چلے جانا بھی ان کی محبت ہی کا ایک انداز تھا۔ قبیلہ قریش والی محبت کا انداز!

☆☆☆

دو ماھی گلبن احمد آباد۔شمارہ: نومبر دسمبر ۱۹۹۸ء

کزنز

میرے چچازاد اور پھوپھی زاد بھائی بہن نہیں ہیں۔خالہ زاد بھائی بہنوں میں صرف خالہ سعیدہ کی دو بیٹیاں صالحہ اور نعیمہ میرے ایج گروپ میں آتی ہیں۔خالہ حبیبہ کے بیٹے بیٹی عمر کے لحاظ سے مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔سو اُن سے محبت کا تعلق تو ہے لیکن دوستانہ بے تکلفی والی بات نہیں ہے۔میرے تین ماموں زاد صحیح معنوں میں میرے ایج گروپ کے ہیں۔کریم اللہ،مجید اللہ اور مبشّر۔۔۔۔کریم اللہ ،مجید اللہ جڑواں بھائی ہیں اور بڑے ماموں کے بیٹے ہیں۔مبشّر میری بیوی کا بھائی اور ماموں ناصر کا اکلوتا بیٹا ہے۔ماموں کوثر کا بیٹا شکور اگرچہ عمر میں مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا لیکن بے تکلفی میں سب سے آگے تھا۔باقی ماموں زاد اور خالہ زاد یا تو عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں یا بہت چھوٹے۔اسی لئے ان کے معاملے میں احترام یا شفقت کا ایک پردہ حائل ہے۔اپنی ماموں زاد آپی نعیمہ سے بچپن میں میری گہری دوستی تھی۔صالحہ اور نعیمہ دونوں میری کھوئی ہوئی کزنز ہیں۔خالہ سعیدہ ہالینڈ میں مقیم تھیں۔وہاں ان کی اپنے شوہر سے ناچاقی ہوگئی۔معاملہ بڑھا تو دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔خالہ سعیدہ غم وغصہ کی حالت میں دونوں بیٹیوں صالحہ اور نعیمہ کو بھی ان کے والد ڈاکٹر غلام احمد بشیر صاحب کے پاس چھوڑ آئیں۔صالحہ اور نعیمہ کو ان کے والد ڈاکٹر غلام احمد بشیر اور ان کی دوسری (ڈچ) بیوی نے پالا پوسا۔وہ دونوں فوت ہو گئے۔صالحہ اور نعیمہ کا کوئی اتہ پتہ معلوم نہ ہوسکا۔جرمنی آنے کے معاًبعد سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔ابھی تک کوئی واضح سراغ نہیں مل سکا۔دنیا امید پر قائم ہے۔مجھے لگتا ہے کہ ہم بچپن کے بچھڑے ہوئے کزنز ایک بار ضرور آمنے سامنے ہوں گے۔چاہے یہ آمنا سامنا بڑھاپے کی سرحد پر ہی کیوں نہ ہو۔☆1

مجھے یقین ہے کہ جب بھی ہماری ملاقات ہوئی صالحہ کو یاد آجائے گا کہ مکئی کے کھائے ہوئے سِٹّے کو توڑ کر اور اس میں چڑیوں اور کبوتروں کے پروں کو ٹھونس کر وہ کیسی عمدہ شٹل بنایا کرتی اور ہم دونوں ریکٹ کے طور پر اسکول کی تختیوں کو استعمال کرتے ہوئے اس شٹل سے اپنی دیسی بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔نعیمہ کو اور کچھ یاد آئے نہ آئے لیکن یہ تو ضرور یاد آئے گا کہ اسے بچپن میں مٹی کھانے کا شوق تھا جبکہ آپی،میں اور صالحہ

خدائی فوجدار کی طرح اس کی تاک میں رہتے تھے۔ایک بار اس نے بڑی عقلمندی سے کام لیا تھا۔ہمسایوں کی کچی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔پہلے اِدھر اُدھر دیکھتی پھر بڑی مہارت کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کر کے کچی مٹی کی دیوار کو چاٹ لیتی۔اس کی تمام تر مہارت کے باوجود میں نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔اور پھر حسبِ معمول صالحہ،آپی اور میں۔۔۔۔۔۔۔ہم تینوں نعیمہ کو ٹانگوں اور بازوؤں سے اٹھائے ہوئے گھر لئے جارہے تھے جہاں لازماً اسے خالہ سعیدہ سے ڈانٹ پڑنی تھی۔ایک عرصہ کے بعد رشید احمد صدیقی کا پُرلطف مضمون ''میرا بچپن'' پڑھا تو شگفتگی کے تمام تر احساس کے باوجود میں اداس ہوگیا۔مجھے صالحہ اور نعیمہ دونوں خالہ زاد بہنیں بہت یاد آئیں۔

کریم اللہ، مجید اللہ مجھ سے سوا سال بڑے ہیں جبکہ مبشّر مجھ سے ایک سال چھوٹا ہے۔بچپن میں ہی مبشّر کی دوستیاں بڑی عمر کے لوگوں سے زیادہ ہوتی تھیں۔لڑائی بھڑائی میں بھی وہ تیز تھا۔میں جسمانی لڑائی میں ہمیشہ سے پھسڈی ہوں۔کریم اللہ، مجید اللہ تو اس معاملے میں میرے بھی بڑے بھائی ہیں۔جڑواں بھائی ہونے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ وابستہ تھے۔اب تو خیر ان کی شکلیں صاف پہچانی جاتی ہیں لیکن بچپن میں تو انہیں پہچاننے میں اچھے اچھوں کو مغالطہ ہوجاتا تھا۔اباجی نے کئی بار دونوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔کافی غور سے دونوں کے چہرے دیکھنے کے بعد جب اباجی ایک کو کریم اللہ کہتے تو وہ مجید اللہ نکلتا اور جسے مجید اللہ کہتے وہ کریم اللہ نکلتا۔دونوں کو پہچان نہ پانے پر اباجی پھر خود ہی ہنسنے لگ جاتے۔ ایک بار اباجی نے کسی شناخت کی بنیاد پر نہیں بلکہ تکّے سے ٹھیک نام بتادیا کہ تم کریم اللہ ہو تب کریم اللہ نے بڑی مہارت سے کہہ دیا:نہیں پھوپھا جان میں تو مجید اللہ ہوں۔اور اباجی انہیں پہچان نہ پانے پر ہمیشہ کی طرح ہنسنے لگے۔

بچپن میں میرا کسی سے جھگڑا ہوجاتا تو میں عام طور پر مبشّر کو مدد کے لئے بُلا لاتا تھا۔ایک بار پتہ نہیں کس بات پر میرا کریم اللہ اور مجید اللہ سے جھگڑا ہوگیا۔وہ دو بھائی، میں اکیلا۔۔۔اتفاق سے مبشّر نے دور سے ہی یہ منظر دیکھا اور از خود لپکا چلا آیا۔آتے ہی اس نے دخل در معقولات کرتے ہوئے مجید اللہ کو پکڑا اور اس کا سر ریت میں گھسانے لگا، اور مجھے بھی ہدایت کی کہ   صرف مجید اللہ پر ہی سارا زور لگاؤں۔اوپر سے کریم اللہ ہم دونوں کو مار رہا تھا لیکن مبشّر یہی کہے جارہا تھا کہ مجید اللہ پر ہی سارا زور لگاؤں۔۔۔۔۔ہم دونوں کے زور کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجید اللہ نے رونا شروع کردیا۔مجید اللہ کے روتے ہی کریم اللہ نے نہ صرف ہمیں مارنا چھوڑ دیا بلکہ خود بھی رونے لگ گیا۔تب مجھے اندازہ ہوا کہ مبشّر صرف

ایک ہی بھائی پر سارا دباؤ کیوں ڈال رہا تھا۔ جڑواں بچوں کی محبت کا یہ بھی انوکھا رنگ تھا۔

مبشّر کی ''پھوں پھاں'' اور ''ٹے کا'' بہت تھا اسی لئے اس کی دوستی سے مجھے فائدہ ہوجاتا تھا۔ ایک بار پتہ نہیں کس بات پر ہمارا جھگڑا ہوگیا۔ مبشّر نے پٹری کا ایک ننھا منّا سا چاقو مجھ پر تان لیا۔ میں نے وہیں سے دوڑ لگائی اور نانا جی کو جا کر بتایا کہ مبشّر مجھے چاقو مارنے لگا تھا۔ نانا جی نے فوری کاروائی کے لئے ماموں سمیع اللہ کو بھیجا۔ ماموں سمیع نے آ کر مبشّر کو ایک چپت رسید کی تو وہ کہنے لگا کہ میں تو صرف ڈرا رہا تھا۔ اس چاقو کی ''خوفناکی'' کا اندازہ اس سے لگالیں کہ ماموں سمیع نے اسی وقت مبشّر سے لے کر، انگلیوں سے مروڑ تروڑ کر اسے دور پھینک دیا تھا۔

چھوٹے کزنز میں سے خالہ سعیدہ کی دوسری شادی سے ہونے والی پہلی بیٹی زاہدہ، ماموں ناصر کی غزالہ، ماموں سمیع کی نوشی، ماموں صادق کی سمیرہ اور خالہ حبیبہ کا آصف مجھے زیادہ عزیز رہے ہیں۔ زاہدہ میرے چھوٹے بھائی اکبر سے بیاہی گئی اور میری چھوٹی بہن زبیدہ کی شادی کریم اللہ سے ہوئی۔ سمیرہ اور آصف مجھے اس لئے بھی عزیز رہے کہ دونوں نے کبھی شاعری شروع کی تھی۔ ماموں صادق خود ایک عرصہ تک شاعری کرتے رہے تھے۔ اس لئے مجھے لگتا تھا کہ سمیرا ماموں صادق کا شاعری کا ورثہ ضرور سنبھالے گی۔ لیکن وہ تو کمپیوٹر ایکسپرٹ بن گئی۔ شاعری کہیں بیچ میں ہی رہ گئی۔ آصف کی شاعری سے عطاء اللہ خاں نیازی عیسیٰ خیلوی کی گلوکاری کی طرف دھیان جاتا تھا۔ لیکن ابتدا میں ایسا ہونا بھی غنیمت تھا۔ کچھ عرصہ تک آصف کو شاعری کا شوق رہا پھر اس کا بھی پتہ نہیں چلا۔

ماموں ناصر کی سب سے چھوٹی بیٹی بشریٰ ہما کو بیک وقت شاعری اور گلوکاری کا شوق ہے۔ ایک دفعہ اس نے مجھے اور مبارکہ کو لتا جی کے چند گانے سنائے۔ گانے سُن کر میں حیران رہ گیا۔ بشریٰ نے بڑے اچھے انداز میں لتا جی کے گانے سنائے تھے لیکن میری حیرت کا پس منظر کچھ اور تھا۔ دراصل ممانی آصفہ نے گھر کا ماحول بے حد مذہبی بنایا ہوا تھا۔ ٹیلی ویژن صرف ان اوقات میں آن کیا جاتا تھا جب اس پر تلاوت، اذان، کوئی دینی پروگرام یا پھر خبرنامہ آرہا ہو۔ ایسے ماحول میں بشریٰ نے اتنے گانے کیسے یاد کرلئے اور اپنی آواز میں اتنی پختگی کیسے پیدا کرلی؟ میں نے اپنی حیرت کو چھپائے بغیر سیدھا سوال کردیا تو بشریٰ نے شرماتے ہوئے بتایا۔۔۔ بھائی جان! وہ اصل میں ناں۔۔ ۔وہ جب ٹی وی پر اذان لگتی تھی تو میں اذان کے ساتھ اپنی آواز اٹھاتی تھی اس طرح آواز پر گرفت ہوتی گئی۔ پھر جب باجی غزالہ جرمنی چلی گئیں تو وہ اپنا چھوٹا ٹیپ ریکارڈر مجھے دے گئیں۔ اس میں مہندر کپور کے گانوں کی

ایک کیسٹ تھی۔ اس کیسٹ میں وہ گانا بھی تھا ''نہ منہ چھپا کے جیئو اور نہ سر جھکا کے جیئو''۔ جب امی گھر پر نہیں ہوتی تھیں تو میں اسی گانے پر آواز اُٹھانے کی پریکٹس کرتی تھی۔ یوں اب گانے کا شوق پورا کرلیتی ہوں لیکن امی سے چوری چھپے۔ آپ بھی امی کو نہیں بتایئے گا۔ ان کے سامنے تو میں صرف دینی نظمیں سُر کے ساتھ پڑھتی ہوں۔

ماموں صادق کا بیٹا اویس میرے بڑے بچوں کے ایج گروپ کا ہے۔ گزشتہ تین برس سے امریکی آرمی کی طرف سے اس کی جرمنی میں تعیناتی ہوئی تو اس سے بھی تھوڑی سی دوستی ہوگئی۔ اس کے بچپن اور اپنے ''عالمِ شباب'' کا ایک لطیفہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں خانپور سے کراچی گیا۔ قیام ماموں صادق کے ہاں تھا۔ اویس پانچ، چھ سال کا تھا۔ مجھے کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا: بھائی! آپ ہیں تو آدمی، پر لگتے نہیں ہیں۔ میں اس کے جملے کی سادگی کا مزہ لے رہا تھا کہ ماموں صادق کہنے لگے: یار! تم شادی شدہ ہونے کے باوجود لڑکے ہی لگتے ہو۔ اویس کی دانشمندی دیکھو کہ اس نے لڑکے میں چھپے ہوئے مرد کو کیسے پہچان لیا ہے۔ ماموں صادق کی وضاحت کے باوجود مجھے اویس کے جملے کی سادگی مزہ دیتی رہی۔ اب جرمنی میں اویس آیا تو میں نے اسے اس کی بات یاد دلائی۔

غالبؔ کو یہ گلہ رہا کہ ''آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا''۔ لیکن اب تو وہ زمانہ آ گیا ہے کہ آدمی کو آدمی ہونا بھی میسّر نہیں ہے، آدمی یا تو روبوٹ بن گیا ہے یا جانور۔۔۔۔۔اویس کے آنے کے بعد ایک بار میں شیو کر کے فارغ ہوا اور آئینے میں خود کو دیکھنے لگا تو مجھے اپنے ہی اندر سے آواز آئی: لگتے تم آدمی ہو، پر ہو نہیں۔

پتہ نہیں یہ میری اپنی آواز تھی
آدم کی روح کی آواز تھی
یا پھر روحِ کائنات کی!

دو ماہی گلبن احمد آباد۔شمارہ: مئی، جون ۱۹۹۹ء

☆یادوں کا یہ حصہ دوماہی ''گلبن'' احمد آباد کے شمارہ مئی، جون ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی مہینے میرا نعیمہ سے رابطہ ہوا۔ پھر مبارکہ، مانو اور میں ہم تینوں ہالینڈ گئے۔ نعیمہ نے واضح کردیا کہ صالحہ اپنے کسی رشتہ

دار سے ملنا نہیں چاہتی۔نعیمہ،اس کے ڈچ شوہر اور دو پیارے سے بچوں نے ہمارا اچھا سواگت کیا۔ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خالہ سعیدہ کی دونوں بیٹیاں (ماں کی کمی کے علاوہ) ہر طرح سے خوش وخرّم ہیں۔نعیمہ کی بیٹی نے تھوڑا سا دکھ کا اظہار کیا کہ میری ماں اپنی ماں کے سائے میں پلتی تو اچھا تھا۔تب میں نے اسے کہا شکر کرو ایسا نہیں ہوا، ورنہ تم دنیا میں ہی نہ آتیں اور نعیمہ، صالحہ سرگودھا کے چک ۶۴ میں اُپلے تھاپ رہی ہوتیں۔میں نے یہ بات تو آسانی سے بتادی لیکن اُپلوں کے بارے میں سمجھانے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ بعد میں نعیمہ نے بتایا کہ صالحہ نے مجھے اَلٹی میٹم دے دیا ہے کہ یا تو نئے دریافت ہونے والوں سے رشتہ داری رکھو،یا مجھ سے۔چنانچہ پھر یہ تعلق ٹوٹ گیا۔تاہم اس ملاقات سے جب یہ واضح ہوا کہ نعیمہ کی پاکستان سے روانگی کے وقت میری عمر صرف تین سال تھی تو مجھے اپنی یادداشت پر شدید حیرت ہوئی۔ایک بار پہلے بھی میں نے ماموں ناصر کو اپنے بچپن کے زمانے کی ایک بات کے بارے میں تھوڑا سا بتایا تھا۔وہ بات ایسی تھی کہ کوئی بزرگ اپنے بچوں سے ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔لیکن بات دلچسپ تھی۔ماموں ناصر میری بات سُن کر جیسے سنّاٹے میں آ گئے۔پھر مسکرا کر کہنے لگے تمہارا دماغ شیطان کا دماغ ہے۔تب تم صرف ساڑھے تین سال کے تھے۔میرا خیال ہے اس کا تعلق حافظے سے زیادہ یاد سے وابستگی سے ہے۔کہیں کوئی بات حافظے سے چِپک جاتی ہے اور بس۔

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔شمارہ: مئی، جون ۱۹۹۹ء

پڑھنے سے پڑھانے تک

عام طور پر ہر انسان کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔میری پہلی درسگاہ بھی میری ماں کی گود تھی۔اور دوسرا اسکول ابا جی کی خصوصی توجہ تھی۔جب ابا جی کی رحیم یار خان میں کپڑے کی دوکان تھی مجھے دوکان پر بلوالیا کرتے تھے اور اردو لکھنا پڑھنا سکھایا کرتے تھے۔جب کوئی فاش قسم کی غلطی ہوتی، مجھے ایک تھپڑ پڑتا۔میں رونے لگتا تو ابا جی پھر پیار کرنے لگتے۔پیسے دیتے۔۔پیسے ملنے پر میں بھاگ کر جاتا اور بازار کی قریبی دوکان سے کھانے کی کوئی چیز لے آتا۔جب تک وہ چیز کھاتا رہتا، میری چھٹی رہتی۔چیز ختم ہوجاتی تو پھر پڑھائی شروع ہوجاتی۔یوں دن میں لگ بھگ چار پانچ دفعہ سبق بھولتا، تھپڑ کھاتا، پیار پاتا اور پھر چنے، مرونڈا، میٹھی گولیاں، مکھانے وغیرہ کھاتا۔سبق بھولنے میں تھوڑا سا نقصان تھا مگر بہت سارا فائدہ بھی تھا۔اب سوچتا ہوں تو ابا جی کے تھپڑوں والا ''نقصان'' ہی مجھے سب سے بڑا فائدہ اور اپنا اثاثہ لگتا ہے۔

ابا جی کی اس توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اسکول میں داخل ہونے سے پہلے اخبار پڑھنے لگ گیا تھا۔جب مجھے اسکول میں داخلے کے لئے لے جایا گیا تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر راجہ محبوب صاحب نے میرا ٹیسٹ لیا اور مجھے کچی، پکّی کلاسوں کی بجائے سیدھا دوسری جماعت میں داخل کرلیا گیا۔پرائمری لیول پر میری پڑھائی کے سلسلے کی یہی ایک اہم بات تھی۔میں پڑھائی میں نہ اوّل درجہ کا طالب علم تھا، نہ نکمّا تھا۔بس اوسط درجے سے تھوڑا سا بہتر طالب علم تھا۔مڈل اسکول کے زمانے تک ہم لوگ خانپور آ چکے تھے۔کالونی مڈل اسکول خانپور ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔بروقت اسکول پہنچنے کی دُھن میں کئی بار ایسا ہوا کہ میں اسکول میں پہنچنے والا سب سے پہلا بچہ ہوتا۔

ریاضی اور سائنس کے مضامین میں تو میں ہمیشہ سے نکمّا رہا ہوں۔عربی، فارسی اور ڈرائنگ کے اختیاری مضامین میں مجھے عربی زیادہ مناسب لگی، چنانچہ میں نے یہ مضمون چھٹی جماعت سے ہی لے لیا۔لیکن ہمارے عربی ٹیچر علاّمہ عبدالخالق اشرؔف صاحب اتنے متشدد نکلے کہ میں عربی سے ہی ڈرنے لگا۔چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک مجھے ضَرَبَ ضَرَبَ کی گردان یاد نہیں ہوسکی اور میں تین سال

تک علاّمہ صاحب کی ضربِ شدید کا نشانہ بنا رہا۔ ہائی اسکول میں جا کر جیسے ہی پتہ چلا کہ یہاں عربی کا مضمون چھوڑ سکتا ہوں، میں نے فوراً خدا کا شکر ادا کیا۔ بعد میں دیکھا کہ یہاں کے عربی ٹیچر مولوی خدا بخش صاحب بہت ہی نرم دل اور شفیق انسان تھے۔ مڈل اسکول میں ماسٹر فریدی صاحب مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ آئیڈیل ٹیچر تو نہیں لیکن کسی حد تک ایسے ہی تھے۔ دو اور ٹیچرز کے نام یاد نہیں رہے البتہ ان کے چہرے اور میرے تئیں ان کے رویے مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ میں ساتویں جماعت میں تھا۔ ایک ٹیچر جنرل سائنس اور ریاضی پڑھاتے تھے۔ مجھے انتہائی نکمے لڑکوں میں شمار کرتے۔ ایک بار کسی اور مضمون کے ٹیچر کی غیر موجودگی کے باعث انہیں ہماری کلاس لینی پڑی۔ یہاں انہوں نے جو پہلا سوال پوچھا میں نے فوراً اس کا جواب بتا دیا تو ہلکا سا مسکرائے اور بولے: کمال ہے تمہیں بھی اس کا جواب آتا ہے۔ لیکن پھر کبھی وہ حیران اور کبھی پریشان ہونے لگے جب میں ہر سوال کے جواب میں ہاتھ کھڑا کرنے لگا۔ وہ بھی ہر بار مجھ سے ہی کہہ دیتے کہ بتاؤ کیا جواب ہے، اور ہر بار میرا جواب درست ہوتا۔ دوسرے ٹیچر غالباً اسکول کے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر بھی تھے۔ پھر ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ بعد میں تحصیل دار ہو کر محکمہ تعلیم سے چلے گئے۔ یہ مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ بے حد نفیس اور شفیق۔ مجھے کلاس کے اچھے بچوں میں شمار کرتے تھے۔ ایک دن انہیں جنرل سائنس کی کلاس لینی پڑی تو انہیں اس مضمون میں میری نالائقی کا اندازہ ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہم لوگ بے حد بھیانک غربت کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن آ رہے تھے اور میرے پَیروں میں ہوائی چپّل تھی۔ تب خالہ حبیبہ نے اپنے پرانے ''کوٹ شوز'' مجھے دیدیئے۔ خالہ حبیبہ کے پاؤں ہمیشہ سے چھوٹے ہیں۔ اسی لئے مجھے وہ ''کوٹ شوز'' پورے آ گئے اور میری سردیاں آرام سے گزر گئیں۔ اسکول کے بعض لڑکوں نے میرا مذاق بھی اڑایا لیکن اس مذاق کی تکلیف سردیوں میں ہوائی چپل پہننے کی تکلیف سے کم تھی۔ اس لئے اسے برداشت کر لیا۔ برداشت نہ بھی کرتا تو کیا کر لیتا۔ گھریلو حالات کو دیکھتے ہوئے میری یہ عادت بن گئی کہ نئے تعلیمی سال پر اپنی پچھلی کلاس کی کتابیں سیکنڈ ہینڈ قیمت پر بیچ دیتا اور نئی کلاس کی کتابیں کسی اپنے جیسے لڑکے سے آدھی قیمت پر خرید لیتا۔ اسکول کی کاپیوں کے سلسلے میں میرا یہ طریقِ کار رہا کہ کاغذوں کے دستے خرید کر ہاتھ سے ان کی کاپیاں بنا لیتا۔ والدین نے کبھی ایسا کرنے کو نہیں کہا، لیکن میں نے ممکنہ حد تک کوشش کی کہ والدین پر کم سے کم بوجھ ڈالوں۔

میں اسکول کی بزمِ ادب میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا ہوں۔ ایک بار خانپور تحصیل کے مڈل اسکولوں

میں، شاید آٹھویں جماعت تک کے تمام طلبہ کے لئے تقریری مقابلہ ہوا۔ میں اس مقابلے میں اوّل آیا۔ انعام میں ایک ٹیبل لیمپ اور علامہ اقبال کی ''بانگِ درا'' دو چیزیں ملیں۔ ٹیبل لیمپ ہمارے ایک ٹیچر ہاشمی صاحب نے رکھ لیا (ہاشمی صاحب بعد میں ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی بنے) میرے لئے ''بانگِ درا'' ہی کافی تھی اس تقریری مقابلے میں تقریر کا عنوان تھا ''کھیل کے میدان میں کردار کی تشکیل''۔ تب میری ساتویں جماعت کا سال ختم ہونے کے قریب تھا۔ میری تقریر مجھے ابا جی نے لکھ کر دی تھی اور تیاری بھی انہوں نے کرائی تھی۔ اپنی کلاس میں بیت بازی کے مقابلوں میں میری اہمیت ہمیشہ بنی رہی۔

آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول خانپور میں داخلہ مل گیا۔ اس اسکول میں داخل ہونا میرے لئے اس وجہ سے زیادہ خوشی کا باعث تھا کہ کبھی ابا جی بھی اسی اسکول میں پڑھ چکے تھے۔ نویں جماعت میں ہمارے کلاس ٹیچر محمد خان صاحب تھے۔ ڈیرہ غازی خاں کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے پہلے دن کلاس کے ہر طالب علم سے اس کے تعارف کے ساتھ اس کے رجحان کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ بڑے ہو کر کیا بننے کا ارادہ ہے؟ تو میں نے بے اختیارانہ طور پر کہا کہ اردو کی خدمت کروں گا۔ تب محمد خان صاحب نے کہا: بابائے اردو کا جانشین بننے کا ارادہ ہے۔ حالانکہ اس وقت ادبی دنیا میں آنے کی بات میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ محمد خان صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جو تبصرہ کیا تھا، مجھے لگتا ہے اندر ہی اندر لاشعوری طور پر اس نے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ صرف پانچ چھ ماہ کے بعد ہی محمد خان صاحب کا تبادلہ ہو گیا تو محمد صدیق صاحب ہمارے کلاس ٹیچر بنے۔ صدیق صاحب ہائی اسکول میں میرے سب سے زیادہ پسندیدہ ٹیچر تھے۔ اسکول کے زمانہ کے ایک عرصہ بعد جب میں ادبی رسالوں میں چھپنے لگا تھا، ایک بار ریڈیو بھاولپور سے ایک ادبی پروگرام کر کے واپس آ رہا تھا، یہ وہ عمر تھی جب ریڈیو پر اپنی کوئی غزل یا افسانہ پڑھنے کو میں اپنی معراج سمجھتا تھا۔ ٹرین میں صدیق صاحب مل گئے۔ میں انہیں اپنی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں جوش و خروش سے بتانے لگا۔ میرا خیال تھا وہ میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ لیکن وہ مجھے یہ بتانے لگے کہ ان کے شاگردوں میں فلاں فلاں ڈاکٹر بن گئے۔ فلاں فلاں انجینئر بن گئے۔۔۔۔ مقابلے کا امتحان پاس کر گئے۔ اپنے ایسے شاگردوں کی تفصیل بتاتے ہوئے ان کا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا اور میں اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہا تھا۔

ہائی اسکول میں مولوی خدا بخش صاحب (اگر میں نام بھول نہیں رہا تو یہی نام تھا) اصلاً عربی اور

اسلامیات کے ٹیچر تھے۔ تھوڑے عرصہ کے لئے انہوں نے ہماری اردو کلاسز لی تھیں۔ اردو پڑھاتے ہوئے، خصوصاً اشعار کی تشریح کرتے ہوئے مزے مزے کی باتیں کر جاتے۔ ہماری اردو کی نصابی کتاب میں مولانا چراغ حسن حسرتؔ کا مشہور مزاحیہ مضمون ''لکڑی کی ٹانگ'' بھی شامل تھا۔ یہ مضمون ان کے مضامین کے مجموعہ'' کیلے کا چھلکا'' سے لیا گیا تھا۔ مضمون کی ریڈنگ کے بعد اس پر بات شروع ہوئی تو میں نے کہا: یہ 'لکڑی کی ٹانگ'۔۔۔ 'کیلے کے چھلکے' سے حاصل کی گئی ہے۔ مولوی صاحب میرا جملہ سُن کر محظوظ ہوئے۔ مجھے دو تین بار ایسے شاباش دی جیسے داد دے رہے ہوں۔

۱۹۶۸ء میں دسویں کا امتحان پاس کرتے ہی میں نے حبؔی سنز شوگر ملز جیٹھہ بُھٹہ' خانپور میں مزدوری کر لی۔ تب ایک صاحب نے پیش کش کی کہ حیدر کالج میں پڑھنا چاہے تو اس کے جملہ تعلیمی اخراجات کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ لیکن میرا مسئلہ کالج کی تعلیم سے زیادہ اباجی کے بوجھ کو بانٹنا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر خدمت کر ہی نہیں سکا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اباجی کے سر پر ایک من کا وزن تھا اور میں نے اس میں سے ایک چھٹانک وزن کم کر دیا۔ میں نے شوگر مل میں ۱۹/سال تک مزدوری کی۔ نوکری کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر اپنا سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ خدا کے فضل اور امی' ابو کی دعاؤں سے ۱۹۷۰ء میں ایف اے' ۱۹۷۲ء میں بی اے اور ۱۹۷۴ء میں ایم اے (اردو) کر لیا۔ (سال ۱۹۷۴ء کا ایم اے کا امتحان ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوا تھا۔ تاہم میرے امتحان کا سیشن ۱۹۷۴ء شمار ہوتا ہے)۔

شوگر مل میں طویل عرصہ تک مزدوری کرنے کے بعد مجھے پاکستان انٹرنیشنل پبلک اسکول اینڈ کالج ایبٹ آباد میں اردو پڑھانے کی جاب ملی۔ یہاں پر سرکاری لیکچرر کے گریڈ کے ساتھ مزید بہت ساری مراعات تھیں۔ فری رہائش' فری بجلی' پانی' تین وقت کا پکا پکایا کھانا جو تینوں وقت گھر پر پہنچایا جاتا تھا۔ میں نے مبارکہ سے کہا کبھی بنی اسرائیل پر من وسلویٰ اترتا تھا۔ خدا نے ہم جیسوں پر بھی فضل فرما دیا ہے۔ ہمیں بھی من وسلویٰ عطا ہو رہا ہے۔ بنی اسرائیل کو تو وہی مخصوص ڈشیں مل رہی تھیں جن کی یکسانیت سے تنگ آ کر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لہسن' پیاز اور مسور کی دال کی فرمائش کرنے لگے تھے۔ جبکہ ہمیں تو ہر بار نئی ڈشیں نصیب ہوتی تھیں۔ اُن نعمتوں پر آج بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور اُس تعلیمی ادارہ کے مالک اور پرنسپل بریگیڈیئر اعجاز اکبر صاحب کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ انہیں خوش رکھے۔

مجھے نویں' دسویں' کیمرج اور ایف ایس سی کی کلاسوں کو اردو پڑھانا ہوتی تھی۔ پڑھانے کا تجربہ

ہوا تو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میں تو خود ازسرِ نَو پڑھائی کر رہا ہوں۔ بچوں کو پڑھانے سے پہلے خود پوری تیاری کرنا۔۔۔۔۔ مجھے لگا کہ میں استاد سے زیادہ ایک اچھا طالب علم بن رہا ہوں۔ طالب علموں کے ساتھ میرا رویہ مدرّسانہ سے زیادہ دوستانہ تھا۔ اس کا مجھے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہوا کہ طلبہ مجھ سے مانوس ہو گئے اور اپنے بعض مسائل کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ مانگنے لگے۔ اور تو اور ایک سینئر طالب علم نے اپنے ایک عشق کے سارے کوائف مجھے بتا کر مشورہ مانگا۔ لڑکے کی سنجیدگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے اسے مناسب مشورہ دے دیا۔ نقصان یہ ہوا کہ بعض اساتذہ مجھ سے حسد کرنے لگے۔ ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ بعض طلبہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہونے لگے۔ باہر تک تو خیر تھی' کلاس روم میں بھی ان کی بے تکلفی بڑھنے لگی۔ جملے بنانے کی مشق کے دوران بے تکلف طلبہ کچھ زیادہ ہی کھلنے لگے۔ بعض جملے جان بُوجھ کر غلط بناتے' جو غلط ہو کر بھی بامعنی ہوتے تھے اور ان سے جملہ بنانے والے کی ذہانت عیاں ہوتی تھی۔ اس وقت مجھے جو جملے یاد آ رہے ہیں' درج کر رہا ہوں۔

پیٹھ پیچھے برائی کرنا : کسی کے پیٹھ پیچھے برائی کرنے سے گناہ ہوتا ہے اور ایڈز کی بیماری بھی ہو جاتی ہے۔

کارگذاری: بارش کی وجہ سے بہت کیچڑ ہو گیا تھا اور میں نے بڑی مشکل سے پُل پر سے کار گذاری۔

مت ماری جانا: ڈاکو نے اپنی بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا تم مفت میں میرے ساتھ مت ماری جانا۔

پو پھٹنا: جنگل میں شیر کو دیکھتے ہی میری پو پھٹ گئی۔

سٹاف روم میں ہم دوست اساتذہ ایسے جملوں پر دل کھول کر ہنستے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر سائنس کے کسی استاد نے 'داشتہ آید بکار' کا مطلب پوچھا تو ایک ذہین استاد طیّب صاحب نے کہا پوری مثل یوں ہے ''اہلیہ آید بہ تانگہ' داشتہ آید بہ کار'' اور مطلب بالکل واضح ہے۔

میری تعلیم سرکاری اسکولوں کے جس ماحول میں ہوئی تھی پاکستان انٹرنیشنل پبلک اسکول اینڈ کالج کا ماحول اس سے بالکل مختلف تھا۔ اعلیٰ تعلیمی معیار کی حامل اس درسگاہ میں لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کے بچے زیادہ تھے۔ میں ٹاٹ اسکول سے اپنی پڑھائی شروع کرنے والا، انگلش میڈیم ماحول میں پڑھا رہا تھا۔

وہ بھی زندگی کا ایک تجربہ تھا اور یہ بھی زندگی کا ایک تجربہ تھا۔

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔ شمارہ: مئی، جون ۱۹۹۹ء

بندۂ مزدور کی اوقات

۱۹۶۸ء میں جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا' میری عمر ۱۶ سال ہو چکی تھی جبکہ سرکاری کاغذات کے مطابق میں ابھی ۱۵ برس کا ہوا تھا۔ رزلٹ آنے کے بعد میں نے گھر والوں کو بتایا کہ میں اب ملازمت کرنا چاہتا ہوں اور ملازمت کے ساتھ اپنی پڑھائی کا سلسلہ بھی پرائیویٹ طور پر جاری رکھوں گا۔ تب ابا جی نے حمئ سنز شوگر ملز کے جنرل مینجر عزیز حسین کی بیگم سے بات کی' انہوں نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ ملازمت کرنے کی بات سن کر کہنے لگیں: ہائے ۔۔۔ ہائے وہ تو ابھی بالکل ہی بچہ ہے۔۔۔۔ بہر حال ان کی سفارش پر مجھے شوگر مل میں لیبارٹری سیمپلر کی مزدوری مل گئی۔ یہ شاید مشقت کے لحاظ سے کافی آسان مزدوری تھی۔ اس مزدوری کو پانے کے لئے مجھے اُس وقت سول ہسپتال خانپور کے ڈاکٹر محمد اکبر ملک سے اپنی عمر کا ایک سرٹیفکیٹ لینا پڑا' جس میں انہوں نے لکھا کہ یہ لڑکا اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کے حصول کے لئے مجھے مبلغ ۲۰ روپے ''فیس'' کے طور پر ادا کرنے پڑے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے میری نبض دیکھ کر ہی سرٹیفکیٹ جاری کر دیا تھا۔ لیب سیمپلر کی حیثیت سے میری تنخواہ ۸۷ روپے ماہانہ تھی۔ ڈھائی مہینے کے بعد مجھے لیبارٹری بوائے بنا دیا گیا اور تنخواہ ۱۰۴ روپے ماہانہ ہو گئی۔ تین سال کے بعد لیبارٹری انالسٹ کی ترقی ملی تو میری تنخواہ ۱۵۰ روپے سے ۲۰۰ روپے ماہانہ کے لگ بھگ ہو گئی' اسی دوران میں ۱۹۷۴ء کے سیشن تک اپنے ایف اے' بی اے اور ایم اے کے امتحان پاس کر گیا۔

جب مبارکہ اور بچے جرمنی آنے والے تھے چھوٹے بیٹے ٹیپو کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ شعیب نے اس سے پوچھا کہ آپ جرمنی کیسے جائیں گے؟ تو ٹیپو نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔ ''یا ہوائی جہاز سے جائیں گے یا تانگے سے جائیں گے''۔ ٹیپو کی یہ بات اس لئے یہاں یاد آ گئی کہ اس سے ملتا جلتا اپنے مَن کا بھولپن یاد آ گیا ہے۔ دسویں کا رزلٹ آنے سے پہلے میں من ہی من میں ارادہ بنایا کرتا

تھا کہ نوکری کے ساتھ پڑھائی کروں گا۔ یا تو گریجوایشن کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں گا اور ایک دن ڈپٹی کمشنر بنوں گا' یا پھر وٹرنری ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ ڈپٹی کمشنر بننے کی آرزو تو پھر بھی ممکنات میں سے تھی لیکن وٹرنری ڈاکٹر بننا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ دسویں میں میرے مضامین آرٹس گروپ کے تھے۔ اس میں جنرل سائنس کا مضمون بھی میں نے مر مر کر پاس کیا تھا۔ وٹرنری ڈاکٹر بننے کے لئے تو ایف ایس سی کرنا پہلی سیڑھی تھی جو میرے لئے بذریعہ تانگہ جرمنی جانے سے زیادہ مشکل تھی۔ بہر حال شوگر مل کی نوکری کے پہلے دن جب مجھے لیبارٹری کی کھڑکیوں کے شیشوں اور فرش کی صفائی کرنا پڑی تو میرے اندر کے ڈپٹی کمشنر اور وٹرنری ڈاکٹر دونوں کی موت واقع ہو گئی۔ صفائی کرتے ہوئے' اپنے دوسرے ساتھیوں سے منہ چھپا کر میں ان دونوں کی موت پر باقاعدہ آنسوؤں سے روتا رہا۔

اس ملز کی شفٹوں کی ڈیوٹی کے اوقات کار یوں تھے: صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک کی شفٹ' شام چھ بجے سے نصف شب دو بجے تک کی شفٹ اور رات دو بجے سے صبح دس بجے تک کی شفٹ۔ ہر ہفتے کے بعد شفٹ تبدیل ہو جاتی۔ ملازمت بھی سیزنل تھی۔ گنے کا سیزن ختم ہو جاتا تو ہمیں فارغ کر دیا جاتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان فارغ مہینوں میں مجھے اپنی پڑھائی پر زیادہ دھیان دینے کا موقعہ مل جاتا۔ ۱۹۷۱ء میں میری شادی ہو گئی۔ شادی کی خبر سُن کر ہمارے چیف کیمسٹ نے کہا: تم تو کہتے تھے کہ نوکری کے ساتھ پڑھائی جاری رکھوں گا' اب شادی کے بعد کیسے پڑھ سکو گے؟ میں نے کہا جی اگلے سال مجھے بی اے کا امتحان تو دینا ہی دینا ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں جب میں نے بی اے کا امتحان دے دیا اور اسے پاس بھی کر لیا تو اُس وقت کے چیف کیمسٹ کوثر صاحب حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ اسی کیفیت میں انہوں نے مجھے اسی وقت ایک سو روپے کا انعام دیا۔ میں نے رقم لینے میں ہچکچاہٹ کی تو کہنے لگے یہ انعام ''سٹوڈنٹ حیدر'' کے لئے ہے۔ یہ انعامی رقم اس لحاظ سے مفید رہی کہ مجھے ایم اے کے کورس کی کتابیں خریدنے میں آسانی ہو گئی۔ ایم اے کرنے کے بعد مجھے بطور لیبارٹری انالسٹ مستقل کر دیا گیا۔ اب میری ملازمت سیزنل نہیں رہی تھی۔

عملی زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کے بعد میرے اندر ناانصافی کے خلاف بغاوت کے خیالات پرورش پانے لگے تھے لیکن مجھے ایک خاص اخلاقیات اور چند اصولوں کا پاس بھی تھا۔ ملز انتظامیہ مجھے نظر انداز کر رہی تھی۔ ایک حد تک ان کی مجبوری جائز لگتی کہ میں نے تو ایم اے اردو کیا ہے اور میری ملازمت کی لائن لیبارٹری کی ہے۔ ایم اے اردو اور لیبارٹری کا کوئی جوڑ ہی نہیں۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد

جب اُس وقت کی ملز انتظامیہ کے بیس بائیس سال کی عمروں کے چار پانچ نوجوان بھانجے بھتیجے اور بیٹے آفیسرز کیڈر میں آئے اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ سارے کے سارے میٹرک اور انڈر میٹرک نوجوان ہیں تو مجھے ملز انتظامیہ کے خلاف اپنی ساری برہمی جائز لگنے لگی۔ اگر وہ لوگ چاہتے تو مجھے لیبارٹری سے مین آفس میں ٹرانسفر کرکے اس طرح کی ملازمت دے سکتے تھے۔ لیکن یہ تو بہت بعد کے زمانے کی بات ہے۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ میرے اندر بغاوت کے افکار بھی پرورش پانے لگے تھے اور مجھے ایک خاص اخلاقیات کا پاس بھی تھا۔ اسی دوران ملز میں مزدور یونین قائم ہوئی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد دیکھا کہ جو لوگ یونین بنانے والے تھے ان میں سے بیشتر کو پیچھے دھکیل دیا گیا ہے اور بعض نئے چہرے سامنے آ گئے ہیں۔ جب یونین کے صدر رانا محمد حسین اور جنرل سیکریٹری نذیر احمد بنے تو مزدوروں کے لئے خاصی مراعات حاصل کی گئیں۔ یہ لوگ کسی سیاسی لیڈر یا مذہبی پیر کی طرح مزدوروں میں مقبول ہو گئے۔

ہماری لیبارٹری کے عملہ میں عام مزدوروں کے مقابلہ میں تھوڑے بہت پڑھے لکھے لوگ تھے۔ بعض دوستوں نے کہا کہ جب جمہوری طریق کار ہے تو ہم بھی یونین کے الیکشن میں حصہ لیں گے۔ اس سلسلہ میں ہمارے دو لیبارٹری کیمسٹ عبدالمجید اور مہدی حسن پیش پیش تھے۔ مہدی حسن نے انڈیا سے بی ایس سی کیا تھا۔ خوبصورت اور نازک سے نوجوان تھے۔ حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد یہ لوگ پاکستان آئے تھے اور تھوڑی سی مشکلات کے بعد قانونی تحفظ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ عبدالمجید اور مہدی حسن دونوں نے مزدور یونین کے الیکشن میں بحیثیت صدر اور جنرل سیکریٹری کھڑے ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو رانا محمد حسین اور نذیر احمد دونوں بھڑک اُٹھے۔ انہوں نے ملز کے گیٹ پر ایک پبلک میٹنگ کی جس میں ان دونوں پر ملز انتظامیہ سے ساز باز کرنے کا الزام لگایا۔ مجید صاحب کو پکڑ کر لے گئے۔ پبلک میٹنگ میں ان پر الزامات عائد کرتے ہوئے ان سے جواب طلبی کی گئی۔ انہوں نے جمہوری طریقِ کار کی بات کرنا چاہی لیکن ہُوٹنگ کرا کے انہیں بولنے نہیں دیا گیا۔ مزید زیادتی یہ کی گئی کہ ان کے منہ پر سرِ عام تھوڑی سی سیاہی مَل دی گئی۔ یہ سانحہ میرے لئے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ میں خود مزدور تھا، مزدوروں کے حقوق کے لئے آئینی اور قانونی طریقے سے لڑنے کے لئے بھی تیار تھا لیکن ایسے غیر جمہوری عمل اور کھلم کھلا غنڈہ گردی کے باعث میں اس مزدور یونین کے ایسے لیڈروں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

یہ سب کچھ دراصل عوامی وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے دی گئی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ تھا۔ رانا محمد حسین، پیپلز پارٹی کے مقامی رہنماؤں میں شامل تھے۔ گویا حکومتی سرپرستی کے ساتھ انہیں اپنی پارٹی کا تحفظ بھی حاصل تھا۔ ان ساری طاقتوں کو مزدور کے مفاد میں استعمال کرنا چاہئے تھا لیکن رانا محمد حسین اور نذیر احمد نے اپنے مخالفین کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ چنانچہ مذکورہ واقعہ کے بعد جب بھی الیکشن ہوتے یہ دونوں عہدیدار ہمیشہ بلا مقابلہ صدر اور جنرل سیکریٹری کے عہدوں پر کامیاب ہوتے۔ رانا محمد حسین اور نذیر احمد دونوں بحیثیت ملازم اب اپنی ڈیوٹی نہیں کرتے تھے۔ بعض اکھڑ قسم کے مزدوروں کو انہوں نے اپنے محافظینِ خاص بنا لیا۔ ان محافظین کی یہ ڈیوٹی تھی کہ جہاں بھی کوئی مذکورہ دونوں لیڈروں کے خلاف بات کرے اس کی وہیں سرکوبی کر دی جائے۔ دہشت گردی کا یہ رویہ آگے چل کر پوری مزدور تحریک کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔

جب جنرل ضیاع الحق نے جمہوریت کا خون کر کے ملک میں مارشل لا نافذ کیا تو مزدوروں کے معاملہ میں حکومت کا رویہ بالکل برعکس ہو گیا۔ بھٹو کے دور میں جتنی بے جا رعائت دی گئی تھی اب اس سے بھی زیادہ بے جا سختی کی جانے لگی تھی۔ ہمارے لیب کیمسٹ عبدالمجید جو مزدوروں کے تشدد کا نشانہ بن چکے تھے، اب لیب انچارج کے عہدہ پر فائز تھے۔ اب وہ ہمارے نئے چیف کیمسٹ نذیر صاحب کے ستم کا نشانہ بنے۔ انہوں نے بھری لیبارٹری میں سرِ عام مجید صاحب کی بے عزتی کی۔ یہاں تک کہ مجید صاحب آنسوؤں سے روتے ہوئے لیبارٹری سے باہر نکل گئے۔ مجھے جب اس زیادتی کا علم ہوا میں نے لیبارٹری کے سارے عملہ کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ ایک ساتھی بشیر باجوہ نے مجھے صاف لفظوں میں کہا کہ مجید کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو۔ وہ اسی لائق ہے۔ اسے بچاؤ گے تو وہ بچانے والوں کو ڈبو دے گا۔ چیف کیمسٹ نذیر صاحب سے میرے ذاتی مراسم خوشگوار تھے لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ مجید صاحب کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرا کے رہنا ہے۔ ہم نے مہم شروع کی تو مزدور یونین بھی ہماری مدد کو آ گئی۔ جنرل ضیا کا دور آنے کے بعد شاید یونین کو ہم جیسے لوگوں کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ ہم نے چیف کیمسٹ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجید صاحب نے نہ صرف چیف صاحب سے صلح کر لی بلکہ جارحانہ انداز میں مجھ پر حکم بھی چلانے لگے۔ چند دنوں کے بعد انہیں لیب انچارج سے ترقی دے کر شفٹ کیمسٹ بنا دیا گیا۔ لیکن میں تو انتظامیہ کے عمومی رویے کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میرے لئے اب بیٹھ جانا مناسب نہ تھا۔ ملز انتظامیہ اور مزدوروں کے

درمیان تناؤ بڑھتا جارہا تھا۔اسی دوران ایک دن جنرل منیجر سعید صاحب نے مجھے لیبارٹری سے باہر ''پین اسٹیشن'' پر بلوایا۔ وہاں انتظامیہ کے بیشتر افسران تشریف فرما تھے۔ میں وہاں پہنچا تو کسی رسمی علیک سلیک کے بغیر جنرل منیجر سعید صاحب نے مجھ پر چڑھائی شروع کردی۔انہوں نے انتہائی غلیظ گالیاں بکتے ہوئے مزدوروں میں پائی جانے والی ساری گڑبڑ کا ذمہ دار مجھے قرار دیا۔ یہ وار اتنا اچانک ہوا تھا کہ میں ہکا بکا رہ گیا۔اس زیادتی نے مجھے رانا محمد حسین اور نذیر احمد سے مزید قریب کردیا۔

یہ ۱۹۷۹ء کا زمانہ تھا۔تب جنرل ضیاء الحق نے کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان میں مزدوروں پر اندھا دھند فائرنگ کرا کے اور سینکڑوں مزدوروں کا قتلِ عام کرا کر اصلاً پورے ملک کے مزدوروں کو وارننگ دے دی تھی۔اس کے باوجود مجھے گالیاں دیئے جانے والے سانحہ کے بعد دس'بارہ دن کے اندر ملز کے مزدوروں نے بعض افسران کی زوردار اور سرِ عام پٹائی کردی۔جن اہم افسران کی پٹائی ہوئی ان میں کین منیجر'چیف انجینئر اور چیف کیمسٹ بطور خاص شامل تھے۔ گنے سے چینی تیار کی جاتی ہے اور گنّوں سے ہی ان مزدور دشمن افسران کی مرمت ہوئی کین منیجر کا پیشاب ہی خطا نہیں ہوا' پتلون بھی گندی ہوگئی۔ چیف کیمسٹ کو مزدوروں نے گیٹ پر روکا اور پکڑ کر جیپ سے اتارا۔انہوں نے منت کی کہ مجھے مت مارنا۔ مزدوروں نے کہا آپ ناچ کر دکھاؤ تو نہیں ماریں گے۔ چنانچہ چیف صاحب نے تھوڑا سا بھدہ ڈانس کیا۔اس کے باوجود مزدوروں نے تو انہیں مارنا ہی تھا' سو بھدے ڈانس سے ناراض ہوکر انہیں بھی مارا پیٹا گیا۔جنرل منیجر اس مار سے بچ نکلے جس کا مجھے افسوس ہوا۔ یہ سب کچھ میری اخلاقیات کے خلاف تھا لیکن میرے ساتھ ہونے والی ملز انتظامیہ کی غنڈہ گردی سے لے کر کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے سینکڑوں بے گناہ مزدوروں کے قتلِ عام تک مزدوروں کے ساتھ ملز انتظامیہ کے عمومی رویے کو سامنے رکھیں تو یہ سب کچھ جائز تھا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔تنگ آمد بجنگ آمد۔

اس واقعہ کے وقت ہم لوگ ملز ایریا سے دُور اپنے اپنے گھروں میں تھے۔اس کے باوجود مقدمات درج ہوئے۔مقامی تھانے میں پندرہ مزدوروں کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی گئی۔''این آئی آر سی''جو مزدوروں کے معاملات کی سب سے بڑی عدالت ہے اور جس کے فیصلے کے خلاف صرف سپریم کورٹ میں جا سکتے ہیں' وہاں پندرہ کی بجائے صرف سات مزدوروں کے خلاف مقدمہ درج کرایا گیا۔ یہاں رانا محمد حسین اور نذیر احمد کے ساتھ میرا نام بھی شامل تھا۔اسی دوران ملز انتظامیہ نے شہر کی سرکاری انتظامیہ کی مدد سے ایک پاکٹ یونین تیار کرلی جو ہماری یونین کے مقابلے میں سرکاری طور پر تسلیم

کرالی گئی۔اس یونین کے خاص عہدیداروں میں الطاف احمد اور اظہر ادیب طبعاً اچھے انسان تھے۔اظہر ادیب تو شاعر بھی ہیں۔بعد میں جب ہماری دوستی ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ بعض ادبی رسائل میں تھوڑا بہت چھپے تھے لیکن پھر ادبی دنیا سے ان کا رابطہ نہ رہا۔میرے ساتھ دوستی ہوئی تو نہ صرف شاعری میں متحرک ہوئے بلکہ ادبی رسائل میں بھی چَھپنے لگے۔میں نے خانپور سے ''جدید ادب'' جاری کر رکھا تھا۔اظہر ادیب سے بھاولپور سے ''اسلوب'' جاری کرایا۔اس کے صرف تین شمارے چَھپ سکے۔۔۔۔۔لیکن فی الوقت بات ہو رہی تھی شوگر مل کی مزدور یونینوں کی۔۔۔

ہمارے مقابلے میں قائم کی گئی پاکٹ یونین نے کچھ رانا محمد حسین کی یونین کی پرانی زیادتیوں کی تشہیر کر کے' کچھ مزدوروں کو مراعات دلا کے اور کچھ ڈرا دھمکا کے اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش شروع کی لیکن ان کی بے حد محنت کے باوجود انہیں کامیاب ہونے میں خاصا وقت لگ گیا۔ملز انتظامیہ نے ایک طرف رانا محمد حسین' نذیر احمد اور ان کے ساتھیوں کے خلاف مقدمات دائر کر رکھے تھے دوسری طرف دونوں لیڈروں کا ملز کے اندر داخلہ ممنوع کر رکھا تھا۔ یوں انہیں مزدوروں سے بالکل الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔تیسری طرف پاکٹ یونین کی کاروائیاں جاری تھیں۔''این آئی آر سی'' والا مقدمہ خاصا پریشان کن تھا۔مختلف اطراف سے ایسے دباؤ بنانے کے بعد ملز انتظامیہ نے رانا محمد حسین سے اپنی شرائط پر ''مفاہمت'' کی بات چیت شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا جب نذیر احمد جنرل سیکریٹری بھی تھک ہار کر گھر میں بیٹھ گئے تھے۔رانا محمد حسین ملز انتظامیہ سے مذاکرات کرنے کے لئے بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ان کے سارے وفادار' جاں نثار اور مرتے دَم تک ساتھ نبھانے کے دعویدار ساتھی غائب ہو گئے تھے۔ایسے وقت میں صرف حیدر قریشی تھا' جس کے پاس وہ آتے' مجھے ساتھ لیتے اور ملز انتظامیہ سے معاملہ طے کرنے جاتے۔کبھی اسی یونین نے محض اصولی اختلاف کرنے اور غیر مشروط فرماں برداری سے انکار کرنے کے جرم میں مجھے مزدور دشمن' انتظامیہ کا ایجنٹ' غدار اور پتہ نہیں کیسے کیسے اعزازات سے نوازا تھا اور آج یہی یونین اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی تو میں ہی تھا جو اس کی زندگی کی دعا مانگ رہا تھا اور ممکنہ حد تک دوا کے لئے بھی تگ و دو کر رہا تھا۔اسی دوران مجھے اباجی کے ذریعے' انور صاحب ڈسٹلری انچارج کے ذریعے اور چوہدری فضل صاحب گوڈاؤن انچارج کے ذریعے خوشنما آفرز دیئے گئے۔ایک بار تو خود چیف کیمسٹ نذیر صاحب نے بھی براہِ راست مجھے پیش کش کی لیکن میں اصولوں کی پاسداری کی دُھن میں ہر پیش کش پر انکار کرتا گیا۔

ویسے اب سوچتا ہوں کہ جب رانا محمد حسین سے لے کر مجید صاحب لیب انچارج تک ہر کسی نے اپنے مفادات کو مقدم رکھا تو مجھے بھی اپنا نہیں تو اپنے خاندان کے آرام و آسائش کا کچھ خیال رکھ لینا چاہیئے تھا۔اس کے باوجود مجھے معلوم ہے کہ آئندہ بھی کبھی زندگی کے کسی شعبے میں ایسی صورتحال سامنے آئی تو میں پھر اُن لوگوں کے مشکل وقت میں اُن کا ساتھ نبھا رہا ہوں گا جو اپنے اچھے وقت میں مجھے خوار کرتے رہے ہوں گے۔

رانا محمد حسین نے آخر گھٹنے ٹیک دیئے۔صدر،جنرل سیکریٹری اور مار پیٹ کرنے والے نمایاں مزدوروں سمیت ۱۵۔افراد نے ''از خود'' استعفےٰ دے دیئے۔اس کے بدلے میں انہیں تھوڑی سی اضافی رقم دے دی گئی اور سارے مقدمات واپس لے لئے گئے۔جس دن مذکورہ مزدوروں نے استعفےٰ دیئے،میرے چیف نذیر صاحب نے اپنے گھر سے لیبارٹری میں فون کر کے خصوصی طور پر میری ''خیریت'' دریافت کی۔اس کے بعد ان کی طرف سے میرے خلاف انتقامی کاروائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔صرف ذہنی اذیت دینے والا۔۔۔۔۔تذلیل کرنے والا سلسلہ۔۔۔۔لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ملز انتظامیہ کے افسران ایک پکنک پارٹی پر گئے۔وہیں نذیر صاحب چیف کیمسٹ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔جنرل منیجر سعید صاحب ایک سرکاری مقدمے کی زد میں آگئے۔یہ چینی کی اسمگلنگ کا کوئی بڑا اسکینڈل تھا جس میں حبیٰ سنز شوگر ملز کے ڈائریکٹر آصف صاحب کو بھی ملوث کر دیا گیا تھا۔حبیٰ سنز گروپ چونکہ اُس زمانے میں بھٹو مرحوم کے ساتھیوں میں شمار ہوتا تھا اس لیے ممکن ہے جنرل ضیاء الحق نے سیاسی انتقام کی خاطر حبیٰ سنز گروپ کو نشانہ بنایا ہو۔وجہ کچھ بھی رہی ہو،جنرل منیجر سعید صاحب کی گرفتاری کے ساتھ ہی میرے خلاف انتظامیہ کا جارحانہ محاذ ختم ہو گیا۔

نئی انتظامیہ کے چیف کیمسٹ شیر باز خاں نیازی بڑے ذہین آدمی نکلے۔پہلی دفعہ لیبارٹری میں آئے تو میں اپنے بگڑے مزاج کے مطابق کرسی پر بیٹھا رہا۔انہوں نے اسے نوٹ کیا،پھر اپنے طور پر میرے بارے میں معلومات حاصل کیں۔میرا ریکارڈ دیکھا،اپنے طور پر کسی نتیجے پر پہنچے۔۔اور پھر یوں ہوا کہ وہ لیبارٹری میں آئے۔باقی سارا عملہ انہیں ''سر!سلام'' کہہ رہا تھا اور میں حسبِ معمول اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔نیازی صاحب سیدھے میرے پاس آئے۔میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے''حیدر صاحب!السلام علیکم''۔یہ بڑا ہی اچانک وار تھا۔بالکل غیر متوقع۔میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ہاتھ ملایا،وعلیکم السلام کہا۔انہوں نے میری خیریت پوچھی اور چلے گئے۔اگلے دن جیسے ہی

وہ لیبارٹری میں داخل ہوئے،میں اُٹھ کر ڈارک روم کی طرف کھسکنے لگا تاکہ سامنا ہی نہ ہو۔لیکن نیازی صاحب نے مجھے آدھے راستے ہی سے آواز دے دی۔''حیدر صاحب!السلام علیکم''۔اس بار مجھے لگا ان کا ہاتھ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے نہیں بڑھا،میرے دل کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے آگے بڑھا ہے۔میں شرمندہ ہو کر پلٹا،سلام کا جواب دیا،ہاتھ ملایا اور پھر میں خود یہ کوشش کرنے لگا کہ نیازی صاحب سے پہلے انہیں سلام کہوں لیکن انہوں نے بہت کم اس کا موقعہ دیا۔میرا خیال ہے انہوں نے میرے اندر کے باغی کو بڑی حد تک سمجھ لیا تھا اور اسے مزید بھڑکانے کی بجائے محبت آمیز انداز سے میرے باغیانہ جذبے کی تہذیب کرنے لگے تھے۔

پاکٹ یونین کے صدر الطاف کو ذاتی طور پر میں نے ہمیشہ بہت اچھا انسان پایا تھا۔رانا محمد حسین کے عروج کے زمانہ میں ان کے بے جا جبر و تشدد کے نتیجہ میں یہ اُن کے مخالف ہوئے تھے۔پھر جب ملز انتظامیہ سے انہیں مدد ملی تو انہوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا تاکہ رانا محمد حسین اور ان کے متشدد گروپ کو ٹھکانے لگایا جا سکے۔مجھے انہوں نے ایک دو بار سمجھانے کی کوشش کی۔میں نے انہیں صاف کہہ دیا کہ رانا صاحب کے سابقہ کردار کا میں بھی مخالف ہوں لیکن اِس وقت یہ لوگ مظلوم ہیں اس لیے میں ان کا ساتھ دوں گا۔چنانچہ میں نے آخر تک ان کا ساتھ نبھایا۔الطاف صاحب کا خیال یہ تھا کہ رانا گروپ مزاجاً متشدد ہو چکا ہے اس لیے دوبارہ طاقت میں آکر یہ لوگ پھر پہلے والی زیادتیاں کریں گے۔مزید یہ کہ بدلے ہوئے سیاسی منظر نامے کے باعث مزدور کے اجتماعی مفاد کے تحفظ کے لئے اب یہی راستہ غنیمت ہے۔جنرل ضیا کے فوجی دور کے حوالے سے الطاف صاحب کی باتیں کچھ اتنی غلط نہ تھیں۔تاہم میں نے رانا گروپ کی یونین ختم ہونے تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔جب یونین ختم ہو گئی تو الطاف گروپ پوری طرح چھا گیا۔انہیں مزدوروں کی تائید ملی تو انہوں نے مزدوروں کے حقوق اور مفادات کے لئے جدو جہد شروع کر دی۔ملز انتظامیہ کا خیال تھا کہ انہیں ہم نے مقبول لیڈر بنایا ہے اس لیے انہیں صرف ہمارے ہی اشاروں پر چلنا چاہیے۔الطاف گروپ کا موقف یہ تھا کہ ایک مجبوری اور مصلحت کے تحت ہم نے ملز انتظامیہ کی مدد سے فائدہ اُٹھایا ہے وگرنہ ہم بنیادی طور پر مزدور ہیں اور مزدور مفادات کا تحفظ ہی ہماری اوّلین ترجیح ہے۔چنانچہ جلد ہی ملز انتظامیہ اور الطاف گروپ کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔

نئے چیف کیمسٹ نیازی صاحب میرے معاملے میں خاصے مہربان تھے۔ان کی جدو جہد کے نتیجہ میں مجھے شفٹ کیمسٹ کے عہدہ کی ترقی مل گئی لیکن یہ ترقی دوسرے شفٹ کیمسٹوں کے لئے دُکھ کا

سب بن گئی۔ان کے لئے میٹرک پاس مجید صاحب تو بطور شفٹ کیمسٹ قابلِ قبول تھے لیکن ایم اے اردو حیدر قریشی قابلِ قبول نہیں تھا۔۔۔۔ایم ایس سی اور کیمیکل انجینئر شفٹ کیمسٹوں میں خود میں بھی اپنے آپ کو ’’مِس فٹ‘‘ محسوس کرتا تھا لیکن پھر میٹرک پاس مجید صاحب؟۔۔۔۔۔۔اس تناؤ میں مجھے اصل ڈیوٹی دینے کی بجائے گنّا تولنے کی چیکنگ کی سپیشل ڈیوٹی دے دی گئی۔مجھے یہ سب کچھ خاصا توہین آمیز لگ رہا تھا۔اسی دوران ملز انتظامیہ کے بعض افسران کے بھانجے' بھتیجے' بیٹے قسم کے رشتوں والے چند نوجوان میرے ساتھ آ گئے۔یہ سب مڈل اور میٹرک پاس لڑکے تھے اور ان کی تنخواہیں مجھ سے ڈیڑھ گُنا' دوگُنا تک زیادہ تھیں۔میں جو اُنیس سال سے یہاں مشقت کر رہا تھا' اس صورتحال سے بے حد دل برداشتہ ہوا۔کبھی کبھی خیال آتا کہ کہیں نیازی صاحب نے خلوص اور محبت کا جال بچھا کر مجھے پھنسانے کی چال تو نہیں چلی تھی؟آفیسر کیڈر میں لانے کے باوجود نہ تو مجھے میری اصل ڈیوٹی دی گئی اور نہ ہی تنخواہ میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ کیا گیا۔بس اتنا ہوا کہ اب میں براہِ راست لیبر یونین سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔لیکن نیازی صاحب کے لئے میں خود اتنا مخلص ہو چکا تھا کہ ان کی کسی زیادتی کو بھی خاموشی سے برداشت کر سکتا تھا۔سو ایسا ہی کیا۔آج بھی میں پوری ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ نیازی صاحب کے تئیں میری خاموشی' کسی بے بسی کی زائیدہ نہیں تھی۔میں بظاہر بے بس ہونے کے باوجود ابھی بالکل ہی بے بس نہیں ہوا تھا۔میں حقیقتاً ان کے لئے مخلص تھا۔

اسی دوران الطاف گروپ نے کسی مسئلے پر نیازی صاحب کے خلاف ہنگامہ کیا اور انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ایک دو اور مسئلوں پر بھی نیازی صاحب کے لئے پریشانی پیدا ہوئی' یہاں تک کہ انہیں دل کا عارضہ ہو گیا۔ان کے خلاف ان سارے ہنگاموں میں وہ سارے افسران بھی کہیں نہ کہیں موجود تھے جنہوں نے میرے شفٹ کیمسٹ بنائے جانے پر احتجاج کیا تھا۔خود مجید صاحب بھی پس پردہ پیش پیش تھے۔۔۔۔۔۔اب میں ایک اعتراف کر لینا چاہتا ہوں کہ اگر میں ان سارے ہنگاموں میں نیازی صاحب کو بچا لے جانا چاہتا تو الطاف اور اظہر ادیب مجھ سے دور نہیں تھے۔ان سے بات کر کے باعزت سمجھوتہ کرا سکتا تھا۔لیکن میں خاموش تماشائی ہی بنا رہا۔نیازی صاحب نے ایک بار بھی مجھ سے بات کی ہوتی تو شاید سارا منظر تبدیل ہو جاتا۔اب سوچتا ہوں ممکن ہے وہ خود میری ترقی کے بعد میرے ساتھ ہونے والے سلوک پر دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کرتے ہوں اور اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہوں اور اسی شرمندگی کی وجہ سے مجھ سے بات نہ کی ہو۔بہر حال نیازی صاحب نے پھر یہ ملازمت چھوڑ دی اور

ان کے بعد میں نے بھی جلد ہی شوگر مل کی نوکری چھوڑ دی۔

محبتوں میں تم سے جو نباہ بھی نہ کر سکا
تمہارے بعد پھر کسی کی چاہ بھی نہ کر سکا

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔شمارہ: جولائی،اگست ۱۹۹۹ء

گراموفون سے سی ڈی تک

رحیم یار خاں میں قیام کے زمانے میں، ہمارے بچپن میں جب ہمارے گھر میں بجلی آئی تو بجلی سے چلنے والا ریڈیو بھی آ گیا۔تا ہم گھر میں ریڈیو آنے سے پہلے ہم بابا جی کے ہاں خانپور میں گراموفون مشین سے متعارف ہو چکے تھے۔آپی اور میں، ہم دونوں گانا سننے کی بجائے گانا گانے والوں کو ڈھونڈا کرتے تھے۔کبھی مشین کے بکس کو کھٹکھٹاتے تھے،کبھی اس کے ساتھ منسلک بھونپو کے اندر جھانک کر گانے والوں کو تلاش کرتے تھے۔ریڈیو کے معاملے میں بھی ہم اسی طرح حیران ہوئے اور پھر اس کے عادی ہو گئے۔ایک بار بابا جی اپنی ایک گراموفون مشین رحیم یار خاں لے آئے، وہاں انہوں نے پتہ نہیں کس تکنیک سے مشین کا کنکشن ریڈیو سے جوڑ دیا۔ایک کمرے میں مشین رکھ دی گئی دوسرے میں ریڈیو، مشین پر کوئی گراموفون ریکارڈ چلایا جاتا تو ریڈیو سے وہی گانا سنائی دیتا۔بچپن کی حیرت انگیز باتوں میں یہ ہمارے لئے ایک اور حیرت انگیز بات تھی---ایک بار بابا جی گراموفون مشین کے پاس بیٹھے تھے،انہوں نے اپنے سامنے بہت سارے گراموفون ریکارڈز پھیلا رکھے تھے۔شاید اپنی پسند کے بعض ریکارڈز الگ کر رہے تھے۔اسی دوران پتہ نہیں کسی کام سے وہ تھوڑی دیر کے لئے اٹھے تو میں اُنہیں کے انداز میں انہیں کی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا اور کچھ سمجھے بوجھے بغیر ان ریکارڈز کو بابا جی کی طرح غور سے دیکھنے لگا۔ پھر گھٹنوں کے بل ایک طرف بڑھا تو چار پانچ ریکارڈز میرے گھٹنوں کے نیچے آ کر ٹوٹ گئے۔اسی دوران بابا جی آ گئے۔اس نقصان سے تھوڑا سے پریشان تو دِکھے لیکن مجھے ڈانٹا نہیں---ایک عرصہ بعد بابا جی میری اسی غلطی کو یوں مزے سے بتایا کرتے جیسے میں نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا تھا۔زندگی بھر تو مجھ سے ڈھنگ کا کوئی کام نہیں ہو سکا تاہم اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے بچپن میں ہی چار پانچ ریکارڈز توڑ دیئے تھے۔یہ غالباً 1957-58 کا زمانہ تھا۔

اب یہاں جرمنی میں ایک بار میری بڑی بیٹی ہمارے ہاں آئی ہوئی تھی، میرا نواسہ رومی کھیل رہا تھا ،سامنے ٹی وی بھی چل رہا تھا۔اچانک ٹی وی پر ایک نیم برہنہ سا اشتہار آ گیا۔ڈھائی سال کے رومی کی

نظر ادھر پڑی تو کھیلنا چھوڑ کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔میں نے فوراً ریموٹ کے ٹیکسٹ کا بٹن دبا دیا۔ رومی کو لگا کہ میں نے ٹی وی کے ساتھ کچھ کر دیا ہے۔اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تو میں بالکل انجان بن گیا۔تب وہ دوڑ کر ٹی وی کے قریب گیا اور جھک کر یوں سکرین کے نیچے سے دیکھنے لگا جیسے ٹیکسٹ کی عبارت کے نیچے سے وہ نیم برہنہ خواتین تھوڑی سی دکھائی دے جائیں گی۔میں اس کی اس حرکت پر بے اختیار مسکرا دیا۔تب ہی مجھے احساس ہوا کہ بچپن کی معصومیت کا انداز بے شک وقت بدلنے کے ساتھ بدل جاتا ہے لیکن بچپن کی معصومیت بہر حال معصومیت ہی رہتی ہے۔

خانپور منتقل ہونے تک ہمارے گھر کے اقتصادی حالات کافی بگڑ چکے تھے۔بابا جی کا گراموفون مشینوں کا شوق بھی ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ایک دو مشینیں کباڑ کی طرح گھر کے کسی کونے میں پڑی ہوئی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ایک مشین ٹھیک ہو جائے اور میں اس پر ریکارڈ لگا کر سن سکوں۔بابا جی سے بات کی تو پتہ چلا ایک مشین ٹھیک ہے۔اسے جھاڑ پونچھ کر چلانا چاہا تو پتہ چلا بعض پرزوں کو تیل کی ضرورت ہے۔ تیل گھر میں ہی موجود تھا،سو یہ مسئلہ بابا جی کی مدد سے حل ہو گیا لیکن پھر ایک بڑا مسئلہ سامنے آ گیا۔ریکارڈ چلانے کے لئے مخصوص سوئیوں کی ضرورت تھی۔سوئیاں بازار سے خریدی جا سکتی تھیں لیکن پیسے کہاں سے آئیں؟ یہ گہرا مسئلہ تھا۔۔۔مجھے لڑکپن سے ہی گھر کے حالات کا احساس ہو گیا تھا اس لئے امی جی، ابا جی یا بابا جی سے ایسی فرمائش کرنا ہی زیادتی لگتی تھی۔لیکن ادھر گراموفون مشین پر ریکارڈز سننے کی شدید خواہش تھی۔مشین موجود تھی، ریکارڈز بھی موجود تھے لیکن سارا معاملہ مشین کی سوئی پر اٹک گیا تھا۔یہ خواہش، حسرت میں تبدیل ہونے ہی والی تھی کہ قدرت نے دستگیری فرما دی۔لیکن سوئیوں کے حصول کی داستان اب ذرا بعد میں---پہلے خانپور کا ہی ایک اور واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے گھر کے مغربی اور جنوبی اطراف میں سیال فیملی کے گھر تھے۔یہ فیملی کئی بھائیوں اور کزنز اور پھر آگے ان کی اولادوں کے گھروں پر مشتمل تھی۔ان سب کے گھر دور تک ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ہمارے گھر کے جنوبی (عقبی) جانب منیر سیال کا گھر تھا۔عمر میں یہ مجھ سے سات آٹھ سال بڑے تھے۔ان کے والد فوت ہو گئے تھے۔بیوہ ماں تھی اور منیر سیال تھے۔صبح سویرے منیر سیال دال چھولے کی چھابڑی لگاتے تھے۔جو کچھ کماتے لا کر ماں کے ہاتھ میں رکھ دیتے۔گھر کا خرچہ چل رہا تھا۔ دراصل منیر کے والد یہی کام کیا کرتے تھے۔ان کی وفات کے بعد اپنی ماں کو سہارا دینے کے لئے منیر کو اپنے والد کی چھابڑی سنبھالنی پڑی۔جب ہم لوگ خانپور میں رہنے لگے تو مجھے اور میرے چھوٹے بھائی

اکبر کو ایک ساتھ سکول جاتے آتے دیکھ کر منیر سیال کے دل میں بھی پڑھنے کی دبی ہوئی خواہش نے سر اٹھایا۔ غالباً چوتھی جماعت کے بعد انہوں نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور اس بات کو چار پانچ سال گزر چکے تھے۔ منیر سیال نے اپنی ماں سے کہا کہ میں پھر سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ ماں نے اسے برا بھلا کہا کہ تم پڑھو گے تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ سیال برادری کے بعض دیگر بزرگ خواتین وحضرات کو پتہ چلا تو وہ سارے لوگ جو اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہے تھے، انہوں نے بھی منیر کی پڑھائی کی مخالفت کی اور یہاں تک کہہ دیا اس کا باپ پڑھا تھا جو یہ بدبخت پڑھے گا۔ مگر وہ ''بدبخت'' تو اپنی ضد پر اڑ گیا تھا۔ روزانہ ماں بیٹے میں ہونے والے جھگڑے کی آوازیں ہمارے گھر تک سنائی دیتیں۔ آخر ایک دن امی جی نے منیر کی ماں سے پوچھ لیا کہ آپ کے گھر میں کیا جھگڑا ہوتا رہتا ہے؟۔ منیر کی ماں نے منیر کو برا بھلا کہتے ہوئے اس کے دوبارہ پڑھائی شروع کرنے کے ''مذموم ارادے'' کی بابت بتایا تو امی جی نے انہیں سمجھایا کہ اگر وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ امی جی کے سمجھانے کا منیر کی ماں پر مثبت اثر ہوا اور انہوں نے آخر کار منیر کو پڑھنے کی اجازت دے دی۔

منیر نے ابتدا میں چھابڑی بھی لگائے رکھی اور گھر پر پڑھائی کرنے لگا۔ اس دوران انہوں نے مجھ سے ٹیوشن کی مدد مانگی اور کہا وہ مجھے مناسب ٹیوشن فیس بھی دیں گے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں صرف ایک بار ٹیوشن فیس لونگا، کیونکہ مجھے گرامونون مشین والی سوئیاں خریدنی ہیں اور یہ فیس صرف چار آنے ہوگی۔ منیر نے اسی وقت جیب سے چونی نکال کر فیس ادا کی اور میں انہیں پڑھانے کی بجائے سیدھا بازار کی طرف بھاگا۔ وہاں سے مطلوبہ سوئیاں خریدیں۔ گھر آکر مشین پر گھسے ہوئے ریکارڈز کو لگا لگا کر سنتا رہا۔ گھسے ہوئے ریکارڈز کو اتنی بار سن لیا کہ مزید سننے کی تمنا نہ رہی۔ پھر اسی دن ہی میں نے گرامونون مشین کو اٹھا کر اس کے اصل مقام پر رکھ دیا۔

منیر سیال نے شروع شروع میں مجھ سے تھوڑی سی اردو پڑھی۔ پھر ہمارے اسکول کے ایک دو ٹیچر ان کی مدد کرنے لگے۔ سال ڈیڑھ سال میں انہوں نے آٹھویں جماعت کا بورڈ کا امتحان دیا اور کامیاب ہو گئے۔ پھر تین سال کے بعد پرائیویٹ طور پر ہی دسویں کے امتحان میں شرکت کی اور اس میں بھی کامیاب رہے۔ اس کے بعد انہوں نے سکول ٹیچر کا کورس ptc کر لیا۔ پھر ایف اے بھی کر لیا۔ ایک گاؤں میں ٹیچر لگ گئے، شادی خانہ آبادی بھی ہوگئی۔ منیر سیال کو میری اور اکبر کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوا تھا۔ مجھے دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد ملازمت کے ساتھ ایف اے، بی اے اور ایم اے

کرنے کی توفیق ملی تو اس شوق میں مجھے کچھ شعوری اور کچھ لاشعوری طور پر منیر کے کردار سے تحریک ضرور ملی تھی۔ شاید ایسے ہی چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔

جب ہمارے حالات قدرے بہتر ہونے لگے تو ابا جی ایک سیکنڈ ہینڈ بلکہ تھرڈ یا فورتھ ہینڈ ریڈیو ٹرانزسٹر لے آئے۔ ہر سیٹ کی طرح اس سیٹ پر بھی دائیں بائیں KC--MC-MW-SW کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ میڈیم ویو یا شارٹ ویو پروگراموں کی فریکوئنسی تلاش کرنے کے لئے ان سے راہنمائی ملتی ہے۔ اکبر تب چھٹی جماعت میں تھا۔ نئی نئی اے بی سی سیکھی تھی۔ چنانچہ وہ انہیں بڑی روانی کے ساتھ مئو، سئو، کک، مک پڑھتا تھا۔ ریڈیو کے پیچھے کا کور جب چاہتے کھول لیتے بلکہ اکثر کھلا ہی رکھتے۔ پرزوں کے اصل نام تو خدا جانے کیا ہوں گے۔ دیسی حساب سے بیشتر پرزوں کے نام ہمیں یاد ہو گئے تھے۔ کسی تار کا ٹانکا ٹوٹ جاتا تو ابا جی خود ہی ٹانکا لگا لیتے تھے، ایک بار ریڈیو کے سپیکر سے منسلک تار کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔ ابا جی گھر پر نہیں تھے۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ میں نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے پروگرام ''یک رنگ'' سننا تھا۔ یہ پروگرام مجھے ویسے بھی اچھا لگتا تھا لیکن اس دن یک رنگ کا الوداعی پروگرام تھا۔ یک رنگ۔۔۔۔ یک رنگ کے نام تھا۔ تب میں نے تار کا ننگا حصہ اسپیکر کی متعلقہ جگہ پر انگلی کے ساتھ مسلسل چپکائے رکھا اور یوں وہ سارا پروگرام سنا۔ ٹانکوں کے مسئلے سے ہٹ کر بھی ریڈیو سیٹ کا طرزِ عمل ضدی بچوں جیسا تھا۔ چلتے چلتے کبھی آواز کا از خود بڑھ جانا اور کبھی بالکل خاموش ہو جانا۔ جب ریڈیو کا کوئی بٹن کارگر نہ ہوتا تب ایک دو تھپڑ لگانے سے ریڈیو عموماً ٹھیک ہو جاتا تھا۔ ایک بار جب مختلف پرزوں کو چھیڑنے سے لے کر تھپڑ لگانے تک کوئی نسخہ کارگر نہ ہوا تو ابا جی نے یہ سمجھ کر کہ اب یہ بالکل ہی ختم ہو گیا ہے، پاؤں کا جوتا اٹھا کر غصے سے ریڈیو پر دے مارا۔ یقین کیجئے ریڈیو اسی وقت ٹھیک ہو گیا۔ ہم سارے گھر والوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ ابا جی کو ریڈیو سے صرف خبروں کی حد تک سروکار تھا۔۔۔۔ ابا جی کے اور میرے درمیان پسندیدہ اسٹیشن لگانے کی کشمکش چلتی رہتی تھی۔ ابا جی کو پاکستانی گانے اور خاص طور پر نور جہاں کے گانے بہت پسند تھے۔ قوالیاں بھی بڑے شوق سے سنتے تھے۔ مجھے اس زمانے میں صرف انڈین گانے اچھے لگتے تھے۔ ابا جی نے ریڈیو لاہور یا ملتان لگایا ہوا ہے۔ میں اٹھا اور آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس لگا دی۔ عصر کے بعد کبھی کبھار آکاش وانی بمبئی وِوِدھ بھارتی وگیا پن کاری کرم بھی کیچ ہو جاتا۔ میرے لئے اس پروگرام کی کمرشلز بھی دلچسپ ہوتی تھیں۔

دراصل دلی، لکھنو، کلکتہ اور بمبئی جیسے شہروں کے بارے میں تاریخ اور اردو کی درسی کتابوں میں جتنا

پڑھا تھا اس کی وجہ سے یہ شہر میرے لئے خوابوں کے شہر ہو گئے تھے۔ سو بمبئی ریڈیو سن کر میں جیسے اپنے خواب کی آوازیں سن رہا ہوتا تھا۔ جب مجھے دلی جانے کا موقعہ ملا تب خواب اور حقیقت کا فرق معلوم ہوا۔ میرے خوابوں والے دلی کی ہلکی سی پرچھائیں مجھے غالب کے مزار اور حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار میں نظر آئی۔ جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ کے علاقوں میں بھی ایسی پرچھائیوں کا ہلکا سا احساس ہوا لیکن دلی تو کیا سے کیا ہو چکی۔ دہلی سے Delhi ہو چکی۔ اب اگر کبھی لکھنؤ، کلکتہ اور بمبئی جانے کا موقعہ ملا تو ظاہر ہے مجھے یہ تجربہ تو ہو ہی گیا ہے کہ اپنے خوابوں والے شہر تو اب کہیں بھی نہیں ملیں گے، لیکن خوابوں کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گی۔

محمد رفیع اور لتا منگیشکر تو مشرقی موسیقی کے امر گلوکار ہیں۔ مکیش، مہندر کپور، طلعت محمود، آشا بھونسلے، گیتا دت، ہیمنت کمار، کشور کمار، سمن کلیان پور، مبارک بیگم اور منا ڈے کے بہت سارے گانے مجھے پسند ہیں۔ پاکستانی گلوکاروں میں سلیم رضا، زبیدہ خانم، مہدی حسن، مسعود رانا، احمد رشدی، مالا، نسیم بیگم، مسرت نذیر، اسد امانت وغیرہ کے گیت مجھے اچھے لگتے ہیں۔ ملکہ ترنم نور جہاں نے 1970ء کے عرصہ تک بے حد عمدہ گیت گائے، لیکن مجھے لگتا ہے اس کے بعد ان کی آواز جیسے پھٹ گئی ہو۔ سمن اور مبارک بیگم نے بعض بے حد خوبصورت گانے گائے ہیں لیکن خدا جانے وہ فلم انڈسٹری میں کیوں نہیں ٹک پائیں۔ آشا بھونسلے مجھے کئی جہات سے اچھی لگتی ہیں لیکن حال ہی میں انہوں نے جو اپنے خوبصورت گیتوں کو پاپ میوزک سے آمیز کر کے البم نکالے ہیں ان سے مجھے ذاتی طور پر بے حد شاک لگا ہے۔ یہ تو فلمی گلوکاروں کے بارے میں میری پسند کا ایک خاکہ سا تھا۔ پرائیویٹ گانے والوں میں مجھے سب سے زیادہ لوک گلوکار پسند ہیں۔ صوفیائے کرام کا کلام گانے والے گلوکار، پھر غزلیں گانے والے اور قوالیاں گانے والے بھی۔ حامد بیلا، نصرت فتح علی خاں، پٹھانے خاں، شوکت علی، عالم لوہار، ریشماں، غلام علی، جگجیت، چترا، پنکج ادھاس اور بے شمار دوسرے گلوکار میری پسند ہیں۔ کبھی کبھار سہگل کے اور اُس دور کے گلوکاروں کے گانے سننے میں بھی مزہ آتا ہے۔ اگر میں اپنے پسندیدہ گانوں کی فہرست تیار کرنے بیٹھوں تو شاید ایک چھوٹی سی کتاب تیار ہو جائے۔ یہاں میں دو گیتوں کا خصوصی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا گانا فلم خاموشی کا ہے اور اسے لتا جی نے گایا ہے

ہم نے دیکھی ہے ان کی آنکھوں کی مہکتی خوشبو
ہاتھ سے چھو کے اسے رشتوں کا الزام نہ دو

یہ گانا میں نے پہلی بار جب سنا تو رات کا وقت تھا "تعمیل ارشاد" پروگرام لگا ہوا تھا۔ گرمیوں کا موسم، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ یہ گیت شروع ہوا تو مجھ پر عجیب سا جادو طاری ہو گیا۔ یہ گانا میرے پسندیدہ ترین گانوں میں سے ایک ہے۔ دوسرا گانا بھی لتا جی کا ہے فلم ''انوپما'' سے:

'' کچھ دل نے کہا، کچھ بھی نہیں۔۔۔/ کچھ دل نے سنا، کچھ بھی نہیں۔۔۔/
ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔''

میں ریڈیو کی سوئی گھما رہا تھا کہ یہ گیت سنائی دیا۔ آخری انترا چل رہا تھا۔ ادھر ریڈیو بھی مستی سی کر رہا تھا۔ لیکن تیر تو نشانے پر لگ چکا تھا۔ میں نے مکھڑا ذہن نشین کر لیا تب فلم کا نام معلوم نہیں تھا اور پھر مجھے اس گیت کی تلاش ہی رہی۔ جب حالات بہتر ہوئے، اپنا کیسٹ پلیئر آگیا تب میں نے اس گانے کی تلاش تیز کر دی۔ لیکن جس سے بھی گانے کی بابت پوچھتے وہ دوکاندار ہنس دیتا کہ جی یہ بھی کوئی گانا ہوگا۔ کچھ دل نے کہا، کچھ بھی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ 1993 میں جب میں دلی میں تھا تب زی ٹی وی کی نشریات ختم ہونے کے بعد رات کو گانوں کی ایک ہی آڈیو کیسٹ مسلسل اس چینل سے نشر ہوتی رہتی تھی۔ ان گانوں میں یہ گانا بھی شامل تھا۔ مجھے یہ گانا کیا ملا، کوئی کھویا ہوا خزانہ مل گیا تاہم بات صرف ان گیتوں پر ختم نہیں ہوتی لیکن یہاں یہ باتیں کچھ زیادہ ٹھیک نہیں رہیں گی۔

گراموفون اور ریڈیو کے زمانے میں گویا ایک نقاب سا حائل تھا۔ ٹی وی نے آکر پہلے تو یہ نقاب اتارا، پھر اور بھی بہت کچھ اتار دیا۔ سیٹلائٹ نے کثرت کا ایسا تماشہ دکھایا کہ چینل کا انتخاب کرنا مشکل ہو گیا۔ گراموفون کے زمانے میں فلم بھی تھی لیکن میرے لئے اس کا ہونا ''نہ ہونے'' کے برابر تھا۔ میں نے تیس سال کی عمر تک فلم نہیں دیکھی۔ سینما ہاؤس میں جا کر اب بھی نہیں دیکھی، وی سی آر، ایشیا نیٹ اور زی ٹی وی کے ذریعے اتنی فلمیں دیکھ لی ہیں کہ زندگی کے ابتدائی تیس برسوں کی کسر بھی نکال دی ہے اور آنے والے کئی برسوں کا کوٹہ بھی پورا کر لیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے اتنی فلمیں دیکھ لی ہیں کہ اب فلم دیکھنے کی خواہش ہی نہیں رہی۔ کبھی کوئی بہت اچھی فلم سننے میں آئے تو اسے دیکھ لیتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں وہ گیت جو ریڈیو پر اچانک سننے کو ملتے تھے اور عجیب جادو سا کر دیتے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر آنے کے بعد پوری طرح ہماری دسترس میں آ گئے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب گانا سننے کے لئے ریڈیو کے سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔ جب جی چاہے کیسٹ لگائیں اور پسندیدہ گانا سن لیں لیکن نقصان یہ ہوا کہ کتنے ہی خوبصورت گانے بار بار سن کر وہ سرور گم ہو گیا ہے جو ریڈیو پر وہی گیت اچانک سننے سے ملتا تھا۔

شروع میں گراموفون کے ریکارڈ میں ایک طرف ایک گانا ہوتا تھا دوسری طرف ایک اور گانا ہوتا تھا۔ ہر گانے کے بعد ریکارڈ کو تبدیل کرنا پڑتا تھا، مشین کی چابی بھرنا ہوتی تھی۔ اور اب سی ڈی کا زمانہ آ گیا ہے۔ سی ڈی پلیئر پر بیک وقت تین سی ڈی لگی ہیں۔ لگ بھگ پچاس گانے آپکے ہاتھ میں ہیں۔ مرضی کا گانا سنتے رہیں۔ اٹھ کر سی ڈی پلیئر کے کسی بٹن کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے، ریموٹ سے کنٹرول کیجئے اور اپنی پسند کے گانے سنتے رہئے۔ ٹیپ ریکارڈر کی طرح یہ مجبوری بھی نہیں ہے کہ چھ یا آٹھ گانے ہیں اور ریکارڈ ڈ ترتیب کے مطابق باری باری آتے جائیں گے۔ بس مطلوبہ سی ڈی کا نمبر دبائیں، پسندیدہ گانے کا نمبر دبائیں اور اطمینان سے اپنی پسند کا گانا سن لیں۔ میں کفرانِ نعمت کو بدترین گناہوں میں شمار کرتا ہوں۔ زندگی کے تلخ ترین حالات سے گزرنے کے بعد خدا نے اس قسم کی آسائشیں اور سہولتیں عطا کی ہیں تو ان کے لئے تہہ دل سے خدا کی شکر گذاری کرتا رہتا ہوں۔ گراموفون مشین اور سی ڈی پلیئر میں اتنا فرق ہے جتنا بیسویں صدی کی پہلی ربع صدی اور آخری ربع صدی میں فرق ہے۔ زمانہ وہی ہے، صدی وہی ہے، بس گراموفون مشین اب سی ڈی پلیئر کا روپ اختیار کر گئی ہے۔ اور ہاں۔۔۔۔ میری ذاتی زندگی بھی تو گراموفون سے سی ڈی جیسی ہو گئی ہے۔ **فالحمدللہ علی ذلک** ۔

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔ شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۹ء

اخلاقی قدریں اور ویاگرا

میرے بچپن کے دور میں رحیم یار خاں اور مقامی آبادی میں خواتین کے لئے شٹل کاک برقعہ رائج تھا۔ شہری لوگوں میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی آ رہی تھی۔ سفید کفن نما برقعہ کی جگہ ریشمیں کپڑے کا سیاہ برقعہ پہنا جانے لگا تھا۔ شٹل کاک برقعہ والے حلقے میں لیڈی ہملٹن کے سیاہ برقعے کو "بے حیائی" سمجھا جاتا تھا۔ میرے جوان ہونے تک۔۔۔۔۔ یعنی بیس سال کے اندر اندر ہی نہ صرف شٹل کاک برقعہ تقریباً غائب ہو گیا بلکہ سیاہ برقعہ سے بڑھ کر چادریں اوڑھنے کا رواج شروع ہو گیا۔ اب تو ان شہروں میں صرف دوپٹہ اوڑھے ہوئے بلکہ دوپٹہ گلے میں ڈالے ہوئے بیبیاں بھی عام دکھائی دیتی ہیں۔ لڑکیوں کو پڑھائی کرانے کا معاملہ بھی شروع میں کچھ ایسا ہی تھا۔ خانپور میں ہماری ایک ہمسائی ماسی خانزادی لڑکیوں کو پڑھانے کی سخت مخالف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں تو اپنے یاروں کو محبت نامے لکھتی ہیں۔ بعض دوسری ہمسائیوں کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو پانچ جماعت تک تعلیم ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔ ہمارے گھر والوں کے مطابق بچیوں کو دسویں تک تعلیم دلانے میں کوئی حرج نہیں لیکن کالج کی تعلیم ٹھیک نہیں تھی۔ پھر ہمارے اپنے ہی عزیزوں اور احباب میں تین طرح کے لوگ ملے۔ ایک کے نزدیک لڑکیوں کو کالج تک پڑھانے میں کوئی حرج نہیں لیکن یونیورسٹی نہیں بھیجیں، وہاں ماحول بہت زیادہ کھلا ہوتا ہے۔ دوسروں کے موقف کے مطابق لڑکیوں کو یونیورسٹی تک تعلیم تو دلانا چاہئے لیکن ملازمت نہیں کرانا چاہیئے۔ کیونکہ خواتین کو ملازمت کرانے دیں تو اس سے بہت سارے اخلاقی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جبکہ تیسروں کے نزدیک خواتین کا ملازمت کرنا قابلِ اعتراض نہیں تھا۔ ان کے خیال کے مطابق اخلاقی مسائل اَن پڑھ دیہاتی ماحول میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ تعلیم اور ملازمت سے خواتین میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ برقعہ کی سخت پابندی اور لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت سے شروع ہونے والا "اخلاقی قدروں" کا سفر وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی اپنے آپ کو بدلتا چلا گیا۔ ایسے ماحول میں ہی میں پلا بڑھا اور اس کے مختلف اثرات مجھ پر مرتسم ہوئے۔

اخلاقیات کی ایک قسم تو عالمی اور دائمی نوعیت کی ہے، جو تمام مذاہب میں قدر مشترک ہے، تاہم کبھی کبھی انفرادی نوعیت کی اخلاقیات اپنا جواز خود لے کر آتی ہے۔غالباً1975ء کی بات ہے، بزم فرید خانپور کی مقامی نوعیت کی ادبی تقریبات کا سلسلہ جاری تھا۔تب ہی ریڈیو پاکستان بہاولپور کی ریکارڈنگ ٹیم خانپور آئی۔نصراللہ خاں ناصر پروڈیوسر تھے۔ہم نے گورنمنٹ سکول حلقہ نمبر۲ میں ایک چھوٹے سے مشاعرے کا انتظام کیا۔صدارت کے لئے شیخ فیاض الدین کو مدعو کیا گیا جو خانپور کے تجارتی حلقوں کی معروف شخصیت تھے۔شاعری کے اچھے قاری اور سامع تھے۔مشاعرہ بعد از نماز مغرب ہونا تھا۔سو جیسے ہی مشاعرہ شروع ہونے لگا، شیخ فیاض کے دو ملازم، ایک نوجوان کو اس طرح پکڑے ہوئے اندر لائے کہ صرف قمیص نوجوان کے تن پر تھی اور اس کی دھوتی ایک ملازم کے ہاتھ میں تھی۔ملازموں نے یہ بتایا کہ یہ بدکار قریب کے ویرانے میں ایک گدھی کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کر رہا تھا اور وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لائے ہیں۔نوجوان کے چہرے پر خوف اور شرمندگی کے گہرے اثرات تھے۔شیخ فیاض نے اس نوجوان سے اس کے دو تین نجی کوائف دریافت کئے۔کوئی بے حد مفلوک الحال تھا۔شیخ فیاض نے اپنے ملازمین کو ڈانٹ کر کہا یہ اتنا غریب ہے کہ نہ تو شادی کر سکتا ہے نہ کوٹھے پر جا سکتا ہے۔ایسے حال میں یہ غلطی کر بیٹھا ہے تو تمہیں اس سے کیا نقصان پہنچا ہے، چلو اس کی دھوتی اسے واپس کرو۔۔۔۔۔۔پھر اس نوجوان سے بڑی ملائمت سے کہا جا بچے جا۔۔۔۔یہ واقعہ کوئی بہت بڑا واقعہ نہیں تھا لیکن میں جزا، سزا کے جن تصورات کو بے حد اہمیت دیتا تھا، مجھے پہلی دفعہ ان میں معافی کی گنجائش محسوس ہوئی۔شیخ فیاض کے رویے کا میں کوئی جواز نہیں دینا چاہتا۔شاید دے ہی نہیں سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ تب سے مجھے شیخ فیاض بحیثیت انسان ہمیشہ اچھے لگے۔

اس سے مختلف ایک اور واقعہ چند سال پہلے جرمنی میں ہوا تھا۔ایک معروف مذہبی جماعت کے ایک سابقہ اعلیٰ عہدیدار جو عمر کے لحاظ سے لگ بھگ 60 کے پیٹے میں تھے، ایک 40 سالہ پاکستانی خاتون کے ساتھ ایک آئس شاپ کے بیس منٹ کی ٹائلٹ سے پکڑے گئے۔ہوا یوں کہ دونوں کو محبت بڑھانے کے لئے Langen شہر کی ایک اٹالین آئس کریم شاپ مناسب لگی۔عشق کے اگلے مراحل طے کرنے کے لئے طے شدہ پروگرام کے مطابق پہلے خاتون بیس منٹ میں گئیں، پھر وہ بزرگ بھی بیس منٹ میں اتر گئے۔اتفاق کی بات تھی کاؤنٹر پر موجود اطالوی دوکاندار نے خاتون کو نیچے جاتے نہیں دیکھا تھا لیکن بزرگ کو جاتے دیکھ لیا۔چنانچہ جب بزرگ کی واپسی میں دیر ہونے لگی تو دوکاندار کو یہ خدشہ ہوا کہ بزرگ آدمی تھے

کہیں لیٹرین میں ہی دل کا دورہ نہ پڑ گیا ہو۔چنانچہ اس پریشانی کے ساتھ جب وہ نیچے گئے تو مردانہ لیٹرین کا دروازہ کھٹکٹانے پر مضحکہ خیز نظارا سامنے آیا۔مذکورہ خاتون اپنا لباس درست کرتی ہوئی اور بزرگوار اپنی بیلٹ باندھتے ہوئے باہر نکلے۔یورپ میں باہمی رضامندی سے ہونے والا جنسی عمل کوئی سماجی یا اخلاقی مسئلہ نہیں ہے۔لیکن لیٹرین میں Sex Play یورپ والوں کے لئے مضحکہ خیز حرکت ضرور تھی۔سو یوں یہ قصہ یہاں عام ہوا۔

ان دو مختلف نوعیت کے واقعات کے ساتھ مجھے ایک ہولناک واقعہ یاد آ رہا ہے۔خانپور میں سیال فیملی کے لوگ ہمارے ہمسائے تھے۔عمومی طور پر یہ سب ہی اچھے لوگ تھے۔چھوٹی موٹی ناراضیاں تو قریبی رشتہ داروں میں بھی ہوتی ہیں یہ تو پھر ہمسائے تھے۔سارے لوگ اپنی سماجی اخلاقیات کے پابند تھے۔1982ء میں جب ہم نے اپنا پرانا گھر فروخت کیا اور ماڈل ٹاؤن میں کرائے کے ایک مکان میں منتقل ہونے لگے تو سیال فیملی کے ایک دوست ملنے آئے۔مکان کا سودا کرانے میں انہوں نے بھی تھوڑا سا مثبت کردار ادا کیا تھا۔بظاہر وہ مجھے خدا حافظ کہنے آئے تھے لیکن میں اس وقت سناٹے میں آ گیا جب انہوں نے بڑی لپٹی ہوئی مگر کچھ اس مفہوم میں بات کی کہ میرے ملنے جلنے والے دوست احباب بہت ہیں اس لئے یہ گھر تو بہت چھوٹا تھا۔بات کا طنزیہ انداز ایسا تھا جس کا میرے ذہن میں کہیں شائبہ تک نہ تھا۔شاید وہ مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے لطف اٹھانا چاہتے تھے۔سو بظاہر تو نہیں لیکن اندر ہی اندر مجھے کہیں اذیت سی ضرور محسوس ہوئی۔آخر انہوں ایسا گمان بھی کیوں کیا؟۔۔۔۔۔اور ایک دن یہ اذیت بالکل ختم ہو گئی۔خانپور شہر کی تاریخ کا یہ ہولناک سانحہ یکایک سامنے آیا۔سیال فیملی کے اسی کرم فرما کی دو بیٹیوں اور تین لڑکوں کو پولیس نے دن دہاڑے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا۔ایک مکان میں دونوں بہنیں مذکورہ لڑکوں کے ساتھ فحش فلمیں دیکھتے ہوئے وہی سین دہرا رہی تھیں۔اس سانحہ کے ساتھ مزید المیہ یہ ہوا کہ جائے وقوعہ سے پولیس اسٹیشن تک سارے گرفتار شدگان کو ننگے پاؤں پیدل چلا کر لایا گیا۔سب کے تن پر صرف ان کی لمبی قمیصیں تھیں جبکہ سب کی شلواریں اور جوتے ان کے سروں پر دھرے تھے۔آگے عبرت کی ایک الگ داستان ہے۔یہ واقعہ کچھ زیادہ ہی تکلیف دہ سا بیان ہو گیا ہے، اس لئے ہلکی پھلکی شرارت والی یادوں کو کریدتا ہوں۔

چند سال پہلے بخش لائلپوری لندن سے جرمنی آئے۔میرے ہاں مقیم تھے۔ان سے جو باتیں ہوئیں' ان میں ایک قصہ بے حد مزے کا تھا۔مغرب میں جنسی آزادی (بے راہروی) کا مغرب والوں کا اپنا الگ

سا تصور ہے۔بچوں کے لئے طرح طرح کی گڑیائیں بنانے والوں نے بڑوں کے لئے بھی گڑیائیں بنا دی ہیں۔مارکیٹ میں ربڑ کی ایسی گڑیائیں دستیاب ہیں جن میں ہوا بھر دیں تو وہ پوری عورت بن جائے۔ پاکستان سے ایک ادیب لندن گئے تو سیر وسیاحت کے ساتھ ربڑ کی گڑیا بھی خریدی۔پھر وطن چلے گئے۔ چند دن کے بعد بخش لائکپوری کے نام ان کا خط آیا کہ وہ ربڑ کی گڑیا پنکچر ہوگئی ہے،تم جانتے ہو میں ایک معزز آدمی ہوں اس لئے کسی دوکان پر پنکچر لگوانے کے لئے نہیں جا سکتا۔تم مہربانی کرواور ربڑ کی ایک اور گڑیا لے کر مجھے بھیج دو۔چنانچہ بخش لائل پوری نے ان کی فرمائش پوری کر دی۔تاہم بخش لائل پوری نے گڑیا کے پنکچر ہو جانے کا قصہ ایسے انداز سے سنایا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔میں نے انہیں کہا آپ اس معزز ادیب کی فرمائش پوری کرنے کی بجائے اسے لکھتے کہ پہلے سائیکلوں کی مرمت کرنے والے کسی کاریگر کے شاگرد بنو،وہاں سے پنکچر لگانے کی تربیت حاصل کرواور پھر خود ہی اپنے کئے ہوئے پنکچر ٹھیک کرتے رہو۔

ایک اور مزے کا واقعہ۔۔۔۔۔اکبر بابر ایڈووکیٹ خانپور کے ممتاز وکلاء میں شمار ہوتے تھے۔اپنے ہی مُوڈ کے آدمی تھے۔شیخ فیاض الدین کی اور ان کی گہری دوستی تھی۔اُن دنوں شیخ فیاض بلدیہ خانپور کے چیئرمین تھے۔اکبر بابر کا موڈ خوشگوار تھا،اپنی موج میں باتیں کر رہے تھے،اسی لہر میں کہنے لگے بلدیہ خانپور کے سارے کونسلرز Gay ہیں ،سوائے ایک کونسلر کے(انہوں نے Gay کی جگہ گاف سے شروع ہونے والا ایک سلیس سا لفظ کہا تھا جو اردو پنجابی اور سرائیکی تینوں زبانوں میں یکساں مستعمل ہے) میں نے پوچھا جو کونسلر Gay نہیں ہے،کیا وہ شیخ فیاض ہیں؟ کہنے لگے ہرگز نہیں۔۔۔۔وہ بھی گے ہے۔میں نے پوچھا کیا ثبوت ہے؟ کہنے لگے میں خود ثبوت ہوں۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں ان سے کیا پوچھتا۔ لیکن پھر خیال آیا اور میں نے آہستہ سے پوچھ ہی لیا کہ وہ خوش نصیب کونسلر کون ہے جو آپ کے بقول گے نہیں ہے؟انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا لیڈی کونسلر۔۔۔۔۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک بار اپنے صاحبزادے سلیم آغا کے ساتھ لندن کی سیاحت کیلئے گئے تھے۔ان کی واپسی پر میں اور ڈاکٹر پرویز پروازی ان سے ملنے کے لئے ان کے گاؤں وزیر کوٹ گئے۔وزیر آغا اور سلیم لندن کے احوال بتا رہے تھے پرویز پروازی،ڈاکٹر وزیر آغا کے ایج گروپ کے ہیں،ان کے دوست بھی ہیں،سو سلیم آغا ان کا بزرگوں کی طرح احترام کرتے ہیں یکایک پرویز پروازی نے سلیم آغا سے ایک شریر سا سوال پوچھ لیا۔۔سنا ہے کہ اصل انگلش نسل خواتین کا Bottom بندر کے Bottom جیسا ہوتا ہے۔

آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟سلیم آغا کا مزاج بھی اس انداز کی باتوں والا نہیں ہے،چنانچہ اس اچانک اور بے باک سوال پر وہ شرما کر رہ گئے۔لیکن ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی ہی برجستہ معصومیت کے ساتھ کہا جس نے بندر کا Bottom ہی کبھی نہیں دیکھا،وہ اس بارے میں کیا بتا سکتا ہے۔

مشرقی عشق میں بندر کا تو نہیں البتہ کتے کا ایک اہم رول رہا ہے۔لیلیٰ کا کتا اس کی واضح مثال ہے۔ادھر مغرب میں بھی یہاں کی لیلاؤں اور ان کے کتوں کی ایک بڑی تعداد دیکھی جا سکتی ہے۔بعض کتے تو بلی کے بچے سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ٹھہریئے مغرب کی بات بعد میں۔۔۔۔یہاں مجھے پاکستان کے ایک عزیز کا ایک نازک سا کتا یاد آ گیا ہے۔اس عزیز کو کبوتر بازی کا شوق تھا اور اس نے بلی کے بچے جتنا ایک چھوٹا سا کتا بھی پال رکھا تھا۔ایک بار یوں ہوا کہ کتا گھر کی چھت پر کبوتروں کے دڑبے کے پاس بیٹھا تھا،کبوتر دڑبے سے باہر غڑغوں کر رہے تھے۔اچانک وہاں ایک بلی آ گئی،کتا بچارا بہت ہی نازک سا تھا۔اس نے بلی کو دیکھ کر اپنے فرض کا احساس کیا اور کبوتروں کی حفاظت کے طور پر اپنی نازک سی غراہٹ کی آواز نکالی،اس کے ساتھ ہی شاید اسے خیال آ گیا کہ بلی اسے بھی نقصان پہنچا سکتی ہے،چنانچہ پھر وہ خود ہی پیچھے ہٹتا چلا گیا۔وہ عزیز چھت کی سیڑھیوں کے اوپری حصہ سے خود یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

مجھے ہمیشہ کتوں سے ڈر لگا ہے۔اب یہاں بہت ہی چھوٹے اور نفیس سے کتے دیکھنے کے بعد اتنا حوصلہ ہو گیا ہے کہ انہیں محبت بھری نظروں سے مسکرا کر دیکھ لیتا ہوں مگر تھوڑے فاصلے سے۔۔۔جب میں جرمنی میں نیا نیا پہنچا۔ایک بار صبح کی سیر کر رہا تھا۔نہر کے کنارے کنارے جا رہا تھا مجھ سے کافی آگے ایک نوجوان جوڑا اپنی مستی میں جا رہا تھا۔ان کے ساتھ ایک چھوٹا سا کتا بھی تھا۔اس کتے کو بلی کے سائز جتنا سمجھ لیں۔اس کم بخت کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف منہ کر کے رک گیا میں نے خوفزدہ آواز میں زور سے ہیلو۔۔۔۔۔ہیلو،کہہ کر اس مست جوڑے کو پکارا تو کتا باقاعدہ بھونکنے لگا۔میں نے اردو میں ہی چلا کر کہا،اپنے کتے کو سنبھالو۔۔۔۔لڑکی نے مڑ کر دیکھا اور اتنے زور سے ہنسنے لگی کہ میں خود کو بے وقوف محسوس کرنے لگا۔اسی دوران لڑکے نے کتے کو آواز دی تو وہ بھونکتا ہوا اپنے مالکوں کے پاس چلا گیا اور میری جان میں جان آئی۔

بڑے میاں سو بڑے میاں،چھوٹے میاں سبحان اللہ۔۔۔۔۔۔میرا چھوٹا بیٹا ٹیپو بھی مجھ سے کم ڈرپوک نہیں ہے۔پاکستان میں جب ٹیپو اور میرا بھانجا احمد،دونوں ابھی بہت چھوٹے بچے تھے،گھر سے باہر گلی میں کھڑے تھے،اچانک انہیں گلی میں ایک چھوٹا سا کتا دکھائی دیا اور دونوں یہ کہتے ہوئے گھر کو

بھاگے۔ بھادو (بھاگو)۔۔۔ بھادو ۔۔۔۔۔ شیر آیا۔ یہاں جرمنی میں جب ٹیپو کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ اسے چیک اپ کے لئے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ سائیکل اسٹینڈ پر اس نے اپنی سائیکل لاک کی، جب ڈاکٹر سے ہو کر واپس آیا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ کوئی اپنا کتا بھی سائیکل اسٹینڈ کے ساتھ باندھ گیا ہے۔ کتا بے شک چھوٹا تھا لیکن تھا تو کتا ہی۔۔۔۔ آخر ٹیپو نے چھ سات سال کے ایک جرمن بچے کو پیش کش کی کہ اگر میری سائیکل نکال کر لا دو تو تمہیں ایک مارک دونگا۔ بچے نے ساری سچویشن سمجھنے کے بعد مسکرا کر آفر قبول کر لی۔ ٹیپو سے سائیکل کے لاک کی چابی لی اور آرام سے سائیکل نکال کر لا دی۔

بات ہو رہی تھی مغربی لیلاؤں کے نازک کتوں کی۔ نازک اندام گوریاں ننھے منھے سائز کے کتوں کے ساتھ پھر بھی سج جاتی ہیں لیکن بعض گوریوں نے تو ایسے جسیم اور خوفناک کتے پال رکھے ہیں کہ ان کے کتے تو کتے خود ان گوریوں کی طرف دیکھتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا ہے۔ اہل مغرب کا کتوں سے گہری محبت کرنا بظاہر ان کا معاشرتی انداز لگتا ہے لیکن مجھے اس میں ایک ایسا مذہبی حوالہ محسوس ہوتا ہے جسے شاید اہل مغرب اب تسلیم بھی نہ کریں۔ اصحاب کہف، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو کار تھے اور ان کے ساتھ ان کے کتے کا ذکر موجود ہے۔ سو مذہب کے ابتدائی سفر میں کتے کی وفاداری نے مسیحی اہل مغرب کو کتے کی طرف زیادہ راغب کیا۔ اس میں مغربی کلچر کے مختلف رنگ بھی ملتے گئے اور یہ وفادار جانور مغربی معاشرت کا ایک حصہ بن گیا۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

حالیہ دنوں میں ویاگرا کی ایجاد نے ساری دنیا میں خاصا تہلکہ مچایا ہے۔ مغرب والوں نے شروع میں اسے جائز ضرورت کے طور پر استعمال کرنے کی بجائے محض زیادہ سے زیادہ لذت انگیز مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شروع میں ہی چار پانچ اموات کی خبریں آ گئیں۔ ان ساری اموات سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ بعض کم عمر نوجوان اسے استعمال کر بیٹھے۔ جنہیں اس کے استعمال کی قطعاً ضرورت نہ تھی یا پھر ایسے ادھیڑ عمروں نے اسے استعمال کیا جنہوں نے پہلے ہی خاصی شراب چڑھا رکھی تھی۔ ویاگرا شراب تو تھی نہیں کہ پہلی شراب میں مل کر نشہ کو بڑھاتی۔ ایک صاحب نے شراب اور ویاگرا کے استعمال کے بعد ڈسکو کلب کا رخ کیا اور وہیں جان دے دی۔ یہ دل کے مریضوں کے لئے زہر ہے، دوسرے کسی نشے کے ساتھ انتہائی مضر ہے۔ 55 سال کی عمر تک کے لوگوں کے لئے عام طور پر مفید ہے لیکن اس کے لئے جائز ضرورت مند ہونا ضروری ہے۔ سو اہل مغرب نے اب ویاگرا کا جائز استعمال سمجھ لیا ہے۔

ان کے برعکس ہمارے بعض مشرقی دانشوروں نے اس دوا کی مخالفت کرتے ہوئے معلم اخلاق بننے کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے اسے میکانکی عمل قرار دیا ہے۔ میرا خیال ہے صدیوں تک نوابوں، راجوں، مہاراجوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں کے درباری اطباء نے جو نسخہ طبقہ خواص تک محدود رکھا، اب وہ ویاگرا کی صورت میں زیادہ بہتر ہو کر عام ضرورت مند انسان کو بھی فیض یاب کرنے لگا ہے۔ ویاگرا کا مثبت استعمال بہت سے ضرورت مندوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ جہاں تک میکانکیت کا تعلق ہے، اگر انسانی جذبات کا تجزیہ کیا جائے تو آج کی سائنس نے اسے بھی کیمیائی تماشہ ثابت کر دیا ہے۔ فلاں جز کو کم کر دیں تو انسان کا غصہ ختم ہو جائے گا۔ فلاں جز کو نکال دیں تو غم کا احساس نہیں رہے گا۔ اور تو اور محبت کا کوئی کیمیائی جز بھی تلاش کر لیا گیا ہے۔ اسے نکال دیں تو محبت کا جذبہ ہی ختم ہو جائے گا یوں تو پھر محبت سمیت سارے انسانی جذبات ہی ایک کیمیائی کھیل سے زیادہ کچھ نہیں رہتے۔ انڈیا کے بارے میں تو میری معلومات زیادہ نہیں ہیں لیکن پاکستان میں "زندگی سے مایوس لوگوں کے لئے خوشخبری" جتانے والے دیسی معالج لاکھوں کی تعداد میں دوکانیں سجائے بیٹھے ہیں جبکہ ان میں 99 فی صد فراڈ ہیں جو مجبور ضرورتمندوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ ویاگرا کی آمد سے فراڈ قسم کے دیسی معالجین کو خاصا نقصان پہنچے گا۔

جنسی عمل ہر ذی روح کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ انسانوں میں اسے اچھے انسانی اور فطری طریقے سے بروئے کار لانے میں ہی بہتری ہے۔ اس سلسلے میں مغرب اور مشرق کے عمومی رویے انتہا پسندانہ ہیں ۔ اہل مغرب نے سب کچھ کھول کھال کر رکھ دیا ہے، کچھ بھی مخفی نہیں رہنے دیا جبکہ اہل مشرق نے اس عمل کو ایک طرح سے شٹل کاک برقعہ سے ڈھانپ رکھا ہے۔ ہم پردے کے اندر سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ یوں ہمارا معاشرہ دوہرے پن کا ملزم قرار پاتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے دونوں رویوں کو کسی حد تک سمجھ لینے کے بعد میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ بقائے نسل انسانی کے اس اہم ترین عمل کو شٹل کاک برقعہ سے ملفوف رکھنے کی بجائے ریشمیں برقعہ جتنا پردہ رکھنا چاہیئے۔ دوہرا لیکن خاصا باریک نقاب۔ جس میں سے ایک نقاب آنکھوں کو کھلا چھوڑتے ہوئے دوسرے کان تک چلا جائے اور ایک نقاب پورے چہرے پر پڑا رہے۔ یعنی تھوڑا سا پردہ بہرحال ضروری ہے۔

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔ شمارہ: نومبر، دسمبر ۱۹۹۹ء

دعائیں اورقسمت

مذہب کی ایک سطح عقائداورفروعات سے تعلق رکھتی ہے۔دنیاکے بیشتر مذہبی جھگڑے اسی سطح سے اُبھرے اورخونریز فسادات کی حدتک گئے ۔مذہبی اختلافات اورفسادات کا یہ سلسلہ آج بھی دنیا بھر میں کسی نہ کسی رنگ میں چل رہاہے۔جبکہ مذہب کی دوسری اوراہم سطح روحانیت سے متعلق ہے۔دنیاکے ہر مذہب اور ہرمسلک سے تعلق رکھنے والے کا دعویٰ ہے کہ صرف اسی کے مسلک پرعمل پیرا ہوکرخدا سے روحانی تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔یوں ہردعویدار کے بقول دنیا کے ننانوے فیصد مذاہب جھوٹ ہیں اور صرف وہی سچ ہیں۔میرے ایک نیم دہریہ قسم کے دوست مسعودشاہ ہنستے ہوئے کہا کرتے تھے کہ ننانوے فیصد مذاہب کوجھوٹ کہنے والے اپنے لئے ایک فیصد جھوٹ بچالیتے ہیں اوراسے سچ قرار دیتے ہیں۔

معتقدات سے ہٹ کر جہاں تک خدا سے کچھ مانگنے کاتعلق ہے میرے نزدیک یہ ہرانسان اورخدا سے اس کےتعلق کی نوعیت پرمنحصر ہے۔نسیم سیفی صاحب طویل عرصہ تک بعض افریقی ممالک میں مقیم رہے۔وہ ایک بار بتانے لگے کہ خشک سالی کے باعث قحط کا خطرہ پیدا ہوگیا تو مسلمانوں نے نمازِ استسقاء پڑھنے کے لئے ایک تاریخ کا اعلان کردیا۔اس تاریخ سے ایک یا دو دن پہلے سِکھ حضرات نے ایک گراؤنڈ میں اپنے طریقِ عبادت کے مطابق اجتماعی دعا کی اور مسلمانوں کے نمازاستسقاء پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ برسات نے پہلے ہی دھرتی کوسیراب کردیا۔

’’مظلوم کی دعا اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا‘‘عمومی طور پرانسانی تاریخ اورعصرِ حاضر کی صورتحال کودیکھیں تواس فرمان میں ہمیں بےشمار مستثنیات دکھائی دیں گی۔لیکن مجھے ذاتی زندگی میں ہمیشہ اس فرمان کی سچائی کا جلوہ بلکہ جلالی جلوہ دیکھنے کوملا ہے۔میں جب بھی مظلومیت کی حالت میں ہوا میرے ساتھ ظلم کرنے والا کوئی عام انسان تھا تو وہ بھی خدا کی گرفت سے نہیں بچا اوراگرکسی کوخدا سے تعلق کا کوئی زعم تھا اوراس نے میرے خلاف کوئی ظالمانہ کاروائی کی تو جس نوعیت کی کاروائی کی گئی زیادہ سے زیادہ تین ماہ کے اندرویسی ہی کاروائی خوداس کے خلاف ہوگئی یااس سے بھی زیادہ رُسوائی اسے بڑے

پیمانے پرمل گئی۔میں نے ایک چیزاوربھی نوٹ کی ہے۔اگرمیں کسی کی زیادتی کا بدلہ خود لےلوں تو میرا بدلہ ہی اس کی سزا ہوتا ہے۔لیکن اگر میں کسی سے بدلہ نہ لےسکوں۔۔۔خواہ مجبوری کے باعث خواہ صبر کرکے۔۔۔میری خاموشی کے نتیجہ میں ظالم کوقدرت کی طرف سے ایسی سزا ملی کہ میں خود بھی بعض اوقات دُکھی ہوگیا کہ مولا!اتنی کڑی سزا تو انہیں نہ دینا تھی۔بعینہٖ اگرمیں کسی کے ساتھ کبھی ناجائز زیادتی کرجاؤں تو مجھے بھی خدا کی طرف سے سزا ملنے کا احساس ہوتا ہے اور صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ فلاں زیادتی کی سزا ہے۔

چندقرآنی اورمسنون دعائیں مجھے بچپن میں رٹا دی گئی تھیں۔ان کی بھی ایک اہمیت ہے لیکن میں جب کسی دُکھ کی حالت میں ہوتا ہمیشہ اپنی زبان میں خدا سے دعا کرتا۔بہت بار ایسا تجربہ ہوا کہ میں نے دعا کی اوراسی حالت میں مجھے دعا کی قبولیت کا یقین بھی ہوگیا۔جب بارہا ایسا ہوا تو میں نے اپنے بعض قریبی عزیزوں کواس بارے میں بتایا۔اس بتانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو دعا بظاہر قبول ہوچکی تھی ایک لمبے وقفہ تک معلّق ہوگئی۔دوتین بار ایسے جھٹکے لگنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ قبولیت دعا کا نشان تو خدا کے مامورین اوراولیاء کے لئے مخصوص ہے۔میری کسی بھی دعا کا قبول ہونا میرا انفرادی معاملہ ہے۔اگرمیں اسے دوسروں کو بتاؤں گا تو مقامِ ولایت پرقدم رکھنے جیسی جسارت کروں گا جس کا میں اہل ہی نہیں۔سو اسی لئے وہ دعائیں جن کی قبولیت کے بارہ میں دوسروں کو بتا دیتا ہوں لمبے عرصہ کے لئے ردّوقبول کے درمیان معلّق ہوجاتی ہیں اوریہی میرے افشاء کی سزا ہوتی ہے۔

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک نہ مستجاب ہوئے

اپنی زبان میں دعاؤں کا میرا سلسلہ اُس وقت متزلزل ہونے لگا جب میں نے ۱۹۸۶ء میں اپنے ابا جی اورامی جی کی لمبی عمرکی دعائیں مانگنا شروع کیں اورمیرے دیکھتے ہی دیکھتے میرے دونوں بزرگ دنیا سے چل بسے۔پھرمیں نے اپنے باباجی (تایاجی) کے لئے یہی دعا کی اور وہ بھی فوت ہوگئے۔تب میں جوبھی دعا کرتا اُس کی تاثیر اُلٹ ہوجاتی ۔

جو دعا کرتے تھے اُلٹا ہی اثر ہوتا تھا
تیری چاہت کی دعا رب سے بچالی ہم نے

اسی دوران مجھے پھٹی پرانی اورخستہ سی حالت میں قرآنی اورمسنون دعاؤں کی ایک چھوٹی سی کتاب

ملی۔ ہر دعا کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی درج تھا۔ مجھے یہ کتاب کیا ملی، نئی زندگی مل گئی۔ اسے لاہور سے کے۔ اے۔ عزیز نے شائع کیا تھا۔ انہیں اور ان کی اولاد کو میں آج بھی اپنی دعاؤں میں شامل رکھتا ہوں۔ اس کتاب کے ذریعے مجھے پہلی بار صبح اور شام کی مسنون دعاؤں کا علم ہوا۔ پھر دن بھر میں پیش آمدہ مختلف مسائل اور پریشانیوں کو دور کرنے والی دعائیں۔ خیر و برکت کی دعاؤں سے لے کر ''سید الاستغفار'' تک دعاؤں کا ایک خزانہ میرے ہاتھ لگ گیا۔ تب میں نہ صرف بے روزگار تھا بلکہ ۸۰ ہزار روپے کا مقروض ہو چکا تھا۔ اور بعض ''صاحبِ ایمان'' لوگ مجھے ''کیفرِ کردار'' تک پہنچا کر اپنی صداقت کا نشان بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔

ان دعاؤں کو میں نے اتنی بار دل کی گہرائی سے پڑھا کہ مجھے زبانی یاد ہوگئیں اور آج بھی میرے روزانہ وظیفہ کا حصہ ہیں۔ اگرچہ ان کے وِرد میں اب پہلے جیسی لذّت اور کیفیت تو نصیب نہیں ہوتی (اس کی وجہ میری اپنی داخلی کیفیت ہے)، تاہم میں نے ان دعاؤں کو آج بھی حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ ان کے نتیجہ میں پہلے مرحلہ میں مجھے پاکستان انٹرنیشنل پبلک اسکول اینڈ کالج ایبٹ آباد میں اردو پڑھانے کی بہت عمدہ جاب مل گئی اور دوسرے مرحلہ میں مجھے جرمنی پہنچنا اور یہاں سیٹ ہونا نصیب ہوگیا۔ یہ دعائیں مختلف کتابچوں کی صورت میں دینی کتب کی دوکانوں سے باآسانی مل جاتی ہیں۔ اپنے ذاتی تجربہ نہیں، پیہم تجربات کی بنیاد پر میں دعا کا ایک مسنون نسخہ سارے دوستوں کے لئے یہاں بیان کئے دیتا ہوں۔ جمعہ کے دن فجر کی نماز کے بعد سورۃ یاسین اور سورۃ صافات پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا لیں اور خدا سے کوئی ایک (صرف ایک) دلی مُراد مانگیں۔

جائز مُراد ہونے کی صورت میں ایک دو جمعوں میں ہی مُراد پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی بہت ہی مشکل قسم کا کام ہو تو اس کی مشکل کے مطابق وقت زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔ لیکن ثابت قدمی سے اور باقاعدگی سے یہ وظیفہ جاری رکھنا ضروری ہے۔ میں نے جرمنی پہنچنے کے لئے لگ بھگ دو سال تک یہی مُراد مانگی تھی اور یہ میری سب سے طویل دورانیے کی دعا تھی۔ دعا کا یہ طریق مسنون ہے لیکن مُراد مانگتے وقت ہر بندے کا خدا کے ساتھ اپنا ہی انداز ہوتا ہے۔ میں تو ضد کر کے بیٹھ گیا تھا۔ رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا ''میں نے جرمنی جانا ہے۔ مجھے جرمنی پہنچائیں'' کی رَٹ لگا دی تھی۔ دو سال تک رُلانے کے بعد خدا نے نہ صرف یہ مُراد پوری کر دی بلکہ اس کے ساتھ اور بھی بہت ساری دعائیں از خود پوری ہوگئیں۔

یہاں جرمنی میں میرے ایک دوست ہیں ارشاد ہاشمی صاحب۔ کمپیوٹر انجینئر ہیں۔ بہت ہی بھلے

آدمی ہیں۔ آج کل جرمنی سے ایک ادبی خبر نامہ ''اردو دنیا'' بھی نکال رہے ہیں۔ ایک بار انہوں نے اپنی بعض ذاتی پریشانیوں کی بابت بتایا تو میں نے انہیں مخصوص دعاؤں کے وِرد کی تحریک کی۔ دعاؤں والی وہ پھٹی پرانی کتاب میں نے آج بھی بہت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ میں نے ہاشمی صاحب کو وہ کتاب دیتے ہوئے کہا اس کی فوٹو کاپی کرا لیں۔ ان دعاؤں کے باعث میرے سارے دُکھ دور ہو گئے ہیں۔ ہاشمی صاحب نے کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر کہا: ''اب آپ باقاعدہ طور پر کہہ سکتے ہیں'

؎ لے جا مِری دعائیں لے جا''

دعاؤں کی کتاب کے ساتھ انہوں نے برجستہ طور پر جوگا نا جوڑ دیا تھا، اس پر میں بھی بے ساختہ مسکرا دیا۔

بیدار ہونے اور رات کو سونے سے پہلے کی دعائیں اور فجر کی نماز کے بعد کی بہت ساری دعائیں۔۔۔اور ان کے علاوہ میری زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والی بعض دعائیں ایسی ہیں جن کا میں دن میں ایک بار مکمل وِرد کرتا ہوں۔ اپنی جاب پر جاتے ہوئے مجھے بذریعہ ٹرین آدھے گھنٹے کا سفر کرنا ہوتا ہے اور اس عرصہ میں ان ساری دعاؤں کا ورد مکمل کر لیتا ہوں۔ ورد کرتے ہوئے ہونٹ تو بہر حال ہلتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ میرے سامنے کوئی گوری بیٹھی ہے اور میرے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ وِرد کرتے ہوئے میں عموماً غضِّ بصر سے کام لیتا ہوں۔ اس کے باوجود کبھی کبھار نظر اُٹھ تو جاتی ہے۔ ایک بار عام گوریوں سے کہیں زیادہ خوبصورت گوری میرے سامنے آ بیٹھی اور میرے وِرد پر اس کی حیرت بھی غیر معمولی سی لگی۔ مجھے لگا یہ ابھی مجھ سے پوچھ بیٹھے گی کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟۔۔۔ اُس نے تو نہیں پوچھا لیکن اپنی اُس وقت کی حالت پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا اور وظیفہ کے دوران ہی ایک شریر سی مسکراہٹ میرے چہرے پر پھیل گئی۔ لطیفہ یوں ہے:

ایک صاحب اپنے دوست کے گھر گئے تو دیکھا کہ وہاں ایک پنجرے میں دو طوطے بند ہیں۔ ایک طوطا حالتِ سجدہ میں ہے اور ایک طوطا مسلسل تسبیح کر رہا ہے۔ وہ صاحب دونوں طوطوں کی شرافت اور نیکی سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے دوست سے کہنے لگے میرے پاس ایک طوطی ہے جو بہت شرارتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو وہ طوطی دو چار ہفتوں کے لئے آپ کے طوطوں کے پاس چھوڑ جاؤں تاکہ ان کی رفاقت میں طوطی کی بھی تربیت ہو جائے۔ دوست راضی ہو گیا تو وہ صاحب اپنی طوطی لے آئے۔ جیسے ہی طوطی کو طوطوں والے پنجرے میں ڈالا گیا، تسبیح والے طوطے نے فوراً اپنی تسبیح پرے پھینکی اور سجدہ ریز طوطے کو ہلا کر کہنے لگا: یار! اُٹھ جاؤ، آخر ہماری دعا قبول ہو ہی گئی۔

دعاؤں کے سلسلے میں میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی دعا بہت زور لگانے کے باوجود بھی قبول نہیں ہوتی تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس دعا کا قبول نہ ہونا ہی میرے حق میں بہتر ہے۔اس سلسلے میں یہ قرآنی فرمان ہمیشہ میرے مدِّنظر رہتا ہے کہ بہت سی باتیں ہیں، جنہیں تم اپنے لئے بہتر سمجھتے ہو لیکن وہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہیں۔اور بہت سی باتیں ہیں جنہیں تم اپنے لئے بہتر نہیں سمجھتے لیکن وہ تمہارے حق میں بہتر ہوتی ہیں۔اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔۔۔۔دعا کی ایک اور قِسم جو قبول نہیں ہوتی وہ تقدیرِ مبرم سے متصادم دعا ہے، جب ایک چیز مقدّر میں ہی نہیں ہے تو دعا کے باوجود اس کا ملنا محال ہے۔

مقدّر کی بات چلی ہے تو یہاں واضح کر دوں کہ میں قسمت پر بہت یقین رکھتا ہوں۔میرے لڑکپن میں خانپور میں ہماری ایک ملنے والی خالہ جمیلہ نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ اس کے حالات ۴۰ سال کی عمر کے بعد ٹھیک ہوں گے، البتہ یہ باقی سارے بھائی بہنوں سے زیادہ علم حاصل کرے گا۔میں نے ناممکن قسم کے ظاہری حالات کے باوجود ایم اے کر لیا لیکن میرے حالات ۴۰ سال کی عمر کے بعد ہی ٹھیک ہونا شروع ہوئے۔ویسے ہاتھ کی لکیروں کے فیصلوں کے باوجود بھی بعض استثناء نکل آتے ہیں۔مثلاً میرے ہاتھ پر قسمت کی لکیر، دماغ کی لکیر سے ٹکرا کر رُک گئی ہے۔میں جب کسی بات پر اَڑ گیا تو بڑے سے بڑے فائدے کو بھی نظر انداز کر دیا اور یوں کئی بار اپنا نقصان کیا۔دوسری طرف میری بیوی مبارکہ کے ہاتھ پر قسمت کی لکیر بہت واضح، صاف اور روشن ہے۔سو میری خوش قسمتی دراصل میری بیوی کی مرہونِ منّت ہے۔اسی طرح میرے ہاتھ پر شہرت کی لکیر نہیں ہے۔اس کے باوجود اگر محبت کرنے والے چند دوست اچھے لفظوں میں اور مجھ سے برہم احباب مجھے ملامت کر کے بھی یاد کر لیتے ہیں تو اس تھوڑی سی ''شہرت'' کا سبب ابا جی کے دو خواب ہیں۔ابا جی کے وہ دونوں خواب اپنی کتاب ''میری محبتیں'' سے یہاں نقل کئے دیتا ہوں:

''میری پیدائش سے چند ماہ پہلے ابا جی نے یکے بعد دیگر دو خواب دیکھے تھے۔پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا اور گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ابا جی اس درخت کے اُوپر، عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔یہ خواب سُن کر ابا جی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کر کے ''حیدر۔۔۔۔حیدر'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔ابا جی نے اپنے مُرشد کو

خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرما دیں، مرشد کو ابا جی کے خواب کا علم نہیں تھا۔انہوں نے مجھے حیدر بنا دیا۔''

جبر و قدر کا مسئلہ سُلجھانے کے لئے یا سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بزرگانِ دین سے لے کر فلسفیوں تک ہر کسی نے اپنی اپنی سمجھ بُوجھ کے مطابق اظہارِ خیال کیا ہے۔جبر کی طرف جھکاؤ ہو تو قسمت کا لکھا اٹل قرار پاتا ہے اور تصوّف کی طرف رغبت بڑھتی ہے۔اختیار کی طرف جھکاؤ ہو تو عمل کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔یوں قسمت سے لے کر دعا تک سب باتیں غیر اہم ہو جاتی ہیں۔مجھے لگتا ہے کہ اصل حقیقت کہیں اِن دونوں تصوّرات کے بین بین ہے۔

میں ذات پات کا قائل نہیں ہوں لیکن مجھے نسلی حوالے کے اثرات کا تھوڑا بہت احساس ضرور ہوا ہے۔مثلاً قریشی ہونے کے ناطے مجھے کسی روحانی سفر میں کسی مقام تک پہنچنے کے لئے دس قدم چلنا پڑتا ہے تو کسی دوسرے کو شاید بیس، تیس یا چالیس قدم چلنے کے بعد وہاں پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔اس کے باوجود اگر کوئی قریشی اس طرف پیش قدمی ہی نہ کرے تو وہ روحانیت سے محروم ہوتا چلا جائے گا اور دوسرے اپنی کم رفتاری کے باوجود قربِ خداوندی میں آگے بڑھتے جائیں گے۔ہندوؤں کے ذات پات کے تصوّر کو انسانی حوالے سے اب درست نہیں مانا جا سکتا لیکن اس میں بھی کہیں کوئی جزوی سچائی ضرور ہے۔انسانوں کی طبقاتی تفریق کو الگ رکھیں۔ہر انسان کے خود اپنے وجود کے بھی کئی طبقے بنے ہوئے ہیں۔دماغ برہمن کی طرح خود کو افضل سمجھتا ہے اور دل کے توسط سے باقی جسم سے رابطہ رکھتا ہے۔دائیں ہاتھ کے مقابلہ میں بایاں ہاتھ کمتر ہے۔جسم کے نیچے کے حصہ کو صاف رکھنے کے باوجود ہم خود ایک اچھوت ہی سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے خیالات کی کشمکش اپنی جگہ۔۔۔۔میری معمول کی دعاؤں میں ڈیڑھ برس پہلے ایک اور اضافہ ہوا۔میں صبح، شام تینوں قُل شریف تین تین بار پہلے ہی سے پڑھتا ہوں۔لگ بھگ ڈیڑھ سال پہلے میں سویا ہوا تھا۔نیند میں ہی میں سورۃ فلق پڑھ رہا تھا۔اسی حالت میں آنکھ کھُل گئی تو میرے ہونٹوں پر سورۃ فلق اسی طرح جاری تھی۔جاگنے کے باوجود میرے ہونٹ اس وقت تک ہلتے رہے جب تک میں نے سورۃ الناس مکمل کر کے درود شریف پڑھ نہیں لیا۔تب میں بیداری کے بعد پھر بیدار ہوا۔مجھے محسوس ہوا کہ اپنے اندر اور اپنے باہر کے دشمنوں اور جنّات سے محفوظ رہنے کے لئے مجھے سورۃ معوذتین کا وِرد کثرت سے کرتے رہنا چاہئے۔چنانچہ خاص طور پر پیدل، بس یا ٹرین سے سفر کرتے ہوئے، اپنی مخصوص دعاؤں کا وِرد مکمل کرنے کے بعد میں سفر کا بیشتر وقت سورۃ معوذتین کو بار بار پڑھنے میں صَرف کرتا ہوں۔

اس وِرد کے دوران مجھے کئی بار محسوس ہوا کہ میرے دشمنوں کے وار ضائع ہوتے جا رہے ہیں یا اُنہیں پر اُلٹتے جا رہے ہیں۔ باہر کے ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے دشمن مجھے اپنے رُوبرو بے چارگی سے بیٹھے دکھائی دیئے اور اندر کے لاکھوں میل دور رہنے والے دشمن مجھے دُور بھاگتے دکھائی دیئے۔ یہ محض کسی ادیب کی لفظ گری نہیں ہے۔ میں نے حقیقتاً اپنے باطن کے کشف سے بار ہا ایسا دیکھا ہے۔

اب یہی دعا ہے کہ ایسی ہی دافع البلیّات دعاؤں کے سائے میں زندگی کا یہ سفر آسانی کے ساتھ، حفاظت کے ساتھ اور بے حد آرام و سکون اور اطمینان کے ساتھ مجھے اگلی دنیا میں لے جائے۔ موت میرے لئے دُکھ کا مُوجب نہیں راحت کا مُوجب بنے۔ ہجر کا احساس نہیں بلکہ وصل کا پیغام ہو اور وصل کا راحت بھرا پیغام تو جب بھی آئے، عشاق کی خوش نصیبی ہوتا ہے۔

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔شمارہ: مئی، جون ۲۰۰۰ء

شوخیاں، بچپنا

اردو کے ایک بہت اچھے شاعر، خاکہ نگار اور انشائیہ نگار اکبر حمیدی ہیں۔ ہماری گہری دوستی ہے۔ ایک بار ہم دونوں ڈاکٹر وزیر آغا کے گاؤں وزیر کوٹ، اُن سے ملنے کے لئے گئے۔ ہم تینوں آغا جی کے کھیتوں کی سیر کر رہے تھے۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ آغا جی اپنی فصل کے سلسلے میں فکر مند تھے کہ ابھی دو تین دن تک بارش نہیں ہونی چاہئے۔ اکبر حمیدی کہنے لگے:

''اگر ایسا مسئلہ ہے تو بادلوں کو روک دیتے ہیں۔ بارش کرانا اور روکنا کون سے مشکل کام ہیں۔''

ان کی اس بات پر آغا جی ہنسے تو اکبر حمیدی نے کہا

''آغا صاحب! یہ تو معمولی سی بات ہے۔ کیا آپ خود ایسے کام نہیں کر سکتے؟''۔۔۔۔۔۔۔۔

آغا جی نے ویسے ہی ہنستے ہوئے کہا ''اس قسم کے سارے کام مجھ سے صرف اُس وقت ہوتے ہیں جب میرا معدہ خراب ہوتا ہے۔ لیکن آج کل میرا معدہ بالکل ٹھیک ہے۔''

یہ بات صرف آغا جی کی شگفتہ مزاجی کو ظاہر کرتی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ارتکاز کے بَل پر Rain making اور Rain Breaking کے سچے واقعات مجھے آغا جی نے ہی پڑھائے تھے۔ میں نے انہیں ابا جی کا ایسا ایک واقعہ سنایا تھا اور انہوں نے مجھے اس نوعیت کی پوری دنیا کی سیر کرا دی۔

یہاں جرمنی میں ایک بار مجھے صوفیانہ خیالات نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ زندگی کی ہر سرگرمی بے معنی لگ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کسی ویرانے میں جا کر اللہ اللہ کرتے ہوئے زندگی بسر کروں۔ پھر زندگی ہی بے معنی لگنے لگی۔ میں نے دنیا کی بے ثباتی پر گفتگو شروع کر دی۔ گفتگو گہری اور طویل ہونے لگی تو مبارکہ نے کہا ''ٹھہریں! میں آپ کی شوگر چیک کرتی ہوں''۔۔۔۔ جب شوگر چیک کی گئی تو اس کا لیول معمول سے خاصا زیادہ تھا۔ شوگر کنٹرول کرنے والی دوا لینے سے حالت بہتر ہوئی تو زندگی بامعنی اور خوشی سے بھری ہوئی لگنے لگی۔ تب میں نے شریر انداز سے مبارکہ سے کہا ''پہلے زمانے میں شوگر کی بیماری کی تشخیص کرنے، اسے ماپنے اور کنٹرول کرنے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے بعض

شہزادے اپنے محل چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے۔ بُرا ہو اِن جدید سہولیات کا جن کے باعث میں گوتم بُدھ بنتے بنتے رہ گیا''

خانپور میں بنک کے شعبہ سے وابستہ دوستوں میں ارشد خالد' ظفر اقبال ماچے توڑ اور صفدر صدیق رضی کا ذکر تو ''میری محبتیں'' میں آ چکا ہے۔ بنک سے وابستہ ایک اور دوست نجم الحسن نجمی تھے۔ شاعر تھے اور خوش باش قسم کے انسان تھے۔ رحیم یار خاں کے قریب کے کسی گاؤں میں ایک شاعر عاشق قریشی رہتے تھے۔ بہت ہی روایتی قسم کے شاعر تھے لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ دھڑا دھڑ اپنے شعری مجموعے چھپوا رہے تھے۔ ایک بار نجمی نے میری موجودگی میں اُن سے پوچھا کہ یار! تم اتنے مجموعے کیسے چھپواتے ہو؟۔۔۔ عاشق قریشی نے بتایا کہ اردگرد کے دیہاتوں کے بڑے زمینداروں سے پہلے سے طے کر لیتا ہوں۔ پھر کتاب کا انتساب دو تین زمینداروں کے نام کر کے ان سے کتاب کی لاگت نکلوا لیتا ہوں اور جو کتاب بِکتی ہے وہ میرا منافع ہوتا ہے۔

''ہائیں! تمہارے مجموعے بِکتے بھی ہیں؟'' نجمی نے مضحکہ اُڑانے والے انداز سے پوچھا۔

اس پر عاشق قریشی نے بڑی ہی صاف گوئی سے بتایا کہ چھ سات تھانے والوں سے اس کی دوستی ہے۔ وہ سب اس سے پچاس' پچاس جِلدیں لے لیتے ہیں اور تھانے آنے والوں کو تھوپ دیتے ہیں۔ جو رقم ملتی ہے' آدھی آدھی کر لیتے ہیں۔

تب نجم الحسن نجمی نے کہا کہ یہ کرامت تو سُنی تھی کہ ''تُوں چوراں نُوں قطب بنانویں'' (تم نے اپنی نظر سے چوروں کو بھی قطب بنا دیا) لیکن اب سالے تُو نے تو کمال کر دیا ''تُوں چوراں نُوں کتب پڑھانویں'' (تم نے چوروں کو مطالعۂ کتب پر لگا دیا ہے)۔

میری دُور کی نظر کمزور ہے۔ پاکستان میں میری عینک کا نمبر 3.75- تھا۔ ایبٹ آباد میں یہ 3.50- ہو گیا تھا اور جرمنی آ کر چیک کرایا تو عینک کا نمبر 3.25- ہو گیا۔ تب میں نے بعض قریبی عزیزوں سے بات کرتے ہوئے کہا ہمیں ہمارے بزرگوں نے زندگی بھر غضِّ بصر کی تلقین کر کر کے نظر کمزور کرا دی۔ لیکن ایبٹ آباد میں لیڈی ٹیچرز کی رفاقت سے اور یہاں جرمنی کے کھلے ماحول سے آنکھوں کا درست استعمال شروع کیا تو ان کی کم ہوتی ہوئی روشنی بحال ہونے لگی ہے۔ ویسے یہ بات شوخی کی حد تک ہے وگرنہ ڈاکٹر نے میرے استفسار پر بتایا تھا کہ ایک عمر کے بعد دور کی نظر کا نمبر تھوڑا سا کم ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں نزدیک کی نظر پر اثر پڑتا ہے۔ یہ اور بات کہ میری دور کی نظر پہلے سے بہتر ہونے کے ساتھ نزدیک کی نظر

بھی خدا کے فضل سے ابھی تک بالکل ٹھیک ہے۔

بچپن اور لڑکپن میں میرا سب سے پسندیدہ کھیل ''گُلّی ڈنڈا'' تھا۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بھی یہ کھیل کھیلنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ تھوڑی سی کرکٹ بھی کھیلے تھے لیکن ہماری کرکٹ کے قواعد ہمارے اپنے تھے۔ کپڑے کی کترنوں کو مِلا جُلا کر گیند تیار کی جاتی۔ اسے پنجابی میں ''کھِدّو'' کہتے ہیں۔ تختی سے بیٹ کا کام لیتے۔ وکٹوں کی جگہ اینٹیں سجائی جاتیں تاکہ وکٹ گرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ بیٹس مین شاٹ کھیلنے کے بعد جتنی چاہے رنز بنا سکتا تھا۔ ''کھِدّو'' کبھی قریبی جھاڑیوں میں گُم ہو جاتا تو بیٹس مین کے وارے نیارے ہو جاتے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر میں نے مسلسل پندرہ رنز بنائے تھے۔ پھر تھک گیا تھا اس لئے مزید رنز نہیں بنائے۔ وگرنہ ایک شاٹ پر سنچری ہو سکتی تھی کیونکہ گیند جھاڑیوں سے ملی ہی نہیں تھی۔

رحیم یار خاں میں ہمارے قیام کے زمانے میں ایک بار میرے ننھال سے بے جی' خالہ حبیبہ' ماموں سمیع' ماموں صادق' ماموں کوثر' ماموں ناصر۔۔۔ بہت سارے عزیز آئے ہوئے تھے۔ تب ابا جی اور چاروں ماموؤں نے ایک تفریحی گراؤنڈ میں دوڑ کا مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ ابا جی نے جیت لیا تھا۔

جن دنوں میں بے جی (نانی جان) کے ساتھ سارے مذکورہ عزیز آئے ہوئے تھے' انہیں دنوں ایک نیم دیوانے قسم کے میاں کالے خاں بھی آ وارد ہوئے۔ یہ ہمارے ننھال کے جاننے والے تھے۔ امی جی کو دعا یا آشیرواد دینے کے لئے آئے۔ ایک بگل سا ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اپنا نام اس بگل پر ''کالے خاں۔۔۔ امام مہدی'' لکھوا رکھا تھا۔ لیکن بیعت کسی کی نہیں لی۔ ان کے بارے میں پتہ چلا کہ پِیروں کے مزاروں پر چڑھائی جانے والی چادریں اتار کر لے جاتے۔ کوئی روکتا تو برہم ہو کر کہتے زندوں کو کپڑا ملتا نہیں اور تم مزاروں پر چڑھاتے پھرتے ہو۔ مزاروں والے انہیں بھی کوئی پہنچا ہوا سمجھ کر چُپ کر جاتے۔ ہمارے ہاں ایک دن رہے۔ صبح اُٹھتے ہی کہنے لگے مجھے خدا نے کہا ہے: **قالوبلیٰ قد جاء نا**۔ پھر اس کا پنجابی میں ترجمہ بھی کر دیا۔ کالے خاں توں کدوں جانا ایں؟ (کالے خاں! تم نے کب یہاں سے جانا ہے؟) اور پھر سب کو دعا دیتے ہوئے فقیرانہ شان کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ جاتے ہوئے بگل بھی بجاتے جاتے تھے۔

قرآنی الفاظ کے پنجابی استعمال کی ایک دلچسپ بات سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے لڑکپن سے متعلق ہے۔ کہیں پڑھا تھا کہ وہ لڑکپن میں امرتسر کے کسی معروف حکیم صاحب کے شاگرد بنے تھے۔ حکیم صاحب کے مطب کے سامنے ہی ان کا گھر تھا۔ گھر والے حکیم صاحب کے لئے (غالباً حقہ کے لئے) دہکتے کوئلوں

کا تسلا تیار کر دیتے تھے اور کوئی شاگرد آ کر وہ تسلا لے جاتا تھا۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو جب پہلی بار تسلا لانے کے لئے بھیجا گیا تو انہوں نے کسی کپڑے کے بغیر انگلیوں سے تسلے کے کنارے پکڑے۔ظاہر ہے کہ لوہے کا تسلا خاصا گرم تھا۔شاہ صاحب جلدی سے سڑک پار کر کے مطب کے تھڑے پر ہی تسلا رکھ کر کہنے لگے:''استاد جی! **تصلیٰ نار حامیہ**۔''

ایسے ہی حکیم نورالدین صاحب کا یہ قصہ بھی مشہور ہے ۔کسی نے ان سے **قولو قولاً سدیدا** کا مطلب پوچھا تو انہوں نے رواں پنجابی میں اسے یوں واضح کر دیا۔**قولو**۔۔۔کہہ دے' **قولاً**۔۔۔گل (بات)' **سدیدا**۔۔۔سیدھی سیدھی۔

کالے خاں کی بات سے بات کہاں جا پہنچی۔بات ہو رہی تھی ابا جی اور ماموؤں کی ریس کی۔ایک اور موقعہ پر ابا جی' ماموں کوثر' ماموں صادق' ماموں سمیع اور محلے کے بہت سارے احباب شامل ہوئے۔فٹ بال میچ کھیلا گیا۔بچوں کو بھی ٹیموں میں شامل کیا گیا۔میں ابا جی کی ٹیم میں تھا۔مجھے ابھی کھیلنا تو آتا نہیں آتا تھا' پھر بڑوں کے سامنے ویسے بھی کیا کھیل پاتا۔اس کے باوجود ابا جی باآواز بلند ''شاباش۔۔۔حیدر شاباش۔۔۔'' کہہ کر میری ہمت بندھاتے رہے۔کک وہ خود مارتے اور مجھے شاباش دیتے جاتے۔اسی دوران مجھے پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔میں گراؤنڈ سے باہر کسی مناسب جگہ پر پیشاب کر رہا تھا۔تب بھی ابا جی کی آواز آئی:''شاباش۔۔حیدر شاباش'' یہ ایسی سچویشن تھی کہ دونوں ٹیمیں دیر تک ہنستی رہیں۔

آپی مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔میرے بعد پھر ایک بہن (زبیدہ) پیدا ہوئی۔یوں میں ابتدائی بچپن میں دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔(ویسے ہم پانچ بھائی اور پانچ بہنیں' کُل دس بہن بھائی تھے۔ایک بہن شمسہ فوت ہوگئی تھی) محلے میں بچیوں کی تعداد زیادہ تھی۔چنانچہ میرے بچپن کی ابتدائی گیمز لڑکوں والی کم اور لڑکیوں والی زیادہ تھیں۔رحیم یار خاں کے ماحول میں تب یہ گیمز مقبول تھیں۔''کوکلا چھپا کے جمعرات آئی اے''۔''مائی نی مائی تنور تپیا کے نائیں؟''۔''ککلی کلیر دی'' اور ''لکن میٹی''۔

ذرا بڑے ہوئے تو بچیوں کی گیمز کی جگہ بچوں کی گیمز کا پتہ چلا۔''پٹھو گرم''۔''چکّر بتی''۔''میر و ڈبہ'' اور ''گلّی ڈنڈا''۔۔۔''چکر بتی'' اور ''میرو ڈبہ'' ملتی جلتی گیمز تھیں۔آجکل مغرب میں جو ''بیس بال'' گیم مقبول ہے' اسے ''چکر بتی'' اور ''میرو ڈبہ'' کی بدلی ہوئی صورت سمجھیں۔''پٹھو گرم'' میں نے بہت کھیلا لیکن سب سے زیادہ مزہ ''گلی ڈنڈا'' کے کھیل میں آیا۔ایک بار ہم سارے عزیزوں نے یہاں

جرمنی کے ایک پارک میں ''کوکلا'' کھیلا تو بہت مزہ آیا۔بعد میں ''گلی ڈنڈا'' کھیلنے کا طے کیا تھا لیکن ابھی تک پروگرام نہیں بن سکا۔

جب ہم لوگ خانپور شفٹ ہوئے تب بابا جی نے مجھے پہلوانی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔پہلوان تو میں کیا بنتا البتہ کبڈی کے دو تین داؤ بابا جی سے ضرور سیکھ لئے۔لیکن مجھے یہ کھیل اچھا نہیں لگا۔سچی بات یہ ہے کہ میں جسمانی لڑائی لڑنے کا اہل ہی نہیں ہوں ذہنی لڑائی اور ادب کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ذہنی لڑائی لڑنے میں مجھے ہمیشہ مزہ آیا ہے۔اسی لئے ادبی پنگوں میں الجھا رہتا ہوں۔

میرے نزدیک ادبی پنگے تہذیب کے دائرے کے اندر ہوتے ہیں۔بعض ادیبوں؟ میں جو گمنام ''گشتی مراسلہ بازی'' کی ''خوبی'' پائی جاتی ہے وہ ادب کے دائرے سے ہی نہیں ''ادنیٰ درجہ کی تہذیب'' سے بھی گری ہوئی حرکت ہے۔ایسے لوگ نہ ادیب ہیں نہ ادب سے ان کا کوئی جائز تعلق ہے۔یہ صرف جعلی اور چور قسم کے لوگ ہیں جو ادب کی دنیا میں گھُس آئے ہیں اور اپنے طرزِ عمل سے ادب میں ''طوائف الملوکی'' پیدا کر رہے ہیں۔سو ایسے لوگوں کو میں اپنا حریف ہی نہیں سمجھتا۔ہاں ادب اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر ادبی پنگا کرنا ایک اور چیز ہے اور ایسے تمام ذہین ادیب دوستوں سے پنگا کرنے میں بھی مزہ آتا ہے۔

پنگوں کے لفظ سے ''پِینگ'' یاد آ گئی۔درختوں پر ''پینگ'' (جھولا) ڈال کر پینگ چڑھانے کا بھی ایک وقت تک شوق رہا لیکن ایک گیم ایسی ہے جو بچپن سے لے کر جوانی تک' شادی کے بعد بھی دیر تک کھیلی ہے۔یہ گیم ''اشٹاپُو'' ہے۔چھ خانے بنا کر' ایک ٹھیکری کے ساتھ وہ خانے ایک ٹانگ کے بَل پر پُگانے ہوتے تھے۔دو اور گیمز بھی یاد آ گئیں۔۔''ماماں جمال خاں'' اور ''ہرا سمندر''۔۔۔یہ بھی بچپن کے مزیدار کھیل تھے۔

اِن ڈور گیمز میں ''کیرم'' بھی تھوڑا سا کھیلا ہوں لیکن ''لوڈو''۔''بارہ ٹہنی'' اور ''نو ٹہنی'' (جسے ہماری سرائیکی میں ''نَوں تَرِین'' کہتے ہیں) میری پسندیدہ گیمز رہی ہیں۔اب بھی کبھی کبھار کھیل لیتا ہوں۔''کانچ کی گولیاں''۔''اخروٹ'' اور ''تاش کے پتے'' ان تین گیمز سے بچپن میں ہی اتنا ڈرا دیا گیا تھا کہ یہ بہت بُری گیمز لگتی تھیں۔''بہت ہی بُرے بچے ایسی گیمز کھیلتے ہیں''۔۔۔۔کانچ کی گولیاں اور اخروٹ تو کبھی نہیں کھیلا البتہ ایک بار چھوٹے بھائی اکبر نے تاش کے پتے کھیلنے کے گُر سکھا دیئے۔دو تین برس یہ گیم خوب کھیلی لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ یہ بہت ہی واہیات گیم ہے۔اس میں

ہارنے والا جیتنے کی اُمید لئے کھیلنے پر تُلا رہتا ہے اور جیتنے والا جیت کے نشے میں مزید کھیلتا چلا جاتا ہے۔یوں ساری ساری رات اس کھیل میں گزر جاتی ہے۔ مجھے لگا کہ یہ گیم وقت کا ضیاع ہے۔ چنانچہ پھر طبیعت خود ہی اس سے اُچاٹ ہوگئی اور اب میرے سامنے اس کھیل کی رونق بھی لگی ہوئی ہو تب بھی کھیلنے کو جی نہیں کرتا۔

لڑکپن کا ایک کھیل ۔۔۔۔ جسے میں لکھنے سے پہلے ہچکچایا ہوں اور اب لکھنے لگا ہوں تو میرے چہرے پر خفیف سی شرمندگی والی مسکراہٹ ہے۔ میں نے اپنی بہنوں کے ساتھ مل کر گڈی' گڈے کے بیاہ کا کھیل بھی بہت کھیلا ہے۔اس میں بہنوں کی سہیلیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔مہندی کی رسم سے لے کر رخصتی تک کی تقریب کی پوری پوری نقل کرتے۔

ایک بار میں رحیم یار خاں گیا۔اپنے پرانے محلے میں گیا تو گلی وہی تھی لیکن گلی کے بیشتر مکان پختہ' قد آور اور خوبصورت بن چکے تھے جو مکینوں کی خوشحالی کو ظاہر کر رہے تھے۔ بُوا زیبُو کا گھر البتہ ویسے کا ویسا ہی کچا کوٹھا اور جھونپڑی نما تھا۔ مجھے اس گھر کو جوں کا توں دیکھ کر اس گھر سے جُڑی ہوئی ساری یادیں مسکراتی' گاتی اور اچھلتی' کودتی دکھائی دینے لگیں۔ ہر منظر' ہر یاد' اس گھر کی چیزوں سے دِکھنے لگی تو میں اپنی خوشی کو نہ چھپا سکا اور بے اختیارانہ میں نے کہہ دیا کہ اس گھر کو جوں کا توں دیکھ کر مجھے بیحد خوشی ہوئی ہے۔تب بوا زیبو کی بڑی بہو نے دُکھی لہجے میں کہا: اگر اس گھر کو ایسے دیکھ کر آپ خوش ہوئے ہیں تو ہمیں بھی خوشی ہے ورنہ ہم تو یہی سوچتے رہتے ہیں کہ کب حالات بہتر ہوں اور گھر کو پکا کرا لیں۔بُوا زیبو کی بہو کا وہ دُکھی لہجہ مجھے ابھی تک شرمندہ کرتا رہتا ہے۔

بالکل ابتدائی بچپن میں' دوسری اور تیسری جماعت کے دورانیہ میں ہمارے دوستوں کا ایک حلقہ سا بن گیا تھا۔اس میں اکرم' غوری' افضل' نظام دین اور امداد حسین کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں۔لیکن خانپور آنے کے بعد پھر ان میں سے کسی دوست کا کوئی اتہ پتہ نہ چل سکا۔میرے ذہن سے باقی چہرے تو دھندلا گئے لیکن اکرم کا چہرہ ہمیشہ واضح رہا۔لگ بھگ بیس' بائیس سال کے بعد کی بات ہے۔تب ہماری شوگر مل کی حبیب بنک برانچ کے مینیجر ظفر اقبال ماچے توڑ تھے۔ایک دن انہوں نے مجھے کہا کہ رحیم یار خاں سے ایک نئے آفیسر مرزا افضل بیگ آئے ہیں۔ایک دفعہ دورانِ گفتگو آپ کا ذکر آیا تو انہوں نے اپنے بچپن کے ابتدائی دوستوں کے گروپ میں حیدر نامی دوست کا ذکر کیا جو یکا یک لاپتہ ہوگیا تھا۔ مجھے یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی۔

افضل سے ملاقات ہوئی' کچھ یاد نہیں آیا۔ چہرے پہچان میں نہیں آئے۔البتہ واقعات کے بیان میں ہم آہنگی تھی۔آخر افضل ایک دن اُس زمانے کی ایک گروپ تصویر لے کر آیا۔ میں نے اکرم اور غوری کو فوراً پہچان لیا۔تب افضل نے بتایا کہ جسے آپ اکرم کہہ رہے ہیں' یہ میں ہوں۔اس سے میں نے اندازہ کیا کہ نام کا ادل بدل بے شک ہوا لیکن میرا ایک اچھا دوست یہی تھا۔

''لیکن یہ (اکرم یا افضل جو بھی ہے) تو بچپن میں بہت دُبلا پتلا اور لمبے قد کا تھا؟''

میرے اس تذبذب پر افضل نے بتایا کہ ''دسویں جماعت کے بعد اس کا قد بڑھنا بند ہوگیا تھا''۔

پھر میں نے اکرم' غوری اور امداد کے بارے میں پوچھا تو افضل نے صرف غوری کے بارے میں بتایا کہ اچھی پوزیشن میں ہے۔اکرم کے بارے میں لہجہ درست نہ تھا اور امداد حسین (جو خوشخط تختی لکھنے کے باعث کلاس میں مشہور تھا) کے بارے میں اتنا بتایا کہ وہ کاتب بن گیا ہے۔میں اس کے تحقیر آمیز انداز سے یہی گمان کئے رہا کہ افضل کی ان دوستوں کے ساتھ اَن بَن ہوگی اس لئے ان کا ذکر سرسری اور اس انداز میں کر رہا ہے۔میں بچپن کی گمشدہ دوستیوں کے ملنے پر نہ صرف خوش تھا بلکہ خاصا پُر جوش بھی تھا۔لیکن ایک دو دن کے اندر میں نے افضل کے رویے میں سرد مہری سی محسوس کی تو میرا اپنا میٹر گھوم گیا۔وہ خود کو سماجی لحاظ سے افضل سمجھ رہا تھا جبکہ میں فقیری میں بادشاہی اور بادشاہی میں فقیری کرنے والا بندہ ہوں۔چنانچہ پھر میں نے افضل کو ایسے نظر انداز کر دیا کہ شاید وہ خود بھی حیران ہوا ہوگا۔

ایک بار پھر میں رحیم یار خاں گیا تو وہاں ہمارا گھر اپنی اصلی حالت میں موجود ہونے کے باوجود اتنا خستہ اور جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا کہ میں کمروں میں جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ایسے لگتا تھا جیسے کسی وقت بھی سارا گھر گر پڑے گا۔

بوا زیبو کے گھر' افضل سے ملاقات کے تجربہ اور اپنے پرانے گرتے ہوئے گھر کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یادوں کا تعلق گزرے ہوئے واقعات اور مقامات سے منسلک ہونے کے باوجود ہمارے اپنے اندر کی دنیا سے ہوتا ہے۔باہر کی دنیا میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہوتا ہے لیکن ہمارے اندر کی دنیا میں سارے واقعات' سارے مقامات ویسے کے ویسے ہی آباد ہوتے ہیں۔

یہ ہماری یادوں کی دنیا' ہمارے اندر کی دنیا بھی کتنی عجیب ہے!

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔شمارہ: جولائی،اگست ۲۰۰۰ء

علّتیں، علالتیں

ہر انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔مجھ میں بھی بہت سی کمزوریاں ہیں۔کسی زمانے میں غصہ جلد آجاتا تھا لیکن میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں پر بہت جلد اعتبار کر لیتا ہوں۔میں خود اپنے دوستوں کے تئیں جتنا مخلص ہوتا ہوں' ان کے بارے میں بھی ویسا ہی تصوّر کر لیتا ہوں۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب دوست میرے تصور سے کم' بلکہ بہت کم نکلتا ہے تو بجائے اپنے تصور اور اپنے رویے کو غلط سمجھنے کے اپنے دوست کو غلط سمجھ لیتا ہوں۔پوری زندگی اسی طرح گزری ہے اور ابھی بھی میرے رویے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔عزت' شہرت اور دولت کی تمنّا ہر کسی کو ہوتی ہے۔مجھے بھی ہے۔۔لیکن عزتِ نفس کو مجروح کر کے ملنے والی ظاہری عزت ہو' شہرت ہو یا دولت ہو' مجھے کبھی اس کی تمنا نہیں رہی۔

دسویں کے بعد جب میں نے نوکری کر لی' تب میں دعا کیا کرتا تھا کہ الٰہی! بے شک مزدوری ہی کرتا رہوں لیکن مجھے ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کی توفیق ضرور دے۔چلو لوگ یہ تو کہیں گے کہ بے شک مزدور ہے لیکن ایم اے تو کیا ہوا ہے۔۔۔ایم اے پاس مزدور۔۔کیا بات ہے!۔۔۔جب ایم اے کر لیا اور میں مزدور کا مزدور ہی رہ گیا تب میں نے خواہش کی کہ کچھ تو ترّقی کر لوں۔تب ہی مجھے شفٹ کیمسٹ بنا دیا گیا۔یہ آفیسر کیڈر کی جاب تھی۔لیکن میری تنخواہ بہت ہی کم تھی۔وہی مزدور کی حیثیت والی تنخواہ۔۔۔قلیل تنخواہ سے تنگ آکر ایک دن میں نے تمنّا کی کہ بندہ بھلے مزدور ہی ہو لیکن تنخواہ تو اچھی ہو۔یہ تمنّا اب جرمنی میں آکر یوں پوری ہوئی ہے کہ یہاں پھر سے مزدور ہو گیا ہوں لیکن پاکستان کے حساب سے تنخواہ مناسب ہے۔ان سارے تجربوں سے میں نے دو باتیں سمجھی ہیں۔ایک تو یہ کہ خدا سے اگر مانگنا ہے تو تھوڑا نہیں مانگو۔ہوس بھی ٹھیک نہیں ہے لیکن اپنے پیَروں کے برابر چادر ضرور مانگو۔جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی ایک حمد کا شعر یاد آ گیا ہے ؎

اور کچھ بھی مجھے درکار نہیں ہے لیکن میری چادر' میرے پیَروں کے برابر کر دے

دوسری یہ کہ اللہ میاں بھی شاید اس انتظار میں یا تاک میں بیٹھا ہوتا ہے کہ کب یہ تھوڑے کی تمنّا کرے اور اس کی آرزو پوری کر دوں۔اسی لئے اب میں تھوڑے پر راضی نہیں ہوتا۔مثلاً اگر کوئی لاٹری ٹکٹ ۱۰۰ مارک سے ایک ملین مارک انعام تک کا ہے تو میں سب سے بڑا انعام ہی مانگوں گا۔دوسرے نمبر والا بھی نہیں مانگوں گا۔لاٹری نہیں نکلتی نہ نکلے لیکن مانگنا ہے تو سب سے بڑا انعام ہی مانگنا ہے۔ویسے یہ صرف مثال سے واضح کیا ہے وگرنہ میں یہاں لاٹری کے چکر میں نہیں پڑا۔

جسمانی لڑائی میرے بس کا روگ نہیں ہے۔شاید اسی لئے ذہنی لڑائی لڑنے کی قوت مجھ میں زیادہ ہے۔لیکن افسوس ابھی تک مجھے کسی اچھی علمی لڑائی لڑنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔یورپ کی سطح پر ایسے لوگوں نے جن کے بے وزن شعری مجموعے میں نے بے نقاب کرائے' جن کے افسانوں کی چوریاں شواہد کے ساتھ ظاہر کیں' جن کی شعری چوریاں مکمل ثبوت کے ساتھ پیش کیں۔ان لوگوں نے اُن چوریوں اور جعل سازیوں کا جواب دینے کی بجائے میرے خلاف گمنام ''گشتی مراسلہ بازی'' کا نہایت غلیظ سلسلہ شروع کیا۔ظاہر ہے ایسی کسی خاتون یا اس کے اسی نوعیت کے چاہنے والوں سے لڑنا میرے بس کی بات ہی نہیں۔اس نوعیت کی غلیظ لڑائی کے لئے تو انہیں کے قبیلے کے افراد ہی ان سے لڑ سکتے ہیں۔

ادبی چورا چکوں سے ہٹ کر' میں نے ماہیے کی بحث میں تھوڑی سی علمی لڑائی لڑی ہے۔میرے ہتھیار مضبوط دلائل ہوتے ہیں۔لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ہماری علمی' ادبی دنیا میں عام طور پر محض مضبوط دلائل کام نہیں آتے۔ایک مضمون کے جواب میں میرے مدلل جواب کو نظر انداز کر دیا گیا۔لیکن جب میرے احباب میں سے ایک دوست نے مخالفین جیسے انداز میں انہیں جواب دیا تو باوجود اس کے کہ ان کے دلائل مضبوط نہ تھے' یار لوگ اس مضمون کے بعد ٹھنڈے پڑ گئے۔اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وقتی کامیابی کے لئے یہی گُر مناسب ہے۔اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ میں خود اس گُر کو کبھی بھی استعمال نہیں کر سکوں گا۔شروع میں جب کوئی مخالفانہ مضمون آتا تھا تو میں غصے کے ساتھ کانپتا تھا اور جب تک جواب نہ لکھ لیتا تھا مجھے چَین نہیں آتا تھا۔لیکن جب سے میں نے سکہ رائج الوقت کو سمجھ لیا ہے مجھے اب زیادہ غصہ بھی نہیں آتا اور مخالفین کی کسی واقعی اہم بات کا جواب تو ضرور دیتا ہوں مگر ان کی عام اور سطحی باتوں کی اب میں پرواہ بھی نہیں کرتا۔

میں مزاجاً کنجوس نہیں ہوں لیکن اپنی ذات پر خرچ کرنے کے معاملے میں ہمیشہ سے کنجوس ہوں۔مجھے اچھی طرح سے یاد ہے ایف اے کا امتحان دینے کے لئے مجھے خانپور سے رحیم یار خاں جانا

تھا۔ ابا جی مجھے خود لے کر رحیم یار خاں گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے تھوڑی سی رقم دی کہ امتحان کے بعد کچھ کھا پی لینا۔ مجھے امتحان گاہ تک چھوڑ کر ابا جی خانپور واپس چلے گئے۔ امتحان کے بعد میں نے دو آنے کے چنے بھنوائے اور باقی ساری رقم لا کر ابا جی کو دے دی۔ گھر کا خرچ میں نے کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا۔ آج بھی کسی ریستوران میں کھانا کھانے یا کافی پینے کی نوبت آ جائے تو بھلے ادائیگی کوئی اور ہی کرے مجھے فضول خرچی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ میں کنجوسی اور فضول خرچی میں فرق سمجھتا ہوں۔ اس رویے نے مجھے ادبی لحاظ سے ایک فائدہ پہنچایا ہے کہ میں کفایت لفظی سے کام لیتا ہوں۔ یہ بھی میری عادت سی ہے۔ مجھے اس کا اتنا زیادہ اندازہ نہیں تھا۔ بس ایک ہلکا سا احساس تھا کہ جو کچھ کہنا ہے اسے مناسب اور کم سے کم لفظوں میں کہنا چاہئے۔ ایک بار انڈیا سے شاہد ماہلی اور ڈاکٹر وسیم بیگم جشنِ غالب کے سلسلے میں جرمنی آئے تو ڈاکٹر وسیم بیگم نے میرے افسانوں کی ایک خاص بات مجھے یہ بتائی کہ بہت ہی کم سے کم الفاظ میں اپنی بات پوری کر دیتا ہوں۔ یہ بات انہوں نے غالباً اپنے کسی تبصرے میں لکھی بھی تھی۔ تب مجھے خوشی ہوئی کہ میری کفایت شعاری کی کمزوری نے مجھے فائدہ پہنچایا ہے۔

میرے احباب بخوبی جانتے ہیں کہ مجھے ان کی طرف سے ادائیگی کی صورت میں بھی کسی ریستوران میں کھانا پینا اچھا نہیں لگتا۔ جب کہ اپنے گھر پر احباب کی میزبانی سے مجھے ہمیشہ خوشی ہوئی ہے۔ میرے اہلِ خانہ نے بھی مہمان نوازی میں کبھی کوئی کسر نہیں رہنے دی۔ میرے مقامی احباب کے علاوہ، وہ سارے شعراء اور ادباء بھی اس کی تصدیق کریں گے جو میرے ہاں آ چکے ہیں۔

میری بیوی کا خیال ہے کہ میں انتہا پسند ہوں۔ یا تو اتنا میٹھا بن جاؤں گا کہ دوسرا مجھے محبت ہی میں کھا جائے۔ اور یا اتنا کڑوا ہو جاؤں گا کہ کسی کے حلق سے ہی نہیں اتروں گا۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا ادراک ہے۔ میں خود کو بدلنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جو عیب قدرتی طور پر ودیعت کیا گیا ہو وہ ختم نہیں ہو سکتا۔ میرے بیٹوں کا کہنا ہے کہ میں کسی رشتہ دار پر جب بگڑتا ہوں تو حق بجانب ہوتا ہوں۔ کسی سے بہت تنگ آ کر رابطہ منقطع کر لیتا ہوں لیکن جب وہی رشتہ دار آ کر جذباتی انداز میں منانے لگیں تو فوراً مان جاتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی دوست یا عزیز سامنے آ کر رونے لگ جائے اور اپنی غلطی کا اقرار کر لے تو اس کے بعد میرے لئے ناراض رہنا تکبّر کے زمرہ میں آتا ہے۔ کوئی میرے سامنے آ کر رونے لگے تو یہی بات مجھے بیحد خوفزدہ کر دیتی ہے اور پھر میں سب کچھ بھول بھال جاتا ہوں۔ ایک قریبی عزیز تو اتنی دفعہ شرارتیں کر چکے ہیں اور پھر اتنی دفعہ گڑگڑا کر معافیاں مانگ چکے ہیں کہ میرے لئے رشتہ داری ہی عذاب

بنا دی ہے۔ نہ ان سے تعلق جوڑا جا سکتا ہے نہ پوری طرح توڑا جا سکتا ہے۔ ذرا سی طاقت یا موقعہ ملتے ہی وار کر دیں گے اور غبارے میں سے ہوا نکلتے ہی پھر رو رو کر منانا شروع کر دیں گے۔ چونکہ میرے بیٹوں نے ان کے سارے واقعات بچشمِ خود دیکھے ہیں۔ شاید اسی لئے وہ میرے رویے کو میرا عیب کہتے ہیں۔

میری چھوٹی بیٹی مانو کے نزدیک مجھ میں جو عیب ہے وہ ذرا بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ واضح کر دوں کہ میری امی جی نے گھر کے کام کاج میں مَردوں کو زحمت نہیں دی۔ ابا جی ہوں، یا بابا جی، میں یا میرے چھوٹے بھائی، ہم میں سے کسی نے گھر کے اندر کے کام کاج نہیں کئے۔ مثلاً کپڑے یا برتن دھونا، چارپائیاں اُٹھانا، بستر بچھانا، کھانا پکانا وغیرہ۔ مبارکہ سے میری شادی ہوئی تو یہ بھی اپنی پھوپی کے رنگ میں رنگ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گھر کے کام کاج میں بیوی کا ہاتھ نہ بٹانے کی میری عادت مضبوط ہو گئی۔ حالانکہ گھر کے کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ اور تو اور میری بڑی بیٹی رضوانہ بھی ماں جیسی ہی نکلی۔ اس کی شادی ہو گئی تو گھر کے کام کاج کی ذمہ داری مانو پر آن پڑی اور اس نے بڑی چالاکی کے ساتھ گھر کے معمولات کو تبدیل کر دیا۔ چائے بنانے سے لے کر برتن دھونے تک بھائیوں کو بھی کام پر لگا لیا۔ یوں اب میرے تینوں بیٹے ماشاءاللہ گھر کے بیشتر کام کاج کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔ سو جب میں نے مانو سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک میری سب سے بڑی کمزوری کونسی ہے؟ تو اس نے فوراً کہا آپ گھر کے کام کاج بالکل نہیں کرتے۔ بات تو ٹھیک ہے لیکن اب عادت پختہ ہو چکی ہے۔

اس قسم کی عادتوں کو بیماریوں میں شمار کرنا چاہئے کہ ایسی عادت علّت کے زمرہ میں آتی ہے اور علّت و علالت کا قرب ظاہر ہے۔ مجھے بیشتر عادتیں اور بیماریاں والدین سے ملی ہیں۔ میرے ننہال میں شوگر کی بیماری موروثی ہے۔ امی جی کو بھی شوگر کی شکایت تھی اور اسی وجہ سے ان کی وفات ہوئی۔ سو مجھے شوگر کی شکایت ہے۔ اسی طرح ابا جی کو بواسیر کی شکایت تھی۔ ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف بھی تھی۔ مجھے یہ دونوں بیماریاں بھی ایک عرصہ سے لاحق ہیں۔ بس اتنا ہے کہ ابا جی کے مقابلہ میں مجھے ایسے وسائل میسّر ہیں کہ میں آسانی سے انہیں کنٹرول کئے رکھتا ہوں۔ ''پرہیز علاج سے بہتر ہے'' پر ممکنہ حد تک عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی کبھی بد پرہیزی بھی ہو جاتی ہے۔ ویسے جرمنی آنے کے بعد بلڈ پریشر بالکل نارمل ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود وقتاً فوقتاً چیک کرتا رہتا ہوں۔ بواسیر کی جڑیں ختم تو نہیں ہوئیں لیکن یہ بیماری بھی اس حد تک کنٹرول میں آ گئی ہے کہ گویا ہے ہی نہیں۔ اسے خدا کا فضل کہنا چاہئے کہ بیماری ہوتے ہوئے بھی ''نہ ہونے'' جیسی ہے۔

بواسیر کی تکلیف سے یاد آیا اس کا ایک سادہ سا دیسی علاج یہ ہے کہ مولیوں کے بیج لے کر انہیں تھوڑا سا کُوٹ کر دو چمچ صبح، دوپہر، شام پانی کے ساتھ پھانک لینے سے دو ہفتوں میں تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔ آپریشن تو نہیں ہوتا لیکن جلن اور تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ جب میں شوگر مل میں ملازم تھا اس زمانے میں ایک بار میں نے لیبارٹری میں ایک خوراک پھانکی تو ایک دوست نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ساری تفصیل جاننے کے بعد پھر کہنے لگا اگر یہ بیج اس بیماری کے لئے مفید ہیں تو انہیں کُوٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ ثابت بیج بھی تو کھائے جا سکتے ہیں۔ تب میں نے اسے کہا تھا کہ بھائی! یہ مُولی کا بیج ہے اس لئے احتیاط کرنا چاہئے۔ خدانخواستہ پیٹ میں جا کر بیج سے مُولی اُگ آئی تو بواسیر کا مریض بے چارہ بیماری کے بجائے اپنے علاج کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

میں پاکستان میں بھی پانی بہت پیتا تھا اس سے قبض کی شکایت نہیں ہوتی۔ جرمنی آنے کے بعد جب شوگر کی بیماری لگی تب ڈاکٹر کی ہدایت کے پیشِ نظر میں نے پانی پینے کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ چاہے جرمنی کی دسمبر کی یخ سردیاں ہوں، میں اپنے معمول کے مطابق دن میں کم از کم تین جگ پانی کے پی جاتا ہوں۔ کسی شرط کے بغیر پانی کا ایک جگ تو میں آرام سے آدھ، پون گھنٹے میں پی جاتا ہوں۔ پانی زیادہ پینے کے نتیجے میں مجھے بار بار پیشاب کے لئے جانا پڑتا ہے لیکن اپنی صحت کی خاطر اتنا کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ پانی کثرت سے پینے کے باعث مجھے اپنے اندر کی صفائی کی بھی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

بواسیر، بلڈ پریشر اور شوگر کی بیماریاں مجھے اپنے والدین سے ملی ہیں تو میں انہیں اپنی وراثت سمجھتا ہوں۔ ان ساری بیماریوں کے میرے حصے کے دُکھ بھی وہ آپ اُٹھا گئے ہیں کہ تب نہ تو ان کی تشخیص اور بروقت چیک کرنے کی سہولت تھی اور نہ ہی مناسب علاج میّسر تھا۔ اور ان کے حصے کے بروقت تشخیص، بروقت کنٹرول اور مناسب علاج معالجے کے سارے سُکھ مجھے مل گئے ہیں۔ اگرچہ میں نے بغیر چینی کے چائے پینے کی عادت بنا لی ہے لیکن اب ''شوگر فری'' گولیاں عام مل جاتی ہیں۔ اور تو اور ''شوگر فری'' چینی بھی مل جاتی ہے۔ اس سے اپنی مرضی کی مٹھائیاں تیار کرائیں، کیک بنائیں۔ گھر والے عموماً میرے لئے ایسی چیزیں تیار کرتے رہتے ہیں۔ گویا ورثے میں ملی ہوئی یہ بیماریاں تو اچھی بھلی عیّاشی ہیں۔ میرے امی، ابو بھی عجیب تھے۔ بیماریوں کے معاملے میں بھی میرے سُکھ کے لئے، خود ہی سارے دُکھ بھوگ گئے۔

بخار ہونے کی صورت میں مجھے گھبراہٹ تو ہوتی ہے لیکن میں ٹمپریچر کی زیادتی کے باوجود بخار کو

آسانی سے برداشت کر لیتا ہوں۔ بخار کے اختتام پر مجھے عموماً متلی سی ہونے لگتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کچا تھوک مسلسل نکلتا آ رہا ہے۔ مسلسل تھوکنا پڑتا ہے اور مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ امرت دھارا کے استعمال سے اس وحشت سے نجات ملتی ہے۔ ایک عرصہ تک بخار کے ساتھ یہ مصیبت رہی اور میں بخار سے زیادہ بخار کے ختم ہونے سے گھبرایا کرتا تھا۔ خدا کا شکر ہے اب ایک عرصہ سے بخار کے بعد متلی کی مصیبت سے جان چھوٹ گئی ہے۔

۱۹۷۳ء میں خانپور میں قیامت خیز سیلاب آیا تھا۔ تب ہمارا مکان اس سیلاب کی نذر ہو گیا تھا۔ مشرقی جانب کمرے کی دیوار گر چکی تھی۔ خیال تھا کہ اس طرف نئی دیوار اُٹھا کر کام چلا لیں گے۔ لیکن باقی دیواروں کی حالت بھی سیلاب کی مار سے کچھ مخدوش سی لگتی تھی۔ اسی دوران بابا جی ایک کمرے اور برآمدے کے درمیانی دروازے کو اینٹ مار کر نکالنے لگے۔ تب بابا جی کمرے کی طرف تھے۔ ابا جی اور میں برآمدے کی طرف تھے۔ برآمدے کی مشرقی سائڈ والی دیوار سلامت تھی۔ جبکہ کمرے کی مشرقی سائڈ والی دیوار گر چکی تھی۔ میں دروازے کے قریب تھا۔۔۔۔۔ ابا جی تھوڑا سا پیچھے تھے اور بابا جی کو روک رہے تھے کہ غلام حسین! ایسے مت کرنا۔ لیکن بابا جی نے اسی دوران ہی اینٹ سے دروازے کے اوپری حصّہ پر ضرب لگا دی۔ ایک دھماکہ سا ہوا۔ میں پیچھے پلٹا تو ابا جی کو باہر جمپ کرتے دیکھا۔ بابا جی کے بارے میں مجھے ایسے لگا جیسے وہ اندر ملبے کے نیچے آ گئے ہوں۔ ابا جی نے بعد میں بتایا کہ بابا جی نے تو مشرقی جانب چھلانگ لگا لی تھی۔ ابا جی کو ایک بار تو ایسے لگا کہ بیٹا گیا۔ دل میں انّا للہ بھی پڑھ لیا۔ پھر انہوں نے مجھے آواز دی تو میں نے ملبے میں سے کہا کہ میں تو ٹھیک ہوں، بابا جی کا پتہ کریں۔ تب ابا جی کو تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ انہوں نے وہیں سے بتایا کہ بابا جی بھی خیر سے ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس کا تو کچھ پتہ نہیں، لیکن صورتحال یہ تھی کہ برآمدے کی چھت کے ساتھ ساتھ، اس سے منسلکہ کمرے کا بیشتر ملبہ بھی مجھ پر آن گرا تھا۔ لیکن ایسے طریقے سے کہ شہتیروں نے ایک دوسرے کو ٹیک دے کر اوپر آئی ہوئی کڑیوں کو روک رکھا تھا۔ جب سارا ملبہ ہٹا کر مجھے باہر نکالا گیا تو میں خود چل کر ساتھ والے ہمسائے چاچا بگو کے گھر تک گیا۔ میں کہہ رہا تھا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن بابا جی کا کہنا تھا کہ ابھی جسم گرم ہے اس لئے ایسا لگ رہا ہے۔ ابا جی مجھے چارپائی پر لیٹنے کو کہہ رہے تھے۔ جب میں چارپائی پر بیٹھا تو اندر کی ضربوں نے اپنے ''ہونے'' کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ تب مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہوئی۔ اسی دوران دودھ اور دیسی گھی کو ملا کر گرم کر چکے تھے۔ اسے پینے سے کچھ بہتر محسوس ہوا۔ بعد میں ہسپتال بھی گئے لیکن دودھ اور دیسی

گھی والا نسخہ زیادہ کارگر رہا۔

دودھ اور دیسی گھی سے ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔شوگر مل کی ملازمت کے دوران ایک بار رمضان شریف کا مہینہ تھا۔میری ڈیوٹی کا وقت ایسا تھا کہ افطاری ڈیوٹی پر ہی کرنا ہوتی تھی۔سو لیبارٹری میں ہم سارے لوگ افطاری کا انتظام کر لیتے تھے۔لیبارٹری میں نمک بھی اچھی کوالٹی کا ہوتا تھا۔اس دن کسی نے غلطی سے نمک جیسا کوئی اور کیمیکل لا کر رکھ دیا۔مالٹے کاٹ کر ان پر نمک چھڑک دیا گیا۔جب افطار کے وقت سب نے روزہ کھولا تو کھجور کے بعد بیشتر نے مالٹے کی طرف توجہ کی۔اس کے بعد جب مٹھائی اور پکوڑوں کی باری آئی تو دونوں چیزیں ہی پھیکی بلکہ بے ذائقہ لگ رہی تھیں۔جن ایک دو ساتھیوں نے ابھی مالٹے نہیں چکھے تھے'وہ کہہ رہے تھے کہ مٹھائی بھی اچھی ہے اور پکوڑے بھی مزے کے ہیں۔لیکن باقی سارے ساتھیوں کو کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔تب ہمارے چیف صاحب یا لیبارٹری انچارج نے آ کر چیک کیا تو پتہ چلا کہ نمک کا ہم شکل کوئی اور کیمیکل غلطی سے استعمال ہو گیا ہے۔یہ مرکری سے متعلق کوئی کیمیکل تھا۔اب نام یاد نہیں آ رہا۔اس سے مجھے اور تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن ذائقے کا احساس بالکل ختم ہو گیا۔کئی قسم کے دیسی ٹوٹکے کرنے سے غالباً بارہ گھنٹے کے لگ بھگ وقفہ کے بعد اس کیمیکل کا اثر زائل ہوا۔گھریلو ٹوٹکوں میں دودھ گرم کر کے اس میں دیسی گھی ملا کر پینا بھی شامل تھا۔اس تجربے سے مجھے ''ذائقے'' کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ذائقے کا احساس نہ ہو تو لذیذ ترین چیز بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔

شوگر مل اور لیبارٹری سے مہدی حسن یاد آ گئے۔یہ ہمارے لیبارٹری کیمسٹ تھے۔شوگر مل کی سیاست کے حوالے سے ان کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔حیدر آباد دکن سے آنے والے یہ دوست بہت ہی نفیس انسان تھے۔گفتگو کرنے کے بادشاہ تھے۔ادب' سیاست' فلم' مذہب۔۔۔۔کسی موضوع پر بات ہو'عمدہ گفتگو کرتے تھے۔باقی موضوعات پر سب ہی کچھ نہ کچھ معلومات رکھتے تھے لیکن انڈین فلموں کے معاملے میں انہیں اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔تب میں ہی تھا جس کی معلومات پر وہ بھی حیران ہوئے۔

تب ٹی وی چینلز کا موجودہ سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔میں اُس زمانے میں دوسرے رسائل کے ساتھ فلمی رسائل بھی پڑھتا تھا' ویکلی ''مصوّر'' لاہور نے غلام اکبر کی ادارت میں ایک ہنگامہ خیز اور باغیانہ روایت آغاز کیا تھا۔پاکستانی فلموں پر بے لاگ تبصروں کے ساتھ انڈین فلموں کی کہانیوں اور ان کے بارے میں معلومات شائع کرنے کا سلسلہ ''مصور'' میں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔تب کہانی چوروں کو بے نقاب کیا جاتا تھا(افسوس کہ بعد میں کہانی چوروں نے مل کر غلام اکبر کو ''مصوّر'' کی ادارت ہی سے فارغ

کرا دیا)یوں مجھے بہت سی فلموں کی کہانیاں اور ڈائیلاگ تک یاد ہو گئے تھے۔گانوں سے ریڈیو کے ذریعے اتنا رابطہ تھا کہ گانے کے بول کے ساتھ گلوکار کا نام' فلم کا نام' گیت کار کا نام'اور موسیقار کا نام بھی یاد ہوتا تھا۔اب ایک طرف میری معلومات ایسی تھی کہ دورانِ گفتگو مہدی حسن بھی حیران ہو جاتے دوسری طرف میں یہ بھی کہتا تھا کہ میں نے کبھی کوئی فلم نہیں دیکھی۔مہدی حسن میری یہ بات نہیں مانتے تھے اور اندر کی بات میں نے انہیں بتائی نہیں تھی۔خیر ۔۔۔یہ بات یونہی طویل ہوئی جا رہی ہے۔اصل میں مجھے یہ ذکر کرنا تھا کہ مہدی حسن چائے پینے کے معاملے میں بہت نفاست دکھاتے تھے۔لیبارٹری میں چائے بنائی جاتی'ان کی وجہ سے چینی بہت ہی کم ڈالی جاتی۔اس کے باوجود وہ ہمیشہ کہتے کہ یار! چینی زیادہ ہے۔

ایک بار میں نے اپنے ساتھی لال دین سے کہا کہ آج چائے میں بناؤں گا۔ساتھ ہی اسے بتا دیا کہ آج چینی بالکل نہیں ڈالیں گے۔چنانچہ بغیر چینی کے چائے تیار کی گئی۔میں نے خود مہدی حسن کو چائے پیش کی اور کہا کہ امید ہے آج آپ کو چینی مناسب لگے گی۔مہدی حسن نے چائے کی ایک چُسکی لی اور کہنے لگے پہلے سے بہت بہتر ہے لیکن میرے حساب سے ابھی بھی تھوڑی سی زیادہ ہے۔

ابے سالے! تیری افسری کی بھی اور تیری بھی ایسی کی تیسی۔۔۔۔اس سے کم اور کیا ہو گی؟

مہدی حسن میرے اندازِ گفتگو سے سٹپٹا گئے کیونکہ میں کبھی ایسے نہیں بولتا۔جب انہیں چائے میں چینی کی ساری حقیقت بتائی تو نہ صرف بے حد شرمندہ ہوئے بلکہ اس کے بعد ہم کچھ اور قریبی دوست ہو گئے۔یہ دوستی وقت اچھا گزارنے والی تھی۔باہمی اعتماد والی نہیں تھی۔اور اب میں خود بغیر چینی والی یا شوگر فری گولیوں والی چائے پیتا ہوں تو کبھی کبھی مہدی حسن یاد آ جاتے ہیں۔

شوگر مل کے ماحول میں صرف مہدی حسن ہی ایسے تھے جن سے مختلف موضوعات پر نہ صرف گفتگو ہو سکتی تھی بلکہ اس گفتگو کا مزہ بھی آتا تھا۔ان کے بعد اظہر ادیب سے رابطہ ہوا۔وہ اچھے دوست تھے لیکن ان کے ساتھ ایک حد تک ادبی یا پھر ذاتی باتیں کی جا سکتی تھیں۔یوں مہدی حسن کی اہمیت اپنی جگہ رہی۔پھر وہ شوگر مل کی نوکری چھوڑ گئے۔اپنے رشتہ داروں میں کہیں شادی کر کے سسرال کی زمینوں کی دیکھ بھال کرنے لگے۔اسی دوران ایک دن اچانک شوگر مل میں آ گئے۔انہیں دیکھ کر'ان سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔میں ان کے ساتھ بیٹھنا اور گپ شپ کرنا چاہتا تھا۔لیکن مجھے اُس وقت ہلکا سا شاک لگا جب پتہ چلا کہ انہیں پٹرول کی ضرورت ہے۔ان دنوں پٹرول کی فراہمی کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔سو مجھے کہا گیا کہ خانپور میں پٹرول نہیں مل رہا' میں جا کر ظاہر پیر سے پٹرول کا ایک کنستر لا دوں۔ظاہر پیر کو سڑکوں کا

جنکشن سمجھیں۔ یہ خانپور سے دس پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں پٹرول لینے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو مہدی حسن کے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا مہدی حسن سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔

۱۹۹۲ء میں جب میں ایبٹ آباد میں تھا' ایک بار اسلام آباد گیا۔ وہاں انڈین سفارت خانے سے انڈیا کا ویزہ لینے کے لئے لائن میں کھڑا تھا۔ ایک موٹے سے شخص نے آ کر مجھے مخاطب کیا: ''آپ حیدر قریشی ہی ہیں نا؟''

''جی'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''مجھے پہچانا؟'' اُس شخص نے پھر پوچھا۔ میں نے ایک ثانیے کے لئے اسے غور سے دیکھا اور پھر 'مہدی حسن' کا نعرہ لگا کر ان سے لپٹ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مہدی حسن کبھی اتنے موٹے ہو سکتے ہیں۔ جیسے ششی کپور کی ابتدائی فلموں والی جسامت اور آج کی ضخامت میں فرق ہے بالکل ویسا ہی فرق پہلے والے اور اب والے مہدی حسن میں تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مہدی حسن اتنے موٹے ہو گئے ہیں۔

سفارت خانے سے فارغ ہوئے تو مجھے ویزہ مل گیا تھا اور مہدی حسن کو انکار کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ میرا کوئی رشتہ دار انڈیا میں نہ تھا جبکہ مہدی حسن کی آبائی حویلی بھی وہاں تھی اور بہت سارے رشتہ دار حیدر آباد اور انڈیا کے دوسرے شہروں میں مقیم تھے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ مہدی حسن کو میں نے ایبٹ آباد ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اپنی بہن یا کزن کو کوئی ضروری بات بتانا تھی۔ اس لئے طے پایا کہ راولپنڈی کے اس ویگن اڈہ پر ملیں گے جہاں سے ایبٹ آباد کے لئے ویگنیں جاتی ہیں۔ وقتِ مقررہ تک مہدی حسن وہاں نہیں پہنچے تو میں نے مزید انتظار نہیں کیا اور ایبٹ آباد چلا گیا۔ یوں ہماری ملاقات ادھوری رہ گئی۔ مجھے مہدی حسن سے ملاقات نہ ہو سکنے کا آج تک افسوس ہے۔ لیکن کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ راولپنڈی جیسے شہر میں جہاں بسوں اور ویگنوں سے سفر کرنے والوں کو دیر سویر ہو سکتی ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں مقررہ وقت کے بعد بھی ان کا انتظار کر لیتا۔ اور پھر مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے میں نے مہدی حسن کا مزید انتظار نہ کر کے ان سے پٹرول منگانے والی زیادتی کا بدلہ لے لیا تھا۔ شعوری طور پر نہ سہی' لاشعوری طور پر بھی تو ہم سے کمینگیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔

اپنی خامیاں آپ گنوانا مشکل کام ہے۔ اپنے آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم میں کیا کمزوری ہے۔ جب تک پتہ چلتا ہے تب تک عادتیں اتنی پختہ ہو چکی ہوتی ہیں کہ ان سے نجات حاصل کرنا مشکل

ہو جاتا ہے۔ مجھے یہی صورت حال درپیش ہے۔ اس کے باوجود اپنی بیوی سے اور اپنے بچوں سے پوچھنے کے بعد اپنی جو کمزوریاں سمجھ پایا ہوں' لکھ دی ہیں۔

مجھے اونچائی سے اور دریا' یا سمندر کے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ حالانکہ پانی زندگی کی بنیاد ہے اور بلندیوں کے حصول کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ پہاڑ کی چوٹی تو دور کی بات ہے' مجھے دس بارہ منزلہ عمارتوں سے نیچے جھانکتے ہوئے بھی وحشت ہوتی ہے۔ دراصل میں بچپن سے بہت ڈرپوک ہوں۔ ''اندھیرے کی ماں'' سے ایک عرصہ تک بہت ڈر لگتا رہا۔ امی' ابو مجھے کسی شرارت سے روکنے کے لئے عموماً آخری حربے کے طور پر ''اندھیرے کی ماں آ جائے گی'' کہہ کر ڈراتے اور میں شرارت سے باز آ جاتا۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا کہ ''اندھیرے کی ماں'' تو بڑی کام کی چیز ہے۔ انسان کی پردہ پوشی جیسا نیک کام کرتی ہے۔

دوپہر کے وقت بھی اگر کبھی امی مجھے کہتیں کہ گھر کی چھت پر پڑی کوئی چیز لے آؤ تو میں بھری دوپہر میں بھی چھت پر جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ کسی چھوٹے بھائی کو ساتھ لے لیتا۔ گھر پر کوئی اور نہ ہوتا تو ڈرتے ڈرتے چھت پر جاتا اور وہاں سے آواز دیتا رہتا۔

''امی! چھاج نہیں مل رہا۔ کس طرف ہے؟۔۔۔۔۔۔''

امی جی وہیں سے ہنس کر آواز دیتیں:

''تُو بھی میری طرح ڈرپوک ہے۔ دھیان سے دیکھ چھت پر ہی ہے''

اور میں جیسے تیسے چھاج (یا جو کچھ بھی منگایا جاتا) لے کر چھت کی سیڑھیوں سے جلدی جلدی اترنے لگتا اور اترتے اترتے بھی کوئی نہ کوئی بات کرتا جاتا۔

تو صاحب! اندھیرا ہو یا اجالا۔۔۔۔ میں تنہائی سے ڈرتا اور گھبراتا تھا۔ ایک عمر کے بعد معلوم ہوا کہ گیان کی روشنی اسی تنہائی سے نصیب ہوتی ہے۔ پُر خوف اور گناہ کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد یہ منزل نصیب ہوتی ہے۔ میں بھی گیان کی منزل کا راہی ہوں لیکن ابھی رستے میں ہوں اور شاید جان بُوجھ کر رستے میں ہوں کہ رستوں کا' سفر کا اور سفر کی چھوٹی چھوٹی منزلوں کا اپنا مزہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۰ء

اَن دیکھے، پر جانے دوست

میری ادبی زندگی میں بہت سے دوست آئے۔ کچھ نے چند قدم تک ساتھ نبھایا۔ بعض سے لمبی دوستی نبھی۔ کسی سے نباہ میں میرا سلیقہ کام آیا تو کسی سے نباہ میں اُس کی اپنی محبت کارگر رہی۔ ادبی دوستوں میں اَن دیکھے دوستوں سے تعلق کی نوعیت عام دوستیوں سے خاصی مختلف ہو جاتی ہے۔ میرے بہت سے اَن دیکھے دوست ہیں لیکن یہ میرے لئے اور میں ان کے لئے انجانے نہیں۔ ایسے دوستوں کی فہرست خاصی طویل ہے تاہم ان میں سے بعض بہت زیادہ اہم دوستوں کا ذکر یہاں کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ایسے دوستوں میں سب سے پہلے نمبر پر مشہور جاسوسی ناول نگار ابنِ صفی کا نام آتا ہے۔ میں نے غالباً ساتویں جماعت سے انہیں پڑھنا شروع کیا تھا۔ شروع میں جاسوسی سیریز کے ناول پڑھے۔ ان میں کرنل فریدی، کیپٹن حمید اور قاسم کے کردار مجھے بے حد دلچسپ لگے۔ پھر عمران سیریز کے ناول پڑھے تو ان کا ایک الگ ذائقہ محسوس ہوا۔ میں ابنِ صفی کے ناول اپنے شہر کی ''تھری اسٹار لائبریری'' سے کرائے پر لاتا تھا اور دن میں بعض اوقات دو دو ناول آرام سے پڑھ جاتا تھا۔ خانپور میں میرے گھر سے یہ لائبریری تقریباً دس، پندرہ منٹ کے پیدل فاصلے پر تھی۔ میں ناول لیتے ہی پڑھنا شروع کر دیتا تھا اور گھر پہنچنے تک اس کا آدھے سے کچھ کم حصہ پڑھ چکا ہوتا تھا۔ رستے میں کبھی کبھار کسی سائیکل والے سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ جاتی، گھر پر بھی ناول ختم کرنے کے بعد سانس لیتا تھا۔

عمران سیریز میں ایکسٹو کی ٹیم کے متوازی مجھے ٹی۔ تھری بی یعنی تھریسیا کا کردار بہت اچھا لگتا تھا۔ سنگ ہی کے کردار کی اپنی ایک الگ آن بان تھی۔ میں آج بھی اگر کبھی بہت بوریت محسوس کروں اور کسی اچھی ادبی کتاب سے بھی بوریت دور نہ ہو تو ابنِ صفی کا کوئی ناول پڑھ لیتا ہوں۔ ابنِ صفی سے پہلے مجھے کسی مصنف نے اس طرح سے نہیں جکڑا تھا۔ سو ان سے غائبانہ طور پر محبت کا ایک تعلق بن گیا۔ اسی لئے مجھے وہ ہمیشہ اپنے دوست محسوس ہوئے۔ ایسے دوست جو دوست ہونے کے باوجود رہنمائی

کا کام بھی خاموشی سے کرتے رہے۔ اگرچہ میری تحریریں، اُن کے موضوعات اور میدان سے بالکل الگ ہیں لیکن مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ میری نثر پر کہیں نہ کہیں ان کے اسلوب کا کوئی نہ کوئی اثر ضرور ہے۔ ہماری ادبی دنیا نے ابنِ صفی کے ساتھ انصاف یا ناانصافی تو کیا کرنا تھی انہیں ادب کے زمرہ سے ہی خارج رکھا ہے جو ادبی جرم سے کم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابنِ صفی سے میرے جیسے سینکڑوں ادیبوں نے پڑھنے اور لکھنے کا سلیقہ سیکھا ہے۔ اور ہماری ادبی دنیا کی کم ظرفی ہے کہ ابنِ صفی سے سیکھنے والوں نے بھی انہیں نظر انداز کیا ہے۔ میری دلی آرزو تھی کہ مجھے ان کے ناولوں کا مکمل سیٹ مل جائے تو میں مربوط طریقے سے ان کے فن پر تحقیقی اور تنقیدی کام کروں۔ حال ہی میں مجھے انگلینڈ جانے کا موقعہ ملا تو وہاں ابنِ صفی کی ایک عزیزہ اور لندن کی معروف افسانہ نگار اور کالم نگار صفیہ صدیقی تقریب کے دوران مجھے ملنے آئیں۔ مجھے ان سے مل کر دوہری خوشی ہوئی ایک تو اس لئے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پڑھتے رہتے تھے۔ دوسرے اس لئے کہ ان سے ملاقات کے دوران ابنِ صفی کا مکمل سیٹ دستیاب ہونے کی امید بن گئی ہے۔ کراچی میں مقیم ابنِ صفی کے صاحبزادے ڈاکٹر ایثار احمد صفی سے میرا رابطہ انہوں نے کرادیا ہے۔ سو جو دوست ادبی مباحث میں مجھ سے تنگ یا خفا ہیں، ان کے لئے خوشخبری ہے کہ میں ابنِ صفی کا مکمل سیٹ ملنے کے بعد شاید سال بھر تک بالکل اسی پراجیکٹ کا ہو جاؤں گا۔ سو اس عرصہ میں مذکورہ سارے دوست میری واپسی تک اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ سکتے ہیں۔ خدا کرے مجھے یہ کام کرنے کی توفیق مل جائے!

میں نے بے روزگاری کے ایام میں تین ماہ کے لئے گوجرانوالہ میں ملازمت کی تھی۔ تب تو امین خیال جی سے رابطہ نہیں ہوا تھا لیکن جیسے ہی ماہیے کی تحریک شروع ہوئی، میرا امین خیال جی سے رابطہ ہو گیا۔ اس رابطے میں ماہیے کی محبت شامل تھی۔ امین خیال جی اس لئے خوش تھے کہ پنجابی کی لوک شاعری اردو میں مقبول ہو رہی ہے۔ میں اس لئے خوش تھا کہ پنجابی کے ایک اہم اور معروف شاعر کی شمولیت سے اردو ماہیے کی اس تحریک کو تقویت ملے گی۔ بے شک ماہیے کو تقویت ملی لیکن ہماری دوستی بہت جلد اس سطح سے اونچی چلی گئی۔ جب امین خیال جی نے پنجابی اخبار ''بھنگڑا'' کا اردو ماہیا نمبر شائع کیا تب ان کے شاگرد اور پرانے دوست غلام مصطفیٰ بسملؔ نہ صرف ان کے ساتھ تھے بلکہ ان کا دَم بھرتے تھے۔ انہوں نے ماہیا نمبر میں اختلافی اداریہ لکھا۔ میں نے بڑی نیازمندی کے ساتھ اس کے جواب میں اپنا موقف دلائل کے ساتھ واضح کرتے ہوئے فیصلہ انہیں پر چھوڑ دیا۔ امین خیال جی نے وہ خط من و عن شائع

کردیا۔اس پر بسمل صاحب نے جواب دینے کی بجائے امین خیال جی سے لاتعلقی اختیار کرلی۔نہ استاد کی استادی کا خیال کیا' نہ پرانی دوستی کا پاس کیا اور نہ ہی علمی سطح پر دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی ہمت کی۔تب امین خیال جی بہت دکھی ہوئے تھے۔اگرچہ بسمل صاحب نے پھر خود پسِ پردہ رہ کر مختلف لوگوں سے مجھ پر مختلف قسم کے حملے کرائے لیکن دلائل کی سطح پر ان کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے بسمل صاحب کے اپنے اداریے کا ہو چکا تھا۔تاہم مجھے ابھی تک یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ میری وجہ سے امین خیال جی اپنے ایک عزیز شاگرد اور دوست کو گنوا بیٹھے ہیں۔دراصل امین خیال جی دوستی نبھانے والے دوست ہیں اسی لئے مجھے ان کے نقصان کا احساس ابھی تک تنگ کرتا رہتا ہے۔دوستی میں وہ اتنے بے لوث ہیں کہ فی زمانہ انسان کو اتنا بے لوث نہیں ہونا چاہئے۔

میری تحریروں کو امین خیال جی نہ صرف محبت کے ساتھ پڑھتے ہیں بلکہ میری تحریروں کے تراشے سنبھال سنبھال کر انہوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔صرف میرے ہی نہیں' دوسرے دوستوں کے تئیں بھی ان کا رویہ ایسا ہی ہے۔میری ''کھٹی میٹھی یادیں'' قسط وار چھپ رہی ہیں اور وہ ہر قسط پر مجھے اتنی داد دیتے ہیں کہ مجھے نئی قسط لکھنے کا حوصلہ مل جاتا ہے۔میرے سفرنامہ ''سوئے حجاز'' کی ایک قسط سہ ماہی ''شعرو سخن'' مانسہرہ میں چھپی تو انہوں نے مجھے ''مستجاب الدعوات'' سمجھ لیا اور بعض مسائل کے حل کے لئے دعا کرنے کی تاکید کردی۔تب میں نے انہیں لکھا کہ میں کسی ریاکارانہ انکساری کے بغیر لکھ رہا ہوں کہ میں بے حد گنہگار انسان ہوں۔اس کے باوجود خدا کی منّت کروں گا کہ آپ کی مشکلات دور کردے۔خدا جانے پھر ان کی مشکلات دور ہوئیں یا اور بڑھ گئیں۔

امین خیال جی سے ٹیلی فون پر بھی کبھی کبھی بات ہو جاتی ہے۔خطوط کے ذریعے تو رابطہ مستقل طور پر قائم ہے۔ان کے خط اتنے محبت بھرے ہوتے ہیں کہ بعض اوقات میں سچ مچ آبدیدہ ہو جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ یہ میری کونسی نیکی ہے جس کے اجر کے طور پر خدا نے مجھے ایسی بے لوث اور بے غرض دوستی عطا کردی ہے۔امین خیال جی نے مجھے اپنی ذات کے لئے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی لیکن اپنے دوسرے دوستوں کے لئے وہ ہمیشہ کہتے رہتے ہیں۔دوستوں کی کامیابیوں کے لئے وہ کوشش کرتے رہتے ہیں اور ان کامیابیوں پر پھر خود ہی خوش ہوتے ہیں۔

تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے ان کے ایک دوست نے ایک اور دوست سے ان کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ یہ امین خیال ہے' میرا دوست' جس کے پچھلے پینتیس سال سے میرے ساتھ دوستانہ تعلقات

ہیں۔اس پر دوسرے دوست نے کہا کہ کوئی اور تعارف؟۔۔۔اس پر امین خیال جی کے دوست نے کہا: کیا پینتیس سالہ دوستی سے بڑھ کر بھی کوئی تعارف ہو سکتا ہے!

میری ادبی ترقی جتنی بھی ہے اور جیسی بھی ہے یہ میرے دوستوں میں سے سب سے زیادہ امین خیال جی کی محبت' خلوص اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

نذیر فتح پوری ''اسباق'' پُونہ کے مدیر ہیں۔ان سے براہِ راست قلمی رابطہ تو بہت بعد میں ہوا ہمارے درمیان محبت کا پہلا غیر ارادی اور غیر مفاداتی رابطہ تب ہوا جب انہوں نے ''اسباق'' کا ضخیم اور بڑے سائز کا سالِ اوّلیں نمبر شائع کیا۔یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔اس میں انہوں نے میرا ایک مضمون 'اوراق' لاہور سے لے کر شائع کیا تھا۔''جدید افسانے کا اصل مسئلہ'' کے عنوان سے میرا مضمون دراصل شہزاد منظر کے ایک مضمون کے جواب میں تھا۔اس کے بعد ۱۹۹۲ء میں ان سے رابطہ ہوا۔تب انہوں نے پہلے رابطہ پر ہی نہ صرف ''اسباق'' میں میرا گوشہ چھاپنے کا پروگرام بنا لیا بلکہ انڈیا میں ماہیے کے درست وزن کو رائج کرنے کے لئے میرا ساتھ دیا۔نہ صرف خود ماہیے کہے بلکہ اپنے دوسرے احباب کو بھی اس کے لئے تحریک کی۔اگرچہ انڈیا میں ماہیے کی برسات ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ماہیے کی طرف آمد کے بعد شروع ہوئی تاہم اس برسات کے لئے بخارات نذیر فتح پوری کے ذریعے بننا شروع ہو گئے تھے۔نذیر فتح پوری کی شخصیت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ صرف پرائمری پاس ہیں' اس کے باوجود شعر و ادب کے ساتھ ان کی وابستگی اور ان کی تخلیقی سرگرمیاں حیران کن ہیں۔تعلیم کسی تخلیق کار کو پالش تو کرسکتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تخلیقی صلاحیتیں خدا کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں۔نذیر فتح پوری اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

احمد حسین مجاہد کے ماہیے ''اوراق'' لاہور میں شائع ہوئے تو میں نے ان کی تلاش شروع کی۔ان سے رابطہ ہوا تو بہت ہی محبت کرنے والے انسان لگے۔ان کی آمد سے ماہیے کی تحریک کو عروضی حوالے سے بڑی تقویت ملی۔یار لوگوں کا عام طور پر خیال ہے کہ میں جرمنی میں ہونے کے باعث کوئی بہت مالدار انسان ہوں۔چنانچہ کئی اغراض کے بندے محبت جتاتے ہوئے آئے۔ایسے لجاجت آمیز او رمنت سماجت والے خط لکھے کہ میں ان کی طلب پر شرمندہ ہو گیا اور ان کی تھوڑی سی مدد کردینا ضروری سمجھا۔اُن غرض کے بندوں نے غرض پوری ہونے کے بعد ایسے آنکھیں پھیرلیں کہ میں اُن کے لجاجت سے بھرے خطوط دوبارہ پڑھ کر حیران ہوتا رہا۔ایک بار میرے پاس یہاں چند پاکستانی ڈاک ٹکٹ موجود

تھے۔میں نے ایسے ہی وہ ٹکٹ احمد حسین مجاہد کے خط میں ڈال دیئے۔دراصل انہیں میں وہاں سے پوسٹ کرنے کے لئے اپنے دوسرے خطوط بھیجتا رہتا ہوں۔شاید کچھ ان کا خیال تھا۔جواباً احمد حسین مجاہد کا تھوڑی سی خفگی والا خط آیا کہ میں دوستی میں یہ خطوط پوسٹ کرنا افورڈ کر سکتا ہوں۔ٹکٹ واپس لیجئے اور آئندہ ایسی زیادتی مت کیجئے گا۔

احمد حسین مجاہد کے اس طرزِ عمل نے مجھے ''غرض کے بندوں'' اور محبت کرنے والے دوستوں کے فرق سے آشنا کر دیا وگرنہ میں تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو رہا تھا کہ شاید رابطہ کرنے والے بیشتر لوگ ''اغراض'' کے باعث ہی محبت جتاتے ہیں۔احمد حسین مجاہد ایک معقول سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔بنکنگ کے شعبہ سے وابستہ ہے۔ان کی مصروفیات کا مجھے اندازہ ہے۔اس کے باوجود میں انہیں تھکاتا رہتا ہوں۔ہر رسالے کے ماہیا نمبر میں ان کا براہِ راست یا بالواسطہ اہم کردار شامل رہا ہے۔رسالہ ''گلبن'' کے غزل نمبر کے لئے میرا بہت سارا مطلوبہ میٹر اور اس کے علاوہ بھی بہت سارا اہم میٹر مجھے فراہم کیا۔یہ خاصا محنت طلب کام تھا۔انہوں نے نام کی پرواہ کئے بغیر کام کیا اور نام میرا ہی ہوا۔میری غلطی کہ اپنی بہت زیادہ مصروفیات کے باعث اداریہ میں ان کا شکریہ تک ادا کرنا بھول گیا۔لیکن مجال ہے انہوں نے ہلکا سا شکوہ بھی کیا ہو۔حالانکہ یہ ''شکریہ'' ان کا کم از کم ادبی حق تھا۔

احمد حسین مجاہد ماہیے کے معیار کے سلسلے میں متفکر رہتے ہیں اور مجھے اس سلسلے میں توجہ بھی دلاتے رہتے ہیں۔ان کے ٹکٹ والے تجربے سے ملتا جلتا ایک تجربہ ترنّم ریاض سے رابطے پر پیش آیا۔ان سے رابطہ ان کی ماہیا نگاری کے باعث ہوا۔دہلی میں رہنے والے کسی ماہیا نگار کے ہاں پنجابی مزاج سے لبریز ماہیے ملنا حیران کن بات تھی۔تب ترنّم ریاض نے وضاحت کی کہ وہ اپنے والدین میں سے ایک کی طرف سے لاہوری پنجابی اور ایک کی طرف سے کشمیری ہیں۔تب میری حیرت تو دور ہوگئی لیکن خوشی برقرار رہی۔میں نے انہیں انڈیا کے دوستوں کے لئے اپنی ڈاک آگے پوسٹ کرنے کے لئے بھیجی، ساتھ ہی انہیں لکھا کہ کہ آپ کو جلد ہی ڈاک کے جملہ اخراجات بھیج دوں گا، اس پر ایسا بگڑیں کہ باقاعدہ خفا ہوگئیں اور مجھ سے ''سوری'' کہلوا کر پھر ٹھیک ہوئیں۔تب میں نے اندازہ کیا کہ یہ احمد حسین مجاہد اور ترنّم ریاض کہیں روحانی طور پر بہن بھائی ہیں۔

ترنّم ریاض بہت ہی اچھی خاتون ہیں۔افسانے لکھتی ہیں۔تھوڑی بہت نظمیں بھی لکھی ہیں، لیکن ماہیا نگاری میں تو انہوں نے کمال ہی کر دیا ہے۔میری تحریروں کی اتنی فین ہیں کہ مجھے

''پیر و مُرشد'' کہہ کر شرمندہ کرتی رہتی ہیں۔جب انہوں نے میرے ڈاک کے اخراجات لینے سے بھی انکار کر دیا تب میں نے بہانے سے انہیں کہا کہ ''مجھے دلی میں کوئی ایسا شریف نوجوان ڈھونڈ دیں جو ادب سے شغف بھی رکھتا ہو اور میرے ادب سے متعلق بعض کام بھی وہاں کر دیا کرے۔جس میں کتابوں اور رسالوں کی ڈسپیچنگ بھی شامل ہوگی''۔بی بی نے صاف جواب دیا ''فی الحال دلی میں مجھ سے زیادہ شریف کوئی نہیں ہے۔جب مجھے خود سے زیادہ کوئی شریف مل گیا آپ کو بتا دوں گی''

پروفیسر ریاض دلی کے اقتدار کے کوریڈورز میں اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔لیکن وہ اقتدار کے مقابلہ میں تخلیقی کام کی اہمیت کو نہ صرف مانتے ہیں بلکہ اسی وجہ سے اپنی اہلیہ ترنّم ریاض کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے ہیں۔جب مجھے اپنے طور پر پروفیسر ریاض کی سیاسی اہمیت کا علم ہوا تو میں نے ترنّم ریاض کو لکھا کہ اب تو آپ کو ''بی بی جی!'' لکھنا پڑے گا۔تب جواب آیا مجھے ایسا مت لکھئے گا۔آپ کے ملک کی بی بی (بے نظیر بھٹو) کا یہ حال ہوا ہے کہ وہ وطن واپس جانے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہیں۔سو مجھے میرے وطن میں ہی رہنے دیں۔بی بی جی مت لکھیں۔

''اردو دنیا'' جرمنی کے دوسرے شمارہ (دسمبر ۱۹۹۹ء) میں ترنّم کی ایک تصویر شائع ہوئی۔ رسالے کے ایڈیٹر ارشاد ہاشمی ملے تو ایک دوست کا حال بتانے لگے۔دوست نے رسالہ لیا۔باہر سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔اندر کا صفحہ کھولا اور پھر اسی صفحہ کا ہی ہو رہا۔موصوف بس ترنّم ریاض کی تصویر کو ہی دیکھے جا رہے تھے۔ارشاد ہاشمی انہیں ہوش میں واپس لائے کہ بھائی! رسالہ ابھی آگے بھی ہے۔تب وہ تھوڑا سا خفیف ہوئے اور ورق اُلٹنے لگے۔ویسے تو ''اردو دنیا'' نے بہت اچھی اچھی تصویریں چھاپی ہیں تاہم ترنّم ریاض، فرزانہ خان نیناںؔ، فرحت نواز، کوکب اختر اور ریحانہ قمر کی تصویریں بلا شبہ خواتین کی خوبصورت تصویروں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد بھوپال کی ایک اہم ادبی شخصیت ہیں۔دہلی سے ان کا ایک ادبی رسالہ ''فکر و آگہی'' شائع ہوتا ہے۔جس کے خصوصی نمبروں کی خاص اہمیت بنتی ہے۔میری کتاب ''میری محبتیں'' ان کے ہاتھ لگی اور بے حد پسند آئی۔مجھے ان کا جو توصیفی خط ملا اس نے ان کی حوصلہ افزائی سے شرابور کر دیا۔ بے ساختہ لکھی گئی ایسی چند سطریں جو کئی مضامین پر بھی بھاری ہیں۔صرف پہلی سطر سے ہی ان کی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

''**میری محبتیں** کئی مرتبہ پڑھ چکی ہوں اور یہی حال رہا تو میں اس کی حافظ ضرور ہو جاؤں گی''

ڈاکٹر رضیہ حامد کا ادارتی کام ہو یا تصنیف وترتیب وتدوین کا۔۔۔، وہ سکہ رائج الوقت کی بجائے اپنے اصل موضوع پر سنجیدہ توجہ مرکوز رکھتی ہیں۔انہوں نے اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے محبت میں گندھا ہوا مختصر مگر بھرپور کام کیا ہے۔مجھے لگا کہ میں نے ''میری محبتیں'' میں جو چند چراغ جلائے تھے،ان کے نتیجہ میں حقیقی اور محبت کے رشتوں کے مزید چراغ جلنے شروع ہو گئے ہیں۔آج کے عہدِ ناسپاس میں جب قریبی رشتے ٹوٹ پھوٹ کی تاریکی کا شکار ہو رہے ہیں،ضروری ہے کہ ان رشتوں کی اہمیت کو قلبی حوالوں سے روشن کیا جائے۔

میرے تئیں ڈاکٹر رضیہ حامد بہت زیادہ خلوص اور تعلقِ خاطر رکھتی ہیں۔ان کے شوہر حامد صاحب اور ان کے صاحبزادے عامر میاں سے بھی میرا رابطہ رہتا ہے۔میں اس اخلاص اور محبت کی تفصیل یہاں درج نہیں کر سکتا کہ اس کے لیے تو ایک پورا مضمون درکار ہوگا،تاہم یہ حقیقت ہے ڈاکٹر رضیہ حامد کی حوصلہ افزائی میرے لیے بڑی تقویت کا باعث بنتی رہتی ہے۔اللہ انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

رؤف خیر بہت اچھے دوست ہیں۔ایک بار ان کا خط آیا تو ان سے رابطہ ہوا۔پھر یکا یک رابطہ ٹوٹ گیا۔میں نے کافی انتظار کے بعد دوستانہ خفگی کے ساتھ انہیں خط لکھا۔اس کے جواب میں انہوں نے جو خط لکھا اُس سے مجھے بڑی دلی تقویت ملی۔حالانکہ رؤف خیر نے میری بعض کتابوں کے مطالعہ کے بعد مجھے اپنے خوبصورت تاثرات سے خاصا حوصلہ دیا ہے۔تاہم یہ خط اتنا خوش کرنے والا ہے کہ میں اس کا ایک حصہ یہاں درج کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں سے رؤف خیر کی محبت کے ساتھ بہت ساری دوسری اَن دیکھی ادبی محبتوں کا بھی انکشاف ہو رہا ہے۔خط تاخیر سے لکھنے کے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بیان کیا:

''حکومتِ مغربی بنگال کی دعوت پر کلکتہ گیا جہاں ٹیپو سلطان صدی تقاریب کے سلسلے میں ایک کُل ہند مشاعرہ ۳ رمئی کو منعقد ہوا۔وہیں ماہیا نگاروں سے ملاقاتیں رہیں۔فراغ روہوی،ضمیر یوسف،نسیم فائق،نوشاد مومن،محسن باعشن حسرت وغیرہ وغیرہ سب آپ کے عشق کے گرفتار نکلے یعنے ؎

ہم ہوئے،تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

آپ پر بڑا رشک آتا ہے کہ آپ رہتے کہاں ہیں اور کہاں کہاں اپنے چاہنے والے پیدا کر رکھے ہیں''

ایسی وضاحت کے بعد کون کافر رؤف خیر سے ناراض رہ سکتا تھا۔ویسے میرؔ کا شعر مجھ پر فِٹ

کر کے رؤف خیر نے کچھ اچھا نہیں کیا کیونکہ اس میں زلف کا ذکر آتا ہے اور میں تو کب کا ''فارغ البال'' ہو چکا ہوں۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

کلکتہ کے کچھ اور دوست بھی مجھے یاد آرہے ہیں۔اختر بارک پوری،شمیم انجم وارثی،احمد کمال حشمی، کچھ اور نام فی الوقت بھول رہا ہوں۔یہ سب بھی اَن دیکھی محبت کے زمرے میں شامل ہیں۔خدا سب کو خوش رکھے۔یہاں کسی فلمی گیت کا ایک شعر یاد آگیا ہے ؎

پیار جھوٹا نہ ہو، پیار کم ہی سہی
ساتھ دے تو کوئی دو قدم ہی سہی

مانسہرہ سے ایک دن مجھے ایک خط ملا۔کوئی جان عالم صاحب تھے۔ایک سہ ماہی رسالہ ''شعر و سخن'' کے نام سے جاری کیا تھا۔مجھ سے تعاون چاہتے تھے۔میں نے انہیں اپنی ایک دو کتابیں فراہم کر دیں۔چند تخلیقات بھیج دیں۔سالانہ چندہ بھی ادا کر دیا لیکن یہ صاحب تو جان کو آگئے۔میں نے یہی سمجھا کہ رسالہ کیلئے مزید چندہ درکار ہوگا۔لیکن پھر پتہ چلا کہ رسالے کا چندہ تو کہیں رستے میں ہی رہ گیا ہے۔جان عالم میرے خاکوں اور افسانوں سے بہت خوش تھے۔شاعری بھی انہیں پسند تھی لیکن میری نثر کی بہت تعریف کرنے لگے۔اسی دوران میں نے اپنے سفرنامہ ''سُوئے حجاز'' کا ایک باب انہیں اشاعت کے لئے بھیجا۔ساتھ ہی لکھا کہ اسے سہولت کے ساتھ چھاپ سکیں تو چھاپیں ورنہ بیشک رہنے دیں۔دراصل میرے اس سفرنامہ میں از خود بہت ساری ''بریلویت'' آگئی تھی اور بعض دوستوں کی دل شکنی کا بھی خدشہ تھا۔جان عالم نے وہ قسط چھاپ دی اور ہر طرح سے خیر وعافیت رہی۔

یوں جان عالم سے دوستی میں فکری مکالمہ شروع ہوا۔میں حیران ہوا کہ جان عالم نے کم عمری میں ہی کتنا سفر طے کر لیا ہے۔یہ نوجوان روحانیت کی دنیا سے گزرتا ہوا سوالات کی دنیا میں آگیا۔سوال اُٹھتے رہے اور اس کی جستجو بڑھتی رہی اور جان عالم کی جان یقین اور گمان کے بیچ اَٹکی رہی۔کسی سے سوال کرتے ہوئے بھی ڈرتا کہ کہیں کوئی جواب دینے کی بجائے فتویٰ ہی نہ صادر کر دے۔کم ظرف لوگ تو ماہیے کی بحث میں بھی فتویٰ صادر کرنے سے باز نہیں آئے۔جان عالم کے پاس تو ویسے بھی بڑے تیکھے سوال تھے۔اسی دوران اسکی زندگی کئی زاویوں میں بٹتی گئی۔اچھائی اور برائی کے چکر میں ہی خواہشوں کا سفر

شروع ہوگیا۔لوگ ' آئے' گئے۔۔۔۔کچھ زخم' کچھ یادیں'۔۔۔احساسِ محرومی'۔۔۔احساسِ نارسائی۔۔۔سب جمع ہوتا رہا۔

پھر اس نے سرسید احمد خاں' مولانا اسلم جیراج پوری' مولانا عبداللہ چکڑالوی' مولانا غلام احمد پرویز جیسے قرآنی فکر کے داعیوں کو پڑھا۔اسے لگا کہ یہاں تو ہر شے کا منطقی جواب دیا جارہا ہے۔سوال مرتے جارہے ہیں۔غیر محسوس طریقے سے جستجو کے ساتھ روح کو بھی مارا جارہا ہے۔چنانچہ جان عالم مادیت پرست افکار والی پُرکشش تفاسیر کے سحر سے بھی نکل آیا اور پھر اسے لگا کہ جنہیں میں نے سوال سمجھا تھا وہ تو سرے سے سوال تھے ہی نہیں۔سوال تو وہ ہوتے ہیں جن کے پیچھے جہانِ حیرت ہو۔یوں حیرت کی تلاش میں تصوف کی طرف راغب ہوا۔اور پھر تصوف کی دنیا سے بھی نکل آیا۔اس کے تجربے کے مطابق ہر انسان کے اندر ایک صوفی موجود ہے بس اسے تخلیے کی ضرورت ہوتی ہے۔لیکن یہ بھی ہے کہ تصوف درحقیقت ہمیں صرف سفر کی طرف Stimulate کرتا ہے' خود سفر نہیں ہے۔ہم medium کو منزل سمجھ کر رستے میں رُک جاتے ہیں۔جان عالم کے نزدیک تصوف کی شان یہ ہے کہ دنیا کے اندر رہتے ہوئے دنیا سے کاٹ کر رکھ دے۔جیسے حضرت علیؓ کا تیر نماز کے دوران نکالا جاتا ہے اور انہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔اب عالم یہ ہے کہ جانِ عالم کہیں بھی نہیں ہے اور ہر جگہ تھوڑا تھوڑا موجود بھی ہے۔اس سارے سفر کے نتیجہ میں مطالعہ قرآن اور مطالعہ حدیث کو اس نے حرزِ جاں بنالیا ہے۔ایسا شخص جو اپنے اردگرد کے ڈر سے کسی سے سوال پوچھنے کی ہمت نہ رکھتا ہو' کیا اُس سے یہ سارے بھید دوستی کی گہری حد تک گئے بغیر اگلوائے جاسکتے تھے؟ اور کیا محض ایڈیٹر اور رائٹر کے رشتے سے ایسا فکری مکالمہ کیا جاسکتا تھا؟ مجھے خوشی ہے کہ ایک ایسا شخص میری تحریروں کا فین ہے جس کے فکری سفر کے باعث میں خود اس کا فین ہوں۔یوں بھی ہم اپنے اپنے فکری اسفار میں کہیں آس پاس سے ضرور گزرتے ہیں۔اسی لئے اس نوجوان کی دوستی سے مجھے ایک الگ سی خوشبو آتی ہے۔

ماہیے کی بحث چھڑی تو راولپنڈی سے مجھے تین دوست یکے بعد دیگرے ملے۔عارف فرہاد' محمد وسیم انجم اور اختر رضا کیکوٹی۔۔۔عارف فرہاد تخلیقی لحاظ سے زیادہ فعال ہیں تاہم مجھے ان تینوں دوستوں سے خلوص کی ایک جیسی مہک آتی ہے۔عارف فرہاد نے راولپنڈی سے ماہیے کے فروغ کے لئے بنیادی نوعیت کی خدمات انجام دی ہیں۔میری دو کتابیں ''اردو میں ماہیا نگاری'' اور ''اردو ماہیے کی تحریک'' عارف فرہاد کی محنت کے نتیجہ میں شائع ہوسکی ہیں۔انہوں نے انہیں اپنے ادارہ ''فرہاد پبلی کیشنز''

کے زیرِ اہتمام شائع کیا۔

محمد وسیم انجم نے بھی اپنی بساط کے مطابق ماہیے کی ترویج کے لئے خاصا کام کیا ہے۔مجھے معلوم ہے کہ وسیم انجم اور عارف فرہاد دونوں کو وہاں کے بعض ماہیا مخالفین کی مقتدر حیثیت کے باعث ذاتی طور پر مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے لیکن اس کے باوجود ماہیے کے تئیں اور میرے لئے ان کے اخلاص میں کوئی کمی نہیں آئی۔وسیم انجم سے دوستی عارف فرہاد کے ذریعے سے ہوئی تھی۔میری تین کتابیں ''میری محبتیں''۔''عمرِ گریزاں'' اور ''محبت کے پھول'' انہوں نے عارف فرہاد کے ہاں دیکھیں۔ان سے وہ کتابیں لے کر ان پر ایک دلچسپ سا مضمون لکھا اور اسے شائع کرادیا۔یوں ہمارا رابطہ ہوا۔پھر انہوں نے میری دوسری کتابوں پر بھی مضامین لکھے اور جلد ہی ایک کتاب ''حیدر قریشی فکر و فن'' مکمل کرکے چھاپ دی۔وسیم انجم مزاجاً اور فطرتاً دوستی نبھانے والے' محبت کرنے والے اور مخلص نوجوان ہیں۔ان کے ذریعے پھر مجھے ماہیا نگار اختر رضا کیکوٹی کی دوستی نصیب ہوئی۔یہ تب ویکلی ''ہوٹل ٹائمز'' اسلام آباد کے ایڈیٹر تھے۔میری کتابیں انہوں نے وسیم انجم سے لے کر پڑھیں اور ہماری دوستی ہوگئی۔ماہیے کے فروغ کے لئے انہوں نے اپنے اخبار کا فورم مہیا کردیا۔مجھ سے محبت میں اس حد تک گئے کہ میرے ردِعمل والے وہ مضامین جو کوئی اور اخبار یا رسالہ چھاپنے سے ہچکچاتا تھا انہوں نے بے دھڑک اپنے اخبار میں چھاپے' خود میرے لئے اپنے اخبار کے دو صفحات مختص کرکے اور اس پر میری حیثیت سے بڑھ کر عنوان دے کر میری عزت افزائی کی۔عارف فرہاد' محمد وسیم انجم اور اختر رضا کیکوٹی تینوں دوست راولپنڈی میں میرے اَن دیکھے لیکن بے حد جانے پہچانے دوست ہیں۔سچی بات ہے ان کی دوستی میرے لئے بڑی تقویت کا باعث بنی ہے۔

دو ماہی ''گلبن'' احمد آباد کے ایڈیٹر سیّد ظفر ہاشمی سے تعلق کی نوعیت بھی نذیر فتح پوری کی طرح بہت پرانی اور غائبانہ تھی۔''گلبن'' کے اجراء کے تھوڑے عرصہ بعد ہی اس میں میری بعض تخلیقات شائع ہوئیں۔یہ تخلیقات ڈاکٹر مناظر عاشق کے ذریعے سے چھپیں۔تب وہ ''گلبن'' سے براہِ راست وابستہ تھے۔پھر ان سے ۱۹۹۳ء میں رابطہ ہوا۔میں نے ''ماہیے کے بارے میں چند باتیں'' کے عنوان سے ایک تعارفی نوٹ لکھا اور ماہیے کا ایک انتخاب کرکے انہیں بھیجا۔انہوں نے اسے اہتمام سے شائع کیا۔پھر ''گلبن'' ماہیے کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کرنے والا رسالہ بن گیا۔اس کا ماہیا نمبر شائع ہوا۔لیکن میرے تعلق کی نوعیت ماہیے کی حد سے آگے چلی گئی۔ایک دوسرے سے ملے بغیر ہمارے فیملی مراسم

ہو گئے۔ اب بھابی ثریا اور میری بھتیجی سیمانہ میرے لئے اجنبی ہیں نہ میں ان کے لئے اجنبی ہوں۔ سید ظفر ہاشمی کے ساتھ یہ مراسم ان کے خلوص اور محبت کا نتیجہ ہیں۔

ابھی مجھے علامہ شارق جمال (ناگپور)' قاضی حسیب (کراچی)' سیّد اختر الاسلام (میرٹھ)' شفیق سرونجی' سلیم انصاری' ساجد حمید (شیموگہ)' غیاث انجم (بکارو سٹیل سٹی)' ناوک حمزہ پوری' ظہیر غازی پوری' محسن بھوپالی (کراچی)' نیاز احمد صوفی (لاہور)' بشریٰ رحمٰن (لاہور)' شاہدہ ناز (جہلم) قاضی اعجاز محور (گوجرانوالہ)، ذوالفقار احسن (سرگودھا) اور کئی اور نام یاد آرہے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ساتھ میرے باقاعدہ دوستانہ تعلقات ہیں۔ بعض سے براہِ راست رابطہ نہیں لیکن وہ میری تحریریں پڑھ کر اپنی محبت بھری رائے رسائل میں ہی بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کے جذبات پڑھتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ یہ لوگ تو کسی ربط کے بغیر صرف تحریر پڑھ کر خوشی کا اظہار کرنے والے مخلص لوگ ہیں اور تب ہی میں انہیں بھی اپنے اچھے دوستوں میں شمار کرتا ہوں۔

ناوک حمزہ پوری صاحب کے ساتھ تعلق میں پہلے بزرگی کا ایک حجاب سا تھا۔ بعد میں انہوں اپنی بے تکلفی سے اسے بھی دور کر دیا۔ شارق جمال صاحب کے ساتھ بزرگی والا حجاب آج بھی قائم ہے لیکن مجھے ان کی محبت کا ہمیشہ احساس ہوتا ہے۔ ظہیر غازی پوری کے ساتھ ابھی تک میری جھڑپیں ہی ہوئی ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے ایسے لگتا ہے کہ ہم اس کے باوجود ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں۔ اسی لئے ان سے جھگڑوں کے باوجود مجھے ان سے بھی اپنائیت کی خوشبو آتی ہے۔ ایک گمشدہ دوست ذکاء الدین شایاں ہیں۔ ''جدید ادب'' کے پہلے دور میں ان سے بڑی دوستی رہی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا میں ابھی بھی انہیں دل سے یاد کرتا ہوں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی سے دوستی کی نوعیت کچھ اور طرح کی ہے۔ افسوس کہ ہم نے حال ہی میں ایک دوسرے سے انگلینڈ میں ملاقات کر لی ہے۔ یوں وہ اَن دیکھے دوست نہیں رہے وگرنہ ان کے بارے میں تو بہت کچھ لکھنا تھا۔ حالانکہ یہ ملاقات بھی کیا تھی۔

ے نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی ۔۔۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی

ڈاکٹر مناظر کے ذریعے ہی ایک اور دوست ڈاکٹر فراز حامدی سے رابطہ ہوا۔ انہیں میں نے بہت ہی مخلص' محبت کرنے والا اور دعا گو دوست پایا ہے۔ ڈاکٹر جمیلہ عرشی کے بھائی ہی نہیں ادبی رہنما بھی ہیں۔ مجھے ان کے ذریعے زندگی کے بعض نئے گوشے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔

ان سارے دوستوں سے ہٹ کر اب ایک ایسے دوست کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتا ہے۔ یہ بہت ہی انوکھا دوست ہے۔ اس سے میرا کوئی بھی بھید نہیں چھپا۔ ایسے بھید جو انسان اپنے آپ سے بھی بعض اوقات چھپانا چاہتا ہے' میرے وہ بھید بھی اس کے علم میں ہیں۔ اس نے ہمیشہ میرا بھلا چاہا ہے۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی اور نقصان اٹھایا تو اس نے خود ہی نقصان کی تلافی بھی کر دی۔ ایک زمانے میں ہمارا شدید قسم کا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے زندگی بھر کے احسانات کو نظر انداز کر کے اسے طعنہ دے دیا کہ تم ہو ہی کیا؟ ۔۔۔۔۔ اس نے تب بھی بُرا نہیں منایا۔ حالانکہ تب میرے سارے گھر والوں نے بھی مجھے بے حد بُرا بھلا کہا تھا۔ ویسے ایک بات ہے بظاہر بُرا نہ ماننے کے باوجود مجھے لگتا ہے اس نے مجھے خاصا رگڑا دلایا ہے۔ دوستی میں ایسا بھی تو ہوتا ہے۔ خصوصاً محبت میں تو محبوب 'محبّ پر یا محبّ' محبوب پر بے وفائی کی صورت میں وار بھی کرا دیتا ہے۔ سو اس نے بھی مجھے رگڑے دلائے۔ اُن لوگوں کے ہاتھوں جنہیں میں اس سے زیادہ اپنا سمجھ بیٹھا تھا۔

آخر کار مجھے خود ہی اس کی طرف آنا پڑا۔ لیکن میری واپسی محض نقصان اور فائدے کے باعث نہ تھی۔ میں نے اس عرصہ میں اس کی دوستی اور محبت کا باقی دنیا کی دوستیوں اور محبتوں سے موازنہ بھی کیا اور پھر اس سے ازسرِ نو دوستی کر لی۔ تجدیدِ محبت کر لی۔

کیا کوئی کسی ایسے دوست کا تصور کر سکتا ہے جو کبھی سامنے آ کر ملا بھی نہ ہو اور اپنے دوست کی خیر خواہی میں ماں' باپ' بھائی' بہن' بیوی' بچوں' مخلص دوستوں سے بڑھ کر خیر خواہ ہو۔ شاید آپ نے میرے اس بہت ہی پیارے دوست کو پہچان لیا ہے۔ جی ہاں یہ میرا خدا ہے! جو ہم سب کا خدا ہے۔ ہم سب کا خیر خواہ اور ہم سب سے بے پناہ محبت کرنے والا۔ اپنا انکار کرنے والوں کے انکار پر مسکرا کر ان سے بھی محبت کرنے والا۔ مجھے جتنی دوستیاں نصیب ہوئی ہیں میرے اسی دوست کی عنایت سے نصیب ہوئی ہیں۔ میں نے خلوصِ دل سے اس سے کہا تھا کہ مجھے بے لوث پیار کرنے والے دوست عطا فرما۔ اس نے بے لوث دوستوں کی دولت سے مجھے مالا مال کر دیا۔ اوپر جتنے اَن دیکھے دوستوں کا ذکر ہے وہ سب میرے اسی سب سے بڑے دوست کی محبت کا نتیجہ ہیں۔ اسی کی عنایت ہیں ے

ستم جو ہم پہ کئے اس نے بے حساب کئے
کرم بھی کرنے پہ آیا تو بے شمار دیا

اَن دیکھے دوست انسانوں میں سے ہوں یا خود خدا ہو۔ ان کی دوستی فاصلے اور اَن دیکھے ہونے

کے باوجود سچے خلوص کی مہک اور سچی محبت کی خوشبو دیتی رہتی ہے۔یوں دوستی اور تعلق کو جانا پہچانا بنا دیتی ہے۔اسی لئے میرے سارے اَن دیکھے دوست میرے لئے جانے پہچانے دوست ہیں اور مجھے ان کی عدم موجودگی میں بھی ان کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔

☆☆☆

دو ماہی گلبن احمد آباد۔شمارہ: نومبر،دسمبر۲۰۰۰ء

ابتدائی ادبی زمانہ

یادوں کے خزینے میں
خانپور اپنا تو
آباد ہے سینے میں

اردو میں الفاظ کے استعمال کے حوالے سے دیکھیں تو خانپور کا تلفظ ’’خان پُور‘‘ بنتا ہے۔خانپور سے تعلق رکھنے والے لیکن بنیادی طور پر لکھنو کے تربیت یافتہ ہمارے ایک قدیم شاعر محسن خانپوری نے خانپور کا ذکر اپنے ایک شعر میں یوں کیا تھا ۔۔۔؎

نہیں ہے قدرتِ حق سے بعید کچھ محسنؔ
کہ لے ہی جائے وہ ساون میں خانپور مجھے

لیکن میری زبان پر ہمیشہ سرائیکی تلفظ والا ’’خان پُر‘‘ ہی آتا ہے۔اگر اسے ایسے ادا نہ کروں تو ایسے لگتا ہے جیسے یہ میرا خانپور نہیں بلکہ لکھنو کا کوئی مضافاتی خانپور ہے۔سو میرا خانپور لکھنے میں بھلے ’’خان پور‘‘ لکھا جائے لیکن اپنی ادائیگی میں ہمیشہ ’’خان پُر‘‘ ہوتا ہے۔میری شاعری میں خانپور اسی سرائیکی تلفظ کے ساتھ ہی آیا ہے۔مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میری ادبی نشو ونما میں خانپور کا اور میری سرائیکی دھرتی کا بہت زیادہ حصہ ہے۔

میری بالکل ابتدائی ادبی تربیت میں میرے خاندان کے تین اہم افراد کا لاشعوری عمل دخل رہا۔ان کا میں اپنی بعض تحریروں میں ہلکا سا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ابا جی نے مجھے اسکول جانے سے پہلے جس طرح اردو پڑھنا،لکھنا سکھا دیا تھا وہ میری ادبی تربیت کا پہلا زینہ تھا۔پھر امی جی کا گھر میں دلچسپی لے

کر ناول پڑھنا بھی مجھے ادب کے ساتھ جوڑنے کا ایک سبب بنا۔امی جی نے ایک بار ایک طویل دعائیہ پنجابی نظم لکھی تھی۔ پھر میرے بچپن ہی میں ماموں حبیب اللہ صادق کا شاعر ہونا۔ میں سمجھتا ہوں میرے بچپن کے یہ سارے عوامل میری ادبی تربیت کا سبب بنتے رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے یہ ۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء کا زمانہ تھا۔ میں چھٹی ساتویں میں پڑھتا تھا۔ ماموں صادق ڈیرہ اسماعیل خاں سے ہمارے ہاں خانپور آئے تھے۔تب شام کے وقت میں نے اور ابا جی نے ان سے ان کی ایک نظم سنی جو ویت نام کے موضوع پر تھی۔اس کا مرکزی مصرعہ میرے ذہن میں یوں رہ گیا ہے۔ زندہ باد اے ویت نام

ماموں صادق کا ترنم شاعرانہ انداز کا تھا۔ مجھے اپنی وہ حیرت آج بھی یاد ہے جب میں ماموں صادق کی نظم سنتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا اور اس دیکھنے میں ایک عجیب سی خوشی اور تفاخر کا احساس شامل تھا کہ میرے ایک ماموں شاعر ہیں!۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جس کو اس کے قسم کے حالات مل جائیں وہ شاعر اور ادیب بن جاتا ہے۔ یہ صلاحیت تو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔صلاحیت بیج کی طرح ہوتی ہے اور جب تک اسے مناسب زمین اور موزوں آب و ہوا نہ ملے ان کی نشو ونما نہیں ہو سکتی۔میرے پانچوں بچوں میں ایسی خداداد صلاحیت نہیں تھی تو میری ادبی زمین اور آب و ہوا کے باوجود ان میں سے کوئی بھی شاعر اور ادیب نہیں بن سکا۔

اپنے گھر والوں کے مذکورہ اثرات سے ابھرتے ہوئے میں نے سب سے پہلی غزل خانپور میں اپنی نویں کلاس کے اختتام تک کہنے کی کوشش کی۔ یہ غزل کیا تھی۔بس تک بندی تھی۔مصرعوں کی روانی میں کہیں نہ کہیں سقم ضرور ہوں گے۔میں نے وہ غزل اس زمانہ میں سب سے چوری چھپے لاہور کے فلمی ماہنامہ ''شمع'' کو اشاعت کے لئے بھیجی۔ چند دنوں ہی میں ''شمع'' کی طرف سے جواب آ گیا کہ آپ کی غزل ناقابلِ اشاعت ہے۔مزید یہ کہ آپ کسی سے اصلاح لیا کریں۔اس وقت دل کی عجیب حالت تھی۔کبھی ''شمع'' رسالہ کے ایڈیٹر پر غصہ آتا اور کبھی اپنے آپ میں شرمندگی محسوس ہوتی۔میں نے اس بات پر خدا کا بے حد شکر ادا کیا کہ گھر والوں کو نہ میرے شاعری کرنے کا علم ہوا اور نہ ہی میری غزل کو ناقابلِ اشاعت قرار دینے والے اس خط کا علم ہو سکا۔(چلو کچھ بھرم رہ گیا) اس غزل کا مقطع اب بھی مجھے یاد ہے۔

نہیں لطف حیدؔر وہ ذکرِ خدا میں
جو ملتا ہے لطف ہم کو ذکرِ صنم میں

اس غزل کے مسترد ہونے کے دو فائدے ہوئے۔ایک تو یہ کہ میں نے پھر چھوٹی موٹی تک بندی کرتے رہنے کے باوجود ایک عرصہ تک کسی رسالے کو غزل بھیجنے کی جرات نہیں کی۔دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے پھر اپنی کسی غزل میں ''صنم'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔''سلگتے خواب'' کی ایک غزل میں ایک بار یہ لفظ از خود آ گیا تو میں نے اسے بھی حذف کر دیا۔

۱۹۶۸ء میں دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد میں نے حمزہ سنز شوگر ملز میں ملازمت کر لی۔اسی دوران میں نے ایک چھوٹا سا ناول لکھا۔ یہ ناول اسکول کی ایک پتلی سی کاپی میں مکمل ہو گیا۔ممکن ہے وہ طویل افسانہ ہو لیکن مجھے اس زمانہ میں ناول ہی لگا ہو۔لیکن شاید وہ نہ تو ناول تھا نہ افسانہ۔۔۔وہ تو بس میرے اس وقت کے کچے پکے جذبات اور سماجی ناانصافیوں کے زخموں کی کسک کا اظہار تھا۔نیم رومانی، اور نیم انقلابی قسم کی جیسے میری اپنی ہی کہانی تھی جو میں نے لکھی تھی۔اس کہانی کی ایک ہی خوبی تھی کہ اس کا واحد قاری میں خود تھا اور قاری بھی ایسا کہ جو اسے مکمل کرتے ہوئے شدتِ جذبات سے آبدیدہ ہوتا رہا اور بعد میں اسے پڑھتے ہوئے غم سے روتا رہا۔اس ناول کا ہیرو غریب تھا جو ظاہر ہے میں خود تھا اور ہیروئن امیر تھی اور امیر ہونے کے علاوہ بہت خوبصورت بھی تھی۔ویسے بیک وقت بہت خوبصورت اور بہت امیر ہیروئن مجھے ابھی تک کہیں نہیں ملی۔

شوگر ملز میں ملازمت کرنے کے بعد میری اپنے ایک ہمسایہ حفیظ سوز صاحب سے سلام دعا بڑھ گئی۔ ہمارے گھر کے ساتھ والی گلی میں یہ فیملی آباد تھی۔حفیظ سوز صاحب فلمی دنیا میں جانے کا شوق رکھتے تھے۔خانپور کے ماحول میں اور میرے اس وقت کے ذہن کے مطابق وہ شاعری کو جتنا جانتے تھے میرے لئے کافی تھا۔کالونی مڈل اسکول خانپور کے سامنے محکمہ انہار کے دفاتر تھے۔وہاں کے کسی افسر کے ایک صاحبزادہ (اب نام یاد نہیں رہا) سے حفیظ سوز کی دوستی تھی۔چنانچہ ہم تینوں نے مل کر ''ایوان ادب'' نامی ایک ادبی انجمن قائم کی۔محکمہ انہار کے افسر کے صاحبزادے اس کے سرپرست، حفیظ سوز صدر، میں جنرل سیکریٹری، امین (مینو) خزانچی مقرر ہوئے۔تاہم اس ادبی انجمن کا کبھی کوئی اجلاس نہ ہو سکا۔حفیظ سوز نے بھی شوگر ملز میں ملازمت کر لی۔وہاں سے وہ لاہور چلے گئے اور ادا کار قوی کے فلمی ادارہ سے منسلک ہو گئے۔لیکن کوئی اہم ترقی نہ کر سکے تو پھر ملتان میں کوئی ملازمت کر لی۔

یہ وہ دور تھا جب ابھی میں نے باقاعدہ ادبی دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا۔۱۹۷۱ء میں، میں نے پہلی باقاعدہ غزل کہی۔یہ غزل بغیر کسی رد و بدل کے ۱۹۷۲ء کے کسی مہینے میں ہفت روزہ ''لاہور'' میں چھپ گئی۔

بالکل روایتی انداز کی اس غزل کا مطلع یہ تھا ۔۔۔ے

عقل نے جتنا مری راہ کو ہموار کیا

اتنا ہی میرے جنوں نے اسے دشوار کیا

اس غزل کے چھپنے کے بعد مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ چنانچہ پھر میں باقاعدہ غزلیں کہنے لگا۔۔۔۔

۱۹۷۴ء میں بزمِ فرید خانپور کے ذریعے سے مجھے اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ پڑھنے کا موقعہ ملا اور ہفت روزہ مدینہ بھاولپور میں چھپنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ بزمِ فرید کے دوستوں کا تذکرہ میرے خاکوں کے مجموعہ ''میری محبتیں'' میں آچکا ہے۔ اسی دوران غالباً ۱۹۷۵ء کے وسط میں میرا نذر خلیق سے رابطہ ہوا۔ انہیں میں نے اپنے ایک محلّہ دار کے ساتھ دیکھا۔ وہ محلّہ دار حفیظ سوز کے بھائی عنایت نصرت صاحب تھے جو نصرت شیخ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ نصرت شیخ صاحب میرے محلّہ دار تھے، میرے دوست حفیظ سوز کے چھوٹے بھائی تھے، اور ہفت روزہ مدینہ بھاولپور کے نمائندہ بھی تھے۔ جبکہ میں ''مدینہ'' میں بہت باقاعدگی سے لکھنے والا تھا۔ چونکہ میرا میدان شروع سے ہی صحافتی سطح کا نہیں بلکہ ادبی سطح کا تھا (چاہے اس کا لیول کتنا ہی معمولی کیوں نہ رہا ہو) اس لئے کسی اخبار کی نمائندگی نہ میرا مسئلہ تھا نہ مجھے اس سے کوئی غرض تھی۔ نذر خلیق تیرہ سال کا لڑکا تھا۔ نصرت شیخ کی دوستی سے انہیں صحافت کا شوق ہوا۔ مگر نصرت شیخ ہی ان کی راہ کی رکاوٹ بن گئے۔ نذر خلیق نے مجھ سے رابطہ کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ لکھنا سیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور ادب وصحافت سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ اپنی تعلیم کو لازماً مکمل کرنے کی نصیحت کی۔

تب نذر خلیق محلّہ رحیم آباد میں رہتے تھے اور میں محلّہ خواجگان میں۔ لیکن دن میں ہمارا ایک بار ملنا ضروری ہوتا تھا۔ کبھی میں نذر خلیق کے گھر جاتا اور وہاں سے پھر ہم میرے محلّہ تک آتے۔ کبھی نذر خلیق میرے ہاں آتے اور پھر ہم ان کے محلّہ تک جاتے۔ یہ عجیب زمانہ تھا جس میں پیدل چلتے ہوئے تھکن کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے پیدل چلتے ہوئے میری رفتار خاصی تیز ہوتی تھی۔ نذر خلیق بھی تیز رفتار تھے لیکن جیسے مجھ سے تھوڑا سا پیچھے رہ جاتے تھے۔ بعد میں مجھے خانپور سے باہر کے بعض دوستوں سے باقاعدہ سننا پڑا کہ یار! اتنی تیزی اچھی نہیں ہوتی۔ اطمینان سے چلتے ہیں۔ میں نے خود بھی اپنی اس عادت پر غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے مزاج میں جلد بازی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے تیز تیز پیدل چلنے سے لے کر کسی کام میں جت جانے کے بعد اسے نمٹا کر ہی دم لینے تک اسی جلد بازی کے مختلف مظاہر

ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں زندگی کے مختلف کاموں میں جلد بازی کی طرح، موت کے معاملہ میں بھی جلد بازی سے کام لے جاؤں گا۔ بقول اقبال ساجد۔۔ے

میں جلد باز تھا میدانِ عشق ہار گیا

جو آخری تھا وہی داؤ پہلے ہار گیا

ویسے مجھے اقبال ساجد جیسا شکست کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے کیونکہ عشق میں ہار جیت دونوں ہی بے معنی ہوتی ہیں۔ ویسے بھی جس کے لئے موت ''وصلِ یار'' جیسی ہو اس کے لئے تو جلد بازی بھی مفید ہوتی ہے۔ بس اتنا ہے کہ موت کے وقت عزرائیل سے اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ

حضور آہستہ آہستہ، جناب آہستہ آہستہ

ہوسکتا ہے جلد بازی کے نتیجہ میں اتنا کہنے کی نوبت بھی نہ آئے۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ بات ہو رہی تھی میری تیز رفتاری کی۔

صفدر صدیق رضی، آسی خانپوری اور نزدوش ترابی وغیرہ میرے اچھے دوست تھے لیکن ایک مرحلہ پر آکر یہ سارے دوست مجھ سے الگ ہو کر متحد ہو گئے۔ جن دنوں میں یہ دوست متحدہ محاذ بنانے کی تیاری کر رہے تھے، انہیں دنوں میں ایک بار میں آسی خانپوری صاحب سے ملنے ان کے مینا بازار والے گھر میں گیا۔ وہاں صفدر صدیق رضی بھی آگئے۔ کچھ دیر کی گپ شپ کے بعد میں وہاں سے روانہ ہوا۔ مینا بازار سے صدر بازار کو پار کرنے کے بعد میں جیٹھہ بھٹہ بازار کی طرف مڑ کر چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ پیچھے سے صفدر صدیق رضی اپنی موٹر سائکل پر پہنچ گئے۔ انہوں نے موٹر سائکل روک کر پہلے حیرت کا اظہار کیا کہ میں پیدل ہوتے ہوئے اتنی جلدی یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔ تب میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بے ساختہ طور پر انہیں کہا تھا ''رضی صاحب! عقل سے پیدل ہونے اور ویسے پیدل ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں صرف ویسے پیدل ہوں''

صفدر صدیق رضی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے: ''چلیں بیٹھیں میں آپ کو ڈراپ کرتا چلوں گا''

رضی صاحب کا باقی ذکر بعد میں یہاں اس سے پہلے زمانے کی بات ہو رہی تھی۔ نذر خلیق کے ساتھ دوستی میں چھوٹے بھائی جیسی صورت تھی۔ تب ہم لوگ مل کر نہ صرف ہفت روزہ مدینہ میں چھپتے رہے بلکہ ادبی رسالہ ''نئی قدریں'' حیدرآباد میں بھی چھپنے لگے۔ بزمِ فرید سے الگ ہونے کے بعد میں نے نذر خلیق، اے کے ماجد اور جمیل محسن کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق خانپور کی بنیاد رکھی۔ تب ہی

ہم دونوں نے مل کر ''نئی قدریں'' کے ایڈیٹر جناب اختر انصاری اکبرآبادی کو خانپور میں مدعو کیا۔ پاپولیشن پلاننگ والوں کے دفتر میں ان کے اعزاز میں تقریب منعقد کی۔ یہ دفتر تب پیراڈائز سینما کے ساتھ ماڈل ٹاؤن میں ہوتا تھا۔ اختر انصاری اکبرآبادی کے بارے میں ہمارے اہلِ ادب کا رویہ زیادہ تر تمسخرانہ رہا ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ہفت روزہ ''مدینہ'' بھاولپور کے علامہ منظور احمد رحمت کے بعد ادبی جرائد میں میری اوّلین حوصلہ افزائی اختر انصاری اکبرآبادی نے اپنے رسالہ ''نئی قدریں'' میں کی۔ اسی لئے میں آج بھی ان کے لئے اپنے دل میں ایک احترام محسوس کرتا ہوں۔

اسی دوران ایک بار میں اور نذر خلیق میرے گھر کے سامنے بیٹھے تھے۔ سامنے سڑک پر سے گزرتے ہوئے خواجہ ادریس اور رب نواز قریشی نے ہمیں دیکھا اور ہماری طرف چلے آئے۔ میں نے انہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملایا اور تشریف رکھنے کو کہا۔ خواجہ ادریس کو یہ برا لگا اور انہوں نے تشریف رکھنے کی بجائے مجھے تھپڑ جڑ دیا۔ اس واقعہ اور بدمزگی کے بعد نذر خلیق نے ویکلی ''زندگی'' میں اس واقعہ کو درج کر کے میری حمایت میں اور مذکورہ دوستوں کی مذمت میں ایک طویل مکتوب شائع کرایا۔ رب نواز قریشی ذاتی طور پر بہت اچھے انسان ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان بہت بڑا طبقاتی فرق تھا اس کے باوجود وہ کئی بار میرے ساتھ برابر ہو کر بیٹھے اور دوستانہ انداز میں ملے۔ میری ابتدائی غزلوں کو سن کر انہوں نے ایک دو بار تبدیلی کے معقول مشورے بھی دیئے۔ جو مجھے واقعی اچھے لگے۔۔۔خواجہ ادریس بھی طبعاً اچھے انسان ہیں۔ بس یہ بدقسمت واقعہ ایسے ہونا تھا، ہو گیا۔ شاید اس میں کچھ میری بے وقوفی بھی شامل تھی۔ اختر انصاری کے بعد۔۔۔۔اور ایک عرصہ کے بعد جب ڈاکٹر وزیر آغا خانپور تشریف لائے تو میں نے ان کے اعزاز میں بلدیہ خانپور کے جناح ہال میں تقریب کا اہتمام کیا۔ تب خواجہ ادریس نے سابقہ تلخی کی ساری تلافی کر دی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس تقریب کی نظامت کریں۔ انہوں نے بڑی صاف گوئی سے مجھے نصیحت کی کہ اتنا بڑا ادیب ہمارے شہر میں آرہا ہے۔ اس تقریب کی نظامت میرے لئے اعزاز ہے لیکن اصلاً یہ آپ کا حق بنتا ہے۔ اس حق کو ضائع نہ کریں۔ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ چنانچہ پھر میں نے ہی اس تقریب کی نظامت کی۔ خواجہ ادریس نے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لئے ہر ممکن تعاون کیا۔ نہ صرف تقریب میں شرکت کی بلکہ اپنے مخصوص انداز میں ایک زبردست تقریر کی۔ اس تقریب میں خانپور کے بیشتر اہم شاعر اور ادیب شامل تھے۔ نذر خلیق نے بہت سے انتظامی معاملات کو بہتر طور پر سنبھالے رکھا۔

خواجہ ادریس، رب نواز قریشی کا ذکر ہو اور انجمن انسدادِ شعراء خانپور کا ذکر نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس انجمن کا ذکر ''میری محبتیں'' میں آچکا ہے لیکن یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک بار میں بھی ان دوستوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ میں نہ تو مشاعروں کا شاعر ہوں، نہ مجھے کلام سنانے کا سلیقہ آتا ہے۔ ان دوستوں نے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ مجھ سے کلام سننا شروع کیا۔ پھر ان سے سنجیدہ گفتگو ہوئی تو کہنے لگے ہم صرف متشاعروں کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ اچھے شاعروں کی ہم قدر کرتے ہیں۔ خورشید احمد ٹمی کی مثال دے کر کہنے لگے دیکھیں اگر وہ بے تکی شاعری کرنے میں لگا رہتا تو کیا اس کی افسانہ نگاری اتنی ابھر سکتی جتنی اب ابھر آئی ہے؟۔۔۔بات ان دوستوں کی مناسب تھی۔

اب یہاں جرمنی میں رہتے ہوئے جب میں مغربی ممالک میں مقیم بیسیوں بے وزن شاعروں کو دیکھتا ہوں، جعلی شاعروں اور ادیبوں کو دیکھتا ہوں جو محض دولت کے بل پر ریڈی میڈ شاعر اور ادیب بن گئے ہیں تو مجھے کئی بار خواجہ ادریس، رب نواز قریشی، شیخ فیاض الدین اور انجمن انسدادِ شعراء خانپور کے دوسرے دوست شدت سے یاد آتے ہیں۔ کاش یہ دوست یہاں آسکتے اور ایسے جعلی شاعروں اور ادیبوں کی سرکوبی کے لئے کچھ کر پاتے۔

مجھے تو بالکل ہی بھول گیا تھا لیکن اب نذر خلیق صاحب نے یاد دلایا ہے کہ میں نے ایک بار ایک فلمی رسالہ ''سنگیت'' خانپور سے شروع کیا تھا۔ یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ تب میں نے جن دوستوں کی ٹیم بنا کر یہ فلمی رسالہ شروع کیا ان میں نذر خلیق بھی شامل تھے۔ اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا۔ ۱۹۷۸ء میں پھر میں نے خانپور سے ''جدید ادب'' جاری کیا۔ اس کی ٹیم میں صفدر صدیق رضی اور فرحت نواز (جو اَب رحیم یار خان میں انگریزی کی پروفیسر ہیں) موثر پارٹنر تھے۔ رضی صرف دو، ڈھائی سال تک دوستی نبھا سکے۔ اور پھر وہ ''جدید ادب'' کی ادارت میں شامل نہ رہے۔ البتہ فرحت نواز رسالہ کی ادارت میں آخر دَم تک شامل رہیں۔

رضی میرے بہت قریبی دوست تھے۔ میرے ذاتی عمومی حالات تو ایسے تھے کہ میں اپنی غزلیں اور دوسری تخلیقات لکھنے کے لئے کاغذ قلم اور سیاہی خریدنے کی بھی پوری استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے باوجود ''جدید ادب'' جیسا رسالہ جاری کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں صفدر صدیق رضی نے پیراڈائز سینما کے قریب سٹیشنری کی ایک دوکان پر اپنا کھاتہ کھول رکھا تھا اور اسکے مالک کو ہدایت کر رکھی تھی کہ حیدر قریشی جو سٹیشنری جب چاہے رضی کے حساب سے لے سکتا ہے۔ ''جدید ادب'' کے سلسلہ میں جتنی سٹیشنری کی

ضرورت پڑتی تھی میں وہاں سے لے لیا کرتا تھا۔اپنی ضرورت کے لئے میں نے کبھی ایک پیسے کی چیز بھی نہیں لی تھی۔پھر جب وہ ایک بہت ہی معمولی بات پر دوستی کو چھوڑ گئے تب ایسا نہیں کیا کہ مجھے براہ راست کہہ دیتے کہ میری طرف سے ''جدید ادب'' کا کام ختم ہوا۔اب میری طرف سے کوئی اسٹیشنری نہیں لیجئے گا۔اس کے بجائے انہوں نے سٹیشنری شاپ والوں کو کہہ دیا کہ جب حیدرقریشی کوئی سامان لینے آئے اسے بتادیں کہ میں نے منع کر دیا ہے۔مجھے ان کے اندر کی ''پاک تبدیلی'' کا کوئی علم نہ تھا۔چنانچہ حسب معمول اگلے شمارہ کی تیاری کے سلسلہ میں دوکان پر گیا اور ایک دستہ کاغذ کے لئے کہا تو مجھے رضی صاحب کا پیغام سنا دیا گیا۔میں پیغام سن کر حیران رہ گیا۔

اچھا ہوا کہ ہم سے محبت نہیں تمہیں
اچھا ہوا کہ دل کا یہ ابہام مر گیا

میری ''اوقات'' دیکھئے کہ اس وقت میری جیب میں ایک دستہ کاغذ خریدنے جتنے پیسے بھی نہ تھے کہ اپنی طرف سے ہی کاغذ خرید لیتا۔شرمندہ ہو کر وہاں سے لَوٹ آیا۔میرا خیال ہے کہ ناحق ملنے والے دکھ کی تلافی خدا کی طرف سے کسی نہ کسی اجر کی صورت میں ضرور ملتی ہے۔اب جو کاغذ کے بجائے کمپیوٹر پر بیٹھ کر اپنی تخلیقات لکھتا رہتا ہوں تو شاید یہ بھی انہیں دکھوں کا صلہ ہو جو بعض دوستوں نے بے جا طور پر دیئے۔بہر حال اللہ صفدر صدیق رضی صاحب کو خوش رکھے۔

خانپور نے مجھے میری ادبی پہچان عطا کی۔بھاولپور کی سطح پر مجھے نقوی احمد پوری،مظہر مسعود،خورشید ناظر،ڈاکٹر انور صابر جیسے دوست عطا کئے،تو پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد جیسے غائبانہ محبت کرنے والے مہربان بھی ملا دیئے۔ایک طرف خانپور سے نذر خلیق نے دلی محبت کے ساتھ میرے بارے میں تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ایک بہت عمدہ کتاب ''حیدرقریشی کی ادبی خدمات'' مرتب کر کے چھاپ دی ہے۔دوسری طرف ڈاکٹر انور صابر کی صاحبزادی منزّہ یاسمین نے اپنے ایم اے کے مقالہ کے لئے میرے ادبی کام کو اپنا موضوع بنایا تو اس میں ڈاکٹر انور صابر اور خورشید ناظر کی محبت کا بھی کچھ حصہ شامل تھا اور ڈاکٹر شفیق تو بہ نفسِ نفیس اس مقالہ کے نگران تھے۔فل اسکیپ کے ۲۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل یہ مقالہ درحقیقت میری سرائیکی دھرتی کی طرف سے خود میرے لئے میری پہچان کا ایک تحفہ ہے۔میں اس مقالہ کو پڑھ کر صرف خوش ہی نہیں ہوا،اپنی دھرتی کے حوالے سے اپنی پہچان کے ایک اہم مرحلے سے بھی گزرا ہوں۔

جیسا کہ میں شروع میں ذکر کر چکا ہوں،میں نے اپنی سب سے پہلی بے تکی اور ناقابلِ اشاعت غزل میں لکھا تھا۔ے

نہیں لطف حیدرؔ وہ ذکرِ خدا میں
جو ملتا ہے لطف ہم کو ذکرِ صنم میں

اب اپنے پورے ادبی سفر کو شاعری کے حوالے سے دیکھنے لگا ہوں تو مجھے اپنی تین نئی غزلوں کے مقطعوں میں جیسے اپنے ادبی سفر کی پوری روداد مل گئی ہے۔بس میں نے مذکورہ بالا شعر سے لے کر ان اشعار تک کا سفر کیا ہے۔

یا آنکھوں میں خاک برستی تھی حیدرؔ
یا اب پیہم اشک دعائیں گرتے ہیں

بن جاتا تریاق اسی کا زہر اگر تم حیدرؔ
کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اُس پر دَم کرتے

آنکھیں اُس کی بھی ہیں اب برسات بھری
حیدرؔ میل دلوں کے دُھلنے والے ہیں

میری شاعری کی بات میری پہلی کے غزل کے مقطع سے شروع ہوئی تھی اور اب تک کی تازہ غزلوں کے مقطعوں تک آ پہنچی ہے۔گویا ''سخن گسترانہ'' بات مقطع سے شروع ہو کر مقطعوں میں آ پڑی ہے۔

میرے پہلے بے تکے اظہار سے لے کر ایسے اشعار تک۔۔۔۔یہی میرے اب تک کے شعری سفر کی رُوداد ہے۔فکری اور شعری لحاظ سے جتنا بھی سفر طے ہوا ہے سراسر خدا کا فضل اور احسان ہے۔وگرنہ من آنم کہ من دانم!

☆☆☆

دو ماہی گلبن لکھنئو۔شمارہ: مئی،جون ۲۰۰۳ء

جدید ادب جرمنی۔شمارہ: جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء

میری عمر کا ایک سال

(۱۳رجنوری ۲۰۰۳ء سے ۱۳رجنوری ۲۰۰۴ء تک)

عام طور پر شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زندگی کے کسی خاص سال کے حوالے سے کچھ لکھا ہے تو اپنی عمر کے چالیس سال پورے ہونے پر لکھا ہے، یا پچاس سال پورے ہونے پر۔اپنی ادبی زندگی کی کسی نوعیت کی جوبلی پر بھی لکھا ہے۔لیکن میرا طرزِ عمل غیر ارادی طور پر شروع سے ہی اس معمول سے مختلف رہا ہے۔میں نے اپنی شادی کے ساڑھے بارہ سال گزرنے کے بعد ایک نظم ''نصف سلور جوبلی'' کہی تھی جبکہ شادی کی سلور جوبلی پر کچھ بھی نہیں لکھا۔عمر کے چالیس سال پورے ہونے سے پہلے تینتیس سال کی عمر میں ''بڑھاپے کی حمایت میں'' انشائیہ لکھ دیا تھا لیکن چالیس سال پورے ہونے پر کچھ نہیں لکھا۔اسی طرح عمرِ عزیز کے پچاس سال پورے ہونے پر کچھ نہیں لکھا لیکن اب باون سال پورے ہونے پر لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔جی ہاں۔۔۔آج ۱۳رجنوری ۲۰۰۴ء کو میں باون سال کا ہو کر ۵۳ویں سال میں قدم رکھ چکا ہوں۔سال کے باون ہفتے ہوتے ہیں اور تاش کے باون پتے ہوتے ہیں۔گردش ماہ و سال تاش کے سارے پتے مجھ پر آزما چکی ہے تو مجھے اپنی ایک غزل کا یہ شعر یاد آ گیا ہے۔

داؤ پر جو ہمیں لگا بیٹھا
وقت شاید کوئی جواری ہے

آج سے دس سال پہلے میں نے اپنے انشائیہ ''وِگ'' میں لکھا تھا: ''میں بیالیس سال کی عمر میں بلاوجہ باون برس کا بنا ہوا تھا''

اور اب جب واقعی باون برس کا ہو گیا ہوں تو عمر کے اس ایک برس کی تازہ ترین یادوں کو لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔۱۳رجنوری ۲۰۰۳ء سے ۱۳ جنوری ۲۰۰۴ء تک کے ایام کیسے گزرے؟ یہ سال کئی لحاظ سے میرے لئے خاص اہمیت کا حامل سال بن گیا ہے۔خدا کے کچھ ایسے فضل ایک تسلسل کے ساتھ ہوئے ہیں کہ تحدیث نعمت کے طور پر ان کا ذکر کر دینا مناسب ہے۔میری یادوں میں ان سب کا بھی ایک حصہ

ہے۔لیکن تحدیث نعمت سے پہلے اپنی دو کمزوریوں کا ذکر کروں گا جو مجھ پر گزشتہ سال کے دوران منکشف ہوئیں۔پہلی کمزوری یہ ہے کہ میں جب کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا ہوں، صفحہ الٹتے ہی دائیں طرف پڑھنا شروع کرنے کے ساتھ اس سے اگلے صفحہ کو الٹنے کے لئے بائیں طرف کے صفحہ کو انگلیوں سے پکڑ لیتا ہوں تا کہ ورق الٹنے میں دیر نہ ہو۔عادت تو یہ میری ہمیشہ سے ہے مجھے اس عادت کا تب شدت سے احساس ہوا جب میں نے حالیہ رمضان شریف میں ایک بزرگ کو ایسا کرتے دیکھا۔تب مجھے اپنی اس عادت پر غور کرنے کا موقعہ ملا اور مجھے لگا یہ بھی میری جلد بازی کی عادت کا ایک اثر ہے۔اپنی جلد بازی کی عادت کے بارے میں یادوں کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں،اس عادت کو اسی تسلسل میں دیکھا جا سکتا ہے۔دوسری عادت یہ ہے کہ میں عام طور پر ''جھکی جھکی نگاہوں'' کے ساتھ بات کرتا ہوں۔ایک بار ہالینڈ میں مقیم میرے ایک ''کرم فرما'' جمیل الرحمٰن میرے پاس آئے تو انہوں نے مجھے میری اس عادت پر ٹوکا تھا اور کافی کھول کر بتایا تھا کہ آنکھ ملا کر بات نہ کرنے والوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں بنتی۔اس سال مجھے اپنی اس کمزوری پر غور کرنے کا موقعہ ملا۔بچپن کا شرمیلا پن اس عادت کا سبب ہو سکتا ہے۔اگرچہ میں نے اب تک کافی بے شرمی کر لی ہے پھر بھی جو بچپن کی عادت سی تھی وہ تو مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔اگر ماہرین نفسیات کے حساب سے مان لیا جائے کہ ایسے لوگوں کے دل میں کوئی چور ہوتا ہے تو مجھے اپنی بکل میں چھپے چور سے کبھی بھی انکار نہیں رہا۔

میری بکل دے وچ چور نیں میری بکل دے وچ چور
جس ۔ڈھونڈ۔پاتس نے۔پایا،نہ۔جھر جھر ہو یا مور
جیہڑا۔لیکھ۔متھے۔دا۔لکھیا۔کون۔کرے۔بھن توڑ
میری بکل دے وچ چور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بابا بلھے شاہ کے ہاں تو ایک ہی چور تھا میرے اندر پتہ نہیں کتنے چور چھپے ہوئے ہیں۔بکل سے نکلوں گا تو پتہ چلے گا۔اپنی ان دونوں کمزوریوں نے اس سال مجھے کچھ سوچنے پر مائل کیا۔ان کمزوریوں سے قطع نظر جنوری ۲۰۰۳ء کے وسط میں خبر ملی کہ اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے منزہ یاسمین نے میرے ادبی کام پر ایم اے اردو کا جو تحقیقی کام کیا تھا،اس کی منظوری یونیورسٹی کی طرف سے دے دی گئی ہے۔اور اسی سال اگست،ستمبر تک وہ مقالہ یونیورسٹی کی منظوری کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔اس سال خدا کا اس سے بھی بڑا کرم یہ ہوا کہ پہلے ایک مایوسی کی کیفیت ہونے کے بعد یکا یک جنوری کے

اواخر میں پہلے امکان روشن ہوااور پھر فروری کی پہلی کو مجھے اپنی اہلیہ کے ساتھ حج پر جانے کی توفیق ملی۔دسمبر ۱۹۹۶ء میں ہم نے عمرہ کیا تھا اور اب فروری ۲۰۰۳ء میں ہمیں حج کرنے کی توفیق مل رہی تھی۔اسی سال میں نے دسمبر میں اس حج کی روداد لکھ لی اور اب یہ روداد میرے عمرہ کے سفر نامہ ''سوئے حجاز'' کے نئے ایڈیشن میں اضافہ کے ساتھ شائع ہوگی۔انشاءاللہ۔

اس برس میری شاعری کی رفتار دھیمی رہی تاہم میں نے تین غزلیں اور تین نظمیں کہیں۔جو ادبی رسائل میں چھپ چکی ہیں۔چند سیاسی نوعیت کی نظمیں اور افسانے بھی لکھے گئے لیکن ان کی ادبی حیثیت مجھے اچھی نہیں لگی۔مجھے لگا کہ ان پر صحافت غالب آ گئی ہے اس لئے میں نے ان سب کو ضائع کر دیا۔عالمی حالات کے حوالے سے میں نے کچھ عرصہ سے جو کالم قسم کی چیزیں لکھنا شروع کی ہیں ان سے میرا کتھارسس ہوجاتا ہے،یوں مجھے ادب اور صحافت کو الگ الگ رکھنے میں سہولت مل گئی ہے۔میری ساری صحافتی نوعیت کی سرگرمیاں www.urdustan.com پر مکمل فائل کی صورت میں دستیاب ہیں۔ میں نے ''منظر اور پس منظر'' عنوان کے تحت ۲۵ کالم لکھے ہیں۔اس سال یہ فائل مکمل ہوئی۔اور یہ کتاب جلد ہی شائع ہونے والی ہے۔اگرچہ یہ کالم عالمی صورتحال پر میرے دکھ اور بے بسی کے احساس کے نتیجہ میں لکھے گئے ہیں،تاہم مجھے لگتا ہے کہ میرے بہت سے مندرجات کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ واضح ہوتی جائے گی۔میں ۲۲؍جولائی ۲۰۰۲ء کو اس وقت اپنے کالم میں یورپی یونین کی طرز پر سارک یونین کے قیام کی ضرورت کا احساس دلا رہا تھا جب انڈو پاک ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑے تھے۔مجھے خوشی ہے کہ اس برس مجھے یہ دیکھنے کا موقعہ ملا کہ سارک کے سب سے بڑے ملک نے اس تصور کو سب کے سامنے رکھا اور اب سب اس کے امکانات پر غور کر رہے ہیں۔یقیناً یہ ایک عمدہ پیش رفت ہے اور میرے لئے ذاتی طور پر بھی خوشی اور اطمینان کا باعث ہے۔اسی طرح قلبِ اسلام کے حوالے سے میرے کالموں کے نتیجہ میں فوری طور پر اخبارات سے لے کر ٹی وی تک ایک تحرک پیدا ہوا لیکن تمام متعلقین پھر خوابِ خرگوش میں چلے گئے۔آنے والے سنگین وقت میں میرے لکھے کو شاید پھر یاد کیا جائے۔اردوستان پر ہی میں نے خبر نامہ کی صورت میں خبروں پر ہلکے پھلکے تبصروں کا سلسلہ بھی شروع کیا۔اس سارے لکھے کا فائدہ یہ ہوا کہ میں فوری طور پر ہنگامی موضوعات کو مدِنظر رکھ کر ادب میں صحافیانہ تحریریں پیش کرنے سے بچ گیا اور براہِ راست صحافت کے میدان میں اتر کر میں نے اپنے احساسات کو بہتر انداز سے بیان کر دیا۔

اس سال کی میری ادبی تحریروں میں یوں تو ساختیات اور ماہیا پر میرے مباحث اور چھ کتابوں پر تبصروں کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے،تاہم مجھے دو اہم مضامین لکھنے کی توفیق ملی۔''تیسرے ہزاریے کے آغاز پر اردو کا منظر'' اور ''ماریشس میں عالمی اردو کانفرنس''۔پہلا مضمون ماریشس کی اردو کانفرنس میں پڑھنے کے لئے لکھا گیا تھا اور دوسرا مضمون اس کانفرنس کی روداد تھا۔ماسکو میں اردو کی معروف خدمتگار ڈاکٹر لڈمیلا کے بقول میرا رپورتاژ پہلا آرٹیکل تھا جس کے ذریعے ماریشس کانفرنس کی تفصیلات انٹرنیٹ کے ذریعے ساری اردو دنیا تک پہنچیں۔

اس برس میرے فن کے حوالے سے منزہ یاسمین کے مقالے کے ساتھ برادرم نذر خلیق کی مرتب کردہ کتاب ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' بھی شائع ہوئی۔اسی برس مجھے جدید ادب کے از سرِ نو اجراء کا موقعہ ملا۔اور سال میں دو شمارے پیش کئے۔اس بار **جدید ادب** کی پیش کش میں بعض نمایاں تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔سب سے اہم تبدیلی یہ رہی کہ یہ ادبی رسالہ کتابی صورت میں چھپنے کے ساتھ انٹرنیٹ پر بھی مکمل جریدہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ویب سائٹ www.jadeedadab.com پر جدید ادب کا ہر شمارہ مستقل طور پر موجود رہے گا۔ادبی رسائل کی دنیا میں یہ اپنی نوعیت کی سب سے پہلی مکمل پیش کش ہے۔اس سلسلہ میں جہاں ریحانہ احمد،نذر خلیق اور عمر کیرانوی نے میرے ساتھ ادارتی ٹیم کا کام کیا ہے وہیں امریکہ میں مقیم اردوستان ڈاٹ کام کے کرتا دھرتا کاشف الہدیٰ نے ویب سائٹ کے قیام میں بہت بنیادی اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کے تعاون سے ہی جدید ادب کو انٹرنیٹ پر اتنی کامیابی سے پیش کیا جا سکا۔جدید ادب کے دو شمارے شائع ہونا اور ویب سائٹ پر دونوں شماروں کا بروقت آن ہو جانا میری عمر کے اِسی سال میں ہوا۔میری ٹیم کے باقی ارکان کے نام تو رسالہ پر موجود ہیں جبکہ کاشف الہدیٰ کی خوبی دیکھیں کہ اتنا سارا کام کرنے کے بعد بھی انہوں نے ادب کی خاموش خدمت کو ہی اپنا اجر مانا ہے۔اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

شروع میں ذکر کر چکا ہوں کہ اس برس میں نے اپنی دو کتب ''منظر اور پس منظر'' اور سوئے حجاز'' (حج کی روداد کے اضافہ کے ساتھ) کو فائنل کیا۔ان کے ساتھ اپنی دو کلیات فائنل کی ہیں۔شعری کلیات ''غزلیں،نظمیں،ماہیے'' کا پہلا ایڈیشن چار مجموعوں پر مشتمل تھا۔اب نیا ایڈیشن میرے پانچویں مجموعے سمیت شائع ہو سکے گا اور نثری کلیات ''افسانے،خاکے،یادیں،انشائیے'' بھی پانچ نثری مجموعوں پر مشتمل ہوگا۔اس سال ۱۲؍جنوری ۲۰۰۴ء کو میں نے دونوں کلیات کی پروف ریڈنگ کا جان لیوا کام مکمل کر

لیا۔اب صرف ان زیرِتحریر یادوں کو''کھٹی میٹھی یادیں''میں شامل کرنے کا کام باقی ہے۔مجموعی طور پر اس برس میں نے اپنی بارہ کتب کی پروف ریڈنگ کرنے کے ساتھ ان کی نوک پلک سنوارنے کا کام بھی کیا۔یہ اچھی خاصی مشقت تھی۔

اس سارے مطالعہ سے گزرتے ہوئے مجھے اپنی لکھی ہوئی کئی پرانی تحریریں نئے حالات کے تناظر میں بہت ہی تازہ دکھائی دیں۔ایسے لگتا ہے جیسے بیس پچیس سال پہلے کی تحریریں وجدان کی کسی ان جانی سطح سے لکھی گئی تھیں۔اس کے لئے مجھے تخلیقات میں سے متعدد مثالیں ملی ہیں یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

اس وقت ساری اسلامی دنیا عمومی طور پر اور پاکستان خصوصی طور جس قسم کے حالات سے دوچار ہے۔اندرونی اور بیرونی دونوں طور پر حالات اتنے تکلیف دہ ہیں کہ ایسے لگتا ہے ہمارے لئے کوئی راہِ نجات نہیں رہی۔اس صورتحال کو میرے ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والے ایک افسانے میں یوں دیکھا جا سکتا ہے:

''مجھے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔بے چارگی اور مایوسی کے اندھیرے چاروں طرف رقص کررہے ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے میرے اندر والے فنکار کو قتل کردیا ہے اور میں اپنی لامتناہی تلاش کے سفر میں ایک ایسے ٹیلے پر کھڑا ہوں جس کے ایک طرف سر بفلک دشوار گزار پہاڑ ہیں اور دوسری طرف گہرا نا قابل عبور سمندر۔ایک طرف سینکڑوں اژدہوں اور عفریتوں کی پھنکاریں ہیں تو دوسری طرف آبی بلاؤں کی چیخیں۔میں اپنے آپ کو پکارنا چاہتا ہوں مگر میری صدا بھی کہیں کھو گئی ہے۔۔۔۔۔تب میری تجرید کی ساری معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے۔۔۔۔یہ معنویت اتنی گھناؤنی اور مکروہ ہے کہ میں کسی کو بھی اس سے آگاہ کر کے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔کیونکہ یہ معنویت صرف میری نہیں۔۔ہم سب کی ہے۔شاید اسی لئے وہ مقدس آواز بھی اب نہیں آرہی ہے جس نے کہا تھا:''خارجی دنیا کو بھی تمہارے اس کشف کا ادراک ہونا چاہیے!''(افسانہ''اپنی تجرید کے کشف کا عذاب'')

امریکہ اور اس کے حلیفوں کے ذریعے اس وقت جو نام نہاد صلیبی جنگ شروع کی گئی ہے،اس کے دیگر مقاصد سے قطع نظر اگر اسے صرف صلیبی رنگ میں ہی لیا جائے تب بھی یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی باہمی لڑائی ہے۔بنی اسرائیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کی ایک شاخ ہیں جن سے یہودی اور مسیحی مذاہب نکلے۔۔۔جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت محمد ﷺ ہوئے جو دینِ اسلام کے بانی ہیں۔اس وقت امریکہ اور اسرائیل کے گٹھ جوڑ کو مذہب کے ساتھ خاندانی سطح پر دیکھا جائے تو ایسے لگتا ہے کہ اسحاق علیہ السلام کی اولاد اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ وہی سوتیلا سلوک کر رہی ہے جو ماضی بعید میں ایک بار پہلے بھی ہو چکا ہے۔۔۔عام مسلمانوں کو عمومی طور پر علم نہیں ہے کہ مسیحی اور یہودی دنیا کی نظروں میں ہمارا شجرہ نسب کیا ہے۔بائبل کی رُو سے بی بی ہاجرہ کی حیثیت بی بی سارہ کی لونڈی کی تھی۔اور وہ اسماعیل علیہ السلام کو لونڈی کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ابراہیم علیہ السلام کی حقیقی اولاد میں شمار نہیں کرتے۔اسی سے ان کی ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ۱۹۸۲ء میں افسانہ لکھا تھا''میں انتظار کرتا ہوں''۔سوتیلے جذبوں کی اذیت سہتے ہوئے اس افسانے میں تین اہم تاریخی کرداروں کو ایک کردار میں یکجا کیا گیا تھا۔اس میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حوالے سے جو کچھ آیا تھا اس کی ہلکی سی جھلک یہاں دیکھ لیں۔۔باقی پورا افسانہ تو اپنے پورے تناظر میں ہی پڑھنے سے سمجھ میں آئے گا:

''میری بے گناہی۔۔۔میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔

میں اذیت میں ہوں کہ میری ماں ابھی تک میری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔وہ جو بادشاہ زادی ہے۔میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا چاہیں مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیونکر مٹا سکیں گے کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔

میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔

''آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔''

یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ میری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اور اس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔''

اس نوعیت کے اتنے حوالے میرے سامنے آئے کہ انہیں پڑھتے ہوئے مجھے اپنی تخلیقات میں خود ایک انوکھے وجدان کا احساس ہوا۔شاید میں خود کبھی ایسے اشارات کو کسی مضمون کی صورت میں یکجا کر دوں جو اب تک کے حالات میں ظاہر ہو چکے ہیں۔شاید اسی کیفیت کو بھانپ کر جیلانی کامران صاحب نے میرے افسانوں کے حوالے سے لکھتے ہوئے اپنے تجزیہ کا اختتام ان الفاظ پر کیا تھا کہ

''ان افسانوں میں ایک ایسا رویہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کہانی محض کسی واقعے ہی کی بات نہیں کرتی بلکہ اس سچائی کا ذکر بھی کرتی ہے جو واقعیت کے رگ و ریشے میں جاگتی ہے اور سب سے کہتی ہے کہ مجھے پہچانو، میں کون ہوں؟ سچائی نے ہمارے زمانے میں افسانے کا لباس پہن رکھا ہے''

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے،ہم لوگ روایات کے نام پر ابھی تک ماضی سے چمٹے ہوئے ہیں،ماضی سے جُڑ کر رہنا کوئی بری بات نہیں اگر آپ اس کے ساتھ حال سے باخبر رہتے ہوئے مستقبل کی طرف بھی قدم بڑھاتے رہیں۔ایک بہت ہی ہلکی پھلکی سی ذاتی واردات یاد آ گئی۔میں ایک بار انٹرنیٹ پر بیٹھا ہوا ایک ویب سائٹ سے اپنی پسند کا گانا ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سن کر کچھ جذباتی بھی ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ آئی ہوئی ای میلز کے جواب بھی دیتا جا رہا تھا۔اپنے اس عمل سے میں نے بعد میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماضی سے کٹ کر نہیں رہنا لیکن ماضی کے چکر میں حال اور مستقبل سے غافل ہو جانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔اخلاقی قدریں بھی دو طرح کی ہیں ایک تو وہ جن کی حیثیت مستقل نوعیت کی ہے،دوسری وہ جو زمانے کے ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔مثلاً ایک طویل دور تک سینہ تان کر لڑنا اور سینے پر زخم کھانا بہادری کی علامت تھا۔اب ہولناک بموں کے دور میں ایسا کرنا بہادری نہیں بلکہ سیدھی سی بے وقوفی ہے۔ایک قدر جو ہمارے بچپن تک بہت اہم رہی یہ تھی ''پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب۔جو کھیلو گے،کودو گے،ہو گے خراب''۔آج کے دور میں سپورٹس کے سٹارز کی جو حیثیت ہے اور ان کے مقابلہ میں بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والوں کی جو بے توقیری ہے،اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہت سی قدریں کس حد تک بدل کر رہ گئی ہیں۔بہر حال وقت کی رفتار تو اپنے بہاؤ میں رہتی ہے۔

جدید دور کی سب سے اہم اور عام ایجاد کمپیوٹر ہے۔پچاس سال سے اوپر کی عمر کے بہت کم لوگ ہوں گے جو میری طرح اس ٹیکنالوجی سے بنیادی واقفیت نہ رکھنے کے باوجود اس ایجاد سے بہت زیادہ منسلک ہوں۔میری کمپیوٹر سے دوستی بہت گہری ہو چکی ہے۔اتنی گہری کہ اس نے قلم اور کاغذ سے میرا عمر بھر کا تعلق بڑی حد تک ختم کر کے رکھ دیا ہے۔میں جو چند برس پہلے تک دن میں بیس پچیس خطوط آسانی سے لکھ لیا کرتا تھا۔اب قلم پکڑنا بھی بھول گیا ہوں۔کمپیوٹر پر میرا اردو پروگرام اتنا موثر ہے کہ میں ساری خط و کتابت اسی کے ذریعے کرتا ہوں۔اس اردو فائل کو پھر ان پیج فائل میں یا گف فائل میں ای میل سے

بھیج دینا میرے لئے سیکنڈوں کا کام بن گیا ہے۔پوری کتاب یا رسالے کی فائل ایک ای میل سے میرے پاس پہنچ جاتی ہے اور ایک کلک سے میں اسے بیک وقت کئی دوستوں تک پہنچا سکتا ہوں۔

اب میرے زیادہ تر دوست وہی ہیں جو کسی نہ کسی طرح انٹرنیٹ سے منسلک ہو گئے ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے سابقہ دوستوں کو فراموش کر دیا ہے۔ان سب کو یاد کرتا رہتا ہوں لیکن ان سے اب خط و کتابت والا تعلق موثر طور پر برقرار نہیں رکھ سکتا۔اس وجہ سے بہت سے دوست مجھ سے شاکی ہیں اور ان کی شکایت بجا ہے۔لیکن کیا کروں کمپیوٹر نے مجھے اسیر کر لیا ہے۔اہم ادباء میں وزیر آغا،جوگندر پال،فتح محمد ملک،شمس الرحمٰن فاروقی،شمیم حنفی اور ان کی اہلیہ صبا حنفی،الطاف احمد اعظمی،رشید امجد،صلاح الدین پرویز،سلطان جمیل نسیم،داؤد رضوان،منظر حسین،ڈاکٹر شفیق،ڈاکٹر انور صابر،منزہ یاسمین،مرتضیٰ اشعر،فیصل ہاشمی،رفعت مرتضیٰ اور سنجئے گوڑ بولے سے کبھی کبھار ای میل سے رابطہ ہو جاتا ہے۔منشا یاد،امین خیال،اسلم بدر،کرشن مہیشوری،احمد سہیل،سعادت سعید،عارف فرہاد،وسیم عالم،ارباب بزمی،ارشد خالد،رؤف خیر،صفدر ہمدانی،جواز جعفری سے بھی وقتاً فوقتاً رابطہ رہتا ہے۔یوں تبسم کاشمیری،ڈاکٹر لڈمیلا،فاروق باؤچہ اور متعدد دیگر شعراء و ادباء بھی رابطہ میں رہتے ہیں۔اکبر حمیدی نے بھی ایک دو بار منشا یاد کے توسط سے ای میل سے رابطہ کیا ہے۔یقیناً اور بھی کئی دوست رابطے میں رہتے ہیں اور میں فی الوقت ان کے نام بھول رہا ہوں۔'یا ہو' یا 'ہاٹ میل' پر چیٹنگ کرتے ہوئے بھی کئی ادبی دوستوں سے گپ شپ رہی ہے۔بعض دوستوں کے ساتھ ویب کیمرے کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے۔یعنی ہم دونوں ایک دوسرے کو Live دیکھ رہے ہوتے ہیں اور گفتگو بھی کر رہے ہوتے ہیں۔سو یوں مجھے انٹرنیٹ پر ادبی دوستوں کی ایک بھری پری محفل ملی ہوئی ہے۔اس وقت میرے بے حد قریبی حلقہ میں خورشید اقبال،کاشف الہدیٰ،نذر خلیق،سعید شباب،ریحانہ احمد،عاصمہ خان اور عمر کیرانوی شامل ہیں۔

چند دن پہلے میرے ایک کرم فرما مسعود ہاشمی صاحب تشریف لائے اور بتانے لگے کہ سال ۲۰۲۵ء تک دنیا ایٹمی جنگ سے تباہ ہو جائے گی۔میں نے انہیں کہا کہ دنیا تباہ نہیں ہونی چاہئے،کیونکہ میں اس جنگ کے باوجود زندہ بچ جاؤں گا لیکن پھر محض کمپیوٹر نہ ہونے کی وجہ سے مر جاؤں گا۔اگرچہ یہ بات مزاح کے رنگ میں کہی گئی تھی لیکن واقعی کمپیوٹر میری بہت بڑی ضرورت اور اس سے بھی بڑی کمزوری بن گیا ہے۔

پاکستان،انڈیا،امریکہ،کنیڈا،روس،فرانس،برطانیہ،ترکی،آسٹریلیا،جاپان تک پھیلے ہوئے

میرے سارے ادبی دوست کمپیوٹر کی بدولت مجھ سے صرف ایک ہلکی سی کلک کے فاصلے پر ہیں اور میں ان سے جب چاہوں رابطہ کر لیتا ہوں۔اتنا برق رفتار،اتنا سستا اور اتنا موثر رابطہ جو پرانی داستانوں میں محض کہانی کے طور پر آتا تھا میرے عہد کی ایک حقیقت بن کر میرے تجربے میں آرہا ہے۔

اردو میں لکھنے کا کوئی کام ہو میں کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے اطمینان سے کر لیتا ہوں۔دن میں کتنی ہی ای میلز آتی ہیں اور اسی وقت ان کا جواب میری طرف سے چلا جاتا ہے۔میری ان مصروفیات کی وجہ سے میری بیوی نے میرے کمپیوٹر کے کمرے کو''سوتن کا کمرہ'' کہنا شروع کر دیا ہے۔ای میلز اور چیٹنگ کے تعلق سے جتنا کچھ لکھ چکا ہوں اسی حوالے سے یہاں صرف آج ۱۳؍جنوری ۲۰۰۴ء کو موصول ہونے والی ای میلز بھیجنے والے احباب کے نام لکھ دیتا ہوں۔عمر کیرانوی (دہلی)،نذر خلیق (خانپور)،ریحانہ احمد (کنیڈا)،بشارت احمد استاد (گلبرگہ) ، ناصر عباس نیر (جھنگ) ترنم ریاض (دہلی)،دانش طاہر (کراچی)،علی اختر رانا (لاہور)،عارف فرہاد (راولپنڈی۔آف لائن میسج)،ایک رائٹرز فورم کی ٹریش قسم کی چار پانچ ای میلز اور بعض کمپنیوں کی اشتہاری ای میلز میں نے کھولے بغیر ضائع کر دیں۔

آج ہی ان دوستوں سے براہِ راست چیٹنگ ہوئی۔ناصر عباس نیر (جھنگ)،سلمان (ڈاکٹر شفیق احمد کا صاحبزادہ۔بھاولپور) ، لقمان (میرا بھانجہ۔کراچی)، دانش (میرا بھتیجا۔کراچی) ریحانہ احمد (کینیڈا)،نادرہ سلطانہ (امریکہ)۔

کمپیوٹر سے اتنی وابستگی کے باوجود میری ایک کمزوری کسی حد تک تکلیف کا باعث بھی ہے۔میں نے ٹائپ رائٹنگ نہیں سیکھی ہوئی،اس لئے دس انگلیوں کے بجائے صرف دو انگلیوں سے کام کرتا ہوں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دونوں بازوؤں کی کہنیوں میں تکلیف ہوتی رہتی ہے۔؎ انگلیوں سے درد اٹھا،کہنیوں تک آ گیا

لیکن ادب سے وابستگی،اور بیک وقت تینوں زمانوں سے جڑے رہنے کا جنون ابھی تک کسی تکلیف کو خاطر میں نہیں لا رہا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات ''دمبدم''
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ میرے گزشتہ برس کی یادوں کی ایک جھلک تھی۔۔۔۔ایسی یادیں جو مجھے اپنے حال سے باخبر اور مستقبل پر نظر رکھنے کی قوت دیتی ہیں۔

☆☆☆

نوٹ: ان یادوں کو لکھنے کے بعد یاد آیا کہ ان اہم دوستوں کے ساتھ بھی کبھی کبھار انٹرنیٹ سے رابطہ رہتا ہے۔شان الحق حقی، احمد ہمیش، انجلا ہمیش، مسعود منور، رحیم انجان، ڈاکٹر کرسٹینا ، ارشاد ہاشمی ،حمید شاہد، ہارون عباس اور قمر علی عباسی۔۔۔یقیناً ابھی اور بھی کئی نام ہیں جو فوری طور پر یاد نہیں آ رہے۔

☆☆☆ موجودہ ایڈیشن کی اشاعت تک ان دوستوں کے ناموں میں بے شمار حد تک اضافہ ہو چکا ہے۔

(حیدر قریشی)

☆☆☆

دو ماہی گلبن لکھنئو۔شمارہ: مئی، جون ۲۰۰۴ء

روزنامہ جنگ لندن کے ادبی صفحہ پر سال کے شروع میں ہی یہ باب دو قسطوں میں شائع کیا گیا۔

رپورتاژ

ماریشس میں ورلڈ اردو کانفرنس

ماریشس کے ادارہ نیشنل اردو انسٹیٹیوٹ اور اردو اسپیکنگ یونین کے اشتراک سے ۲؍اگست تا ۶؍اگست ۲۰۰۳ء ورلڈ اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس سلسلہ میں پاکستان اور انڈیا سے سرکاری وفود کے علاوہ انڈیا، روس، امریکہ، انگلینڈ اور جرمنی سے ادیبوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ماریشس کی منسٹری آف آرٹ اینڈ کلچر نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے بھرپور تعاون کیا۔

مجھے ۲؍جولائی ۲۰۰۳ء کو نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری فاروق باؤچہ صاحب کی ای میل ملی۔ جس میں اس کانفرنس کے انعقاد کی اطلاع کے ساتھ مجھے مدعو کرتے ہوئے ایئر ٹکٹ بھیجنے کی خبر بھی تھی۔ تیرہ سال پہلے ماریشس میں ورلڈ اردو کانفرنس ہوئی تھی اور اب یہ سیکنڈ ورلڈ اردو کانفرنس ہونے جا رہی تھی۔ ائر ماریشس کے توسط سے مجھے ریٹرن ٹکٹ بھیج دی گئی تھی جو میں نے ۲۵؍جولائی کو وصول کی۔ ویزہ کے حصول کے لئے میں فرینکفرٹ سے برلن جانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ ۲۵؍جولائی کو ماریشس کے سفارت خانہ کو فون پر اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ اگلے دو دن دفتر بند تھے۔ ۲۸؍جولائی کو سفارتخانہ کی طرف سے ٹیلی فون آیا کہ آپ فلاں فلاں کاغذات فیکس سے بھیج دیں۔ کاغذات فیکس کے ذریعے بھیج دیئے تو پھر ٹیلی فون آ گیا کہ الفاظ مدھم ہیں پڑھے نہیں جاتے۔ اب فلاں فلاں کوائف بتا دیں۔ کوائف بتا دیئے تو وہ لوگ باقی کاروائی کرتے رہے۔ ۳۰ جولائی کو مجھے بذریعہ فیکس ویزہ موصول ہو گیا۔ اور اسی دن سفارتخانہ والوں نے ایک بار پھر فون کر کے تصدیق کر لی کہ مجھے ویزہ مل گیا ہے یا نہیں؟ یاالٰہی یہ کیسا سفارتخانہ ہے!۔۔۔۔۔ ۳۱؍جولائی کی شام کو میں ماریشس کے لئے روانہ ہوا۔

یکم اگست کو ماریشس ائیرپورٹ سے سیدھا اس ہوٹل میں پہنچایا گیا جہاں قیام رہنا تھا۔ ہوٹل میں پہلے مرحلہ ہی میں ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد ماہلی، قمر علی عباسی، نیلوفر عباسی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر زاہد، ابوالکلام قاسمی، (تاشقند کے) تاش مرزا، آزاد شاماتوف اور دیگر احباب سے ملاقات ہوئی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی سے ملاقات میں ایک دلچسپ لطیفہ ہو گیا۔ انہوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا نام بتایا

تو میرے کانوں نے کچھ اس قسم کا نام سنا۔ عبداللہ خان کاظمی۔۔۔ وہ یاد دلا رہے تھے کہ جب جدید ادب خانپور سے نکلتا تھا تو ہمارا رابطہ تھا۔ لیکن مجھے کوئی عبداللہ خان کاظمی یاد آتے تو کچھ کہتا۔ بس رسمی مسکراہٹ کے ساتھ چپ ہو رہا۔ دو دن یہی صورتحال رہی۔ ان کا پُرتپاک انداز مجھے شرمندہ کرتا رہتا لیکن کچھ یاد نہ آتا۔ دوسرے دن شام کو انہوں نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تو مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے اپنا بیگ صوفے پر رکھا اور بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔ ڈھیر ساری معذرت کی۔ اور ایک بار پھر ان سے گلے ملا۔ لیکن اس طرح کا ملنا خود ایک یادگار ملنا ہو گیا۔

یکم اگست کو ہمیں اندرا بھون لے جایا گیا۔ بس میں بیٹھے تھے کہ اچانک لگا کوئی چاند سا طلوع ہو گیا ہے۔ ''ارے قریشی صاحب! آپ بھی تشریف لائے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی''۔۔ یہ روس کی ڈاکٹر لڈمیلا تھیں۔ میرے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالحق بیٹھے تھے۔ آپ اقبال کے مداحوں میں سے ہیں۔ انہوں نے ادبی اور تعلیمی کرپشن کے بارے میں دکھ کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ یونیورسٹیوں میں کیا ہو رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کے پراجیکٹس میں گڑبڑ سے لے کر ادبی ہیرا پھیریوں تک انہوں نے بہت سی سچی باتیں کر ڈالیں۔ اسی دوران اندرا بھون آ گیا۔ یہاں کیرالہ کے گورنر اور بھارت کے سرکاری وفد کے سربراہ سکندر بخت کے اعزاز میں تقریب تھی۔ یہاں نہ کسی کو خوش آمدید کہا گیا، نہ کسی کا تعارف کرایا گیا۔ نہ کوئی رسمی کاروائی ہوئی۔ بس چلتے پھرتے کچھ کھایئے، پیجئے اور بس۔ اس کانفرنس کی سب سے فضول تقریب یہی تھی۔

تقریب سے واپسی پر ندا فاضلی کے ساتھ سیٹ ملی۔ ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ جرمنی کا نام سنتے ہی بتانے لگے ''شاعر'' ممبئی کے تازہ شمارہ میں جرمنی کی ایک شاعرہ اور افسانہ نگار کے بارے میں افتخار امام صدیقی نے کچھ چھاپا ہے۔ میں ''شاعر'' تو ابھی تک نہیں دیکھ سکا لیکن یہاں کے سارے عظیم شاعروں اور دانشوروں کی عظمت سے بخوبی واقف ہوں اس لئے شرمندگی سے چپ ہو رہا۔ ہوٹل پہنچے تو وہاں کھانے کی میز پر کشور ناہید اور پروفیسر فتح محمد ملک سے ملاقات ہوئی۔

دو اگست کو ناشتہ کافی تاخیر سے کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور شاہد ماہلی کے ساتھ ساحلِ سمندر تک گئے۔ واپسی پر انگلینڈ کے اردو اسکالر ڈیوڈ میتھیوز کو جدید ادب کا تازہ شمارہ دیا۔ دوپہر کو دو بجے کے بعد ورلڈ اردو کانفرنس کی افتتاحی تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں ماریشس کے وزیراعظم، وائس پریذیڈنٹ، آرٹ اور کلچر کے وزیر اور بعض دیگر وزراء بھی شریک ہوئے۔ اس تقریب کے بعد ابھی کچھ وقت باقی تھا

اس لئے مہمانوں کو ایک شاپنگ سنٹر لے جایا گیا تاکہ کوئی شاپنگ کرنا چاہیں تو کر لیں۔شاپنگ سنٹر سے باہر آ جانے کے بعد بھی ابھی کچھ وقت باقی تھا چنانچہ مہمانوں کو ’’ہرن غار‘‘ کا دور سے نظارا کرایا گیا۔یہاں سے سیدھا نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین شہزاد عبداللہ کے گھر لے جایا گیا۔وہاں ڈنر کا انتظام تھا۔ڈنر میں پاکستانی قائم مقام سفیر رحمت علی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ان کے علاوہ ماریشس کے نائب صدر،بعض وزراء،انڈیا کے سکندر بخت اور جملہ شعراء وادباء شامل تھے۔۔ڈنر کے بعد ہمیں ایک ڈراما دکھانے کے لئے لے جایا گیا۔یہ ڈرامہ ماریشس میں اردو کا پہلا اسٹیج ڈرامہ تھا جو مکمل لوکل پروڈکشن کا ثمر تھا۔’’رشتہ‘‘ کے نام سے دکھایا جانے والا یہ ڈرامہ فاروق رجل کا تحریر کردہ تھا اور رشید نیروا ،اس کے ڈائریکٹر تھے۔اولین لوکل پروڈکشن ہونے کے باعث اس ڈرامہ کے تمام اداکاروں کی،رائٹر اور ڈائریکٹر سب کی بہت پذیرائی کی گئی۔

تین اگست کو سارا دن سیر کرنے اور کہیں بیٹھ کر بریانی کھانے کے لئے ایک مناسب جگہ تلاش کرنے میں گزر گیا۔وہ جگہ ملی تو بریانی کھائی۔ڈاکٹر یاسمین اور خدا کا شکر ادا کیا۔اس تھکا دینے والے سفر کے بعد ہوٹل میں آ کر کچھ آرام کیا اور پھر ماریشس کے نائب صدر کی جانب سے دیئے گئے ڈنر میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔خیال تھا کہ یہاں بہت زیادہ رکھ رکھاؤ سے کام لینا پڑے گا۔۔۔۔لیکن یہ ڈنر بے تکلفانہ سا ہو گیا۔نائب صدر نے خود اعلان کیا کہ آپ بالکل بے تکلفی اور اطمینان کے ساتھ باتیں کریں۔پہلے کچھ رسمی طور پر جذبات کا اظہار کیا گیا۔احمد فراز،ندا فاضلی،فیضان عارف،قمر علی عباسی،نیلوفر عباسی،کشور ناہید اور ڈاکٹر لڈمیلا نے اپنے جذبات اور تاثرات کا اظہار کیا۔اس کے بعد سب اپنی اپنی میزوں پر گپ شپ میں مشغول ہو گئے۔میں جس ٹیبل پر تھا وہاں پروفیسر فتح محمد ملک،ندا فاضلی،پروفیسر امیر عارفی،ڈاکٹر خلیق انجم اور شاہد ماہلی بیٹھے تھے۔یہاں ندا فاضلی نے پہلے فیض کے بارے میں کہا کہ علی سردار جعفری ان سے بڑے شاعر تھے۔اس پر حیدرآباد کے قدیمی باسی پروفیسر امیر عارفی نے کہا کہ نہیں۔۔مخدوم سردار سے بڑے شاعر تھے۔(سردار جعفری کو فیض سے بڑا کہنے والی بات بعد میں جب میں نے ڈاکٹر لڈمیلا کو بتائی تو انہوں نے بڑا ہی بے ساختہ سا قہقہہ لگایا)۔بحث ذرا چھڑنے لگی تو ندا فاضلی نے بڑی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے کہا ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی لکھا ہے کہ فیض انجماد کا شکار ہو گئے تھے۔اس پر میں نے کہا کہ اس کے باوجود وزیر آغا مانتے ہیں کہ فیض ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی عطا تھے۔انہوں نے علی سردار جعفری کو تو کسی شمار میں ہی نہیں رکھا۔یہ ساری بحث اتنی مزیدار ہو رہی

تھی کہ احمد فراز جو نائب صدر کے ساتھ بیٹھے تھے وہیں سے جملوں کی صورت میں شرکت کرنے لگے۔اب بحث میں خاصی گرما گرمی ہوئی۔ندا فاضلی نے علامہ اقبال کے بارے میں ایک نامناسب سا جملہ کہا جس پر پروفیسر فتح محمد ملک جواب دینے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ ملک صاحب اس کا جواب نہ دینا ہی اس کا جواب ہے۔بہر حال گرما گرمی کے بعد مسکراہٹوں پر بات ختم ہوئی۔ندا فاضلی ہماری ٹیبل سے اٹھ کر چلے گئے تو احمد فراز مسکراتے ہوئے ہماری ٹیبل پر آ گئے۔وہ اس ساری بحث کا مزہ لیتے رہے تھے۔

چار اگست کو کانفرنس کا اصل اور اکیڈمک سیشن شروع ہوا۔افتتاحی تقریب کے لئے اسلام بھگن (پرنسپل ایونٹس منیجمنٹ آفیسر۔منسٹری آف آرٹ اینڈ کلچر) نے ماریشس میں اردو کی صورتحال پر روشنی ڈالتے ہوئے اسٹیج پر چند کلمات کہے۔ان کے بعد عنایت حسین عیدن نے افتتاحی خطبہ کے آغاز کے لئے پروفیسر فتح محمد ملک کو دعوت دی۔

پروفیسر فتح محمد ملک کو افتتاحی خطبہ کے لئے انتظامیہ کی طرف سے چند نکات دیئے گئے تھے کہ ان کے حوالے سے کچھ کہئے گا۔۔انہوں نے فی البدیہہ خطبہ دیتے ہوئے بعض ایسی باتیں کہہ دیں جو کانفرنس کے ہندوستانی مندوبین کے لئے کافی مشکل ہو گئیں۔چنانچہ دوران خطبہ بھی ہلکا سا ردِ عمل ہوا۔لیکن خطبہ کے بعد ٹی بریک میں چائے کی ہر پیالی میں طوفان اٹھ رہا تھا۔اصلاً پروفیسر فتح محمد ملک نے جو مثالیں دے کر اپنی بات واضح کرنا چاہی تھی،اس کے لئے یہ فورم مناسب نہیں تھا۔چنانچہ ایسا لگ رہا تھا کہ اب اگلے سارے سیشن اسی تنازعہ کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔افتتاحی خطبہ کے بعد پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے ذمہ تھی۔میں جموں کے ظہور الدین،دہلی کے ڈاکٹر خلیق انجم اور دوسرے دوستوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔دوسری طرف دیکھا تو وہاں احمد فراز بھی نہ صرف یہی کام کر رہے تھے بلکہ ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ بھی تقریباً وہی الفاظ کہہ رہے تھے،جو میں ہندوستانی دوستوں کے لئے کہہ رہا تھا۔آخر طے یہ ہوا کہ دونوں صدور اپنی صدارتی تقریر میں اس مسئلہ کو اپنے موقف کے ساتھ سمیٹ لیں گے اور اس کے بعد اسے مزید اچھالا نہیں جائے گا۔خدا کا شکر ہے کہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔(ویسے اس کانفرنس کا آخری سیشن اسی نکتے پر مکمل ہوا جو پروفیسر فتح محمد ملک نے اپنے افتتاحی خطبہ میں پیش کیا تھا۔لیکن چونکہ بات کسی پاکستانی کے منہ سے نہیں نکلی تھی بلکہ ماریشس والے خود وہی بات کہہ رہے تھے،اس لئے کوئی ہنگامہ نہیں ہوا)۔

پہلے سیشن کے صدور تھے پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی۔۔۔۔۔نظامت کے

فرائض ادا کر رہے تھے صابر گودڑ۔ سب سے پہلے پڑھے جانے والے پروفیسر محمد زاہد کے مضمون کا عنوان تھا ''ہندوستان میں اردو زبان کی صورت حال'' لیکن ان کی گفتگو کا دائرہ علی گڑھ تک محدود رہا۔ شاہد ماہلی کا مقالہ ''اکیسویں صدی میں اردو کے مسائل'' پر تھا۔ انہوں نے اس ضمن میں بعض عمدہ تجاویز پیش کیں۔ تیسرا مقالہ انور سعید کا تھا جس میں انہوں نے برصغیر میں ادب کی صورتحال پر روشنی ڈالی۔ چوتھا مقالہ ڈیوڈ میتھیوز کا تھا۔ ''اردو ادب ۔۔ مسرت اور غم''۔ وقت کی کمی کے باعث وہ صرف خوشکن صورتحال ہی بیان کر سکے۔ غم کا فسانہ بیان ہونے سے رہ گیا۔ پانچویں نمبر پر قمر علی عباسی تشریف لائے۔ انہوں نے زبانی تقریر کی۔ اردو کے سلسلے میں اچھی اچھی باتیں کیں اور بتایا کہ اردو کسی مذہب کی زبان نہیں ہے۔ آخر میں اس سیشن کے دونوں صدور پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور پروفیسر شمیم حنفی نے صدارتی خطاب کیا۔ ابوالکلام قاسمی نے بہت عمدگی، شائستگی اور مدلل طریقے سے نہ صرف اپنے موقف کو واضح کیا بلکہ اس انداز سے اپنی بات مکمل کی کہ افتتاحی خطبہ سے پیدا ہونے والی ساری تلخی دور ہو گئی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے عالمانہ انداز سے اور اختصار کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ساری بحث کو سمیٹا۔

پہلا سیشن مکمل ہونے کے بعد لنچ کا پروگرام تھا۔ لنچ کے بعد دوسرا سیشن شروع ہوا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز اور رضا علی عابدی نے کی۔ نظامت ابنِ کنول نے کی۔ سب سے پہلے فیضان عارف نے ''انگلینڈ میں اردو'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا۔ ان کے بعد خال مرزا اوف تاش مرزا نے ازبیکستان میں اردو کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ تیسرے نمبر پر ریاض گوکھل نے ''ماریشس میں اردو ادب'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ بہت سے مندوبین کے لئے اتنا معلوماتی تھا کہ وقت کی کمی کے باوجود اسے زائد وقت دیا گیا۔ ان کے بعد ''انگلینڈ میں اردو'' کے موضوع پر عبدالغفار عزم نے تقریر کی۔ ان کے بعد مجھے اپنا مقالہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا۔ میں نے مغربی ممالک میں ادب کی صورتحال کو ادب کے مرکزی دھارے کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ مغربی ممالک میں جعلی شاعروں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی کہ کس طرح پچاس سال کے بعد یکا یک کوئی شاعر بن کر نمودار ہوتا ہے اور دو سال میں تین مجموعوں کا خالق بن جاتا ہے۔ اس کے ذمہ دار انڈیا اور پاکستان کے وہ استاد شعراء ہیں جو بھاری معاوضے پر انہیں پورے پورے شعری مجموعے لکھ کر دے رہے ہیں۔ میرا مقالہ ختم ہوتے ہی مجھے اسٹیج پر سب سے پہلے ڈاکٹر لڈمیلا نے بے حد تپاک کے ساتھ ہاتھ ملا کر مبارکباد دی۔ بعد میں مجھے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، صبا حنفی، نیلوفر عباسی

نے خصوصی طور پر مقالہ کی تعریف کی۔ خلیق انجم اور فتح محمد ملک نے تو اسے انجمن ترقی اردو دہلی اور مقتدرہ اسلام آباد میں چھاپنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ میرے بعد ڈاکٹر لڈمیلا ویسی لیویا نے اپنے مخصوص انداز میں ''روس میں اردو'' مقالہ پیش کیا۔ ان کے مقالہ کے بعد رضا علی عابدی اور ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز دونوں نے صدارتی تقاریر کیں۔

اس سیشن کے بعد پہلے ہمیں ہوٹل لے جایا گیا۔ وہاں سے کچھ تیاری کے بعد ماریشس میں شیزان ہوٹل لے جایا گیا۔ یہاں پاکستانی ہائی کمیشن کی جانب سے سب کے لئے ڈنر کا انتظام تھا۔ ڈنر کے فوراً بعد مشاعرہ تھا۔ سو شیزان ہوٹل سے مشاعرہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مشاعرہ کی نظامت ندا فاضلی نے کی۔ صدارت احمد فراز کر رہے تھے۔ تین مقامی شعراء نے کلام سنایا۔ یہ تھے جناب طاہر صاحب، جناب صابر گودڑ صاحب اور ناز انور عثمانی صاحب۔ مجھے آخر الذکر بطور شاعر اچھے لگے جبکہ صابر گودڑ مقالہ نگاری میں بہت محنت کر رہے ہیں۔ ویسے ماریشس کے شعراء کو مقامی شعراء کہنے کے بجائے وہاں کے نیشنل لیول کے شعراء بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے بعد ان شعراء نے باری باری اپنا کلام سنایا۔ پاپولر میرٹھی، اے جی عزم، فیضان عارف، حیدر قریشی، شاہد ماہلی، زمان آزردہ، امیر عارفی، شمیم حنفی، ظہور الدین، کشور ناہید، ندا فاضلی اور احمد فراز۔ حاضرین بالکل خاموشی کے ساتھ کلام سن رہے تھے۔ ہمارے مشاعرہ کے شعراء کو ان کی خاموشی کھل رہی تھی۔ لیکن مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ وہ شعراء کو نہ صرف توجہ سے سن رہے ہیں بلکہ اچھے اشعار سے لطف بھی اٹھا رہے ہیں۔ ''واہ واہ۔۔ اور۔۔ مکرر'' کے لایعنی شور سے پاک یہ مشاعرہ مجھے اچھا لگا۔ رات کو دیر گئے اپنے ہوٹل پہنچے اور بے سدھ ہو کر سو گئے۔

پانچ اگست کو اس کانفرنس کے اکیڈمک سیشن کا تیسرا اجلاس تھا۔ اس اجلاس کے صدور تھے پروفیسر اصغر عباس اور پروفیسر انیس اشفاق۔ نظامت پروفیسر محمد زاہد کر رہے تھے۔ ''اردو تعلیم'' کے موضوع پر ہونے والے اس سیشن کی پہلی مقالہ نگار ڈاکٹر ظلِ ہما تھیں۔ ان کے بعد صابر گودڑ نے ''ماریشس میں اردو کی تعلیم'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ان کے بعد صبا حنفی صاحبہ نے پری پرائمری کلاسز میں اردو پڑھانے کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ یہ بہت ہی عمدہ اور معلوماتی مقالہ تھا۔ ان کے بعد پروفیسر قاضی افضال حسین نے اردو کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے موضوع پر تقریر کی۔ انہوں نے اپنے موقف کو مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کیا اور حاضرین کو بھی پُر امید کر دیا۔ پروفیسر الطاف اعظمی کا موضوع بھی یہی تھا۔ تاہم انہوں نے ہمدرد یونیورسٹی کے حوالے سے کہا کہ ماریشس میں اس کا قیام اردو کے لئے

بھی اور طب کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔ان کی تجویز کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔آخر میں پروفیسر زمان آزردہ نے تیسرے میلینیئم میں اردو ٹیکسٹ بکس کے حوالے سے اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا۔ان کے بعد پروفیسر اصغر عباس نے اپنا صدارتی تقریر کا وقت بھی پروفیسر انیس اشفاق کو دے دیا۔انہوں نے تمام مقالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس سیشن کو سب سے بہترین مقالات کا سیشن قرار دیا۔اس کے ساتھ ہی چائے کے لئے وقفہ ہوا۔چائے کے وقفہ کے بعد کانفرنس کا چوتھا سیشن شروع ہوا۔اس کی صدارت پروفیسر زمان آزردہ اور پروفیسر فتح محمد ملک نے کی اور نظامت رحمت علی نے کی۔اس سیشن میں نیلوفر عباسی،رضا علی عابدی اور ایرینا وغیرہ نے مقالات پڑھنے تھے۔اس سیشن کے دوران کانفرنس کی ریزولیشن کمیٹی کا اجلاس تھا۔ریزولیشن کمیٹی میں شامل ہونے کی وجہ سے میں اس سیشن کے مقالات سننے سے محروم رہا۔ریزولیشن کمیٹی کا احوال ذرا آگے چل کر آئے گا۔

اس سیشن کے بعد لنچ بریک ہوا۔اور اس کے بعد کانفرنس کا پانچواں سیشن شروع ہوا۔اس کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر لڈمیلا نے کی جبکہ نظامت کے فرائض سعید میاجون نے ادا کئے۔اہم اردو ناولوں کے ذکر پر مبنی ڈاکٹر ابن کنول کا مقالہ بڑی حد تک متوازن تھا۔''بیسویں صدی میں غزل''پروفیسر انیس اشفاق کے مقالہ کا موضوع تھا۔بہت زیادہ پھیلے ہوئے موضوع کو انہوں نے بڑے سلیقے کے ساتھ چار حصوں میں بانٹ کر پوری صدی کے مختلف ادوار کی غزل کو یوں سمیٹا کہ سچ مچ دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ان کے بعد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے''مہجری ادب اور ہجرت کا مسئلہ''کے موضوع پر اپنا پُر مغز مقالہ پیش کیا۔آخر میں پروفیسر ظہورالدین نے اردو میں''ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم''کے موضوع پر معلوماتی مقالہ پیش کیا۔مقالات کے بعد ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر لڈمیلا دونوں نے اپنے اپنے صدارتی خطاب میں پیش کئے گئے مقالات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

۶ راگست کو کانفرنس کا چھٹا اور آخری اکیڈمک سیشن شروع ہوا۔صدارت پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور ڈاکٹر امیر عارفی کر رہے تھے اور نظامت ریاض گوکھل نے کی۔اس سیشن کا مرکزی موضوع تھا اردو مسلم کلچر کی نمائندہ۔جو بات پروفیسر فتح محمد ملک نے افتتاحی خطبہ میں کہی تھی وہی سخن گسترانہ بات اب سیشن کے''اکیڈمک مقطع''میں آپڑی تھی۔پروفیسر عبدالحق،اے رحمت علی اور آزاد شاما توف نے اپنے اپنے موضوعاتی دائرہ کار میں اسلامی کلچر اور اردو کے تعلق سے بہت سی اچھی اچھی باتیں کیں۔پروفیسر فتح محمد ملک نے اپنے مقالہ''اردو اور مسلم کلچر''میں مولویت اور صوفی ازم کے فرق کو واضح کرنے کے ساتھ جب

صوفیانہ رواداری اور اخوت و محبت کو اسلامی کلچر کی بنیاد بنایا تو ان سے کسی کو کوئی گلہ نہ رہا۔یوں جب اس کلچر کو اردو کے ساتھ جوڑا گیا تو سب خوش ہو گئے۔بات وہی تھی جو صدارتی خطبہ میں آئی تھی لیکن پہلے بیان میں روا روی کے باعث کچھ بے احتیاطی سی ہو گئی تھی اور اب آخری بیان میں وہی باتیں احتیاط کے ساتھ آگئی تھیں۔سو سب لوگ خوش ہوئے۔پروفیسر امیر عارفی اور ابوالکلام قاسمی نے سیشن کے اختتام پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔یہاں اکیڈمک سیشن کا اختتام ہو گیا۔

چائے کے وقفہ کے بعد کانفرنس کا ساتواں سیشن شروع ہوا۔اس میں ریزولیشن پیش ہونا تھا اور اس پر بحث کی گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔صدارت ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی۔نظامت اے۔رحمت علی کے ذمہ رہی۔ریزولیشن کمیٹی میں ڈاکٹر خلیق انجم،پروفیسر شمیم حنفی،شہزاد عبداللہ،اسلام بھگن،عبدالغفار عزم،فیضان عارف اور حیدر قریشی شامل تھے۔ریزولیشن کمیٹی نے''عالمی اردو نیٹ ورک''کے نام سے ایک ادارہ کی تشکیل کی سفارش کی۔جس کے ابتدائی مراکز ماریشس،انڈیا،پاکستان اور انگلینڈ میں ہوں گے۔بعد میں ان میں اضافہ بھی کیا جاتا رہے گا۔عالمی سطح پر اردو دنیا کو مربوط اور یکجا کرنے کا یہ ایک بہت بڑا منصوبہ ہے۔لیکن اتنا پھیلا ہوا ہے کہ دستیاب وسائل کو دیکھتے ہوئے میں اس کی کامیابی کی امید پر کچھ تحفظات رکھتا ہوں۔میں نے اس کمیٹی میں ایک ذمہ داری قبول کی اور وہ یہ کہ عالمی اردو نیٹ ورک کی جو ویب سائٹ قائم کی جائے گی اس کی ساری ذمہ داری میں اٹھانے کو تیار ہوں۔میں نے یہ ذمہ داری اپنے دوستوں خورشید اقبال(اردو دوست ڈاٹ کام) اور کاشف الہدیٰ(اردوستان ڈاٹ کام) پر اپنے بھروسے کے باعث بے دھڑک اٹھالی تھی۔مجھے یقین ہے کہ میرے یہ دوست مجھے شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔

پہلے ریزولیوشن انگریزی میں پیش کیا گیا پھر ڈاکٹر خلیق انجم نے اسے اردو میں بیان کیا۔

جب ریزولیوشن پیش ہوا تو بعض دوستوں نے کہا کہ ممالک کی فہرست میں امریکہ اور کینیڈا کو بھی شامل کیا جائے۔اصولی طور پر اس رائے کو تسلیم کر لیا گیا۔رضا علی عابدی صاحب نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ ویب سائٹ کیسے اتنی جلدی بنالیں گے۔ان کے جواب میں مجھے اسٹیج پر آنا پڑا۔میں نے کہا کہ جہاں تک ویب سائٹ کے پراجیکٹ کا تعلق ہے میں تمام حاضرین کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ جب مجھے تنظیم کی جانب سے میٹر فراہم کر دیا جائے گا،میں دوماہ میں ویب سائٹ کو آن لائن کرادوں گا(اس اعلان پر حسبِ توقع حاضرین کی طرف سے پُر زور تالیاں بجائی گئیں)۔بہر

حال ریزولیوشن منظور کرلیا گیا۔اب عمل درآمد کی نوبت کب آتی ہے یہ دیکھنا ہوگا۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے ریزولیوشن پر ہونے والی بحث کو سمیٹا اور پھر لنچ بریک ہوگیا۔

لنچ کے بعد کانفرنس کا آٹھواں اور بالکل آخری سیشن شروع ہوا۔اس کی صدارت کشور ناہید اور پروفیسر الطاف اعظمی نے کی۔نظامت اسلام بھگن نے کی۔دوران اجلاس آرٹ اور کلچر کے وزیر ایم۔رام داس بھی تشریف لے آئے۔فاروق حسنو نے اکیڈمک سیشن کے تمام مقالات کی رپورٹ پیش کی۔ان کو بلانے سے پہلے بتایا گیا کہ انہوں نے ہر مقالہ کے خلاصہ کو ایک دوسطر میں سمو کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔چنانچہ جب فاروق حسنو ڈائس کی طرف آنے لگے تو میں نے کہہ دیا''لایئے صاحب! اپنے کوزے''۔۔۔اس پر کشور ناہید نے اپنی کرسئ صدارت سے ہی کہا''پر۔۔مصری اپنی اپنی''۔۔۔

فاروق حسنو کی رپورٹ کے بعد اسکول کے بچوں کو ان کی مختلف کامیابیوں پر انعامات دیئے گئے۔

تقسیم انعامات کے بعد ووٹ آف تھینکس کے لئے فاروق باؤچہ کو آنا تھا لیکن ان کی جگہ کوئی اور دوست آ گئے۔ان کا نام اب یاد نہیں رہا۔

اپنے طور مجھے اس کانفرنس کی بعض باتیں اور بعض پہلو اچھے لگے۔سب سے پہلے تو یہ کہ اس کانفرنس کے کرتا دھرتا شہزاد عبداللہ اور سیکریٹری فاروق باؤچہ اردو کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے ضروری نہیں سمجھا کہ وہ خود کو بطور شاعر یا ادیب متعارف کرائیں۔ہمارے ہاں تو یار لوگ پہلے دوسروں سے شاعری لکھوا کر اپنے مجموعے چھپواتے ہیں اور اس کے بعد کانفرنسوں کا ڈول ڈالتے ہیں۔کانفرنس سے پہلے ہی میں نے پتہ کیا تھا کہ مجھے یہاں مدعو کرنے میں کس کا ہاتھ ہے۔معلوم ہوا پروفیسر شمیم حنفی نے میرا نام دیا تھا۔یہ میرے لئے خوشگوار انکشاف تھا۔میرا کبھی پروفیسر شمیم حنفی سے براہ راست رابطہ نہیں رہا۔اس کے باوجود انہوں نے میرا نام تجویز کیا۔میں نے اس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے مجھے مزید زیر بار کر دیا۔پروفیسر شمیم حنفی سے ملاقات کے دوران ان کی محبت کے باوجود مجھے ایک ڈر سا لگا رہتا۔جیسے اسکول کے زمانے میں بعض اساتذہ کا ڈر رہتا ہے۔ایسا ڈر جس میں احترام کا عنصر غالب ہوتا ہے۔میں نے جھجھک کے ساتھ انہیں یہ بات بتائی تو وہ مسکرائے،میری حوصلہ افزائی کے لئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ان کے برعکس ان کی اہلیہ بھابی صبا کے ساتھ تو میری جیسے ایک دم دوستی ہوگئی۔حالانکہ خواتین کے معاملہ میں تھوڑی سی جھجھک فطری بات ہوتی ہے۔بھابی صبا حنفی سے میری گپ شپ زیادہ رہی۔ڈاکٹر لڈمیلا سدابہار خاتون ہیں۔زندہ دل بھی اور صاحبِ علم بھی۔ان سے جتنی ملاقات

رہی خوشگوار رہی۔ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر فتح محمد ملک صاحب سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی۔ایک اور اچھی ملاقات پاپولر میرٹھی کے توسط سے پی کے آریا سے رہی۔ہندی جرنلزم کا جنون کی حد تک شوق رکھنے والے اس نوجوان کے دائرہ کار میں ٹی وی سے لے کر ادب تک سب کچھ آ گیا ہے۔آخری دن اس وقت مجھے عجیب سی خوشی ہوئی جب وہ ماریشس میں مقیم ایک ہندوستانی لڑکی کے ساتھ آئے۔وہ شرما فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔میں نے یونہی کہا کہ ہمارے بھی ایک شرما جی ہیں۔ہمت رائے شرما،اردو ماہیے کے بانی۔انہوں نے بے اختیار کہا وہ تو میرے پھوپھا جی ہیں۔ہمت رائے شرما جی سے میرے تعلق کی نوعیت کو جاننے والے دوست بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ تب مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔قمر علی عباسی اور ان کی اہلیہ نیلوفر عباسی امریکہ سے آئے ہوئے تھے۔عباسی صاحب نے جرمنی کا سفر نامہ لکھا ہے''اور دیوار گر گئی''۔اس میں میرے بعض جملے جس طرح انہوں درج کئے ہیں اس سے ان کے حافظہ کا قائل ہونا پڑا۔میں نے بڑی مشکل سے ایک لفظ کی غلطی ڈھونڈ نکالی۔''عباسی صاحب!میں نے سیلاب کہا تھا آپ نے طوفان لکھ دیا ہے''۔۔انہوں نے برجستہ کہا بالکل آپ نے سیلاب کہا تھا کمپوزر نے غلطی سے طوفان لکھ دیا''۔۔۔موت کو چھو کر واپس آنے والے قمر علی عباسی شدید تر نقاہت کے باوجود ویسے ہی زندہ دل تھے،جیسا انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔اللہ انہیں لمبی عمر عطا کرے۔

میری افغانی ٹوپی میرے لئے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں سے مفید رہی۔بیشتر ناواقف لوگ مجھے افغانستان سے آیا ہوا ادیب سمجھتے رہے۔اس کے نتیجہ میں بعض لوگ مجھ سے کچھ محتاط سے دکھائی دیئے تو بعض لوگ بڑی محبت کے ساتھ ملتے رہے۔آخری دن خوبصورت آنکھوں والی ایک خاتون چائے کے وقفہ کے دوران مجھ سے پوچھنے لگیں آپ افغانستان سے آئے ہیں؟میں نے مختصراً کہا نہیں۔پھر انہوں نے پوچھا پشاور سے آئے ہیں؟میں نے پھر کہا نہیں۔انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا پھر آپ کہاں سے آئے ہیں؟۔۔۔میں نے کہا بی بی آپ کو یہ سوال پہلے پوچھنا چاہئے تھا۔ویسے میں جرمنی سے آیا ہوں۔بی بی بہت حیران ہوئیں۔میں نے انہیں بتایا کہ جب ساری مغربی دنیا میں نائین الیون کے بعد افغانی باشندے اپنے آپ کو چھپاتے پھرتے تھے،میں وہ بے وقوف ہوں جو تب بھی فرینکفرٹ میں اسی ٹوپی کو پہن کر گھومتا پھرتا رہتا تھا۔اس خاتون کا نام تھا فیروزیہ نورنگ۔

اردو پروگرام کے فروغ کے لئے ڈاکٹر یاسمین نے طے کیا کہ آخری سیشن کے بعد میں ان کے ساتھ ان کے ہاں جاؤں گا۔وہاں ان کی بھتیجی صبا ہوگی جو آئی ٹی میں گریجوایشن کر رہی ہے۔میں

انہیں اردو پروگرام کو استعمال کرنے کے بارے میں بنیادی باتیں سمجھا دوں گا۔اردو ای میل بھیجنے کے دونوں طریقے بھی سمجھا دوں گا۔یعنی ان پیج فائل کی اٹیچ منٹ بھیجنا اور گف فائل بنا کر اردو میں ای میل بھیجنا۔یہ باتیں جاننے والوں کے لئے بہت معمولی سی ہیں لیکن نہ جاننے والوں کے لئے بہر حال حیرانی کی باتیں ہیں۔چنانچہ جب میں نے اردو میں ای میل کا کامیاب تجربہ کیا تو عزیزی صبا بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کرنے لگی۔اردو پروگرام کو کمپیوٹر میں کاپی کرنا۔پھر ''یوزرس ڈیفائنڈ کی بورڈ'' کو تیار کرنا اور پھر ای میل کے مراحل سے گزرنا یہ سب کچھ کرنے اور سمجھانے میں اتنی دیر ہو رہی تھی کہ الوداعی ڈنر پر جانا مشکل ہو گیا تھا۔میری طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں تھی۔چنانچہ میں نے ڈنر کو مس کر دیا اور اردو پروگرام کے لئے جتنا کچھ میرے بس میں تھا اسے آگے پہنچانے میں لگا رہا۔جبکہ الوداعی ڈنر میں وزیر اعظم اور نائب صدر دونوں نے آنا تھا۔

میرے مقالہ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے حوالے سے اردو کی چند اہم اور ادبی قسم کی ویب سائٹس کا ذکر آیا تھا۔اس پر ماریشس کے احباب نے خاص طور پر خوشی کا اظہار کیا۔میں ماریشس کے احباب کے لئے اپنا اردو پروگرام ''اردو۔۲۰۰۰'' لے گیا تھا۔چنانچہ کانفرنس کے دوران کمپیوٹر رکھنے والے دوستوں کو وہ سوفٹ ویئر دے دیتا تھا۔وہ اپنے کمپیوٹر میں اسے کاپی کر کے مجھے واپس کر دیتے۔کچھ اس کا اثر تھا۔آخر میں جب ویب سائٹ بنانے کی ذمہ داری بھی میں نے اپنے سر لے لی تو ساری کانفرنس نے مجھے اردو میں آئی ٹی کا ایکسپرٹ قرار دے دیا۔قاضی افضال حسین نے تو اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ حیدر قریشی کہتے ہیں کہ وہ دو ماہ میں ویب سائٹ بنوا دیں گے۔مجھے لگتا ہے دو ماہ سے بھی کم عرصہ میں ایسا کر دیں گے۔میں ان ساری باتوں پر اس لئے مسکراتا رہا کہ مجھے علم تھا جب اس تاثر کے بارے میں اپنے دوستوں خورشید اقبال اور کاشف الہدیٰ کو بتاؤں گا تو وہ بہت ہنسیں گے۔اور ان سے پہلے میرا بیٹا ٹیپو ہنسے گا جو مجھے انگلی پکڑ کر کمپیوٹر کو استعمال کرنا سکھاتا ہے۔چنانچہ بعد میں یہی ہوا۔لیکن مجھے خوشی ہے کہ ان سب کی وجہ سے سہی ماریشس میں اردو پروگرام بڑے پیمانے پر متعارف ہو رہا ہے، یہ بھی اردو کے فروغ کی ایک صورت ہے۔

☆☆☆

اخبارِ اردو۔۔اسلام آباد۔۔۔ شمارہ:اکتوبر۲۰۰۳ء

ماریشس سے واپسی کے بعد روزنامہ منصف حیدر آباد اور روزنامہ آبشار کلکتہ نے بھی انہیں دنوں میں اسے شائع کیا۔

۔۔۔ادبی کائنات میں رنگ

شعر و ادب میں مردانہ اور زنانہ ڈبوں والی کوئی بات نہیں رہی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی سوسائٹی میں خواتین کے مختلف رشتوں اور رنگوں سے حسن پیدا ہوا ہے۔میری زندگی پر میری والدہ کا جتنا گہرا اثر ہے وہ میری مختلف تحریروں میں بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔اردو میں والدہ کے حوالے سے اب کئی لوگ لکھنے لگے ہیں۔عام طور پر قدرت اللہ شہاب کے خاکے ''ماں جی'' کو اس نوعیت کا پہلا اردو نمونہ کہا جاتا ہے۔تاہم میں اپنی معلومات کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں کہ قدرت اللہ شہاب سے بھی بہت پہلے سر محمد ظفر اللہ خان نے ۱۹۳۸ء میں ایک مختصر سی کتاب ''میری والدہ'' شائع کی تھی۔اپنے کردار کی مضبوطی کے حوالے سے اور بعض دوسرے حوالوں سے بھی سر محمد ظفر اللہ خان کی والدہ کا کردار قدرت اللہ شہاب کی ''ماں جی'' سے کہیں زیادہ اہم دکھائی دیتا ہے۔لیکن کچھ ہماری اردو سوسائٹی کے بعض تحفظات اور تعصّبات کے باعث اور کچھ اردو ادب کے سنجیدہ قارئین میں سے بعض کی بے خبری کے باعث اردو میں ماں کے بارے میں لکھے گئے اس اولین شہ پارے کی طرف توجہ ہی نہیں جا سکی۔میرا خیال ہے کہ سر محمد ظفر اللہ خان اور قدرت اللہ شہاب کے بعد اکبر حمیدی نے ''ماں جی'' کے عنوان سے ایک زبردست خاکہ لکھا جو ان کی والدہ کا نہیں بلکہ دادی کا خاکہ تھا۔دادی کو انگریزی میں گرانڈ مدر یعنی بڑی ماں کہتے ہیں۔سو یوں اکبر حمیدی نے اس خاکے کے ذریعے ماں کے رشتے کے ایک اور زاویے کو اجاگر کیا۔اکبر حمیدی کے بعد میں نے ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' کے عنوان سے اپنی امی جی کا خاکہ لکھا۔اس کے بعد جیسے والدہ کے بارے میں لکھنے والوں کی بہار آ گئی۔بعض دوستوں نے اپنی اپنی والدہ کے حوالے سے پوری کتابیں لکھ دیں۔اگرچہ ایسی کتابوں میں طوالت کے باعث جذباتیت زیادہ راہ پا گئی ہے تاہم ایک مثبت رویے کی طرف لکھنے والے دھیان تو دینے لگے، یہی بڑی بات ہے۔اپنی والدہ کے علاوہ میں نے اپنی بڑی بہن کا خاکہ ''محبت کی نمناک خوشبو'' اور اپنی اہلیہ کا خاکہ ''پسلی کی ٹیڑھ'' لکھا جنہیں ادبی دنیا میں کافی پسند

کیا گیا۔مجموعی طور پر میرے خاکوں اور یادوں میں ماں،دادی،نانی،بہن، بیٹی،ممانی، کے کردار براہ راست آئے ہوئے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی امی جی کے اثرات سے خود کو کبھی بھی آزاد نہیں کر سکتا بلکہ ان کے اثرات سے آزاد ہونا ہی نہیں چاہتا۔

عورت کے یہ سارے روپ میرے دل میں عقیدت،احترام اور محبت سے گندھے ہوئے ہیں۔اس پس منظر کے ساتھ اردو دنیا کی خواتین کے بارے میں غور کرنا شروع کیا تو مجھے لگا کہ وہاں عقیدت تو نہیں ہے لیکن بہت ساری ایسی ادبی خواتین ہیں جن کے لئے میرے دل میں احترام اور محبت کے جذبات ہیں۔کئی ہیں جن کے لئے دنیاوی سطح پر سہی لیکن اخلاص موجود ہے۔بعض خواتین کے منفی روپ بھی ہیں۔کئی ایسی ادبی خواتین ہیں جن سے ملنا میرے لئے ذاتی طور پر ایک اعزاز سے کم نہیں۔سو یادوں کے اس باب میں ادبی حوالے سے ایسی شاعرات اور ادیباؤں کو یاد کروں گا جن سے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ملاقات ہوئی ہے۔کہیں کہیں ادب سے غیر متعلق خواتین کا ذکر ناگزیر ہوا تو وہ بھی آجائے گا کیونکہ یادوں کا بہاؤ تو خواتین کی طرف ہے۔

قرۃ العین حیدر سے دوبار ملاقات ہوئی۔ایک بار جب وہ پہلی بار پاکستان آئیں تو ان کے اعزاز میں فیصل آباد کے چناب کلب نے ایک ادبی تقریب کا بھی اہتمام کیا تھا۔میں اس میں شریک ہوا تھا اور تقریب کے بعد بھی ان کے ساتھ تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی۔تاہم اس ملاقات کا حاصل فوٹو سیشن رہا۔کشور ناہید لاہور سے ان کے ساتھ آئی تھیں۔میں نے دیکھا کہ وہ جو بڑے بڑے مردوں کے سامنے مردانہ وار گفتگو کرتی ہیں وہی کشور ناہید ان کے سامنے سراپا نیاز بنی ہوئی تھیں۔قرۃ العین حیدر سے دوسری ملاقات سال ۲۰۰۰ء میں لندن میں ہوئی۔یہاں بھی ایک کانفرنس چل رہی تھی اور یہاں بھی سلام دعا،پہلی ملاقات کا ہلکا سا ذکر اور فوٹو سیشن۔فیصل آباد والی تصویر انہیں دنوں میں ماہنامہ ماہِ نو لاہور میں چھپی تھی اور لندن والی تصویر تو انگلینڈ اور جرمنی کے رسالوں میں چھپ چکی ہے۔پہلی ملاقات میں وہ زور آور دکھائی دی تھیں جبکہ اس بار وہ بہت کمزور لگ رہی تھیں۔تاہم ان کے ساتھ ملنا بھی میرے لئے ملاقاتِ مسیحا و خضر جیسی بات تھی۔

کشور ناہید کا ذکر ہوا ہے،ان کے بارے میں مثبت اور منفی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ان سے میری بہت زیادہ ملاقاتیں تو نہیں رہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں ہوئیں۔میں جدید ادب کی اشاعت کے سلسلے میں جب لاہور جاتا تھا تو مختلف ادباء سے ملا کرتا تھا۔کشور ناہید سے بھی سات آٹھ بار تو ملاقات ہوئی ہو

گی۔خوش مزاج اور لبرل خاتون ہیں۔مردوں کی محفل میں بیٹھ کر بھی پوری محفل پر چھا جاتی تھیں۔مرد حضرات زچ ہو کر پھر ان کے ساتھ مردوں جیسا رویہ اختیار کر لیتے۔ایک بار عید الفطر کے بعد ادیبوں کی عید ملن پارٹی ہوئی۔اس میں کشور ناہید حسبِ معمول خوب چہک رہی تھیں جبکہ ان کے شوہر یوسف کامران خاموش بیٹھے تھے۔کسی ادیب نے اس صورتحال کی طرف توجہ دلائی تو ڈاکٹر انور سدید کہنے لگے عید الفطر کے موقعہ پر کشور ناہید بولتی ہیں اور یوسف کامران چُپ رہتے ہیں اور عید الاضحیٰ پر یوسف کامران بولتے ہیں اور کشور ناہید خاموش رہتی ہیں۔ایک اور موقعہ پر پاکستان کے قومی ترانہ کے خالق حفیظ جالندھری کشور کے جملوں کی لپیٹ میں آ گئے۔انہیں کشور ناہید کے جملوں کا جواب نہیں سوجھ رہا تھا،آخر تنگ آ کر بولے:اگر میں نے تمہیں پہلے دیکھ لیا ہوتا تو قومی ترانے میں کبھی یہ مصرعہ شامل نہ کرتا۔

کشورِ حسین شاد باد!

مدت کے بعد ماریشس کی ادبی کانفرنس میں ان سے ملاقات ہوئی۔شفقت سے پیش آئیں۔لیکن جملہ بازی سے وہاں بھی باز نہیں آئیں۔رات کو مشاعرہ ہوا تھا۔میں نے اس میں جو غزل سنائی تھی،اس کے ایک شعر پر کشور نے داد دی۔

دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم
سو اب اس کے عشق میں گھلنے والے ہیں

اگلے دن ایک اجلاس کی صدارت کشور ناہید کے ذمہ تھی۔وہ کرسیٔ صدارت پر بیٹھی تھیں۔اسٹیج سیکریٹری اعلان کر رہے تھے کہ اب فلاں صاحب اسٹیج پر آ کر ساری کانفرنس کی تقاریر اور مقالات کا خلاصہ دو دو سطروں میں کوزے میں سمندر کی طرح بند کر کے پیش کریں گے۔جب وہ صاحب اسٹیج کی طرف جانے لگے تو میں نے صدا لگائی:لایئے صاحب! آپ اپنے کوزے۔اس پر کشور ناہید نے صدارت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہی جواب داغا:''پر۔۔۔مصری اپنی اپنی''۔

کشور ناہید غزل اور نظم کے میدان میں آگے چلتیں تو ان کے ہاں موجود امکانات بہتر طور پر سامنے آتے لیکن انہوں نے خود ہی نثری نظم کو سب کچھ مان کر شاعری کی دنیا میں اپنے تخلیقی امکانات کی راہیں مسدود کر دیں۔اس کے باوجود ان کے مجموعی ادبی کام کے حوالے سے بھی اور خواتین کے حقوق کے حوالے سے بھی انہیں ایک بہادر خاتون کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

۱۹۹۳ء میں دہلی میں مجھے امرتا پریتم سے تین چار بار ملنے کا موقعہ ملا۔حوض خاص کے علاقہ

میں ان کی رہائش گاہ پر ان سے طویل نشستیں ہوئیں۔تب اردو میں ماہیے کی بحث کا آغاز ہو رہا تھا، میں نے ان سے بھی اس موضوع پر بات کی۔عروضی حوالے سے تو انہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن جب میں نے ایک ماہیا گنگنا کر انہیں سنایا تو کہنے لگیں یہ تجربہ تو ساحرلدھیانوی کئی سال پہلے اردو میں کر چکے ہیں۔میں نے فلم نیا دور کا حوالہ دے کر ماہیا سنایا:

دل لے کے دغا دیں گے/یار ہیں مطلب کے/یہ دیں گے تو کیا دیں گے

میرے حافظہ کی تحسین کرنے لگیں۔ایک پاکستانی شاعر نے ان کی پنجابی نظموں کے اردو میں تراجم کئے تھے،امرتا پریتم ان سے مطمئن نہیں تھیں۔چنانچہ ہم نے طے کیا کہ وہ نظم سنائیں گی اور ساتھ کے ساتھ اردو ترجمہ کرتے جائیں گے۔اس طرح ان کی کوئی آٹھ دس نظموں کا ترجمہ کیا گیا۔افسوس کہ میں اپنی مسافرت میں وہ قیمتی کام کہیں گم کر بیٹھا ہوں۔امروز صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔اور امرتا کے بیٹے کو بھی دیکھا جس کی شکل ساحر سے ملتی ہے اور جس کا بہت سارا ذکر امرتا پریتم نے اپنی کتاب ''رسیدی ٹکٹ''میں کیا ہوا ہے۔امرتا پریتم نے جو کچھ لکھا ہے سب سچ ہوگا لیکن مجھے اس جوان کا ذہنی توازن کچھ گڑبڑسا لگا تھا۔

ایک بار ٹائمزآف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن میں ہندی کے ایک معروف ادیب (اس وقت نام ذہن میں نہیں آرہا) کا مضمون چھپا۔وہ ساحر کے اور امرتا کے پرانے دوستوں میں سے تھے لیکن اس مضمون میں انہوں نے امرتا کے بارے میں بعض نامناسب باتوں کا ذکر کیا تھا۔میں اسی روز سہ پہر کے بعد ملنے گیا تو گھر پر افسردگی اور ذہنی تناؤ کی سی کیفیت طاری تھی۔امروز غصہ میں دکھائی دے رہے تھے۔مجھے افسوس ہوا کہ میں ایسے موقعہ پر ان کے گھر کیوں چلا گیا۔بہر حال امرتا پریتم سے ملنا بھی میرے لئے ایک اعزاز رہا۔یہ ان سینیئرز میں سے ہیں جنہیں پڑھ کر ہمارے دلوں میں اپنے لئے ادب کی مزید نئی راہوں کی تلاش کی جستجو پیدا ہوئی۔

بانو قدسیہ سے صرف ایک بار اور ان کی کوٹھی پر ملاقات ہوئی۔اشفاق صاحب علیل ہو گئے تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ میں بھی ان کی عیادت کے لئے گیا۔اشفاق صاحب اور بانو قدسیہ کے لئے تو میں کوئی انجان سا نیا ادیب تھا لیکن خدا بھلا کرے ممتاز مفتی کا جو اسلام آباد سے اشفاق صاحب کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے۔جدید ادب کے حوالے سے میرا ان سے باقاعدہ رابطہ رہتا تھا سو انہوں نے اتنے تپاک سے ملاقات کی کہ اپنا کچھ بھرم سا رہ گیا۔تاہم بانو قدسیہ سے رسمی علیک سلیک ہی

ہوئی۔ان سے اصل ملاقات تو تب ہوئی جب ان کا ناول راجہ گدھ پڑھا۔عشرت آفریں (کراچی۔حال امریکہ)،حمیدہ معین رضوی (لندن) نوشی گیلانی (بہاولپور۔حال امریکہ) صفیہ صدیقی (لندن) سے سرسری ایک دو ملاقاتیں ہوئیں تاہم ان کا مثبت تاثر میرے ذہن میں رہا۔پاکستان کی آزادی کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے پاکستانی ادیبوں کا ایک وفد جرمنی میں آیا تھا۔تب انتظار حسین صاحب کو میں اپنے ہاں لے آیا۔اگلے روز انہیں جس گھر پر پہنچانے گیا وہاں پاکستانی وفد کے دوسرے افراد سے بھی ملاقات ہوئی۔میں نے ایک خاتون کو دیکھ کر استفسار کیا: آپ خالدہ حسین ہیں؟۔۔خالدہ حسین ان کے ساتھ بیٹھی تھیں اور وہ خاتون فہمیدہ ریاض تھیں۔عمر کے اس مقام پر بھی اچھی لگیں لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے ان کی بے باک شاعری کبھی اچھی نہیں لگی۔شاید یہ مرد شاونزم کی کوئی صورت ہو لیکن میرا تاثر ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے۔

ماہ طلعت زاہدی سے ایک بار بہاولپور میں ہونے والی ایک ادبی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی اور اس کے بعد ایک بار ان کے گھر ملتان میں ملاقات ہوئی۔دھان پان سی بی بی ماہ طلعت اپنے انداز کی بھلی شاعرہ ہیں۔اب بھی رسائل میں کہیں دکھائی دے جائیں تو انہیں پڑھ کر خوش ہوتا ہوں۔خانپور کی ایک شاعرہ تھیں سیدہ ماہ طلعت۔ان دونوں ماہ طلعتوں کے ناموں کا مسئلہ سامنے آیا تو خانپور کی ماہ طلعت، نے غزالہ طلعت کے قلمی نام سے لکھنا شروع کر دیا اور پھر بہت جلد ان کی شادی ہو گئی اور ان کی شاعری کا شوق اپنے انجام کو پہنچ گیا۔خانپور کی ایک شاعرہ شیما سیال تھیں۔اردو اور سرئیکی میں شاعری کرتی تھیں۔ان کی شادی کے بعد بھی شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ان کے مقابلہ میں ان کی چھوٹی بہن پروین عزیز میں شاعرانہ صلاحیت بہت عمدہ تھی۔خانپور کی سب سے اچھی شاعرہ انہیں کہا جا سکتا ہے۔شروع میں مجھ سے ان کے معاملہ میں کچھ زیادتی ہوئی، میں نے انہیں نظر انداز کیا۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے غلطی کا احساس ہوا۔میں نے اس کی تلافی کرنا چاہی لیکن تب تک وہ مجھ سے شدید خفا ہو چکی تھیں۔وہ شاعری کی طرف آئیں لیکن بے دلی سے۔اب خانپور میں ہی انگریزی کی پروفیسر ہیں۔تاہم میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میری زیادتی کی وجہ سے پروین عزیز نظر انداز ہوئیں اور اس سے اتنا دلبرداشتہ ہوئیں کہ ادب سے ہی کسی حد تک کنارا کر گئیں۔میں خود بھی پھر ادب کی دنیا میں انہیں واپس نہ لا سکا۔اور میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ پروین عزیز کو ابتدا میں اچھی حوصلہ افزائی کرنے والے احباب مل جاتے تو وہ یقیناً آج کی ایک معتبر شاعرہ ہوتیں۔ایسا نہیں ہوا تو یہ میرا ادبی گناہ ہے۔

خدا میرے ادبی بے انصافی کے گناہ کو معاف کرے۔

ثمینہ راجہ رحیم یارخان کے قریب ایک گاؤں راجہ کوٹ میں رہتی تھیں۔ان میں شروع سے ہی شاندار تخلیقی صلاحیتیں تھیں۔گاؤں کے ماحول میں تو شاید یہ صلاحیتیں پوری طرح ابھر نہ پاتیں تاہم انہوں نے ہمت سے کام لیا اور قسمت نے یاوری کی اور وہ جلد ہی اسلام آباد کے کشادہ ماحول میں پہنچ گئیں۔اردو کے ایک اچھے شاعر زمان ملک سے ان کی شادی ہوگئی۔پھر غالباً رشتہ زیادہ نبھ نہیں سکا۔تاہم ثمینہ راجہ نے بڑی بہادری کے ساتھ سماجی سطح پر بھی اور ادبی سطح پر بھی زندگی کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ثمینہ راجہ کو ادبی دنیا میں کافی حد تک پذیرائی ملی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا جو ادبی مقام بنتا ہے ابھی تک ان کے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا گیا۔میری ان کے ساتھ رحیم یارخان کے زمانے سے ہی خط وکتابت تھی۔ادبی رابطہ تھا۔تاہم ان سے بالمشافہ ملاقات غالباً ۹۲۔۱۹۹۱ء ہوئی تھی۔عذرا اصغر نے میری اسلام آباد میں آمد پر اپنے گھر میں ہی ایک ''گیٹ ٹوگیدر'' کا اہتمام کیا تھا۔ثمینہ راجہ بھی اس موقعہ پر آئی تھیں۔

عذرا اصغر کے گھر اور ان کے نام سے کچھ ان کا بھی ذکر ہو جائے۔ویسے میں ان کا خاکہ لکھ چکا ہوں جو میرے خاکوں کے مجموعہ میں شامل ہے۔میرے پہلے دو شعری مجموعے اور پہلا افسانوی مجموعہ عذرا اصغر نے اپنے اشاعتی ادارہ تجدید اشاعت گھر کی طرف سے شائع کئے تھے۔ان کے سرورق ان کی صاحبزادی شبہ طراز نے بڑی محنت کے ساتھ بنائے تھے۔شبہ طراز بیک وقت شاعرہ بھی ہیں اور مصورہ بھی۔ان سے بھی عذرا کے گھر پر ہی ملاقات ہوئی تھی،جہاں وہ اپنے سسرال سے آئی ہوئی تھیں۔ویسے فون پر تو کچھ عرصہ پہلے بھی میری شبہ اور عذرا دونوں سے بات ہوئی تھی۔میرا دل رکھنے کے لئے دونوں نے تھوڑے سے ماہیے بھی کہے تھے۔

ہندوستان میں کرشنا پال سے جوگندر پال جی کے ہاں ملاقات ہوئی۔جوگندر پال جی کی اہلیہ کرشنا پال یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں۔ہندی میں زیادہ تر لکھتی ہیں۔جوگندر پال جی کی کئی کہانیوں کے انہوں نے ہندی میں ترجمے کئے ہیں۔ان سے دہلی میں کئی بار ملاقات ہوئی۔مجھے ایک بار حدیث قدسی ''زمانے کو برا مت کہو،میں خود زمانہ ہوں'' کا اصل عربی متن درکار تھا۔کرشنا پال سے ذکر ہوا تو انہوں نے دوسرے دن مجھے عربی متن فراہم کر دیا۔پتہ چلا انہوں نے یونیورسٹی کے عربی یا اسلامیات کے پروفیسر سے پوچھ کر متن حاصل کر لیا اور مجھے دے دیا۔جوگندر پال جی اور کرشنا پال کی صاحبزادی سکریتا پال کمار انگریزی کی ڈاکٹر اور پروفیسر ہیں۔متعدد بین الاقوامی سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت کر چکی

ہیں۔انگریزی کی اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ان کی متعدد انگریزی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ان سے دو بار ملاقات ہوئی تھی اور گفتگو کرتے ہوئے اپنی کم علمی کا احساس ہوتا رہا تھا۔

ظفر پیامی کے قلمی نام سے لکھنے والے دیوان صاحب کی اہلیہ منورما دیوان اردو کی ممتاز صحافی ہیں۔یہ لوگ ہندو مسلم اتحاد کے داعیوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ان سے دو تین بار ملاقات ہوئی اور ہر ملاقات کا ایک گہرا نقش میرے دل پر موجود ہے۔کرشنا سوبتی ہندی کی پاپولر رائٹر ہیں۔دیوندر اسر مجھے ان سے ملانے لے گئے۔بہت اچھی طرح ملیں۔باتوں باتوں میں حضرت خواجہ غلام فرید کا ذکر چھڑا اور پٹھانے خان کا نام آیا تو کرشنا سوبتی بتانے لگیں کہ پٹھانے خاں ہندو تھے۔پاکستان بننے کے بعد وہاں رہ گئے تو مسلمان ہو گئے تاہم انہوں نے خواجہ غلام فرید کے در کی غلامی پکڑ لی۔خیال رہے کہ برصغیر کے مسلمان اولیاء کے مزاروں پر ہندو بھی اتنی ہی عقیدت سے حاضری دیتے ہیں جتنی عقیدت سے مسلمان حاضر ہوا کرتے ہیں۔کرشنا سوبتی کا کہنا تھا کہ پٹھانے خاں کے گلے میں جو درد اور سوز ہے وہ اسی المیہ کے بھیتر کی داستان ہے۔جیسے میرے لئے پٹھانے خاں کے بارے میں کرشنا سوبتی کے بیان کی تردید کرنا مشکل ہے اسی طرح میں اس کی تصدیق بھی نہیں کر سکتا۔مجھے اتنا یاد ہے اباجی بتایا کرتے تھے کہ وہ اپنے بچپن میں پٹھانے خاں کو سڑکوں اور بازاروں میں گاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ظاہر ہے تب پٹھانے خاں کا بھی بچپن ہی ہوگا۔اب تو حضرت خواجہ غلام فرید کا نام اور کلام ذہن میں آتے ہی پٹھانے خاں کا چہرہ بھی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔حیدرآباد دکن کی رہنے والی ممتاز افسانہ نگار جیلانی بانو سے ان کی پاکستان میں آمد پر ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔لیکن یہ بس رسمی سی ملاقات تھی۔شمیم حنفی کی اہلیہ صبا حنفی کے ساتھ ماریشس میں اچھی ملاقاتیں رہی تھیں۔شمیم حنفی کی صحبت نے ان کا ادبی ذوق نکھار دیا ہے۔بنیادی طور پر بچوں کی تعلیم ان کا شعبہ ہے لیکن جز وقتی شاعری بھی کرتی ہیں۔بہت ہی نفیس اور شائستہ خاتون ہیں۔

کسی زمانے کی معروف براڈ کاسٹر ثریا شہاب جرمنی میں رہ رہی تھیں۔ان سے ملاقات ہوئی تو تھوڑا ربط بڑھا۔وہ ڈیلی جنگ لندن سے بھی منسلک تھیں۔جرمنی میں مقیم پاکستانی کمیونٹی سے پوری طرح رابطے رکھتی تھیں۔مجھ سے انہوں نے جنگ لندن کے لئے ایک انٹرویو کیا جو اس اخبار میں تب ہی چھپ گیا تھا۔میں نے اس انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں ادب کی مجلسی زندگی سے اپنی بے رغبتی اور بے تعلقی کا اظہار کیا تھا۔ثریا نے دل میں طے کر لیا کہ اس بندے کو مجلسی زندگی میں لانا ہے۔چنانچہ جلد

ہی ایک حلقۂ ادب قائم کر کے مجھے اس کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔ میں نے کام شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہاں آنے والوں کی بڑی تعداد تو وزن میں شعر بھی نہیں سنا سکتی۔ بے وزن کلام تنقید کے لئے پیش کیا جانے لگا تو میں نے کہا کہ یہ تو حلقہ کے نام پر دھبہ ہے۔ کمال یہ ہے کہ یہاں کے شعراء مکمل بے وزن ہونے کے باوجود پورے اعتماد کے ساتھ خود کو باوزن شاعر سمجھتے تھے۔ چنانچہ میں نے ایسے ماحول سے جان چھڑانے کے لئے حلقہ کی سیکریٹری شپ چھوڑ دی۔ دو تین ہفتوں کے بعد ثریا میرے ہاں آگئیں۔ نہیں حلقہ آپ نے ہی چلانا ہے۔ بہر حال مجھے اس حلقہ میں دوسری اور تیسری بار بھی جانا پڑا۔ لیکن حلقہ ادب تو ''ہلکا'' ادب بھی نہیں تھا۔ تیسری بار میں نے کچھ ناراضی اور کچھ منت کے ساتھ جان چھڑائی۔

ثریا شہاب ادبی طور پر پہلے افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سرخ لباس'' چھپ چکا تھا لیکن اس میں ایک افسانہ بھی ایسا نہیں جسے کسی ادبی حوالے کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ اسی دوران ان کا ناول ''سفر جاری ہے'' چھپ کر آگیا۔ میں اس ناول کو پڑھ کر حیران ہوا اور خوش بھی ہوا۔ ناول بڑا نہ سہی لیکن ثریا کی ادبی پہچان اس سے بن رہی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے اپنا شعری مجموعہ ترتیب دینے کے لئے مجھے اپنا مسودہ دیا۔ میں نے اس پر بہت محنت کی۔ بہت سی بے وزن چیزیں قلم زد کیں۔ چند ایک کی درستی کی۔ نظموں کی نوک پلک سنواری۔ ردھم سے عاری نظموں کو الگ کر کے میں نے مشورہ دیا کہ انہیں نثری نظم کے الگ سیکشن میں شامل کر لیں۔ لیکن جب مجموعہ چھپ کر آیا تو نظم اور نثری نظم سب ملی جلی تھیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے کہا کہ میرا ایک ادھورا ناول ہے، آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو شاید اس پر ہم گفتگو کر سکیں اور ناول مکمل ہو جائے۔ میں نے وقت کی کمی اور اپنی دوسری مصروفیات کے باعث معذرت کر لی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ان کا ناول ''بارشوں کے موسم میں'' چھپ گیا۔ تاہم مجھے ایک حیرانی رہتی ہے کہ ان کے پہلے ناول کے بعد دوسرے ناول کی زبان و بیان پر گرفت مضبوط ہونا چاہئے تھی لیکن دوسرے ناول پر یہ گرفت پہلے کے مقابلہ میں بے حد کمزور ہے۔

بنیادی طور پر ثریا نیوز ریڈر تھیں۔ ٹی وی سے ریٹائرمنٹ کے بعد جنگ لندن کی نمائندگی کر کے جرمنی میں رونق میلہ لگائے رکھا۔ پھر انہیں کینسر کا عارضہ ہو گیا۔ جرمنی میں علاج معالجہ کی شاندار سہولتوں کے ہوتے ہوئے ثریا نے پاکستان واپس جانے کا طے کر لیا۔ ان کے جرمن شوہر مسٹر ہنس بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ چند برس وہاں رہے۔ اب سنا ہے کہ وہ بھی ثریا کو چھوڑ کر جرمنی میں واپس آگئے ہیں۔ اور ثریا ڈپلومیٹس کے شہر اسلام آباد میں کینسر کے عارضہ کی آخری اسٹیج پر بالکل تنہائی کی زندگی بسر کر

رہی ہیں۔ اللہ ان کا حامی و ناصر ہو۔

جرمنی میں برلن سے ایک شاعرہ کا پتہ چلا۔ رخسانہ شمیم ان کا نام تھا۔ ان سے رابطہ ہوا تو تھوڑے عرصہ کے بعد ملنے کے لئے آگئیں۔ تین چار دن ہمارے گھر پر رہیں۔ شاعری واعری کا تو کچھ خاص پتہ نہیں چلا کہ کیسے کرتی ہیں لیکن مجھے ایسا لگا کہ اپنے بعض مسائل کی وجہ سے وہ کچھ نیم خبطی سی ہو رہی ہیں۔ پھر پتہ چلا کہ وہ امریکہ جا رہی ہیں۔ ان کا کلام ''توازن'' مالیگاؤں میں چھپتا رہتا ہے۔

جرمنی میں اردو بولنے والی جرمن خواتین ڈاکٹر کرسٹینا اور اولرک اسٹارک ہیں۔ دونوں ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوبی ایشیائی زبانوں کے شعبہ سے متعلق ہیں۔ اولرک اسٹارک تو اب شکاگو چلی گئی ہیں۔ کرسٹینا اب بھی اسی ادارہ میں ہیں۔ انہوں نے مشرقی جرمنی کے زمانہ میں برلن سے قرۃ العین حیدر پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے اردو میں پی ایچ ڈی کی ہو گی لیکن کرسٹینا نے خود ایک بار بتایا کہ مقالہ جرمن زبان میں لکھا تھا۔ ان سے دو تین ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ بوقت ضرورت ہم رابطہ کر لیتے ہیں۔ اردو بول چال سکھانے کے لئے نصابی نوعیت کا کام زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ اردو ادب کا ایک انتخاب جرمن زبان میں ترجمہ کر کے شائع کر چکی ہیں۔ ادبی تحقیق کے حوالے سے کسی ریفرینس کی ضرورت ہو اور وہ ان کی دسترس میں ہو تو فراہمی کے لئے مخلصانہ تعاون کرتی ہیں۔ قلی قطب شاہ اور ملاّ وجہی سے لے کر ن۔م۔ راشد اور میرا جی تک کتنے ہی اردو شاعروں اور ادیبوں پر انگریزی اور جرمن زبانوں میں مضامین لکھ چکی ہیں۔ شاعروں سے زیادہ نثر نگاروں پر کام کیا ہے۔ کئی یورپی اور عالمی ادبی کانفرنسوں اور سیمینارز میں شرکت کر چکی ہیں، لیکن ان کا میلان مجلسی سے زیادہ علمی ہے۔

اردو جاننے والی اور فیض احمد فیض کی عاشقِ صادق روس کی ڈاکٹر لڈمیلا باغ و بہار شخصیت کی حامل ہیں۔ اردو ادب پر ان کی نظر کافی گہری ہے۔ کثیر المطالعہ ہیں اور ادبی شعور بھی رکھتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے شروع سے وابستگی رہی جو روح میں رچ سی گئی۔ لیکن اب جو سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد کیمونزم کا زور ٹوٹا ہے تو ڈاکٹر لڈمیلا نے بھی خود کو نئی صورتحال میں اچھے طریقے سے ایڈجسٹ کر لیا ہے۔ فیض اور اردو سے ان کی وابستگی آج بھی قائم ہے۔ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی کوئی اردو کانفرنس ہو انہیں بلایا جاتا ہے۔ بے شک ہم لوگوں کے لئے کسی گورے یا گوری کا اردو بولنا حیرانی اور خوشی کا موجب بنتا ہے اور انہیں بلانے میں یہ فیکٹر بھی موجود ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈاکٹر لڈمیلا اپنی اہلیت کی بنا پر اردو، فیض اور ترقی پسند حوالے سے بلائے جانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔ میری ان سے دو

کانفرنسوں میں ملاقات ہوچکی ہے اور وہ اتنے خلوص کا تاثر دیتی ہیں کہ جیسے میں ان کے لئے ذرا سا بھی اجنبی نہیں رہا۔

ڈاکٹر وسیم بیگم دہلی سے انگلینڈ آئی تھیں تو میں نے شاہد ماہلی صاحب کے ساتھ انہیں بھی جرمنی میں مدعو کیا تھا۔ یہاں انہوں نے غالب پر ہونے والی ایک تقریب میں اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ دہلی جانے کے بعد کبھی کبھار ان سے رابطہ ہوجاتا تھا۔ پھر ایک لمبا وقفہ آیا اور اس کے بعد اچانک ان کی ای میل ملی جس میں انہوں نے لکھا کہ انہین علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنی پسند کی جاب مل گئی ہے۔ تحقیق کی طرف زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ بعض رسائل میں ان کے تبصرے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

صدیقہ بیگم ادبِ لطیف کے بانی برکت علی چوہدری کی صاحبزادی ہیں۔ خود شاعرہ یا ادیبہ نہیں ہیں لیکن نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے اپنے پُرکھوں کی یاد کے طور پر ادبِ لطیف کو جیسے تیسے جاری رکھا ہوا ہے۔ پاکستان میں اپنے بے روزگاری کے دور میں مجھے ادبِ لطیف کے لئے تھوڑا بہت کام کرنے کا موقعہ ملا۔ ان کے پچپن سالہ نمبر کے لئے میں نے بطور خاص محنت کی تھی۔ لاہور میں کئی بار ان سے ویسے بھی ملنا رہا۔ ملنسار خاتون ہیں۔ جرمنی آنے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان سے رابطہ رہتا ہے۔ ادبِ لطیف کی ویب سائٹ اردوستان کے زیرِ اہتمام میں نے جاری کرائی تھی۔ کاشف صاحب کی مہربانی ہے کہ انہوں نے میرے کہنے پر اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ ادبِ لطیف کی تاریخ ترقی پسند تحریک کی حمایت سے عبارت رہی ہے۔ تاہم اس کی گولڈن جوبلی تقریب کی صدارت قدرت اللہ شہاب سے کرائی گئی اور انہوں نے اپنی تقریر میں ادبِ لطیف کے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے پرانے دکھ بیان کئے اور ادارہ کا شکریہ ادا کیا کہ اب انہیں اتنی عزت دی گئی ہے۔ صدیقہ بیگم نے جرمنی میں مقیم ایک رائٹر خاتون سلمیٰ جبیں سید کا اتہ پتہ بھیجا اور انہیں اپنی دوست لکھا۔ ان سے رابطہ ہوا۔ میں انہیں وہ سلمیٰ جبیں سمجھتا رہا جو خواتین کے رسائل میں لکھا کرتی تھیں اور رضیہ بٹ کی طرح پاپولر ناولسٹ بھی تھیں۔ لیکن جب وہ میرے ہاں آئیں تو انہوں نے اس کی تردید کی۔ لکھنے کا شوق انہیں ضرور رہا لیکن بنیادی طور پر براڈ کاسٹر تھیں۔ قمر علی عباسی بڑے خوش مزاج انسان ہیں اور ان کے سفر نامے بھی ان کی شخصیت کی طرح خوشگوار ہوتے ہیں۔ اپنے جرمنی کے سفر نامہ ''اور دیوار گر گئی'' میں انہوں نے ہم سب کا محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن ثریا شہاب اور سلمیٰ سید کے ذکر میں بین السطور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کچھ گراں سا گزرا۔ ہم سب خطا کے پتلے انسان ہیں کوئی ادبی خامی ہو تو ضرور بیان کریں لیکن شخصی کمزوریوں کا ذکر محبت کے باب میں کچھ

اچھا نہیں لگتا۔ بہر حال یہ تو یونہی بات سے بات نکل آئی۔ قمر علی عباسی سے اور ان کی اہلیہ اور کسی زمانے کی معروف ٹی وی اسٹار نیلوفر عباسی سے دو تین بار ملاقات ہوچکی ہے۔ دونوں میاں بیوی ایک بار جرمنی میں میرے گھر بھی تشریف لا چکے ہیں۔ نیلوفر عباسی کی گفتگو میں یہاں مغرب میں مقیم کئی شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ ادبی شعور جھلکتا تھا جو میرے لئے حیران کن بات تھی۔ دورانِ گفتگو نیلوفر عباسی نے جب یہ بتایا کہ آصف فرخی ان کے خالہ زاد بھائی ہیں تو ان کے ادبی شعور پر حیرت دور ہوگئی اور یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ وہ ایک علمی و ادبی خاندان کی فرد ہیں۔ کراچی میں مقیم فردوس حیدر معروف افسانہ نگار ہیں۔ ٹی وی کے لئے ان کی ایک دو سیریلز بھی کافی مقبول ہوئیں۔ ان سے سلطان جمیل نسیم صاحب اور جمیل زبیری صاحب کے ذریعے رابطہ ہوا تھا۔ کراچی میں دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ایک بار دہلی میں بھی جوگندر پال جی کے یہاں ملاقات ہوئی۔ مجھے ان کی شخصیت میں ہمیشہ ایک نفاست اور وقار کا احساس ہوا۔ ہم بہت زیادہ نہیں ملے لیکن جتنا ملے ہماری گفتگو نے ادب کے کئی تازہ موضوعات کو اپنے محیط میں لیا اور ہم نے ان پر بے تکلفانہ اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

سیدہ حنا جب پشاور میں تھیں اور وہاں سے اپنا رسالہ ابلاغ نکالتی تھیں، تب ان سے رابطہ ہوا۔ میں اپنے سسرال پشاور گیا تو ان سے بھی ملنے کے لئے گیا۔ حامد سروش اور سیدہ حنا دونوں اچھے لوگ تھے۔ دونوں بہن بھائی مل کر ادب کی خدمت کر رہے تھے۔ اچانک کہیں بیچ میں ماہیے کا مسئلہ شروع ہوگیا اور پھر کسی نہ کسی بہانے سے یہ تعلق ٹوٹنا ہی تھا، سو ٹوٹ گیا۔ پھر ہمارے درمیان گھمسان کا رن پڑا تھا۔ ماہیے کی بحث کو ادبی سلیقے سے آگے بڑھا جا سکتا تھا لیکن اُدھر سے ایسی بے جا الزام تراشیاں ہوئیں کہ پھر ویسا ہی جواب دینا پڑ گیا۔ ہمارے جھگڑے سے کئی جعلی یا کمزور شاعروں اور ادیبوں نے رسالہ ابلاغ سے فائدے سمیٹے۔ بہر حال اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اب سیدہ حنا کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

نجمہ منصور سے ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں ملاقات ہوئی۔ مجھے اوراق میں پڑھتی رہتی تھیں۔ انہیں دنوں ان کی نثری نظموں کا مجموعہ شائع ہونے والا تھا۔ انہوں نے اپنی نثری نظمیں مجھے دیں اور ان پر تاثرات لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نثری نظم میں شعری مواد کو تو مانتا ہوں لیکن اسے شاعری نہیں مانتا۔ اس کے باوجود انہوں نے اصرار کیا کہ میں جیسے چاہوں اپنی رائے کا اظہار

کردوں۔ چنانچہ میں نے مناسب طور پر اپنی رائے لکھ دی، اسے انہوں نے اپنی اولین کتاب ''میں سپنے اور آنکھیں''میں شامل کرلیا۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ''سلگتے خواب''چھپا تو انہوں نے سرگودھا میں کسی ادیب سے لے کر پڑھا اور پھر مجھے ایک خط لکھا جس میں مبارک باد اور خوشی کے اظہار کے ساتھ میری شاعری پر دلی تاثرات کا اظہار کیا۔

روشن آرا نزہت لاہور میں پنجاب سیکریٹریٹ میں شعبہ اطلاعات میں سیکشن آفیسر تھیں۔ جنرل ضیا الحق کا آمرانہ دور تھا۔ملک میں سرِ عام کوڑوں کی سزاؤں اور دوسری اسی طرح کی تعزیرات کے ذریعے اسلام کی ایسی خوفناک صورت پیش کی جا رہی تھی جو مغربی دنیا کے وقتی مفادات پورے کرنے کے ساتھ آج خود مغربی دنیا کے اعتراضات کی زد میں ہے اور جس کی قیمت پاکستان ابھی تک ادا کر رہا ہے۔ میں جدید ادب کو کتابی صورت میں ہر دو ماہ کے بعد چھاپ رہا تھا۔سنسر شپ لگی تو پرچہ سنسر کرانے کے لئے متعلقہ آفس میں گیا۔ وہاں کی کرتا دھرتا روشن آرا نزہت تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کتابی سلسلہ دیکھ کر بندش کا حکم ہی نہ ہو جائے لیکن وہ بہت شفیق انداز سے ملیں۔ اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ میں خانپور جیسے شہر میں بیٹھ کر ایسا کام کر رہا ہوں۔ انہوں نے رسالے کی جڑی ہوئی کاپیوں کو سرسری نظر سے دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض سیاسی مواد تو نہیں ہے۔ اور میری وضاحت پر انہوں نے اسی وقت پرچہ کی سنسر شپ کا مرحلہ کلئیر کر دیا۔ جبکہ عام طور پر کتابوں اور رسالوں کی کلیرنس کے لئے ایک دو دن کے بعد کا وقت دیا جاتا تھا۔ وہ خود ناول نگار تھیں اور نظمیں بھی لکھتی تھیں۔ میرے ساتھ ان کی خصوصی توجہ اور جدید ادب کے معاملہ میں بہت زیادہ رعائت کا علم سرگودھا کے ادبی دوستوں کو بھی تھا۔ چنانچہ شاید اس کو ٹھیک سے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوا کہ راغب شکیب نے اپنے سفر نامہ ''سفر ہم سفر''میں خانپور کے حلقۂ ادب کا ذکر کرتے ہوئے روشن آرا نزہت کو بھی خانپور کی ناول نگار شمار کیا۔ یہ بات جب روشن آرا کو معلوم ہوئی تو خوش ہوئیں کہ چلو آپ لوگوں کے شہر میں شمار کی گئی ہوں۔ روشن آراء نزہت جہاں بھی ہوں خدا انہیں خوش رکھے۔

راغب شکیب کے ذکر سے سیما شکیب یاد آ گئیں۔ ان کی شادی ہونے سے پہلے ہی سیما سے میرا رابطہ تھا۔ وہ جدید ادب میں چھپا کرتی تھیں۔ جب دونوں کی شادی کی خبر ملی تو بہت خوشی ہوئی۔ پھر ان میاں بیوی سے سرگودھا میں بھی ملاقات ہوئی اور یہ لوگ ربوہ میں بھی مجھے ملنے آئے۔ وہاں میں نے اپنے گھر پر ہی چند ادبی دوستوں کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ ڈاکٹر پرویز پروازی نے راغب کے سفر نامہ پر مضمون

پڑھا تھا۔ سیما شکیب بطور شاعرہ چونکاتے ہوئے ابھری تھیں۔ ان کی غزل تمام عام اور خاص شاعرات سے کچھ الگ دکھائی دیتی تھی۔

نہ میں کسی کی نہ کوئی مری سہیلی تھی
ہر ایک کھیل میں اپنے خلاف کھیلی تھی

لیکن شادی کے بعد گھر گرہستی نبھانے میں ان کی شاعری کی چمک ماند پڑتی گئی۔ اگرچہ انہوں نے بعد میں بھی راغب کے ساتھ مل کر کافی ادبی کام کیا لیکن ان کی وہ تخلیقی چمک جو شروع کی غزلوں اور نظموں میں دکھائی دی تھی، نہ صرف ارتقائی سفر نہ کر سکی بلکہ اسی مقام پر بھی نہ رہ سکی۔ یہ صرف سیما کا مسئلہ نہیں ہے ہمارے معاشرے میں خواتین کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی وجہ سے کئی باصلاحیت خواتین اپنی خداداد صلاحیتوں کا پورا اظہار کر ہی نہیں پاتیں۔ اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ سیما شکیب اردو شاعرات میں اپنی الگ جگہ رکھتی ہیں۔

پروین عاطف سے میرا قلمی رابطہ تھا لیکن آمنا سامنا کبھی نہیں ہوا تھا۔ افسانے بھی اچھے لکھتی ہیں لیکن مجھے ان کے سفر نامے زیادہ اچھے لگے۔ اب کالم نگاری بھی کرنے لگی ہیں۔ ایک بار ایک محفل میں ان کے ساتھ آمنا سامنا ہوا تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ یہ میں ہوں۔ میرے جانے کے بعد انہیں میرا علم ہوا تو افسوس کرنے لگیں۔ ایک دو دوستوں سے بھی افسوس کا اظہار کیا کہ مجھے بتانا تو چاہئے تھا کہ میں حیدر قریشی ہوں۔ لیکن میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ جن سے کافی سارا قلمی رابطہ تھا انہیں دیکھ بھی لیا تھا۔ اور اب مجھے حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کی ایک تقریب یاد آ رہی ہے۔ اس میں بعض مرد حضرات کے انداز گفتگو کے نتیجہ میں پروین عاطف نے شکوہ کیا کہ خواتین کا کچھ لحاظ کرنا چاہئے، حلقہ کے اجلاسوں میں خواتین پہلے ہی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ تب ممتاز مفتی نے اپنی روایتی شگفتگی کے ساتھ کہا تھا: لیکن آٹے میں سارا مزہ تو نمک کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔

امریکہ میں مقیم ریحانہ قمر کا بہت چرچا سننے میں آ رہا تھا۔ ان سے رابطہ ہوا تو ادبی حوالے کے علاوہ ذاتی طور بھی اچھا لگا۔ میں نے ان کے ساتھ جرمنی میں ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ ان کی کتاب ''ہم پھر نہ ملیں شاید'' ملی تو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ یہ تو پروین شاکر سے آگے کی کوئی شاعرہ ہیں۔ جرمنی میں آئیں، تقریب ہوئی، رونق میلہ رہا۔۔۔۔ بعد میں میری زندگی کی یہ ایک ادبی غلطی ثابت ہوئی۔ جب میں ان کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کر رہا تھا مجھے امریکہ سے افتخار نسیم نے ایک دو بار بتایا

کہ یہ خود نہیں لکھتیں بلکہ لاہور میں عباس تابش انہیں لکھ کر دیتے ہیں۔میں ان کی بات نہیں مانا تو افتخار نسیم نے اتنا کہا دیکھ لینا بعد میں جب اصلیت سامنے آ گئی تو خود ہی پچھتاؤ گے۔اس بات کے معاملہ میں افتخار نسیم ولی ثابت ہوئے۔ان کی بات سچ نکلی۔ بعد میں اصلیت کھل گئی۔ جرمنی میں قیام کے دوران انہوں نے مجھ سے صرف ایک شاعر کے بارے میں فرمائش کی کہ اس کے اعزاز میں ایک تقریب جرمنی میں کرادوں۔اس کے لئے پانچ سو ڈالر کی رقم دینے کی پیش کش بھی از خود کر دی۔(میں نے موقعہ پر ہی معذرت کر لی کہ اب ایسی تقریب کرانا مشکل ہے)۔پھر بھی انہوں نے غور کرنے کے لئے کہا۔میں نے بعد میں غور ضرور کیا لیکن اس بات پر کہ ریحانہ قمر نے صرف عباس تابش کے لئے ہی کیوں کہا؟

ایک اور بات جو مجھے کھٹکنے لگی۔۔۔جرمنی میں قیام کے پورے عرصہ میں بھی اور اپنے طویل دورانیہ کے ٹیلی فونز پر ہونے والی گفتگو کے دوران بھی انہوں نے کبھی ادب کی صورتحال پر کوئی گفتگو نہیں کی۔ادبی اشوز کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔بس اپنی غزلیں سنا دیا کرتیں یا پھر دوسری گپ شپ۔میں ان کی غزل سنتے ہوئے پیچیدہ بحر کے باعث رُک رُک جاتا۔اتنی عروضی مہارت پر حیرت ہوتی۔اسی دوران میں نے ان کی ایک زمین میں غزل کہی۔ان کی چار اشعار کی غزل ان کے شعری مجموعہ ''ہم پھر نہ ملیں شاید'' میں شامل تھی۔میں نے اس زمین میں آٹھ شعر کہے۔میں عام طور پر جن بحور میں شعر کہتا ہوں یہ ان سے بالکل مختلف تھی اور سچی بات ہے اس بحر میں شعر کہتے ہوئے میں جیسے پسینے پسینے ہو گیا لیکن میں نے سارے کے سارے اچھے شعر نکالے۔

جو بس میں ہے وہ کر جانا ضروری ہو گیا ہے
تری چاہت میں مر جانا ضروری ہو گیا ہے
درختوں پر پرندے لوٹ آنا چاہتے ہیں
خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہو گیا ہے
نئے زخموں کا حق بنتا ہے اب اس دل پہ حیدرؔ
پرانے زخم بھر جانا ضروری ہو گیا ہے

جب یہ غزل محترمہ کو سنائی تو انہوں نے اسے اتنا رواروی سے لیا کہ میں حیران رہ گیا۔جس نے خود اس بحر کو نبھایا ہو اُس کی تو دوسرے کے ہر شعر کے ایک ایک لفظ پر نظر ہوتی ہے کہ اس نے کیسے اسے ادا کیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہی غزل میں نے عباس تابش کو سنائی ہوتی تو وہ اس کے معائب اور محاسن کو ساتھ

ساتھ دیکھتے جاتے۔شاعر اور غیر شاعر کے فرق کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب مجھے عباس تابش کا شعری مجموعہ ''چاند کسی سے مت کہنا'' مل گیا۔قطع نظر اس سے کہ ریحانہ قمر کے نام کے قمر اور عباس تابش کے مجموعہ کے چاند میں کسی روحانی نسبت کا اشارہ تو نہیں ہے؟، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عباس تابش کی پسندیدہ بحور (جو میرے لئے کافی مشکل بحور ہیں۔شاید ہر شاعر کے اپنے مزاج سے ان بحور کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوتا ہے) اور ریحانہ قمر کی بحور اصل میں دونوں ایک ہیں۔مجھے یاد آ رہا ہے کہ انہیں دنوں میں غالباً لاہور کی کسی تقریب کی رپورٹنگ میں یہ بات آئی کہ ریحانہ قمر کی شاعری میں نسائیت ملتی ہے۔اور افتخار نسیم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہم نہ کہتے تھے کہ عباس تابش کی شاعری میں نسائیت پائی جاتی ہے۔

انہیں دنوں میں لالی چودھری کا ایک خط تخلیق لاہور میں شائع ہوا۔اس میں نام لئے بغیر بتایا گیا تھا کہ ایک شاعر نے ایک بھری محفل میں خود بتایا کہ مجھے فلاں خاتون نے اتنے ڈالرز دیئے ہیں کہ میرے لئے شاعری لکھو بھی اور اسے کتابی صورت میں چھپوا بھی دو۔میں نے ان شاعر اور شاعرہ کے بارے میں لالی چودھری اور نیر جہاں دو ذرائع سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ ''شاعرہ'' ریحانہ قمر ہیں اور جس پاکستانی شاعر نے انکشاف کیا وہ عباس تابش ہیں۔نیر جہاں نے تو یہ بھی بتایا کہ جب میں نے عباس تابش کو اس ادبی بد دیانتی سے روکنا چاہا تو انہوں نے کہا کہ اگر میں یہ کام نہیں کروں گا تو ریحانہ کسی اور شاعر سے یہی کام کرا لے گی۔اس لئے مجھے ہی چار پیسے کما لینے دیں۔اور اب تو صرف عباس تابش ہی نہیں ہمارے ادب کے کتنے ہیں اچھے اور شاندار شعراء اس بُرے کام میں لگ گئے ہیں۔اور مغربی دنیا میں اردو کی نئی بستیاں زیادہ تر اسی طرح بسی ہوئی ہیں۔جو گنتی کے چند اچھے اور جینوئن لکھنے والے ہیں وہ ایسی بستیوں سے پرے اپنی ذات کے ویرانوں میں ادبی مراقبہ کر رہے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر جب واضح ہو گیا کہ محترمہ خود شعر نہیں کہتیں تب میں نے انہیں کہہ دیا کہ آپ کو یا تو اپنی ہی بحور میں موقعہ پر قافیہ ردیف کی تبدیلی کے ساتھ وزن میں شعر کہنے کے ٹیسٹ سے گزرنا چاہئے یا پھر دوسروں سے لکھوا کر کتابیں چھپوانے کا سلسلہ بند کرنا چاہئے۔ساتھ ہی میں نے کہا کہ میں نے آپ کے بارے میں جو مضمون پڑھا تھا اسے کہیں نہیں چھپوایئے وگرنہ مجھے معذرت کے ساتھ اعلان کرنا پڑے گا کہ اسے اب ترمیم کے ساتھ اصل شاعر عباس تابش کی شاعری پر میرا مضمون شمار کیا جائے۔مغربی ممالک میں شاعر بن جانے والے بہت سارے شعرا اسی طرح کے ہیں۔اس المیہ کا سب

سے زیادہ نقصان یہ ہے کہ ایک تو یہاں اصل اور نقل کا فرق مٹتا جا رہا ہے۔ دوسرے سارے جعلی شعراء اپنے مالی وسائل کے بل پر اپنے ''شاعر گروں'' اور دوسرے چاہنے والوں کے ذریعے پھر خود اور جینئن شعراء کے خلاف گند اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسئلے کا آسان حل یہی ہے کہ جو لوگ مغربی دنیا میں بس جانے کے بعد ادھیڑ عمر میں جا کر یکا یک شاعر بن گئے ہیں ان سب کا پاکستان اور انڈیا میں جانے پر ایک ٹیسٹ لیا جائے جس میں صرف اتنا دیکھا جائے کہ یہ وزن میں شعر کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ ایسا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اب ادب سے متعلق سرکاری اداروں میں بھی ایسے جعلی شعرا کی بڑے پیمانے پر پذیرائی ہونے لگی ہے۔ یوں مختلف حکومتی شعبوں میں کرپشن کی جو داستانیں گزشتہ نصف صدی سے بنتی آرہی ہیں ان کی طرح اب ادب کے حکومتی شعبہ میں بھی ایسی کرپشن پھیلتی جائے گی۔ ریحانہ قمر اگر واقعی خود شعر کہتی ہیں اور ان کا اور جینئن شاعرہ ہونا ثابت ہو جائے تو میں نہایت شرمندگی کے ساتھ ان سے معافی مانگ لوں گا۔ لیکن جو موجودہ صورت ہے اس کے مطابق وہ قطعاً شاعرہ نہیں ہیں اور انہیں ان بحور میں تو شعر کہنے کا پتہ ہی نہیں جو اِن کے شعری مجموعوں میں شامل ہیں۔ ریحانہ قمر کے اس ذکر میں ان تمام شاعرات کو شمار کر لیا جائے جو جرمنی، انگلینڈ، امریکہ اور کینیڈا میں انہیں کی طرح یا پھر بے وزن، شعری مجموعے چھپوا چکی ہیں یا چھپوا رہی ہیں۔

ریحانہ قمر کے ذکر کے ساتھ افتخار نسیم کا ذکر ہوا ہے تو یہاں ان کا بھی کچھ بیان ہو جائے۔ مجھے شروع میں ان کے جسمانی مسئلہ کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ جرمنی میں میرے ہاں آئے تو انہیں میں نے شادی کی تقریب میں مردانہ حصہ میں ٹھہرایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انسانیت میں مرد اور عورت کی بجائے تیسری صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس صنف میں بھی کہیں دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک مردانہ مخنث اور ایک زنانہ مخنث۔ افتخار نسیم کا تعلق موخر الذکر سے ہے۔ سو یوں خواتین شاعرات کے ذکر میں بھی انہیں شامل کیا جا سکتا ہے اور مرد شعرا کے ذکر میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس طبقہ کو تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ میں اس طبقہ کے دوہرے استحقاق کا حامی ہوں۔ افتخار نسیم جو اب افتی نسیم کے نام سے مقبول ہیں اس لحاظ سے بہت بہادر ہیں کہ اپنے پاکستانی ماحول کی سماجی گھٹن اور منافقت کے باوجود انہوں نے اپنی نام نہاد مردانگی کا بھرم رکھنے کی بجائے کھل کر اپنی جسمانی حقیقت کو بتا دیا۔ اس پر ان کے خاندان میں کہرام برپا ہوا۔ ان کی ماں جیسی بڑی بہن نے انہیں خط لکھا کہ مجھے بتاؤ کس نے تمہیں اس راہ پر ڈالا ہے میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔ تب افتی نے اپنی بہن کو

جواب میں کچھ ایسا لکھا کہ مجھے جس نے ایسا بنایا ہے ہمارے ہاتھ اس کے گلے تک نہیں پہنچ سکتے، صرف اس کے سامنے دعا کے لئے اُٹھ سکتے ہیں۔

چونکہ مجھے شروع میں افتی کے مسائل کا اندازہ نہیں تھا اس لئے میں انہیں ایک عام مرد ادیب کی طرح لیتا تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ کچھ نوک جھونک بھی رہی لیکن جیسے ہی مجھے اصل بات کا علم ہوا مجھے اپنی ساری نوک جھونک کا افسوس ہوا اور افتی سے کسی قسم کا لفظی الجھاؤ بھی اچھا نہ لگا۔ ہاں ویسے میں ان کے ساتھ ہلکی پھلکی جملہ بازی کر لیتا ہوں لیکن دلی احترام کے ساتھ۔ اپنے کڑے جسمانی، نفسیاتی اور سماجی مسائل سے گزرتے ہوئے افتی نے تخلیقی اظہار سے اپنی شخصیت کو سنبھالا دیا ہے اور ایک بڑی، کڑوی سچائی کا اظہار کر کے معاشرتی منافقت کو بھی آئینہ دکھایا ہے۔ اپنے مخصوص موضوع کے حوالے سے افتی کو امریکہ کے بعض نصابوں میں بھی جگہ مل گئی ہے جو بہر حال اس کی کامیابی ہے۔

لندن میں عطیہ خان سے ملاقات ہوئی، بزرگ اور بھلی خاتون ہیں۔ مختلف نثری اصناف میں طبع آزمائی کرتی رہتی ہیں۔ ان سے بعض اصناف خلط ملط بھی ہو جاتی ہیں۔ اپنی ہلکی پھلکی تحریروں کو انشائیہ لکھ دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپا تو اس میں کام کی چیز وہ تحریر تھی جس میں انہوں نے اپنی داستان بیان کی تھی۔ بڑی پُر تاثیر تحریر تھی۔ اسے ادبِ لطیف لاہور نے بھی اپنی ایک اشاعت میں شائع کر دیا تھا۔ میں نے انہیں توجہ دلائی کہ اپنے افسانوں اور اس مضمون کے فرق کو دیکھیں اور اپنی داستان جیسی تحریریں اردو ادب کو عطا کریں۔

رضیہ اسماعیل سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔ اصلاً ان کا ذکر یادوں کی اس قسط میں ہونا چاہئے تھا جس میں اَن دیکھے احباب کا ذکر ہے، لیکن شومئ قسمت کہ اس قسط میں ان کا ذکر کرنا بھول گیا۔ ان سے رابطے اور تعلق کی ایسی صورت ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر یادوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے خواتین سے متعلق اس قسط میں ہی ان کا ذکر کر رہا ہوں۔ یوں بھی ہمارا باہمی رابطہ اتنا زیادہ رہا ہے کہ اسے براہِ راست ملنے جیسا ربط بھی کہا جا سکتا ہے۔ رضیہ اسماعیل انگلینڈ کی ان معدودے چند خواتین میں شمار ہوتی ہیں جو بیک وقت شعر بھی کہتی ہیں اور نثر بھی لکھتی ہیں۔ طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھتی ہیں تو انہیں اسی حیثیت میں پیش کرتی ہیں، انشائیہ یا کوئی اور اس طرح کا لیبل نہیں لگاتیں۔ غزل سے لے کر نثری نظم تک میں طبع آزمائی کر چکی ہیں اور ان سب کے الگ الگ مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ خواتین کی ادبی وثقافتی تنظیم آگہی کی سربراہ ہیں اور اس کے لیے متحرک بھی رہتی ہیں۔ میرے لیے دو

حوالوں سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔انہوں نے مجھ سے کوئی رابطہ ہونے سے پہلے ماہیا نگاری شروع کر رکھی تھی اور مجھ سے تب رابطہ ہوا جب ان کا مجموعہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ان کے ماہیے اپنے ذائقے اور مزاج کے لحاظ سے مغربی ممالک میں مقیم پاکستانیوں کے دل کی آواز ہیں،شاید ایسی آواز جسے سب اپنے اندر سنتے ہیں لیکن سب ہی دوسروں سے چھپاتے ہیں۔صرف دو مثالوں سے ہی میری بات کو جانچا جا سکتا ہے۔

کڑوے ہیں سکھ ماہیا — کلچر کا رونا ہے
کس کو سنائیں اب — آ کے ولایت میں
انگلینڈ کے دُکھ ماہیا — اب کچھ تو کھونا ہے

رضیہ اسماعیل نے ایک اور اچھا کام یہ کیا کہ بی بی سی ایشیا کے ذریعے اردو ماہیا کو متعارف کرایا۔نہ صرف ماہیا کو متعارف کرایا بلکہ میرا بھی وہاں سے ایک انٹرویو کرا دیا۔یہ انٹرویو بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی درمیانی شب کافی دیر تک جاری رہا۔اور دونوں صدیوں کا نکتۂ اتصال اس میں شامل رہا۔میرے لیے یہ اعزاز کی بات تھی اور یہ صرف رضیہ اسماعیل کے ذریعے ہو پایا تھا۔بعد میں بی بی سی ایشیا کے منتظمین مجھے فون کر کے مختلف شاعروں کے نام اور فون نمبرز مانگتے رہے۔یوں میں نے پاکستان اور انڈیا میں مقیم اپنے بہت سارے دوستوں کے بی بی سی ایشیا ریڈیو کے ذریعے براہِ راست انٹرویوز کرا دیئے۔جن دوستوں کے انٹرویوز نشر ہوئے انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا تاہم انٹرویوز کے ہونے کو اپنے عظیم ادیب ہونے کا ثبوت نہیں بنایا۔صرف انڈیا سے دو دوستوں نے ایسا کیا اور ان کے ایسا کرنے پر مجھے شرمندگی ہوتی رہی جب وہ لکھ رہے تھے اور چھاپ رہے تھے کہ انڈیا سے صرف ہمارا براہِ راست انٹرویو ہوا ہے جبکہ اس دوران اور ان سے پہلے بھی کئی پاکستانی اور انڈین اردو شاعروں،شاعرات کے انٹرویوز ہو چکے تھے اور میرے ہی ذریعے ہو چکے تھے۔میری شرمندگی دہری تھی کہ ان کے فخریہ اعلان چھپنے کے بعد میں انہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کا دعویٰ غلط ہے اور دوسری طرف جن دوستوں نے مجھے بتایا کہ ایسا دعویٰ کیا جا رہا ہے میں ان کے سامنے بھی سوائے شرمندگی کے اظہار کے اور کچھ نہ کر سکا۔جبکہ صرف ترنم ریاض کا دو بار انٹرویو ہو چکا تھا۔بہر حال اس سارے اچھے کام کے عقب میں بنیادی کردار رضیہ اسماعیل کا تھا۔پی ایچ ڈی کرنے کے بعد رضیہ اسماعیل اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل بن چکی ہیں،تاہم میں انہیں لیڈی ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کہتا ہوں۔

فرزانہ خان نیناں انگلینڈ کے شہر نوٹنگھم میں رہتی ہیں۔ایک بار جرمنی کے کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے آئیں تو میرے ہاں بھی آئیں۔ان کے شوہر اختر خان بھی ساتھ تھے۔پھر جب ایک بار میں انگلینڈ کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے گیا تو دونوں میاں بیوی لندن آئے،مجھے اپنے شہر لے گئے،وہاں ایک چھوٹی سی تقریب برپا کر ڈالی اور پھر کانفرنس میں بھی شرکت کر کے ساتھ رہے۔میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ نام میں سے نیناں کو حذف کر دیں لیکن انہوں نے میرا مشورہ قبول نہیں کیا۔اپنے اپنے ذہن کی بات ہے۔شاید میرا مشورہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ایک بار انہوں نے اپنی پسند کے گانوں کی ایک کیسٹ خود ریکارڈ کر کے مجھے تحفتاً بھیجی۔ان گانوں میں ایک گانا موسیقار روی کی اپنی آواز میں تھا جسے میں ایک عرصہ سے تلاش کر رہا تھا۔وہ کیسٹ میں نے ابھی تک سنبھال رکھی ہے۔کچھ عرصہ سے

ان کی شاعری میں ان کے معمول سے زیادہ پختگی آنے لگی ہے جو ظاہر ہے ان کی شعر و ادب سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔کچھ عرصہ ایک ٹی وی چینل سے بھی وابستہ رہیں۔ایک ادبی پروگرام کرتی تھیں جس میں کئی کال کرنے والے مزے سے بے وزن اشعار بھی سناتے۔لیکن بے وزن شعر سنانے والے تو ہر چینل پر کال کرتے سنائی دیتے ہیں۔شاید فرزانہ خان کے پروگرام میں ان کا تناسب نسبتاً کم ہی رہا۔

پروین شیر کینیڈا میں ایک طویل عرصہ سے مقیم ہیں۔(اس طویل عرصہ سے ان کی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش نہ کریں۔ملاقات پر سارے اندازے غلط ثابت ہوں گے)ان سے چند برسوں سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ تھا۔ستیہ پال آنند نے بھی ان کی تعریف کی تھی۔شاعرہ ہونے کے ساتھ مصورہ بھی ہیں اور موسیقی سے بھی گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔انہیں شاعرہ،مصورہ اور موسیقار کہا جا سکتا ہے۔ان کا شعری مجموعہ''کرچیاں'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ڈاکٹر کرسٹینا نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اس کتاب کی تقریب کی۔تقریب کے بعد پروین شیر اور ان کے شوہر وارث شیر میرے گھر آئے،دو تین دن ہمارے ہاں رہے۔ان کی کتاب دیکھی تو دیکھتے ہی رہ گئے۔سائز کے بارے میں پروین بتا رہی تھیں کہ اسے''کافی ٹیبل بک'' کہتے ہیں۔میں نے کہا کہ یہ تو کافی ٹیبل سے بھی کافی بڑے سائز کی بک لگ رہی ہے۔بہر حال اس کتاب میں ان کی اردو شاعری کے ساتھ انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے اور ہر نظم یا غزل کے ساتھ موضوعاتی اعتبار سے میل کرتی ہوئی ان کی اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ دی گئی ہے۔یوں یہ کتاب اردو اور انگریزی کے قارئین کے ساتھ مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ بھی حاصل کرتی ہے

اور اپنی پیش کش کے لحاظ سے واقعتاً ایک منفرد تجربہ ہے۔ پروین شیر کی کامیابیوں کے پیچھے ان کے شوہر پروفیسر وارث شیر کی حوصلہ افزائی کا بڑا عمل دخل ہے۔ پروین شیر کا خاندانی پس منظر بھی علم وادب سے منور ہے۔ شکیلہ اختر اور اختر اورینوی دو بڑے حوالے ہیں جو ان کے خالہ، خالو تھے۔

اور اب کچھ ذکر فرحت نواز کا۔ خانپور میں جدید ادب کے سات آٹھ برس ہم نے مل کر رسالہ نکالا تھا۔ فرحت کی شاعری میں ایک انوکھی چمک تھی۔ میرا خیال ہے شعر کہنے کے لئے جس انسپائریشن کی ضرورت ہوتی ہے، ہم ایک دوسرے کے لئے ویسی انسپائریشن رہے ہیں۔ اس کا اندازہ پہلی بار تب ہوا جب ملتان یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے ہم دونوں کے ساتھ ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ ہمیں باری باری بلایا جا رہا تھا۔ میں کچھ غزلیں سنا کر جاتا، پھر فرحت سے کچھ سنا جاتا۔ دو تین بار ایسا ہوا تو لگا کچھ سوال جواب جیسی صورت خوامخواہ بن رہی ہے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب فرحت نے میرے بعد آتے ہی اپنی نظم شروع کر دی ''مجھ کو اوورٹیک نہ کرنا''۔ اور ان کی نظم کے بعد ڈاکٹر انوار احمد نے کچھ دلچسپ سے جملے کہہ دیئے۔ فرحت کے ساتھ تب تک رابطہ رہا جب تک جدید ادب جاری رہا اور میں خانپور میں رہا۔ جب رسالہ بند ہوا تو میں خانپور شہر کو چھوڑ کر گوجرانوالہ، ربوہ، لاہور اور ایبٹ آباد تک بھٹکتا پھرا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ تب تک وہ ایم اے اکنامکس اور ایم اے انگریزی کرنے کے بعد انگریزی کی لیکچرر ہو گئی تھیں۔ پھر ایک بار پتہ چلا کہ انہوں نے شادی کر لی ہے اور اپنی شادی کی تصویریں میرے لئے بھیجی ہیں۔ افسوس میں ان کی انڈونیشین نژاد سہیلی ایڈا (سعیدہ) تک دیر سے پہنچا۔ وہ کافی انتظار کے بعد فرحت کو ان کی وہ البم واپس بھیج چکی تھیں جو میرے لئے بھیجی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی لیکچررشپ اور ازدواجی زندگی میں مصروف ہو گئیں اور ادب پس پشت چلا گیا۔ کبھی کبھار ادھر اُدھر سے خبر مل جاتی کہ اب وہ ایک بچے کی ماں بن گئی ہیں، اب دو بچوں کی ماں بن گئی ہیں۔

اسی دوران جب بہاولپور یونیورسٹی میں میرے بارے میں تحقیقی کام شروع کیا گیا تو مقالہ نگار بچی نے میرے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے سوالنامہ تیار کیا، جو کہیں فرحت کو بھی پہنچایا گیا۔ تیرہ دوستوں اور عزیزوں میں سے فرحت کے جواب سب سے پہلے مقالہ نگار کو موصول ہوئے۔ فرحت نے نہ صرف بڑے خلوص کے ساتھ سوالات کے جواب دیئے بلکہ میری حیثیت سے کہیں زیادہ مجھے عزت دی۔ یوں ہمارا رابطہ پھر سے بحال ہو گیا۔ میرا بڑا بیٹا شعیب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان گیا تو فرحت کے گھر بھی گیا اور ان کی ساری فیملی سے مل کر آیا۔ پھر طارق پاکستان گیا تو وہ بھی ان سب سے مل کر آیا۔ میری خواہش تھی

کہ فرحت پھر سے تخلیقی طور پر متحرک ہوں، وہ بھی ایسا چاہنے لگی تھیں لیکن غالباً گھریلو اور تدریسی مصروفیات انہیں مہلت نہیں دے رہیں۔ فرحت کے ساتھ میرے روابط میں لاگ اور لگاؤ دونوں تھے لیکن ان کے ساتھ سب سے اہم چیز ہمارا ایک دوسرے پر گہرا اعتماد اور رشتوں کے تقدس کا احترام تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم دونوں نے اپنے رشتوں کی پاکیزگی کو کبھی بھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ان کے ساتھ رابطہ رہے یا نہ رہے لیکن ایک انسپائریشن اور ایک اعتماد کبھی کم نہیں ہوئے۔

فرحت نواز، پروین عزیز اور ثمینہ راجہ تینوں میرے آبائی علاقہ کی شاعرات تھیں۔ فرحت کو جتنے مواقع میسر آئے انہوں نے عمدہ ادبی کام کیا۔ پروین کے ساتھ کچھ میں نے اور کچھ قسمت نے اچھا نہیں کیا اور یوں ایک بہت اچھی شاعرہ سامنے نہ آسکیں۔ ثمینہ کے حالات بھی کچھ ایسے موافق نہ تھے لیکن انہوں نے اپنے حالات سے خود ٹکر لی قسمت نے ان کا ساتھ دیا اور اب بہر حال وہ اردو کی ایک اچھی بلکہ بہت اچھی شاعرہ شمار کی جاتی ہیں۔

☆☆☆

عکاس اسلام آباد۔ شمارہ: جون ۲۰۰۸ء

جدید ادب جرمنی۔شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۰۹ء

رہے نام اللہ کا

نام تو اللہ کا ہی رہنے والا ہے، باقی سب کو فنا ہے لیکن یہ نام کیا چیز ہے؟ چلیں ہم انسان تو نام کی مجبوری رکھتے ہیں، کیا خدا کو بھی نام کی ضرورت ہے؟ یہ مسئلہ تھوڑا سا نازک ہے، اس لئے اس پر آگے چل کر بات کروں گا۔ فی الحال اپنے نام کے ساتھ یورپ میں ہونے والے سلوک کا حال بتا دوں۔ میرا پورا نام قریشی غلام حیدر ارشد ہے۔ ادب کی دنیا میں آیا تو اتنے طویل نام کو سنبھالنا مشکل لگا، سو قلمی نام حیدر قریشی موزوں لگا اور اسے اختیار کر لیا۔ میرے آنے سے پہلے میری اہلیہ اور تین بچے جرمنی پہنچ چکے تھے۔ پاکستان میں تو تین چار ٹکڑوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے ہیں۔ اور ان ٹکڑوں میں فیملی نام اور پہلے نام کی تخصیص بھی نہیں کی جاتی۔ چنانچہ چوہدری شاہ محمد صاحب کی اگلی پیڑھی آسانی سے شاہ صاحب بن جاتی ہے۔ لیکن ادھر یورپ میں پہنچے تو پتہ چلا کہ بچے دو ہی اچھے کی طرح نام کے بھی دو ہی حصے اچھے۔ مبارکہ سے پوچھا گیا کہ فیملی نام کیا ہے؟ اس نے آسانی سے خود کو مبارکہ حیدر لکھوا لیا۔ بچوں کے نام بھی اسی طرح حیدر فیملی نام کے ساتھ لکھ لئے گئے۔ جب میں جرمنی میں پہنچا تو میرے ساتھ آنے والے بیٹوں نے بھی اپنے نام شعیب حیدر اور عثمان حیدر لکھوائے، جبکہ میں نے اپنا پورا نام قریشی فیملی نام کے ساتھ درج کرایا۔ اب صورتحال یوں بنی کہ میرے گھر کے باقی سارے افراد کا فیملی نام حیدر تھا اور میرا فیملی نام قریشی۔ کسی آفس سے واسطہ پڑتا تو وہاں تھوڑی سی الجھن ہوتی لیکن پھر مسئلہ حل ہو جاتا۔

اسی دوران ایک آفس کی افسر نے بتایا کہ ہمیں تو اس صورتحال سے کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن آگے چل کر جب آپ لوگوں نے جرمن نیشنلٹی حاصل کرنا چاہی، تب آپ لوگوں کو فیملی بک بنواتے وقت مشکل پیش آئے گی۔ اس لئے یا تو باقی سب کا فیملی نام قریشی کرا لیں یا اپنا فیملی نام حیدر کر لیں۔ مجھے مسئلے کی نزاکت کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا حل ڈھونڈنے کے لئے ایک وکیل سے رابطہ کیا۔ فیملی نام میں تبدیلی سرکاری اور عدالتی سطح پر کرانا ہوتی ہے اور فی کس کے حساب سے یکساں فیس ادا کرنا پڑتی ہے۔ اب

صورتحال یوں بنی کہ یا تو میرا فیملی نام بھی حیدر کرا لیا جائے اور صرف ایک بندے کی فیس ادا کی جائے یا پھر چھ افراد کا فیملی نام قریشی کرایا جائے اور چھ گنا زیادہ فیس ادا کی جائے۔ اپنی مالی حالت دیکھتے ہوئے یہی مناسب لگا کہ میرا فیملی نام ہی حیدر کرا لیا جائے۔ سو یوں اب میرا فیملی نام حیدر ہو گیا اور پہلا نام شاہ محمد کی طرح قریشی ہو گیا۔ یوں قریشیت کے حوالے سے ہم اہلِ عرب خود ہی عجم ہو گئے۔ باقی صاحب! کہاں کا عرب اور کہاں کا عجم۔ ہم سیدھے سادے پاکستانی تھے اور اب اتنی ہی سیدھی سادی پاکستانی اصلیت کے ساتھ جرمن نیشنلٹی کے حامل ہیں۔ فیملی نام کی اس تیکنیکی تبدیلی کے نتیجہ میں واقعتاً ہم بہت سی قباحتوں سے بچ گئے اور بہت سارے کام بڑی آسانی سے ہو گئے۔

فیملی نام کے مسئلہ کو شاید پاکستانی دوست ٹھیک سے نہ سمجھ پائیں اس لئے یہاں کی بہت ساری مثالوں میں سے ایک دو مثالیں بیان کر دیتا ہوں۔ ایک لڑکے کے والد رانا تھے اور پاکستان میں مجسٹریٹ تھے، ان کی والدہ قریشی تھیں۔ میاں بیوی میں علیحدگی ہو گئی۔ لڑکے کی والدہ بیٹے کو لے کر جرمنی میں آ گئیں۔ یہاں انہوں نے اپنا فیملی نام قریشی لکھوایا اور اسی مناسبت سے راجپوت بیٹے کا فیملی نام بھی قریشی ہو گیا۔ ایک خاتون پہلے جرمنی پہنچیں تو انہوں نے اپنے نام کے ساتھ بیگم لکھوایا۔ اندراج کرنے والوں نے بیگم کو بطور فیملی نام لکھ لیا۔ اس کے بعد لطیفہ اس وقت بنا جب ان کے ہر بچے کے نام کے ساتھ بیگم بطور فیملی نام کے لکھا گیا۔ مثلاً عتیق بیگم، لئیق بیگم وغیرہ۔ اس فیملی کو واقعتاً بعد میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور کئی برس کی بھاگ دوڑ کے بعد اب اپنے نام ٹھیک کرا سکے ہیں، جبکہ خرچہ بھی بہت کرنا پڑا۔

یہ نام اور ذات کیا ہے؟ بلھے شاہ نے کہا تھا:

چل اوئے بلھیا اوتھے چلیے جتھے سارے انھیں   نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے نہ کوئی سانہوں منے

(بلھے شاہ! چلو وہاں چلیں جہاں سب اندھے ہوں،

تا کہ نہ کوئی ہماری ذات پہچان سکے اور نہ ہی ہمیں مانے۔)

ذات اور ہستی تو صرف خدا ہی کی ہے۔ اور نام۔۔ پتہ نہیں خدا کا کوئی ایسا نام بھی ہے جس کے بغیر اس کی شناخت ممکن نہ ہو؟ جہاں تک مختلف مسالک اور مذاہب کا تعلق ہے، جسے خدا کا جو نام ملا ہوا ہے یا بتا دیا گیا ہے وہ اسی نام کو خدا کا اصل نام قرار دیتا ہے۔ اور خدا کے لئے دوسروں کے اختیار کردہ ناموں کو صفاتی یا فرضی نام سمجھتا ہے۔ یہاں جرمنی میں مسیحی فرقہ یہوواہ وٹنسز کے کچھ لوگ میرے پاس

آتے رہے۔ان کا کہنا ہے کہ خدا کا اصل نام یہوواہ ہے۔میں نے انہیں کہا کہ سارے اچھے نام جو خدا کے لئے بولے جاتے ہیں،میں ان سب کا احترام کرتا ہوں۔اس لئے مجھے یہوواہ کے نام پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کا اصرار تھا کہ صرف یہی نام خدا کا حقیقی نام ہے۔پاکستان میں بھی اسلام کے نام پر انتہا پسندی کی جو لہر آئی ہوئی تھی اس کے نتیجہ میں وہاں خدا کا لفظ ایک طرح سے ممنوع قرار دے دیا گیا اور صرف 'اللہ' نام کو حقیقی قرار دیا گیا۔'اللہ' نام تو خود میری روزمرہ بول چال کا بھی حصہ ہے لیکن میں صرف اسی پر ایسا اصرار نہیں کرتا کہ دوسروں کے ناموں پر پابندی لگا دوں۔خدا کا نام تو ویسے بھی فارسی روایت کا حصہ ہے جو اردو میں رچ بس چکا ہے۔خدا کے نام کو چھوڑ کر صرف اللہ پر اصرار کرنے والے دنوں میں مجھے اکبر الہٰ آبادی کا ایک شعر یاد آتا رہا۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبؔر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

لفظ اللہ کے بارے میں پڑھا تھا کہ یہ ایل الہٰ سے بنا ہے۔الہٰ کا مطلب ہے معبود۔ایل کا لفظ خدا کے لئے بولا جاتا ہے۔حضرت اسماعیل کا اصل نام اسمع ایل ہے۔یعنی خدا نے سن لی۔بی بی ہاجرہ کے دکھ کو دیکھ کر خدا نے ان کی سن لی اور فرشتہ کے ذریعے انہیں ایک بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی۔اور اس کا یہی نام رکھنے کا حکم دیا تھا یعنی اسمع ایل۔چار معروف فرشتوں کے نام بھی خدا (ایل) سے ان کی وابستگی اور نسبت کو ظاہر کرتے ہیں۔جبرایل،میکائیل،عزرائیل،اسرافیل۔۔حضرت یعقوب علیہ السلام کے بنائے ہوئے بیت ایل کا ذکر بھی بائبل میں موجود ہے۔اور بائبل میں بعض دوسرے مقامات پر بھی ایل بمعنی خدا مذکور ہے۔باقی واللہ اعلم!

جرمن زبان میں خدا کے لئے Gott گاٹ کا لفظ بولا جاتا ہے۔اس کا صحیح تلفظ گاٹ اور گوٹ کے درمیان کی آوز میں ہے۔جس میں گَوٹ سے ملتی جلتی آواز نکلتی ہے۔میں یہاں جس اولڈ ہوم میں ملازم ہوں،یہاں ایک بزرگ خاتون فراؤ کلاسن (Frau Klassen) داخل ہوئی تھیں،اب فوت ہو چکی ہیں۔وہ جب کبھی کسی بات پر جھنجھلا جاتیں تو گوٹ گوٹ گوٹ گوٹ گوٹ چار پانچ بار ایک ساتھ کہہ جاتیں اور میں دل ہی میں کہتا فراؤ کلاسن تم نے تو اپنے خدا کو گھوٹ کر رکھ دیا۔

سائنسی ترقی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کمپیوٹر سے کلوننگ کے عہد تک آ گئی ہے۔ابھی آئرن ایج تھا،''لوہے کے پر اُگ آئے'' تھے،ہم اسی عہد کے سحر میں تھے کہ ڈیجیٹ ایج شروع ہو گیا۔چپ کی

جادوگری کی حیرتیں ختم نہیں ہوئیں کہ کلوننگ کا زمانہ بھی شروع ہو گیا۔اور ابھی پتہ نہیں مزید کیا سے کیا ہوتا جائے گا۔نئی سائنسی ترقیات سے ایک سطح پر مذہبی تصورات میں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے تو ایک بڑی سطح پر مذہب کا اثبات بھی ہو رہا ہے۔

کمپیوٹر چِپ کی کارکردگی دیکھیں تو اس میں لکھت پڑھت کے ساتھ آڈیو،ویڈیو ریکارڈنگ بھی محفوظ ہو جاتی ہے۔اگر انسانی چپ کی کارکردگی اتنی حیران کن ہے تو منکر نکیر کے تصور اور انسانی اعمال و افعال کی خدائی ریکارڈنگ کی بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے۔

میں چھ سات برس تک تو کمپیوٹر سے اور انٹرنیٹ سے جنون کی حد تک وابستہ رہا ہوں۔لیکن اب لگتا ہے دریا کی سیلابی کیفیت ختم ہو گئی ہے اور بس عام بہاؤ والی حالت ہو گئی ہے۔معمول کے اخبارات دیکھے،ای میلز پڑھیں،جواب بھیجے،اپنا ادبی کام کیا اور بس!وہ جو کئی کئی گھنٹے کمپیوٹر پر بیٹھنے کا شوق تھا اب ختم ہو گیا ہے۔ہاں معمول کے مطابق روزانہ ایک سے دو گھنٹے تک کمپیوٹر پر صرف ہو جاتے ہیں۔تاہم اپنے سارے بچوں کے مقابلہ میں اب بھی کمپیوٹر پر زیادہ وقت میں ہی بیٹھتا ہوں۔جب میرے بچوں کے بچے گھر پر آتے ہیں،مجھے اپنی بہت ساری چیزوں کی فکر رہتی ہے اور میں ان سے انہیں بچائے پھرتا ہوں۔ایک سال سے نو سال کی عمر تک کے یہ سارے بچے مجھ سے متعلق چیزوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔میری کتابیں ہوں،ٹوپیاں ہوں،کھانے پینے کی شوگر فری اشیاء ہوں یا میرا کمپیوٹر ہو،میرے پوتے ، پوتیاں ،نواسے سب اپنے اپنے طور پر داؤ میں لگے رہتے ہیں۔ٹوپیاں پہن لیں گے،اشیاء چکھتے پھریں گے۔ایک بچہ میری زیر مطالعہ کتاب کو اٹھائے گا اور جو صفحہ ایک بار دیکھ لے گا ،اسے پھر کوئی اور کتاب میں نہیں دیکھ سکے گا۔ایک پوتا پہلے کتابیں کتر کتر کر کھاتا تھا۔میں نے کہا بھئی یہ تو علم اور ادب کو ہضم کر رہا ہے۔کمپیوٹر پرنٹر کے لئے اے۔۴ سائز کے پیپرز کے پیکٹس کو بچے ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں اور پھر ہر بچہ ان پیپرز پر اپنی مرضی کی پینٹنگ یا شاعری کر رہا ہوتا ہے۔پیپرز کو بچوں سے بچانے کے لئے آخر اپنے کمپیوٹر کے ساتھ منسلک پرنٹر کو میں نے کمپیوٹر ٹیبل پر اس طرح سیٹ کیا کہ بچوں کا ہاتھ کاغذات والے حصے تک پہنچ ہی نہ سکے۔میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو سب کے ہاتھ میں پیپرز تھے اور وہ اپنے معمول کے مطابق پینٹنگ یا شاعری ''کرنے'' میں مصروف تھے۔پہلے بڑے افراد سے پوچھا کہ کس نے انہیں اتنے سارے پیپر نکال کر دیئے ہیں؟۔کسی بڑے نے ایسا نہیں کیا تھا۔پھر بچوں سے ڈائریکٹ تفتیش شروع کی تو پتہ چلا بڑے پوتے نے سب کو پیپر نکال کر دیئے

ہیں۔میں نے اس سے پوچھا آپ میز کے اوپر چڑھ گئے تھے؟ پوتے نے بتایا کہ نہیں ویسے نکالے ہیں۔میں اسے کمپیوٹر والے کمرے میں لایا۔اس کی عمر،قد اور میز پر رکھے پرنٹر کی سیٹنگ ایسی تھی کہ وہ کسی کی مدد کے بغیر یا میز پر چڑھے بغیر پیپر نکال ہی نہیں سکتا تھا۔میں نے اسے کہا ایک اور پیپر نکال کر دکھاؤ۔

پوتے نے فوراً پرنٹر کا سوئچ آن کیا پھر اس کے اس بٹن کو دبایا جس کے ذریعے حسبِ ضرورت فوٹو کاپی نکالی جا سکتی ہے۔بٹن دبانے کی دیر تھی بالکل پیچھے رکھے ہوئے پیپرز میں سے ایک پیپر باہر آ گیا۔چونکہ فوٹو کاپی کرنے کے لئے کوئی میٹر نہیں رکھا تھا اس لئے پیپر پلین ہی آنا تھا۔میں پوتے کی ترکیب پر حیران ہو کر ہنس رہا تھا اور پوتا مجھ سے پوچھ رہا تھا دادا ابو! اور کاغذ نکال دوں؟

پوتے کے ساتھ اس تجربہ کے بعد مجھے لگا کہ کمپیوٹر چپ کے کمالات کی طرح، اگلی زندگی میں ہمارے اعمال کا سارا ریکارڈ ہونے کے باوجود ہم گنہگاروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی کئی ترکیبوں پر اللہ میاں بھی پہلے تو پوچھے گا کہ اوئے بدمعاشو! تم نے یہ ساری حرکتیں کیسے کی تھیں؟ اور پھر ہمارے کسی جواب کے بغیر ہی ہنس دے گا کہ وہ تو سب کچھ ہی جانتا ہے۔اس کے پاس سارا ریکارڈ بھی موجود ہے۔

کمپیوٹر برق رفتاری کی علامت ہے۔زندگی کے ہر شعبے میں رفتار بہت تیز ہے۔ہم لوگ ۳۰ میل فی گھنٹہ سے زندگی شروع کرنے والے ۵۰ کلو میٹر فی گھنٹہ تک ہی پاکستان میں خوش ہو جاتے تھے۔کسی عزیز کو الوداع کہنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر جاتے یا کوئی ہمیں الوداع کہنے آتا، گاڑی ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رینگنا شروع کرتی تو الوداع کہنے والے چلتی ٹرین کے ساتھ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلتے اور الوداع کہنے کا یہ ایک ڈیڑھ منٹ کا وقت جیسے ملنے اور بچھڑنے کے سارے زمانے ساتھ لئے ہوتا تھا۔ابا جی کبھی ہمیں ٹرین پر سوار کرنے آتے تو عموماً پلیٹ فارم کے آخری سرے تک ساتھ ساتھ چلتے آتے۔اور جب پلیٹ فارم اور ابا جی ایک ساتھ آنکھ سے اوجھل ہو جاتے تو اگلی منزل پر جانے کی خوشی کے باوجود ایسے لگتا جیسے ابا جی گم ہو گئے ہیں۔اور اب کہ زندگی کی اس منزل پر آ گیا ہوں جہاں لوکل ٹرین بھی سٹارٹ ہوتی ہے تو اتنی رفتار پکڑ لیتی ہے کہ ایک قدم بھی ساتھ ساتھ چلنے کی نوبت نہیں آنے دیتی۔یہاں ایک بار بچوں کو ٹرین کے ذریعے سفر کر کے ہمبرگ جانا تھا، میں انہیں خدا حافظ کہنے کے لئے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ گیا۔جب ٹرین روانہ ہوئی تو میں بچوں کو ٹرین کے ساتھ چلتے چلتے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہنے کی خواہش دل میں ہی لئے رہ گیا۔لیکن اس تجربہ نے مجھے فرینکفرٹ ریلوے اسٹیشن پر ابا جی سے ملا دیا۔مجھے لگا ابا جی عدم کے پلیٹ فارم پر کھڑے مجھے زندگی کی ٹرین میں دیکھ کر ہاتھ ہلاتے، ساتھ ساتھ

چلے آ رہے ہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی مخصوص جدید سائنسی تجربات و ایجادات کی۔حال ہی میں کلوننگ کا ایک انوکھا تجربہ کامیابی کے ساتھ کیا گیا تھا۔کسی جاندار کے کسی ایک سیل کو لے کر سائنسی عمل سے گزار کر ہو بہو ویسا ہی جاندار بنا دینا۔یہاں تک کہ آپ کے مکھڑے پر دائیں جانب تل ہے تو آپ کے ایک سیل سے بنایا جانے والا آپ کا ہمزاد بھی بعینہٖ ویسے تل کا حامل ہوگا۔اس کے نتیجہ میں پیدائش کے عمل میں مرد اور عورت کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔یہاں ٹیسٹ ٹیوب بے بی والا کوئی جھنجھٹ بھی نہیں ہے۔بے شک یہ تجربہ ایک سطح پر بہت سارے مذہبی تصورات کو توڑتا دکھائی دیتا ہے۔میرے جیسا بندہ جو بچپن میں خوش الحانی سے ایک نظم میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا

بنا سکتا نہیں اک پاؤں کیڑے کا بشر ہرگز   تو پھر کیونکر بنانا نورِ حق کا اس پہ آساں ہے

اب عمر کے اس حصے میں دیکھ رہا ہے کہ ایک بھیڑ (ڈولی) کی کلوننگ کا کامیاب تجربہ ہو چکا ہے۔اس کے بعد اسی انداز کے چند اور تجربے بھی ہوئے ہیں تاہم پہلے تجربے کے بعد کسی بڑے بریک تھرو کی خبر نہیں آئی۔اس تجربہ کے فوراً بعد پوپ سمیت سنجیدہ مذہبی حلقوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اس پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا تھا اور امریکہ سمیت بعض ممالک نے بھی اس تجربہ پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ویسے امریکہ کی تشویش کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ آج کی ترقی یافتہ ترین سائنس کے عہد کا سب سے بڑا سائنسی تجربہ کرنے والا کوئی امریکی نہیں تھا بلکہ اسکاٹ لینڈ کا ایک سائنس دان تھا۔جدید سائنس کی ابتدا گلیلیو سے شروع کریں تو اس کے یہ کہنے پر کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گردش کر رہی ہے، اُس وقت کے پوپ کے حکم سے اسے کافر قرار دے کر مار دیا گیا تھا۔اب کلوننگ کے تجربے پر ناپسندیدگی کرنے والے بھی دراصل سائنس کو عقائد کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔بے شک کلوننگ کے کامیاب تجربہ سے موت پر قابو پانے کے انسانی خواب کی امیدیں بڑھ گئی ہیں۔ہم پرانی داستانوں میں جو آبِ حیات ڈھونڈتے پھرتے تھے، کلوننگ بھی اس سے ملتی جلتی کوئی چیز لگتی ہے۔ویسے آبِ حیات کی تلاش کا ایک اور تجربہ بھی ہو رہا ہے جس کے مطابق انسانی زندگی کو دو اڑھائی سو سال تک آسانی سے لے جایا جا سکے گا۔سائنس ابھی سائنسی آبِ حیات کے کنارے تک پہنچنے والی ہے مگر ہم تو اپنی داستانوں میں پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ آبِ حیات پی چکنے والے سارے لوگ آبِ حیات نہر کے کنارے پر ایسی عبرتناک حالت میں زندہ تھے کہ تڑپ رہے تھے اور موت کی دعا کر رہے تھے لیکن انہیں موت نہیں آ رہی تھی۔شاید

ہماری سائنس بھی اسی طرف یا اس سے کچھ ملتی جلتی طرف جا رہی ہے۔اس کے باوجود کہ سائنسی ایجادات کے اس تیز رفتار دور میں کوئی ایجاد کسی ایسی تباہی کا باعث بن سکتی ہے جو انسان کو پھر سے پتھر کے زمانے میں لے جائے، پھر بھی میں مذہب کی طرح سائنس کی بھی خودمختاری کا حامی ہوں۔کلوننگ کے تجربہ کی کامیابی سے ایک چھوٹی سطح پر مذہبی افکار پر ضرب تو لگی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ بڑی سطح پر مذہب کا اثبات ہوا ہے۔اگر ایک سائنسدان کسی جاندار کے ایک سیل سے بالکل ویسا جاندار بنا سکتا ہے تو حیات بعد الموت کا مذہبی عقیدہ سائنسی طور پر ثابت ہو گیا کہ خدا کے لئے ہماری خاک یا راکھ میں سے کسی ایک سیل کو نکال کر اس سے ہمیں دوبارہ زندہ کر دینا کونسا مشکل کام ہوگا۔قرآن شریف میں کئی مقامات پر معترضین کے الفاظ آئے ہیں کہ جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے تو پھر ہمیں کیسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔اللہ کی قدرتوں کا تو اپنا ہی انداز ہے لیکن کلوننگ کا تجربہ بجائے خود حیات بعد الموت کے عقیدہ پر اعتراض کا سائنسی جواب ہے۔

میری کئی دہریے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔پاکستان میں، انڈیا میں اور اب یہاں جرمنی میں بھی۔دہریے لوگوں کی کم از کم دو قسمیں تو میرے ذہن میں واضح ہیں۔ایک قسم کے دہریے وہ ہیں جو کچے پکے مطالعہ کے ساتھ، دانشور کہلانے کے لئے شوقیہ دہریے بن گئے۔یہ لوگ محض محفلوں میں نمایاں ہونے کے لئے نازیبا زبان میں بات کرتے ہیں۔خدا کو سمجھنے کی کاوش یا اس کی جستجو (چاہے اس کے نتیجہ میں بندہ کوچۂ الحاد میں بھی چلا جائے) ان کے ہاں بالکل نہیں ہوتی۔نام آوری کے ایسے شوقین دہریوں کو میں شیخ چلی دہریے سمجھتا ہوں۔ان کے برعکس وہ لوگ جو واقعتاً خدا کی ہستی کو عقل کے ذریعے سمجھنا اور جاننا چاہتے ہیں، میں ان کے انکار کے باوجود انہیں خدا پرست کہتا ہوں۔**لاتسبو الدھر** والی حدیث قدسی میں خدا خود کہتا ہے کہ زمانے (دہر) کو برا مت کہو، میں خود زمانہ (دہر) ہوں۔تو صاحب! اگر خدا دہر ہے تو دہریہ کا مطلب ہوا خدا پرست۔

مختلف مذاہب کا پس منظر رکھنے والے دہریوں میں ایک دلچسپ چیز میں نے یہ دیکھی کہ کسی نہ کسی سطح پر وہ اپنے مذہب سے لازماً وابستہ ہوتے ہیں۔یہاں فرینکفرٹ میں ایک بی بی کرسٹین Kerstin خود کو انسانیت کا علمبردار کہتی ہیں۔مسیحی چرچ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں، مذہب ان کے نزدیک نفرتوں کی بنیاد ہے۔مسٹر مُلر Müller خود کو واضح لفظوں میں دہریہ کہتے ہیں۔میں نے ان سے ان کا فکری پس منظر جاننا چاہا تو انہوں نے کوئی وضاحت نہیں کی۔لیکن اتنا معلوم ہو گیا کہ ان کی اہلیہ یہودی ہیں۔ایک دن

فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے حوالے سے کسی تازہ خبر پر گفتگو شروع ہوئی تو مسٹر مُلر کی ساری دہریت کھل گئی۔مجھے احساس ہوا کہ وہ دہریے تو ہیں لیکن یہودی دہریے۔یوں دہریوں کے بھی کئی مسلک سمجھ لیجئے۔مسلمان دہریے، مسیحی دہریے، ہندو دہریے۔یہاں کراچی کے ایک معروف ترقی پسند نقاد اور لاہور کے بھی ایک نیم ترقی پسند کالم نگار کی یاد آ گئی۔ان میں سے ایک نے انڈیا کے ادیب دوستوں میں بیٹھ کر اظہر جاوید کے مسلک کا مذاق اڑایا اور ایک نے میرے مذہبی رجحانات کی خطرناکی سے وہاں کے ہندو دوستوں کو آگاہ کیا۔سو ثابت ہوا کہ دہریوں کی بھی اقسام ہیں یعنی مسلمان دہریے، مسیحی دہریے، ہندو دہریے، یہودی دہریے، وغیرہ وغیرہ۔جو حسبِ موقع صاحبِ ایمان بھی بن جاتے ہیں۔

یہاں مجھے پاکستان سے سائنس کے ایک استاد ایم سلیم کی یاد آ گئی۔پندرہ سولہ سال قبل ان کی ایک چھوٹی سی کتاب پڑھی تھی۔"پُر اسرار کائنات کا معمہ"۔اس میں کاسمالوجیکل حوالے سے بڑی زبردست معلومات درج کی گئی تھی۔لیکن میرے مطلب کا سب سے اہم حصہ وہ تھا جس میں خلا کی بعض صفات اور خدا کی صفات کا ذکر کیا گیا تھا۔میں نے خدا کو سمجھنے میں اس موازنہ سے زبردست استفادہ کیا۔پہلی سطح پر یہ موازنہ خدا کے بارے میں ہمارے معیّن تصورات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔لیکن میں نے (لا الہٰ۔۔) نفی کے اس مرحلہ سے گزر کر خدا کے بارے میں ایک برتر تصور (لا الہ الا اللہ) تک رسائی حاصل کی۔نفی کا مرحلہ بجائے خود ایک دلچسپ سفر تھا۔خدا کی جتنی صفات ہیں انہیں ہم دو بڑے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک خانے میں وہ صفات آتی ہیں جو انسان میں چھوٹی سطح پر پائی جاتی ہیں اور خدا میں بہت بڑی سطح پر ان صفات کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔جیسے ربوبیت، رحیمیت، رحمانیت، قہاریت، جباریت وغیرہا۔ان صفات کے علاوہ ایسی جتنی بھی صفات ہیں جو انسان میں تو نہیں پائی جاتیں لیکن وہ ساری صفات خدا کے ساتھ خلا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ایم سلیم نے مجھے ان صفات کا موازنہ کر کے ایک نئے فکری جہان کی سیر کرا دی تھی۔چند مثالیں یہاں بھی درج کر دیتا ہوں۔

۱۔خدا سب سے بڑا ہے۔اس کی بڑائی کی کوئی حد نہیں ہے۔خلا بھی ساری کائنات سے بڑا ہے۔جہاں تک مادی کائنات ہے، خلا موجود ہے اور اس سے سوا بھی خلا ہی خلا ہے۔

۲۔خدا واحد ہے۔خلا بھی پوری کائنات میں ایک ہی ہے۔

۳۔خدا کسی سے پیدا نہیں ہوا۔خلا بھی کسی سے پیدا نہیں ہوا۔

۴۔خدا بے نیاز ہے۔اور بے نیاز کی تعریف یہ ہے کہ اسے کسی کی کوئی ضرورت نہ ہو لیکن سب کو

اس کی ضرورت ہو۔اس مادی کائنات کواپنے وجود کے قیام کے لئے خلا کی اشد ضرورت ہے۔لیکن خلاکو کسی کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ پرواہ۔

۵۔خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔خلابھی ہر جگہ موجود ہے اور ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

لیکن شاید اتنا کہہ دینے سے بات واضح نہیں ہوگی اس لئے اس سائنسی نکتے کی آسان لفظوں میں وضاحت کردینا ضروری ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا سے زبانی طور پر بھی اور ان کی خودنوشت سوانح کے ذریعے بھی اتنا تو جان چکا ہوں کہ اگر کروڑوں نوری سال سے بھی زیادہ مسافت پر پھیلی ہوئی ساری مادی کائنات میں سے خلا کو نکال دیا جائے تو سارا مادہ ایک گیند کے برابر یا اس سے بھی کم چمچ بھر رہ جائے گا۔بعض سائنس دانوں کے نزدیک اسے Compress کیا جائے تو یہ اس سے بھی کم ہوکر سوئی کی نوک پر سماجائے گا۔اگر کوئی اینٹی میٹر اس سے ٹکرا جائے تو یہ مادہ بھی گا ماریز میں تبدیل ہوکر غائب ہوجائے گا اور باقی صرف خلا رہ جائے گا۔اور خدا کی بجائے خلا کے لفظ سے بھی غالبؔ کا یہ شعر اپنے مفہوم میں غلط نہیں رہے گا۔

نہ تھا کچھ،تو خلا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خلا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے،نہ ہوتا میں،تو کیا ہوتا!

شہ رگ سے قریب ہونے والی بات کی وضاحت رہی جا رہی ہے۔اسے بھی آسان لفظوں میں بیان کرنا ضروری ہے۔ایٹم کے اندر جو پارٹیکلز ہیں ان کے درمیان بھی خلا ہے۔پروٹون اور الیکٹرون کے درمیان خلا کو سمجھنے کے لئے یہ جان لیں کہ اگر پروٹون کا سائز ایک فٹ بال جتنا تصور کر لیا جائے تو اس سے الیکٹرون تقریباً دو میل کی دوری پر ہوگا۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے وجود کے ہر ذرے میں خلا کس حد تک سرایت کئے ہوئے ہے اور اسی مناسبت سے وہ واضح طور پر ہم سے ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

سو یوں ایک سطح پر فکری طور پر میرا مسئلہ یہ بنا کہ خدا کو اس کی صفات کے ذریعے جانا جائے تو انسانی صفات اور خلا کی صفات جیسی مشترکہ صفات کو چھوڑ کر کوئی ایسی صفت بھی ہونی چاہئے جو صرف خدا ہی کا امتیاز ہو۔اور وہ صفت کونسی ہے؟۔۔۔میری زندگی کا بیشتر عرصہ ایک شوگر مل میں مزدوری کرتے گزرا ہے۔وہاں لیبارٹری میں گرمیوں کے دنوں میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے روشنی کے کیڑے آجاتے تھے(ان کیڑوں کے کچھ احوال کے لئے میرا ایک پرانا افسانہ ''پتھر ہوتے وجود کا دُکھ'' پڑھئے)۔ان میں

سے کوئی کیڑا اگر پوری شوگر مل کی حقیقت جاننا چاہے تو یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔انسان کی حقیقت خدا کے سامنے کیڑے اور شوگر مل کی مناسبت جیسی بھی نہیں ہے۔لیکن پھر بھی انسان میں اپنے خالق و مالک کو جاننے کی جستجو تو ہے۔

حضرت علیؑ کا ایک فرمان اس جستجو میں میری رہنمائی کر گیا۔**کمال التوحید نفی عن الصفات**۔۔۔توحید کی حقیقت اور کمال تب ظہور فرماتا ہے جب صفات کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔یا یوں کہہ لیں کہ صفات بھی بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔اور اس حقیقتِ عظمٰی کے سامنے صفاتی نام بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔پھر ایک حدیث شریف میں مذکور ایک دعا کے ذریعے بھی خدا کو جاننے کی جستجو کو تسکین سی ملی۔مسلم شریف کی اس دعا کا متعلقہ حصہ یہاں تبرکاً درج کر دیتا ہوں۔**اللھم ...اسئا لک بکل اسمِ ھو لک سمیت به نفسک او انزلته فی کتابک او علمته احدا من خلقک اواستاء ثرت به فی علم الغیب عندک ان تجعل القرآن العظیم ربیع قلبی** اے اللہ!۔۔۔میں سوال کرتا ہوں تیرے اس نام کے ساتھ جو تو نے اپنے لیے پسند کیا،یا اپنی کتاب میں تونے اتارا ہے،یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے،یا اپنے علم غیب میں تو نے اسے اختیار کر رکھا ہے،اس بات کا کہ تو کردے قرآن مجید کو میرے دل کی فرحت وخوشی۔

گویا خدا کا کوئی ایک ایسا نام ابھی ہے جو بڑی بڑی صاحبِ عرفان ہستیوں کو بھی معلوم نہیں ہے۔یہ دعا کا اقتباس ہے،پوری دعا میری روز کے معمول کا حصہ ہے اور شاید اسی دعا کی برکت ہے کہ جرمنی جیسے ملک میں رہتے ہوئے اب تک میرے دونواسوں اور ایک پوتے نے قرآن شریف ختم کر لیا ہے۔بڑے نواسے رومی نے تین سال پہلے سات سال کی عمر میں،دوسرے نواسے جگنو نے اسی برس (۲۰۰۶ء میں) ساڑھے سات برس کی عمر میں اور بڑے پوتے شہری نے بھی اسی برس ساڑھے پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا ہے۔رومی اور جگنو کی قرأت کا تو مجھے علم تھا کہ بہت عمدہ ہے۔تاہم اپنے پوتے کے بارے میں مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا تلفظ اور لہجہ بھی اتنا عمدہ ہے۔اب ۲۴ جون (۲۰۰۶ء) کو جب اس کی آمین کی تقریب میں اس سے قرآن شریف سنا تو میں حیران رہ گیا،حقیقتاً میرے پوتے نے اپنی قرأت سے میرا دل خوش کر دیا۔میری عربی ریڈنگ پنجابی لہجے والی ہے،میرے مقابلہ میں تینوں بچوں کی قرأت سن کر جی خوش ہوتا ہے۔خدا میری بڑی بیٹی اور بڑی بہو کو اجرِ عظیم عطا کرے کہ ان کی توجہ کے بغیر بچے گھر پر رہ کر اتنا پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔اور باقیوں کو بھی خدا توفیق دے کہ وہ بھی اپنے

بچوں کو اسی طرح قرآن شریف پڑھنا سکھا دیں۔آمین

میں نے مسلم شریف والی مذکورہ دعا کو اپنے روزانہ معمول کا حصہ بتایا ہے۔دعاؤں کے بارے میں ''دعائیں اور قسمت'' باب میں کچھ ذکر کر چکا ہوں۔اس دوران معمولات میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی آجاتی ہے۔گھر پر فجر کی نماز کے بعد والی دعائیں بدستور جاری ہیں۔پھر گھر سے نکل کر جاب پر جانے تک دعاؤں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔رمضان شریف کے مہینہ میں ایسا کرتا ہوں کہ چھوٹے سائز کا قرآن شریف جاب پر ساتھ لے جاتا ہوں۔دعاؤں کا سلسلہ مکمل کرنے کے بعد دورانِ سفر قرآن شریف پڑھتا رہتا ہوں۔رمضان شریف کے مہینہ میں یہ عادت سی بن جاتی ہے چنانچہ میں نے رمضان شریف کے بعد بھی قرآن شریف ساتھ لے جانے کا سلسلہ جاری رکھا۔لیکن پھر مجھے ایک دو جھٹکے لگے۔ٹرین کے انتظار میں کھڑا ہوں۔کوئی پاکستانی واقف دوست مل گئے۔رسمی سی خیر خیریت کی باتیں ہوتی ہیں۔اور مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ سچائی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود عام زندگی میں دن بھر میں کتنے ہی جھوٹ بول جاتے ہیں۔بے ضرر سے سہی لیکن جھوٹ تو جھوٹ ہی ہے۔دوست مجھ سے کل کا پروگرام پوچھتا ہے اور میں اس سے جان چھڑانے کے لئے ڈیوٹی کا وقت غلط بتا دیتا ہوں۔اس قسم کے کئی جھوٹ جو ہم دن میں بلا تکلف بول جاتے ہیں۔مجھے لگا کہ قرآن شریف کو ساتھ رکھ کر معمول کی زندگی بسر کرنا مشکل ہو رہا ہے۔بولتے ہوئے بار بار اٹکنا پڑتا ہے اور پھر رُک جانا پڑتا ہے۔نہ رُکیں تو قرآن اُٹھا کر جھوٹ بولنے والی بات ہو جائے۔اب میرے سامنے دو رستے تھے، یا تو میں ہمیشہ قرآن شریف ساتھ رکھا کروں اور اس طرح بے ضرر قسم کے جھوٹ بولنے سے بھی بچنے کی عادت کو مستحکم کر لوں۔یا پھر قرآن شریف کو صرف گھر پر ہی پڑھا کروں اور بلاوجہ قرآن اٹھا کر جھوٹ بولنے کا مجرم نہ بن جاؤں۔اور صاحب! سچی بات ہے میں نے دوسری صورت اختیار کرنے میں عافیت سمجھی ہے۔

دعاؤں کا ورد تو اب بھی جاری ہے لیکن غضِ بصر والی عادت کم ہوتی جا رہی ہے۔ٹرین میں بیٹھے ہوئے وِرد از خود جاری رہتا ہے۔ذہن کسی اور طرف ہو تب بھی وِرد عموماً کسی روک کے بغیر جاری رہتا ہے۔لیکن بعض اوقات سوئی اٹکنے بھی لگتی ہے۔میں دعا پڑھ رہا ہوں: **اللھم طھر قلبی من النفاق و عملی من الریآءِ و لسانی من الکذب و عینی من الخیانته**۔۔۔(اے اللہ میرے دل کو نفاق سے پاک وصاف کر دے اور میرے ہر عمل کو ریا سے اور زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک کر دے۔۔۔) دعا ابھی یہاں تک پہنچتی ہے اور نظر باہر اسٹیشن پر لگے ہوئے ایک

بڑے اشتہاری بورڈ پر جا پڑتی ہے۔آٹھ دس خواتین مکمل برہنگی کی حالت میں کھڑی مسکرا رہی ہیں۔اگرچہ اشتہاری کمپنی نے اشتہار کو بے حیائی سے بچانے کے لئے ان خواتین پر دو بڑی پٹیاں کھینچ دی ہیں جن سے ان کی زینت کے مقامات کی کسی حد تک پردہ پوشی ہو جاتی ہے۔لیکن **عینی من الخیانته** پڑھتے ہوئے ہی وہ منظر سامنے آجائے تو کمزور انسان کیا کرے؟

اگلے اسٹیشن تک دعا پڑھ رہا ہوں **رب تقبل توبتی واغسل حوبتی و اَجب دعوتی**..اور سامنے بورڈ پر ایک مکمل برہنہ مرد کسی سنسر شپ کی پٹی کے بغیر نیم دراز ہے۔البتہ فوٹو گرافی کا کمال یہ ہے کہ اس کا ستر بھی ظاہر نہیں ہوتا۔لیکن میری دعا **واغسل حو بتی** پر اٹکتی ہے، میں کراہت کے ساتھ کسی تھوک کے بغیر تھوک نگلنے جیسی کیفیت سے گزرتا ہوں اور باقی دعا مکمل کرنے لگتا ہوں۔سید الاستغفار کے ان الفاظ پر پہنچتا ہوں **انا علیٰ عھدک و وعدک ماا ستطعت**....سامنے کوئی خوبصورت خاتون بورڈ پر توبہ شکن حالت میں بیٹھی دکھائی دیتی ہیں۔بدن پر ایک گرہ کپڑا بھی نہیں ہے۔لیکن فوٹو گرافر کا کمال یہ ہے کہ بازو کے ایک زاویے سے سینے کی پوری ستر پوشی کر دی ہے اور ٹانگ کے ایک زاویے سے زینت کی بھی ستر پوشی ہو گئی ہے۔لیکن ایسی تصاویر اپنی تاثیر کے لحاظ سے بالکل گندی تصویر سے زیادہ ''ہدف بہ تیر'' ثابت ہوتی ہیں۔اور میں بار بار یہی الفاظ وِرد کئے جاتا ہوں۔**انا علیٰ عھدک و وعدک ماا ستطعت**....... **ما ا ستطعت** . . . . **ماا ستطعت** . . . . . . **ماا ستطعت** ...استطاعت سے زیادہ کچھ کیا بھی تو نہیں جا سکتا۔

یہاں تک لکھنے کے بعد مجھے ان مولوی صاحب کا لطیفہ یاد آ گیا ہے جو جمعہ کے خطبہ میں اس کرب کا اظہار کر رہے تھے کہ معاشرے میں بے حیائی اور عریانی بہت زیادہ پھیل رہی ہے اور پھر بطور ثبوت انہوں نے جزئیات میں جانا شروع کیا تو ایک نمازی نے کھڑے ہو کر التجا کی جناب! آپ نے جمعہ کی جماعت کھڑی کرانی ہے یا۔۔۔۔۔۔۔۔ہمیں کسی ابتلا میں ڈالنا ہے؟

سو مجھے بھی ایسا کچھ نہیں کرنا، اپنے ابتلا سے خود ہی گزرنا ہے۔ جو کچھ زمیں دکھائے سو ناچار دیکھنا

اب ہماری اگلی نسلیں اس مغربی ماحول میں کس حد تک خود کو بچا سکیں گی؟ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں بزرگوں کے شوق ہی پورے نہیں ہو رہے۔پچاس سال سے ساٹھ سال تک کی عمر کے کئی پاکستانی جوڑے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔کہیں خواتین کو معاشی تحفظ ملا ہے تو انہوں نے خاوندوں کو چھوڑ دیا ہے اور کہیں مردوں کو کوئی نئی چمک دکھائی دی ہے تو انہوں نے عمر بھر

کے ساتھ کوتوڑ کر رکھ دیا ہے۔وفا کے کئی ایسے بھرم ٹوٹے ہیں جومشرقی ماحول میں مجبوریوں کے باعث بنے ہوئے تھے۔یورپ میں جہاں یہ احساس ہوا کہ ہمیں معاشی لحاظ سے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا اور معاشرتی طور پر بھی کوئی دباؤ نہیں رہے گا تو مشرقی روایات کے سارے بھرم ٹوٹ کر بکھر گئے۔لیکن صرف مغرب میں مقیم ہم لوگوں کا ہی ذکر کیوں؟اب تو پاکستان بھی انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلز کی برکت سے، حرکات کے لحاظ سے لگ بھگ آدھا یورپ بن چکا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں جو کچھ ریلوے اسٹیشنوں اور بس اڈوں پر سرِ عام دکھائی دیتا ہے وہاں وہ سب کچھ اور اس سے سوا بھی بہت کچھ،انٹرنیٹ پراور ٹی وی چینلز پر دستیاب ہے۔ایک حالیہ سروے کے مطابق انٹرنیٹ پر فحش ویب سائٹس پر کثرت سے جانے والے ممالک میں پاکستان تیسرے نمبر پر ہے۔میڈیائی یلغار اور مغربی تہذیب کی چکا چوند کے ساتھ قناعت کا دامن ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے۔لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی ہے،پاکستان میں ایک طرف لوٹ مار کرنے والے مقتدر طبقے ہیں تو دوسری طرف غربت اور بھوک کی ماری ہوئی رعایا ہے جو قناعت کا درس بھول گئی ہے۔عوام کو معلوم ہو گیا ہے کہ ایک طویل عرصہ سے انہیں قناعت کا درس دینے والے اور دلانے والے ملی بھگت کے ساتھ ان کا استحصال کر رہے ہیں۔درس دلانے والے لکھ پتی سے کروڑ پتی اور اب ارب پتی بنتے جا رہے ہیں۔قناعت کا درس دینے والے بھی لکھ پتی سے بڑھ کر کروڑ پتی ہو گئے پھر بھی بھوکے ننگے عوام کو ہی درس دیا جا رہا ہے کہ قناعت سے کام لیں اور وطن کے لئے مزید قربانیاں دیں۔عوام اس فریب سے آشنا ہو گئے ہیں اسی لئے اخلاقی مسائل کے ساتھ افراتفری کا سماں بڑھتا جا رہا ہے۔

اس وقت دنیا کو مذہبی انتہا پسندی سے شدید خطرات لاحق ہیں۔کسی ایک مذہب یا مسلک کو قصوروار کہے بغیر میرے نزدیک ہر مسلک اور مذہب کے انتہا پسند انسانیت کے لئے شدید خطرہ ہیں۔میرے ذاتی خیال کے مطابق ہر مسلک اور مذہب کے پاس کچھ ایسی بنیادیں ہوتی ہیں جن پر وہ باقاعدہ قائم اور استوار ہوتا ہے۔اسی لئے اس کے پیروکاروں کے لئے اس پر کاربند رہنے کا کچھ جواز بنتا ہے۔اسی طرح ہر مذہب اور مسلک میں کچھ ایسے کمزور پہلو بھی ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ان پر مدلل اعتراض وارد ہوتے ہیں۔بس جہاں ایسے اعتراضات میں شدت آتی ہے وہیں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی اپنے مخالف کے کمزور پہلوؤں پر حملہ کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔یوں مذہبی نفرتیں بڑھتی ہیں۔عمومی طور پر ہمارے تہذیبی اور ثقافتی میلان کے ساتھ ہمارا نفسیاتی میلان ہمیں کسی مسلک پر کاربند

رکھتا ہے۔یا پھر بھیڑ چال کا نسل در نسل رویہ بھی ہمیں ہانکتا ہے۔یوں کوئی انتہائی جذباتی اور مشتعل قسم کا سچا مومن اگر کسی مسیحی،یہودی،ہندو یا سکھ گھرانے میں پیدا ہوتا تو وہاں بھی وہ اتنا ہی مخلص،سچا،کھرا،جذباتی اور مشتعل قسم کا مسیحی،یہودی،ہندو یا سکھ ہوتا۔

میں ہر مذہب کے اس قسم کے مومنین کا احترام بھی کرتا ہوں اور ان سے ڈرتا بھی ہوں اور ہر سال اکبر حمیدی کے الفاظ میں دعا کرتا ہوں:

یارب العالمین! ترے لطف سے رہیں
محفوظ ''مومنین'' سے ''کفار'' اس برس

مجھے مذہب اور سائنس کے اس پہلو سے دلچسپی ہے جہاں سائنس آزادانہ طور پر کائنات اور اس کے بھیدوں کی نقاب کشائی کا کوئی مرحلہ سر کرتی ہے اور **لا الہ** ۔۔کا منظر دکھاتی ہے اور وہیں کہیں آس پاس سے مذہب کی بخشی ہوئی کوئی روحانی کیفیت یا کوئی مابعدالطبیعاتی لہر مجھے اس نفی میں سے اثبات کا جلوہ دکھاتی ہے اور **الا اللہ** کی صدائیں آنے لگتی ہیں۔اور یہ سارا سائنسی اور مابعدالطبیعاتی آہنگ میری ادبی جمالیات میں میری ادبی استطاعت کے مطابق اپنے رنگ دکھانے لگتا ہے۔کمپیوٹر کے چِپ کی کارکردگی منکر نکیر اور یومِ حساب پر ایمان پختہ کرتی ہے تو کلوننگ کا تجربہ حیات بعد الموت کا سائنسی ثبوت دے کر اس عقیدہ پر مجھے مزید راسخ کرتا ہے۔خلا کو نکال دینے سے ساری کائنات کا مادہ سوئی کی نوک پر سما جانے،اور پھر کسی اینٹی میٹر کے اس سے ٹکرانے کے نتیجہ میں اس کے بھی غائب ہو جانے کا سائنسی دعویٰ مجھے اس قیامت پر پکا یقین دلاتا ہے جس میں ساری کائنات فنا ہو جائے گی اور صرف خدا کی ہستی باقی رہے گی۔میرا شروع سے یہی خیال رہا ہے کہ سائنس خدا کی نفی کرتے ہوئے اسی کی طرف جا رہی ہے،مذہب روحانی طور پر اسی کی طرف سفر کراتا ہے اور ادب بھی جمالیاتی سطح پر اسی حقیقتِ عظمیٰ کی طرف سفر کرتا ہے۔اور بس۔۔۔بات اپنے نام کے حصے بخروں کی داستان سے شروع ہوئی تھی اور اس کے نام پر تمام ہو رہی ہے جو اس ساری بھید بھری کائنات کا مالک وخالق ہے۔ے

سب موت کا شکار ہیں اس کو فنا نہیں

رہے نام اللہ کا!

☆☆☆

جدید ادب جرمنی۔شمارہ:جنوری تا جون ۲۰۰۷ء

روح اور جسم

برادرم نذر خلیق نے مجھے ایک الجھن میں ڈال دیا ہے۔انھوں نے میری دوسری تحریروں کے بعض مندرجات سے عمومی طور پر اور یادوں کی قسط ''رہے نام اللہ کا!'' سے خصوصی طور پر اخذ کر کے استفسار کیا ہے کہ میں جب روحانیت کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری کیا مراد ہوتی ہے؟ اوران کا اصرار ہے کہ میں اس کا جواب کسی مضمون میں یا پھر یادوں کی کسی قسط میں ہی لکھ دوں ۔یہ بیک وقت بہت ہی آسان اور بہت ہی مشکل سوال ہے۔سو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق مختصر ترین عرض کرتا ہوں کہ انسانی روح جب اپنے اصل مالک وخالق کی جستجو کا سفر کرتی ہے تو یہ سفر روحانیت کہلاتا ہے۔خالقِ کائنات روحِ اعظم ہے۔ہم سب اسی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف ہم سب نے لوٹ کر جانا ہے۔کسی کی وفات پر **انا للہ و انا الیہ راجعون** کہتے ہوئے ہم دراصل اسی حقیقت کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔

اُسی کے پاس تو جانا ہے لَوٹ کر آخر
سو خوب گھومیئے ، پھریئے ، رجوع سے پہلے

پیغمبرانِ الٰہی کی روحانیت ایک الگ مقام ومرتبہ ہے،اولیا وصوفیا کی روحانیت کے بھی اپنے اپنے مدارج ہیں۔ان سے ہٹ کر کوئی عام انسان اگر سچی لگن کے ساتھ خدا کی جستجو کرتا ہے،تو اس کی یہ جستجو ہی اس کی روحانیت ہے،اس میں وہ جتنی ترقی کرتا جائے گا،اتنا ہی روحانی طور پر آگے بڑھتا جائے گا۔روحانی مدارج طے کرنے کے لئے مختلف مذاہب کے ہاں مختلف طریقے ملتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ طریق کار کوئی بھی اختیار کیا جائے ،اصل چیز یہ ہے کہ انسان کی جستجو اور لگن سچی ہو۔اگر جستجو اور لگن واقعی سچی ہو تو خدا خود متلاشی کے ظرف کے مطابق اس تک پہنچ جاتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔جب کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کا رستہ صرف اسی کے پاس ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنی سوجھ بوجھ کے خدا کو اپنی جیب میں ڈال رکھا ہے یا کسی تجوری میں بند کر رکھا ہے اور یوں

وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ صرف وہی ہے۔خدا کا عرفان کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔وہ لامحدود ہے اور ہم لوگ اس کی پوری معرفت حاصل کر ہی نہیں سکتے۔جس خدا کا عرفان مکمل طور پر حاصل ہو جائے وہ خدا لامحدود نہیں رہتا۔میری دانست میں تنہائی،یکسوئی وارتکاز کے نتیجہ میں روح بہتر طور پر اپنی اصل منزل کی طرف سفر کر سکتی ہے،اسی لئے بیشتر بڑی روحانی شخصیات نے عمر کے ایک حصہ میں اپنے معاشرے سے الگ ہو کر تنہائی میں اس سفر کو طے کرنے کی کاوش کی۔اسے آپ چلہ کشی کہہ لیں،ریاضت کہہ لیں،تپسّیا کہہ لیں اور چاہے کوئی اور ملتا جلتا نام دے لیں۔یہ میرے ذاتی خیالات ہیں،ان کا مقصد کسی کی دلآزاری کرنا نہیں ہے۔ہو سکتا ہے میرے کچے پکے روحانی تجربوں کے نتیجہ میں ایسے خیالات ذہن میں آتے ہوں اور جو لوگ مجھ سے بدرجہا بہتر روحانی تجربات سے گزر چکے ہیں،وہ اس معاملہ میں زیادہ اچھے اور درست خیالات رکھتے ہوں۔

معاشرتی سطح پر رہتے ہوئے انسان کو نہ تو مناسب تنہائی میسر ہوتی ہے اور نہ ہی ذہنی یکسوئی۔۔۔ایسے ماحول میں انفرادی ریاضت ومجاہدہ کی بجائے مذاہب کی عبادات کے طریق احسن طور پر خدا کی طرف رہنمائی کرنے میں ممد ہوتے ہیں۔یوں روحانیت کے سفر میں مذہب کی بڑی اہمیت ہے۔تاہم خدا کی جستجو کے روحانی تجربات کا سلسلہ کسی ایک مذہب تک محدود نہیں ہے۔یہ ہر طالب اور متلاشی کی طلب اور تلاش پر منحصر ہوتا ہے۔یہاں ایک وضاحت کر دوں۔میرے نزدیک کوئی کسی بھی مذہب سے تعلق رکھے،اپنے طریق عبادت کے مطابق خدائے واحد کی عبادت ضرور کرے۔البتہ اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے یہ بتانا چاہوں گا کہ میں جن دنوں میں اسلام سے کچھ دور ہوا تھا ان دنوں میں بھی میری عادت رہی کہ روزے اسلامی طریق کے مطابق رکھتا تھا اور نمازیں بھی اسلامی طریق والی پڑھتا تھا۔اسے بچپن کی عادت کہہ لیں،ماں باپ کی تربیت کا گہرا اثر کہہ لیں یا کچھ اور کہہ لیں۔ایک عرصہ کے بعد کسی حدیث میں یا کسی بزرگ کے فرمان میں پڑھا کہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں،تباہی کے دہانے پر بھی پہنچ جائیں تو خدا انہیں بچا لیتا ہے۔ہو سکتا ہے میری نمازیں ہی مجھے بچا لائی ہوں۔(پتہ نہیں میں بچا بھی ہوں یا نہیں؟)۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب سلیم آغا کی شادی تھی۔بہت سارے ادیب ڈاکٹر وزیر آغا کے گاؤں وزیر کوٹ میں جمع تھے۔رات کو خانپور اور راولپنڈی،اسلام آباد کے ادیبوں کی چارپائیاں ایک ساتھ حویلی کے صحن میں بچھائی گئی تھیں۔اگلے روز کافی دن چڑھے،جب سارے دوست جاگ گئے تو وزیر آغا ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے: میں اپنے معمول کے مطابق فجر کے وقت جاگا اور باہر آیا تو

عجیب منظر دیکھا۔

سارے دوست وزیر آغا صاحب سے کوئی حیران کن بات سننے کے منتظر ہوئے تو انہوں نے کہا: جب میں باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ سارے مسلمان سوئے ہوئے تھے اور ایک غیر مسلم بڑے خشوع وخضوع سے فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔

میں بہت ہی کھلے ذہن اور دل کا شاعر اور ادیب ہوں۔نماز ،روزہ میرے مزاج کا حصہ ہیں ۔یقیناً والدین کی تربیت کے سبب ہی ایسا ہوا ہے،وگرنہ نمازی ہونے کا ایسا ذکر کرنا اپنے کسی تقویٰ کے اظہار کے لئے نہیں ہے۔کسی انکساری کے بغیر اور پوری ایمانداری سے لکھ رہا ہوں کہ میں قطعاً کوئی متقی نہیں ہوں، بہت ہی گنہگار بندہ ہوں۔اپنے گناہوں کے سبب خدا سے کئی بار مار بھی کھائی ہے۔سو ان عباداتی معاملات کو بچپن کی عادت سمجھیں اور کچھ نہیں۔اپنی اس عادت کی وجہ سے اپنے گھر میں میری اپنے کسی بچے کے ساتھ تلخی ہوتی ہے تو عام طور پر وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ بچہ نمازوں میں سست ہو رہا ہوتا ہے۔

روحانیت کی بات تو ہو گئی لیکن خود روح کیا ہے؟اس بارے میں دو تصورات پائے جاتے ہیں۔ایک تصور یا عقیدہ کے مطابق حمل ٹھہر جانے کے کچھ عرصہ کے بعد آسمانِ ارواح سے رُوح بچہ میں داخل ہوتی ہے۔جبکہ دوسرے تصور یا عقیدہ کے مطابق رُوح ایک لطیف نُور ہے، یہ نور نطفہ کے اندر ہی موجود ہوتا ہے اور نطفہ کی نشو ونما کے ساتھ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔''اسلامی اصول کی فلاسفی''میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے اور میرا یہی عقیدہ ہے کہ جسم اور روح لازم وملزوم ہیں۔علامہ اقبال بھی فلسفیانہ سطح پر اسی تصور کے قائل تھے۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں وہ روح اور مادہ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے اور انسان کو ایک ایسی وحدت قرار دیتے ہیں جس کے اعمال وافعال کا مشاہدہ عالم خارجی کے حوالے سے کیا جائے تو اسے بدن کہیں گے اور جب ان کی حقیقی غرض وغایت اور نصب العین پر نظر رکھی جائے تو اسے روح کہیں گے۔عقیدہ اور فلسفہ سے ہٹ کر سائنس میں کلوننگ کے تجربہ سے اس عقیدہ اور تصوّر کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔روح ہمارے ہر سیل میں سرایت کئے ہوئے ہے۔اس کا مطلب ہے پانی کی طرح روح کے نور کو بھی توڑا نہیں جا سکتا۔جتنا اسے توڑا جائے گا ہر قطرہ کی طرح روح کے نور کا ہر قطرہ بھی اپنی اصل کی پوری بنیاد کے ساتھ اپنی جگہ موجزن رہے گا۔اب کلوننگ سے جس بات کی تصدیق ہو رہی ہے، ہمارے صوفیائے کرام تو ایک عرصہ سے صوفیانہ سطح پر اسی بات کو قطرہ میں دجلہ اور دجلہ میں قطرہ دیکھنے کی صورت بیان کر چکے ہیں۔یوں میرے نزدیک جسم اور روح دونوں لازم وملزوم ہیں،موت

کے بعد بھی یہ تعلق کسی نہ کسی سطح پر قائم رہتا ہے اور قیامت کے دن ہمیں ہمارے جسم دوبارہ دے دیئے جائیں گے۔اور انہیں جسموں کو ہی جزا،سزا سے گزرنا ہوگا،ظاہر ہے یہ جسم اپنی اپنی روح سمیت ہوں گے۔کلوننگ کے تجربے کا گہرا جائزہ لیا جائے تو قیامت کے دن انہیں جسموں کے ساتھ دوبارہ زندہ کئے جانے کا عقیدہ،عقلی لحاظ سے بھی مزید واضح اور روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔

ان دنوں میں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری مختلف اصنافِ ادب میں تخلیق کاری کا عمل ایک دوسری اصناف میں کچھ کچھ مدغم ہونے لگا ہے۔مثلاً یادوں کی گزشتہ اور موجودہ قسط میں یادوں کے ساتھ افکار وخیالات کی زیادہ یلغار ہو رہی ہے،یوں یادیں مضمون جیسی صورت اختیار کر رہی ہیں۔اسی طرح میرے آخری تین افسانوں (مسکراہٹ کا عکس،کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار اور اپنے وقت سے تھوڑا پہلے) میں یادوں کے گہرے اثرات کہانی کا رُوپ اختیار کر گئے ہیں۔اگرچہ ایسے اثرات میری دوسری کہانیوں اور دیگر تخلیقات میں بھی ہیں لیکن اتنے گہرے نہیں جتنے مذکورہ تین افسانوں میں در آئے ہیں۔ اب تو مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ شاید ان یادوں کی یلغار کسی ناول کا روپ اختیار کرنا چاہ رہی ہے۔ایسا ہو جائے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ناول اور افسانہ فکشن میں شامل ہیں اور فکشن کو تو لغوی معنوں میں ویسے بھی جھوٹ شمار کیا جاتا ہے۔اوپر سے میں نے اپنی پچھلی قسط میں روزمرہ زندگی میں بے ضرر سے جھوٹ بولنے کا اقرار کیا تو ایک دوست کہنے لگے آپ نے تو خود مان لیا کہ آپ جھوٹ بھی بولتے ہیں۔مجھ پر طنز کرنے والے دوست فرینکفرٹ میں ٹیکسی چلاتے ہیں اور یہ ایک کھلا راز ہے کہ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور احباب قانونی طور پر دو یا چار گھنٹے کی ملازمت کے پیپرز پُر کراتے ہیں اور بارہ بارہ گھنٹے کام کر کے بلیک منی کماتے ہیں، پھر دو، چار گھنٹے کی ملازمت کے جتنی آمد ظاہر کرتے ہیں،اس کے نتیجہ میں حکومت کے فلاحی قوانین کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت سے مالی امداد بھی وصول کرتے ہیں۔اس سارے ''ایماندارانہ عمل'' کو مکمل کرنے کے لئے دستاویزی طور پر کتنے ہی ''سچ'' لکھ کر یہ سب کچھ کمایا جاتا ہے۔۔۔اب ایسے دوست خود کو سچا سمجھ کر مجھ پر طنز فرما رہے تھے تو ان کے حصے کی شرمندگی بھی مجھے ہی محسوس کرنا پڑی۔ان کے سچ کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی کیا یہ بذاتِ خود میرا سچ نہیں ہے کہ میں مان رہا ہوں کہ ہم دن میں کئی بار غیر ارادی طور پر اور کسی کو نقصان پہنچائے بغیر بے ضرر سے جھوٹ بول جاتے ہیں؟ کوئی لاکھوں،کروڑوں جھوٹ بولنے والا اگر اپنے جھوٹ کا اعتراف نہ کرے تو کیا وہ محض اس لئے سچا کہلائے گا کہ اس نے اپنے کروڑوں جھوٹ بولنے کا اقرار نہیں

کیا؟ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے فقیہوں اور فریسیوں کو مخاطب کر کے کیا خوب کہا تھا کہ:
''تم مچھروں کو تو چھانتے ہو مگر اونٹوں کو نگل جاتے ہو''

ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم انسان کو انسان کی سطح پر دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ اگر کوئی ہمارا ہیرو ہے تو وہ ہر عیب سے پاک ہے، اس میں کوئی انسانی عیب ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کوئی ہمارے لئے کسی زاویے سے ولن ہے تو اس بد بخت میں کوئی خوبی ہو ہی نہیں سکتی۔ خدا اسے جہنم میں بھیجے نہ بھیجے، ہم خود اس کی زندگی کو ضرور جہنم بنا کر رکھ دیں گے۔ حالانکہ ہم سب انسان اچھائی اور برائی، نیکی اور خیر کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ کسی میں شر کے مقابلہ میں خیر کا پلڑا بھاری ہو تو اتنا ہی کافی ہے۔ لیکن مذہبی انتہا پسند اتنی سی بات سمجھ لیں تو پھر ان کا کام کیسے چلے۔

میں نے اپنے خاکوں اور یادوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ سب سچ ہے۔ بیتا ہوا سچ، دیکھا ہوا سچ یا سنا ہوا سچ اور وہ انکشافی سچ جو کسی تخلیق کار کو نصیب سے ملتا ہے۔ اب جو ناول لکھنے کا ارادہ ہے اگر لکھا گیا تو اس میں بھی سارا سچ ہی لکھوں گا۔ کہیں مشکل پیش آئی تو زندگی کے بعض حصے نہیں لکھوں گا لیکن جھوٹ نہیں لکھوں گا۔ خدا کرے مجھے اب ناول لکھنے کی توفیق مل جائے کیونکہ میں نے کم از کم ایک پورے ناول کی زندگی بسر کر لی ہے۔

پاکستان میں مجھے ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف رہتی تھی۔ جرمنی میں آنے کے بعد سے یہ بیماری ایسی غائب ہوئی ہے کہ جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ یہاں زندگی میں بعض انتہائی تکلیف دہ اور بہت زیادہ دکھی کرنے والے سانحات بھی پیش آئے لیکن ہر مرحلہ پر ذہنی و روحانی دکھ کے باوجود میرا بلڈ پریشر بالکل نارمل رہا۔ ایک دو مواقع پر شوگر کی مقدار بڑھ گئی تو ڈاکٹر نے فکر مند ہو کر میرا بلڈ پریشر بھی چیک کرنا شروع کیا۔ میں نے مسکرا کر ڈاکٹر کو بتایا کہ فشارِ خون کو تو آپ بالکل متوازن پائیں گے۔ میری بات درست نکلی تو ڈاکٹر حیرت سے مسکرا دیا۔ تب میں نے اس سے کہا کہ مجھے لگتا ہے جب فوت ہو جاؤں گا تب بھی میرا فشارِ خون دیکھا گیا تو اسی طرح نارمل رزلٹ آئے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک بار امین خیال جی سے یاہو کے میسنجر پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں بلڈ پریشر والی ساری بات بتائی تو وہ کہنے لگے بھائی یہ تو نفسِ مطمئنہ کا مقام ہے۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ بہت سارے ''یقین'' کے باوجود میں گنہگار تو ابھی تک ''تذبذب'' کے مراحل سے گزر رہا ہوں۔ مجھے نفسِ مطمئنہ کی دولت کہاں نصیب ہوئی ہے۔ نصیب ہو جائے تو میری زندگی کا مقصد ہی پورا ہو جائے۔ بہر حال بلڈ پریشر کے نارمل رہنے کو خدا کا خود پر بڑا فضل

اور احسان سمجھتا ہوں۔ اس نے دوسری بیماریوں اور موسمی علالتوں سے بھی کافی حد تک محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اور میں شاعر کے الفاظ میں ''تندرستی ہزار نعمت ہے'' کا مزہ لیتا رہتا ہوں۔

مجھ پر آنے والے تکلیف دہ دنوں میں سے ایک وہ عرصہ تھا جب بے وزن شعری مجموعے رکھنے والوں اور جعلی شاعروں اور ادیبوں نے مل کر میرے خلاف غلیظ مہم شروع کی تھی۔ اس تمام عرصہ میں بھی میرا بلڈ پریشر بالکل نارمل رہا۔ میرے خلاف مہم چلانے والے اس لائق نہیں کہ میں ان کے ناموں سے اپنی یادوں کے اس سلسلہ کو آلودہ کروں۔ ان کا ذکر کسی اور جگہ پر ہی کافی رہے گا لیکن دو شخصیات اس غلیظ کھیل میں ایسی بھی شریک ہوئیں، جن کا صدمہ مجھے آج بھی ہے۔ یہ شخصیات تھیں (تب) سویڈن میں مقیم ڈاکٹر پرویز پروازی اور ہالینڈ میں مقیم جمیل الرحمٰن۔ دونوں صاحبان نے میرے جرمنی پہنچنے کے بعد مجھے خود ڈھونڈا اور خود مجھ سے رابطہ کیا۔ پرویز پروازی کا میرے بزرگوں سے بھی تعلق رہا تھا اس لئے ان کے معاملہ میں دوستی کے ساتھ احترام کا تعلق بھی تھا۔ انہوں نے اس احترام کا کچھ فائدہ اٹھانا چاہا۔ میرے ایک شعر پر اعتراض فرما دیا ۔

متن میں آپ کا ہی ذکر چلا آتا ہے
اچھا ہے بچ کے رہیں حاشیہ آرائی سے

ان کا کہنا تھا کہ متن کی ت پر زبر ہے جبکہ میں نے ت کو ساکن باندھا ہے۔ میں ان کا اعتراض والا خط پڑھ کر ہی ساکت ہو گیا۔ تو آپ ساری زندگی پاکستان سے جاپان تک ت کی زبر کے ساتھ متن پڑھاتے رہے ہیں؟۔ میں نے ادب کے ساتھ وضاحت کی تو انہیں احساس ہو گیا کہ وہ غلط تھے، چنانچہ انہوں نے معذرت کر لی لیکن دل سے شاید مجھے معاف نہیں کیا۔ چنانچہ پھر انہوں نے ماہیے کی بحث میں غیر ضروری دخل اندازی فرما دی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ کسی مضمون میں یہ سب لکھیں تا کہ بحث آگے چلے۔ لیکن انہوں نے مضمون نہیں لکھا۔ میرا ذاتی قیاس ہے کہ انہوں نے جاپانی ہائیکو کے حوالے سے جو کام کیا تھا اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس تب ماہیے کی بحث کوئی بڑے ادبی رسائل اہمیت دے رہے تھے۔ اور جہاں بھی ماہیے کی بحث چلتی تھی میرا حوالہ آ جاتا تھا۔ اسی دوران جنگ لندن کے ادبی صفحہ پر ہائیکو کے حوالے سے ایک مضمون چھپا جس میں پروازی صاحب کے کام کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ان کا ذکر تک نہ کیا گیا۔ پروازی صاحب کا اس پر غصہ کرنا یا دُکھی ہونا بجا تھا لیکن اس میں ماہیا کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بہر حال تب انہوں نے اپنے ہاتھ سے اپنی حمایت میں ایک جوابی مضمون لکھ کر

مجھے بھیج دیا کہ میں اسے اپنی طرف سے جنگ لندن میں چھپوالوں۔اس باران کی اس ''بے پایاں محبت'' پر میں صرف ساکت نہیں ہوا، مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا۔جی کڑا کر کے ان کے جرمنی میں مقیم ایک شاگرد کو وہ مضمون دے دیا کہ بھائی! چاہو تو استاد کی استادی کا بھرم رکھ لو۔لیکن ان کے اس شاگرد نے بھی پروازی صاحب کا دفاع کرنے والا مضمون استعمال کرنے سے معذرت کر لی اور وہ مضمون مجھے واپس کر دیا۔اسی دوران پرویز پروازی صاحب نے مجھے حمید نسیم کی خودنوشت میں شامل ایک اقتباس بھیجا جس سے زمانی طور پر چراغ حسن حسرت کو اردو ماہیے کا بانی قرار دلوایا جا سکتا تھا۔یہ تحقیقی اور علمی معاملہ تھا۔اس لئے میں نے بالکل ایسا باور نہیں کیا کہ پروازی صاحب یہ اقتباس مجھے کسی دباؤ میں لانے کے لئے بھیج رہے ہیں۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اس موضوع پر مزید تحقیق کرنے کا موقعہ مل گیا۔اس تحقیق کے نتائج حمید نسیم کے حوالے کے ساتھ میری کتاب ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' کے پیش لفظ میں اور میرے بعد کے ایک مضمون ''مرزا (حامد بیگ) صاحب کے جواب میں'' پوری تفصیل سے موجود ہیں۔(اور ابھی تک تحقیقی حوالے سے حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں، تاوقتیکہ کوئی نئی تحقیق انہیں رد نہ کرے) بس میری ان حرکتوں کے بعد پروازی صاحب مجھ سے ایسے خفا ہوئے کہ ان گھٹیا لوگوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف نہایت غلیظ مہم کے روحِ رواں بن گئے۔ان کی شخصیت کا یہ رُخ اخلاقی طور پر اتنا افسوسناک تھا کہ میں ابھی تک ان کے حوالے سے اس صدمے سے باہر نہیں آسکا۔جسے تہذیب اور اخلاق کا آسمان سمجھا تھا وہ کیا نکلا۔ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

جمیل الرحمٰن نے جب میرا اتہ پتہ ڈھونڈ کر مجھ سے رابطہ کیا تب انہوں نے ادبی حوالے سے مجھے تعریف کی حد تک جو کچھ کہا،اسے درج کرنا مناسب نہیں ہے۔لیکن جب وہ پرویز پروازی کے کہنے پر میرے خلاف غلیظ مہم کے سپاہی بنے تو مجھے دلی صدمہ ہوا۔وہ جس طرح کی حرکتیں ہالینڈ سے لے کر ہندوستان اور پاکستان تک کر آئے تھے، مجھے ساتھ کے ساتھ ان کی رپورٹ مل رہی تھی۔اس مہم کے بعد کئی بار جمیل الرحمٰن کے فون آتے رہے۔میں نے انہیں ان کی کسی زیادتی کا احساس تک نہیں دلایا لیکن ان کے ساتھ کبھی گرمجوشی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔انسان کتنا ہی زیادتی کر لے اگر اس کی فطرت میں تھوڑی بہت نیکی کی رمق ہو تو ضمیر کچوکے ضرور لگاتا ہے۔چنانچہ ایک بار جمیل نے خود ہی کھل کر معذرت کی اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا صرف استاد،شاگرد کے رشتے کی وجہ سے کیا۔میں نے تب بھی خاموشی اختیار کئے رکھی۔وقفے وقفے سے آٹھ دس بار ٹیلی فون کرنے کے

بعد ایک بار انہوں نے گلہ کیا کہ وہ اتنی بار مجھے فون کر چکے ہیں جبکہ میں انہیں فون نہیں کر رہا۔میں نے تب بھی بات کو ٹال دیا۔اس سے اگلی بار جب جمیل الرحمٰن کا فون آیا تو مجھ پر برہمی کا اظہار کرنے لگے کہ میں ہر بار فون کرتا ہوں۔آپ فون نہیں کرتے۔تب میں نے اتنا جواب دے دیا کہ میں نے کب آپ سے کہا ہے کہ آپ مجھے فون کیا کریں؟

اس دن کے بعد سے ان کا کوئی فون نہیں آیا یعنی ۔ وہ بھی ہیں آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے ☆

میں اپنے ایک ہم نام کے حوالے سے ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔خانپور میں ہی میں نے شاہکار والوں کی چھاپی ہوئی ایک پاکٹ سائز کتاب دیکھی تھی ''ستاروں کا سجدہ''۔اس ناول کو لکھنے والے تھے حیدر قریشی صاحب۔اس نام کے ساتھ ''صاحب'' اس لئے لکھا ہے کہ مذکورہ ناول نگار میں نہیں تھا کوئی اور صاحب تھے۔کون تھے؟ میری بد قسمتی کہ مجھے آج تک ان کے بارے میں علم نہیں ہو سکا۔اب حال ہی میں کراچی سے ایک دوست نعیم الرحمٰن صاحب نے توجہ دلائی تو میں نے انہیں لکھا کہ ان حیدر قریشی صاحب کا کچھ اتہ پتہ کریں۔دیکھیں شاید ان کی بابت کچھ معلوم ہو جائے۔ویسے ایک بات طے ہے کہ وہ جو بزرگ بھی ہیں یا تھے،گزشتہ ربع صدی سے زائد عرصہ سے ادب کی دنیا میں،ادبی رسائل میں کہیں دکھائی نہیں دیئے۔

جرمنی میں بہت ہی معمولی سی مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلا رہا ہوں۔ایک بار ایک دوست مجھے میری جاب پر ہی ملنے کے لئے آئے۔بعد میں گھر پر ملے تو کہنے لگے،اس دن آپ کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا کہ اردو کا اتنا اچھا شاعر اور ادیب اور اتنی معمولی سی ملازمت کر رہا ہے۔میں نے فوراً انہیں کہا کہ بھائی! شاعر اور ادیب تو میں ویسے بھی معمولی سا ہوں لیکن آپ اس ساری صورتحال کو یوں دیکھیں تو آپ کو خوشی ہو گی کہ اتنا معمولی سا مزدور ہے اور خدا نے ایسی صلاحیتیں عطا کر رکھی ہیں کہ چکی کی مشقت کے باوجود اتنا ادبی کام کر رہا ہے۔

جرمنی میں نیشنلٹی لینے کے لئے پہلے اتنی شرائط تھیں کہ بندے کو جرمنی میں رہتے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے ہوں،اپنے ذرائع آمدن ہوں یعنی حکومت سے اسے کوئی امداد نہ ملتی ہو اور جرمن زبان مناسب حد تک آتی ہو۔امریکہ کے ٹریڈ ٹاورز پر حملوں یعنی نائن الیون کے بعد سے پورے یورپ میں بھی رویوں میں قدرے سختی آگئی ہے۔میرے سارے بچوں کو جرمن نیشنلٹی مل چکی تھی۔میرا اور میری اہلیہ کا معاملہ یوں ہے کہ ہمیں جرمن زبان بالکل نہیں آتی۔میری ملازمت کی آمدنی اتنی کم ہے کہ حکومت کو اپنے

فلاحی قوانین کے مطابق مجھے ہر مہینے میری ضرورت کی بقیہ رقم دینا ہوتی ہے۔گویا ہمیں زبان بھی نہیں آتی تھی اور ہماری آمدنی بھی اپنے لئے پوری نہ تھی۔اس لئے ہم دونوں شرائط پر پورے نہیں اترتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ہم نے نیشنلٹی کے حصول والے اپنے فارم پُر کروا کر پانچ سال تک اپنے پاس ہی رکھ چھوڑے تھے ۔چونکہ اپنی لیگل پوزیشن کا اندازہ تھا اس لئے اپلائی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔آخر پانچ سال کے بعد میں نے کچھ ہمت کی اور مبارکہ سے کہا کہ اپلائی تو کر دیتے ہیں۔زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ درخواست مسترد ہو جائے گی۔خیر ہے،ایک تجربہ تو ہو جائے گا۔سو، جی کڑا کر کے ہم نے درخواست جمع کرا دی۔روٹین کے مطابق ہمیں جرمن زبان کے ٹیسٹ کے لئے بلاوا آ گیا۔جس دن ٹیسٹ تھا اس دن میں نے علی الصبح انٹرنیٹ پر یاہو کے قسمت کے حال والے حصہ کو دیکھا تو وہاں کچھ اس مفہوم میں واضح احوال لکھا ہوا تھا کہ آپ آج جس خاص کام کے لئے جا رہے ہیں،اس میں کامیابی نہیں ہوگی لیکن ہمت نہ ہاریں اور کوشش جاری رکھیں۔یہ پڑھ کر میں دل میں ہی ہمت ہار بیٹھا۔مبارکہ بیدار ہوئی تو اس نے ایک انوکھا سا خواب سنایا۔اس کی کوئی جاننے والی باجی کوثر ہیں،انہوں نے ہم دونوں کو اپنے گھر پر دعوت دی ہوئی ہے اور ہم باجی کوثر کی دعوت کھا رہے ہیں۔اس خواب سے کچھ امید بندھتی نظر آئی تو میں نے گومگو کی حالت میں مبارکہ کو اپنا آزمودہ ایک ٹوٹکا بھی بتا دیا۔جب زبان کا ٹیسٹ لینے والی کے کمرے میں جانے لگیں تو اپنی انگلی سے اپنی پیشانی پر **یا عزیز!** لکھ لیں۔افسر کا رعب دل پر نہیں رہے گا اور افسر کے دل میں آپ کے لئے نرمی پیدا ہو جائے گی۔

پہلے مجھے ٹیسٹ کے لئے بلایا گیا،ایک اخباری تراشہ کی ریڈنگ کرائی گئی پھر اُس پر گفتگو کی گئی۔مجھے آج تک علم نہیں ہے کہ میں نے کیا پڑھا تھا اور کیا ڈسکس کی تھی۔لیکن مجھے بتایا گیا کہ میں امتحان میں پاس ہو گیا ہوں۔میرے بعد مبارکہ گئی اور وہ بھی اسی طرح پاس قرار دے دی گئی۔میری جرمن زبان اتنی خراب ہے آج بھی کسی ٹیسٹ میں بٹھایا جائے تو فیل ہو جاؤں گا لیکن اللہ کا کرم تھا کہ ہم دونوں کو زبان کے ٹیسٹ میں بھی پاس قرار دے دیا گیا اور آمدن پوری نہ ہونے کی خامی کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔وہ دن اور آج کا دن میں نے اخبارات ورسائل میں اور انٹرنیٹ پر قسمت کے احوال بتانے والے حصے دیکھنا ترک کر دیئے ہیں۔البتہ جس خاتون نے ہمارا جرمن زبان کا ٹیسٹ لے کر ہمیں پاس قرار دے دیا تھا اس کے لئے کبھی کبھار دعا ضرور کر لیتا ہوں اللہ اسے خوش رکھے!ہمیں نیشنلٹی ملنے کے معاً بعد سے اب یہاں اس کے حصول کا طریق کار پہلے سے بھی بہت زیادہ مشکل کر دیا گیا ہے۔

ہماری جرمن زبان کا حال تو بس ایسا ہی ہے البتہ اگلی نسلوں کے لئے زبان کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔بچے سکول جاتے ہیں اور وہاں سے انہیں جرمن زبان سیکھنے کے لئے کسی خصوصی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔سب کچھ از خود ہوتا جاتا ہے۔البتہ عربی یا اردو سکھانے کے لئے ان کی ماؤں کو محنت کرنا پڑتی ہے۔اس کے نتیجہ میں کئی مزے کے لطیفے سامنے آتے رہتے ہیں۔جرمن زبان میں بلی کو Katze کہتے ہیں۔یہ انگریزی میں CAT سے ملتا جلتا نام ہے۔میرے دوسرے پوتے جہاں زیب کی عمر ابھی چار سال ہے۔اسے عربی قاعدہ کے ساتھ اردو قاعدہ بھی پڑھانا شروع کیا گیا ہے۔الف انار پڑھنے کے بعد جہاں زیب نے قاعدہ کی تصویر پر نظر گاڑی ہوئی تھی اور ب: بلی کی بجائے بڑے مزے سے پڑھ رہا تھا ب: کاٹزے(Katze)۔

معمولاتِ زندگی میں احتیاط اچھی چیز ہے لیکن بہت زیادہ احتیاط سے بھی خرابی ہو جاتی ہے۔اپنے گھر کی دو مثالیں یاد آ گئیں۔ پاکستان میں کھانا کھاتے ہوئے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سالن میرے کپڑوں پر گر جاتا تھا۔یہ عادت یہاں بھی قائم ہے۔جتنی زیادہ احتیاط کروں کہ سالن نہ گرے اتنا ہی زیادہ ایسا ہو جاتا ہے۔یوں بیوی کی کڑوی کسیلی سننا پڑتی ہیں۔میری چھوٹی بہن زبیدہ خانپور کے زمانہ میں جب گھر کے برتن دھو رہی ہوتی تو آواز سے پتہ چلتا کہ کوئی گلاس ٹوٹ گیا یا پلیٹ ٹوٹ گئی ہے۔نقصان پر امی جی تھوڑا سا بولتیں تو ابا جی ہنستے ہوئے کہتے کہ بیٹا ایک اور گلاس بھی توڑ دو۔اور اسی وقت دوسرا گلاس ٹوٹنے کی آواز آ جاتی۔ایک بار اسی طرح جب دوسرا گلاس ٹوٹنے کی بھی آواز آئی تو امی جی ذرا غصے کے ساتھ بولیں۔ابا جی نے وہیں سے آواز دی بیٹا! جگ بھی توڑ دو۔بیچاری زبیدہ کی تمام تر احتیاط کے باوجود دھلا، دھلایا جگ اٹھاتے وقت جگ بھی ٹوٹ گیا۔زبیدہ نے اس ناگہانی نقصان پر رونا شروع کر دیا۔اب ایک طرف امی جی کی خفگی بھری آواز ہے دوسری طرف زبیدہ کے رونے کی آواز اور تیسری طرف زبیدہ کو شاباش دیتے ہوئے ابا جی کے ہنسنے کی آواز۔۔۔ابا جی کے ہنسنے کا وہی انداز جس میں ہنستے ہنستے ان کی آنکھ سے پانی بہنے لگتا تھا۔ایک بار امریکہ میں زبیدہ کے ساتھ ٹیلی فون پر ان یادوں کی باتیں ہو رہی تھیں اور ہم دونوں ان پر ہنس رہے تھے۔ہمارے ہنستے ہنستے ابا جی کی آنکھوں کا پانی ہماری آنکھوں میں آ گیا اور ہم دونوں ہی ہنستے ہنستے اپنی بھیگی پلکیں صاف کر رہے تھے۔کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی سی بے معنی یادیں بھی ہماری زندگی میں کتنی بامعنی بن جاتی ہیں۔

مغربی ممالک میں عمومی طور پر اور یہاں جرمنی میں خاص طور پر بجلی اور پانی کی فراہمی میں کسی

تعطل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ٹیلی فون سروس اب تو ہر جگہ بہت بہتر ہوتی جا رہی ہے لیکن جب دوسرے ملکوں میں اچھی سروس نہ تھی یہاں تب بھی عمدہ سروس ہوا کرتی تھی۔ نکاسیِ آب کا معاملہ ہو یا سردیوں میں گھروں کا ہیٹنگ سسٹم، یہ سہولیات یہاں زندگی کا حصہ شمار ہوتی ہیں۔ کوئی انتہائی دور دراز کا گاؤں ہو وہاں بھی سڑکیں جاتی ہیں، بجلی، پانی، نکاسیِ آب، ہیٹنگ سسٹم، اور ٹیلی فون کی سہولیات میسر ہیں۔ کسی پائپ لائن کی کوئی مرمت کرنا ہوئی یا انسپکشن کرنا ہوئی تو کئی دن پہلے نوٹس لگا دیا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے سے اتنے بجے تک پانی بند رہے گا۔ اپنی ضرورت کا پانی جمع کر رکھیں۔ سڑکوں کی مرمت کا کام بھی ساتھ کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ لیکن جہاں ایسا کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہیں متبادل رستوں کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ یہاں فرینکفرٹ شہر کے اندر ٹریفک اور عوام کے ہجوم میں بھی دیکھا کہ کسی بلڈنگ کی تعمیر ہو رہی ہے یا کسی عمارت کی مرمت ہو رہی ہے، مجال ہے کوئی کوڑا کرکٹ اِدھر اُدھر بکھر جائے۔ تعمیراتی اداروں کا ایسا مربوط نظام ہے کہ نہ تو کوئی رستہ بلاک ہوگا اور نہ ہی گرد و غبار پیدا ہوگا۔

ایک بار اس وقت مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب فرینکفرٹ کے بڑے ریلوے اسٹیشن سے لے کر Hauptwache تک انڈر گراؤنڈ ٹریکس کی مرمت کا کام ہونا تھا۔ لگ بھگ ۲۰ دن تک یہ مرمت ہونا تھی اور اس عرصہ میں اُس رُوٹ کو بند رہنا تھا۔ مجھے پہلے دن تشویش ہوئی کہ جاب پر جانے کے سارے اوقات درہم برہم ہو جائیں گے۔ میں نے مین اسٹیشن پر پہنچ کر انفارمیشن والوں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی منزل کا پتہ بتا کر متبادل رُوٹ پوچھا تو انہوں نے ایک منٹ میں متبادل رُوٹ کی پرچی نکال کر میرے حوالے کر دی۔ پہلے دن میں اپنے معمول سے صرف دس منٹ لیٹ ہوا، اور بعد میں صرف پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچ جاتا تھا۔ پاکستان میں کسی ریلوے ٹریک کی مرمت یا کسی سڑک کی مرمت کی صورت میں جو حال ہوتا ہے اس کے بارے میں کیا کہوں۔ سارے اہلِ وطن بخوبی جانتے ہیں بلکہ ایسی صورتحال کو بھگتتے رہتے ہیں۔ ریلوے کے سلسلے میں تو کچھ عرصہ پہلے ''رن پٹھانی پُل'' کے بارے میں ہی جتنی خبریں آتی رہیں، انہیں پڑھ کر اپنے ہاں کے انتظامات پر شرمندگی ہوتی رہی۔ یہاں جرمنی میں ریلوے کے مذکورہ بہترین متبادل انتظام کے ساتھ کمال یہ تھا کہ نہ صرف ہزاروں مسافروں کے معمولات میں خلل نہیں پڑا بلکہ اس دوران کسی قسم کا گرد و غبار پبلک تک نہیں پہنچا۔ سچی بات ہے میں تو اپنی پاکستانی یادوں کی وجہ سے گرد و غبار دیکھنے کو ہی ترستا رہا۔

پاکستان میں ہمیں یہ حدیث شریف تو پڑھائی جاتی تھی کہ صفائی ایمان کا حصہ ہے۔ لیکن

جہاں تہاں گندگی کے ڈھیر اب بھی ویسے ہی موجود ہیں۔ ادھر جرمنی میں ایسی کوئی حدیث یا آیت نہیں پڑھائی جاتی لیکن صفائی کا حال سب کے سامنے ہے۔ ہم لوگوں کی خرابی یہ ہوئی ہے کہ ہم گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح چند باتوں اور نصیحتوں کو تو دہراتے رہتے ہیں لیکن ہمارا عمل کا خانہ یکسر خالی ہے۔ قرآن شریف میں سب سے زیادہ دنیا اور کائنات کے اسرار و رموز پر غور و فکر کی تلقین کی گئی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا جدید سائنسی انکشافات اور ایجادات میں کتنا حصہ ہے؟ اس سوال کے جواب سے پتہ چل سکتا ہے کہ مسلمان آج کل قرآن کی اس سب سے زیادہ تلقین پر کتنا عمل کر رہے ہیں؟۔ ان کے برعکس اہلِ مغرب نے فلسفہ اور دوسرے علوم میں جتنی پیش قدمی کی، سائنسی ترقی کی، جتنی ایجادات کیں، جونئی ٹیکنالوجی اختیار کی وہ سب دنیا اور کائنات کے اسرار و رموز پر غور کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔ ہم نے تو سوچ بچار اور آزادانہ غور و فکر کو شجرِ ممنوعہ بنا رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔ اہلِ مغرب نے آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو عالمی غلبہ حاصل کر رکھا ہے، یہ سب ان کی آزادانہ سوچ، غور و فکر اور تدبر کا ثمر ہے۔ وہی آزادانہ سوچ، غور و فکر اور تدبر جس کی قرآن نے بار بار تلقین کی اور ہمارے علماء اور رہنماؤں نے لوگوں کو اسی عمل سے دور رکھا۔

یہاں ایک وضاحت بھی کر دوں ہمارے مصلحین اور مفکرین جب مغربی معاشرے کے مقابلہ میں اپنے مشرقی معاشرہ کے فضائل بیان کرتے ہیں تو اس میں مغرب کی ''بے راہروی'' کو بطورِ خاص نشانہ بناتے ہیں۔ میں نے اس معاملہ کو ایک اور زاویے سے دیکھا ہے۔ وہ آزادی جو مغرب نے فلسفہ، سائنس، مذہب، ادب اور دیگر علوم میں اختیار کی اسی کے زیرِ اثر ان کے ہاں معاشرتی سطح پر آزادی کا رجحان بڑھا۔ اب صورتحال یوں ہے کہ مغرب میں مرد و عورت باہمی رضامندی سے جو کچھ کر لیں روا ہے، لیکن جبراً کرنا منع ہے۔ دوسری طرف ہمارے مشرقی معاشرہ میں مقتدر اشرافیہ طبقہ وہ سب کچھ بھی کرتا ہے جو مغرب میں ہوتا ہے اور جبراً بھی بہت کچھ کر کے الٹا متاثرہ فریق کو گنہگار قرار دلوا کر جیلوں میں سڑوا دیتا ہے۔ ایک طرف عیاشی اور ظلم کی یہ صورت ہے دوسری طرف اخلاقیات اور مذہب کے نام پر عام آدمی کو اس فعل سے روکا جاتا ہے جس کا ارتکاب مقتدر طبقہ دن رات کرتا ہے۔ اس حوالے سے جب میں دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ہمارا مشرقی معاشرہ مقتدر طبقہ کی منافقت کے باعث استحصالی اور منافقانہ معاشرہ بن گیا ہے۔ ہم نیک بننا نہیں چاہتے، صرف نیک دِکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے برعکس مغرب میں جو سہولیات مقتدر طبقہ کو میسر ہیں وہ انہوں نے عام آدمی کو بھی مہیا کر رکھی ہیں۔ شرط ہر جگہ ایک ہی ہے کہ جو

کچھ ہو باہمی رضامندی سے ہو۔جبراً اگر شوہر بھی اپنی بیوی سے کچھ کرے تو اس پر بھی کیس بن جاتا ہے۔

جنرل ضیاع الحق کے دور میں ہونے والی ادیبوں کی ایک کانفرنس میں قبائلی علاقہ سے آئے ہوئے ایک ادیب فائیوسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔صبح سویرے وہ رفع حاجت کے لئے ڈھیلے کی تلاش میں ویرانے کی طرف نکل گئے۔دیر سے واپس آئے تو بعض ادیبوں کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ڈھیلے کی تلاش میں ویرانے کی طرف چلا گیا تھا۔ایک ادیب نے انہیں بتایا کہ باتھ روم میں جوٹشو پیپرز ہیں،آپ انہیں استعمال کر سکتے تھے۔اس پر انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ تو اس پر شاعری لکھتے رہے ہیں۔ہمارے بعض سخت گیر علاقوں میں استنجہ کے لئے ڈھیلے کے استعمال کو آج بھی بعض لوگ ایمانیات کا حصہ سمجھے بیٹھے ہیں۔اس کے نتیجہ میں ایسے کئی لطیفے سامنے آتے رہتے ہیں۔اگر اہلِ مغرب کے عقائد یا معاشرت میں ڈھیلے کا ایسا عمل دخل ہوتا تو مجھے یقین ہے یہ لوگ ڈھیلوں کی ایسی فیکٹریاں بنا لیتے جہاں سے نفیس قسم کے ایسے ڈھیلے تیار ہوتے جو حفظانِ صحت کے مطابق ہوتے اور صفائی کا سارا عمل مقناطیسی اور خود کار طریقے سے مکمل ہوا کرتا۔

سرائیکی میں دو الفاظ کا مطلب واضح کر کے ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔سرائیکی میں ''ہِے'' کا مطلب ''ہَے'' اور ''ہا'' کا مطلب ''تھا'' ہوتا ہے۔خانپور میں ہمارے محلّہ میں ایک تھے چاچا مسُّو لکڑی کے ٹال والے اور ایک تھے چاچا چھتّا موچی۔چھتا موچی بریلوی مسلک کے مطابق حاضر ناظر کے قائل تھے اور چاچا مسو دیوبندی مسلک کے مطابق اس کے مخالف تھے۔لیکن علم دونوں کا ہی پورا پورا تھا۔دونوں میں کلمہ طیبہ کی قرات پر بحث ہو رہی تھی۔چاچا مسّو کہہ رہے تھے کہ کلمہ شریف یوں پڑھنا چاہئے۔**لا الٰہ الااللہ محمد الرسول اللہَ** (یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمدﷺ اللہ کے رسول تھے۔) ''تھے'' کو واضح کرنے کے لئے وہ کلمہ کے آخر میں سرائیکی ''ہا'' پڑھ کر سمجھتے تھے کہ وہ حضورﷺ کو وفات یافتہ قرار دے رہے ہیں،جبکہ چاچا چھتا موچی اصرار کر رہے تھے کہ کلمہ کی اصل قرات یوں ہے: **لا الٰہ الااللہ محمد الرسول اللہِ** یعنی وہ تھے نہیں،بلکہ اب بھی ہیں،حاضر ناظر ہیں۔اس کے اظہار کے لئے وہ آخر میں سرائیکی لفظ کی طرح ''ہِے'' پڑھتے۔میں نے دونوں بزرگوں کی اس عالمانہ بحث کو مزے سے سنا تھا۔

میں نے اپنے نانا جی کا خاکہ لکھا تھا جو ''میری محبتیں'' میں شامل ہے۔منشایاد نے میری خاکہ نگاری پر مضمون لکھتے ہوئے اس خاکہ کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی۔اور خیال ظاہر کیا ہے کہ میرے نانا جی کے

بعض خاص اثرات مجھ پر ہیں۔نانا جی کے وہ اثرات یقیناً مجھ پر ہیں اور ان کی طرح دوسرے ان تمام عزیزوں کے اثرات بھی مجھ پر ہیں،جن کے خاکے میں نے لکھے اور وہ سب اپنے اپنے طریق سے میری شخصیت کی بُری بھلی تعمیر کا کام کر گئے۔ابا جی کو تو میں اب براہِ راست اپنے آپ میں دیکھتا ہوں۔منشایاد کی نشاندہی کے بعد میں نے تھوڑا سا غور کیا تو ایک بڑی عجیب سی مماثلت مجھے اپنے نانا جی میں اور خود میں دکھائی دی۔نانا جی ایک بار لتا کا ایک گانا گنگنا رہے تھے:

یہ زندگی اسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا

ہماری نئی نئی جوانی تھی۔ہم اپنے حساب سے نانا جی کے گانے پر ہنسے تو نانا جی نے ہم سب ہنسنے والوں کو پیار سے اپنے پاس بلایا اور بتانے لگے کہ تم بچے اس گانے کو صرف گانا سمجھتے ہو،اس میں تو بڑی معرفت کی بات ہے۔یہ زندگی اس کی زندگی ہے جو ہمیشہ کے لئے خدا کا ہو گیا اور اس کی محبت میں گم ہو گیا۔نانا جی کی اس تشریح پر ہمیں مزید ہنسی آئی لیکن ان کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے ہنسی کو دبائے رکھا۔

آج ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب میں بھی نانا بن چکا ہوں تو بالکل نانا جی والی صورتحال بن چکی ہے۔مجھے متعدد پرانے گانے پسند ہیں۔کسی زمانے میں صوفیانہ کلام سنتے ہوئے جذباتی کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔لیکن چند برسوں سے ایک فلمی گانے نے مجھے عجیب طرح سے جکڑ رکھا ہے۔

اک جاں تھی پاس وہ جاں لے کر ہم تیری گلی میں آ نکلے
کیا جانے کیا ارماں لے کر ہم تیری گلی میں آ نکلے

نور جہاں کی آواز میں گایا ہوا یہ گانا میرے لئے ایک عجیب معنویت اور کیفیت کا حامل بن گیا ہے۔جب بھی اس گانے کو سنتا ہوں ایسے لگتا ہے جیسے میں اپنے گناہوں کی گٹھڑی اُٹھائے ہوئے خدا کے دربار کی طرف جا رہا ہوں اور یہ سب گاتا ہوا جا رہا ہوں:

ترے سامنے نذر گزارنے کو ہم بے سروساماں کیا لاتے
کانٹوں سے بھرا داماں لے کر، ہم تیری گلی میں آ نکلے

اور پھر مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔اگر گانا سنتے ہوئے جذب کی کیفیت گہری نہ ہو تو میرے صرف ایک مصرعہ گنگنانے سے ہی جذب کی کیفیت گہری ہو جاتی ہے۔یہ نانا جی کے ساتھ کسی نوعیت کی مماثلت ہے،یا ان کے سوچ کے انداز پر ہنسنے کی سزا ہے؟اگر سزا ہے تو میں اسے بہت بڑی جزا سمجھتا ہوں۔عجیب اتفاق ہے کہ نانا جی کو جس گانے کے بول میں معرفت دکھائی دیتی تھی وہ انڈین فلم انارکلی کا گانا تھا اور مجھے

جس گانے نے کئی برسوں سے جکڑا ہوا ہے وہ پاکستانی فلم انارکلی کا گانا ہے۔خدا جانے (اچھی اور میٹھی) موسیقی واقعی روح کی غذا ہوتی ہے یانہیں لیکن مذکورہ گانا تو میرے لئے واقعتاً روح کا ایک تجربہ بنا ہوا ہے۔صوفیانہ کلام نہ ہوتے ہوئے مجھ پر اس کا اتنا گہرا اثر کیوں ہے اور میں معرفت کے سوا اسے کسی دوسرے رنگ میں کیوں نہیں لے سکتا؟ مجھے خود اس کی سمجھ نہیں آتی۔شاید کہیں روح کا کوئی تار،اس گانے کے تاروں سے جُڑ گیا ہے۔

کبھی کبھار تھوڑا سا وقت ملتا ہے اور گانے سننے کا موڈ ہوتا ہے تو کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے کوئی سی ڈی لگا لیتا ہوں۔ایک بار صبح سویرے کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے میں نے لتا منگیشکر کا ایک گانا لگایا ''یہ شام کی تنہائیاں،ایسے میں تیرا غم''۔۔۔مبارکہ کمرے کے آگے سے گزری تو کہنے لگی یہ کیا صبح صبح ''شام کی تنہائیاں۔۔۔'' لگا کر بیٹھے ہیں۔میرے پسندیدہ گانوں پر مبارکہ کے تبصرے بعض اوقات اپنا الگ لطف پیدا کر دیتے ہیں۔پنجابی کا ایک پرانا گانا سنتے ہوئے مبارکہ نے میری کیفیت پر بڑا مزے کا تبصرہ کیا تھا۔میں وہ احوال ڈاکٹر نذر خلیق کے نام اپنے ایک خط میں لکھ چکا ہوں،جسے انہوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں شامل کر دیا تھا۔خط کا وہ حصہ بنیادی طور پر یادوں سے تعلق رکھتا ہے اور اب یہاں گانوں کا ذکر ہو رہا ہے تو اپنے ۱۶ رنومبر ۲۰۰۲ء کے تحریر کردہ اس خط کا متعلقہ حصہ یہاں درج کئے دیتا ہوں:

''ایک دن میں پنجابی کی ایک ویب سائٹ ''اپنا آرگ ڈاٹ کام'' سے طفیل ہوشیار پوری صاحب کا مشہور گانا ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سنتے ہوئے دوستوں کی ای میلز کے جواب دے رہا تھا۔گانے سے اپنی بعض یادوں کے باعث میں کچھ جذباتی سا بھی ہو رہا تھا۔اسی دوران کمرے میں مبارکہ آ گئی اور ہنسنے لگ گئی۔۔۔۔۔میں نے حیران ہو کے پوچھا کیا ہوا ہے؟
کہنے لگی انٹرنیٹ پر ای میلز کے جواب لکھ رہے ہیں اور ساتھ ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سن کر جذباتی ہو رہے ہیں۔
مبارکہ کی بات سن کر میں اپنی جذباتی کیفیت ہی میں مسکرا دیا۔

لیکن بعد میں غور کیا تو مجھے کبوتروں کے ذریعے پیغام بھیجنے والے دَور سے ای میل کے ذریعے پیغام بھیجنے والے دَور تک کے سارے زمانے اپنے اندر برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔نیا دور اپنی طرف بلاتا ہے اور اس میں بڑی کشش ہے،اس کا مضبوط جواز بھی ہے۔پہاڑ کی چوٹی تک جانا آسان ہے لیکن دوسری طرف پرانے دور کی یادیں مسلسل بلاتی ہیں۔روتی ہوئی،ہنستی ہوئی،ہر طرح کی آوازیں بلاتی ہیں۔مجھے

یہ بھی معلوم ہے کہ گزرے زمانے کی آوازوں پر مڑ کر دیکھنے والے شہزادے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔اس کے باوجود میں نہ صرف مڑ کر دیکھتا ہوں بلکہ ہر قدم پر مڑ کر دیکھتا ہوں اور خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی کوشش بھی کرتا جاتا ہوں۔
''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' جذباتی ہو کر سننا،پہاڑ پر جاتے ہوئے مڑ کر دیکھنے جیسا ہے اور ساتھ ساتھ ای میلز کے جواب لکھتے جانا خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی کوشش ہے۔''

مجھے بہت سارے پرانے گانے پسند ہیں،ان سب کی اچھی موسیقی میری روح پر اثر کرتی ہے اور دل میں سوز و گداز بھی پیدا کرتی ہے۔ان گانوں کے ساتھ میں حال میں رہتے ہوئے اپنے گزرے ہوئے زمانوں کا سفر کر لیتا ہوں۔

ہر مذہب کے دو پہلو ہیں۔ایک دانش والا اور دوسرا دہشت والا۔دانش والے پہلو میں دوسروں کے ساتھ مکالمہ بلکہ ایک دوسرے کی تفہیم والے تقابلی مطالعہ کا ظرف پیدا ہوتا ہے۔یہی پہلو آگے چل کر صوفیانہ ریاضت کی طرف بھی لے جانے میں ممد ہوتا ہے۔جہاں مختلف علوم ایک نقطے میں یکجا ہو جاتے ہیں۔اسی لئے اپنے ظرف کی وسعت کے باعث مذہب کے اس پہلو میں مکالمہ اور تقابلی مطالعہ سے کسی کو گھبراہٹ نہیں ہوتی۔

جبکہ مذہب کا دہشت والا پہلو کسی مکالمہ کی گنجائش نہیں رکھتا۔اس میں صرف بزور بازو اور خوفزدہ کر کے بات منوائی جاتی ہے۔یہی رویہ آگے بڑھ کر اس دہشت گردی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اس وقت ساری دنیا کو درپیش ہے۔یہ دہشت گردی امریکہ کے انتہا پسند مسیحی نیوکونز کی ہو یا طالبان کی،کسی پس منظر میں موجود انتہا پسند یہودی گروپ کی ہو یا القاعدہ کی،یہ سارے انتہا پسند انسانیت کے لئے خطرہ ہیں۔

مذہب کا دانش والا پہلو **ھاتو برھانکم ان کنتم صادقین** کی دعوت دے کر علم اور دلیل کی بنیاد پر مکالمہ کرتا ہے۔جبکہ علم اور دلیل سے خائف مذہب کا دوسرا پہلو علم کی تضحیک کر کے،دھمکانے ڈرانے سے لے کر دہشت گردی کی اس صورت تک جاتا ہے جیسا آجکل دنیا میں دکھائی دے رہا ہے۔
اگر مشرق اور مغرب کے عمومی رویوں کو دیکھیں یا پھر صرف پاکستان اور جرمنی کے حوالے سے ہی بات کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ من حیث المجموع اِن لوگوں نے روح کے معاملات کو نظر انداز کیا ہے اور جسم کے معاملات پر ہی زیادہ توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ساری سائنسی ترقیات اور برکات کا تعلق بھی افادی لحاظ

سے جسم سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ان کے برعکس ہم لوگ جسم کے تقاضوں اور مطالبوں کو یکسر نظر انداز کر کے روح کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔لیکن ہمارے ساتھ المیہ یہ ہے کہ روح کے حوالے سے بھی ہمارے پاس صرف زبانی کلامی دعوے رہ گئے ہیں۔روحانی ترقی سے معاشرے میں جو روحانی ترفع دکھائی دینا چاہئے وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔بات ہم روح کی کرتے ہیں دوڑتے جسم کی ضروریات کی طرف ہیں۔یوں ہم نہ کوئی روحانی معاشرہ برپا کر سکے نہ جدید علوم سے ہی خاطر خواہ طور پر بہرہ ور ہو سکے۔جسمانی طور پر ہم بے روح ہو چکے ہیں اور روحانی طور پر ہم جسم کے بغیر اپنا ہی بھوت بن کر رہ گئے ہیں۔

روحانی تجربات کی ایک اہمیت ہے اور کسی روحانیت کے دعویدار معاشرہ میں تو اس کی اہمیت بہت زیادہ ہونی چاہئے۔تاہم روحانی تجربات کا مطلب یہ ہوا کہ اس بندے کو خدا سے پیار ہے اور یہ اپنے رب کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔اس کے برعکس مغربی اسکالرز جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت کر رہے ہیں،ان کا شمار ان لوگوں میں کیا جانا چاہئے جو خدا کے بندوں سے پیار کرتے ہیں۔کیونکہ کسی مکاشفہ کرنے والے کے مقابلہ میں بیماریوں کے علاج والی ادویات اور انسانوں کے لئے جدید تر سہولیات کی ایجاد کرنے والا کوئی بھی سائنسدان اس لئے زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ کسی (غیر مامور) کا سچا خواب،کشف یا خدا سے مکالمہ بھی اس کی اپنی ذات کی حد تک ہے جبکہ جو ادویات ایجاد کر رہے ہیں،بجلی سے لے کر آج تک کی نت نئی ایجادات میں پیش رفت کر رہے ہیں جن سے ساری انسانیت فیض یاب ہو رہی ہے،وہ سائنس دان اور موجدین اپنی ذات کو نہیں بلکہ پوری انسانیت کو،لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں بندگانِ خدا کو فیض پہنچا رہے ہیں۔سو روحانیت کے ساتھ سائنسی ترقی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔میں یہاں مغربی ممالک کے سیاسی کردار کو موضوع نہیں بنا رہا۔اس حوالے سے میری دو کتابوں ''منظر اور پس منظر'' اور ''خبر نامہ'' میں میرا موقف کافی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔یہاں صرف معاشرتی سطح پر روحانی اور مادی امور سے سروکار ہے۔

ایک بار ایک ٹی وی چینل پر روحانیت کے حوالے سے مکالمہ چل رہا تھا۔شرکاء تھے جسٹس جاوید اقبال،پروفیسر مہدی حسن اور مولانا ڈاکٹر اسرار احمد۔آخر میں شو کے کمپئیر نے تینوں شرکاء سے پوچھا کہ ان کی ذاتی زندگی میں کوئی روحانی تجربہ ہوا ہے؟

جسٹس جاوید اقبال نے،جو اقبال کے فرزند ہی نہیں لبرل شارح بھی ہیں،ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی والے دن علی الصبح اپنے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ بیان کیا۔یہ واقعہ وہ اپنی سوانح حیات میں بھی لکھ

چکے ہیں۔اس میں سوتے ہوئے ان کے اوپر سے چادر کھینچ لی جاتی ہے۔میرے ساتھ اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ ہوا تھا جس میں مجھ پر کسی نے آکر رضائی ڈال دی تھی۔یہ واقعہ میرے افسانہ ''بھید'' اور یادوں کے پہلے باب ''بزمِ جاں'' میں تفصیل سے درج ہے۔پروفیسر مہدی حسن جنہیں ان کی فلسفہ میں گہری دلچسپی کی وجہ سے اہلِ مذہب ملحد بھی کہنے لگے ہیں،ان سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں کسی اچھا یا برا کام کرتے وقت ایسا لگتا ہے جیسے ان کے والد انہیں دیکھ رہے ہیں۔مجھے یہ بات سن کر بھی خوشی ہوئی۔کیونکہ میں ایسا ہی اپنا تجربہ اپنے افسانے ''مسکراہٹ کا عکس'' میں لکھ چکا ہوں اور نذر خلیق صاحب نے مجھ سے جو تفصیلی انٹرویو کیا تھا اس میں بتا چکا ہوں کہ یہ'' کہانی خود میرا اپنا نفسی تجربہ تھا جو یہاں جرمنی میں مجھے پیش آیا،اسے آپ سوتی جاگتی حالت کا تجربہ کہہ سکتے ہیں''۔یہ کوئی بڑے روحانی تجربے نہیں ہیں،بس ہم جیسے گنہگاروں کے ظرف کے مطابق خدا کی طرف سے تھوڑی بہت خیرات ہے،ایسی خیرات ہم جیسے اور ہزاروں گنہگاروں کو بھی ملتی رہتی ہے۔کسی کو ایسے تجربات سے بدہضمی ہو جائے اور وہ خود کو کچھ سمجھنے لگ جائے تو اس کے لئے ابتلا کا موجب بھی بن جاتے ہیں۔لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے۔ایسے تجربات کے لئے تھوڑا سا گنہگار ہونا بھی شاید شرط ہو۔کیونکہ ''اللہ کے نیک بندے'' تو ایسے تجربات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔اس لئے انہیں ایسے تجربے ہوتے بھی نہیں۔خیر بات ہو رہی تھی ٹی وی کے ''ٹاک شو'' کی۔مجھے خوشی ہوئی کہ روایتی معنوں میں غیر مولوی ہوتے ہوئے بھی،جسٹس جاوید اقبال اور پروفیسر مہدی حسن،دونوں دانشوروں کے ہاں نہ صرف روحانی تجربات موجود تھے بلکہ ان کی نوعیت سے میرے تجربوں کی نوعیت کی بھی تصدیق ہوئی۔تاہم اس نشست کا سب سے دلچسپ جواب مولانا ڈاکٹر اسرار احمد کا تھا۔۔۔وہ روح اور روحانیت پر بڑی عالمانہ گفتگو فرماتے رہے تھے لیکن ان کا دامن کسی بھی روحانی تجربہ سے خالی تھا۔انہوں نے اعتراف کیا کہ انہیں زندگی میں کوئی روحانی تجربہ نہیں ہوا۔اب جبکہ پاکستان کی روحانی ذمہ داریاں ایسے پڑھے لکھے علماء کرام نے سنبھال رکھی ہیں جو کسی روحانی تجربے سے یکسر محروم ہیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جسم کی نفی کرتے ہوئے،جسم کی ضروریات کی طرف دوڑتا ہوا ہمارا معاشرہ روحانی طور پر کیوں اپنا ہی بھوت بن کر رہ گیا ہے۔

☆☆☆

جدید ادب جرمنی۔شمارہ: جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء

☆ میری یادوں کا یہ باب جدید ادب کے شمارہ:۹ میں چھپنے کے لئے پریس میں جا چکا تھا جب مجھے ایک مدت کے بعد پھر جمیل الرحمٰن کا فون آ گیا۔ان کا فون آنے سے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔میں نے انہیں کھل کر بتا دیا کہ میں نئے باب میں آپ کا ''ذکرِ خیر'' کر چکا ہوں ۔انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں،آپ نے جو لکھا، میں کچھ نہیں کہوں گا۔ان کے ساتھ مختلف ادبی موضوعات پر بات ہوئی۔''رہے نام اللہ کا!'' کے مندرجات انہیں بہت پسند آئے تھے۔اس پر بہت خوشی کا اظہار کرتے رہے۔سائنس، مذہب اور ادب کی اپنی اپنی خود مختاری کے ساتھ تینوں کے ربطِ باہم پر دلچسپ باتیں ہوئیں۔بحیثیت شاعر میں نے ان کی خوبیوں کو مانا ہے،خامیوں کا انہیں خود بخوبی علم ہے۔میں جمیل الرحمٰن سے اپنی شدید ناراضی کے دنوں میں بھی اپنے مضمون ''یورپی ممالک میں اردو شعرو ادب:ایک جائزہ'' میں نہ صرف ان کا ذکر کر چکا ہوں بلکہ انہیں یورپ کے ان معدودے چند شعراء میں شمار کیا ہے، جو اردو شاعری کی نام نہاد بین الاقوامیت سے قطع نظر،اردو کی مین سٹریم یا ادب کے مرکزی دھارے کے اہم شعراء کے ہم پلہ ہیں۔نجی سطح پر جو دکھ تھا وہ ان کی دوبارہ ٹیلی فون کال آنے پر ہونے والی کھلی اور دوٹوک گفتگو نے دور کر دیا ہے۔شاید بہت ساری غلط فہمیاں عدم رابطہ کے باعث بھی ہو جاتی ہیں۔اللہ انہیں خوش رکھے۔

(ح۔ق)

جدید ادب جرمنی۔شمارہ: جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء

جمیل الرحمٰن کی مزید روداد میرے مضمون ''ریکارڈ کی درستی (جمیل الرحمٰن کے حوالے سے''میں لکھی جا چکی ہے۔یہ مضمون میرے مضامین کے مجموعہ ''تاثرات''میں شامل آخری مضمون ہے۔(ح۔ق)

چند پرانی اور نئی یادیں

سال ۲۰۰۸ء شروع ہوتے ہی مجھے یادوں کے حوالے سے ایک خوشی یہ ملی کہ میرے بچپن کے ہم جماعت اے کے ماجد کا اچانک ٹیلی فون آ گیا۔اے کے ماجد کا تھوڑا سا ذکر ''میری محبتیں'' کے ''پرانے ادبی دوست'' میں موجود ہے۔عبدالخالق ماجد کو اے کے ماجد بنانے میں میرا مشورہ بھی شامل تھا۔ہم چھٹی جماعت سے ایک ساتھ ہوئے اور خانپور میں قیام تک ہمارا باہمی ملنا جلنا رہا۔سکول کے زمانے میں ان کی کھیتی باڑی والی زمین اور ان کا گھر خانپور کی شہری حد کے ساتھ ملحق تھا۔اب تو وہ سارا علاقہ بھی خانپور کی شہری حد میں آ چکا ہے۔شہر سے جڑے ہوئے اُس گاؤں میں ہم دونوں درختوں کی چھاؤں کے نیچے بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرتے ۔اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم ذہنوں سے سوچی ہوئی باتیں کرتے۔ہمارے کوئی لمبے چوڑے خواب نہیں تھے۔زندگی جیسے گزر رہی تھی ہم دونوں اسی میں خوش تھے۔اے کے ماجد کے والد اور والدہ دیہاتی مزاج کے شفقت اور محبت بھرے کردار تھے۔پھر ان کے والد اور والدہ کا انتقال ہوا تو حالات میں تبدیلی آئی۔اے کے ماجد نے قومی بچت کے مرکز میں جاب کر لی تھی۔وہ جاب اب بھی قائم ہے۔اے کے ماجد نے ماڈل ٹاؤن کے قریب کی نئی آبادی میں پلاٹ لے لیے تھے۔وہاں گھر بنا لیا تھا اور گھر بسا بھی لیا تھا۔اے کے ماجد کے دیہات والے گھر میں ہم لسی پیا کرتے تھے تو ماڈل ٹاؤن کی حد سے جڑے ہوئے گھر میں ہم کافی پیا کرتے تھے۔دودھ پتی کی طرز پر ہم دودھ کافی بناتے تھے اور اسے پی کر دونوں ہی خود کو کسی حد تک نئے زمانے کا فرد سمجھتے تھے۔حالانکہ ہم دونوں ایک حد تک دیہاتی اور ایک حد تک شہری تھے۔اب سوچ رہا ہوں کہ اے کے ماجد ہمیشہ شہر اور ماڈل ٹاؤن سے الگ لیکن قریب کیوں رہا ہے؟۔۔۔وہ خود شہر یا ماڈل ٹاؤن کا حصہ نہیں بنا بلکہ اس کے کنارے پر آباد ہو کر پھر اُسے اپنے اندر جذب کر لیا۔شاید اس کی یہی خوبی ہماری دوستی کا لاشعوری سبب بنی رہی اور یہی رویہ میرے اندر پروان چڑھتا رہا جو اب خود میرے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔بہر حال

اے کے ماجد کا فون آیا تو پہلی بار ذوقؔ کا یہ شعر روح کی گہرائی تک مزہ دے گیا۔

اے دوست کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے (۱)

اے کے ماجد کے فون کے ساتھ ایک اور فون بھی اچانک آ گیا۔ یہ تھے خانپور کے ظفر اقبال ماچے توڑ۔ ضیاع الحق دور کے حوالے سے ''آئین سے انحراف'' جیسی کتاب لکھنے والے ظفر اقبال ماچے توڑ کے ساتھ ایک دو بار پہلے بھی ٹیلی فون پر رابطہ ہو چکا تھا تاہم اس بار طویل عرصہ کے بعد ان کا فون آیا تو اچھا لگا۔ مزید کمال یہ ہوا کہ سعید شباب کی ہمت کے نتیجہ میں جمیل محسن کے ساتھ بھی رابطہ ہو گیا۔ جمیل محسن ہمیشہ جیسا خوش مزاج تھا۔ ڈاکٹر نذر خلیق، سعید شباب اور ارشد خالد کے ساتھ تو ویسے بھی ٹیلی فون پر مستقل رابطہ رہتا تھا۔ البتہ آجکل ارشد خالد کے ساتھ رابطہ زیادہ رہتا ہے۔ اب خانپور سے جمیل محسن کے فون کے بعد میرے ابتدائی دوستوں سے رابطہ کا ایک دور مکمل ہو گیا ہے۔

ایک بار کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے مجھے لگا کہ ابھی باتھ روم میں جا کر پیشاب کر کے آتا ہوں۔ لیکن میرے اُٹھنے سے پہلے ہی خانپور سے نذر خلیق کا فون آ گیا۔ میرا خیال تھا بات جلد مکمل ہو جائے گی لیکن نذر خلیق لمبی بات کرنے کے موڈ میں تھے۔ میں نے تار کے بغیر والا فون اُٹھایا ہوا تھا، اسے دائیں کندھے اور کان سے ٹکا کر میں باتھ روم میں چلا گیا۔ گھر پر عام طور پر سلوار قمیص پہنتا ہوں۔ سوکموڈ کی وجہ سے سلوار اتار کر ہی بیٹھتا ہوں۔ میں نے سلوار اتارنے، پیشاب کرنے، طہارت کرنے، پھر سے سلوار پہننے اور ہاتھ دھونے تک سارے مرحلے آسانی سے طے کر لیے۔۔۔ اس دوران گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ لیکن سلوار کا ازار بند ''آزارِ جاں'' بن گیا۔ اب یہ مضحکہ خیز صورتحال تھی کہ میں ایک ہاتھ سے ٹیلی فون تھامے نذر خلیق کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے سلوار کے ازار بند کو تھامے باتھ روم سے باہر نکلا۔ مبارکہ کو اشاروں میں کہا کہ میرا ازار بند باندھ دیں۔ مبارکہ نے اس ناگہانی اور تماشہ صورتحال پر بڑبڑاتے ہوئے ازار بند باندھ دیا لیکن ان کی بڑبڑاہٹ اتنی بلند آہنگ تھی کہ نذر خلیق نے فون پر ہی پوچھ لیا: کیا بات ہے لگتا ہے بھابی کسی بات پر غصہ کر رہی ہیں؟

میں نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر انہیں ساری بات بتا دی، نتیجتاً ان کے ہونٹوں سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ اسی ہنسی کے دوران ہی انہوں نے کہا کہ جب چار پانچ سال کے بچوں والے کام کرائیں گے تو اس عمر کے بچوں کو جیسی ڈانٹ پڑتی ہے ویسی ڈانٹ تو لازماً پڑے گی۔

تار کے بغیر والے ٹیلی فون کے فوائد کے ساتھ اب اپنے کمپیوٹر کے ''بغیر تار والے'' کی بورڈ اور ماؤس کا بھی کچھ ذکر ہو جائے یہ کمپیوٹر ابھی نیا لیا ہے۔ میرے چھوٹے داماد عادل نے اس کی ساری انسٹالیشن مکمل کر کے مجھے اس کی سہولیات کے بارے میں جب یہ بتایا کہ میں کی بورڈ اور ماؤس کو لے کر کمپیوٹر والی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے اپنے کمرے کے صوفہ پر آرام دہ طریقہ سے بیٹھ کر اور کی بورڈ کو گود میں لے کر بھی سارا کام کر سکتا ہوں تو مجھے اس سہولت نے بڑا خوش کیا۔ میں نے ایک بار صوفہ پر بیٹھ کر اردو میں لکھنے کا تجربہ کیا۔ دوسری بار صوفہ پر اُلٹا لیٹ کر اور کی بورڈ اور ماؤس کو سامنے رکھ کر اردو لکھنے کا کام کیا۔ دونوں تجربے پھر مبارکہ کے سامنے دہرائے۔ وہ جو میرے کمپیوٹر والے کمرہ کو ویسے ہی سوتن کا کمرہ کہتی ہیں، ان تجربوں پر صرف مسکرا کر رہ گئیں۔ دراصل یہ نیا کمپیوٹر مجھے میری ۵۶ ویں سالگرہ پر مبارکہ نے ہی تحفہ کے طور پر لے کر دیا ہے۔

''بغیر تار والے'' کی بورڈ اور ماؤس کی سہولت اس وقت میری دسترس میں ہے تو اپنا تجربہ لکھ دیا ہے، وگرنہ لیپ ٹاپ میں یہ سہولت اس سے بھی زیادہ مزے کے ساتھ میسر ہے۔ لیکن مجھے ابھی تک لیپ ٹاپ لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ موبائل ٹیلی فونز میں اب ایسی سہولت بھی آ گئی ہے کہ موبائل آپ کی جیب میں پڑا ہے اور آپ تنہا، راہ چلتے، ہاتھ اپنی جیب میں ڈالے، کسی کے ساتھ گپ شپ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ چند برس پہلے کوئی عام دیکھنے والا یہ منظر دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ شاید کوئی نیم خبطی ہے جو خود کلامی کرتا جا رہا ہے۔ اب کوئی نیم خبطی بھی اس انداز میں جاتا دکھائی دے تو یہی خیال آئے گا کہ کوئی موبائل پر کسی کے ساتھ محوِ گفتگو ہے۔ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

چند روز قبل جرمنی کے دو شاعر دوست ظفر اللہ محمود اور طاہر عدیم مجھے کہہ رہے تھے کہ برلن میں ایک مشاعرہ ہے، اس میں شرکت کے لیے چلیں۔ میں نے مشاعرہ بازی سے پرہیز کی اپنی مجبوریاں بتائیں۔ پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو میں نے وضاحت کی کہ بھائی! ان مشاعروں سے اردو کی جو بین الاقوامیت بنی ہے سو بنی ہے، مجھے تو اب عالمی کانفرنسوں اور سیمینارز کے حقیقی نتائج پر بہت سے تحفظات ہیں۔ نشستند، خوردند، برخاستند سے زیادہ کوئی نتیجہ سامنے آیا ہو تو بتایا جائے۔ پھر مجھے وہ کانفرنسیں اور سیمینارز یاد آنے لگے جن میں مجھے مدعو کیا گیا لیکن میں نے شرکت سے معذرت کر لی۔ سجاد ظہیر صدی کی تقریبات کے حوالے سے ان کی صاحبزادی نور ظہیر نے بذاتِ خود مدعو کیا، ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو ہند کی صد سالہ تقریب کے ضمن میں مدعو کیا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام

اردو کی نئی بستیاں کے موضوع پر ہونے والے سیمینار میں مدعو کیا، ڈاکٹر خلیل طوق اُر نے استنبول یونیورسٹی کے سیمینار میں مدعو کیا، لندن کی میلینئم کانفرنس کے منتظمین نے اس کانفرنس کے بعد کی کانفرنس میں مدعو کیا۔۔۔میں نے ان سب سے معذرت کی تھی۔وجہ؟۔۔۔تمام دعوت ناموں میں قیام وطعام وغیرہ امور کی ذمہ داری لی جاتی تھی لیکن ہوائی جہاز کا ٹکٹ ''بین الاقوامی ادیبوں'' کو اپنی جیب سے خریدنا تھا۔میں چونکہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اس لیے ادب کے ساتھ شرکت سے معذرت کر لیتا ہوں۔اور اس لیے قلبِ یورپ میں بیٹھ کر بھی پورے کا پورا مقامی شاعر اور ادیب ہوں اور اس بات پر خوش ہوں کہ میں معروف معنوں میں ''بین الاقوامی ادیب'' نہیں ہوں۔

امریکہ میں جون ۲۰۰۰ء میں اقوام متحدہ کے دفتر میں ایک اردو کانفرنس ہوئی تھی۔مجھے اس میں ہوائی سفر کا خرچہ دینے کی یقین دہانی کے ساتھ مدعو کیا گیا تھا۔میں جانا چاہتا تھا لیکن امریکی ویزہ کے حصول میں انتظامی تاخیر کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔اس کا مجھے افسوس رہا۔

نومبر ۲۰۰۸ء میں لندن کے ایک سیمینار میں ائیر ٹکٹ کی ادائیگی کے ساتھ مدعو کیا گیا لیکن شرکت کی حامی بھرنے کے باوجود میں نے بعد میں معذرت کر لی۔وجہ صرف یہ ہوئی کہ متعلقہ تنظیم کے جنرل سیکریٹری فہیم اختر نے پہلے مجھے کہا کہ جرمنی سے (بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں سے بھی) کوئی اور شاعر اپنے کرایہ پر آنا چاہیں تو ان کے قیام وطعام کا انتظام ان کی تنظیم کے ذمہ ہوگا۔میں نے انہیں دو شاعروں ظفراللہ محمود اور طاہر عدیم کے نام دے دیئے۔ایک سامع کا نام بھی دے دیا۔انہوں نے پاکستانی پاسپورٹ والے دوستوں کے لیے برطانیہ سے ویزہ لیٹر بھیج دیا۔لیکن کانفرنس سے چند دن پہلے مجھے لکھا کہ ہم فنڈز کی کمی کی وجہ سے صرف آپ کے قیام کا انتظام کر سکیں گے، دوسرے مہمانوں کے لیے قیام کا انتظام نہیں کر سکتے، اگر وہ اپنے قیام کا انتظام کر سکیں تو آ جائیں۔برطانیہ میں دو چار دوستوں کے قیام طعام کا انتظام کرنا کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔یہ بات اچھے پیرائے میں بھی کہی جا سکتی تھی۔لیکن جس انداز میں یہ پیغام دیا گیا وہ اتنا نامناسب تھا اور مجھے اتنا برا لگا کہ میں نے خود بھی جانے سے معذرت کر لی

زندگی میں جن چند کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں ان کانفرنسوں میں بھی میری ترجیحات سادہ سی رہی ہیں۔ماریشس کی کانفرنس کے الوداعی ڈنر (جو ملک کے نائب صدر کی جانب سے تھا) میں شرکت کی بجائے میں نے ماریشس کی ایک بچی کو اس کے گھر پر اردو ای میل بھیجنے کا طریقہ سکھانے پر وقت صرف کر دیا۔جبکہ دوسری طرف الوداعی ڈنر میں ملک کے وزیر اعظم اور نائب صدر شریک ہو رہے تھے۔اب بھی

میں یہاں جرمنی کے کسی مشاعرہ میں شرکت کرنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ کسی بچے کو اردو پروگرام کا شوق پیدا ہو جائے۔سو برلن کے مشاعرہ کی بجائے ایک دوست سجاد ساجن کی دو بیٹیوں عروج اور علینہ کو میں نے اردو پروگرام سے متعارف کرا دیا ہے۔عروج کو تو اردو سیکھنے کا ویسے ہی بہت شوق تھا، چنانچہ اردو پروگرام کو سمجھنے کے بعد اسی وقت ایک گھنٹے کے اندر اس بچی نے ایک غزل ٹائپ کر کے پیش کر دی۔تاہم علینہ نے اس لحاظ سے بہت حیران کیا کہ اردو میں زیادہ دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود اسی وقت بہن سے کچھ سمجھا اور پھر اسی وقت اس نے بھی ایک غزل ٹائپ کر کے شاباش حاصل کر لی۔مجھے ایسے بچوں کی اردو سے دلچسپی یہاں کی روایتی مشاعرہ بازی سے بہت زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے۔

بہت زیادہ پُر امید نہ ہونے کے باوجود اپنی اگلی نسلوں کے ساتھ ذہنی فاصلہ کم کرنے کے لیے میں اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ہلکی پھلکی کوشش کرتا رہتا ہوں۔پوتوں، پوتیوں اور نواسوں کو ایک ساتھ بٹھا کر ان کے والدین کے بچپن کے حوالے سے اپنی لکھی تحریروں کے اقتباس سناتا ہوں تو بچے بہت خوش ہوتے ہیں پھر اپنے ماں باپ سے پوچھتے ہیں: آپ نے سچ مچ ایسا کیا تھا؟ بات کی تصدیق ہونے پر پہلے سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ایک بار اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں تو ایک بچے نے کہا کہ آپ نے ہمارے بارے میں بھی ایسا کچھ لکھا ہے؟

میں نے ذہن پر زور دیا تو اپنے نواسے رُومی (مشہود) کا ٹی وی والا واقعہ یاد آ گیا جو یادوں کے باب ''گراموفون سے سی ڈی تک'' میں شامل ہے۔بچوں کو وہ واقعہ سنایا تو سب نہ صرف ہنسنے لگے بلکہ رُومی کو چھیڑنے بھی لگے۔دوسرے نواسے جگنو (مسرور) نے کہا کہ آپ نے رُومی کا ذکر کیا ہے، ہم باقی بچوں کا بھی ذکر کریں۔میں نے اسے بتایا کہ یادوں کے ایک باب ''رہے نام اللہ کا!'' میں اس کے اور پوتے شہر یار کے ختمِ قرآن کا ذکر کیا ہوا ہے۔جب بچوں کو وہ حصہ پڑھ کر سنایا تو جگنو نے کہا کہ یہ بھی ٹھیک ہے، پر جیسا رومی کا واقعہ لکھا ہے ویسا ہونا چاہئے تھا۔جگنو کی معصومیت میں چھپی شوخی نے مجھے کافی مزہ دیا۔

میں موجودہ پاپولر میوزک سے بہت بور ہوتا ہوں، لیکن بچوں کو یہی زیادہ پسند ہے۔میں نے سوچا انہیں تھوڑا بہت پرانے گانوں کا بھی ذوق دیا جائے۔سو میں نے بچوں کے نک ناموں کی مناسبت سے چند گانے ڈھونڈ لیے۔مثلاً: پوتے شہری (شہر یار) کے لیے۔۔کوئی شہری بابو دل لہری بابو ہائے رے پگ باندھ گیا گھنگرو میں چھم چھم نچدی پھراں۔

نواسے رُومی (مشہود) کے لیے۔۔نار دانہ، انار دانہ۔۔اساں رُومی ٹوپی والے نال جانا

شہری پہلے تو گانے پر غصہ کرتا تھا، پھر شرمانے لگا اور اب اس کا عادی ہو گیا ہے۔رُومی والا گانا سب نے پسند کیا۔میرے سب سے چھوٹے نواسے شام (احتشام) کو یہ گانا زیادہ ہی پسند آ گیا۔اپنی توتلی زبان میں وہ گانا گنگنانے لگا تو رُومی کے نک نام کی بجائے اس کے اصل نام کو گانے میں فٹ کر دیا۔''ناردانہ، اناردانہ۔۔۔مشہو دٹوپی والے نال جانا''۔

شام نے اپنے طور پر یہی سمجھا کہ یہ گانا اس کے بھائی رُومی (مشہود) کے لیے ہے،اس لیے اس کا کوئی بھی نام لیا جا سکتا ہے۔اب بچوں کو کیا پتہ کہ رُومی ٹوپی کس تہذیب کی علامت تھی۔شآم کے لیے میں نے ایک فلمی بھجن کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ سنا دیا۔

شآم! تیری بنسی کو بجنے سے کام   پاپا کا بھی شآم ہے تو ماما کا بھی شآم

جگنو کے لیے عالم لوہار کی جگنی سے کام چلانا پڑا اور سونو کے لیے سونی والا گانا تلاش کرنا پڑا۔لڑکے تو سارے خوش ہو گئے۔اب میری پوتی ماہ نور (ماہا) نے کہا کہ میرا گانا بھی لائیں۔اس پر لڑکوں نے مذاق میں ماہی لفظ والے بعض گانے بیان کرنا شروع کر دیئے۔لیکن میں نے اسے بتایا کہ میں نے ماہا کے بارے میں خود ایک ماہیا لکھا ہے۔پھر وہ ماہیا اسے ماہیے کی لَے میں گنگنا کر سنایا:

ماہا مِری پوتی ہے/ روتے ہوئے ہنستی/ ہنستے ہوئے روتی ہے

اس پر چار سال کی ماہا بڑی خوش ہوئی اور سب کو اس ماہیے کی تشریح کر کے بتاتی پھرے کہ جب میں چھوٹی تھی تو ایسا کرتی تھی اور دادا ابو نے یہ بات لکھی ہے۔علیشا اور ماہم ابھی بہت چھوٹی ہیں، وقت آنے پر وہ بھی اپنے حصہ کے ماہیے سن لیں گی۔

ستمبر ۲۰۰۸ء میں میرے چھوٹے بیٹے طارق (ٹیپو) کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش ہو چکی ہے۔میرا نیا پوتا شایان ابھی بمشکل پانچ ماہ کا ہے۔ہمارے گھر میں ایک ڈیکوریشن مکراما لٹکا ہوا ہے۔مختلف رنگوں کے خوبصورت گول ڈیزائنز کے بیچ ایک میوزیکل راڈ جھول رہا ہے۔اسے ہلائیں تو جلترنگ سی آواز آتی ہے۔رنگین گولائیوں کی جھلمل اور جلترنگ کی آواز مل کر ایک انوکھا سا منظر بنا دیتی ہیں۔شایان جب کسی وجہ سے رو رہا ہو اور چپ نہ کر رہا ہو تو میں اسے اس مکراما کے قریب لا کر مکراما کے میوزیکل راڈ کو تھوڑا سا چھیڑتا ہوں، رنگوں کی جھلمل اور جلترنگ کی آواز آتی ہے تو شایان رونا بھول کر پہلے حیرت سے اس منظر کو دیکھتا ہے پھر جیسے اس کے اندر ایک جوش سا بھر جاتا ہے اور دوسری بار راڈ کو چھیڑنے تک وہ خود بھی ایسے ہمکتا ہے کہ میرے لیے وہ بھی اس سارے منظر کا حصہ بن جاتا ہے۔شایان کے ہمکنے اور پُر جوش

ہونے سے مجھ پر دنیا ایک اور زاویے سے منکشف ہوئی۔مجھے لگا ہم سب انسان جو مختلف خواہشوں کی تکمیل اور مختلف چیزوں کے حصول کے لیے بھاگتے ہیں اور پھر جن خواہشوں کو پورا کر لیتے ہیں اور جن چیزوں کو حاصل کر لیتے ہیں، ان سب کی کیفیت بھی بس رنگوں کی جھلمل اور جلترنگ کی آمیزش جیسی ہوتی ہے۔اب رنگوں اور جلترنگ کے روبرو شایان کے ہمکنے سے مجھ پر جو حقیقت ظاہر ہوئی ہے تو میں خود ایک عجیب سی خوشگواریت کے احساس میں گھر گیا ہوں۔ایسا احساس جو زندگی کی ایسی بے معنویت کے انکشاف سے عبارت ہے جو بیک وقت بے معنی بھی ہے اور بامعنی بھی۔

طارق نے اپنے بچپن میں اباجی کی وفات پر اپنی ایک معصومانہ حرکت سے مجھے خدا کے بارے میں ایک انوکھی آگاہی عطا کر دی تھی۔تو اب طارق کے بیٹے شایان نے اپنے باپ سے بھی کم عمری میں مجھ پر زندگی کی خواہشوں کی حقیقت منکشف کر دی ہے۔پر اپنی تمام تر بے معنویت کے باوجود خواہشوں کی جھلمل اور جلترنگ اس عمر میں بھی مجھے اپنے شایان جیسا ہی کر دیتی ہیں۔خدا جانے جھلمل اور جلترنگ میں وقتی طور پر اتنی معنویت کہاں سے آ جاتی ہے اور اس کو پا لینے کے بعد کہاں غائب ہو جاتی ہے! یہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ بات ہوتی جا رہی ہے، سو اصل موضوع کی طرف واپس آتا ہوں۔

جس وقت میں جگنو اور سونو کے لیے گانے تلاش کر رہا تھا، ایک مزے کا لطیفہ ہو گیا۔یوٹیوب پر اردو گانوں کے بہت سارے چینل دستیاب ہیں۔ہر گانے کے ساتھ اس سے متعلقہ نوعیت کے کئی اور گانے بھی دائیں طرف سامنے آ جاتے ہیں۔یعنی بائیں طرف چھوٹی سکرین پر آپ کا پسندیدہ ایک گانا چل رہا ہے اور دائیں جانب اسی انداز کے یا ملتے جلتے گانوں کی ایک لسٹ آویزاں ہوتی ہے، جہاں سے آپ اپنی پسند کے مزید گانے منتخب کر سکتے ہیں۔میرے سارے پوتے، نواسے، پوتیاں وغیرہ میرے ارد گرد کھڑے تھے۔چھوٹا بیٹا ٹیپو بھی دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔اسکرین پر ایک نیا اور مشہور گانا:

''کجرارے۔۔کجرارے   تیرے کارے کارے نیناں''

لگا ہوا تھا۔میں نے اسے تبدیل کرنا چاہا تو بچوں نے شور مچا دیا کہ یہ گانا سننا ہے۔میں نے سوچا بچے یہ گانا دیکھ لیں، میں اسی دوران اس کے دائیں جانب والی لسٹ کو دیکھ لیتا ہوں۔شاید وہاں سے جگنو اور سونو کے نام والا کوئی گانا مل جائے۔اب صورت حال یوں بنی کہ میں عینک اتار کر دائیں جانب والی لسٹ کو کمپیوٹر اسکرین پر جھک کر، قریب سے ہو کر دیکھ رہا ہوں اور اُدھر گانے پر ایشوریا رائے رقص فرما ہیں۔

میرا چین وَین سب اُجڑا

ظالم نظر ہٹالے

برباد ہو رہے ہیں جی ترے اپنے شہر والے

یہ الفاظ گانے کی ابتدا میں دہرا کر گائے جاتے ہیں۔سو جب دوسری بار محترمہ ایشوریہ رائے نے ''ظالم نظر ہٹالے'' کے الفاظ ارشاد فرمائے تو پیچھے سے ٹیپو کی شرارت سے بھری شوخ آواز آئی۔

''ابو!اب تو نظر ہٹالیں''

کبھی کبھی غیر ارادی طور پر ایسی صورتحال بن جاتی ہے کہ واقعاتی حقیقت نہ ہوتے ہوئے بھی سامنے کا منظر حقیقی واقعہ جیسا ہی لگتا ہے۔ اس واقعہ کے وقت ٹیپو کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی وہ میرے چہرے پر بھی منعکس ہو رہی تھی۔چھوٹے بچوں کو پتہ نہیں کتنی بات سمجھ میں آئی،لیکن وہ سب کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔میں اب بھی اس منظر کو ذہن میں لاتا ہوں تو ٹیپو والی مسکراہٹ میرے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔

جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں کہ بچوں کے لیے مذکورہ گانوں کی تلاش میں مجھے انٹرنیٹ پر یوٹیوب میں جا کر وہاں سے پرانے پاکستانی اور انڈین فلمی گیتوں کے حصہ میں جانا پڑا۔وہاں ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ لنک ملتا گیا۔بچوں کے کام سے نمٹ کر میں خود بچہ بن گیا اور کئی نایاب اور بھولے بسرے گیتوں کو اپنی دسترس میں پا کر دیر تک ان سے لطف اندوز ہوتا رہا۔یوں ان گیتوں کے زمانوں سے جڑی ہوئی کئی ذاتی یادیں ذہن میں آتی رہیں،دل میں جگمگاتی رہیں اور آنکھوں میں جھلملاتی رہیں۔

مجھے پہلی دفعہ بڑی سطح پر تجربہ ہوا کہ ایسی یادیں کس طرح ہمارا کتھارسس کر دیتی ہیں۔

☆☆☆

جدید ادب جرمنی۔شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۰۹ء

----

(۱):بزمِ فرید کے زمانے کے ایک دوست مجاہد جتوئی بھی اسی عرصہ میں تھوڑے سے رابطہ میں آئے تھے۔ہمارے درمیان لاگ میں لگاؤ اور لگاؤ میں لاگ جیسی کوئی کیفیت چلتی رہی ہے۔تاہم اب یہ کتاب چھپنے سے پہلے سعید شباب کے توسط سے مجاہد جتوئی سے پرانا تعلق پھر وہیں سے بحال ہوا ہے جہاں سے معلق ہو گیا تھا۔مجاہد جتوئی کے موجودہ حلیہ کو دیکھتے ہی میں چونک گیا۔یہ تو شاید میرے اندر کا حلیہ ہے۔مجاہد جتوئی نے اسے اوپر سے اوڑھا ہوا ہے یا واقعی وہ اندر باہر سے ایسا ہو گیا ہے؟یہ تو اب آگے چل کر معلوم ہو سکے گا۔فی الحال خوشی کی بات یہ ہے کہ مجاہد جتوئی سے بھی ربط کی ایک صورت بن گئی ہے۔(ح۔ق)

لبّیک الّٰھمّ لبّیک

قل ان کانت لکم الدّار الآخرۃ عنداللہ خالصۃ من دون الناس فتمنو الموت ان کنتم صادقینO ولن یتمنوہ ابداً بما قدمت ایدیھم ط واللہ علیم بالظّلمینO

(سورۃ **البقرۃ** ۔آیت ۹۴۔۹۵)

(**ترجمہ:** تو ان سے کہہ اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر (باقی) لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے،تو اگر تم [اس دعویٰ میں] سچے ہو تو موت کی خواہش کرو۔(یاد رکھو کہ) جو کچھ ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں،اس کے سبب سے وہ کبھی بھی (موت کی) تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے)

مجھے جنوری ۲۰۰۹ء میں ایک خواب کے ذریعے واضح طور پر بتایا گیا کہ ۳ر دسمبر کو میری وفات ہو گی۔میں یہ تحریر نومبر کے آخری عشرہ میں لکھ رہا ہوں اور قارئین تک تب پہنچے گی جب ۳ر دسمبر ۲۰۰۹ء کا دن گزر چکا ہوگا۔

زندگی کے معاملہ میں دو جمع دو چار کی طرح کوئی دوٹوک اور حتمی بات کہہ کر گزر جانا ممکن نہیں۔ہر انسان کی زندگی اس کے اپنے ڈھب سے ہوتی ہے۔زندگی نے اس کے ساتھ کیا کیا اور اس نے زندگی کے ساتھ کیا کیا؟ دونوں معاملات ہی ہر انسان کی ذات اور اس کی اپنی کائنات کے حوالے سے ہوتے ہیں۔میری چھوٹی سی کائنات خاندانی سطح پر میرے والدین،بہن بھائیوں،بیوی،بچوں اور ان سب سے منسلک رشتہ در رشتہ کہکشاں پر مشتمل ہے۔ان سارے رشتوں کا ذکر اذکار میرے،خاکوں اور یادوں میں نمایاں طور پر اور دوسری اصناف میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب کہ عمر کے اس حصے میں ہوں جب بندہ اس دنیا سے آگے کی دنیا میں جانے کے لیے بوریا بستر باندھنے میں لگا ہوتا ہے،میں نے بھی کچھ عرصہ سے اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کر رکھا ہے۔اگلی دنیا میں

جانے کی تیاری کے ساتھ اِس دنیا سے لذت کشید کرنے کا عمل بھی میں نے کم نہیں ہونے دیا۔میری اہلیہ مبارکہ ان معاملات میں ایک حد تک میرے ساتھ ہے اور ایک حد تک مزاحمت کررہی ہے۔اس دنیا کے معاملات میں تو نہ صرف اس نے مزاحمت نہیں کی بلکہ بڑی حد تک پردہ پوشی بھی کی ہے۔البتہ اگلی دنیا کے معاملہ میں اس نے شدید مزاحمت کررکھی ہے۔اس حوالے سے جو تازہ ترین صورتحال ہے اسے بعد میں بیان کروں گا پہلے گزرے دنوں کا کچھ ذکر ضروری ہے۔

۱۹۹۶ء میں مبارکہ کو Rheumatism کی بیماری کی ابتدا ہوئی تھی۔پہلے تو بیماری کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی۔پتہ نہیں یہ'' روئے ماٹ ازم'' کونسی اللہ ماری ولایتی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ہم نے تو سوشلزم،کمیونزم،کیپٹل ازم کے نام ہی سن رکھے تھے اور مبارکہ کو ان میں سے کسی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔بہرحال بیماری کی نوعیت کا جب کچھ کچھ اندازہ ہوا تو اس کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے میں نے ۱۹۹۶ء ہی میں ایک غزل میں کہا تھا:

دیکھو مجھے اس حال میں مت چھوڑ کے جانا
دل پر ابھی میں نے کوئی پتھر نہیں رکھا

پھر مبارکہ نہ صرف اس بیماری کی عادی ہوگئی بلکہ Rheuma نے بھی اس کے ساتھ دوستانہ برتاؤ شروع کردیا۔بارہ تیرہ برس علاج معالجہ کے ساتھ آرام سے گزر گئے۔مبارکہ کی علالت اور اپنے شروع میں بیان کردہ خواب کا مزید ذکر ذرا آگے چل کر۔۔۔۔یہاں یادوں کے اس نئے باب کے تناظر میں اپنی پرانی تحریروں کا تھوڑا سا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

بیسویں صدی کے آخری سرے پر لکھی گئی میری یادوں کے باب''دعائیں اور قسمت'' کا اختتام ان دعائیہ الفاظ پر ہوتا ہے۔

''اب یہی دعا ہے کہ ایسی ہی دافع البلیّات دعاؤں کے سائے میں زندگی کا یہ سفر آسانی کے ساتھ،حفاظت کے ساتھ،اور بے حد آرام وسکون اور اطمینان کے ساتھ مجھے اگلی دنیا میں لے جائے۔موت میرے لئے دُکھ کا مُوجب نہیں راحت کا مُوجب بنے۔ہجر کا احساس نہیں بلکہ وصل کا پیغام ہو اور وصل کا راحت بھرا پیغام تو جب بھی آئے،عشّاق کی خوش نصیبی ہوتا ہے۔''

یہ کوئی دنیا کو جتانے یا بتانے کا رویہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے مقابلہ میں موت کے تئیں میرا یہ رویہ میری ابتدائی شاعری سے اب تک کسی نہ کسی رنگ میں آتا چلا گیا ہے۔زندگی اور موت کے معاملہ میں میرا

رویہ میرے مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔مثلاً میرے شعری مجموعوں کی بالکل ابتدائی غزلوں سے لے کر اب تک کی شاعری کے یہ اشعار دیکھیں۔

موت سے پہلے جہاں میں چند سانسوں کا عذاب
زندگی! جو قرض تیرا تھا ادا کر آئے ہیں

دیکھا خلوص موت کا تو یاد آ گیا
کتنے فریب دیتی رہی زندگی مجھے

چلو پھر آنکھیں کرو چار موت سے حیدؔر
پھر آج موت کی آنکھوں میں زندگی بھر دو

زندگی! دیکھ بجھتے ہوئے لوگ ہم
بزمِ جاں میں چمکتے رہے رات بھر

ابھی ممکن ہی نہیں قرض چکانا تیرا
زندگی! قرض ترا ہو گا ادا میرے بعد

موت کی بھی حقیقت انہیں سے کھلی
زندگی کے جو دل میں دھڑکتے رہے

موت کو چھو کے دیکھنا ہے ذرا
زندگی،اپنی دیکھی بھالی ہے

گزشتہ برس میری دو غزلوں میں اس حوالے سے زیادہ کھلا اظہار سامنے آیا:

کفن مرے لیے دامانِ یار ٹھہرے گا

چلوں گا کوچۂ دلدار میں لحد کے لیے

تمام خواہشیں حیدرؔ کبھی کی چھوڑ چکے
کہو تو خود سے بھی اب ہم کنارا کرتے ہیں

ایسے اشعار کے زمانی تسلسل کے درمیان میں کہیں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا جب موت مجھے کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا، زندگی کے ساتھ کچھ دیر کے لیے اُلجھی، مگر پھر خاموشی سے واپس چلی گئی۔اُس وقت کی کیفیات میری تب کی ایک غزل میں موجود ہیں۔

موت آئی ہوئی ہے مجھے لینے کے لیے اور
یہ زندگی پاس اپنے ہی رکھنے پہ اڑی ہے
ہے زندگی و موت میں اک معرکہ برپا
جیتے کوئی، ہم پر یہی اک رات کڑی ہے
دیکھو ہمیں ہم ہنستے ہوئے جانے لگے ہیں
کچھ جان پہ گزری ہے نہ نزع کی تڑی ہے

ہمبرگ کے خالد ملک ساحل صاحب کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے مجھے اپنی بالکل ابتدائی شاعری کے دو شعر یاد آ گئے۔یہ غزل ہفت روزہ مدینہ بہاولپور میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء کے درمیانی عرصہ میں کہیں چھپی تھی، میرے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔لیکن اس کے ان دو اشعار سے موت کے تئیں میرے رویہ اور بالخصوص ابتدائی رویہ کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

کوئی آوارہ ہے یا بھٹکی ہوئی ہے زندگی
موت کی نظروں میں جو کھٹکی ہوئی ہے زندگی
شور سنتے تھے بہت لیکن حقیقت اور ہے
ایک ہی تو سانس پر اٹکی ہوئی ہے زندگی

۲۶ جنوری ۲۰۰۹ء کو میں نے صبح چار بجے کے لگ بھگ ایک خواب دیکھا۔اس میں مجھے تاریخِ وفات ۳؍دسمبر بتائی گئی۔خواب میں سَن نہیں بتایا گیا لیکن بیداری پر مجھے اس کی جو تفہیم ہوئی اس کے مطابق سال ۲۰۰۹ء ہی میں وفات ہو گی۔اس تفہیم کے ساتھ ایک بار پھر غنودگی کی کیفیت ہوئی اور اس

میں یہ قرآنی الفاظ میرے ہونٹوں پر جاری ہوئے: **انی متوفیک**۔یعنی بے شک میں تجھے وفات دوں گا۔

میں نے اسی روز صبح پانچ بجے سبز رنگ کی جلد والی اپنی نوٹ بک کے بائیں جانب اندر کے پہلے صفحہ پر وہ خواب، اور اس کی تعبیر و تفہیم درج کر دی، اپنے دستخط بھی کر دیئے۔اسی روز اپنے چھوٹے بیٹے طارق کو وہ نوٹ بک دکھا کر بتا دیا کہ دسمبر ۲۰۰۹ء میں اگر کچھ رونما ہو جائے تو اس تحریر کو خود بھی پڑھ لینا اور بہن بھائیوں کو بھی پڑھا دینا۔ساتھ ہی اسے کچھ اور ہدایات بھی دیں۔لیکن ہوا یہ کہ طارق نے دو چار دن تک تو صبر سے کام لیا لیکن پھر گھبرا کر اپنی ماں کو اس بارے میں بتا دیا۔مبارکہ کو خواب کی کچھ حقیقت کا اندازہ ہوا تو وہ خود بیمار پڑ گئی۔یہاں تک کہ ۶ فروری کو ایمبولینس بلانا پڑ گئی۔ہفتہ بھر صورتحال اتنی زیادہ نازک رہی کہ ڈاکٹرز نے صاف کہہ دیا کہ ہم اپنی طرف سے بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔بچ جانے کے چانسز ہیں تو سہی لیکن بہت کم۔کیونکہ قوتِ مدافعت کمزور ہوتے ہی Rheuma نے تقریباً تمام مرکزی اعضا پر حملہ کر دیا ہے۔ان آرگنز کو بچانے کے لیے جن دواؤں کو دیا جا سکتا ہے وہ موجودہ صورت میں جتنی مفید رہیں گی، سائڈ ایفیکٹ میں اس سے زیادہ نقصان دہ ہوں گی۔عجیب مشکل اور پیچیدہ صورتحال تھی۔بہر حال دعا اور دوا دونوں کے نتیجہ میں مبارکہ نے ایک مہینہ کے لگ بھگ عرصہ میں بیماری کو کچھ کَور کر لیا۔شیموتھراپی جو کینسر کے مریضوں کے لیے ہوتی ہے، اس کا پانچ فیصد چھ مہینوں میں آزمانے کا طے ہو گیا۔پانچ مہینوں میں مبارکہ اس حد تک صحت یاب ہو گئی کہ مجھے باقاعدہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔کامیاب شوہر بخوبی جانتے ہیں کہ بیوی جب شوہر کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پوری طرح سے صحت یاب ہو چکی ہے۔وگرنہ ناکام و نامراد شوہر تو بیوی سے سرِ عام جوتے یا دھکے کھا کر بھی کچھ نہیں سمجھ اور سیکھ پاتا، البتہ اس کے انجام سے لوگ سبق ضرور سیکھ لیتے ہیں۔

مبارکہ کی حالت سنبھلنے تک ۲۰۰۸ء کے آخر میں دی گئی، میری بائیں آنکھ کے موتیا کے آپریشن کی تاریخ آ گئی۔اطہر خان جیدی جو پاکستانی مزاحیہ ڈرامہ کا ایک معروف نام ہیں، ان کا ایک شعر حسبِ حال ہو گیا۔

ہم نے پھولوں کی آرزو کی تھی
آنکھ میں موتیا اتر آیا

۲؍مارچ کو آپریشن ہوا اور اسی دن مجھے چھٹی بھی مل گئی۔دو تین دن احتیاط سے کام لیا اور

پھر اپنی معمول کی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔کچھ عرصہ کے بعد دوسری آنکھ کے آپریشن کی تجویز دی گئی تھی۔چند مہینوں کے بعد جب اس کی نوبت آئی،دائیں آنکھ کے کنارے پر نیچے کی جانب ایک چھوٹا سا دانہ نکل آیا۔بس اس دانے کے ختم ہونے تک آپریشن موخر کر دیا گیا۔جو تا حال موخر چلا آرہا ہے۔لیکن یہ تاخیر تو بعد کی بات ہے۔فی الحال بات ہو رہی تھی مبارکہ کی اپنی سنگین بیماری کے وار سے بچ کر گھر واپس آجانے کی۔

مبارکہ کا بہتر حالت میں گھر واپس آنا خدا کا بہت ہی خاص فضل تھا۔گردوں کی کارکردگی متاثر ہونے کے باعث اس کے پورے جسم سے پانی رِستا تھا۔خوشی سے بھیگنا اور غم میں آنسوؤں سے بھیگ جانا تو ہماری دنیا میں ہوتا ہے لیکن بیماری سے اس طرح بھیگنا ہمارے ہاں پہلا تجربہ تھا۔جسم بھی کسی حد تک پھول گیا تھا،تاہم تھراپی کرانے کے نتیجہ میں حالت تدریجاً بہتر ہوتی جا رہی تھی۔اس دوران مبارکہ کو نہانے کے لیے تو مدد کی ضرورت نہ ہوتی لیکن نہانے کے بعد کھڑا کرنے اور ٹب میں سے باہر نکالنے میں مجھے بہت زیادہ ہیلپ کرنا پڑتی۔

اپنے افسانہ ''گھٹن کا احساس'' میں ایک بار اپنی بیوی کے ساتھ ہوئی بات کو میں نے یوں لکھا ہوا ہے۔

''نہاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی پوری کمر پر نہیں پھر سکتا تھا۔ماں کا کمر پر صابن مَلنا یاد آتا تو اس کا جی چاہتا کاش ماں زندہ ہوتی اور اب بھی میری کمر پر صابن مَل دیتی۔ایسے ہی خیالوں کے دوران ایک بار اُس نے اپنی بیوی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔اس کی بیوی نہ صرف اس کی ماں کی بھتیجی تھی بلکہ بڑی حد تک اس کی ماں کی ہم شکل بھی تھی۔اس نے اپنی بیوی سے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نہاتے وقت اس کی کمر پر صابن مَل دیا کرے۔اس کی بیوی تھوڑا سا شرمائی پھر کہنے لگی:

''مجھ سے یہ فلموں والے باتھ روم کے سین نہیں ہو سکتے''

وہ بیوی کے جملے پر مسکرایا اور سوچا یہ پگلی کہاں جا پہنچی۔یوں بھی باتھ روم میں اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ وہ بھی میرے ساتھ سما سکتی۔''

اور اب صورت حال یہاں تک آ پہنچی تھی کہ ہم انڈین فلموں کے باتھ روم سے بڑھ کر انگریزی فلموں کے باتھ روم والے سین جیسی صورتحال سے گزر رہے تھے۔مبارکہ کا وزن بہت بڑھ گیا تھا اس لیے اس سین کا مزہ تو کیا لیا جاتا،میرا سانس ہی پھولنے لگتا۔یہ سانس پھولنے کا سلسلہ بڑھا تو ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ڈاکٹر نے ای سی جی تک کے اپنے سارے ٹیسٹ کرنے کے بعد مجھے ہسپتال ریفر کر

دیا۔ہسپتال والوں نے ٹیسٹ کے کئی مراحل سے گزارنے کے بعد بتایا کہ دل کا کوئی وال (شریان) بند ہے۔انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی دونوں کام ایک ساتھ کر دیئے جائیں گے۔اس کے لیے یکم اکتوبر کی تاریخ دے دی گئی۔

انہیں دنوں میں ایک نئی غزل ہوئی،جس کے یہ اشعار جیسے ۳ر دسمبر کے لیے ذہنی تیاری کی غمازی کر رہے تھے۔

دردِ دل کی ہمیں اب کے وہ دوائی دی ہے
اپنے دربار تلک سیدھی رسائی دی ہے
اک جھماکا سا ہوا روح کے اندر ایسے
نوری برسوں کی سی رفتار دکھائی دی ہے
کیسے زنجیر کا دل ٹوٹا یہ اُس نے نہ سُنا
وقت نے قیدی کو بس فوری رہائی دی ہے
اک نئی لمبی مسافت کا زمیں زاد کو حکم
اور اس بار مسافت بھی خلائی دی ہے
جب بھی جانا ہے پلٹ کر نہیں دیکھیں گے کہیں
اپنے اندر سے یہ آواز سنائی دی ہے

اکیس ستمبر کو عید الفطر تھی،عید بہت اچھی گزری۔سارے بچے گھر پر جمع ہوئے۔پانچ بیٹے بیٹیاں،پانچ بہوئیں اور داماد،دس پوتے،پوتیاں اور نواسے۔گھر پر اتنی رونق تھی کہ ہم دونوں تھک گئے۔بائیس ستمبر کو میں ڈٹسن باخ میں خانپور کے زمانے کے ایک دوست وزیر احمد صاحب کو ملنے چلا گیا۔شام کو گھر آیا تو مبارکہ کی طبیعت خراب تھی،بخار ہو گیا تھا۔رات گئے تک بخار میں شدت آ گئی اور صبح تک حالت اتنی بگڑ گئی کہ اس کی لیڈی ڈاکٹر فراؤ ہے نگ (Frau Hennig) کو گھر پر بلانا پڑا۔ڈاکٹر نے مبارکہ کی حالت دیکھتے ہی ایمبولینس منگا لی۔جاتے وقت مبارکہ پر غشی سی طاری تھی۔اسے قریبی شہر ہوف ہائم کے ہسپتال میں لے جایا گیا۔۲۴ تاریخ تک حالت اتنی بگڑ گئی کہ اسے صوبائی صدر مقام ویزبادن کے اس ہسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں پہلے سے اس کا ''روئے ما'' کا علاج چل رہا تھا۔انتہائی نگہداشت والے کمرہ میں جب ہم دیکھنے کے لیے پہنچے تو دل دھک سے رہ گیا۔وہاں کے ڈاکٹرز نے کہا کہ ہم بچانے کی پوری

کوشش کر رہے ہیں لیکن اس طرح کے کیسز میں بچنے کا صرف ایک فی صد چانس ہوتا ہے۔ جو بچہ اندر آتا اور رونے لگتا میں اسے باہر بھیج دیتا۔ رفتہ رفتہ بچوں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا شروع کیا۔

میں تو مستقل طور پر مبارکہ کے سرہانے کھڑا ہوا تھا، بچوں کو دو سے زیادہ تعداد میں آنے کی اجازت نہ تھی۔

جب بھی کوئی بچہ آتا۔ میں پوچھتا یہ کون ہے؟ آواز نہیں آتی تھی لیکن مبارکہ کے ہونٹ اس طرح ہلتے جس سے بچے کا نام ادا ہوتا ہوا پورا سمجھ میں آتا۔ حالت تو غیر ہی تھی لیکن تیسرے دن دو دلچسپ باتیں ہوئیں جس سے مجھے کچھ تسلی ہونے لگی۔ میں نئے کپڑے پہن کر ہسپتال پہنچا۔ مبارکہ نے آنکھ کھولی تو مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔ ''کتھے چلے او'' (آپ کہاں جا رہے ہیں؟)۔ جب بیوی بے ہوشی اور بے خبری کی حالت میں بھی نگرانی کی اس حد تک آجائے تو اسے کون بے ہوش یا بے خبر کہے گا۔

جب سارے بچے باری باری آکر ماں سے مل چکے تو مبارکہ نے دوسری طرف پڑی ہوئی کرسی کی طرف آنکھ سے اشارہ کر کے کہا آپ اب وہاں بیٹھ جائیں۔ مجھے ان دونوں باتوں سے کافی تسلی ہو گئی۔لیکن کمال یہ ہے کہ جب مبارکہ بالکل صحت یاب ہوگئی تو اسے ان باتوں میں سے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ صرف اتنا یاد تھا کہ بچوں کی پرچھائیاں سی دکھائی دیتی تھیں اور بس۔

مجھے اندازہ ہے کہ اصلاً مبارکہ کو اندر سے یہ خوف ہے کہ میں دنیا سے کوچ کرنے والا ہوں۔ فروری والی بیماری کے دوران میں نے اسے بڑے رسان سے کہا تھا کہ مبارکہ بیگم! آپ زیادہ فکر مت کریں، میں پہلے چلا گیا تو جاتے ہی آپ کو بلوا لوں گا۔ آپ پہلے چلی گئیں تو میں بھی زیادہ دیر یہاں نہیں رہوں گا، آپ کے پیچھے پیچھے ہی چلا آؤں گا۔لیکن شاید ہم دونوں کے درمیان اہلِ لکھنو کے ''پہلے آپ۔۔۔۔پہلے آپ'' کے برعکس ''پہلے میں۔۔۔پہلے میں'' کا مقابلہ چلا ہوا ہے۔اس چکر میں شاید موت کا فرشتہ بھی کنفیوز ہو رہا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ پہلے کسے لے جاؤں؟

۲۹ رستمبر ۲۰۰۹ء کو مبارکہ ابھی انتہائی نگہداشت والے روم میں تھی، گردن میں، ہاتھ پر، سینے پر، بازو پر مختلف کنکشنز لگے ہوئے تھے۔ ایک بازو اور ہاتھ کے الٹی طرف ڈرپیں لگانے کے لیے، ایک بازو پر بوقتِ ضرورت ٹیسٹ کرنے کی غرض سے خون لینے کے لیے، گردن اور سینے پر کہیں ڈائلسز کے لیے، کہیں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ کے لیے اور کہیں پتہ نہیں مزید کن کن مقاصد کے لیے کنکشن کی تاریں ہی

تاریں لگی ہوئی تھیں۔ مبارکہ کیا تھی، اچھی بھلی روبوٹ دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے روبوٹ کو بالکل انسان جیسا دکھائی دینے کا تجربہ کر لیا گیا ہو۔ ہم سارے گھر والے اسے دیکھ کر واپس گھر پہنچے۔ چائے بنانے کے لیے کہا، چائے بن کر ٹرے میں ہی چائے کے کپ رکھ کر لائی جا رہی تھی کہ اچانک میری چھ سالہ پوتی ماہ نور کمرے سے باہر کی طرف دوڑ کر گئی اور اپنی چچی کی اٹھائی ہوئی چائے کی ٹرے سے ٹکرا گئی۔ یہ حادثہ ایسے ہوا کہ ساری چائے ماہ نور پر آن گری۔ فوراً ایمبولینس کو بلایا۔ ایمبولینس پہنچی تو انہوں نے حادثہ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ایک اور ایمبولینس بلا لی۔ ہم سمجھے ابھی فرسٹ ایڈ دے رہے ہیں، بعد میں پتہ چلا کہ گھر پر ہی اصل علاج شروع کر دیا گیا تھا۔ معاملہ کی سنگینی کا تب احساس ہوا جب انہوں نے ہیلی کا پٹر بھی منگا لیا۔ ماہ نور اور اس کی امی تسنیم دونوں ہیلی کا پٹر سے من ہائم کے یونیورسٹی کلینک روانہ ہوئے۔ یہ شہر ہمارے شہر سے ایک گھنٹہ کی ڈرائیو پر ہے۔ بچوں کے اس طرح کے جلنے کے علاج کے سلسلہ میں اسے خصوصیت حاصل ہے۔ شعیب اور میں، ہم دونوں کار کے ذریعے من ہائم روانہ ہو گئے۔ من ہائم اور ویزبادن کے دونوں ہسپتال بالکل مختلف سمتوں میں واقع ہیں۔ بہر حال ابھی پہلے بحران سے نکلے نہ تھے کہ دوسرا بحران آ گیا۔ اور تیسرا بحران یکم اکتوبر کو میرے دل کا وال (شریان) کھولنے کی صورت میں پہلے سے طے کیا جا چکا تھا۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ان سارے بحرانوں میں گھرا ہوا تھا اور تب ہی میری گیارہ کتابوں کی کتاب ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کا لائبریری ایڈیشن اور جدید ادب کا جنوری ۲۰۰۹ء کا شمارہ ریلیز ہو چکا تھا۔ اسی دورانیہ کے اندر میں نے ارشد خالد کے عکاس انٹرنیشنل کے نارنگ نمبر کے لیے بنیادی نوعیت کا کام بھی نمٹایا۔ اسی دوران ہی میں نے نہ صرف اپنی کتاب ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' کی بیک وقت ہندوستان اور پاکستان سے اشاعت کو ممکن بنایا بلکہ جنوری ۲۰۱۰ء کا جدید ادب کا شمارہ بھی انہیں ایام میں مکمل کر کے اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ اور اب جبکہ نومبر کے آخری عشرہ کے شروع میں یادوں کا یہ باب لکھ رہا ہوں تو جدید ادب کا اگلے سال جنوری ۲۰۱۰ء کا شمارہ جدید ادب کی ویب سائٹ پر ریلیز کیا جا چکا ہے اور کتابی صورت میں چھپ جانے کی اطلاع بھی آ گئی ہے۔ اور انشاءاللہ نومبر کے مہینے کے اندر ہی کتابی صورت میں ریلیز بھی کیا جا رہا ہے۔ اسی اثناء میں غزلیں، نظمیں بھی تخلیق ہوئیں، ایک نیا افسانہ بھی لکھا گیا، اور اب یادوں کا یہ نیا باب بھی مکمل کر رہا ہوں۔ انہیں ایام کے دوران ہی خدا نے مجھے چوتھا پوتا شیراز حیدر بھی عطا کر دیا۔ یہ شعیب کا دوسرا بیٹا ہے۔

فالحمدللہ علی ذالک!

جب شیراز کی پیدائش ہوئی مبارکہ ہسپتال میں تھی۔ہسپتال سے چھٹی ملتے ہی سب سے پہلے اس ہسپتال میں گئی جہاں شیراز کی پیدائش ہوئی تھی،وہاں پوتے کو دیکھا،چوما،دعا کی اور پھر گھر واپس آئی۔اپنے دو نواسوں اور ایک پوتے کے ختم قرآن کا ذکر یادوں کے ایک باب میں کر چکا ہوں۔اس عرصہ میں مزید پیش رفت یہ ہوئی کہ گزشتہ برس عثمان کے بیٹے اور میرے دوسرے پوتے جہاں زیب نے فروری میں ساڑھے پانچ برس کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا۔اس برس جولائی میں جہانزیب کی بہن علیشا نے پونے پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا۔ماہ نور بھی بیس پارے پڑھ چکی ہے اور اگلے دو تین ماہ تک اس کے ختم شریف کی بھی امید ہے۔سو اپنی ذاتی زندگی کی اس سال کی اچھی خبروں میں ان خبروں کو بھی شمار کرتا ہوں۔ایک بار پھر **شکر الحمدللہ**!

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ویسے تو سارے بچے بہت فرمانبردار اور خیال رکھنے والے ہیں۔ہمارے عمرہ اور حج کی توفیق میں ان کا بھرپور ساتھ شامل رہا ہے۔جب مجھے کسی ذاتی کام کے لیے رقم کی ضرورت پیش آئی اور میں نے تینوں بیٹوں کے ذمہ کچھ رقم لگائی،سب نے وہ رقم فراہم کر دی۔عام حالات کے مطابق میرے کہے بغیر بھی طارق نے دو تین اہم مواقع پر از خود میری ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھے خاصی معقول رقم فراہم کی ہے۔تاہم مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ بڑا بیٹا شعیب ایک عرصہ سے ہر سال ایک معقول رقم خاموشی کے ساتھ ماں کو دے رہا ہے۔مجھے کئی برس کے بعد اب علم ہوا تو میں نے دونوں ماں بیٹے کو نصیحت کی کہ مجھے اس کا علم ہونا چاہیے تھا تاکہ میں تحدیث نعمت کے طور کہیں اس کا ذکر کر دیتا۔خدا کا شکر ہے کہ اب مجھے اس کا ذکر کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

یکم اکتوبر کو میری انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی ہوئی۔ایک سائڈ پر سکرین پر سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔سمندروں ڈوہنگے دل دریا کی گہرائیوں میں تو کئی بار غوطہ زن ہوا ہوں،لیکن اس کی مواجی کا منظر ایک اور طرح سے دیکھ رہا تھا۔دائیں ران سے سوراخ کر کے تار وہاں سے گزارا گیا جو بائیں جانب مقیم دل تک پہنچنا تھی۔تو جناب یہ دل بائیں جانب ہی کیوں ہوتا ہے اور دائیں جانب سے چل کر ہی بائیں جانب والے دل کا علاج کیوں کیا جاتا ہے۔ادب میں دائیں بازو اور بائیں بازو کے مکاتب فکر کی کہانی بھی شاید ران اور دل کے رشتے کی کہانی ہے۔دونوں لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ۔

میں ادب میں دائیں بازو،بائیں بازو والوں کی کارگزاری کے ساتھ مشینوں کی انسان دوستی کا منظر بھی دیکھ رہا ہوں۔علامہ اقبال نے اپنے حساب سے کہہ دیا تھا۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہو رہا ہے۔مشینیں دل کے لیے موت کا نہیں بلکہ حیات کا پیغام بن رہی ہیں۔پیس میکر کی صورت میں دل کا محافظ تو متعارف ہو چکا ہے،حال ہی میں جاپان کے سائنس دانوں نے پلاسٹک کا ایسا دل تیار کیا ہے جو کارکردگی کے لحاظ سے اب تک کے سارے متبادل ذرائع سے زیادہ موثر اور مفید ثابت ہوگا۔

علامہ اقبال کی بعض باتیں آج بھی درست ثابت ہو رہی ہیں،لیکن مشینوں کو دل کے لیے موت قرار دینے کی طرح ان کی بعض باتیں درست ثابت نہیں ہوئیں۔انہوں نے مغربی تہذیب کو للکارتے ہوئے کہا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب نے تب سے اب تک خودکشی نہیں کی،البتہ عالمِ اسلام کے کئی خطوں سے چلتی ہوئی خودکش حملوں کی وبا اب پاکستان کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔میں یہاں کسی موازنۂ مشرق ومغرب میں نہیں پڑ رہا۔بس اتنا سا اشارہ ہی کافی ہے۔بات ہو رہی تھی،جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان کو ملنے والی سہولتوں کی۔میرے لیے آپریشن کا سارا مرحلہ خیر وخوبی کے ساتھ مکمل ہو گیا تھا۔کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔لیکن چند گھنٹوں کے بعد شدید تکلیف اور اضطراب کا سامنا کرنا پڑا۔دائیں ٹانگ کو پٹیوں سے جکڑ دیا گیا تھا اور اگلے چھ گھنٹے تک اس ٹانگ کو ہلانا سختی کے ساتھ منع تھا۔چھ گھنٹے تک ٹانگ کو نہ ہلانے کا احساس اتنا جان لیوا ثابت ہوا کہ میں اس کرب کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔رات مجھے ہسپتال ہی میں گزارنا تھی۔رات کو ساڑھے دس بجے کے قریب دائیں ٹانگ کو جکڑ بندی سے نجات ملی تو میں نے فوراً ہسپتال کی جانب سے پہنایا گیا ملنگوں جیسا چولا اتارا،اپنا لباس پہنا اور چہل قدمی کرتا ہوا ہسپتال سے باہر نکل آیا۔سردی کے باوجود کھلی فضا میں بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔باری باری سارے بچوں کو فون کیا۔سب کو اپنی خیریت سے آگاہ کیا،ان سب کی خیریت دریافت کی۔مبارکہ اور ماہ نور کا حال پوچھا۔گھنٹہ بھر باہر گھومنے کے بعد ہسپتال میں واپس آ گیا۔اگلے دن دوپہر کے بعد مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔اسی دن شام کو مبارکہ سے ملنے گیا۔وہ انتہائی نگہداشت والے روم سے اب درمیانی نگہداشت والے روم میں منتقل ہو گئی تھی۔ہوش میں آ گئی تھی لیکن کوئی جنبش از خود نہیں کر سکتی تھی۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں خود اپنے دل کے معاملے سے نمٹ کر آ رہا ہوں۔ ابھی اسے اپنے بارے میں یا ماہ نور کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ جیسے جیسے مبارکہ روبصحت ہو رہی تھی ویسے ویسے ماہ نور کی حالت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ تو خدا نے اپنے فضل سے محفوظ کر دیا تھا۔ سینے کے بیشتر داغ بھی کم ہو رہے تھے اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ بچی بہت چھوٹی ہے اس لیے ایک سے دو سال تک یہ داغ بھی دور ہو جائیں گے۔

مبارکہ کو جب مختلف کنکشنز سے آزاد کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو جہاں جہاں سے سوئی وغیرہ کو ہٹاتے، وہاں گہرے سرخ داغ نمایاں ہو جاتے۔ تن ہمہ داغ داغ شد والا منظر تھا۔ پنبہ کجا کجا نہم کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک دن کے بعد یہ گہرے سرخ داغ جیسے نیلے سے رنگ میں ڈھلنے لگے اور مجھے پنجابی کا ''تن من نیل و نیل'' یاد دلانے لگے۔ (ویسے کمال ہے کہ ایک مہینہ کے اندر ہی وہ گہرے داغ ایسے ختم ہو گئے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں)۔

۲۳ راکتوبر کو مبارکہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی لیکن اس خبر کے ساتھ کہ ہفتہ میں تین بار ڈائلسز ہوا کرے گا۔ سرکاری طور پر ہی سارا انتظام کیا گیا ہے۔ مقررہ وقت پر ٹیکسی آتی ہے اور گھر سے ہسپتال لے جاتی ہے، چار سے پانچ گھنٹے کے درمیان ڈائلسز کا عمل مکمل ہوتا ہے تو ٹیکسی گھر چھوڑ جاتی ہے۔ مبارکہ کی بیماری، اپنی پوتی ماہ نور کے حادثہ اور اپنے دل کے علاج تک تین چار ہسپتالوں سے واسطہ رہا۔ کہیں بھی امیر یا غریب، جرمن یا غیر جرمن کا فرق دکھائی نہیں دیا، کہیں بھی ہسپتال کے عملہ میں دیکھ بھال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ جو مسیحا نہ مقام تھا ہر جگہ دکھائی دیا۔ انسانی خدمت کا ایسا اعلیٰ معیار کہ سوچنے بیٹھیں تو آنکھیں شکر گزاری سے بھیگ جائیں۔ ہمارے معاشرے کے لوگ اپنی ذہنیت کے مطابق اان کے بارے کیا کچھ باور کرتے ہیں لیکن میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اپنی خدمتِ انسانی کے اعلیٰ ترین معیار کے باعث ان لوگوں نے سچ مچ اپنی جنت کمالی ہے۔

اپنی اس علالت کے نتیجہ میں مبارکہ کا وزن پچاس کلو کے لگ بھگ رہ گیا۔ بیشتر کپڑوں کی نئی فٹنگ کرانی پڑی، چھوٹی بیٹی کا شادی سے پہلے کا ایک کوٹ پورا آ گیا۔ اب بہو بیٹیوں میں حسرت کے ساتھ مبارکہ کو دیکھا جاتا ہے کہ ہائے امی! آپ اتنی سمارٹ ہو گئی ہیں۔

میرے دل کا وال (شریان) ٹھیک کر دیا گیا تھا لیکن سانس پھولنے کی کیفیت نہیں جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اور ہسپتال کے دو معائنوں کے بعد فرینکفرٹ کے یونیورسٹی کلینک کے ریڈیالوجی نیوکلیر

میڈیسن کے شعبہ میں چیک اپ کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ چار گھنٹے طویل دورانیے کا چیک اپ تھا۔ پہلے مرحلہ میں جب مجھے انجکشن لگا کر سائیکلنگ کرائی جا رہی تھی تو ڈاکٹر بار بار پوچھتی تھی کہ دل میں کوئی گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی؟ میں مزے سے سائیکل چلائے جا رہا تھا اور ہر بار بتا رہا تھا کہ دل کو کوئی گھبراہٹ نہیں ہو رہی، البتہ سائیکل چلاتے ہوئے ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔ دوسرے مرحلہ میں جب مجھے لٹا کر اوپر ایک مشین لائی جانے لگی تو شدید گھبراہٹ ہونے لگی۔ میرے دونوں ہاتھ اس طرح سے میرے سر کے نیچے تہہ کر دیئے گئے تھے کہ میں اُٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے کہا میں اپنے جوتے اتارنا چاہتا ہوں، جواب ملا آپ اسی طرح پڑے رہو، ہم خود جوتے اتار دیتے ہیں۔ پندرہ منٹ تک کسی جنبش کے بغیر پڑے رہنا تھا، یہ بھی ٹانگ سیدھی رکھنے جیسا ہی کربناک تجربہ تھا۔ کھجلی جو ویسے کبھی نہ ہوتی تھی اب ہر جگہ ہوئی جا رہی تھی لیکن کہیں بھی کھجانے کی اجازت نہ تھی۔ بہر حال پندرہ منٹ کے بعد اس مشکل سے نجات ملی۔ ایک وقفہ کے بعد جب ایک بار پھر یہی معائنہ دہرایا گیا تو پھر میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا تھا۔ دوسری بار یہ معائنہ بخیر و خوبی مکمل ہو گیا۔ سارے چیک اپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزید دو وال بند پائے گئے۔ اور اب ایک بار پھر آپریشنل پراسیس سے گزرنا ہوگا۔ گھر آ کر میں نے مبارکہ سے پنجابی میں کہا کہ ''سِر تے اک وال نئیں ریہا، تے اے ہن دل دے والاں دے دوالے ہو گئے نیں''۔ بہر حال ۳ نومبر کو ایک بار پھر دل کی انجیوگرافی اور انجیو پلاسٹی ہونا قرار پائی۔

میں اپنے دوست احباب کو بتا رہا تھا کہ زندگی بھر جنہیں دل کھول کر دکھانے کی حسرت رہی وہ تو پوری نہیں ہوئی، لیکن یہ لوگ نہ صرف دل میں جھانکتے رہتے ہیں بلکہ جب جی چاہتا ہے اسے کھول کر دیکھ بھی لیتے ہیں، بلکہ بار بار دیکھتے جا رہے ہیں۔ بہر حال ۳ نومبر کو یہ مرحلہ بھی خیر و خوبی سے گزر گیا۔ رات کو چھ گھنٹے سیدھے لیٹے رہنے اور دائیں ٹانگ کو بالکل نہ ہلانے کی ہدایت پر عمل کے لیے میں اس بار ذہنی طور پر تیار تھا۔ میں نے نیند کی گولی کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر نے ڈرپ میں ہی ہلکی سی مقدار میں دوا دے دی۔ اس سے نہ تو گہری نیند آئی اور نہ ہی بے چینی والی بیداری رہی۔ نیم خوابی کی سی کیفیت تھی۔ سو اس بار زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ جب پٹی کھولی گئی تو میں اطمینان اور آرام کے ساتھ اُٹھا۔ ہسپتال والوں کا ملنگوں والا چولا اتارا، اپنا لباس پہنا اور اس بار اپنے وارڈ کے باہر لان میں کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ہسپتال سے باہر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دوسرے دن معمول کے مطابق چھٹی مل جانی تھی لیکن ایک مہینے میں دوسری بار اس مرحلہ سے گزرنے

کے باعث مجھے احتیاطاً ایک دن کے لیے مزید روک لیا گیا۔۵ر نومبر کو چھٹی دی گئی اور میں مزے مزے سے گھر پہنچ گیا۔

پہلی بار آپریشن وارڈ سے جنرل وارڈ تک پہنچا تھا تو طارق، نازیہ اور شایان فوراً ہسپتال پہنچ گئے تھے۔اب دوسری بار جنرل وارڈ میں پہنچا تو مبارکہ، طارق، نازیہ اور شایان کے ساتھ پہنچ گئی تھی۔دوسرے دن جب چھٹی نہیں ملی تو مبارکہ، شعیب اور عثمان ایک ساتھ ملنے آگئے۔اب عمر کے اس حصے میں اور بیماریوں کی اس یلغار میں مبارکہ اور میں ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔بعض عزیز اور دوست احباب ہم دونوں کی خیریت دریافت کرنے لگے تو میں نے کہا ہم دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی دیکھ ریکھ کرتے رہتے ہیں ۔مثلاً میں مبارکہ سے کہتا ہوں آپ آرام سے بیٹھیں، میں چائے تیار کر کے لاتا ہوں۔مبارکہ جواباً کہتی ہے نہیں آپ آرام سے بیٹھیں میں چائے تیار کر کے لاتی ہوں۔ہم دونوں کا جذبہ دیکھ کر چائے کہتی ہے آپ دونوں آرام سے بیٹھیں میں خود ہی تیار ہو کر آجاتی ہوں۔

۱۹ر نومبر ۲۰۰۹ء کو ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ سانس پھولنے کا مسئلہ جوں کا توں ہے،تو اس نے کہا کہ ایک بار پھر انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کے مراحل سے گزرنا ہوگا۔میں نے کہا ۳ر دسمبر کے بعد کی کوئی تاریخ طے کر لیں۔تب تک خواب کی تعبیر نہ آئی تو پھر جیسے چاہیے ہمارے دل پر مشقِ ناز فرمائیے۔

جب میرے ۳ر دسمبر والے خواب کی بات گھر کے تقریباً سارے افراد تک پہنچ گئی تو میں نے مناسب سمجھا کہ خوابوں اور ان کی تعبیروں سے دلچسپی رکھنے والے بعض خاص دوستوں کو بھی خواب بتا دیا جائے۔اس سلسلہ میں ہالینڈ سے جمیل الرحمٰن، انگلینڈ سے نصیر حبیب اور جرمنی سے خالد ملک ساحل تین دوستوں کا بطور خاص حوالہ دوں گا۔خالد ملک ساحل صاحب اتنے رقیق القلب نکلے کہ مجھے لگا میری فوتگی پر وہ جس طرح رونے لگیں گے، انہیں دلاسہ دینے کے لیے شاید مجھے خود ہی اٹھ کر انہیں چپ کرانا پڑے گا۔تاہم انہوں نے تعبیر یہ کی کہ ۳ر دسمبر سے آپ کی زندگی میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا، جس میں روحانی پہلو زیادہ ہوگا۔لگ بھگ اسی انداز کی بات نصیر حبیب صاحب نے ہنستے ہنستے اور بعض رنگین اشارے دے کر کر دی۔جمیل الرحمٰن سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ۳ دسمبر کی تاریخ کو ایک طرف رکھیں۔اور انّی متوفّیک کے اعداد نکالیں۔ اعداد نکالے تو ۹ نکلے۔میں نے کہا اب تو بات واضح ہوگئی کہ ۲۰۰۰ کی صدی میں ۲۰۰۹ ایک بار ہی آنا ہے۔اس کی دوسری تاویل کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ

۲۰۰۹ء سے اگلے نو برس تک زندگی رہے گی اور ۲۰۱۸ء میں وفات ہوگی۔اس پر جمیل الرحمٰن نے کہا کہ میرے حساب سے ۲۰۱۶ء کا سال نکلتا ہے۔کیونکہ ۲۰۱۶ کے اعداد نو نکلتے ہیں۔میں نے کہا کہ ہاں یہ بھی قرینِ قیاس ہے۔جب مبارکہ کو اس حساب کتاب کا علم ہوا تو کہنے لگی کہ ۲۰۲۵ء اور ۲۰۳۴ء کے اعداد بھی تو نو ہی نکلتے ہیں۔میں نے کہا کہ صرف ۲۰۳۴ تک ہی کیوں پھر ۲۰۵۲ء کر لیں۔اس کا عدد بھی ۹ نکلتا ہے اور میری زندگی کی سنچری بھی پوری ہوتی ہے۔۹ کے پھیر میں جمیل الرحمٰن نے ڈال دیا ہے ورنہ خواب سیدھا سادہ ۳ر دسمبر ۲۰۰۹ء سے متعلق ہے۔پورا ہو گیا تو بھی ٹھیک اور پورا نہ ہوا تو بھی خیر۔۔۔لیکن نو کے عدد سے تاویل و تعبیر کا ایک طویل تر سلسلہ بنتا جا رہا ہے۔اتنی تعبیریں یکجا ہوتی گئیں تو میرا بے چارہ خواب اپنی موت آپ مر جائے گا۔شاید دوستوں نے مجھے بچانے کے لیے یہی ترکیب نکالی ہو کہ اتنی تعبیریں اور تاویلیں جمع کر دو کہ سب کچھ خلط ملط ہو جائے۔کثرتِ تعبیر کے ہاتھوں خواب کے انجام سے مابعد جدید والوں کا ڈھکوسلہ بھی مزید سمجھ میں آتا ہے۔لیجیے صاحب معنی کو ہمہ وقت ملتوی کراتے رہیے، موت سے جان بچاتے رہیے، لیکن تا بہ کے!

میں نے اپنی یادوں کے باب ''دعائیں اور قسمت'' میں بڑی وضاحت سے لکھا تھا:

''چند قرآنی اور مسنون دعائیں مجھے بچپن میں رٹا دی گئی تھیں۔ان کی بھی ایک اہمیت ہے لیکن میں جب کسی دُکھ کی حالت میں ہوتا ہمیشہ اپنی زبان میں خدا سے دعا کرتا۔بہت بار ایسا تجربہ ہوا کہ میں نے دعا کی اور اسی حالت میں مجھے دعا کی قبولیت کا یقین بھی ہو گیا۔جب بارہا ایسا ہوا تو میں نے اپنے بعض قریبی عزیزوں کو اس بارے میں بتایا۔اس بتانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو دعا بظاہر قبول ہو چکی تھی' ایک لمبے وقفہ تک معلّق ہوگئی۔دو تین بار ایسے جھٹکے لگنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ قبولیت دعا کا نشان تو خدا کے مامورین اور اولیاء کے لئے مخصوص ہے۔میری کسی بھی دعا کا قبول ہونا میرا انفرادی معاملہ ہے۔اگر میں اسے دوسروں کو بتاؤں گا تو مقامِ ولایت پر قدم رکھنے جیسی جسارت کروں گا' جس کا میں اہل ہی نہیں۔سو اسی لئے وہ دعائیں جن کی قبولیت کے بارہ میں دوسروں کو بتا دیتا ہوں' لمبے عرصہ کے لئے ردّ و قبول کے درمیان معلّق ہو جاتی ہیں اور یہی میرے افشاء کی سزا ہوتی ہے۔

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک نہ مستجاب ہوئے ''

اپنے خواب اور غنودگی کی حالت میں قرآنی الفاظ کے زبان پر جاری ہونے کے تجربہ کو قبولیت دعا

سے ملتا جلتا یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ قرار دیا جا سکتا ہے۔تو میں نے جو اسے مقررہ وقت آنے سے پہلے اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں میں اتنا زیادہ بتا دیا ہے تو کہیں لاشعوری طور پر میں نے یہی تو نہیں چاہا کہ تین دسمبر کا سن سچ مچ معلق ہو جائے۔اور چاہے پھر بعد میں تاریخ بھی ادل بدل ہو جائے۔بظاہر ایسا نہیں ہے لیکن انسانی لاشعور کا کیا کہا جا سکتا ہے۔یوں بھی دل دریا سمندروں ڈونگھے۔مجھے موت کے سلسلہ میں صرف ایک خواہش شدت کے ساتھ رہی ہے کہ جب بھی آئے بہت آرام سے آئے۔جیسے ہلکی سی اونگھ میں گہری اور میٹھی اونگھ آجائے اور میں اسی میٹھی اونگھ میں آگے نکل جاؤں۔روح اور جسم کے حوالے سے میں اپنی بساط کے مطابق کافی کچھ لکھ چکا ہوں۔یہاں اپنی سوچ میں ہوئی پیش رفت کا ہلکا سا ذکر بھی کر دوں۔جسم اور روح لازم وملزوم ہیں۔جسم کے اندر ہی کہیں کوئی مین سوئچ ہے (جسے ابھی جدید سائنس دریافت نہیں کر پائی)۔وہ مین سوئچ آف کر دیا جاتا ہے تو ہم مر جاتے ہیں۔جسم سے گہرے اور مستقل ربط کے باوجود مجھے روح کی ایک حد تک الگ حیثیت کا بھی پرچھائیں جیسا ادراک ہوتا ہے۔اس سے جسم کی نفی نہیں ہوتی لیکن روح جسم کے ساتھ اس سے سوا بھی ہے۔مثال کوئی بہت واضح نہیں ہے لیکن اسے کسی حد تک اور محض مثال کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔سیٹلائٹ سے جو پروگرام نشر کیے جا رہے ہیں، وہ اپنے اظہار کے لیے ٹی وی سیٹ کے محتاج ہیں۔ٹی وی کے بغیر وہ خود کو ظاہر نہیں کر سکتے، یوں ٹی وی اور سیٹلائٹ سے آنے والے پروگرام میں گہرا ربط ہے۔تاہم ٹی وی کے بغیر بے شک وہ پروگرام خود کو ظاہر نہ کر پائے لیکن وہ یہیں کہیں موجود تو ہوتا ہے۔میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر میرے لیے بہت سا مزید غور وفکر کا سامان موجود ہے۔تاہم اس سے روح اور جسم کے لازم وملزوم ہونے کے اس تصور کی نفی نہیں ہوتی جو میں اپنی یادوں کے باب ''روح اور جسم'' میں بیان کر چکا ہوں۔یہ نئی سوچ دراصل اسی سوچ کی محض توسیع اور اسی کے اندر ایک نئے زاویے کی دریافت کا احساس دلاتی ہے۔

بہر حال دوستوں کی تعبیروں کو بھی ایک حد تک مدنظر رکھا جائے تو اب تین امکانات ہیں، اسی سال ۲۰۰۹ء کے ۳ دسمبر کو مجھے بارگاہِ الٰہی سے بلاوا آجائے۔یا پھر ۲۰۱۶ء یا ۲۰۱۸ء تک اسے موخر سمجھا جائے۔ذاتی طور پر میرے دامن میں حبّ رسولؐ کے طور پر کچھ بھی خاص نہیں ہے۔ایک ہلکا سا احساس اور بس۔میں نے ایک عرصہ پہلے سے یہ خواہش کر رکھی ہے کہ میرے پاس نذر گزارنے کو اور کچھ بھی نہیں ہے سوا اپنی عمر کا نذرانہ بارگاہِ رسالت میں پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ میری عمر ۶۳ برس سے تجاوز نہ کرے، اس کے اندر ہی اندر کہیں بھی مکمل ہو جائے۔

بلاشبہ زندگی خدا کا عطا کردہ بہت بڑا انعام ہے، اس کے لیے خدا کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔موت بھی برحق ہے، خدا جب چاہے بلا لے، میں اس کے لیے بھی ہمیشہ اس کی رضا پر راضی اور کوچ کے لیے کمر بستہ ہوں۔بس اپنی عمر کے ۶۳ برس سے تجاوز نہ کرنے کی خواہش کے پیش نظر مجھے ۲۰۱۶ء یا ۲۰۱۸ء کے مقابلہ میں ۲۰۰۹ء کا سال ہی زیادہ مناسب لگ رہا ہے۔آگے جو اس کی مرضی!

۳ دسمبر ۲۰۰۹ء والی تعبیر سچ ثابت ہوگئی تو اس لیے بھی خوشی ہوگی کہ یادوں کا یہ باب چھپتے وقت پورا باب بزبانِ حال کہہ رہا ہوگا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

خواب کی تعبیر کچھ اور ہوئی یا سارا خواب ہی غلط ہو گیا تو پھر ۴ر دسمبر کو ایک دو سطروں کا اضافہ کر کے یہ باب مکمل کرلوں گا۔

وماتوفیقی الا باللہ!

(یہ تحریر میں نے ۲۳ر نومبر ۲۰۰۹ء کو مکمل کر لی تھی۔آج ۲۶ر نومبر تک اس میں ہلکے پھلکے اضافے کیے اور آج ہی ان احباب کو ای میل سے یہ فائل بھیج رہا ہوں: شمس الرحمٰن فاروقی (الٰہ آباد)، محمد عمر میمن (امریکہ)، شمیم حنفی (دہلی)، ڈاکٹر علی جاوید (دہلی)، منشا یاد (اسلام آباد)، ایوب خاور (کراچی) ڈاکٹر صغریٰ صدف (لاہور)، جمیل الرحمٰن (ہالینڈ)، خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ)، خالد ملک ساحل (جرمنی)، شبانہ یوسف (انگلینڈ)، ارشد خالد (اسلام آباد)، احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)، سلیمان جاذب (دبئی) ۔ح۔ق)

۲۸ نومبر کو یہ فائل سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)، عبداللہ جاوید اور شہناز خانم عابدی (کینیڈا) کو بھی بھیج دی گئی۔

۴ر دسمبر کو لکھا جانے والا اضافی نوٹ:

اس وقت جرمنی کے وقت کے مطابق رات کے بارہ بج کر سات منٹ ہو چکے ہیں،

۳ردسمبر ۲۰۰۹ء گزر چکا ہے، ۴ردسمبر کا دن شروع ہو چکا ہے۔ ویسا کچھ نہیں ہوا جیسا میں سمجھ رہا تھا۔ لیکن منشایاد کے افسانہ ''بیک مرر'' کے اختتام کے مطابق ایسا ہو تو سکتا تھا۔ (ح۔ق)

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ جنوری ۲۰۱۰ء

جدید ادب جرمنی۔ شمارہ: جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء

زندگی دَر زندگی

یادوں کے گزشتہ باب **لبیک اللھم لبیک** کی اشاعت کے بعد میرے قریبی دوست احباب نے میرے ۲۶ جنوری ۲۰۰۹ء والے خواب اور اس کی ممکنہ تعبیر کے سلسلے میں مزید اپنی اپنی رائے سے نوازا ہے۔ بعض تاثرات دوستوں اور بزرگوں کی محبت یا ہمدردی پر مبنی ہیں۔ بعض تاثرات میں خواب کو واہمہ جیسا سمجھا گیا ہے اور مجھے بھی یہی باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی (الٰہ آباد)، محمد عمر میمن (امریکہ)، شمیم حنفی (دہلی)، ڈاکٹر علی جاوید (دہلی)، اشعر نجمی (تھانے)، سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)، منشایاد (اسلام آباد) وغیرہ اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ البتہ ان میں سے منشایاد نے تو کسی حد تک غصہ کر کے میری توجہ موت کے احساس سے ہٹانا چاہی جبکہ شمیم حنفی نے میری تحریر کو ادبی طور پر بہت پسند کرتے ہوئے مجھے مزید لکھنے کی تحریک کی۔ ایوب خاور (کراچی)، خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ)، شبانہ یوسف (انگلینڈ)، ارشد خالد (اسلام آباد)، عبدالرب استاد (گلبرگہ)، احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)، عظیم انصاری (کلکتہ) ان احباب نے تو بہت زیادہ جذباتی جوش کے ساتھ میرا خیال رکھا۔ ان میں سے بیشتر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پروین شیر (کینیڈا)، شہناز خانم عابدی (کینیڈا)، ڈاکٹر صغریٰ صدف (لاہور)، سلیمان جاذب (دبئی)، بشریٰ ملک (جرمنی) وغیرہ احباب جیسے درازیٔ عمر کی دعا میں مشغول ہو گئے۔ جوگندر پال جی کا ٹیلی فون آ گیا، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میرا حوصلہ بڑھاتے رہے، تحریر کی سچائی پر داد دیتے رہے۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ آپ کے ''خود وفاتیہ'' طرز کی تحریر ہے، کہنے لگے: تمہاری واردات بہت گاڑھی ہے۔ بعض احباب نے خواب کا غلط ہونا قرار دیا ہے تو بعض نے اس کی تاویل کر کے تعبیر کسی اور زاویے سے دیکھی ہے۔ مذکورہ بالا احباب کے تاثرات اگر یکجا کرنے بیٹھوں تو پورا ایک باب بن جائے گا، لیکن ظاہر ہے وہ سارا میٹر ان کی میرے تئیں محبت اور ہمدردی کا غماز ہے اس لیے اسے یہاں درج کرنے کی بجائے ذاتی ریکارڈ میں ہی سنبھال رکھتا ہوں۔

تین تاویلیں ایسی ہیں کہ میں انہیں یہاں درج کرنا چاہوں گا۔ میرے ماموں صادق باجوہ کا کہنا

ہے کہ خواب میں موت سے مراد لمبی عمر ہے۔ میرے خیال میں خواب میں کسی زندہ انسان کی موت کی خبر ملنا یا اسے مردہ دیکھنا تو اس کی لمبی عمر کی علامت ہو سکتی ہے لیکن اس طرح معین تاریخ وفات کی خبر سے مراد لمبی عمر شاید نہیں بنتی۔ باقی واللہ اعلم۔

کینیڈا سے عبداللہ جاوید صاحب کی تاویل مجھے مزے کی لگی۔ ان کے بقول: جیسے کسی بچے کو کسی شرارت یا کام سے روکنے کے لیے کسی تاریک کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول کر دکھایا جائے اور پھر دروازہ بند کر کے بچے کو ڈرایا جائے کہ اگر تم شرارت سے باز نہ آئے تو تمہیں اس کمرے میں بند کر دیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح ۳ دسمبر کی تاریخ بتا کر اللہ میاں نے موت کے تاریک دروازے کا ڈراوا دیا تھا۔ لیکن یہ ضدی بچہ شرارت کو چھوڑ کر دروازے کے اندر میں دلچسپی لینے لگا۔ دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا کہ شرارت ورارت کا معاملہ چھوڑیں یہ دروازہ کھولیں مجھے اس کمرے میں جانا ہے۔ دیکھوں تو سہی اندر کیا ہے۔ جب دروازہ نہیں کھلا تو ۲۶ نومبر آنے تک اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا، اور پھر ۲۶ نومبر سے ۳ دسمبر تک اس بچے نے دروازہ کھٹکھٹانا اور شور مچانا جاری رکھا۔

ایک طرف تعبیر و تاویل کا یہ سلسلہ تھا دوسری طرف بعض دوستوں کا کہنا تھا کہ خواب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس پر میری اہلیہ مبارکہ نے بڑی انوکھی نشان دہی کی۔ مبارکہ کی تاویل بیان کرنے سے پہلے دو وضاحتیں کر دوں۔ پہلی وضاحت: اپنے قریشی ہونے کی نسبت سے، اپنی تمام تر کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود میں خود کو ہمیشہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی آل میں شمار کرتا ہوں۔ مجھے گہرا احساس ہے کہ روحانی سطح پر مجھ خاک کی اُس عالمِ پاک سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ پر کچھ ہے تو سہی۔ دوسری وضاحت: خواب کی تعبیر و تاویل میں جو ایک مماثلت کا بیان آگے آنے والا ہے، وہ صرف خواب کی تفہیم کے سلسلہ میں ایک مثال کے طور پر ہے، وگرنہ میں ابراہیمی سمندر کے سامنے ایک قطرہ اور صحرا کے سامنے ایک ذرہ جتنی وقعت کا بھی حامل نہیں ہوں۔ یہ وضاحت اس لیے نہیں کر رہا کہ کوئی مذہبی انتہا پسند میری بات سے کوئی اشتعال انگیزی نہ کر گزرے۔ بلکہ اس لیے کر رہا ہوں کہ اس اظہار کے نتیجہ میں کہیں میرے اپنے اندر کوئی فتور نہ آجائے۔ بس میری یہ تحریر مجھے میری اوقات کا احساس دلاتی رہے۔

ان وضاحتوں کے بعد مبارکہ کی بیان کردہ تعبیر و تاویل پیش کرتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ انہوں نے بیٹے کو اپنا خواب بتایا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً خواب کو پورا کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اب

صورتحال یہ بنی کہ باپ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے اور بیٹا قربان ہونے کو تیار ہے۔ جب خدا نے دیکھا کہ باپ بیٹا دونوں اس کی رضا پر راضی اور اس کے حکم کی تعمیل پر کمر بستہ ہیں تو قربانی کے حکم کے باوجود ذبح کرنے سے روک دیا گیا اور خواب کی تعبیر مینڈھا بھیج کر پوری کر دی گئی۔ یوں خواب دوسرے رنگ میں پورا ہو گیا۔

میرے خواب میں ایک معیّن تاریخ وفات کی خبر کے بعد میری طرف سے ایک لمحہ کے لیے بھی موت کا ڈر یا خوف پیدا نہیں ہوا۔ اسی برس پے در پے دہلا دینے والے سانحات نے بھی مجھے کسی یاس انگیز کیفیت میں نہیں جانے دیا۔ **لبیک اللھم لبیک** میں جتنا میں ہشاش بشاش ہوں اتنا ہی میں گزشتہ برس اپنی زندگی میں ہشاش بشاش رہا اور ۳ دسمبر کا وعدۂ وصل کی طرح انتظار کرتا رہا۔ میری اس کیفیت کو میرے وہ تمام عزیز اور احباب بخوبی جانتے ہیں جو گزشتہ برس میرے ساتھ مسلسل رابطہ میں رہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس خدا نے یہ خواب دکھایا تھا اور جو ہمارے دلوں کے بھید ہم دل والوں سے بھی زیادہ جانتا ہے، وہ بخوبی جانتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں کس حد تک راضی برضا ہو گیا تھا۔ سو موت کی خبر پا کر اس کے لیے کسی خوف کے بغیر آمادہ ہو جانے کی سال بھر کی کیفیت کو دیکھ کر میرے خدا نے بھی ۳ دسمبر کی تعبیر کسی اور رنگ میں بدل دی۔ کس رنگ میں بدلی؟ یہ ابھی تک مجھے بھی علم نہیں ہے۔

کچھ عزیزوں نے کہا کہ اللہ کے نیک بندوں پر بیماریوں کی یلغار کی صورت میں ابتلا اور آزمائش آتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ میں ان بلاؤں کے آنے پر شاکی نہیں ہوں لیکن خدا کی قسم میں اللہ کا نیک بندہ نہیں ہوں، اس کا گنہگار بندہ ہوں۔ ایک کرم فرما نے فرمایا کہ یہ گناہوں کی سزا ہے۔ میں نے کہا میری گناہوں کے سلسلہ میں اپنی ایک سوچ ہے۔ میں تکبر، رعونت، فرعونیت خواہ وہ کسی صورت میں ہو اس لعنت سے ہمیشہ بچتا ہوں۔ ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ مجھ سے کسی کی بے جا تذلیل نہ ہو جائے۔ کسی کی زیادتی کا بدلہ ضرور لیتا ہوں لیکن اس زیادتی کے برابر، پوری طرح ناپ تول کر۔ میرے نزدیک تکبر، رعونت اور فرعونیت چاہے کسی رنگ، روپ اور بہروپ میں ہو۔۔ سب سے بڑا گناہ ہے۔ ریاکاری والی انکساری بھی ایسا ہی بہروپ ہے جس کے عقب میں تکبر موجود ہوتا ہے۔ سو میں ان سب کے ارتکاب سے ہمیشہ بچتا رہا ہوں اور بچنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اس گناہِ عظیم سے ہٹ کر جہاں تک بشری کمزوری والے گناہوں کی سزا کی بات ہے تو اگر یہ بشری کمزوری والے گناہوں کی سزا ہے تو بہت کم ہے، بہت ہی کم ہے ، اتنی کم ہے کہ سزا لگتی ہی نہیں کیونکہ بشری کمزوریوں والے میرے گناہ تو بے شمار ہیں۔

دسمبر ۲۰۰۹ء گزر گیا تو نئے سال کا استقبال اپنے معمول کے مطابق کیا۔ پاکستان سے ہی میرا معمول رہا ہے کہ میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ کسی چھوٹے سے کمرے میں بند ہو کر مصلیٰ بچھا لیتا ہوں۔ گزرے ہوئے سال کا ایک جائزہ اپنے اندر لیتا ہوں۔ کہیں استغفار کرتا ہوں تو کہیں شکر گزار بنتا ہوں۔ آنے والے سال کے سلسلہ میں اپنی دعائیں بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہوں۔ سوا بارہ بجے تک یا ساڑھے بارہ بجے تک میں اسی طرح نئے سال کا استقبال کرتا ہوں۔ اسے میں اللہ میاں سے اپنی سالانہ ملاقات بھی سمجھتا ہوں۔

۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کا جو مرحلہ ملتوی کر دیا گیا تھا وہ گیارہ جنوری ۲۰۱۰ء کو ہونا طے پایا۔ گیارہ جنوری کو انجیو گرافی کی گئی لیکن کسی ٹیکنیکل مسئلہ کی وجہ سے انجیو پلاسٹی کو ملتوی کر دیا گیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے دو گھنٹے تک زیرِ نگرانی رکھنے کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ انجیو پلاسٹی کے لیے ۲۱ جنوری کی تاریخ طے کر دی گئی۔ مجھے ایک دن پہلے یعنی ۲۰ جنوری کو ہسپتال میں آ کر داخل ہونا تھا۔ سو ۲۰ جنوری کو ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ انٹرنیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جب گھر سے روانہ ہوا، اور وہاں سے سیدھا ہسپتال پہنچا۔ ایک کوئے یار سے دوسرے کوئے یار میں آ نکلا۔ منجھلا بیٹا عثمان مجھے ہسپتال تک پہنچا گیا تھا۔ بار بار آنے جانے کی وجہ سے بادزودن ہسپتال کے کارڈیو ڈیپارٹمنٹ میں اب کافی جان پہچان ہو گئی ہے۔ پہلی منزل پر کمرہ نمبر ۹ میں میرا بیڈ تھا۔ پہلے نرس آئی اور شوگر، بلڈ پریشر وغیرہ چیک کر گئی۔ پھر نیپالی ڈاکٹر مایا آئی۔ اس نے سر سے معائنہ شروع کیا۔ آنکھ، منہ اور گلے کو ٹٹول کر چیک کرتے ہوئے جب پیٹ تک آئی تو پیٹ کو دباتے ہوئے پوچھنے لگی کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی؟ میں نے کہا صرف گیس کی تکلیف ہے۔ ڈاکٹر تھوڑا سا مسکرائی۔ پھر پیٹ کے دائیں بائیں جانب سے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دباتے ہوئے پوچھا درد تو نہیں ہو رہی؟ میں نے کہا گدگدی ہو رہی ہے۔ وہ ڈاکٹر جو ابھی تک مسکراہٹ میں بھی سنجیدگی ظاہر کر رہی تھی، اب زور سے ہنسنے لگی، گویا میرے حصے کا بھی ہنس دی۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر چہل قدمی کے لیے نکلا۔ پھر اپنے کمرے اور وارڈ سے باہر لگی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات کو گھر والوں سے بات ہوئی۔ پھر ایک غزل شروع ہو گئی۔ رات گیارہ بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

۲۱ جنوری کو فجر کی نماز سے فارغ ہوا تو ٹیپو آ گیا۔ میرے استعمال کی چند چیزیں جو گھر پر رہ گئی تھیں دینے آیا تھا۔ وہیں سے پھر اپنی جاب پر چلا گیا۔ صبح ناشتہ سے پہلے میری شوگر ۱۶۹ تھی۔ ناشتہ کے بعد یکدم

۳۶۹ ہو گئی۔ اس پر فوراً انسولین کا ٹیکہ لگایا گیا۔ ٹیکہ لگوا کر میں اپنے کاغذ قلم لے کر لابی میں چلا گیا۔ (لیپ ٹاپ کی سہولت ہوتی تو کاغذ قلم کی ضرورت نہ پڑتی) شام کو ساڑھے چار بجے انجیو پلاسٹی کا وقت طے تھا۔ اس دوران مبارکہ سے فون پر بات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ کل رات کو کینیڈا سے پروین شیر نے فون کر کے خیریت دریافت کی تھی۔ آج دن میں ارشد خالد اور نذر خلیق کے فون آئے تھے اور دونوں خیریت دریافت کر رہے تھے۔ مبارکہ کے فون کے بعد اپنے اپنے گھر سے سارے بچوں نے بھی فون کر کے خیریت دریافت کی۔

آج ڈاکٹر ویسنا چیک اپ کے لیے آئیں۔ ٹمپریچر، نبض، بلڈ پریشر سب نارمل تھے۔ بلڈ پریشر ۸۰-۱۴۰ تھا۔ ڈاکٹر ویسنا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے بیڈ پر بہت زیادہ جھک آئی تھیں، شاید اسی لیے بلڈ پریشر ۱۲۰ کی بجائے ۱۴۰ ہو گیا تھا۔ بہرحال سب کچھ کنٹرول میں تھا۔ شام کو انجیو پلاسٹی بھی ہو گئی۔ اپنے کمرے میں آ گیا اور ٹانگ سیدھی رکھنے والی تکلیف کا مرحلہ بھی نسبتاً آسانی سے گزر گیا۔ ۲۲ جنوری کو صبح سویرے میرا ای سی جی ٹیسٹ ہوا۔ رپورٹ اطمینان بخش تھی۔ اسی روز میں نے دو غزلیں کہیں۔ شام تک مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

۱۸ فروری کو چیک اپ ہوا۔ اس کے بعد ۱۲/اپریل کو پھر معائنہ کیا گیا۔ یہ معمول کے چیک اپ ہیں۔ ہماری بیماریوں کے معاملہ میں ہم سے زیادہ ان لوگوں کو فکر رہتی ہے۔ اسی دوران میری پوتی ماہ نور نے بھی قرآن شریف ختم کر لیا۔ ۲۶ فروری کو اس کی آمین کی تقریب ہم سب نے اہتمام کے ساتھ کی۔ اب تک میرے دونواسوں مشہود (رومی) اور مسرور (جگنو) نے، دو پوتوں شہریار (شہری) اور جہاں زیب (سونو) نے اور دو پوتیوں ماہ نور (ماہا) اور علیشا (ایشا) نے قرآن شریف پڑھنا سیکھ لیا ہے اور ان سب کی تقریب آمین ہو چکی ہے۔ یہ ان بچوں کی ماؤں کا اعزاز ہے کہ انہوں نے جرمنی میں رہتے ہوئے بھی بچوں کو اوائل عمری میں ہی نہ صرف قرآن شریف پڑھنا سکھا دیا بلکہ اس کی تلاوت کی عادت بھی قائم کر رہی ہیں۔ **فالحمد و للہ!**

مبارکہ کا ہفتہ میں تین بار ڈائلسز کا سلسلہ جاری ہے اور اب ایک طرح سے معمولاتِ زندگی میں شامل ہے۔ ۱۶، ۱۷/اپریل کی درمیانی رات اسے بے چینی ہونے لگی۔ شوگر اور بلڈ پریشر چیک کیے تو سب نارمل تھے البتہ نبض کی رفتار مدھم تھی۔ ۴۰ سے ۴۳ کے درمیان۔ دو اڑھائی گھنٹے اپنے ٹوٹکے کرنے میں گزار دیئے۔ صبح ساڑھے پانچ بجے بڑے بیٹے کے گھر فون کیا۔ تسنیم سے بات ہوئی۔ اس نے فوراً قریبی شہر

ہوف ہائم کے ہسپتال میں فون کیا۔ چھ بجے وہاں کا ڈاکٹر ہمارے گھر پہنچ گیا۔نبض کے بارے میں جان کر اس نے دستی ای سی جی مشین بھی ساتھ رکھ لی تھی ۔مبارکہ کی صورتحال دیکھ کراس نے گھر پر ہی ای سی جی ٹیسٹ شروع کر دیا۔دل میں گڑ بڑ ہونے کے سگنل مل رہے تھے۔ساڑھے چھ بجے اس نے ایمبولینس بلا لی۔ایمبولینس والوں نے آتے ہی اپنی کاروائی شروع کر دی۔وہ اسٹریچر پر ڈال کر لے جانا چاہتے تھے۔ہم اپنی بلڈنگ کی ساتویں منزل پر رہتے ہیں۔میرے پاس ہاؤس ماسٹر کا فون نمبر نہیں تھا۔ہاؤس ماسٹر سے سارے معاملات چھوٹا بیٹا ٹیپو خود ڈیل کرلیا کرتا ہے۔ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ لفٹ کی چابی منگائیں تاکہ مریضہ کواسٹریچر پر ہی لے جایا جاسکے۔میں نے ٹیپو کے گھر فون کیا،موبائل پرفون کیا،مگر سارے فون بند تھے۔پانچ منٹ کا پیدل رستہ ہےاس دوران میں نے خود جا کراس کے گھر پر بیل دی اور پیغام دیا کہ فوراً ہمارے ہاں پہنچو۔ان لوگوں کے پوری طرح بیدار ہونے ،تیار ہونے اور ہمارے ہاں پہنچنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ تب تک ڈاکٹرز مزید انتظار کیے بغیر مبارکہ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ہی لے گئے۔تینوں بیٹے ہمارے گھر کے اتنے قریب ہیں کہ کسی ایمرجنسی میں بلانے پر پانچ منٹ کے اندر گھر پر پہنچ سکتے ہیں۔ہر چند آج بڑی بہو تسنیم کو جتنا کام سونپا گیا اس نے احسن طریقے سے کر دیا اور اسی کے نتیجہ میں ڈاکٹر اور ایمبولینس بروقت پہنچ چکے تھے۔لیکن آج ایمرجینسی میں یہ تجربہ بھی ہوا کہ سب سے قریب مقیم بیٹا اس وقت ہم تک پہنچا جب اس کے آنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔اس سے اندازہ ہوا کہ قدرت کی طرف سے آسانی ہوتو دور والے بھی قریب ہیں اور اگر الجھن پیدا ہونی ہے تو سب سے قریب والے بھی دور ہیں۔سبق ملا کہ بچوں کی سعادت مندی پران کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے لیکن بھروسہ صرف اورصرف اپنے خدا پر ہی رکھنا چاہیے۔اس کا فضل ہے تو ہر طرف سے ہر طرح خیر ہے۔

ساڑھے سات بجے ایمبولینس والے مبارکہ کوساتھ لے کر گئے تھےاور ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ مبارکہ کا فون آگیا کہ انجیو گرافی اورانجیو پلاسٹی کے دونوں مرحلے طے ہوگئے ہیں۔گویا اب ہم دونوں میاں بیوی ہارٹ کلب کے ممبر بن گئے ہیں۔میں نے تو مبارکہ کی کسی بیماری میں شراکت نہیں کی لیکن وہ میرے دل کی بیماری میں حصہ دار بن گئی۔اگلے دن اس کے ڈائلسز کی باری تھی۔۲۳اپریل کوشام تک ڈائلسز کے بعد مبارکہ کوہسپتال سے چھٹی مل گئی۔

۲۴/اپریل کو ہمارے شہر کی میئر شپ کی ایک امیدوار محترمہ کارین کے ساتھ مقامی کمیونٹی سنٹر میں ملاقات طے ہوئی تھی۔ان کا تعلق ایف ڈی پی سے ہے۔جب کمیونٹی سنٹر میں پہنچیں تو بالکل

اکیلی۔۔۔مجھے اس لیے حیرانی ہوئی کہ ہمارے ہاں تو یونین کونسل کے امیدوار بھی ڈھول،باجے کے ساتھ آتے ہیں۔یہ تو شہر کی بلدیہ کی میئر شپ کی امیدوار تھیں اور بالکل اکیلی۔انہوں نے ماضی میں اپنی سماجی سرگرمیوں کی تفصیل سے آگاہ کیا اور مستقبل کے ارادوں (صرف وعدوں کا نہیں ارادوں) کا ذکر کیا۔ماضی کی سرگرمیوں میں انہوں نے بتایا کہ وہ نوجوانوں کی بہتری کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔میں نے انہیں تجویز دی کہ اس بار آپ بڑی عمر کے لوگوں کے لیے بھی کچھ کام کرنا۔میری تجویز انہوں نے پرزور مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرلی۔جاتے ہوئے مجھے اپنا ای میل ایڈریس دے گئیں۔میں نے اسی دن شام کوانہیں ایک ای میل بھیج دی جس میں اپنے تعارف کے طور پر اپنی نظم ''سرسوں کا کھیت'' کا جرمن ترجمہ بھی نتھی کر دیا۔ان کی جوابی میل آئی جس میں نظم پر پسندیدگی کا رسمی اظہار تھا۔اگلے دن ۲۵اپریل کو انتخاب تھا۔ہمارے ووٹ پڑنے کے باوجود محترمہ ہار گئیں۔تب میں نے انہی حوصلہ بڑھانے والی ایک میل بھیجی۔اس کا جواب بڑا دلچسپ آیا۔انہوں نے لکھا کہ ہارنے کے باوجود ہم لوگ پُرعزم ہیں۔ہار کی خبر سننے کے بعد پارٹی کے مقامی رہنما اور کارکن ایک جگہ جمع ہوئے۔وہاں میں نے بطور خاص آپ کی ای میل کا ذکر کیا اور آپ کی نظم ''سرسوں کا کھیت'' پڑھ کر سنائی،جسے حاضرین نے اس خاص کیفیت میں بطور خاص پسند کیا۔

اس سال فروری کے مہینے میں امریکہ سے ستیہ پال آنند کی ای میل آئی کہ میں یورپ کا سفر کرنے والا ہوں۔ان کے ساتھ گزشتہ برس ایک علمی مجادلہ میں ہلکی سی تلخی ہوئی تھی۔میں نے جوابی کاروائی میں ان کی متعلقہ ای میلز شائع کر کے انہیں علمی واخلاقی دونوں سطح پر خاموش کر دیا تھا۔یہ ساری روداد میری کتاب ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' میں محفوظ ہے۔اس سب کچھ کے باوجود ان کی ای میل آئی تو کچھ اچھا سا لگا۔سو میں نے انہیں لکھا کہ جب یورپ آرہے ہیں تو جرمنی سے بھی ہوتے جائیے۔ڈاکٹر آنند فوراً راضی ہو گئے۔مجلسی سرگرمیوں سے تمام تر بے رغبتی کے باوجود اب مجھے ایک تقریب کا اہتمام تو کرنا تھا۔اسی دوران فرینکفرٹ کے ایک متشاعر سے بات ہو رہی تھی تو اس نے کہا کہ آپ کو تو تقریبات کرانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے پھر کیسے انتظام کریں گے۔میں نے کہا میں جان بوجھ کر ان سرگرمیوں سے پرہیز کرتا ہوں وگرنہ ان کا برپا کرانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔چنانچہ ۲۴مارچ کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کی زیر صدارت ڈاکٹر آنند کے اعزاز میں تقریب کامیابی کے ساتھ ہو گئی۔تقریب کے بعد ڈاکٹر آنند کوئی رسمی شکریہ کہنا تو کجا، مجھے خدا حافظ کہے بغیر روانہ ہو گئے۔اگلے روز

انہوں نے ہمبرگ میں کسی خاتون کی شاعری کی ایسی کتاب کی تقریب رونمائی کرنی تھی جو شائع ہی نہیں ہوئی تھی۔۲۳ مارچ کی رات جب ڈاکٹر آنند میرے ہاں مقیم تھے وہ دیر تک اس خاتون کی شاعری کے مسودے پر اصلاح کا نیک فریضہ انجام دیتے رہے تھے۔میں نے تب ہی انہیں دوٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر وہ کتاب کی اشاعت کے بغیر رونمائی کے ڈرامہ میں شریک ہوئے تو وہ ایک ادبی جرم کے مرتکب ہوں گے۔لیکن انہیں اس تقریب میں شرکت کی جلدی تھی سو ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی تقریب سے فارغ ہوتے ہی ملے بغیر چلے گئے۔امریکہ واپس پہنچنے کے بعد بھی ان کی طرف سے کوئی رسمی ای میل تک نہیں ملی۔شاید یہ ادبی تہذیب کا کوئی مابعد جدید رویہ ہو۔

اسی تقریب کے سلسلہ میں ایک اور لطیفہ در لطیفہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے ایک خاتون صدف مرزا کا حوالہ دیا کہ میرے سفر کے جملہ امور کو وہی دیکھیں گی۔ان کا تعارف بطور شاعرہ کرایا گیا۔سو انہیں بھی مدعو کر لیا گیا۔پھر ان خاتون نے پاکستان سے آئے ہوئے ایک شاعر باقر زیدی کا بتایا تو انہیں بھی مدعو کر لیا گیا۔تقریب سے پہلے ہی کھل گیا کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی متعارف کرائی گئی خاتون کا جو شعری مجموعہ چھپ چکا ہے بے وزن شاعری پر مشتمل ہے۔اب صبر کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔البتہ اس صبر میں یہ اطمینان شامل کر لیا کہ اس تقریب میں اپنا کلام نہیں سناؤں گا۔مجھے ویسے بھی مشاعرہ بازی کا شوق نہیں ہے،سو یہ طے کر لیا کہ میں اپنی ہی اس تقریب میں کلام نہیں سناؤں گا۔پروگرام سے چند دن پہلے معلوم ہوا کہ پاکستان سے جو شاعر آئے ہوئے ہیں وہ کسی ٹی وی چینل سے وابستہ ہیں اور پروگرام کی ریکارڈنگ بھی کی جائے گی۔مجھ سے دو دوستوں نے پوچھا اب تو ٹی وی چینل کی طرف سے ریکارڈنگ بھی ہوگی،تو اب تو کلام سنائیں گے؟ میں نے کہا کہ میرے لیے بے معنی بات ہے۔چنانچہ تقریب ہوئی، ریکارڈنگ دھوم دھام سے ہوئی لیکن اسٹیج سیکریٹری ہونے کے باوجود میں نے کلام نہیں سنایا۔بعد میں لطیفہ یہ ہوا کہ مجھے مذکورہ پاکستانی شاعر کی طرف سے پیغام بھیجا گیا کہ اس تقریب کی ریکارڈنگ کی ڈی وی ڈی کی ماسٹر کاپی لینا چاہیں تو سات سو یورو کا خرچہ دینا ہوگا۔میں نے پیغام پہنچانے والے دوست (ڈاکٹر وسیم) کو جواب دیا کہ پاکستانی دوست کی جیب کٹ گئی ہو اور اسے کرایا کے لیے ہیلپ کی ضرورت ہو تو کوئی مدد کی جا سکتی ہے لیکن اس ڈی وی ڈی کے لیے میں سات یورو دینے کے لیے بھی راضی نہیں ہوں۔جس ریکارڈنگ کے لیے میں نے کلام سنانے میں بھی دلچسپی نہیں لی مجھے اس کی ڈی وی ڈی میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔وہ دوست سات سو سے کم کا بھاؤ تاؤ کرنے لگے تو میں نے انہیں کہا کہ میں

سات یورو دینے سے بھی انکار کر چکا ہوں تو آپ کیا بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں۔ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

اسی دوران بون میں بشریٰ ملک نے ایک ادبی تنظیم اردو سوسائٹی آف یورپ قائم کی اور ۱۶ مئی ۲۰۱۰ء کو وہاں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔اس کی صدارت مجھ سے کرائی گئی۔میں نے بعد میں بشریٰ ملک کو مشورہ دیا کہ الم غلم قسم کے شاعر اور شاعرات کا مجمع لگانے سے بہتر ہے کہ کوئی سلیقے کی ادبی تقریب کی جائے۔انہوں نے اس سلسلے میں مشورہ مانگا تو میں نے کہا کہ فضول شاعروں اور متشاعروں کی بجائے ایک دو اچھے شاعر بلائیں،ایک افسانہ نگار بلائیں،ایک خاکہ نگار۔۔۔اس طرح چار پانچ ادبی اصناف کے مختلف افراد کو بلا کر ان سب سے باری باری سنا جائے۔پھر ان ساری پڑھی گئی تخلیقات پر گفتگو کی جائے۔حاضرین کو مجمع میں بیٹھ کر نہیں بلکہ اسٹیج پر بلا کر اظہار خیال کی دعوت دی جائے۔اس طرح حاضرین براہ راست اس پروگرام میں شریک ہو سکیں گے۔میری تجویز بشریٰ ملک کو اچھی لگی۔اب دیکھتے ہیں وہ کس حد تک اس کو کر پاتی ہیں۔

اس عرصہ میں اٹلی میں مقیم پاکستانی دوست جیم فے غوری جو میرے لیے ادبی محبت اور اخلاص کے جذبات رکھتے ہیں،انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ وہ اٹلی میں تین روزہ سیمینار کرنا چاہتے ہیں۔موضوع ہے ''مغربی دنیا میں اردو کی صورتحال''۔۲۱ تا ۲۳ جولائی کو سیمینار ہوگا۔۲۴ جولائی کو سوئٹزرلینڈ لے جائے جائیں گے،وہاں شام کو ایک مشاعرہ ہوگا اور وہاں کی سیر بھی ہو گی۔۲۶ تا ۲۸ جولائی اٹلی کی سیر ہو گی۔گویا آٹھ دن کا ادبی و تفریحی پروگرام ہوگا۔میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس تقریب میں روایتی مشاعرہ باز اور کانفرنس باز ادیبوں کو بالکل نہیں بلائیں۔ان جینوئن لوگوں کو بلائیں جو مشاعروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے منتظمین کے پیچھے پاگلوں کی طرح نہیں بھاگتے۔ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے بڑی حد تک میرے مشورے کو قبول کیا۔پھر انہوں نے جو پروگرام بنایا اس میں ایک آدھ کو چھوڑ کر تقریباً ہر نشست کی صدارت پر مجھے بٹھا دیا۔میں نے انہیں سمجھایا کہ یہ مناسب نہ ہوگا،ویسے بھی پاکستان میں آج کل صدرِ مملکت کے ساتھ مختلف ادارے اور پارٹیاں مل کر جو کچھ کر رہی ہیں اس کے بعد تو لفظ صدر سے ہی وحشت ہونے لگی ہے چاہے وہ کسی ادبی نشست کا صدر ہی کیوں نہ ہو۔چنانچہ پھر میں نے اوکھے سوکھے ہو کر دو نشستوں کی صدارت قبول کی اور باقی کے لیے خود سے زیادہ بہتر اور موزوں افراد کے نام دے دیئے۔جیم فے غوری نے ۲۹ مئی کو میری ایئر ٹکٹ بنوا کر مجھے بھیج دی۔لیکن اسے قسمت کی

بات سمجھیں کہ محکمہ صحت کی طرف سے انہیں دنوں میں میری Rehabilitation کے لیے منظوری آ گئی۔لوگ اس کے لیے لمبی لائن میں لگ کر باری کا انتظار کرتے ہیں مجھے اتنی جلدی اس کا چانس مل گیا جسے ضائع کرنا اپنی صحت کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔یہ ایک طرح سے فائیو سٹار ہوٹل جیسا صحت افزا مقام ہوتا ہے۔جہاں مریض کی دیکھ بھال ، دواؤں کی تبدیلی کے ٹیسٹ،مساج وغیرہ یعنی مریضوں کو ہر طرح کا ممکنہ عیش و آرام فراہم کیا جاتا ہے جو کامل شفایابی کے لیے ممد ہوتا ہے۔سو میں نے بڑے ہی بوجھل دل کے ساتھ غوری صاحب کو ۲۱ جون ۲۰۱۰ء کو اس کی اطلاع دی۔۲۲رجون کو میری دائیں آنکھ کا موتیا کا آپریشن ہوا اور خدا کے فضل و کرم سے بالکل کامیاب رہا۔یہ آپریشن گزشتہ برس اپریل سے موخر ہوتا چلا آ رہا تھا اور میرے لیے یہ تاخیر کسی حد تک تکلیف دہ ہونے لگی تھی۔خدا کا شکر ہے کہ یہ کام خیر و خوبی سے انجام پذیر ہوگیا اب میں دونوں آنکھوں سے پوری طرح کام لے سکوں گا۔

۲۱ جون کو ہی مجھے پاکستان سے ڈاکٹر نذر خلیق نے بتایا کہ خیر پور میرس یونیورسٹی کے اردو مجلّہ ''الماس''میں میرا مضمون ''ہرمن ہیسے کا ناول سدھارتھ'' شائع ہوا ہے۔ڈاکٹر یوسف خشک جو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کے اردو شعبہ کے سربراہ ہیں، چند برس پیشتر جرمنی میں آئے تھے۔ایک علمی و تحقیقی منصوبہ کے سلسلہ میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ان کا قیام تھا۔تب ان کے ساتھ ملاقاتیں ہوئی تھیں۔یہ اتفاق ہے کہ میرے اور ان کے تعلق میں جرمنی کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہتا ہے۔انہوں نے یونیورسٹی کے مجلّہ میں جو مضمون شائع کیا وہ جرمن ناولسٹ ہرمن ہیسے کے ایک اہم ناول کے مطالعہ پر مبنی ہے۔اٹلی کا پروگرام چھوڑنے کی بوجھل کیفیت میں اس خبر نے کچھ سکون سا دیا،ڈاکٹر یوسف خشک کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں اور ان کی محبتوں کی یاد تازہ ہوگئی۔لیکن محبت تو جیم فے غوری بھی بہت کرتے ہیں۔یوں میں دیر تک اداسی اور خوشی کی ملی جلی کیفیات میں گھرا رہا۔اٹلی کے اتنے اچھے ادبی پروگرام کو مس کرنے کے ساتھ مجھے اٹالین کھانوں سے محرومی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

کھانے پینے کے ذکر سے خیال آیا،جرمنی میں رہتے ہوئے ہم لوگ پاکستانی کھانے ہی کھاتے رہے ہیں۔لیکن اب کھانے کے معمولات میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ناشتہ میں ہم میاں بیوی اپنی اپنی پسند کی بریڈ لیتے ہیں۔دوپہر کو پاکستانی کھانا ہوتا ہے۔مبارکہ شام کو بھی پاکستانی کھانا کھاتی ہے لیکن میں نے شام کو بریڈ لینا شروع کر دی ہے۔ویسے پاکستانی کھانوں میں عام گوشت،سبزی اور دال کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار چپلی کباب،نہاری اور پائے کی بد پرہیزی بھی کر لیتے ہیں۔ویسے آجکل ہماری پسندیدہ ڈش گڑ کے

چاول ہے،اگرچہ یہ بچپن کی پسندیدہ ڈش کے طور پر بہت کچھ یاد دلاتی ہے لیکن اس میں ہر طرح کے میوہ جات کی شمولیت بہت کچھ بھلا بھی دیتی ہے۔کبھی کبھار یہ ڈش بنتی ہے تو میں جی بھر کے بد پرہیزی کر لیتا ہوں۔شوگر کا مریض ہونے کی وجہ سے عام طور پر تشویش تب ہوتی ہے جب شوگر معمول سے بڑھ جاتی ہے۔تاہم حالیہ دنوں میں وقفہ وقفہ سے تین بار ایسا ہو چکا ہے کہ میری شوگر بہت کم ہوگئی۔۵۰ کے لگ بھگ۔پہلی بار تب اس کا انکشاف ہوا جب میں وضو کر رہا تھا اور ٹانگیں کپکپانے لگیں۔شوگر چیک کی تو پچاس۔فوراً احتیاطی تدابیر بروئے کار لائے اور شوگر لیول نارمل ہو گیا۔جب وقفہ وقفہ سے تین بار ایسا ہوا تو ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ڈاکٹر فکر مند ہوا اور کہنے لگا اس میں خطرہ زیادہ ہے،خصوصاً نیند میں ہی شوگر لیول اتنا گر جائے تو بندہ سویا ہوا ہی آگے نکل جائے گا۔اس کے لیے خود ہی الرٹ رہنے کی ضرورت ہے۔لیکن مجھے تو اس مسئلہ میں بھی ایک دلکشی دکھائی دی ہے۔موت برحق ہے۔ایک نہ ایک دن آنی ہے اور میں اس سلسلہ میں اپنی خواہش پہلے سے لکھ چکا ہوں۔

''مجھے موت کے سلسلہ میں صرف ایک خواہش شدت کے ساتھ رہی ہے کہ جب بھی آئے بہت آرام سے آئے۔جیسے ہلکی سی اونگھ میں گہری اور میٹھی اونگھ آجائے اور میں اسی میٹھی اونگھ میں آگے نکل جاؤں۔''

تو اس لحاظ سے نیند میں شوگر لیول کا بہت زیادہ کم ہو جانا اس خواہش کی تکمیل کے لیے ممد ہوسکتا ہے لیکن صرف تب جب خدا کی طرف سے بلاوے کا اصل وقت آئے گا۔اس برس پاکستان سے محمد حامد سراج کی اوپن ہارٹ سرجری کے بعد ایک ای میل آئی تو اس میں موت کے خوف کا احساس نمایاں تھا۔میں نے انہیں اپنی یادوں کے گزشتہ باب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ہمت افزا ای میل بھیجی جس کا پھر اچھا جواب آیا۔بے شک انجیو پلاسٹی کے مقابلہ میں اوپن ہارٹ سرجری زیادہ نازک معاملہ ہے لیکن کامیاب آپریشن کے بعد بندہ جیسے جوان ہو جاتا ہے۔میرا خود اپنے ہسپتال کے ڈاکٹر کے ساتھ یہی مسئلہ چل رہا ہے۔وہ اگلی بار ایک اور انجیو پلاسٹی کرنا چاہتے ہیں۔اور میرا اصرار ہے کہ اب مزید ایسا کچھ نہیں کریں۔اوپن سرجری کر گزریں جو ہونا ہے ہو جائے۔عنقریب اس بارے میں فیصلہ ہونا ہے۔

اسی دوران ہالینڈ سے لندن شفٹ ہو جانے والے دوست جمیل الرحمٰن کا فون آیا تو اپنے بعض مسائل کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے اتنے جذباتی ہو گئے کہ خودکشی کی بات کرنے لگے۔میں نے انہیں سمجھایا کہ میں پاکستان میں ایک بار ایسی کیفیت سے گزر رہا ہوں لیکن اب تو

خدا کا فضل ہی فضل ہے۔ پھران پر جو خدا کے فضل اور احسانات ہیں ان کی طرف انہیں توجہ دلائی اور کہا کہ ہم بامراد لوگ ہیں، نامراد نہیں ہیں۔ سو خودکشی کا سوچنا بھی خدا کی ناشکری میں شمار ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک نازک مرحلہ پر میں ایک دوست کے لیے زندگی بخش اچھی باتیں کر سکا اور اس کے لیے وقتی طور پر سہی سکون کا موجب بنا۔

۱۲مئی کو مجھے ہالینڈ سے ایک دوست احسان سہگل کا ٹیلی فون آ گیا۔ کافی پریشان تھے اور بتا رہے تھے کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ایمبولینس بلانا پڑ گئی۔ چیک اپ ہوا تو تمام رزلٹ اطمینان بخش تھے لیکن احسان سہگل پھر بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں تو تسلی دینے والی باتیں کر دیں لیکن پھر گزشتہ برس اور اس برس کی اب تک کی اپنی صورتحال پر غور کیا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے نہ صرف مجھ جیسے کمزور اور بزدل انسان کو ہمت اور حوصلہ عطا کر رکھا ہے بلکہ پوری طرح سے خود سنبھال رکھا ہے۔ مبارکہ کی جسمانی حالت تو کانچ کی گڑیا جیسی ہو کر رہ گئی۔ اس کے باوجود روئے ما، گردوں کے مسئلہ اور دل کی بیماری کو یوں نبھا رہی ہے جیسے گھر کا معمول کا کام ہو۔ ڈائلسز سے آنے کے بعد انسان اچھا خاصا نڈھال ہو جاتا ہے۔ لیکن مبارکہ پانچ دس منٹ ریسٹ کرنے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ جاتی ہے۔ البتہ کھانا کھانے کے بعد پھر گہری نیند سوتی ہے۔

۲۴مئی کو جرمنی میں سرکاری چھٹی تھی۔ اس دن بارش نہیں ہونا تھی۔ کئی دنوں سے چل رہی ٹھنڈ کے برعکس موسم خاصا بہتر تھا۔ چمکتی ہوئی لیکن نرم دھوپ میں ۲۵ ٹمپریچر نے فضا کو خوشگوار بنا دیا تھا (اس دن پاکستان کے بعض شہروں میں ٹمپریچر ۵۲ ہو گیا تھا)۔ ہم نے، پوری کی پوری فیملی نے اپنے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے دریائے مائن کے کنارے پکنک منانے کا طے کر لیا۔ اپنی اپنی سہولت کے مطابق پانچوں بچوں نے جو پکانا مناسب سمجھا پکا کر لے آئے اور سب دریا کے کنارے پر جمع ہو گئے۔ چھوٹے بچے، پوتے، پوتیاں، نواسے جو ہمارے گھر میں کھیلتے ہیں تو لگتا ہے کہ اودھم مچا رہے ہیں۔ اب یہاں کھل کر کھیل رہے تھے، اودھم مچا رہے تھے لیکن سب اچھا لگ رہا تھا۔ گزشتہ برس کی بیماریوں کی یلغار کے بعد مبارکہ پہلی بار دریا کے کنارے پہنچی تو یہ سب کچھ خواب جیسا لگ رہا تھا۔ بیماریوں کے حملہ سے پہلے ہم دونوں میاں بیوی کئی بار چہل قدمی کرتے ہوئے دریا کے اس کنارے تک آئے ہیں اور کئی بار یہاں کے بنچوں پر دیر تک بیٹھے قدرتی مناظر کا نظارہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن گزشتہ برس ۲۰۰۹ء میں ہم جس نوعیت کی سنگین بیماریوں سے گزرے ہیں، اس کے بعد سوچا نہیں تھا کہ مبارکہ اس طرح پھر سے ہنستے کھیلتے ہوئے

دریا کے کنارے تک پہنچے گی۔ لیکن خدا کے فضل سے ایسا ہو گیا تھا۔ ہمارے لیے یہ پکنک بھی خدا کی شکر گزاری کا جواز بن گئی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بھی پکنک منائی جا سکتی تھی لیکن بچے اسی طرف رہنے پر مصر تھے کیونکہ یہاں کی گراؤنڈ وسیع تھی۔ کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے کے لیے کھلی جگہ تھی۔ دوسری طرف صرف بیٹھنے کے لیے دو تین بنچوں کا ہی انتظام تھا۔ چھٹی والے دنوں میں دریا کے دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے ایک کشتی موجود ہوتی ہے۔ کرایا واجبی سا ہوتا ہے۔ میں اپنے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں کو لے کر دریا کے دوسرے کنارے پر لے گیا۔ بچوں نے اس مختصر سے دریائی سفر کا لطف لیا لیکن دوسرے کنارے پر پہنچ کر واپسی کا شور مچا دیا۔ اصل میں وہ کشتی میں ہی سفر کرتے رہنا چاہتے تھے۔ مجھے ہرمن ہیسے کا ناول ''سدھارتھ'' بہت پسند ہے۔ دریا کی آوازیں سننا اور ان کا گیان حاصل کرنا بڑی بات تھی لیکن ہرمن ہیسے کے سدھارتھ نے میرے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں کی معصوم اور زندگی سے بھرپور آوازوں کے ساتھ دریا کی آواز کو سنا ہوتا تو اسے ایک اور طرح کا گیان بھی نصیب ہو جاتا۔ میں اپنے بچوں کے بچوں میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل سمیت اپنی ساری کائنات کا عکس دیکھ رہا ہوں اور وزیر آغا کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کا اختتامی حصہ جیسے میرے اس تجربے کا حصہ بن جاتا ہے۔

''معاً/مَیں نے دیکھا/زمیں پر ہَوا تھی/
ہَوا کے تڑختے ہوئے فاصلے تھے/
مگر سبز دھرتی کی/ٹھنڈی تہوں میں/جڑوں کی پُراسرار وحدت تھی/
سب فاصلے/ایک نقطے میں سمٹے ہوئے تھے/
ہزاروں جڑیں/ایک ہی جڑ سے پھُوٹی تھیں/
آگے بڑھی تھیں/مگر جڑ سے ایسی جُڑی تھیں/کہ چلنے کے عالم میں/ٹھہری ہوئی تھیں/
یہ ساری جڑیں/سبز دھرتی کی اپنی جڑیں تھیں/
جو خود اُس کے گیلے بدن میں/اُترتی گئی تھیں/
کہو کون تھا وُہ؟/کہ جس نے کہا تھا:/ستارے فقط پات ہیں/
کہکشائیں/گندھی نرم شاخیں ہیں/
آکاش/اِک سبز چھتنار/ہر شے پہ سایہ کُناں ہے/
مگر اس کی جڑ/اس کے اپنے بدن میں/نہیں ہے!/

کہو کون تھا وہ/ کہ جس نے ہَوا کی حسیں سرسراہٹ/ لرزتی ہوئی گھنٹیوں کی سہانی صدا/
مشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز/ اور خواہشوں کے تلاطم کو/ دکھ کا سبب کہہ دیا تھا؟/
وہ جس نے/ خود اپنے ہی پانچوں حواسوں کو/ اپنی جڑوں کو/ فریبی، سیہ کار، جھوٹا کہا تھا؟
مرا اُس سے/ کوئی تعارف نہیں ہے/
مجھے تو فقط/ اپنے ''ہونے'' کا عرفان ہے/
میں تو بس اس قدر جانتا ہوں/ پرَوں کو ہلاتی/ حسیں قوس بن کر/ مری سمت آتی ہوئی/ فاختہ/
پھڑ پھڑاتے ستارے/ گھنی گھاس کی نوک پر آسماں/ سے اُترتی نمی/
اور پُورب کے ماتھے پہ/ قشقے کا مدھم نشاں/
تیرگی کی گُپھا سے نکلتا ہُوا/ روشنی کا جہاں/ دھرتیاں، کہکشائیں، جھروکے/
جھروکوں میں اطلس سے کومل بدن/ بھیگی پلکوں پہ دکھ کی تپکتی چُبھن/
سبز شبدوں کی بہتی ہوئی آبجُو/
اِک انوکھے پُراسرار معنیٰ کے/ گھاؤ سے رِستا لہو/ مُسکراتے ہوئے لب/

یہ سب/ میرے اوتار ہیں/
میری آنکھیں ہیں/ مُجھ کو ہمیشہ سے تکتی رہی ہیں/
سدا مجھ کو تکتی رہیں گی!''

زندگی کا اسرار روح سے منسلک ہے اور روح کا بھید روحِ اعظم تک لے جاتا ہے۔ میں ایک عرصہ سے اس بھید کو سمجھنے کی جستجو میں ہوں۔ کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا تو ممکن نہیں لیکن پھر بھی غور و فکر کے نتیجہ میں جتنا کچھ منکشف ہوتا ہے میرے لیے روحانی لذت کا موجب بنتا ہے۔ میں اپنی یادوں کے باب ''روح اور جسم'' میں لکھ چکا ہوں کہ روح اور جسم لازم و ملزوم ہیں۔ کلوننگ کے سائنسی تجربہ کی کامیابی کے بعد یہ مذہبی تصور مزید مستحکم ہوا ہے۔ تاہم مجھے جسم اور روح کے اس تعلق کے ساتھ روح کے جسم سے سوا ہونے کا ہلکا سا احساس بھی ہوتا ہے۔ میں اس احساس کو شاید ڈھنگ سے بیان نہ کر پاؤں۔ تاہم اس کے لیے ایک دو مثالیں کسی حد تک تفہیم میں مد ہو سکتی ہیں۔ خواب میں جسم اپنے بستر پڑا ہوتا ہے اور روح ایک اور جسم کے ساتھ کہاں سے کہاں تک پہنچی ہوتی ہے۔ خواب میں ہم جن کیفیات سے گزر رہے ہوتے ہیں بیداری پر ان کے اثرات بھی ہم پر کسی نہ کسی حد تک طاری ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم خواب میں دوڑ رہے

تھے تو بیداری پر سانس پھولی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ڈراؤنا یا بہت سہانا خواب تھا تو بیداری پر اس کے ڈراؤنے یا سہانے اثرات بھی ہم پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک اور مثال بھی معین طور پر تو تفہیم نہیں کرتی لیکن اس سے بھی کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خوشبو پھول کے اندر موجود ہوتی ہے لیکن پھر وہ پھول سے الگ ہو جاتی ہے اور پھول مرجھا جاتا ہے۔ کسی بزرگ کی تحریر میں پڑھا تھا کہ قیامت کے دن ہمیں نئے جسم دیئے جائیں گے۔ میں پرانے جسم کی اہمیت سے ابھی تک منکر نہیں ہو پا رہا۔ یوں تو ہمارے جسم کی کھال چند معیّن برسوں کے اندر غیر محسوس طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔ صاحبِ جسم کو بھی اس تبدیلی کا ادراک نہیں رہتا۔ ہم خود کو وہی کا وہی سمجھتے ہیں۔ سو قیامت کے دن اگر ہمیں اسی انداز میں کوئی نیا جسم عطا کیا جاتا ہے جس سے ہم سب اپنا آپ اسی طرح اپنا محسوس کریں تو پھر اس سے ان بزرگ کی بات بھی بجا رہتی ہے اور نئے، پرانے جسم کا مسئلہ بھی کسی حد تک قابلِ فہم ہو جاتا ہے۔

پاکستان اور انڈیا کے کئی چینلز جرمنی میں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسے ہی چینلز میں ایک کا نام NDTV Imagine ہے۔ گزشتہ برس اس چینل پر ایک رئیلیٹی شو ''راز پچھلے جنم کا'' کے نام سے دکھایا گیا۔ چند محدود قسطوں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ میرے گھر والے اس شو میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے کہ شاید انہیں یہ اپنے معتقدات کے خلاف لگتا تھا۔ میرے پیش نظر دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں ایک طویل عرصے سے کبھی ایسا محسوس کیا کرتا ہوں کہ جیسے میں کسی پچھلے جنم میں بادشاہ/ راجہ یا سردار قسم کی چیز تھا اور کبھی ایسے لگتا ہے کہ میں کوئی سادھو، سنت، فقیر یا ملنگ تھا۔ میں اس بات کو اپنی بیوی کے علاوہ بعض بچوں کے ساتھ بھی بیان کر چکا ہوں۔ یہ دو مختلف دھاروں کا احساس پاکستان میں قیام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اس لیے پچھلے جنم کا اسرار میرے لیے ذاتی دلچسپی کا موجب تھا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے روح کے بھید کو سمجھنے کی خواہش ہمیشہ سے رہی ہے۔ یہ گیان اور معرفت مجھے کہیں سے بھی ملنے کی امید ہو میں ممکنہ حد تک وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ شو تو گھر بیٹھے ہی دستیاب ہو رہا تھا۔ اس میں ایک ماہرِ نفسیات خاتون ایک خصوصی نوعیت کے بیڈ کے ساتھ براجمان ہوتی تھیں۔ وہاں اپنے پچھلے جنم کی یاترا پر جانے کے خواہشمند کو لٹا کر پچھلے جنم کا کچھ حصہ دکھایا جاتا تھا۔ میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ مسمریزم سے ملتے جلتے کسی نفسیاتی طریقے سے مریض کو ٹرانس میں لا کر پھر کسی جینیٹک وے سے یا صدیوں سے محفوظ لاشعور کے ذریعے ہمارے آباؤ اجداد کے کسی کردار کی فلم کے ذریعے سے نفسیاتی علاج کر دیا جاتا ہے۔

اس شو میں آنے والے بعض لوگ اپنے پچھلے جنم کی کئی انوکھی داستانیں سنا رہے تھے۔ میں ان

سب کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ تو سائنس کی ایک سادہ سی، درسی نوعیت کی عام سی بات ہے کہ ہر انسانی سیل کے نیوکلس میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں۔۲۳ ماں کی طرف سے اور ۲۳ باپ کی طرف سے۔کروموزوم کے اندر ایک کیمیائی مادہ ہوتا ہے جسے DNA کہتے ہیں۔اس DNA کے مالیکیول کے مخصوص حصوں کو جین کہتے ہیں۔سیل کے ہر فعل کو کنٹرول کرنے والی ایک مخصوص جین ہوتی ہے۔انسانی جسم کے اربوں سیل میں سے ہر ایک سیل کے ۴۶ کروموزوموں کو ملا کر کروڑوں کی تعداد میں جینز ہوتی ہیں۔ایک سیل جس کے اندر یہ کروڑوں کی سرگرمیاں جاری و ساری ہیں،اس کی مادی حیثیت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ سوئی کی نوک پر ۲۰ ہزار سیل سما جاتے ہیں۔(یہاں مجھے ایک غیر متعلق بات یاد آ گئی۔بغداد پر ہلاکو خان کے حملہ کے وقت علماء کے دو گروہوں میں اس مسئلہ پر مناظرہ ہو رہا تھا کہ ستر ہزار فرشتے سوئی کے ناکے میں سے گزر سکتے ہیں یا نہیں؟۔سوئی کی نوک پر مادی صورت کے حامل ۲۰ ہزار سیل سما سکتے ہیں جبکہ ہر سیل کے اندر کروڑوں جینز موجود ہیں،تو ناکے میں سے ستر ہزار فرشتوں کا گزرنا تو معمولی سی بات لگتا ہے)۔

سیل کی کارکردگی کی اس تفصیل کے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہمارے اندر ہمارے آباؤ اجداد کی عادات و افعال کا کتنا بڑا حصہ موجود ہے۔ان کے ذریعے ہمارے ننھیال،ددھیال کے اعمال و عادات کا بہت سارا حصہ ہم میں منتقل ہو جاتا ہے۔اپنے آپ کو کبھی کوئی مہاراجہ یا سردار اور کبھی کوئی ملنگ فقیر محسوس کرنا مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میرے ددھیال، ننھیال میں سے کوئی ایسے رہے ہوں گے اور انہیں کی وہ بادشاہی اور فقیری میرے اندر بھی سرایت کر کے کسی نہ کسی رنگ میں میرے مزاج کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

این ڈی ٹی وی پر پچھلے جنم کا جو سفر میں دیکھ رہا تھا مجھے لگا کہ وہ اصل میں ان کے کروموزوم میں محفوظ آباؤ اجداد کے کسی کردار کی زندگی کی کوئی پرچھائیں جیسی جھلک تھی۔ یہ میں ان افراد کے بارے میں لکھ رہا ہوں جن کی داستانوں میں کہیں کوئی ربط تھا۔لیکن کئی باتیں بے ربط یا بے جوڑ بھی محسوس ہوئیں۔مثلاً کسی کو شدید گھٹن کا احساس ہوتا ہے تو اس کے پچھلے جنم میں اسے کسی صندوق میں بند کر کے ڈبو دیا گیا تھا۔پچھلے جنم میں ظلم ہوا تھا تو اب تو اس کے بدلہ میں من میں شانتی اور کھلے پن کا احساس ہونا چاہیے تھا۔اگر وہی گھٹن کا احساس ابھی تک موجود ہے تو پھر نیا جنم پچھلے جنم کا اجر نہیں بنتا بلکہ اسی سزا کا تسلسل لگتا ہے جس کے نتیجہ میں پچھلا جنم انجام کو پہنچا۔تاہم میرا مقصد یہاں ہرگز ہرگز کسی کے عقائد پر اعتراض کرنا نہیں ہے بس اس پروگرام کو دیکھتے وقت روح کی کھوج کی میری لگن جو کچھ سجھاتی رہی وہ بیان

کر رہا ہوں۔بعض پروگراموں میں جو کچھ دکھایا گیا انہیں کے اندر پچھلے جنم کی داستان کی تردید ہو گئی۔مثلاً ایک لڑکی کے پچھلے جنم میں اس کی ساس نے اسے زندہ جلا دیا تھا۔وہ اپنے پچھلے جنم کے گھر کے علاقہ اور ہاؤس نمبر سے لے کر اسکول کے نام پتہ تک کی ساری تفصیل بیان کرتی ہے۔لڑکی کا پچھلا جنم بھی دہلی میں ہوا اور موجودہ جنم بھی دہلی میں ہوا۔لیکن جب پچھلے جنم کے مقامات کی تصدیق کرنے گئے تو کوئی بھی درست ثابت نہ ہوا۔اسی طرح انڈیا میں پنجابی فلموں کی ایک اداکارہ پچھلے جنم میں یاسمین خان تھی،سلطان نامی مسلمان سے محبت کرتی تھی۔رنجیت سنگھ کے مزار پر جھاڑو دیا کرتی تھی۔۱۹۴۷ء میں اسے مسلمانوں نے قتل کر دیا۔کسی مسلمان کو کسی ہندو یا سکھ کے ہاتھوں قتل ہوتا بتایا جاتا تو قابلِ فہم بات ہوتی یا پھر لڑکی ہندو یا سکھ ہوتی اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں ماری جاتی تو پچھلے جنم کا راز سمجھ میں بھی آتا۔اس طرح کے کئی بے جوڑ نتائج پر مبنی پروگرام ماہرِ نفسیات خاتون کی تشخیص کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہندو عقائد کے حوالے سے روح کے اسرار کی باتیں ہو رہی ہیں تو مجھے ان میں ایک بڑا انوکھا اور دلچسپ تصور بھی ملا ہے۔ہستیٔ باری تعالیٰ جو اس کائنات کی حقیقتِ عظمیٰ بھی ہے اور روحِ اعظم بھی،اصلاً ہم اس عظیم ترین ہستی کو بھی اپنے معاشرتی رویوں کے حوالے سے دیکھتے یا سمجھتے ہیں۔جبکہ وہ ہمارے سارے تصورات اور قیاسات سے بالا ہے۔چونکہ ہمارا معاشرہ مردانہ بالادستی کا معاشرہ ہے اسی لیے خدا کے بارے میں بھی عام طور پر مذکر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ہمارے برعکس قدیم ہندوستان کے مادری نظام کے اثرات کے نتیجہ میں ہندوؤں میں دیوتاؤں کے ساتھ دیویوں کا تصور بھی موجود رہا ہے۔شری دیوی بھگوت پُران میں خالقِ کائنات عورت کے روپ میں ہے۔اس عقیدہ کے مطابق خالقِ کائنات شری دیوی اپنی تنہائی اور شدتِ جذبات سے مضطرب ہوئی تو اس نے اپنی ہتھیلیوں کو رگڑا۔اس کے نتیجہ میں ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے،جو پھوٹ بہے تو پانی کا ایک سیلاب آ گیا۔اس پانی سے برہما کی پیدائش ہوئی۔شری دیوی نے برہما سے جنسی ملن کی خواہش کا اظہار کیا مگر برہما نے اسے اپنی پیدا کرنے والی کہہ کر اس عمل سے انکار کر دیا۔تب شری دیوی نے برہما کو فنا کر دیا۔ان کے بعد وشنو کو پیدا کیا گیا اور ان سے بھی وہی خواہش دہرائی گئی،وشنو نے بھی برہما کی طرح انکار کیا اور ان کو بھی برہما جیسے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔وشنو کے بعد شنکر کا جنم ہوا۔شنکر اِن معاملات میں کافی معاملہ فہم نکلے۔انہوں نے دو شرطوں کے ساتھ شری دیوی کی بات ماننے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ایک شرط یہ کہ برہما اور وشنو کو دوبارہ پیدا کریں اور ان کے لیے دو دیویاں بھی پیدا کی جائیں۔دوسری شرط یہ کہ شری دیوی خود دوسرا روپ

اختیار کریں کیونکہ اس روپ میں بہر حال وہ ماں کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ شری دیوی نے برہما اور وشنو کو ان کے جوڑوں کے ساتھ دوبارہ خلق کیا اور خود بھی پاروتی کا دوسرا روپ اختیار کیا۔شنکر اور پاروتی کی داستان ہندوؤں کے عقائد میں آج بھی کئی جہات سے اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے پدری بالا دستی والے معاشروں میں خدا مردانہ صفات کا حامل دکھائی دیتا ہے تو مادری نظام کے قدیم ہندوستان میں خدا کے عورت جیسے روپ کی بات دلچسپ ہونے کے ساتھ اپنے ثقافتی پس منظر میں قابلِ فہم بھی لگتی ہے۔ باقی خالقِ حقیقی تو ہمارے ہر مردانہ وزنانہ تصور سے کہیں بلند و بالا ہے۔ یہاں تک کہ صفات بھی اس کو سمجھنے اور اس تک رسائی کا ایک وسیلہ تو ہیں لیکن اس عظیم تر حقیقت کے سامنے صفات بھی بہت نیچے رہ جاتی ہیں۔ صفات کا معاملہ یوں ہے کہ ذاتِ احد ہونے کے باوجود ہم صفات کے وسیلے سے اسے مخاطب کرتے ہیں۔مثلاً: ''اے میرے رحیم خدا! مجھ پر رحم فرما'' کہیں گے۔رحیم خدا کی بجائے قہار خدا کہہ کر رحم نہیں مانگیں گے۔اسی طرح رزق مانگتے وقت رزاق خدا کہیں گے، جبار خدا نہیں کہیں گے۔علیٰ ھذ القیاس۔اب میرے سوچنے کا معاملہ یوں ہو جاتا ہے کہ بُت سامنے رکھا ہو یا ذہن میں بنایا ہوا ہو،اسے بُت ہی کہیں گے۔کہیں صفاتِ باری تعالیٰ کے معاملہ میں ہم بھی ذہن میں چھپائی ہوئی بت پرستی کا ارتکاب تو نہیں کر رہے؟

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکمِ اذاں لاالٰہ الااللہ

(یہاں مجھے لاہور میں منعقدہ جماعت اسلامی کے ایک خاص یومِ تاسیس کی یاد آ گئی۔ بڑے پیمانے کی اس تقریب میں علامہ اقبال کی نظم ''خودی کا سِرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ'' خوش الحانی سے پڑھی گئی۔نظم کے تمام اشعار پڑھے گئے لیکن مذکورہ بالا شعر سنسر کر دیا گیا۔اس سنسر شپ کی خبر اخبارات میں چھپی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہاں چور کی داڑھی میں تنکا والی کوئی بات رہی ہوگی،لیکن میں نے اس سنسر شپ کی خبر کا بھر پور لطف لیا تھا)

میرا خیال ہے اپنے آپ کو سمجھنے میں اور خالقِ کائنات کو سمجھنے میں شاید میں کچھ بھٹکنے سا لگا ہوں اس لیے جوگندر پال کے ایک افسانہ ''سانس سمندر'' کے خوبصورت اقتباس کو خود پر منطبق کرتے ہوئے ،اپنی اس روداد کو سمیٹتا ہوں۔مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں رہی۔

''وہ پکی قبر؟......وہ ایک مجذوب کے قبضے میں ہے۔ بے چارہ اپنی اس کھوج میں دنیا سے باہر نکل

گیا کہ پیدا ہونے سے پہلے میں کیا تھا۔ارے بھائی تم ہو ہی کیا، جو کچھ ہوتے؟ وہ تو شکر کرو کہ تمہارے باپ نے تمہاری ماں کو چوم چاٹ کر تمہیں بنا دیا۔مگر باؤلا اپنی چھوٹی سی سمجھ بوجھ کو نہ چھوڑے ہوتا تو اتنی بڑی دنیا کیوں چھوڑتا۔تل گیا کہ اپنی تلاش میں وہیں جانا ہے جہاں سے آیا ہوں۔عین وہیں پہنچا ہوا ہے اور اپنی قبر کی پکی دیواروں کے اندر ہی اندر کچی مٹی ہو چکا ہے۔

ذرے کو جان کیا ملی کہ پاگل نے مٹی سے کھیلنے سے انکار کر دیا مگر مٹی تو اپنے ذرے ذرے سے کھیلتی ہے۔''

یہاں تک آتے آتے مجھے ایسا لگا ہے جیسے آج میرے اندر کے بادشاہ اور ملنگ میں لڑائی ہو گئی ہے۔بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ جیت گیا ہے اور فقیر کو قبر میں ڈال دیا گیا ہے۔لیکن فقیر کی تو قبر بھی زندہ رہتی ہے اور سانس لیتی ہے۔اب میں نہ خود سے مزید مکالمہ کر سکتا ہوں نہ اپنے قارئین سے مزید گفتگو کی گنجائش ہے،بس خدا سے ایک سوال ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے،سلطانی بھی عیاری

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اپنی کہانی کا درویش بھی میں ہوں،سلطان بھی میں ہوں، اور خدا کا سادہ دل بندہ بھی میں ہی ہوں۔

عکاس انٹرنیشنل ۔اسلام آباد۔ شمارہ:اگست ۲۰۱۰ء

جدید ادب جرمنی۔شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۱۱ء

زندگی کا یادگار سفر

انسانی زندگی ایک سفر جیسی ہے۔۱۳ جنوری ۲۰۱۲ء کو اپنی زندگی کے سفر میں ساٹھ برس کا ہو چکا ہوں۔سال ۲۰۰۹ء میری زندگی میں ایسی بیماریوں،دکھوں اور تکالیف کا سال بن کر آیا تھا کہ اب ان کا سوچ کر بھی حیرت ہوتی ہے۔میں اور میری فیملی کیسے سنگین حالات سے کیسے حوصلے اور کیسے اطمینان کے ساتھ گزرتے چلے گئے،یہ سراسر خدا کا فضل وکرم تھا۔اُسی نے ابتلا اور آزمائش میں ڈالا تھا اور اسی نے اس میں سے کامیاب وسرخرو کرکے زندگی کے سفر کو جاری رکھا ہوا ہے۔میری اہلیہ دو بار موت کی سرحد تک پہنچ گئی تھیں،اور دونوں بار ہماری پوری فیملی اللہ میاں کی منت کرکے انہیں واپس لے آئی۔دوسری بار واپسی تو ہوگئی لیکن ساتھ ہی ہفتہ میں تین بار ڈائیلے سز کی شرط لاگو ہوگئی۔ہمارے خاندان میں جو عزیز و اقارب ڈائیلے سز پر آئے چار سے چھ مہینے کے اندر وفات پا گئے۔خود مبارکہ کے والد اور میرے ماموں پروفیسر ناصر احمد بھی بمشکل چار مہینے ڈائیلے سز پر رہے اور پھر وفات پا گئے۔مبارکہ نے سوا سال سے زیادہ عرصہ ہفتہ میں تین بار ڈائیلے سز کی مشقت اٹھائی۔اس دوران ہم نے گردوں کے عطیہ کے لیے درخواست دے دی تھی۔گردے مل جائیں تو ٹرانسپلانٹیشن کے بعد ڈائیلے سز سے نجات مل جاتی ہے۔عام طور پر مطلوبہ گردوں کے ملنے میں کئی برس گزر جاتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے مبارکہ کے لیے سوا سال کے اندر ہی اس کا انتظام ہوگیا۔لیکن یہ انتظام بس خوشی کی ایک خبر جیسا ہی تھا۔ایک طرف ڈائیلے سز والے ڈاکٹر کا کہنا تھا ایسا لگتا ہے کہ ناکارہ گردے کام کرنے لگ گئے ہیں۔ڈاکٹر نے اپنی تسلی کے لیے مختلف قسم کے ٹیسٹ شروع کرائے۔دوسری طرف فروری ۲۰۱۱ء میں فرینکفرٹ کے ڈونر ادارہ کی جانب سے فون آگیا کہ آپ کے مطلوبہ گردے مل گئے ہیں۔میں نے انہیں ڈائیلے سز والے کلینک کا نمبر دے دیا اور کہا کہ ان سے بات کرلیں۔وہاں سے ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ آپ اپریل ۲۰۱۱ء تک یہ گردے ریزرو رکھیں،لیکن ہوسکتا ہے ہمیں ان کی ضرورت پیش ہی نہ آئے۔اور یہی ہوا،خدا کی رحمتِ خاص نے معجزے جیسا ہی کچھ کر دیا۔ٹرانسپلانٹیشن تو رہی ایک طرف ڈائیلے سز کی بھی ضرورت نہ رہی۔سارے ٹیسٹ صحت میں بہتری کی

نشان دہی کر رہے تھے۔سوا سال سے زیادہ عرصہ ہفتہ میں تین بار ڈائیلے سز پر رہنے کے بعد مبارکہ کو ڈائیلے سز سے نجات مل گئی۔ **الحمد للہ،ثم الحمد للہ۔** ۱۱ فروری ۲۰۱۲ء کو ڈائیلے سز کے بغیر ایک سال مکمل ہوگیا ہے،بغیر ڈائیلے سز کے سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے۔صرف دواؤں سے ہی زندگی کا سفر جاری وساری ہے۔۲۰۱۲ء کا آغاز اس خوشخبری کو مستحکم کرتا ہوا آیا۔

میری اپنی صحت کے مسائل بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ڈاکٹر ایک بار پھر انجیو گرافی وانجیو پلاسٹی کے لیے کہہ رہے ہیں۔میرے لیے اب لمبا سفر کرنا آسان نہیں رہا۔لیکن سال ۲۰۱۲ء میں ایک ایسا باضابطہ دعوت نامہ ملا کہ اپنے بعض ادبی حالات و واقعات کے باعث اسے قبول کرنا ضروری ہوگیا۔دراصل دسمبر ۲۰۱۱ء میں پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی کی طرف سے ای میل آئی کہ ایشیاٹک سوسائٹی کولکاتا کی طرف سے جلد آپ کو مدعو کیا جائے گا۔آپ نے ان کے فیض سیمینار میں شرکت کرنی ہے۔میں نے فوراً انہیں ای میل بھیجی کہ میں جتنی بچت کرسکتا ہوں وہ جدید ادب کی اشاعت پر لگا دیتا ہوں۔اس لیے میرے پاس سفر کرنے کے لیے ائر ٹکٹ کی گنجائش نہیں ہے۔پروفیسر شہناز نبی کی طرف سے پھر ای میل آئی کہ آپ اطمینان کریں جب آپ کو مدعو کرا رہی ہوں تو کرایا کی ادائیگی بھی باضابطہ طور پر ہوجائے گی۔میں نے لکھا کہ ٹھیک ہے جب ائر ٹکٹ کی سہولت مل رہی ہے تو پھر انشاء اللہ ضرور شرکت کروں گا۔بیماری کے بعض معاملات کے باوجود اپنی جان پر کھیل کر بھی شرکت کروں گا۔پروفیسر شہناز نبی کے ذریعے کولکاتا میں فیض سیمینار کے سلسلہ میں یہ متوقع دعوت نامہ''ہمارے کردیئے اونچے منارے'' کا اعلان اور میری زندگی کا ایک یادگار سفر بن جائے گا،اس کا مجھے اس حد تک اندازہ نہیں تھا۔

۳ رجنوری ۲۰۱۲ء کی تاریخ تھی جب مجھے ایشیاٹک سوسائٹی کولکاتا کے جنرل سیکریٹری پروفیسر میہیر کمار چکرورتی کی طرف سے ای میل ملی کہ سوسائٹی کی جانب سے ۲۰۔۲۱ مارچ کو فیض سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے،اس سلسلہ میں مجھے مدعو کیا گیا تھا۔پروفیسر شہناز نبی کی یقین دہانی کے مطابق چونکہ ائر ٹکٹ کی سہولت موجود تھی،اس لیے میں نے بخوشی شرکت کی ہامی بھر لی۔کولکاتا میرے لیے کئی پہلوؤں اور کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔اس لیے اس شہر سے آنے والا یہ دعوت نامہ میرے لیے''سفر وسیلۂ ظفر'' کا پیغام تھا۔انٹرنیٹ سے انڈیا کے ویزہ فارم کے حصول میں دقت پیش آ رہی تھی،جیسے تیسے یہ شکایت دور ہوئی،ویزہ فارم پُر کیا اور ۱۲ جنوری کو فرینکفرٹ میں قائم انڈین قونصلیٹ پہنچا۔وہاں فائنل صورت یہ سامنے آئی کہ چونکہ میں جرمن شہریت کے باوجود پاکستانی اوریجن کا ہوں،اس لیے یہ فارم انکوائری کے

لیے انڈیا جائیں گے اور انکوائری کی باضابطہ کاروائی میں چار سے چھ مہینے لگ جائیں گے۔میں نے کہا مجھے وسط مارچ تک ویزہ مطلوب ہے وگرنہ میرے لیے جانا بے معنی ہو جائے گا۔سو ویزہ فارم کے کاغذات واپس لیے اور اس اطمینان کے ساتھ گھر آ گیا کہ نہ جانے میں ہی کوئی بہتری ہوگی۔واپس آ کر پروفیسر میہیر کمار چکرورتی کو ایک ای میل کے ذریعے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ان کی طرف سے رسمی افسوس کی ای میل ملی اور بات آئی گئی ہوگئی۔میں نے اس ساری صورت حال سے کینیڈا میں اپنے دوست عبداللہ جاوید کو آگاہ رکھا ہوا تھا۔انہوں نے کہا کہ اس میں بہتری ہی ہے۔انڈیا میں اردو کے دونوں بڑے آپ سے ناخوش ہیں،ایسی حالت میں آپ کا نہ جانا ہی اچھا ہے۔تب میں نے کہا تھا کہ نہیں ایسی صورت میں تو میں پھر ضرور جانا چاہوں گا۔میں تو صرف خدا کی طرف سے بھلے اور برے کے کسی بھی فیصلے پر خوش ہوں۔کسی بندے کی طرف سے کہیں کوئی برا سوچنے یا کرنے والی بات ہے تو پھر میں ضرور وہاں جانا چاہوں گا۔تاکہ دیکھوں کہ جب خدا اچھا کرنا چاہے تو کوئی بندہ اسے کس حد تک روک سکتا ہے۔یہ بات بھی آئی گئی ہوگئی۔

۲۵ جنوری کو پروفیسر میہیر کمار چکرورتی کی طرف سے اچانک ایک ای میل آ گئی۔اس میل سے اندازہ ہوا کہ ایشیاٹک سوسائٹی کی جانب سے میرے ویزہ کے لیے متعلقہ حکام سے درخواست کی گئی تھی اور اس کے نتیجہ میں مجھے فرینکفرٹ میں انڈین قونصلیٹ کے پنکج ترپاٹھی سے رابطہ کے لیے کہا گیا تھا۔پنکج ترپاٹھی سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ معمول کے مطابق ویزہ فارم جمع کرا دیں۔ہم ضابطہ کے مطابق آپ کے کاغذات بھیج دیں گے۔مارچ کے وسط تک کوئی پیش رفت نہ ہوئی تو ہم قونصل جنرل کی طرف سے خصوصی ویزہ دلا دیں گے۔چنانچہ میں نے کاغذات جمع کرا دیئے۔یہاں ویزہ فیس جمع کراتے ہوئے ایک اور مشکل کا سامنا تھا۔عام لوگوں کے لیے ویزہ فیس ۶۷ یورو تھی (یہ اب ۵۰ یورو کر دی گئی ہے)۔پاکستانی اوریجن والوں کے لیے مزید ۲۷ یورو دینا لازم تھے اور کانفرنس ویزہ کے لیے مزید جرمانہ تھا۔۶۷ یورو ویزہ فیس کی جگہ مجھے ۱۳۷ یورو ادا کرنا پڑے۔میں نے اپنی روانگی کی تاریخ ۱۵ مارچ لکھی تھی،تاہم ٹکٹ ۱۶ مارچ کی بک کرائی۔۱۵ مارچ کو شام چار بجے مجھے ویزہ ملا۔عام طور پر ویزہ چھ مہینے کے لیے دیا جاتا ہے،لیکن چونکہ مجھے خصوصی ویزہ ملا تھا اس لیے اس کی معیاد پندرہ دن کی تھی۔۱۵ مارچ سے ۲۹ مارچ تک۔میں نے اس سہولت کو اپنے لیے مزید آسان کر لیا ہوا تھا۔روانگی ۱۵ مارچ کی بجائے احتیاطاً ۱۶ مارچ کو اور واپسی مزید احتیاط کے ساتھ ۲۹ مارچ کی بجائے ۲۸ مارچ کو۔

اسی رات میں نے کولکاتا میں ایشیاٹک سوسائٹی کے جنرل سیکریٹری کو ویزہ ملنے کی خوشخبری ای میل سے بھیجی۔۱۶ مارچ کو میں اپنی ڈیوٹی سے گھر واپس آیا تو سارے بچے مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے گھر پر جمع تھے۔رات ساڑھے نو بجے ائر انڈیا کی فلائٹ سے جانا تھا۔سو بروقت ائر پورٹ پہنچے اور معمول کی کاروائی سے گزرتے ہوئے جہاز میں سوار ہوگیا۔طارق اور عادل مجھے ائر پورٹ تک چھوڑنے ساتھ آئے تھے۔۱۷ مارچ کو دہلی کے انٹرنیشنل ائر پورٹ پہنچا۔وہاں سے ضابطہ کی کاروائی سے گزرنے کے بعد اندرون ملک کی پروازوں والے ائر پورٹ جانا تھا۔دہلی سے کولکاتا کے لیے میری سیٹ انڈی گو نامی ایک ہوائی کمپنی میں بک تھی۔اگلی پرواز کے لیے ابھی کافی وقت تھا سو ایک ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھایا۔لچھے دے پراٹھے اور دال مکھنی۔شوگر کے مریض کی بد پرہیزی کی انتہا۔بہر حال شام تک کولکاتا پہنچ گیا۔وہاں ائر پورٹ پر روزنامہ عکاس کے چیف ایڈیٹر کریم رضا مونگیری مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔وہاں سے سیدھے ان کے گھر پہنچے۔رستے میں انہوں نے اپنا موبائل فون عنایت کیا کہ جرمنی میں اطلاع کر دیں کہ آپ خیریت سے کولکاتا پہنچ گئے ہیں۔سو اسی وقت مبارکہ سے بات ہو گئی،خیریت سے سفر طے ہو جانے کی خبر سن کر وہاں بھی اطمینان ہو گیا اور مجھے بھی تسلی ہوگئی۔

کریم رضا مونگیری کے گھر پہنچے تو وہاں پہنچتے ہی کولکاتا کے اپنے خاص احباب کو فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع دی۔پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی،اور اردو دوست والے خورشید اقبال دونوں سے ملاقات کا طے کیا۔اسی دوران کریم رضا مونگیری کی بیٹی ثنا اور داماد کاشف بھی آ گئے۔ان کا بیٹا عمیر بہت پیارا تھا اور اسے دیکھتے ہیں مجھے اپنے چھوٹے پوتے یاد آنے لگے۔ان سارے بچوں کے ساتھ کافی دیر گپ شپ رہی۔پھر یہ اپنے گھر چلے گئے۔مجھے بھی تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا تھا۔گزشتہ دو روز میں دن بھر کی ڈیوٹی کے بعد ساری رات کا سفر اور پھر اگلا دن بھی کولکاتا پہنچنے تک مسافرت کی حالت میں گزرا تھا۔چنانچہ رات کا کھانا کھا کر اور بچوں کے جانے کے بعد جلد سو گیا۔۱۸ مارچ کو بروقت آنکھ کھل گئی۔حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر فرض فریضے ادا کیے۔کریم رضا مونگیری بیدار ہوئے تو ان کے ساتھ گپ شپ کے ساتھ بعض دوستوں سے رابطہ شروع کیا۔ادبی رسالہ ''دستک'' کے مدیر عنبر شمیم جو اب روزنامہ آبشار کا سارا کام سنبھالے ہوئے ہیں،ان سے رابطہ ہوا اور ان کے دفتر میں ملنا طے ہوا۔وہیں پہنچنے کے لیے نوشاد مومن مدیر مژگاں کو بھی کہہ دیا۔ناشتہ اطمینان سے کیا اور پھر کریم رضا مونگیری کے ساتھ دفتر آبشار میں پہنچ گئے۔عنبر شمیم سے زندگی میں پہلی بار روبرو ملاقات ہو رہی تھی لیکن کہیں کوئی تکلف

آڑے نہیں آیا، ہم برسوں کے شناسا دوستوں کی طرح بات کر رہے تھے۔نوشادمومن پہنچے تو محفل کی رونق مزید بڑھ گئی۔میں نے انہیں علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف توجہ دلائی جس میں انہوں نے مومن کے بارے میں دو مختلف آراءکو بیان کیا ہے۔

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

کسی نے اس شعر کو دوسرے رنگ میں بھی بیان کر رکھا ہے۔

کہنا ہے فرشتوں کا کم آمیز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے، بہت تیز ہے مومن

نوشادمومن اپنی ادبی سرگرمیوں میں خاصے تیز ہیں۔ان کے ساتھ جوگندر پال جی کا افسانہ ''سائنس سمندر'' اپنے افسانوی مجموعہ میں شامل کر لینے والے سلیم خان ہمراز کے دلیرانہ سرقہ کا ذکر ہوا۔نوشادمومن بتانے لگے کہ وہ اتنے شرمندہ ہیں کہ کسی سے رابطہ میں ہی نہیں آرہے۔اس سرقہ کی نشان دہی جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۷ میں ارشد کمال کے ایک خط میں کی جا چکی ہے۔اس دوران شہناز نبی کا فون آگیا، وہ مجھے لینے آرہی تھیں۔کریم رضا مونگیری نے انہیں ملنے کا مقام بتایا اور پھر ہم آبشار کے دفتر سے نکل کر اس مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔وہاں ڈاکٹر شہناز نبی موجود تھیں، میں کریم رضا مونگیری کی گاڑی سے شہناز نبی کی گاڑی میں منتقل ہو گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی کے ساتھ میرا اولین تعارف ان کی اُن نظموں کے ذریعے ہوا تھا جو ''اوراق'' لاہور میں شائع ہوا کرتی تھیں۔یہ نوے کی دہائی کا اوائل تھا۔ہماری ادبی زندگی کا بھی ابتدائی دور ہی چل رہا تھا۔مجھے علم نہیں تھا کہ شہناز نبی کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں، تاہم ان کی نظموں میں ایسی انوکھی چمک ہوا کرتی تھی کہ میں ''اوراق'' کے ''آپس کی باتیں'' سیکشن میں ہمیشہ ان نظموں کی تعریف کیا کرتا تھا۔اس سلسلہ میں ایک لطیفہ اس وقت ظاہر ہوا جب ''اوراق'' کے ایک شمارہ میں میری بہت اچھی دوست فرحت نواز کا خط شائع ہوا۔انہوں نے اپنے خط میں کچھ اس قسم کی بات لکھی تھی کہ حیدر قریشی کو اس بار بھی شہناز نبی کی نظمیں سب سے زیادہ پسند آئیں گی، لیکن وہ ان نظموں کا نام کیسے لکھیں گے، کیونکہ اس بار تو شہناز نبی کی کوئی نظم چھپی ہی نہیں۔۔۔میں نے اس خط کی لطیف برہمی کا مزہ لیا لیکن اس کے نتیجہ میں غیر شعوری طور پر جیسے شہناز نبی کے ساتھ ایک تعلق سا بن گیا۔پھر زمانے گزر گئے۔جرمنی آنے کے بعد

انٹرنیٹ سے وابستہ ہونے کے بعد اردو دوست ڈاٹ کام والے اپنے خورشید اقبال سے شہناز نبی کا ذکر سنا تو میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا کہ شہناز نبی کولکاتا میں رہتی ہیں؟۔پھر میں نے اُن سے ہی شہناز نبی کا فون نمبر حاصل کیا۔اور فوراً انہیں فون کر دیا۔ایک عجیب سے جوش و خروش کی کیفیت کو قابو کرنے کی ناکام کوشش کے ساتھ میں ان سے بات کر رہا تھا اور وہ جیسے پوری طرح شانت ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری باتوں کا جواب دے رہی تھیں۔یہ غالباً ۲۰۰۴ء کی بات ہے۔پھر ہم میسنجر پر بھی چاٹ کرتے رہے۔فون پر بھی رابطہ رہا اور ای میل سے تو مستقل رابطہ ہو گیا۔۱۹۸۴ کے زمانے کا ابتدائی ادبی رابطہ جو ''اوراق'' سے غائبانہ طور پر شروع ہوا تھا، وہ اب اس مقام پر آ گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے روبرو تھے۔اور ایک دوسرے کے روبرو ہوتے ہوئے بھی بالکل خواب جیسے۔۔۔۔پتہ نہیں کب آنکھ کھل جائے اور صرف اوراق میں چھپی نظمیں اور خطوط ہی رہ جائیں۔لیکن نہیں، بے شک یہ سب خواب جیسا تھا لیکن تعبیر سمیت خواب جیسا۔بہر حال ہم پہلے ایک ریستوران میں پہنچے۔وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔وہاں سے کولکاتا کی تاریخی عمارت وکٹوریہ میموریل ہال دیکھنے گئے۔اس عمارت کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو جہاں گراسی میدان ہونا چاہیے تھا، وہاں پتھر پھیلائے ہوئے تھے، وہاں چلنا مشکل ہو رہا تھا۔میں نے مشکل کا اظہار کرتے ہوئے شہناز نبی کی طرف سے خود ہی یہ شعر پڑھ دیا:

انہیں پتھروں پہ چل کر، اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اس عمارت کو مختلف اطراف سے دیکھا اور ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر مجھے علامہ اقبال کا مرثیہ یاد آنے لگا۔یہ مرثیہ باقیاتِ اقبال میں شامل ہے۔اس کا صرف ڈیڑھ شعر ہی بروقت یاد آسکا۔ایک مصرعہ ''اے ہند تیرے سر سے اُٹھا سایۂ خدا'' سن کر پروفیسر شہناز نبی حیرت کا اظہار کرنے لگیں کہ علامہ نے ایسا لکھا؟۔دوسرا شعر سنانے سے پہلے میں نے وضاحتاً بتایا کہ ملکہ وکٹوریہ کی وفات عید سے اگلے روز ہوئی تھی، علامہ اقبال نے اس بات کو یوں لطیف پیرائے میں بیان کیا۔

آئی اِدھر نشاط، اِدھر غم بھی آ گیا
کل عید تھی تو آج محرم بھی آ گیا

وکٹوریہ میموریل ہال کی سیاحت سے نکلنے لگے تو اب شہناز نبی نے میرے حصے کا شعر پڑھ دیا:

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں

آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

میموریل ہال سے نکلے تو رابندرناتھ بھون میں ٹیگور کا مجسمہ دیکھنے گئے۔غالباً اسی مجسمہ کے حوالے سے لطیفہ مشہور ہے کہ جب سرکاری طور پر اس مجسمہ کی منظوری دی گئی اور ٹیگور کو بتایا گیا کہ ان کے مجسمہ کے بنانے پر لاکھ روپے سے اوپر لاگت آئے گی تو انہوں نے بے ساختہ کہا کہ یہ رقم مجھے دے دیں، میں خود مجسمہ ایستادہ کرنے کی جگہ پر کھڑا ہو جایا کروں گا۔رابندرناتھ بھون کے ساتھ ہی ایک نکڑ پر بنگال کے سٹریٹ تھیٹر کی جھلک دیکھنے کو مل گئی۔گلی کے موڑ پر چند فنکاروں نے ایک پرداتان کر اسٹیج کی بیک گراؤنڈ بنالی تھی اور سڑک کے اسٹیج پر ہی اپنے فن کے جوہر دکھارہے تھے۔دیکھنے والوں کا مجمع بڑا نہیں تھا لیکن پھر بھی لوگ اس تھیٹر کو دیکھ رہے تھے۔یہاں سے واپسی پر میں نے اپنی ساری کتابوں کا سیٹ پروفیسر شہناز نبی کے سپرد کیا، یہ ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری کے لیے میری طرف سے تحفہ تھا۔شہناز نبی نے اگلے دن کتابیں وہاں پہنچادی تھیں اور مجھے وہاں سے باضابطہ رسید مل گئی تھی۔پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی کے ساتھ آج آدھے دن کی پوری ملاقات بھرپور رہی۔ہم نے دنیا جہان کے موضوعات پر باتیں کر ڈالیں۔شہناز نبی اس وقت نہ صرف کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی سربراہ ہیں بلکہ گزشتہ چند برسوں سے اقبال چیئر کی پروفیسر بھی ہیں۔یہ وہی سیٹ ہے جو فیض احمد فیض کو ملنا تھی،لیکن پھر وہ لوٹس کے مدیر بن کر بیروت چلے گئے۔ان کے بعد ڈاکٹر مظفر حنفی اس سیٹ پر پروفیسر رہے۔اب کچھ عرصہ سے شعبہ اردو کی سربراہی کے ساتھ اقبال چیئر کی پروفیسر شپ کا اعزاز بھی پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی کو حاصل ہے۔

شام کو کریم رضا مونگیری مجھے لینے کے لیے آگئے۔ان کے ساتھ پہلے ثنا اور کاشف کے ہاں پہنچے۔وہاں سے ''ہوڑہ'' میں قائم مکمل طور پر مغربی طرز کی مارکیٹ دیکھنے گئے۔کلکتہ میں فرینکفرٹ کا نظارہ کرلیا، مارکیٹ کا مشرق ومغرب کا ایک فرق البتہ واضح تھا۔مغربی مارکیٹوں کے برعکس اس مارکیٹ میں رش زیادہ تھا اور خریداری کم تھی۔زیادہ تر لوگ صرف رونق میلہ دیکھنے آرہے تھے۔کچھ لوگ گرمی کے باعث ایک طرف ائرکنڈیشنڈ کی سہولت کا لطف رہے تھے تو دوسری طرف آنکھیں سینکنے کا کام بھی لے رہے تھے۔فیملی کے ساتھ آنے والے افراد بھی تھے تو بعض نوجوانوں نے اسے میٹنگ پوائنٹ بھی بنالیا تھا۔اس مارکیٹ کو دیکھنا اچھا لگا۔کریم رضا مونگیری نے اپنی ایک ریزروسم مجھے عنایت کردی،جس سے میرے لیے اندرون ہند اور جرمنی میں رابطہ کرنا بہت آسان ہوگیا۔

۱۹مارچ سے ۲۳مارچ کی صبح تک میں باضابطہ طور پر ایشیاٹک سوسائٹی کا مہمان تھا۔سو ۱۹مارچ

کو ایشیاٹک سوسائٹی کے آفس میں پہنچے۔وہاں میہیر کمار چکرورتی سے ملاقات ہوئی۔سوسائٹی کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے ان سے مراسلت کر چکا تھا۔کافی کے کپ پر یہ ایک رسمی ملاقات تھی۔یہیں ڈاکٹر عقیل احمد عقیل سے پہلی ملاقات ہوئی۔انہوں نے سیمینار کا پروگرام عنایت کیا۔اس میں افتتاحی خطاب کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کا نام درج تھا۔خوشی ہوئی کہ جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۸ کی اشاعت کے بعد ان کے ساتھ ملاقات ہو سکے گی۔سوسائٹی کے آفس کے جملہ امور کی دیکھ بھال کرنے والے دلیپ رائے سے ملے۔انہوں نے مجھے گیسٹ ہاؤس بھیجنے کا انتظام کر دیا۔گیسٹ ہاؤس کا کمرہ نمبر ۲۰۲ مل گیا۔دن کا کچھ حصہ آرام کرتے ہوئے گزارا، کچھ وقت گھر پر اور دوست احباب کو فون کرتے ہوئے گزر گیا۔اسی دوران شام کے وقت ایشیاٹک سوسائٹی کے آفس سے دلیپ رائے کا فون آگیا۔وہ بتا رہے تھے کہ کل سیمینار کی افتتاحی تقریر مجھے کرنا ہوگی۔یہ اطلاع میرے لیے دوہری حیرانی و پریشانی کا باعث تھی۔ایک تو یہ کہ ابھی چند گھنٹے پہلے تو شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا نام پڑھ کر آرہا تھا کہ وہ افتتاحی خطاب کریں گے، پھر یکا یک یہ کیا ماجرا ہوگیا؟ دوسرے یہ کہ یہاں میرے پاس نہ صرف کمپیوٹر کی سہولت نہیں تھی، جس کے بغیر میرے لیے اب کچھ لکھنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے بلکہ میرے پاس کاغذ قلم بھی موجود نہیں تھے۔شام گہری ہوئی تو اللہ نے کرم کیا، کریم رضا مجھے ملنے آگئے۔انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کیا تو انہوں نے اسی وقت اپنا قلم عنایت کر دیا اور اخبار کے ایک کارکن کو بھیج کر کاغذ بھی مہیا کر دیا۔میں نے سیمینار کے دوسرے دن اپنا مضمون ''فیض صدی کی ایک جھلک'' پیش کرنا تھا۔اسی کے بعض حصوں سے استفادہ کر کے رات ہی رات میں اپنی افتتاحی تقریر کا مضمون تیار کر لیا اور قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ایک طویل عرصہ کے بعد ہاتھ سے لکھنا پڑا تو ایسے لگا جیسے پرائمری کلاس کے زمانے کی اپنی ہینڈ رائٹنگ دیکھ رہا ہوں۔

۲۰مارچ کو سیمینار ہال میں بروقت پہنچ گئے۔وہاں میں نے پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی سے پوچھا کہ فاروقی صاحب کیوں نہیں آرہے؟ اتنا جواب ملا کہ الہٰ آباد سے تو دہلی آچکے تھے لیکن اب اطلاع ملی ہے ان کی طبیعت ناساز ہے سو کولکاتا نہیں آسکیں گے۔ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سیمینار کا دیدہ زیب بروشر تقسیم ہونے لگا۔اسے دیکھا تو افتتاحی تقریر کے لیے میرا نام لکھا ہوا تھا۔حیرانی ظاہر کی تو جواب ملا کہ یہ بروشر آج رات میں ہی شائع کرایا گیا ہے۔اس پر مزید حیرانی ہوئی لیکن یہاں ہر حیرانی کا جواب نہیں تھا، سو چپ ہو رہا۔افتتاحی پروگرام میں پہلے خاص مہمانوں کو ڈائس پر بلایا گیا، انہیں پھول پیش کیے

گئے۔ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے کلامِ فیض سے افتتاحی گیت پیش کیا۔جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے پروفیسر میہیر کمار نے ویلکم ایڈریس کیا۔سیمینار کے مرکزی خیال کے حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی نے تعارف پیش کیا۔ان کے بعد مجھے افتتاحی تقریر کے لیے بلایا گیا۔میرے بعد علی گڑھ سے آئے قاضی جمال حسین نے کلیدی مقالہ پیش کیا۔ان کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر پروفیسر پلب سین گپتا نے صدارتی تقریر کی۔انہوں نے اس سیمینار کے انعقاد کا بڑا کریڈٹ ڈاکٹر شہناز نبی کو دیا اور توقع ظاہر کی کہ یہ سیمینار فیض احمد فیض کے حوالے سے اہمیت کا حامل ثابت ہوگا۔آخر میں ووٹ آف تھینکس کی رسمی کاروائی ہوئی اور افتتاحی سیشن اختتام پذیر ہوا۔

پہلے اکیڈمک سیشن میں ابوذر ہاشمی، پروفیسر ندیم احمد اور ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے کے مقالات اہمیت کے حامل رہے۔ان کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقفہ دیا گیا۔اسی دوران دیکھا کہ خورشید اقبال اور بلند اقبال دونوں دوست آئے ہوئے ہیں۔ان سے ملاقات ہوئی اور کم سے کم وقت میں جتنا جی بھر کے ملاقات ہوسکتی تھی وہ ہوتی رہی۔خورشید اقبال ۲۴ پرگنہ میں بیٹھ کر اردو دوست ڈاٹ کام جیسی عمدہ ویب سائٹ چلا رہے ہیں۔میری ذاتی ویب سائٹ بھی انہیں کی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ان کے ساتھ طے ہوا کہ ہم سیمینار کے بعد گیسٹ ہاؤس میں میرے روم میں ملیں گے۔فہیم انور ملنے آئے، یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کی اور نئے لکھنے والوں کی ایک کھیپ ملتی رہی اور تصویریں بناتی رہی۔

کھانے کے وقفہ کے بعد سیمینار کا دوسرا سیشن شروع ہوا۔ڈاکٹر عقیل احمد عقیل، پروفیسر وہاج الدین، پروفیسر خالد سعید کے مقالات اور صاحبِ صدر پروفیسر حسین الحق کی تقریر نے اس سیشن کو گرما دیا۔تیسرے سیشن کی صدارت وہاج الدین علوی نے کی۔ان کی صدارتی تقریر کے علاوہ حسین الحق اور ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے نے بھی فیض کے حوالے سے بڑی اچھی اچھی باتیں کیں لیکن پروفیسر مظہر مہدی کا انگریزی کا مقالہ دوہرے طور پر پسند آیا۔ایک تو انہوں نے فیض کے ہاں ارضِ وطن کے ساتھ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ارضِ وطن کے رہنے والوں کے لیے محبت کے زاویے کو ابھارا۔اپنے نفسِ مضمون کے لحاظ سے انہوں نے ایک نازک مگر اہم نکتہ کو ابھارا تھا جس پر ابھی مزید کام کرنے کی گنجائش ہے۔مظہر مہدی کا مقصد بھی یہی تھا کہ فیض کے مطالعہ میں روایتی باتوں سے ہٹ کر کسی نئے زاویے سے نظر ڈالی جائے۔

دوسری دلچسپ بات جو مجھے شدت سے محسوس ہوئی۔ایک تو مظہر مہدی چہرے مہرے سے دیو آنند سے ملتے جلتے لگتے ہیں، دوسرے ان کے بولنے کا بلکہ عام بات کرنے کا انداز بھی بار بار دیو آنند کی یاد دلاتا

ہے۔اس خوشگوار احساس کے ساتھ یہ سیشن اختتام پذیر ہوا تو میں نے بلاتکلف انہیں اپنے تاثر سے آگاہ کر دیا، مظہر مہدی میرے دیو آنند اسٹائل والے انکشاف پر تھوڑا سا حیران ہوئے اور پھر مسکرا کر رہ گئے۔

سیمینار کے بعد خورشید اقبال کے ساتھ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔وہاں انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کولکاتا کے اردگرد رہنے والے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ میری ایک ملاقات کرانا چاہتے ہیں۔اس کے لیے ۲۳ مارچ کی شام طے پا گئی۔وہاں دیر تک خورشید اقبال، بلند اقبال اور محمد انتخاب عالم کے ساتھ گپ شپ ہوتی رہی۔

۲۱ مارچ کو سیمینار کا دوسرا دن تھا۔گیسٹ ہاؤس سے بروقت سیمینار ہال میں پہنچ گیا۔یہاں پھر ایک بری خبر سننے کو ملی۔علی احمد فاطمی اور علی جاوید جنہیں اس سیمینار میں آنا تھا۔ان میں سے علی احمد فاطمی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ واقعی گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکیں گے، جبکہ علی جاوید نے کل شام تک وعدہ کیا تھا کہ وہ ۲۱ مارچ کو سیمینار کے دوسرے دن لازماً پہنچیں گے۔تھوڑی سی خوشی تھی کہ چلو فاروقی صاحب سے نہیں تو علی جاوید سے تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔انہوں نے ۲۰ مارچ کی شام کو اپنا آنا کنفرم کیا تھا لیکن ۲۱ مارچ کو ان کی طرف سے اطلاع آگئی کہ ان کی فلائیٹ مس ہوگئی ہے۔ایسا ہی ہوا ہوگا۔چونکہ اتنے اہم شرکا غیر حاضر ہوگئے تھے اس لیے طے ہوا کہ ۲۱ مارچ کے تینوں سیشنز کو ایک سیشن میں مکمل کر لیا جائے اور دوسرے مرحلہ میں مشاعرہ کر لیا جائے۔چنانچہ قاضی جمال حسین کی صدارت میں یہ تھری ان ون سیشن شروع ہوا۔پروفیسر منصور عالم، پروفیسر ایم فیروز، فاطمہ حسن اور حیدر قریشی کے مضامین کے بعد قاضی جمال حسین نے صدارتی تقریر کی۔ڈاکٹر شہناز نبی نے تمام شرکاء اور حاضرین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔اس کے ساتھ ہی سیمینار اختتام پذیر ہوا۔

حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے پروفیسر خالد سعید کے ساتھ ابھی حاضرین کی صف میں ہی بیٹھا تھا، فاطمہ حسن بھی ساتھ تھیں۔خالد سعید کہنے لگے کہ آج شام کو ہم گیسٹ ہاؤس میں ملیں گے اور اطمینان سے گفتگو ہوگی۔فاطمہ حسن سے بھی کہا کہ آج شام کو ہم تینوں مل کر بیٹھیں گے۔لیکن ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مجھے کہنے لگے میری طبیعت خراب ہو رہی ہے، طبی امداد کے لیے کسی سے کہیں۔میں نے فوراً شہناز نبی کو آگاہ کیا اور چند منٹ کے اندر ڈاکٹر خالد سعید کو طبی امداد کے لیے لے جانے کا انتظام ہو گیا۔بعد میں اللہ کے فضل سے وہ ٹھیک ہوگئے، تاہم سیمینار کے دوران ایسی صورت حال کا پیش آنا سب کے لیے فکرمندی کا باعث بن گیا۔میں نے میہیر کمار چکرورتی کو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پریشان

ہوتے دیکھا۔ بہر حال اس ساری پریشان کن صورت حال کے باوجود سیمینار خیر وخوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ سیمینار کے بعد مشاعرہ کا اعلان کیا گیا۔ مشاعرہ کی صدارت فاطمہ حسن نے کی۔ میں اس وجہ سے مشکل میں پڑ گیا کہ سیمینار کی بھاگم بھاگ میں مجھے اپنا کوئی شعر یاد نہیں آرہا تھا۔ ڈائس چھوڑ کر ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری کے شبیر احمد کو ڈھونڈتا پھرا، وہ ملے تو ان سے اپنی کتاب ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' مستعار مانگی۔ انہوں نے میری مشکل آسان کر دی اور یوں میرے لیے اس اچانک مشاعرہ کو بھگتانے میں آسانی ہوگئی۔

مشاعرہ کے بعد ڈائس سے اترا تو بہت سارے دوست احباب کے ساتھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے بہت سارے طلبہ وطالبات مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے۔ کلکتہ کے شاعر حسن آتش تو جیسے آتشِ شوق کے ساتھ ملنے آئے ہوئے تھے۔ ایک طرف طلبہ وطالبات آٹوگراف لینے اور تصویر بنوانے کے لیے گھیرے ہوئے تھے، دوسری طرف پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی دور سے کھڑی ڈانٹ کر بلا رہی تھیں کہ سارے مندوبین پہنچ گئے ہیں، صرف آپ رہ گئے ہیں، جلدی آجائیں۔ بہر حال پانچ چھ طلبہ وطالبات کو بمشکل آٹو گراف دے سکا، دو چار کے ساتھ تصاویر بن سکیں اور پھر جانا پڑ گیا۔ وہاں سارے مندوبین کی جنرل سکریٹری ایشیاٹک سوسائٹی سے ملاقات تھی۔ وہ سب سے سیمینار کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کر رہے تھے۔ ڈاکٹر خالد سعید کی علالت بھی موضوع گفتگو رہی۔ اس ملاقات کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی کا میوزیم دیکھنے گئے۔ اسی دوران دلیپ رائے نے میرے ہوائی سفر کے جملہ اخراجات، ویزہ فیس سمیت ادا کر دیئے، لیکن یہ رقم انڈین روپوں میں تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے یہ رقم یورو میں ہی چاہیے۔ تنگ وقت کے باوجود ڈاکٹر عقیل احمد عقیل کی خصوصی توجہ سے دلیپ رائے نے ہمت سے کام لیا اور باضابطہ طور پر رقم کی یورو میں تبدیلی کرا کے مجھے ادائیگی کر دی گئی۔ میوزیم کی انچارج بیتالی چٹرجی نے خاص طور کرم فرمایا، میں جو رقم کی وصولی کے چکر میں باقی ساتھیوں سے کچھ لیٹ ہو گیا تھا، انہوں نے مجھے خود لے جا کر میوزیم کے مخطوطات کے حصے کو دیکھنے کا موقعہ دیا۔

کولکاتا کے حوالے سے ہماری درسی معلومات فورٹ ولیم کالج کی حد تک رہی ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ ادارہ ۱۷۸۴ء میں قائم کیا گیا تھا تو اپنی کم علمی کا افسوس ہوا۔ پھر اس ادارہ کی ویب سائٹ سے لے کر وکی پیڈیا تک اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو افسوس میں شرمندگی بھی شامل ہوگئی۔ لیکن اس سب کے باوجود میرے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مجھے اس ادارہ

نے نہ صرف باوقار طریقے سے بلایا، بلکہ میرے سفر کی راہ میں حائل ویزہ کے حصول کی رکاوٹوں کو بھی دور کیا اور مجھے نہایت عزت واحترام کے ساتھ اس سیمینار میں شریک کیا۔ اس کے لیے میں پروفیسر میہیر کمار چکرورتی، پروفیسر پلب سین گپتا، اور ڈاکٹر شہناز نبی سب کا انتہائی شکرگزار ہوں۔ اسی ادارہ کے دلیپ رائے، بیتالی چٹرجی، شبیر احمد اور یہیں پر ملنے والے ڈاکٹر عقیل احمد عقیل سب کا شکریہ ادا کرنا واجب سمجھتا ہوں کہ جن کی رفاقت نے میرے لیے اس سیمینار میں شرکت کو مزید خوشگوار بنا دیا۔

۲۲ مارچ کو مجھے کریم رضا مونگیری اپنے گھر لے گئے۔ وہاں کچھ دیر انٹرنیٹ پر کام کیا۔ اپنی تقریر کو ان پیج فائل میں لکھ کر انٹرنیٹ کے دو فورمز پر ریلیز کیا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک اخبار نے افتتاحی تقریر کو خاصی کوریج دی، میرے لیے چار کالمی سرخی خوشی کا باعث تھی لیکن رپورٹنگ میں بہت سارا خلط ملط ہو گیا تھا۔ نوجوان رپورٹر کی رپورٹنگ کے سقم میرے اپنے حوالے سے کنفیوژن پیدا کر سکتے تھے۔ اب اخبار کی تردید کرنا یا کسی نوعیت کی وضاحت کرنا مناسب نہ تھا، کیونکہ جو کچھ ہوا تھا، اس میں بدنیتی کا کوئی دخل نہ تھا، اس کا حل مجھے یہی مناسب لگا کہ میں اپنی تقریر کا متن ہی جاری کر دوں۔ تقریر کا متن جاری کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سارے دوست احباب انٹرنیٹ کے ذریعے میرے اس سفر میں ہم رکاب ہو گئے۔

شام کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کولکاتا کی جانب سے ان کے لائبریری ہال میں فاطمہ حسن اور میرے ساتھ ایک استقبالیہ اور مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت میرے حصہ میں آئی، مہمانِ خصوصی فاطمہ حسن تھیں۔ میرے ہاتھ سے ایک دو کتابوں کی رونمائی بھی کرائی گئی۔ سلیمان خورشید نے بڑی محبت کے ساتھ فاطمہ اور میرے ادبی کام کے بارے میں بات کی، مسلم انسٹی ٹیوٹ کی جملہ خدمات کا ایک خاکہ سا بیان کیا۔ پھر مشاعرہ ہوا۔ مشاعرہ میں ہم دونوں مہمانوں کے علاوہ عنبر شمیم، ف۔س۔ اعجاز، فراغ روہوی، نوشاد مومن، احمد معراج، خواجہ احمد حسین، وقیع منظر، دمیق القادری، معراج احمد معراج، ارم انصاری، جمیل حیدر شاد، شمیم انجم وارثی، ڈاکٹر عقیل احمد عقیل، کوثر پروین، نیر اعظمی، حلیم صابر، انجم عظیم آبادی نے اپنے کلام سے نوازا۔ ماہیا نگار دوستوں نے اپنے دوسرے کلام کے ساتھ چند ماہیے بھی پیش کیے۔ نعیم انیس نے اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔ یہاں مجھے دو خوشگوار تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ نعیم انیس نے یونیورسٹی کے زمانے میں میرے پہلے شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' پر ایک مضمون لکھا تھا، انہوں نے اسے اپنے مضامین کے مجموعہ میں بھی شامل رکھا تھا۔ مضامین کا مجموعہ ''اظہار'' ۱۹۹۹ء میں چھپ گیا تھا۔ اور آج جب میں مسلم انسٹی ٹیوٹ میں پہنچا تو نعیم انیس نے مجھے اپنی کتاب کا تحفہ عنایت

کیا۔دوسرا تجربہ یہ ہوا کہ تقریب کے حوالے سے ایک بینر آویزاں کیا ہوا تھا جس پر دائیں اور بائیں جانب فاطمہ حسن کی اور میری تصویریں بنائی گئی تھیں۔میں ایسی خوشیوں کو کسی مصنوعی شانِ استغنا کے اظہار کی خاطر دبا لینے کا قائل نہیں ہوں۔اس طرح بینر پر اپنی تصویر دیکھ کر بچوں جیسی خوشی ہوئی۔

میں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کلکتہ شہر سے میرا ادبی و قلبی تعلق بہت پرانا ہے۔پہلا حوالہ شہناز نبی کا بنتا ہے، پھر عنبر شمیم کے دستک میں مجھے چھپنے کا موقعہ ملتا رہا۔وہاں ایک دو ایسی چیزیں بھی چھپیں جو بعد میں کسی ہنگامہ خیز بحث میں بطور حوالہ درج ہوئیں۔ف۔س۔اعجاز کے رسالہ میں گاہے بگاہے چھپ جاتا ہوں لیکن ''انشاء''میں میرے وہ مباحث خاص اہمیت کے حامل رہے جو ماہیا کے بانی کی تحقیق میں کلیدی نوعیت کے مضمون شمار ہوئے۔اردو ماہیا کے بانی ہمت رائے شرما۔۔۔میری کتاب چھپنے سے پہلے''انشا''میں شائع ہوا۔اسی طرح نوشاد مومن کے مژگاں میں بھی مجھے ماہیا کے خدو خال واضح کرنے کے لیے ایک اہم مضمون لکھنے کی توفیق ملی۔کلکتہ وہ شہر ہے جہاں خالصتاً ماہیا مشاعرہ بھی برپا ہوا،عبدالرزاق ملیح آبادی اور قیصر شمیم نے اس مشاعرہ کی صدارت کی تھی۔فراغ روہوی،نسیم فائق ،شمیم انجم وارثی،اور متعدد دیگر اچھے شعرا نے ماہیا نگاری میں اپنے امکانات کو آزمایا اور ماہیے کے دامن کو وسیع کرنے میں قابلِ ذکر کام کیا۔یہ وہی سال ہے جب پاکستان میں سرگودھا میں ایک ماہیا مشاعرہ ہوا تھا اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کی صدارت کی تھی۔اردو دوست ڈاٹ کام والے خورشید اقبال کو بھی کولکاتا میں ہی شمار کیا جانا چاہیے۔ان کے ساتھ میرا تعلق کئی جہات پر پھیلا ہوا ہے۔خورشید اقبال کے ذریعے مجھے کلکتہ سے انٹرنیٹ کی دنیا میں داخل ہونے کا موقعہ ملا۔یہاں کے ماہیا نگاروں سے اور دوسرے شعرا و ادبا سے میرا رابطہ کسی نہ کسی رنگ میں بنا رہا ہے۔اب نعیم انیس سے مل کر جو کچھ سامنے آیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی رابطے کے بغیر بھی ادبی محبت کرنے والے دوست موجود ہیں۔میں یہاں ایشیا ٹک سوسائٹی کی جانب سے بلایا گیا ہوں لیکن مجھے خوشی ہے کہ اس بہانے مجھے یہاں کے دوسرے دوستوں سے ملنے کا موقعہ بھی مل رہا ہے۔اسے میں اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔

اس پروگرام کے دوران ہی کینیڈا سے عبداللہ جاوید اور شہناز خانم عابدی کا فون آ گیا لیکن مختصر بات کر کے فون بند کرنا پڑا۔کل ۲۳ مارچ کو کامٹی، ناگپور سے ڈاکٹر صبیحہ خورشید مجھے ملنے کے لیے اپنے بڑے بھائی شاہد یوسفی کے ساتھ لگ بھگ چوبیس گھنٹے کا سفر کر کے کولکاتا پہنچ رہی ہیں۔اس سلسلہ میں کریم رضا مونگیری نے ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔انہوں نے کہا کہ میں علی الصبح انہیں اسٹیشن

سے لے کر گھر کے قریب کسی ہوٹل میں ٹھہرانے کا انتظام کروں گا اور جب وہ تازہ دم ہو جائیں گے تو انہیں لے کر یونیورسٹی میں پہنچ جاؤں گا۔کریم رضا مونگیری اس کے بعد گھر چلے گئے اور ہماری بھی گیسٹ ہاؤس میں واپسی ہوئی۔فاطمہ حسن نے کل علیٰ الصبح دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا،اس لیے انہوں نے بھی اپنا کھانا میرے کمرے میں منگا لیا۔کھانا کھانے کے دوران ہی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر مظہر مہدی بھی میرے کمرے میں آ گئے۔دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔فاطمہ حسن نے چونکہ کل صبح سویرے ہی چلے جانا تھا،اس لیے وہ سونے چلی گئیں اور ان کے جانے کے بعد بھی میری کافی دیر تک مظہر مہدی کے ساتھ مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔اور گفتگو کا مزہ بھی آتا رہا۔

۲۳ مارچ کو مجھے گیسٹ ہاؤس چھوڑ دینا تھا۔سو میں سارا سامان پیک کر کے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ساڑھے نو بجے ڈاکٹر شہناز نبی مجھے لینے کے لیے آ گئیں۔رستے میں کہیں سے ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے کو بھی ساتھ لیا اور ہم کلکتہ یونیورسٹی پہنچے۔یہاں شعبہ اردو نے دو روزہ ٹیگور سیمینار کا اہتمام کیا ہوا تھا۔۲۲ اور ۲۳ مارچ کو۔لیکن ۲۲ مارچ کو تقسیم اسناد کی تقریب کے باعث سیمینار کو ایک دن میں محدود کرنا پڑا ۔لیکن یہ ایک دن پوری طرح پورے دن پر محیط تھا۔شہناز نبی نہ خود ادھر اُدھر ہوئیں نہ مندوبین یا حاضرین میں سے کسی کو ہلنے دیا۔ایشیا ٹک سوسائٹی کے صدر پلب سین گپتا بھی پہلے سیشن میں تشریف فرما تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے بارے میں اچھی اچھی باتیں سننے کو ملیں۔مجھے ٹیگور سے متعارف ہونے کا موقعہ مل رہا تھا۔شاعر،نثر نگار،مصور ٹیگور کو اس کے اپنوں نے بری طرح نظر انداز کیا لیکن اس کا فن اپنے زور پر آگے بڑھا۔برصغیر کی واحد ادبی شخصیت جسے ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز سے نوازا گیا۔انور ظہیر کے مقالہ سے ٹیگور سے صحیح معنوں میں ملاقات ہو سکی۔وہ بتا رہے تھے کہ ٹیگور مذہبی جکڑ بندیوں کو توڑ کر خدا سے محبت اور تعلق قائم کرنے کے قائل تھے۔میں اس بات کو ہلکی سی ترمیم کے ساتھ یوں مانتا ہوں کہ کسی توڑ پھوڑ کی ضرورت نہیں ہے،انسان کسی بھی مسلک کا ہو،اگر اس کی جستجو سچی ہے تو مذہب کی ظاہری سطح سے اوپر اُٹھ کر خدا سے محبت اور تعلق کو قائم کر سکتا ہے۔انور ظہیر میری طرح جوگندر پال کے چاہنے والے نکلے اور ہم دونوں ٹیگور سیمینار کے ڈائس پر بیٹھے دیر تک جوگندر پال کی باتیں کرتے رہے۔

سیمینار کے دوران یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلر ممتا رئے کچھ دیر کے لیے تشریف لائیں۔میری خوش قسمتی کہ وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھیں۔لیکن اس وقت میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے جب انہوں نے بتایا کہ وہ صرف بنگالی یا انگریزی میں بات کر سکتی ہیں۔اب کیا کیا جائے؟ بہر حال جیسے تیسے

بولنے کی کوشش کی ۔میں اسے ممتارئے کے ساتھ بیٹھنے کا اثر ہی کہوں گا۔میرے جیسا بندہ جس کی انگریزی ''ہاؤڈویوڈو'' کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے،ممتارئے نے انگریزی میں گفتگو شروع کی تو پتہ نہیں کیسے میں بھی فر فر انگریزی بولنے لگا۔سچ ہے پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت کا اچھا اثر ہوتا ہے۔

اسی دوران کریم رضا مونگیری دونو جوانوں کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے تو میں نے اندازہ کرلیا کہ ان میں ایک ڈاکٹر صبیحہ خورشید ہیں اور دوسرے ان کے بھائی شاہد یوسفی۔ان سے دور سے ہی سلام دعا ہو سکی۔دن بھر سیمینار چلتا رہا فیض سیمینار ہو یا ٹیگور سیمینار ان سب تقریبات کی روحِ رواں پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی ہیں۔۔میں کچھ دیر کے لیے ہال کی آخری سیٹ پر صبیحہ خورشید کے ساتھ بیٹھا تو پانچ منٹ کے بعد ہی اسٹیج سے اعلان کیا گیا کہ حیدر قریشی ڈائس پر تشریف لے آئیں۔سو جانا پڑا۔دوسرے سیشن میں مجھے پریزیڈیم میں شامل کر دیا گیا۔گویا اسٹیج سے ہلنا نہیں۔ڈاکٹر عقیل احمد عقیل بھی ڈائس پر آ گئے تھے۔میں کچھ ریلیکس سا ہو گیا۔اس دوران میرے حصے کے آئے ہوئے میرے دوستوں کے فون کریم رضا مونگیری وصول کرتے رہے اور وہی انہیں جواب دیتے رہے۔سیمینار کے آخر میں مجھے اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے بلایا گیا تو ٹیگور کے مجسمہ والا لطیفہ یہاں سنا دیا۔ادب میں روحانی حوالے سے میں خود کو ٹیگور کے قریب سمجھ سکتا ہوں۔انہیں جانے بغیر میں جس انداز میں لکھ رہا ہوں، وہ لگ بھگ ویسا ہی ہے جیسا ٹیگور کے ہاں ذکر کیا جاتا ہے۔مجھے یاد آیا اور میں نے ذکر کر دیا کہ کہیں پڑھا تھا کہ ٹیگور کو نوبل پرائز ملنے کی ٹائم لکیر کھینچ لی جائے۔تو اس کے ایک طرف علامہ اقبال ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کہہ رہے ہیں اور دوسری طرف ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہہ رہے ہیں۔کیا واقعی ایسا ہے؟ یہ تحقیق طلب معاملہ ہے۔اسے سنجیدگی کے ساتھ تفتیشی انداز کے بغیر جو کوئی بھی کر لے،اقبالیات کے حوالے سے ایک اچھا کام ہوگا۔

یہ سیمینار ختم ہوا تو صبیحہ خورشید اور ان کے بھائی شاہد یوسفی سے ملاقات ہوئی۔ہمیں اب ایک اور سفر پر جانا تھا۔آج ہی ۲۳ مارچ کی شام کو شِب پور میں اردو دوست ڈاٹ کام اور ہوڑہ میں ایم نصراللہ نصر کی ادبی تنظیم کی جانب سے ایک خاص تقریب ''حیدر قریشی سے ایک ملاقات'' کا انتظام کیا گیا تھا۔یہاں کلکتہ کے مضافات کے بیشتر اہم شعراء قیصر شمیم،خورشید اقبال،ڈاکٹر مشتاق انجم،ایم نصراللہ نصر، رحمت امین، احمد کمال حشمی ،بلند اقبال،عظیم انصاری،فراغ روہوی،نور پیکار،فیروز مرزا،جاوید مجیدی،وفا صدیقی،شمس افتخاری،احسن شفیق،ارشاد آرزو،ڈاکٹر شبیر ابروی،فہیم انور،علیم

الدین علیم،ڈاکٹر نور بھارتی،ارشد نیاز،نجم العالم،اور متعدد دیگر احباب آئے ہوئے تھے۔کلکتہ کے بزرگ اور اہم شاعر قیصر شمیم خصوصی طور پر شرکت کے لیے تشریف لائے۔ان کی صدارت میں یہ تقریب ہوئی۔پہلے تو دوستوں نے محبت کے پھولوں سے لاد دیا۔پھر خورشید بھائی نے شال کا خاص تحفہ عطا کیا۔پھر تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔یہاں جب میری تعریف وتوصیف میں پانچویں تقریر ہونے لگی تو میں نے قیصر شمیم صاحب کے کان میں درخواست کی کہ ان ساری محبتوں کا بوجھ بہت بڑھتا جا رہا ہے،اس سلسلہ کو رکوائیے۔انہوں نے کرم کیا اور میری کیفیت سے اسی وقت حاضرین کو آگاہ کر دیا گیا۔صبیحہ خورشید نے اردو ماہیا پر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تیاری کے دوران اپنے تجربات میں سے چند خاص باتیں بتائیں اور بتایا کہ کس طرح انہوں نے ثابت قدمی سے اس پروجیکٹ کو مکمل کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اس ضمن میں میرا بھی ذکر ہونا تھا،سو ہوا۔جب ہم شِب پور پہنچے تھے تب ڈاکٹر صبیحہ خورشید نے اپنا مقالہ ہاتھوں میں اُٹھا رکھا تھا۔دھان پان سی بچی کے ہاتھ میں اتنا بھاری بھرکم مقالہ دیکھ کر قیصر شمیم صاحب آگے بڑھے،صبیحہ کے ہاتھ سے مقالہ لیتے ہوئے کہنے لگے بیٹے! آپ نے اپنے وزن سے زیادہ بڑا کام کرلیا ہے۔ماشاءاللہ۔ بہر حال اب تک کی تقاریر کے بعد طے پایا کہ مزید تقاریر کی بجائے جن احباب نے مجھے پڑھ رکھا ہے وہ اس حوالے سے کوئی سوال کریں اور اس طرح براہ راست مکالمہ کی صورت بن سکے۔یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دوستوں نے میری بیشتر تحریروں کو پڑھ رکھا تھا اور ان کے سوالات بھی بڑے نپے تلے تھے۔چنانچہ مجھے ان ساری باتوں کا جواب دیتے ہوئے بہت خوشی ہوئی۔یہی کیفیت سارے دوستوں کی تھی۔یہاں بہت سارے شعرائے کرام کی موجودگی کے باوجود کوئی مشاعرہ نہیں کیا گیا، بلکہ ادبی حوالے سے مکالمہ جیسی صورت حال بن گئی، مجھے کسی بھی مشاعرہ سے زیادہ ایسی تقریب کا مزہ آتا ہے۔یہاں میرے ساتھ ہونے والی تقریب کا بینر پہلے والی تقریب کے بینر سے بھی زیادہ خوبصورت بنا ہوا تھا۔سو اسے دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ خوشی ہوئی۔میں خورشید اقبال کے سارے دوستوں کی محبت سے جھولی ہی نہیں جیبیں بھی بھر کر لے جا رہا تھا۔کریم رضا مونگیری اس پورے دن کی تقریبات میں ہمہ وقت ساتھ رہے۔اپنے سارے کام کاج کو تج کر وہ ہر جگہ میرے میزبان تھے۔تقریب اپنے اختتام کو پہنچی تو سارے دوستوں سے مل کر کریم رضا مونگیری کے ساتھ واپسی کا سفر شروع ہوا۔صبیحہ خورشید اور شاہد یوسفی ہوٹل میں گئے اور ہم کریم رضا مونگیری کے گھر پہنچے۔دن بھر کی مصروفیت نے کسی حد تک تھکا دیا تھا سو تھکن کے باعث اچھی نیند آئی۔

۲۴ مارچ کو اطمینان سے بیدار ہوئے۔اس سے بھی زیادہ اطمینان کے ساتھ ناشتہ کیا۔دوپہر کے کھانے کے لیے فراغ روہوی نے اپنے گھر پر مدعو کر رکھا تھا۔اطمینان سے ان کے گھر پہنچے۔مہمان نوازی کے کتنے ہی لوازمات موجود تھے،ادھر میں شوگر اور دل کے معاملات سے بچنے کے لیے بہت پرہیز کرنے پر مجبور تھا۔پھر بھی گھر والوں نے انواع واقسام کے اتنے کھانے تیار کیے تھے،اب انہیں کچھ نہ کچھ تو چکھنا تھا۔کریم رضا مونگیری،صبیحہ خورشید،شاہد یوسفی کو میرے جیسے پرہیز کا کوئی مسئلہ نہیں تھا،سو انہوں نے اطمینان سے اور مزے سے کھانا کھایا۔بعد میں فراغ روہوی کی صاحب زادی ملنے آئیں۔ایم اے کی طالبہ ہیں اور شعر بھی کہتی ہیں۔یہ جان کر خوشی ہوئی۔اللہ شاعری کے میدان میں بھی اور عملی زندگی میں بھی کامیاب وکامران کرے۔

فراغ روہوی سے اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ویسے تو کریم رضا مونگیری چیف ایڈیٹر روزنامہ عکاس کولکاتا ہمہ وقت میرے ساتھ تھے۔جب میں ایشیاٹک سوسائٹی کے گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھا تب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو کریم رضا ہی کرم فرماتے۔تاہم آج شام کو انہوں نے ادارہ عکاس کولکاتا کی جانب سے ''ایک شام حیدر قریشی کے نام'' کر رکھی تھی۔آج کے عکاس میں اس سلسلہ میں ایک رنگین با تصویر اشتہار صفحہ اول پر دیا گیا تھا۔تقریب کے لیے مسلم انسٹی ٹیوٹ کولکاتا کا لائبریری ہال لیا گیا تھا۔جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ عکاس میں جو دیدہ زیب اشتہار چھپا ہوا تھا،اسی کا بینر وہاں سجا ہوا تھا۔میرے ساتھ ذاتی حیثیت میں یہ تیسری تقریب تھی اور ہر تقریب منانے والوں نے اپنا الگ بینر بنوایا تھا۔ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے نظامت کے فرائض ادا کیے۔کریم رضا مونگیری تقریب کے صدر تھے۔حیدر قریشی صاحبِ شام اور ڈاکٹر صبیحہ خورشید مہمان خصوصی تھیں۔شبیر اصغر کی کتاب ''معصوم کہانیاں'' کی رونمائی بھی اس موقعہ پر کی گئی۔ڈاکٹر عقیل احمد عقیل کے تعارفی وتوصیفی کلمات کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔انجم عظیم آبادی،حلیم صابر،عنبر شمیم،فراغ روہوی،احمد کمال حشمی،خورشید اقبال،خواجہ احمد حسین،مجسم ہاشمی،ارم انصاری،نوشاد مومن،انجم نایاب،طالب صدیقی،اگم شرما،فیروز اختر،نسیم فائق،بشریٰ سحر نے اپنے کلام سے نوازا۔ڈاکٹر صبیحہ خورشید نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔میں نے اپنا کلام سنانے سے پہلے کہا کہ مرزا غالب کلکتہ میں آئے تھے۔جب واپس دہلی گئے تو کلکتہ کو یاد کر کے ہائے ہائے کرتے رہے۔میراجی تو کلکتہ بھی نہیں گئے اور لاہور میں ہی کلکتہ کے ''میرا سین'' نامی تیر کے ایسے گھائل ہوئے کہ ثناء اللہ ڈار سے ہمیشہ کے لیے میراجی بن گئے۔میں نے یہاں اتنی اپنائیت،اتنا خلوص اور اتنی محبت پائی ہے کہ

باقی کی ساری زندگی اسی کے سرور میں گزر جائے گی۔کولکاتا کا یہ سفر میری زندگی کا یادگار سفر بن گیا ہے۔میرے کلام سنانے کے بعد کریم رضا مونگیری نے صدارتی کلمات سے نوازا۔اور یوں یہ خوبصورت تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔تقریب کے بعد بہت سارے دوست ملنا چاہ رہے تھے۔اسی دوران ایک انگریزی اخبار سے منسلک لیڈی اور ایک اردو اخبار کے رپورٹر کچھ انٹرویو کرنا چاہ رہے تھے۔میں نے انگریزی والی لیڈی کے چند سوالوں کے جواب دے کر کہا کہ بہتر ہے آپ مجھے ای میل سے سوالات بھیج دیں،میں ایک ہی دن میں جواب لکھ کر بھیج دوں گا۔یہی بات اردو اخبار والے صحافی سے کہی۔لیکن بعد میں کسی کی کوئی ای میل نہیں آئی۔

۲۵ مارچ کو صبح سویرے دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا۔کریم رضا مونگیری نے سارا انتظام کر رکھا تھا۔صبیحہ خورشید اور ان کے بھائی شاہد یوسفی بھی بیدار ہو کر اور تیار ہو کر آ گئے تھے۔سو بروقت ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔بروقت وہاں پہنچے۔کریم رضا مونگیری،ڈاکٹر صبیحہ خورشید،شاہد یوسفی سب کو خدا حافظ کہا۔اور بورڈنگ کارڈ کے حصول کے لیے اندر داخل ہو گیا۔سارے مرحلے خیر وخوبی سے طے ہوئے اور مقررہ وقت پر جہاز میں سوار ہو گیا۔دہلی پہنچ کر بارہ بجے کے لگ بھگ غالب انسٹی ٹیوٹ میں پہنچا۔وہاں کے گیسٹ ہاؤس میں میری رہائش کا انتظام کر دیا گیا تھا۔جاتے ہی شاہد ماہلی سے ملاقات ہوئی۔ہم ایک مدت کے بعد لیکن چوتھی بار ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔انسٹی ٹیوٹ میں ''غالب کے عہد میں فارسی'' کے موضوع پر سیمینار ہو رہا تھا۔میں اپنے کمرہ میں چلا گیا اور کچھ تازہ دم ہو کر وہاں سے پھر انسٹی ٹیوٹ میں آ گیا۔سیمینار جاری تھا تاہم اس وقت کھانے کا وقفہ تھا۔کھانا کھایا۔سیمینار کے آخری سیشن میں شرکت کی۔ڈاکٹر صادق وہاں آ گئے۔ڈاکٹر شاہینہ پہلے سے موجود تھیں۔عمر کیرانوی سے ملاقات ہوئی۔یہ نوجوان جدید ادب کے ابتدائی شماروں میں میرے ساتھ تھے۔ان کے تعاون سے کافی سہولت میسر رہی تھی۔ایک عرصہ سے یہاں انسٹی ٹیوٹ میں کمپیوٹر سیکشن کو سنبھالے ہوئے ہیں اور تن تنہا سنبھالے ہوئے ہیں۔جرمنی سے روانہ ہونے سے پہلے جب میں نے مظفر گڑھ میں افضل چوہان کو انڈیا جانے کی اطلاع دی تو انہوں نے کہا کہ وہاں میرے ایک دوست ہیں بابو لال شرما۔گاندھی فاؤنڈیشن کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔وہ آپ سے ملنے آئیں گے۔ان سے رابطہ ہو گیا تھا،چنانچہ وہ بھی ملنے کے لیے تشریف لے آئے۔کچھ عرصہ قبل ہی ان کا دل کا بائی پاس ہوا ہے۔اس کے باوجود ۲۵ سے ۲۷ مارچ تک ہر روز ملنے کے لیے غازی آباد سے تشریف لاتے رہے۔میں شاہد ماہلی کے دفتر میں تھا جب ڈاکٹر شاہینہ

نے آکر کہا کہ باہر چند طلبہ آپ کے ساتھ تصویر بنوانا چاہتے ہیں۔ باہر آکر طلبہ کی فرمائش پوری کی۔ پھر دفتر میں جا کر بیٹھے تو ایک صاحب اندر آئے اور کہنے لگے آپ کا فون ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کسی انجان بندے کے موبائل پر میرا فون کیسے آسکتا ہے۔ سنا تو دوسری طرف سکریتا پال کمار بول رہی تھیں اور بتا رہی تھیں کہ پاپا آپ سے ملنے کے لیے بہت زیادہ بے چین ہیں۔ اس لیے آپ کو ڈھونڈ کر بتا رہی ہوں۔ اب بتائیے کب ہمارے ہاں آنا ہے؟۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پہلے ہی سے طے کر چکا ہوں کہ کل یعنی ۲۶ مارچ کا آدھا دن جوگندر پال جی کے ساتھ گزاروں گا۔ ان کے بعد ترنم ریاض سے رابطہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ وہ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں آج ڈنر کا انتظام کر چکی ہیں۔ ترنم ریاض کے ایک صاحب زادے علیل تھے۔ ان کے شوہر پروفیسر ریاض کی طبیعت بھی کچھ ناساز تھی۔ ایسی حالت میں ڈنر کا انتظام کرنا، خاصا مشکل کام تھا۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر اعلیٰ سوسائٹی کا ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں کانفرنس ہال کی سہولت کے علاوہ ریستوران سروس بھی ہوتی ہے لیکن صرف ممبران کے لیے۔ میں سرسوں کا ساگ اور دال کھانے کے موڈ میں تھا۔ اونچی دوکان پھیکا پکوان کے برعکس کھانا بھی بہت عمدہ تھا۔ ساگ اور دال کو ملا کر کھانا مجھے ہمیشہ اچھا لگا ہے۔ یہاں ایک ادیب دوست سید محمد اشرف سے ملاقات ہوئی۔ واپسی کے وقت سید محمد اشرف نے مجھے انسٹی ٹیوٹ میں ڈراپ کرنے کی پیش کش کر دی جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔ وہاں پہنچے تو میں نے ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کی ایک جلد ان کی نذر کی۔ انہوں نے بلاتکلف کہا کہ آپ دو دن کے لیے دہلی میں آئے ہیں، کہیں آنے جانے کے لیے گاڑی کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیں، میں انتظام کر دوں گا۔ میں نے ہلکی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ کہہ دیا کہ ہاں کل مجھے جوگندر پال جی کے ہاں جانا ہے۔ انہوں نے وقت پوچھا۔ میں نے ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان کا وقت دے دیا۔ ۲۶ مارچ کو پونے گیارہ بجے کے قریب ان کی طرف سے گاڑی آگئی۔ اور میں اطمینان سے جوگندر پال جی سے ملنے چلا گیا۔

۲۶ مارچ کو صبح سویرے نوجوان صحافی مطیع الرحمٰن عزیز مجھے ملنے کے لیے آگئے تھے۔ نوجوان اور تازہ دم ہیں اس لیے بہت کچھ کر گزرنے کو بے تاب رہتے ہیں۔ ان کی یہی خوبی مجھے ہمیشہ اچھی لگی۔ ان کے ساتھ بہت ساری باتیں ہوئیں۔ جب جوگندر پال جی کے ہاں جانے کا وقت ہوا تو انہیں گاڑی میں ساتھ بٹھا لیا اور رستے میں ان کے کسی قریبی مقام پر انہیں ڈراپ کر دیا۔

جوگندر پال جی کے ہاں پہنچا تو وہ گھر کے دروازے کے باہر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ بڑی

محبت کے ساتھ ملے۔ گھر کے اندر جا کر بیٹھے۔ بھابی کرشنا پال کچھ دیر کے لیے کسی کام سے گئی تھیں، کچھ دیر کے بعد وہ بھی آگئیں۔ جوگندر پال جی کے ساتھ بہت ساری باتیں ہوئیں لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ بات کر کے بھول جاتے ہیں اور پھر اسی بات کو بتانے لگتے ہیں۔ ایک بات پوچھتے، جواب ملنے کے کچھ دیر بعد پھر وہی سوال پوچھنے لگتے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یادداشت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ایک اور تجربہ ایسا ہوا کہ بہت اداس کرنے والا بھی تھا اور خوشی کا ایک رنگ بھی اس میں شامل تھا۔ میرے سامنے ایک دوست کا فون آیا۔ ان کا نام راجکمار ملک تھا، میں نے تھوڑی سی بات کر کے فون جوگندر پال جی کو دے دیا۔ ان سے کچھ دیر بات کرتے رہے۔ بات ختم کر کے فون واپس کیا تو بھابی کرشنا نے ریسیور لے لیا، انہیں ریسیور دیتے ہوئے کہنے لگے ''حیدر قریشی کا فون تھا''۔ اس پر بھابی کرشنا نے بتایا کہ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا ہے کہ فون پر کسی اور سے بات کرتے رہتے ہیں اور جب بات ختم ہوتی ہے تو کہتے ہیں حیدر قریشی کا فون تھا۔ میں دہلی شہر میں جوگندر پال جی کو آج کے عہد کے ادبی تخلیقی سطح کے دلی کا دل سمجھتا ہوں، اور مجھے یہ دیکھ کر ایک لحاظ سے خوشی ہوئی کہ میں ادب کی دلی کے دل میں اس حد تک بستا ہوں۔ تاہم یہ دکھ کی بات بھی تھی کہ ایسا ذہین تخلیق کار عمر گزرنے کے ساتھ اپنی یادداشت کھو رہا تھا۔ دراصل بعض باتیں ان کے اندر کھب کر رہ گئی تھیں ورنہ باقی ساری باتیں معمول کے مطابق ہی کر رہے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا کی باتیں، اکبر حمیدی کی باتیں، رشید امجد اور منشا یاد کا ذکر، اور بھی بہت ساری باتیں معمول کے حساب سے کر رہے تھے، بس چند باتیں اور سوال ایسے تھے جنہیں وقفے کے بعد پھر بتانے یا پوچھنے لگتے تھے۔ دوپہر کا کھانا جوگندر پال جی کے ہاں کھایا۔ وہیں چند تصویریں بنائیں۔ جوگندر پال جی کے سٹڈی روم میں، ڈرائنگ روم میں اور ڈائننگ ٹیبل سے تھوڑا سا ہٹ کر۔۔۔۔تصویریں بنائیں۔ بھابی کرشنا پال بہت زیادہ کمزور ہوگئی ہیں، تاہم ان کی یادداشت ذرا بھی کمزور نہیں ہوئی۔ اردو فکشن کے جدید تر اور اہم ترین فکشن رائٹر جوگندر پال جی سے زندگی میں ایک بار پھر ملنا میری خوش بختی تھی۔ یہ ایک یادگار ملاقات تھی، خوشی اور اداسی کی مختلف کیفیتوں سے بھیگی ہوئی ملاقات۔ چار بجے کے قریب ان کے گھر سے جانے کی اجازت طلب کی۔ وہ نہ صرف گھر سے باہر تک بلکہ گلی کی سڑک کے آخری سرے تک چھوڑنے آئے۔ انہیں خدا حافظ کہا اور میری گاڑی منداکنی انکلیو سے غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ میں پہنچا تو عمر کیرانوی کے ذریعے انٹرنیٹ کی سہولت میسر آئی۔ میں اپنے کولکاتا کے سفر کی جو مختصر خبریں انٹرنیٹ پر ریلیز کرتا رہا تھا، ان پر ردِ عمل آیا ہوا تھا۔ دوستوں نے بہت

زیادہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔ابھی انٹرنیٹ پر ہی تھا کہ ڈاکٹر صادق آ گئے۔سو کمپیوٹر کو چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ بابو لال شرما،عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ، کیول دھیر، ڈاکٹر خالد علوی،شاہد ماہلی، دوست آتے گئے اور ایک کشادہ کمرے میں گفتگو کا دلچسپ سلسلہ چلتا رہا۔بعض حساس علمی مسائل پر سنجیدہ گفتگو سے لے کر بعض باتوں پر بے تکلفانہ گپ شپ بھی ہوتی رہی۔ڈاکٹر خالد علوی اور عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ کے درمیان نوک جھونک کا اپنا ایک انداز تھا۔اس گپ شپ سے اس وقت اٹھنا پڑا جب معلوم ہوا کہ تقریب کا وقت ہو گیا ہے۔غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی جانب سے یہ میرے ساتھ ایک شام کا اہتمام تھا۔شاہد ماہلی کی محبت کا اظہار تھا۔اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ ڈاکٹر رضا حیدر نے اسٹیج سیکریٹری کے فرائض ادا کیے۔جیسے ہی پروگرام شروع ہوا،میرے موبائل پر مبارکہ کا فون آ گیا۔میں نے صورت حال سے آگاہ کیا کہ پروگرام شروع ہو گیا ہے۔اور ساتھ ہی کہا کہ چلیں اسی بہانے آپ بھی فون کر کے پروگرام کا حصہ بن گئی ہیں۔غالب انسٹی ٹیوٹ کی روایت کے مطابق مجھے شاہد ماہلی نے انسٹی ٹیوٹ کی کتابوں کے سیٹ کا تحفہ عنایت کیا،جبکہ صاحبِ صدر نے محبت کے پھول عطا کیے۔رضا حیدر،شاہد ماہلی،عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ،ڈاکٹر صادق،ڈاکٹر خالد علوی،ڈاکٹر خلیق انجم،ڈاکٹر کیول دھیر اور صدیق الرحمٰن قدوائی نے میرے بارے میں اپنے اچھے جذبات کا اظہار کیا۔توصیف کا پہلو یہاں بھی نمایاں تھا تاہم یہ سب دوست ایک توازن کے ساتھ بات کر رہے تھے،جو مجھے خود بھی اچھی لگ رہی تھی۔اہم بات یہ تھی کہ سارے دوست میری تازہ ترین ادبی سرگرمیوں سے نہ صرف پوری طرح باخبر تھے بلکہ ان کی تعریف بھی کر رہے تھے۔میں نے اپنی چند غزلیں،نظمیں، ماہیے سنانے کے ساتھ اپنے افسانہ ”میں انتظار کرتا ہوں“ کے آخری دو پیراگراف سنائے۔ یہ تقریب خیر و خوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔کولکاتا میں تین دن دو سیمینارز میں مصروف گزرے اور مختلف اداروں کی جانب سے تین تقریبات میرے اعزاز میں ہوئیں۔دہلی میں دوروزہ قیام کے دوران بھی ایک تقریب ہو گئی۔گیارہ دنوں کے سفر میں سات دن مسلسل تقریبات میں گھرے رہنا،میری زندگی کا بھرپور اور یادگار سفر بن گیا ہے۔باقی وقت بھی دوست احباب سے ملاقاتوں میں ہی بسر ہوا۔ یہ سارے پروگرام اگر خود ہی دوستوں کو خرچہ دے کر سجائے گئے ہوتے یا کسی دوسرے دوست کو اشارا کر کے ترتیب دلائے ہوتے،(جیسا کہ ہمارے ”بین الاقوامی“ شاعر،ادیب اپنے اعزاز میں کراتے رہتے ہیں) تو میرے لیے یہ سب کچھ بے معنی ہوتا۔فیض سیمینار کے علاوہ باقی سارے پروگرام ازخود اور میری دستیابی کے باعث ہنگامی طور پر ترتیب پاتے چلے گئے۔اسی

لیے میں اس سفر کو اپنی زندگی کا یادگار سفر سمجھتا ہوں۔

۲۶ مارچ کو تقریب کے بعد معید رشیدی کا فون آ گیا۔ان سمیت چند اور دوستوں کے ساتھ مراسم میں ایک خاموش سا کھچاؤ آ گیا تھا۔میری کوشش رہی ہے کہ اچھے دوستوں کے ساتھ تعلقات میں کوئی خرابی آ جائے تو خاموشی اختیار کر لینی چاہیے۔اگر غلط فہمی دور ہو سکے تو اچھا ہے ورنہ معاملہ دشمنی کی حد تک نہیں جانا چاہیے۔ہاں البتہ اگر کوئی دوست بے لحاظی کی ساری حدیں پار جائے اور حقائق کو مسخ کرنے لگے تو پھر ریکارڈ درست رکھنے کے لیے تھوڑا بہت حساب سامنے لانا پڑتا ہے۔معید رشیدی کے ساتھ تو بہت ہلکا سا کھچاؤ تھا۔اس لیے میں نے دہلی آ کر بھی انہیں اطلاع نہیں دی۔انہیں جیسے ہی میری آمد کا علم ہوا،فوراً فون کیا۔اور بڑی اپنائیت کے ساتھ کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ دہلی آئیں اور ہماری ملاقات نہ ہو۔۲۷ مارچ کو میری کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی، چنانچہ دن کا پہلا حصہ ان کے نام ہوا۔

۲۷ مارچ کو علی الصبح اردو اخبارات دیکھے۔گزشتہ شام کو ہونے والی تقریب کی خبر تقریباً ہر اخبار نے شائع کی تھی۔تاہم نادیہ ٹائمز نے تو کمال کر دیا۔اس اخبار کی ہیڈ لائن تھی ”حیدر قریشی کے اعزاز میں جلسے کا اہتمام“۔اسی دن کے اخبار کے اندر کے صفحہ نمبر ۴ پر میری فیض سیمینار والی افتتاحی تقریر کا پورا متن دیا ہوا تھا اور ساتھ ہی وہ ساری رپورٹس شائع کی گئی تھیں جو میں کولکاتا سے انٹرنیٹ پر جاری کرتا رہا تھا۔اس خصوصی توجہ کے لیے نادیہ ٹائمز کے احمد رئیس صدیقی اور مطیع الرحمٰن عزیز دونوں کا شکر گزار ہوں۔ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے نادیہ ٹائمز کی کوریج کے حوالے سے بہت ہی مزے کی ایک میل بھیجی۔۲۷ مارچ کو ابھی ان خبروں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ معید رشیدی، فیاض وجیہہ، اظہار ندیم اور طارق اقبال کے ساتھ آ گئے۔ان کے ساتھ مل کر بہت اچھا لگا۔جن باتوں کی غلط فہمی تھی، ان پر کھل کر بات ہوئی۔موضوع زیرِ بحث کے کئی اور پرت کھلے، کچھ نئے انکشاف ان کی طرف سے ہوئے تو ایک دو دلچسپ اور افسوسناک قصے میں نے بھی انہیں بتائے۔(بعد میں کہیں سے ملنے والی ایک ای میل انہیں فارورڈ بھی کر دی)۔اسی دوران معلوم ہوا کہ فیاض وجیہہ،ڈاکٹر مظہر مہدی کے شاگرد ہیں۔ڈاکٹر مظہر مہدی کے ساتھ طے ہوا تھا کہ دہلی میں ملاقات کی کوئی صورت دیکھیں گے۔انہیں دہلی میں موجود اپنی کتاب ”عمرِ لاحاصل کا حاصل“ کی ایک جلد دینا تھی۔فیاض وجیہہ نے اسی وقت فون پر رابطہ کرا دیا۔ان کے ساتھ طے ہوا کہ میں ان کے حصے کی کتاب فیاض وجیہہ کو دے دوں۔سو سپردم بہ تو مایۂ خویش را!

دوپہر کا کھانا ہم سب نے ایک ساتھ کھایا۔دوپہر کو دوستوں کا یہ گروپ مل کر چلا گیا تو میں نے

تھوڑا سا آرام کیا۔ پھر انسٹی ٹیوٹ میں آیا تو ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر خالد علوی اور بابو لال شرما جی آ گئے، شاہد ماہلی پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان سب کے ساتھ گفتگو رہی۔ بابو لال شرما بتا رہے تھے کہ پاکستان جانے کے لیے انہیں روانگی سے ایک دن پہلے ویزہ دیا گیا۔ دونوں ملکوں کے سفارت خانے اپنی کسی خاموش پالیسی کے تحت اسی طرح ویزے جاری کر رہے ہیں۔ جانے والے آخری دن تک بے یقینی اور تذبذب کا شکار رکھے جاتے ہیں۔ دونوں طرف کے سفارت خانوں کا یہ ان لوگوں کے ساتھ سلوک ہے جو دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو بہتر دیکھنے کے آرزومند ہیں۔

عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ نے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وعدہ کے باوجود نہیں آئے، سوان کے اور ڈاکٹر خالد علوی کے درمیان ہونے والی مزید نوک جھونک کے لطف سے محروم رہ گئے۔ لیکن اتفاق سے مجھے نہرو فیملی کے حوالے سے پڑھے گئے ایک تازہ مضمون کا خیال آ گیا اور میں نے ڈاکٹر خالد علوی سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس مضمون کے بعض حساس مندرجات کو یکسر غلط قرار دیا۔ پھر انہوں نے دلیل کے طور پر ایسے شواہد اور حوالہ جات پیش کیے کہ ان کی بات کا قائل ہونا پڑا۔ اسی گفتگو کے تناظر میں آج کے بعض سیاست دانوں اور بعض معروف ایکٹریسوں کے جنسی سکینڈلز کی بات بھی نکل آئی۔ ایک دو شادی شدہ اور مشہور ترین ایکٹریسوں کے بارے میں جان کر شدید حیرانی ہوئی۔ اسی کا نام دنیا ہے، بلکہ فلمی دنیا ہے۔ آج کا الوداعی ڈنر ڈاکٹر صادق کی طرف سے تھا۔ ایک مقامی ہوٹل میں گئے۔ کھانا بہت عمدہ تھا، میری تمام تر احتیاط کے باوجود بد پرہیزی ہو گئی۔ پھر شاہد ماہلی اور ڈاکٹر صادق کو خدا حافظ کہا۔ رات کو آرام سے سوئے۔ اگلے دن ۲۸ مارچ کو میری جرمنی کے لیے روانگی تھی۔ مطیع الرحمٰن عزیز مجھے ائر پورٹ تک الوداع کرنے کے لیے آ گئے۔ ائر پورٹ تک کا سفر ان کے ساتھ ہند میں اردو صحافت کے موضوع پر بات کرتے گزرا۔

انڈیا میں صحافت کے مرکزی دھارے پر انگریزی، ہندی اور لگ بھگ ہر صوبے کی صوبائی زبان کے اخبارات کی کمانڈ ہے۔ عمومی طور پر ان سب میں تال میل کی ایک صورت بھی موجود ہے۔ اردو صحافت کے معاملہ میں ایسا لگا کہ یہ مرکزی دھارے سے بالکل الگ تھلگ دنیا ہے۔ بے شک انہیں نظر انداز کیے جانے میں کئی عوامل کارفرما ہوں گے، لیکن اردو صحافیوں کو خود آگے بڑھ کر مرکزی دھارے کا حصہ بننے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ کوٹہ سسٹم کے تحت چند مراعات پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا اخبارات کے مالکان کے لیے ''چلو یہ بھی غنیمت ہے'' جیسا ہو سکتا ہے، لیکن اردو صحافت کا مجموعی کردار اور تاثر اس سے بہت محدود

ہوتا جا رہا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کئی اردو اخبارات کے مالکان ہندو ہیں لیکن یہ دیکھ کر تشویش بھی ہوئی کہ ہندو مالکان کے اخبارات بھی مسلمانوں میں سستی جذباتیت کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ مسلمانوں کو حال مست بنائے رکھنے کی بجائے انہیں زمانے کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کاوشیں کی جائیں تو یہ ہند کے مسلمانوں کے لیے مفید ہو سکیں گی۔ مطیع الرحمٰن عزیز نے مجھے اور میں نے انہیں دہلی ائر پورٹ پر خدا حافظ کہا اور پھر میں ائر انڈیا کی فرینکفرٹ والی پرواز کے لیے معمول کی کارروائی سے گزرتا گیا۔ مقررہ وقت پر جہاز روانہ ہوا اور آدھے گھنٹے کی تاخیر سے فرینکفرٹ پہنچ گیا۔ بڑے بیٹے شعیب نے ائر پورٹ سے مجھے لیا اور ہم خیر و عافیت سے اپنے گھر پہنچ گئے۔

کولکاتا اور دہلی کا یہ سفر میری زندگی کا یادگار سفر ثابت ہوا ہے۔ اس سے ادبی کانفرنسوں، سیمینارس اور تقریبات کے سلسلہ میں میرے پہلے خیالات مزید مستحکم ہوئے ہیں۔ ان تقریبات کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ ادیب دوست ایک دوسرے سے مل بیٹھتے ہیں۔ باقی نشستند، خوردند، برخواستند۔ میری کتاب ''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' کے صفحہ نمبر ۴۳۲۔۴۳۳ پر کلکتہ میں مجھ سے ادبی محبت رکھنے والوں کا ہلکا سا ذکر ہے۔ بارہ تیرہ برس پہلے لکھا گیا یادوں کا باب (اُن دیکھے، پر جانے دوست) تب گلبن میں چھپا تھا۔ اس میں رؤف خیر کے ایک خط کا اقتباس بھی شامل تھا۔ انہوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ حیدر آباد دکن سے کلکتہ گئے تو وہاں کے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ وہاں کے دوستوں کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا:

''حکومتِ مغربی بنگال کی دعوت پر کلکتہ گیا جہاں ٹیپو سلطان صدی تقاریب کے سلسلے میں ایک کُل ہند مشاعرہ ۳ مئی کو منعقد ہوا۔ وہیں ماہیا نگاروں سے ملاقاتیں رہیں۔ فراغ روہوی، ضمیر یوسف، نسیم فائق، نوشاد مومن، محسن باعشن حسرت وغیرہ وغیرہ سب آپ کے عشق کے گرفتار نکلے یعنی ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

آپ پر بڑا رشک آتا ہے کہ آپ رہتے کہاں ہیں اور کہاں کہاں اپنے چاہنے والے پیدا کر رکھے ہیں''

اپنی یادوں کے اس باب میں کلکتہ کے حوالے سے میں نے جو کچھ شامل کیا ہے، یہ سفر اس سے کہیں زیادہ بڑی سطح پر اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ تو اصل بات تو وہی ہے جو میں نے بارہ تیرہ برس پہلے سے لکھی ہوئی تھی، ۲۰۱۲ء میں ایسے شواہد سامنے آ گئے جن سے اس لکھے کی توثیق ہوئی۔ تو نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ اچھا

تخلیق کار اپنے گھر میں بھی بیٹھا رہے تو اس کا لکھا ہوا اپنی واضح شناخت رکھتا ہے۔کسی تقریب میں شرکت یا عدم شرکت سے کسی کے قد کاٹھ میں کوئی علمی و ادبی اضافہ نہیں ہوتا۔ ہر ادیب بنیادی طور پر وہی کچھ ہے اور اتنا ہی ہے جتنا وہ اپنی تخلیقات میں موجود ہے۔

میں ناشکر گزاری نہیں کر رہا،ایک بار پھر ایشیاٹک سوسائٹی کے جنرل سیکریٹری پروفیسر میہیر کمار چکرورتی، پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی، کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرے لیے ہر سطح پر اس سفر کو آسان اور ممکن بنایا۔کریم رضا مونگیری،خورشید اقبال اور شاہد ماہلی کا بہت زیادہ شکریہ کہ انہوں نے مجھے اس سفر میں ویسی ہی عزت بخشی جیسی ہمارے روابط میں پہلے سے دیا کرتے ہیں۔فرداً فرداً اُن تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جن کی رفاقت نے میرے اس سارے سفر کو اتنا خوشگوار، شاندار اور یادگار بنا دیا۔اللہ سب کو خوش رکھے۔اور اب ایک خاص نوعیت کی ادبی سیاسی فضا کے پس منظر کے باعث یہ بات اظہارِ تشکر کی سرشاری کے ساتھ بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ربِ کریم نے نے ’’ہمارے کر دیئے اونچے منارے!‘‘

یہاں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب سمجھتا ہوں جنھوں نے میرے اس سفر کے دوران انٹرنیٹ پر میری مصروفیات کی خبریں پڑھ کر مجھے اپنی خوشی اور دلی جذبات سے آگاہ کیا۔اور اس طرح سے اس سفر میں کسی نہ کسی طور میرے ساتھ شریک رہے۔ان دوستوں کے چند اہم اسماء یہاں درج کر رہا ہوں۔

راجہ محمد یوسف خان (جرمنی)،سعید شباب (خانپور)،حسن چشتی (شکاگو)،ارشد خالد (اسلام آباد) ، جبار واصف (رحیم یار خاں)،کاوش عباسی (سعودی عرب)،مبشر میر (گجرات)،راحت سعید (کراچی) ،یعقوب نظامی (انگلینڈ)، پروفیسر وارث شیر (کینیڈا)، پروین شیر (کینیڈا)،عبداللہ جاوید (کینیڈا) ، شہناز خانم عابدی (کینیڈا)،عبدالرب استاد (گلبرگہ)، ہاجرہ بانو (اورنگ آباد)، ماسیمو بون (اٹلی)، میخائل گرابر (فرینکفرٹ)، ناصر عباس نیر (لاہور)، ناصر نظامی (ہالینڈ)، ناصر علی سید (پشاور)، خادم علی ہاشمی (ملتان)، واجد علی (بھاولپور) ، ڈاکٹر رضیہ حامد (بھوپال)، ڈاکٹر امجد پرویز (لاہور)، نصر ملک (ڈنمارک)، خورشید علی (جرمنی)، خلیق الرحمٰن (انگلینڈ)، محمد افضل چوہان (مظفر گڑھ)، ڈاکٹر فریاد آزر (دہلی)، اویس جعفری، صادق باجوہ (امریکہ)، ڈاکٹر ریاض اکبر (آسٹریلیا)، عبدالحئی، ڈاکٹر پنہاں (امریکہ)، سریندر بھوٹانی (پولینڈ)، معید رشیدی (دہلی)، اظہار ندیم (دہلی) ، ڈاکٹر عقیل احمد عقیل

(کولکاتا)، سید انور جاوید ہاشمی (کراچی)، ڈاکٹر رضیہ اسماعیل (برمنگھم)، قاسم یعقوب (اسلام آباد)، احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)، اسحاق ساجد (جرمنی)، مقصود الٰہی شیخ (بریڈ فورڈ) ، مستبشرہ ادیب (علی گڑھ)، خالد ملک ساحل (جرمنی)، طاہر ملک (جرمنی)، ڈاکٹر حامد اشرف (اودگیر) ، سہیل اختر (بھوبھنیشور)، ڈاکٹر مظہر مہدی (دہلی)، شاہد جمیل (گوجرانوالہ)، طاہر عدیم (جرمنی)، ارم ہاشمی۔ (میانوالی)

جب سے میں نے اس سفر کی روداد کا یہ بلاگ بنایا ہے،

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

خوشی کا ردِ عمل ظاہر کرنے والے دوستوں کی ای میلز کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔سو سب ہی خواہوں کا اور محبت کرنے والوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی زندگی کے اس یادگار سفر کی روداد کو مکمل کرتا ہوں۔

عکاس انٹرنیشنل۔اسلام آباد۔شمارہ:اگست۔۔۲۰۱۲ء

یادوں کے باب ''روح اور جسم'' اور افسانہ ''اپنے وقت سے تھوڑا پہلے'' پر تاثرات

جب میں چلنے کو تھا، آپ یعنی حیدر قریشی ''جسم اور روح'' پر بزبان تحریر بات کرتے مل گئے۔ موضوع میرا اپنا خاص اور بولنے والا اپنا خاص (جو بھی بھلا لگا وہ بڑی دیر سے ملا)، رُکنا ہی پڑا۔ یہ کیسا اسلوبِ بیان ہے کہ بات سے بات جُڑی ہوئی چل رہی ہے، کبھی خراماں خراماں، کبھی رواں، دواں، کبھی بہہ رہی ہے موج در موج، سیل در سیل، جیسے ہوا۔ اصل موضوع کا یہ حال کہ چلتے چلتے، بہتے بہتے بالکل غائب اور پھر غیر محسوس طریقے سے دوسری باتوں کے درمیان ایک بار پھر نمودار۔۔ خیال، فکر، احساس، ادراک، اپنے طور پر ہر قسم کی قید و بند سے آزاد جیسے سب اپنے طور پر اپنے اپنے کاموں میں مصروف، باہم آمیز ہو کر بھی اور جدا جدا بھی ایک غیر محسوس اسلوب کے بنتوں (ٹکسچر) میں بندھے ہوئے۔ بظاہر دھاگے اُلجھے الجھے اِدھر اُدھر نکلتے ہوئے اور پھر خود بخود جُڑتے ہوئے، جیسے کبھی اُدھڑے ہی نہ تھے۔ عرفانِ روح کے مذہب کے راستے کے علاوہ دوسرے راستوں کی نشاندہی نے مضمون کے دامن کو زیادہ معنی خیز بنا دیا لیکن موضوع کو تشنہ رہنا تھا، سو رہا۔ اصل لطف تو طفلانہ معصومیت، حیرانی اور تجسس کی تحت موجی نے دیا جو مجھ سے کم مایہ قاری سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ باتوں کا سلسلہ اس دوران آپ کی تحریر ''اپنے وقت سے تھوڑا پہلے'' کی سرحد میں داخل ہو چکا ہے۔ جسم اور روح سے بھی زیادہ گھمبیر اور گہرے معاملے سے ہم اور آپ دوچار ہیں لیکن لفظیات کا تانا بانا قطعی مختلف ہے۔ حیران کن۔۔ عجیب طرح کا ہلکا پھلکا پن، ایک مکمل سپردگی، ایک کامل تسلیم و رضا بلکہ راضی بہ رضا والی کیفیت کی فضا میں ایقان کو چھونے والا یہ احساس کہ انسان کی مساعی ہی قدرت کی پراسرار قوتوں کو مشکل کشائی، تعاون اور سرپرستی کی جانب راغب کرتی ہے۔ لاٹری۔۔ نوجوان، رقم سے معمور سوٹ کیس، پولیس۔۔ درمیان میں آپ پولیس کے نرغے میں۔۔ ٹرین سے چھوٹے بیٹے کا اترنا۔ تبدیلیٔ شخصیت و شناخت۔۔ پراسرار معاملات۔ کشف کے، وجدان کے، جذب کے، ماہیت قلبی کے، جیسے کوئی شمس تبریز کسی جلال الدین رومی کو قیل و قال کی پستی سے مرتبۂ حال کی بلندیوں پر لے جا رہا ہو۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

(مکتوب مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی شمارہ نمبر ۱۱۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء)

سلطان جمیل نسیم (کینیڈا): اِن ذائقوں کی وجہ سے یہ خوبی بھی پیدا ہو گئی ہے کہ ہر پیمانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کو اپنی یادوں کے میخانے بھی یاد آ جاتے ہیں اور وہ حیدر قریشی کی کھٹی میٹھی یادیں پڑھتے پڑھتے اپنی تلخ و ترش یادوں کا ذائقہ بھی چکھنے لگتا ہے....جیسے میں....میرے ساتھ تو یہ ہوا کہ تقریباً ہر پیراگراف پڑھنے کے بعد ذہن کے اندھیرے میں پڑی ہوئی اپنی کوئی بھولی بسری یاد، یکا یک جگمگ کرتی ہوئی سامنے آتی رہی ہے۔۔۔کھٹی میٹھی یادیں۔ کے بارے میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ ان سوانحی یادوں میں اپنے بزرگوں کے لئے احترام، ہم عمروں کے محبت اور چھوٹوں کے لئے شفقت و پیار کا اظہار نہایت خلوص کے ساتھ ملتا ہے۔ اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ قریشی صاحب کو روحانیت سے بھی لگاؤ ہے۔ اپنی اس بات کے ثبوت میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' میں سے وہ پہلا جام اٹھالیں جس پر ''بزمِ جاں'' کا لیبل لگا ہوا ہے۔ آخری بات کے طور پر یہی کہوں گا کہ رواں دواں اندازِ تحریر نے بھی ان یادوں کو پڑھنے کے قابل ایسا بنا دیا ہے کہ بقول حضرتِ صبا اکبرآبادی ؎ سارے میخانے کو اک سانس میں کیسے پی لوں

۔۔۔حیدر قریشی نے بھی اپنی یادوں کو کھٹا اور میٹھا کرنے کے لئے الفاظ کی مٹھاس اور کھٹاس استعمال کی ہے لیکن مجھے اِن کے الفاظ میں غیروں کے لئے اور اُن لوگوں کے لئے بھی خاص طور سے جنھوں اِن کے ساتھ مناسب اور اچھا سلوک نہیں کیا تلخی اور ترشی کم ہی محسوس ہوئی ہے۔۔۔شاید لفظوں کا احترام کرنے والوں کا یہی شیوہ ہے۔

صفیہ صدیقی (انگلینڈ): آپ کی ''کھٹی میٹھی یادیں'' بہت پُر لطف ہیں اور میں تو ادبی دیانت داری کو بہت اہم سمجھتی ہوں۔ آپ نے جس طرح صاف صاف سب کچھ جو آپ نے محسوس کیا وہ لکھ دیا یہ آپ کی خوبی ہے۔ اسی طرح ''میری محبتیں'' بھی آپ کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ''محبت کی نمناک خوشبو'' میں آپ نے اپنی آپی کا جس طرح تذکرہ کیا ہے اسے پڑھ کر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش میری بھی کوئی ایسی محبت کرنے والی بڑی بہن ہوتی۔ ''پسلی کی ٹیڑھ'' میں آپ نے اپنی شریکِ حیات کا جس انداز میں تذکرہ کیا ہے اس سے بے انتہا مسرت ہوئی۔ ورنہ عموماً ہمارے معاشرے میں والدین کے انتخاب کردہ شوہر بیوی میں زیادہ تر ساری عمر ''سرد جنگ'' سی جاری رہتی ہے۔ وہ شریک سفر تو ہوتے ہیں' شریکِ زندگی نہیں۔

ڈاکٹر شفیق احمد (بھاولپور): انہوں نے اپنی بعض تحریروں کے لیے یادنگاری کی اصطلاح وضع کی ہے اور اس میں جن موضوعات پر لکھا ہے وہ اس سے پہلے اُردو ادب میں کہیں نہیں ملتے۔ ہمارے ہاں ایک مشکل یہ بھی آ پڑی ہے کہ لوگ تخلیقی فکر کے چکر میں سچ سے دور چلے جاتے ہیں یا پھر ان کے سچ میں سے تخلیقی عنصر غائب ہو جاتا ہے۔ حیدر قریشی کے ہاں یہ دونوں مشکل صورتیں پیدا نہیں ہوئیں۔

منزہ یاسمین (بھاولپور): حیدر قریشی کی یہ خودنوشت جب کتابی شکل میں سامنے آئے گی تو ممکن ہے ترمیم واضافہ سے یہ آج سے قدرے مختلف ہو مگر یہ بات طے ہے کہ اپنے سادہ و پرکار انداز اور گذری زندگی کی سچی کھری اور کھٹی میٹھی یادیں پڑھنے والے پر ایک بھرپور تاثر ضرور چھوڑیں گی۔

ڈاکٹر لئیق صلاح (حیدرآباد دکن): ان کے خودنوشت سوانح سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں دعا مانگتے ہیں قبولیت کا یقین بھی ہے۔ اور مایوسی وناامیدی کو کفر سمجھتے ہیں۔تصوف سے بھی واقفیت ہے۔مسئلہ جبروقدر کے بارے میں جو تجزیہ انہوں نے کیا ہے وہ بالکل منفرد انداز کا ہے۔حیدر قریشی احساس کمتری کا شکار نہیں ہیں۔کیونکہ انھوں نے جرمنی پہنچنے پر اپنے جن تاثرات اظہار کیا ہے۔ان سے بیوی کی برتری ثابت ہوتی ہے،اور یہ ان کی روشن خیالی ووسیع النظری ہے۔۔۔اس سوانح کا سب سے خاص وصف حیدر قریشی کا اسلوب ہے۔مختلف موضوعات پر مبنی یہ سوانح ہے۔لیکن کہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ قلم کی روانی میں فرق آیا ہے۔خواہ وہ مل کا حال ہو یا تعلیم و تدریس کا موضوع یا پھر کھیل کا بیان یا دیگر تذکرے۔موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب،طرز ادائے بیان،جن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ان کی تحریر میں بے ساختگی کے علاوہ شگفتگی بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر حامد اشرف (اودگیر): حیدر صاحب نے بعنوان کھٹی میٹھی یادیں' تصنیف کے ذریعے ایک نئی صنف "یادنگاری" کی اردو میں بنا ڈالی ہے۔۔۔۔(مضامین) یہ ثابت کرتے ہیں کہ ادب مسرت زائی کا سر چشمہ ہے۔ان مضامین میں واقعات کی پیش کشی اور اسلوبِ نگارش کی شان پوشیدہ ہے' جس سے حیدر صاحب کے دل کی مخفی دھڑکنوں کا اظہار ہوتا ہے۔

انوار احمد اعجاز (گوجرانوالہ): عکاس 15 کے شمارے میں زندگی کا یادگار سفر کے عنوان سے آپ کی کھٹی میٹھی یادیں پڑھنے کا نہ صرف موقع ملا۔بلکہ آپ کی رفاقت اور ہمسفری کا لطف بھی ملا۔تھوڑے سے دنوں پر محیط یہ سفر اتنی بے پناہ یادیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔آپ نے ان سب کو بڑی خوبصورتی سے اردو کے دامن میں سمو کر ایک یادگار ادبی خدمت سرانجام دی۔خدا آپ کو خوش رکھے۔۔۔۔۔ٹیگور کے مجسمے والے واقعے کو پڑھ کر ان کی اپنی ناقدردانی کے احساس کو جاننے کا موقع ملا کہ کیسے اتنے بڑے بڑے لکھاری بھی اپنوں کی بے اعتنائی کو جھیلتے رہے۔بہر حال آپ نے اپنی لحہ بہ لحہ یادوں کو جس طرح سے محفوظ کیا اور اپنے چاہنے والوں کو جس

طرح سے مربوط صورت میں پیش کیا اس پہ آپ کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

کرشن مہیشوری (راج کوٹ): جب کبھی ہم اپنی بیتی یادوں کو اپنے ذہن میں دہراتے ہیں تو ایک عجیب احساس ذہن کو معطر کرتا ہے۔یہی یادیں جب صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جائیں تو کبھی اسے سوانح نگاری،تو کبھی خاکہ نگاری کا نام دیا جاتا ہے۔حیدر قریشی نے اپنی ایسی یادوں کو''کھٹی میٹھی یادیں'' کا نام دیا ہے اور اسے یادنگاری کے زمرے میں رکھا ہے۔

حیدر کی یہ یادیں پڑھ کر حیدر کے حافظہ اور اندازِ بیان پر حیرت ہوتی ہے اور داد دینے کو جی چاہتا ہے۔اکثر روزمرہ کی باتیں ہمیں یاد نہیں رہتیں۔اکثر یادیں وقت کے ساتھ مدھم نقوش بن کر رہ جاتی ہیں۔دھندلی دھندلی۔۔۔مدھم مدھم۔۔۔اور اگر واضح ہوں بھی تو انہیں حیدر کے انداز میں تحریر کرنا؟۔۔یہ بھی ایک کمال ہے۔حیدر کی کھٹی میٹھی یادیں پڑھ کر ایسا تاثر قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ اپنے ماضی سے ہمیشہ جڑے رہنا چاہتے ہیں۔وہ اپنی یادوں کے ساتھ خوش رہنا چاہتے ہیں۔ایک طرف انہیں انسانی ترقی پر خوشی ہوتی ہے تو دوسری طرف انسانی دلوں میں وقتاً فوقتاً گھٹتی محبت کا گلہ بھی ہے۔۔۔۔۔۔۔حیدر قریشی کی ''کھٹی میٹھی یادیں'' حکایتِ دراز اور لذیذ تر ہیں۔ایسی دلکش اور فرحت بخش یادیں جو قاری کو مکمل طور پر جکڑنے کے بعد ایک بار پھر مطالعہ کے لئے اکساتی ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان (پشاور): ہمارے برخوردار حیدر قریشی۔۔۔میں انہیں مغربی دنیا میں اردو کا سب سے بڑا ادیب مانتا ہوں اور ان کی صلاحیتوں کے سامنے اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف کرتا ہوں۔حیدر،ون مین ادبی رائٹنگ کی انڈسٹری ہیں۔پورا رسالہ کمپیوٹر پر ہی بیٹھ کر مرتب کرتے ہیں۔۔میرے برخوردار ہیں۔مجھ سے عمر میں دس برس کم،لیکن کام وصلاحیت میں سو سال بڑے۔

نصر ملک (ڈنمارک): جرمنی میں مقیم اردو ادب کی منفرد و بے مثال شخصیت،حیدر قریشی ہمارے عہد کے وہ ادیب وشاعر اور نقاد ومحقق ہیں کہ جنہیں مشرق ومغرب میں اردو ادب کا ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوٹ کہا جانا چاہیے۔

Doris Weber (چیف ایڈیٹر پبلک فورم۔فرینکفرٹ) حیدر قریشی کی داستانِ حیات،ایک سچ ہے لیکن اسے پڑھتے ہوئے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی افسانہ پڑھ رہے ہوں۔

حیدرقریشی۔۔شخص وعکس

مرتّب: ارشدخالد

مدیرعکاس انٹرنیشنل(اسلام آباد)

نام: قریشی غلام حیدرارشد

قلمی نام: حیدرقریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور

پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر۱۹۵۳ء '

درست خاندانی روایت:۱۳؍جنوری ۱۹۵۲ء

مقامِ پیدائش: چناب نگر(سابق ربوہ)

آبائی علاقہ: رحیم یارخاں،خان پور(سابق ریاست بھاولپور)

تعلیم: ایم اے(اردو)

ادبی سفر کا آغاز: ۱۹۷۱ء

اصنافِ ادب: **شاعری میں:** غزل،نظم،ماہیا

نثر میں:

افسانہ،خاکہ،انشائیہ،سفرنامہ،یادنگاری،تحقیق وتنقید،حالاتِ حاضرہ

....

کتب کی تفصیل:

شاعری

سلگتے خواب(غزلیں)،ناشر:تجدید اشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ۱۹۹۱ء

عمرِ گریزاں(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)،ناشر:تجدید اشاعت گھر لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

محبت کے پھول(ماہیے)،ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

دعائے دل(غزلیں،نظمیں)ناشر:نصرت پبلشرز لاہور۔مطبوعہ۱۹۹۷ء۔

چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں،نظمیں،ماہیے** ناشر:سروراد بی اکادمی۔جرمنی۔مطبوعہ۱۹۹۸ء۔

دردِ سمندر(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)یہ مجموعہ کلیات’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘میں شامل کیا گیا ہے۔

تخلیقی نثر

روشنی کی بشارت(افسانے)ناشر:تجدید اشاعت گھر،اسلام آباد،لاہور۔مطبوعہ۱۹۹۲ء۔

قصے کہانیاں(افسانے)یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا۔**افسانے** میں شامل ہے۔

افسانے(روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں ایک جلد میں)،ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ۱۹۹۹ء۔

ایٹمی جنگ(تین افسانے اردو اور ہندی میں)ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ۱۹۹۹ء۔

میں انتظار کرتا ہوں(افسانوں کا ہندی ترجمہ)ناشر:ساہتیہ بھارتی،دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

AND I WAIT (اب تک کے سارے افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۸ء

میری محبتیں(خاکے)،ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

میری محبتیں(خاکے)،ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔

کھٹی میٹھی یادیں(یادنگاری)پہلے یہ الگ سے شائع نہیں کی،عمرِ لاحاصل کا حاصل میں شامل ہے۔

اب۲۰۱۳ میں تین ابواب کے اضافوں کے ساتھ پاکستان سے الگ کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔

ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز،خان پور۔ مطبوعہ۲۰۱۳ء

سُوئے حجاز(سفرنامہ۔عمرہ کا احوال)،ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۰ء۔

سُوئے حجاز(سفرنامہ،سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ)،ناشر:سروراد بی اکادمی جرمنی۔مطبوعہ۲۰۰۴ء۔

فاصلے،قربتیں(انشائیے)یہ کتاب ابھی الگ سے شائع نہیں کی،’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘میں شامل ہے۔

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات۔میگزین سائز۲۸۴صفحات

ناشر:معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۵ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات،لائبریری ایڈیشن۔میگزین سائز۶۱۶صفحات

(بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۹ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

انٹرنیٹ ایڈیشن

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات، لائبریری ایڈیشن۔میگزین سائز ۶۸۰ صفحات

(بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء

کے بعد ۲۰۱۲ء تک کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ ایڈیشن

....

قفس کے اندر

چھ شعری مجموعے ایک ساتھ۔۔عوامی اور اکانومی ایڈیشن چھ سو سے زائد صفحات کا میٹر صرف ۱۵۲ صفحات میں

سلگتے خواب　　عمرِ گریزاں　　محبت کے پھول

دعائے دل　　دردسمندر　　زندگی

ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز خانپور۔مطبوعہ ۲۰۱۳ء

....

تحقیق و تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین) ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور مطبوعہ ۱۹۹۵

حاصلِ مطالعہ (تنقیدی مضامین)　　ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مطبوعہ ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت ناشر:سرور ادبی اکادمی جرمنی

(بیک وقت انڈیا و پاکستان سے) مطبوعہ ۲۰۰۹ء

تاثرات (تنقیدی مضامین اور تبصرے)۔ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۱۲ء

اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق و تنقید) ناشر:فرہاد پبلی کیشنز۔اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۷ء

اردو ماہیے کی تحریک (مضامین) ناشر:فرہاد پبلی کیشنز۔راولپنڈی۔مطبوعہ ۱۹۹۹ء

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین) ناشر:معیار پبلیکیشنز دہلی۔۱۹۹۹ء

اردو ماہیا (ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔یہ کتاب ''اردو ماہیا تحقیق و تنقید'' میں شامل ہے)

ماہیے کے مباحث (مضامین۔یہ کتاب ''اردو ماہیا تحقیق و تنقید'' میں شامل ہے)

اردو ماہیا تحقیق و تنقید (ماہیے کی تحقیق و تنقید کی پانچ کتابیں ایک جلد میں)

ناشر:الوقار پبلی کیشنز۔لاہور۔مطبوعہ ۲۰۱۰ء

....

حالاتِ حاضرہ

منظر اور پس منظر (9/11 کے بعد حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے فکر انگیز کالموں کا مجموعہ)

ناشر:سرور ادبی اکادمی جرمنی اور www.urdustan.com مطبوعہ ۲۰۰۴ء

خبر نامہ (خبروں پر تبصروں کا سلسلہ)

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۶ء۔

اِدھر اُدھر سے (خبروں پر تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ)

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۸ء

چھوٹی سی دنیا (مشرق و مغرب کے پس منظر میں لکھے گئے کالموں کا مجموعہ)

۲۰۱۲ء میں اس مختصر کتاب کا انٹرنیٹ ایڈیشن شائع کیا گیا

....

بطور مرتب

شفق رنگ: (ضلع رحیم یار خان کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور، مطبوعہ اپریل ۱۹۷۹ء

کونپل: (بھاولپور ڈویژن کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور۔مطبوعہ اپریل ۱۹۸۰ء

سرائیکی غزل: (سرائیکی میں ایک بحث کے ساتھ غزلوں کا انتخاب)

ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۰ء

پہلا ورق: (اوراق کے اداریے) ناشر: مکتبہ ہم زبان کراچی۔مطبوعہ ۱۹۹۰ء

....

ادارت

ادبی رسالہ ''**جدید ادب**'' خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔۱۷ شمارے شائع کیے۔ان میں ۸۰ صفحات سے لے کر ۵۰۰ صفحات تک کے شمارے شامل ہیں۔

جرمنی سے **جدید ادب** ۱۹۹۹ء میں دوبارہ شروع کیا گیا لیکن دو شماروں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔

چند برسوں کی بندش کے بعد جولائی ۲۰۰۳ء سے یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا ہوا ہے۔یہ رسالہ کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر اس سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔ www.jadeedadab.com

ان کوائف کی ترتیب تک اس کے ۱۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔اس ششماہی رسالہ کے سجاد ظہیر نمبر اور میرا جی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔

حیدر قریشی کی سب سے پہلی ویب سائٹ:

www.haiderqureshi.com

تین ای لائبریریز:

حیدر قریشی کی تمام کتابیں پی ڈی ایف فائل میں موجود ہیں

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی پر لکھی گئی، مرتب کی گئی کتب و رسائل کی پی ڈی ایف فائلز موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی کی تمام کتابیں اس لائبریری میں بھی موجود ہیں

http://issuu.com/haiderqureshi

■■

ادبی بلاگس

ان بلاگس پر حیدر قریشی کی کتب یونی کوڈ میں دستیاب ہیں۔

سوئے حجاز

http://soo-e-hijaz.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

''روشنی کی بشارت''، ''قصے کہانیاں'' اور بعد کے سارے افسانے

http://hq-kayafsanay.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

خاکوں کا مجموعہ ''میری محبتیں''

http://meri-mohabbaten.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

یادوں کا مجموعہ ''کھٹی میٹھی یادیں'' تازہ ترین ابواب کے ساتھ

http://khatti-mithi-yaden.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

انشائیوں کا مجموعہ ''فاصلے، قربتیں''

http://inshaiya.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

کلکتہ اور دھلی کا سفر، با تصویر

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی کی البم: **زندگی تصویروں کے آئینے میں**

http://haiderqureshi-album.blogspot.de/

■■

وکی پیڈیا کے صفحات

حیدر قریشی

http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi

جدید ادب

http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab

عمرِ لاحاصل کا حاصل

http://en.wikipedia.org/wiki/Umr-e-Lahaasil_Ka_Haasil

■■

ادبی اعتراف

حیدر قریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن**   **مصنف**: **محمد وسیم انجم** (مطبوعہ ۱۹۹۹ء)

ناشر: انجم پبلشرز، کمال آباد نمبر۳، راولپنڈی۔ پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**

مرتبین: **نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے** (مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔ پُونہ، انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**   **مرتب**: **پروفیسر نذر خلیق** (مطبوعہ ۲۰۰۳ء)

ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔ خانپور۔ پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن**   **منزہ یاسمین** کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔ خانپور۔ پاکستان

۵۔**حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز**   **مرتب**: **سعید شباب** (مطبوعہ ۲۰۰۴ء)

ناشر: نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ ایمسٹرڈیم۔ ہالینڈ

۶۔ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدرقریشی نمبر **مدیر ومرتب: ارشد خالد**

ناشر: عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)

۷۔جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث

شازیہ حمیرہ کاتحقیقی مقالہ سال۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردوکاتحقیقی مقالہ

۸۔حیدرقریشی۔ شخصیت اور ادبی جھات

ڈاکٹرعبدالرب استاد کاپی ایچ ڈی کاتحقیقی مقالہ سال۲۰۱۳ء

گلبرگہ یونیورسٹی،گلبرگہ،کرناٹک،انڈیا

....

حیدر قریشی پر ترتیب دئیے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ ''**اسباق**''پونہ شمارہ:فروری تااپریل۱۹۹۳ء ایڈیٹر:نذیرفتح پوری

۲۔اشاعتِ خصوصی''دنیائے ادب کادرخشاں ستارہ؍حیدرقریشی''

ہفت روزہ **ہوٹل ٹائمز** اسلام آباد۲۲مئی تا۲۸مئی ۱۹۹۸ء مرتبین:اختر رضا کیکوٹی ومحمدوسیم انجم

۳۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ سہ ماہی''**ادبِ عالیہ**''وہاڑی۔شمارہ مارچ۲۰۰۲ء

ایڈیٹرز:ریاض ہانس وریاض ملک

۴۔خصوصی مطالعہ ''**مہرِامروز**''مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی۲۰۰۴ء

(اردودوست ڈاٹ کام) ایڈیٹر:خورشیداقبال

۵۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی شمارہ نومبر۲۰۰۴ء ایڈیٹر:افتخارامام صدیقی

۶۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی **ادب ساز** دہلی(تقریباً۵۰صفحات میگزین سائزپرمشتمل)

شمارہ:۶،۷،جنوری تاجون ۲۰۰۸ء۔ ایڈیٹر:نصرت ظہیر

۷۔خصوصی مطالعہ''عمرِ لاحاصل کاحاصل''مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد(کتاب نمبر۱۰)

مدیرومرتب:ارشدخالد

۸۔گوشہ بحیثیت محقق ونقاد مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد(کتاب نمبر۱۱،مئی۲۰۱۰ء)

مدیرومرتب:ارشدخالد

....

پاکستان اور جرمنی سے باہر کے اسفار

ہندوستان۔سعودی عرب۔انگلینڈ۔ہالینڈ۔فرانس۔ماریشس۔آسٹریا۔بلجیم۔

حیدر قریشی کاڈاک کا پتہ:

Haider Qureshi

Rossertstr.6, Okriftel,

65795 Hattersheim, Germany.

ٹیلی فون نمبر:0049-6190-930078 ای میل:haider_qureshi2000@yahoo.com

....

بحوالہ **عکاس** اسلام آبادشمارہ اکتوبر۲۰۰۵ء **حیدر قریشی نمبر** مدیر **ارشد خالد**

مارچ۲۰۱۳ءتک مزیدتازہ ترین اضافوں کےساتھ

خصوصی نوٹ

حیدرقریشی کےاوریجنل ورک کےحوالے سےاب تک پچیس کتابیں منظرِعام پرآچکی ہیں۔

شاعری:چھ مجموعے۔۔۔افسانے:دومجموعے۔۔۔خاکے:ایک مجموعہ

یادنگاری:ایک مجموعہ۔۔۔انشائیہ نگاری:ایک مجموعہ۔۔۔سفرنامہ:ایک مجموعہ

ماہیا کی تحقیق وتنقید:پانچ کتابیں۔۔۔۔متفرق تنقیدی مضامین:چارکتابیں

حالاتِ حاضرہ:کالموں کےچارمجموعے

یہی پچیس کتابیں متفرق اورمختلف ایڈیشنزکی صورت میں بتیس کی تعدادمیں چھپ چکی ہیں۔یہ صرف اوریجنل ورک کےذیل میں آنے والی کتابیں ہیں۔مرتب کردہ کتب اورادبی رسائل کی ایڈیٹنگ کوان میں شمارنہیں کیاگیا۔

فاصلے،قربتیں

(انشائیے)

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد

جملہ حقوق بحق حیدر قریشی محفوظ

FASLEY , QURBATEN

(Inshaiyay...Ligt Esseys)

By: Haider Qureshi

Year of 1st Edition: 2014

Price: Rs. 50/-

نام کتاب: فاصلے،قربتیں(انشائیے)

مصنف: حیدر قریشی

مصنف کا پتہ: Rossertstr.6, Okriftel,

65795 Hattersheim,Germany

E-Mail: haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: ارشد خالد

سنِ اشاعت اول: فروری 2014 ء

قیمت: 50 روپے

مطبع: جاوید بٹ پرنٹنگ پریس۔لاہور

Published By

AKKAS INTERNATIONAL

House No 1164 Street No 2 Block C

National Police Foundation ,Sector O-9

Lohi Bhair, Islamabad, Pakistan

Tel.0300-5114739 0333-5515412

....

E- Mail:

akkasurdu2@gmail.com

انتساب

ابا جی کے بڑے بھائی

اپنے بابا جی کے نام

جنھوں نے ایک انشائیہ نگار جیسی زندگی بسر کی

نظر سے دور ہے لیکن نظر میں ہے پھر بھی

کہ عکس اپنے مرے آئنوں میں چھوڑ گیا

ترتیب

حیدر قریشی کی کتب

شاعری (غزلیں، نظمیں، ماہیے):
۱۔سلگتے خواب۔۲۔عمرِ گریزاں۔۳۔محبت کے پھول۔۴۔دعائے دل۔۵۔دردسمندر۔۶۔زندگی
(یہ چھ شعری مجموعے **قفس کے اندر** ۲۰۱۴ء کے ایڈیشن میں یک جا کر دیے گئے ہیں)

نثر (افسانے، خاکے، یادیں، انشائیے، سفرنامہ):
۱۔روشنی کی بشارت۔۲۔قصے کہانیاں۔۳۔میری محبتیں۔۴۔کھٹی میٹھی یادیں۔۵۔فاصلے قربتیں۔
۶۔سوئے حجاز۔ (یہ چھ کتابیں **خواب کے اندر خواب** میں یک جا کر دی گئی ہیں۔)
(پہلے پانچ شعری مجموعے اور چھ نثری کتابیں **عمرِ لاحاصل کا حاصل** میں بھی شامل ہیں)

تنقید و مباحث:
۱۔حاصلِ مطالعہ۔۲۔تاثرات۔۳۔مضامین اور تبصرے۔۴۔گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت
۵۔ستیہ پال آنند کی بودنی نابودنی۔۶۔وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت۔
(یہ چھ کتابیں **ہمارا ادبی منظر نامہ** میں یک جا کر دی گئی ہیں)

اردو ماہیا تحقیق و تنقید:
۱۔اردو میں ماہیا نگاری۔۲۔اردو ماہیے کی تحریک۔۳۔اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما۔
۴۔اردو ماہیا۔۵۔ماہیے کے مباحث
(یہ پانچوں کتابیں **اردو ماہیا تحقیق و تنقید** میں یک جا کر دی گئی ہیں)

حالاتِ حاضرہ (کالم):
۱۔منظر اور پس منظر۔۲۔خبر نامہ۔۳۔اِدھر اُدھر سے۔۴۔چھوٹی سی دنیا۔
(یہ چاروں کتابیں **حالاتِ حاضرہ** میں یک جا کر دی گئی ہیں)

یہ ساری کتابیں الگ الگ بھی اور مذکورہ بالا کلیاتی صورتوں میں بھی اس لنک پر دستیاب ہیں۔
http://haider-qureshi.blogspot.de/

حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

عامر سہیل (ایبٹ آباد)

حیدر قریشی کا تخلیقی سفر اور فکری جہات کا ذکر اُن کی انشائیہ نگاری کے بغیر نامکمل ہے۔ اس صنف میں اُن کی دلچسپی کا پس منظر خاصا وسیع ہے لیکن یہ طے ہے کہ اُنھوں نے اپنی نثر کی فسوں سازقوت کی بدولت بہت جلد انشائیہ نگاری میں اپنی انفرادیت منوالی تھی۔ اُن کے انشائیے کتابی صورت میں طبع ہونے سے پہلے پاک و ہند کے مقتدر معاصر ادبی جرائد میں اشاعت پذیر ہوتے رہے ہیں۔ بعدازاں یہ تمام انشائیے ''فاصلے، قربتیں'' کے نام سے انٹرنیٹ پر آ گئے اور پھر کچھ عرصے بعد ان تمام انشائیوں کو شعری و نثری کلیات '' عمرِ لا حاصل کا حاصل'' میں یکجا کر کے شائع کر دیا گیا۔ یہ کلیات کتابی صورت میں دستیاب ہونے کے علاوہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔۔ گفتگو کو مزید آگے بڑھانے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انشائیے کی تعریف، اصطلاح اور حدود پر اجمالاً بات کر لی جائے تا کہ تفہیم میں آسانی رہے۔

انشائیہ کیا ہے؟

ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے:

''جدید تنقید میں غالباً انشائیہ وہ واحد صنفِ ادب ہے جس کے بارے میں نزاعی نظریات اور جذباتی مقالات لکھے جاتے ہیں۔ اس کی تعریف اور آغاز دونوں پر لے دے ہو رہی ہے۔''[۱]

یہ رائے حقائق پر مبنی ہے۔ آج سے تقریباً نصف صدی قبل جب ڈاکٹر وزیر آغا اور اُن

کے قریبی رفقا نے اپنی تحریروں کو انشائیہ کہنا شروع کیا تو بحث و مناظرے کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور خوابِ جوانی کی مانند ''انشائیہ'' کی بھی نت نئی تعبیریں کی گئیں۔ اس تمام نزاع کی اصل وجہ یہ تھی کی بے شمار ناقدین انشائیہ کی اصطلاح کو مضمون کے ساتھ خلط ملط کر رہے تھے اور دبستانِ سرگودھا کے سنجیدہ تخلیق کار اور ناقدین و محققین اس صنف کو مضمون اور مقالہ نگاری سے الگ صنف ثابت کر نے میں مصروف تھے۔ اگر ان تمام نزاعی امور پر نظر کی جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انشائیہ جیسی نئی صنف پر بات کرتے ہوئے عدل و انصاف اور معروضی حقائق و شواہد کو پسِ پشت ڈال کر محض جذباتی تنقیدیں لکھی جاتی رہی ہیں، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ انشائیہ کو اردو ادب میں قدم جمانے میں خاصی تاخیر ہو گئی۔

جدید عہد میں انشائیہ پر نظر ڈالی جائے تو علم ہوتا ہے کہ تمام تر رکاوٹوں اور سازشوں کے باوجود اس صنف نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کی زیرِ تربیت انشائیہ نگاری پر تخلیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تیار ہو چکا ہے۔

انشائیہ کی تعریف

ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول:

''انشائیہ اُس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

[۲]

یہ تعریف منطقی اعتبار سے جامع اور مانع ہے اور انشائیہ کے تمام اوصاف کو محیط ہے۔ انشائیہ کا اسلوب شگفتہ اور غیر رسمی ہوتا ہے، اور طنز و مزاح کے عناصر اگر شامل ہوں تو کوئی حرج نہیں لیکن اس صنف کے لئے طنز و مزاح کی شرط لازمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس حوالے سے روشنی فراہم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''دراصل اُسلوب کی شگفتگی یا اس میں طنز و مزاح کی آمیزش کو انشائیہ کے لئے ناگزیر

قرار دینا کسی صورت بھی مستحسن نہیں ہے۔ انشائیہ میں طنز کی کاٹ یا مزاح کی پھلجھڑی کا درآنا انشائیہ نگار کے خاص موڈ یا مزاج کا رہینِ منت ہوتا ہے۔'' ۳؎

انشائیے کے موضوع عموماً ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ اور انشائیہ نگار اپنے زورِ تخیل اور شخصی زاویہء نظر اختیار کرتے ہوئے اپنے موضوع کے ایسے ایسے پوشیدہ گوشے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے جو اَب تک نظروں سے اوجھل تھے۔ انشائیہ نگار کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے چنیدہ موضوع کو معمولی یا غیر معمولی بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ عام مضمون کے برعکس انشائیہ میں منطقی ترتیب کا فقدان ہوتا ہے اور اصلاح پسندی یا کسی خاص نقطۂ نظر کا پرچار کرنا اس صنف میں مناسب نہیں سمجھا جاتا۔

انشائیہ نگاری کے ضمن میں جو اختلافی مباحث منظرِ عام پر آئے اگر ان کا غیر جانب داری سے محاکمہ کیا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اکثر ناقدین انشائیہ کو مضمون ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل قرار دیتے ہیں اور مضمون نگاری کے جملہ اوصاف کو انشائیہ میں متحرک دیکھنے کے خواہش مند ہیں، بدیں سبب سرسید احمد خان کی اُن تحریروں کو بھی انشائیہ کہا جانے لگا جس میں پند و نصائح اور مقصدیت کے عناصر حاوی تھے۔ اکبر حمیدی اس صنف کے دیگر وصفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

'' انشائیہ نگار نئے عہد کی نئی زندگی کے نئے نئے رخ نئے انسان کی اظہاری تقاضوں کا دور تک ساتھ دیتا ہے۔'' ۴؎

انشائیہ کے مزید اوصاف ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول کچھ یوں ہیں:

'' انشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنف نثر ہے جو قاری کو بیک وقت لطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے۔ اسی لیے میں اسے امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ، شعر کی لطافت اور سفرنامے کا فکری تحرک یکجا ہو گئے ہیں۔'' ۵؎

مسرت کا حصول انشائیہ نگاری کا وہ اہم مقصد ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے انشائیہ نگار

کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ اور خیالات کی تعمیر و تشکیل میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو مونتین (Montaine) کی پیروی کا عمل آج بھی جاری ہے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں کا تجزیاتی مطالعہ

حیدر قریشی کے کلیاتِ نظم و نثر ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' میں کل دس انشائیے شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں:

انشائیوں کے عنوانات:

۱۔ خاموشی ۲۔ نقاب ۳۔ وگ ۴۔ فاصلے قربتیں
۵۔ بڑھاپے کی حمایت میں ۶۔ اطاعت گزاری ۷۔ خیر و شر کے سلسلے
۸۔ چشمِ تصور ۹۔ اپنا اپنا سچ ۱۰۔ تجربہ اور تجربہ کاری

انشائیہ نگاری میں عنوان کی اہمیت دوسری اصناف کی نسبت قدرے زیادہ ہے۔ انشائیہ نگاری اور تحلیلِ نفسی میں یہ نقطہ قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے کہ دونوں میں کسی ایک عنوان کے گرد سوچوں کا پورا ہالہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ اور خیالات میں ربط یا بے ربطی کا اپنا اپنا جواز بنتا ہے اور ہر ایک کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اردو، انگریزی اور فرانسیسی انشائیہ نگاروں نے عنوانات کا چناؤ زندگی کے از حد عمومی پہلوؤں سے کیا ہے۔ مثلاً بٹن، کمرہ، کھڑکی، سڑک، ایک درخت، صدائے بازگشت، اداس آئینے، کرسی، روشنی اور دیوار وغیرہ۔ عنوان کی عمومیت بذاتِ خود ایک خوبی شمار ہوتی ہے کیوں کہ ایک اچھا تخلیق کار اپنے انشائیے میں عام اشیاء سے خاص اشیاء کی جانب اُڑان بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس تمہیدی پس منظر کے بعد حیدر قریشی کے چند نمائندہ انشائیوں کا فرداً فرداً تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ خاموشی

حیدر قریشی نے اپنے اس انشائیے کا آغاز اِن الفاظ سے کیا ہے:

'' ہنگامہ اور شور زندگی کے صحیح عکاس نہیں۔ اسی طرح سناٹا اور ویرانی بھی

زندگی کے ترجمان نہیں ہیں۔ان کے برعکس خاموشی زندگی کی حقیقی عکاسی کرتی ہے۔ جولوگ سناٹے اور خاموشی میں فرق نہیں کر پاتے وہ خاموشی کی اہمیت نہیں جان سکتے۔ سناٹا بے روح اور بے آواز ہوتا ہے جب کہ خاموشی زندگی کی عکاس ہی نہیں، زندگی کو جنم بھی دیتی ہے۔'' ۶

خامشی بظاہر ہماری زندگی کا ناگزیز حصہ ہےاور روزمرہ کے معمولات میں خاموشی بھی کسی نہ کسی حوالے سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے،لیکن جب زندگی کا یہی عمومی مظہر انشائیہ نگار کا موضوع بنتا ہے تو اس کے نت نئے انوکھے زاویے ہمارے سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔محولہ بالا اقتباس میں خردافروزی تو اپنی جھلک دکھا رہی ہے،اس کے جلو میں خیال افروزی کی کرنیں بھی جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ یہ ایک تیکھی بات ہے جو پڑھنے والوں کے احساسِ لطافت کو مہمیز لگاتی ہے۔نثری بیانیہ تخیل کو وسعت آشنا کر رہا ہے۔

سناٹے اور خاموشی کا فرق وہی واضح کرے گا جو تخیل کی مینا کاری سے نئی دنیا آباد کرنے کا سلیقہ جانتا ہو۔حیدر قریشی نے کمال مہارت سے ایک فلسفیانہ نکتے کو عام فہم انداز میں چلتے پھرتے بیان کر دیا ہے۔یہی وہ تخلیقی ذہانت ہے جو انشائیے کا اصل جوہر ہے۔ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اسی نکتے کو ذرا گہرائی میں جا کر زیرِ بحث لاتے ہیں،اُن کا کہنا ہے:

'' انشائیہ ایک گھتی ہوئی تحریر ہے جس میں ایک نقطہ خیال سے پھوٹتا ہے اور پھیل کر دوبارہ پہلے نقطے میں سمٹ آتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ جب یہ دوبارہ مرکزی نقطے کو چھوتا ہے تو معنی کی ایک نئی پرت ،فکر کا ایک انوکھا زاویہ اور خیال کی ایک تازہ لہر نمودار ہو جاتی ہے۔'' ۷

اس بیان میں اگر نفسیاتی کیفیت کا اضافہ کر لیں تو کئی دوسرے پہلو نمایاں ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

حیدر قریشی اب خاموشی کے مرکزی نقطے کو مضبوطی سے تھامے اپنے موضوع کی دوسری پرتوں کو کھولنا شروع کرتے ہیں:

''کسی ہنگامہ خیز، پرشور ماحول نے نہ کبھی دو سچے دلوں کو ملنے دیا ہے اور نہ

کبھی کوئی سچا صوفی پیدا کیا ہے۔'' ۸

یہی وہ اختصار ہے جو انشائیے کو معتبر بناتا ہے۔مصنف نے دنیا کی اتنی بڑی حقیقت کو غیر رسمی طریقِ کار اور شخصی نقطۂ نظر کی بدولت محض چند الفاظ میں سمیٹ دیا ہے۔غزل کی طرح انشائیے میں بھی کوئی بات خلافِ واقعہ نہیں ہوتی یا اگر کوئی خیال خلافِ واقعہ آ جائے تو اس کی کوئی اپنی منطق یا اپنا کوئی پس منظر لازماً ہو گا۔تاہم غزل کی ایمائیت اپنی پوری توانائی کے ساتھ انشائیہ میں بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے انشائیے میں اُس تاریخی سچ کو بھی فنکارانہ حُسن کے ساتھ پیش کیا ہے جس کے بغیر خاموشی کی معنویت کا تذکرہ ادھورا رہ جاتا:

''سقراط نے زہر پی کر،حسینؓ نے شہید ہو کر اور ابنِ منصور نے سولی قبول کر کے خاموشی سے صبر کے جو عظیم نمونے دکھائے، بظاہر وہ اُس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست تھی،لیکن در حقیقت اُن مظلوموں اور سچوں کی خاموشی اُن کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔'' ۹

اگر چہ یہ کوئی تاریخی انشائیہ نہیں ہے اس کے باوجود تاریخیت کے حُسن سے مملو ہے۔ اکبر حمیدی انشائیے کے نئے افق تلاش کرتے ہوئے یہاں تک رعایت دیتے ہیں:

''جس ماحول کا انشائیہ لکھا جائے اُس کے ماحول کو تبدیل نہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر تاریخی انشائیہ لکھا جائے تو تاریخی مدار سے باہر نہ جایا جائے بلکہ اس کے گوشوں کی سیاحت کروائی جائے اور تاریخی ذائقے کو اوّل تا آخر بحال رکھا جائے۔'' ۱۰

حیدر قریشی کے اس انشائیہ میں تاریخی حوالے بھی آئے سو انھوں نے اکبر حمیدی کی بات پر عمل کیا اور بے ساختہ کچھ ایسے واقعات کا ذکر کیا جن کا تعلق ماضی قریب سے بنتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے ایک مضمون میں انشائیے کی تکنیک کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انشائیے کا ایک وصف یہ بتایا تھا:

''عنوانات کا موضوع یا نقطۂ نظر سے ہم آہنگ نہ ہونا۔'' ۱۱

لیکن حیدر قریشی کے انشائیوں میں ایسی کیفیت نہیں ملتی، اُن کے اکثر انشائیے مشمول ''خاموشی'' اپنے عنوان سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ رائے انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ اگر سو انشائیوں میں سے ایک آدھ انشائیہ ایسا نکل آئے جس کا عنوان اپنے موضوع سے ہم آہنگ نہ ہو تو اس سے یہ نتیجہ ہرگز برآمد نہیں ہوتا کہ باقی ۹۹ انشائیے بھی اپنے موضوع سے انحراف پر مبنی ہوں گے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں نفسیاتی بصیرت کا اظہار ایک لازمی امر ہے، ''خاموشی'' میں یہ رنگ گہرا ہوتا نظر آتا ہے لیکن انشائیے کی تکنیک اور اسلوب کو بوجھل نہیں بناتا، یہ مثال ملاحظہ ہو:

''خاموشی خیر کی علامت ہے جب کہ شور، شر کا مظہر ہے۔ شور پسند لوگ شورش پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ فتنہ فساد کی سوجھتی ہے جب کہ خاموشی پسند کرنے والے فطرتاً امن پسند ہوتے ہیں۔ اُس شوہر کی ازدواجی زندگی کبھی ناکام نہیں ہو سکتی جو مزاجاً امن پسند ہو، چاہے اُس کی بیوی کتنی ہی جھگڑالو کیوں نہ ہو۔ کیونکہ خیر کی قوت بالآخر شر کی قوت پر غالب ہی آتی ہے۔ اسی لئے تو غالب نے کہا تھا: ؎ ایک خاموشی پر موقوف ہے گھر کی رونق۔''[۱۲]

یہی نکتہ آفرینی انشائیے کو انشائیہ بناتی ہے۔ ''خاموشی'' زندگی سے پوری طرح منسلک تحریر ہے جو حسن و خیر کے متنوع پہلوؤں کو اُسی مرکزی دھارے میں رکھ کر زیرِ بحث لاتی ہے جس عنوان کے تحت یہ انشائیہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ عنوان بذاتِ خود اکائی کی وہ تجسیم ہے جو موضوع میں بکھری نظر آتی ہے۔ قاری ''خاموشی'' کو پڑھتے ہوئے یہ تاثر بھی اخذ کرتا چلا جاتا ہے کہ اس انشائیے کی مجموعی فضا رجائیت پر مبنی ہے۔ اس انشائیے کو پڑھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قاری دورانِ مطالعہ ایک عام انسانی سطح سے اوپر اُٹھ کر انشائیے میں چھپے اُس عارفانہ تجربے کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جو زندگی کو حسین اور آسان بناتا ہے۔ انشائیے کا یہ نادر پہلو ہمیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے انشائیہ نگار بذاتِ خود اپنی تحریر میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ اگر انشائیہ نگار اس صنف کے اہم فطری عناصر کو ساتھ لے کر چلے گا تو اُس کی تحریر میں نامیاتی تاثر آفرینی پیدا ہو جائے گی۔

انشائیہ ایک ایسی ظالم صنف ہے کہ اس میں انشائیہ نگار کی اپنی ذات کسی نہ کسی حوالے سے اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ انشائیہ نگار کی کشادہ ذہنی، بالغ نظری، وسعتِ قلبی، انسان دوستی اور وسیع المشربی یا اس کے برعکس بخیلی، دشمنی، حسد، کینہ اور بزدلی کا عکس انشائیے میں اپنی موجودگی لازماً ظاہر کرے گا۔ جن نقادوں نے انشائیہ نگاری اور تحلیلِ نفسی کے مابین مماثلت کا ذکر کیا اُس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ دونوں صورتوں میں انسان کا باطن بہرصورت بے نقاب ہو جاتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب، اگر یہ کہا جائے کہ حیدر قریشی کا یہ انشائیہ فرد کی وجدانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور انفرادی سوچ کو تقویت فراہم کرتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ حیدر قریشی کو زندگی سے پیار ہے۔ وہ زندگی کی سرگرم کیفیات کے رمز شناس، انسانی اقدار کے حامی اور ہمدردی کے اوصاف سے مالا مال ہیں اور یہ تمام رویے اُن کے انشائیے ''خاموشی'' میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جمیل آذر کی یہ رائے دیکھئے جس میں وہ انہی اوصاف کو ذرا عمومی پیرائے میں بیان کر رہے ہیں لیکن ان کا اطلاق حیدر قریشی پر بھی ہوتا ہے:

''انشائیہ نگار وحدتِ انسانی کا علمبردار ہے وہ رنگ، نسل، زبان اور قومیت سے ماورا ہو کر عظمتِ انسانی کا علمبردار ہے۔ اُس کے ہاں انسان سے آفاقی محبت کا تصور بدرجہ اتم ملتا ہے۔''[۱۳]

اس انشائیے میں فکری اور اشاراتی عناصر موضوع کی تہہ داری اور تنوع میں خوبصورت اضافے کر رہے ہیں۔

(۲) بڑھاپے کی حمایت میں:

بڑھاپا بظاہر ایک ایسا نفسیاتی موضوع ہے جس سے ہر شخص بھاگتا ہے اور اور عمر کی اس فطری تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتا۔ حیدر قریشی اپنے انشائیے ''بڑھاپے کی حمایت میں'' اس عمومی رویے کے برعکس بڑھاپے کا خیر مقدم نہایت فراخ دلی سے کر رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے بڑھاپے کو اپنا ہمزاد اور ہم راز بنا کر پیش کیا ہے اور آنے والے دور کے بے پناہ امکانات کو کھلی بانہوں کے ساتھ خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک بڑھاپے کو ٹالنا یا نانا

اُمیدی کوخود پر مسلط کرنا درست نہیں۔ وہ زندگی کے تینوں ادوار کو معروضی سطح پر جانچنے کے بعد کہتے ہیں:

''جس طرح ہم اپنے حال میں رہ کر اپنے حال سے بے خبر ہوتے ہیں، ایسے ہی جوانی میں بھی اپنے آپ سے بے خبری کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ لیکن بڑھاپا مستقبل کی طرح یقین اور بے یقینی کی دھند میں لپٹا ہوا عالمِ برزخ ہے۔ یہاں سے آگے انسان کے ماورائے زمان و مکاں ہونے کا سفر شروع ہوتا ہے۔'' ۱۴؎

حیدر قریشی نے محولہ بالا اقتباس میں بہت دھیمے انداز میں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ''بڑھاپے'' کا مایوسی اور اذیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا بلکہ یہ گذشتہ عمر کی بے چہرگی کو حسن عطا کرتا ہے اور زمان و مکاں سے آزاد کراتا ہے۔ آزادی کا یہ سفر اصل میں نئے جہانوں کی سیر ہے اور انسان میں ایک بار پھر جینے کی امنگ پیدا کرتا ہے۔ درد و کرب اور دکھ تکلیف سے باہر نکل کر حوصلہ مندی اور عزم کی شمع روشن کرتا ہے۔ غالبؔ نے تو یہ کہہ کر ہمت ہار دی تھی:

مضمحل ہو گئے قویٰ، غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں ۱۵؎

لیکن حیدر قریشی کا وژن کچھ اور کہہ رہا ہے:

''بڑھاپا بزرگی اور متانت عطا کرنے کے ساتھ زندگی کے تجربات کا نچوڑ نکال کر ایک رہنما کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ بڑھاپے میں گرگِ ظالم بھی پرہیزگار بن جاتا ہے اور یہ پرہیزگاری اُسے قویٰ کے اضمحلال اور زندگی کے تجربات کے نچوڑ کے بعد نصیب ہوتی ہے۔'' ۱۶؎

انشائیہ نگار کا ایک وصف یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ مشاہدے میں آنے والے حقائق اور مظاہر کے ایسے زاویوں کو بھی نمایاں کرے جو بالعموم ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں تاکہ نئے ادراکات کی روشنی میں اُس شے کے چھپے اَسرار کو سمجھا جا سکے۔ حیدر قریشی نے یہ فریضہ عمدگی سے ادا کیا ہے۔ اُن کا طرزِ بیان بڑی سے بڑی بات کو آسان اور موثر انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ اُن کی فکر پند و نصائح کے بجائے بے تکلف اُسلوب میں اظہار پاتی ہے۔

شہزاد منظر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''انشائیے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ انشا کا اعلیٰ نمونہ ہو، لہٰذا اچھی انشائیہ نگاری کے لیے تخلیقی زبان ضروری ہے، لیکن تخلیقی زبان سے مراد طنز و مزاح، لطائف یا پند و نصائح نہیں۔'' ۱۷؎

زندگی کی کھری اور حقیقی کیفیت کو اُسلوب اور تخیل کی تازہ کاری سے انشائیہ کا حصہ بنانا آسان بات نہیں ہوتا کیونکہ ایک آنچ کی کسر کسی انشائیے کو مضمون یا مقالے میں تبدیل کر سکتی ہے۔

حیدر قریشی نے انشائیہ نگاری کے جملہ تقاضوں کو نبھاتے ہوئے زندگی کی ایک اٹل حقیقت اور سچی جہت کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ فکر کا جذبہ بڑھاپے کی محبت میں گھلتا نظر آتا ہے۔ انشائیہ نگاری کا اصل حسن یہی ہے کہ تخلیقی اظہار ازلی و ابدی سچائیوں کو بوجھل نہ بنائے بلکہ لطیف پیرائے میں اپنی بات دوسروں تک منتقل کر دے۔ فنی و جمالیاتی اقدار کا پاس لحاظ انشائیے کی اولین ضرورت ہے۔

طنز و مزاح کی شرط انشائیے کے لیے لازمی نہیں ہے البتہ اگر یہ عناصر غیر محسوس طریقے سے اسلوب کا حصہ بن کر انشائیے کے قالب میں گھر کر لیں تو مزائقہ نہیں ہے۔ زیرِ بحث انشائیہ سے ایک مثال درج کی جاتی ہے:

''انسان بچپن میں ضدی ہوتا ہے اور جوانی میں باغی۔ لیکن بڑھاپے میں ضد اور بغاوت دونوں سے دامن چھڑا کر خود سپردگی اور راضی بہ رضا کے صوفیانہ مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ اولاد جتنی گستاخ، بے ادب اور بے پرواہ ہو گی، اس صوفیانہ مقام میں انسان اتنا ہی ترقی کرتا جائے گا اور آخر اس مقامِ لاہوت تک جا پہنچے گا جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔'' ۱۸؎

یہ طنزِ ملیح ہے جس میں اصلاح کا کوئی پہلو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اور شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔ انشائیہ نگار کا مقصد کسی کی اصلاح نہیں بلکہ قاری کو مسرت اور لطف کی کیفیت میں شریک کرنا ہے۔ حیدر قریشی نے قاری کو مایوس نہیں کیا اور کسی قسم کی سنجیدگی کو بھی قریب نہیں آنے دیا جس کی وجہ سے اُن کا یہ انشائیہ تخلیقی اضطرار اور تخیلی اظہار کا باوقار حوالہ بن گیا ہے۔

منزہ یاسمین کہتی ہیں:

''حیدر قریشی اپنے اکثر انشائیے اُن موضوعات پر لکھتے ہیں جو اُن کے ذ
ہنی، فکری اور جذباتی ردِعمل کا نتیجہ ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کا ہر انشائیہ اُن کے شخصی تجربے اور
مشاہدے کا حامل نظر آتا ہے، وہ اپنے دل چسپ اور انوکھے تجربے میں قاری کو شریک ہی نہیں
کرتے بلکہ ہم نوا اور ہم خیال بھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ۱۹

یہ بات اپنی جگہ درست ہے بس اس میں اتنا اضافہ بھی کرلیا جائے کہ حیدر قریشی اپنے
تمام موضوعات میں ذات و کائنات کے نئے اور منفرد روپ شگفتہ اور بے تکلف اسلوب میں پیش
کرنے پر قادر ہیں تو بات جامع ہو جاتی ہے۔

(۳) فاصلے، قربتیں:

یہ انشائیہ کلیات میں شامل ہونے کے علاوہ ''اوراق'' ۲۰ میں بھی شائع ہو چکا ہے۔
اس کے آغاز میں یہ شعر درج ہے:

جب سرکار کی جانب سے منظوری ہوتی ہے
فاصلہ کتنا بھی ہو عین حضوری ہوتی ہے ۲۱

حیدر قریشی نے انشائیے کی ابتدائی سطور میں بڑے دوستانہ انداز میں سرسبز و شاداب
پہاڑوں کا ذکر کیا ہے جنہیں وہ روزانہ دور سے دیکھتے اور سراہتے ہیں اور پہاڑوں کی بلندی اور
عظمت اُن کے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ ایک دن پہاڑ کو نزدیک سے دیکھتے ہیں تو
اُن کی رائے میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے:

''میں نے دیکھا کہ دور سے اتنا عظیم دکھائی دینے والا پہاڑ ایسے خوفناک
ٹیڑھے میڑھے، رستوں اور ہولناک کھائیوں سے بھرا ہوا تھا جو سیدھا موت کے منہ میں لے
جانے والی تھیں۔ اِس کا دامن خونخوار جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔'' ۲۲

انشائیے کا یہ حصہ عمومی تجربات و مشاہدات کو رواں اُسلوب میں بیان کرتا ہے اور اُن
کی نظر پہاڑ میں چھپے ولن کو بھی بخوبی دیکھ لیتی ہے:

''تب مجھے فاصلوں کا کمال معلوم ہوا۔ جس نے پہاڑ کے اندر کے ولن کو

چھپا کر اُسے ہیرو کے روپ میں پیش کر رکھا تھا۔'' ۲۳

یہ انشائیہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس میں تفکر کے عناصر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔
اور انشائیہ نگار بظاہر ایک عمومی مشاہدے سے انسانی نفسیات کے گہرے اور تیکھے اصول دریافت
کرنے لگتا ہے:

''مجھے اندازہ ہوا کہ بڑے بڑے عظیم لوگ، پہاڑ جیسے عظیم لوگ، محض اس
لئے عظیم لگتے ہیں کیونکہ ہم اُنھیں فاصلے سے دیکھتے ہیں۔۔۔ جو لوگ انہیں قریب سے دیکھ لیتے
ہیں اُن پر ان کی عظمت سے زیادہ ان کی شخصیت کے مخفی جوہر کھل جاتے ہیں، اس لیے وہ ان کی
عظمت کے منکر ہو جاتے ہیں۔'' ۲۴

یہ وہ آنکھ ہے جو قطرے میں دجلہ دیکھنے پر قادر ہے۔ جن تجربات کی روشنی میں یہ اُصول
اخذ کیا گیا ہے اُن کی آفاقیت تشریح اور وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب والی
بات ہے۔ اس نوع کی اصول سازی کوئی بہت حساس، دردمند اور ذہین شخص ہی کر سکتا ہے۔ یہ
سب کچھ دیکھنے کے لیے گہرے احساس اور بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے۔

حیدر قریشی نے اُوپر جو اُصول وضع کیا تھا اب وہ اس کی مزید گرہیں کھولتے ہیں تا کہ
انھوں نے جو استدلال قائم کیا تھا اُس کے نفسیاتی کوائف مع تشریحات و توضیحات مستحکم ہو
جائیں:

''طویل فاصلے سے سورج جیسے چمکتے ہوئے لوگ اپنے اندر سورج سے بھی
بڑا جہنم آباد کئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ فاصلے پر بٹھائے ہوئے لوگوں کے لیے جنت کی
بشارتیں نشر کرتے رہتے ہیں۔'' ۲۵

حیدر قریشی کی یہ نکتہ آفرینی مجاز کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے، جو استعارے کے پیرہن
میں اپنا جادو جگا رہی ہے۔ یہ انداز اگرچہ شاعرانہ ہے لیکن نکتہ آفرینی حکیمانہ ہے۔ نذر خلیق اس
ضمن میں ہماری رہنمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حیدر قریشی کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی کا عنصر فراوانی سے ملتا ہے۔ ان

کی نکتہ آفرینی ایک دو جملوں سے بہت کم ظاہر ہوتی ہے۔ اگر چہ ایسا ہوتا بھی ہے لیکن عموماً ایک پوری فضا کے بعد اُن کی بات کا بھید کھلتا ہے اور ان کی نکتہ آفرینی سے لطف لینے کے لیے اُس سطح تک جانا ضروری ہو جاتا ہے۔'' ۲۶؎

حیدر قریشی کا یہ انشائیہ جہاں اور بہت سے تکنیکی اور فکری اوصاف کا حامل ہے وہاں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے انشائیے کے مرکزی اور ضمنی وقوعوں کے انتخاب و حذف کا بھی سلجھا ہوا شعور رکھتے ہیں۔ یہ انشائیہ اگر چہ مختصر ہے لیکن کسی واقعاتی یا فکری تشنگی کا احساس نہیں دلاتا بلکہ قدم قدم پر قاری کی قوتِ فکر کو متحرک کرتا چلا جاتا ہے۔ انشائیے میں کئی مقامات پر سماجی اور نفسیاتی رویوں کو سادگی مگر گہرائی میں جا کر دیکھنے کی جو سعی ملتی ہے وہ انشائیے کی معنوی خوبیوں کو منور کرتی ہے۔ یہ انشائیہ بھر پور تاثر کا حامل ہے اس انشائیے کا وہ حصہ بھی کافی تیکھا اور منفرد ہے جہاں وہ فاصلے اور قربتوں کے اَن دیکھے زاویے سامنے لا رہے ہیں:

''قربت آتشِ نمرود یا آتشِ محبت میں بے خطر کود پڑنے کا نام ہے جب کہ فاصلہ ہمیشہ محوِ تماشائے لبِ بام رہتا ہے بلکہ بعض اوقات لبِ بام سے بھی پرے کھڑا ہوتا ہے۔ اگر فاصلہ بھی اس آتش میں کود پڑے تو پھر فرقِ من و تُو ختم ہو جائے گا، فاصلہ ختم ہو جائے گا بس قربت ہو گی، یکتائی کا عالم ہو گا۔ اسے نیستی یا فنا بھی کہہ سکتے ہیں۔'' ۲۷؎

یہ اقتباس قاری کو روحانی طور پر خاصا آسودہ کرتا ہے کیونکہ اب قرب اور فاصلے کا مفہوم روایتی اور عمومی مدار سے نکل کر روحانی مدار میں داخل ہو گیا ہے۔ انشائیہ نگار کی یہی ادا اور تخلیقی توانائی سوز و گداز کی کیفیات پیدا کرتی ہیں۔ اس قسم کے حقایق کو بیان کرنے کے لیے فنی بصیرت، عمیق مشاہدہ، کثیر الجہات تجربات و تجزیات اور جدت طرازی جیسے اوصاف درکار ہیں اور حیدر قریشی کے ہاں یہ عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں۔

(۴) وگ:

یہ انشائیہ کلیات میں شامل ہونے سے پہلے ''اوراق'' ۲۸؎ میں شائع ہو چکا تھا۔ کلیات میں طبع ہونے والے انشائیے کی پیشانی پر یہ شعر چمک رہا ہے:

یہ بال و پر تو چلو آ گئے نئے حیدؔر
بلا سے پہلے سے وہ خال اور خد نہ رہے ۲۹؎

انشائیے کا آغاز تو والد کی یاد سے ہوتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس میں تاریخ اور سماجیات کے بڑے بڑے مسائل کا تذکرہ مخصوص انداز سے اپنی جگہ بناتا چلا جاتا ہے۔ حیدر قریشی جب سماج میں پوشیدہ خود غرضی اور مفاد پرستی پر بات کرتے ہیں تو یہ انشائیہ جو بظاہر وگ جیسی عام شئے پر لکھا ہوا ہے ایک مقام پر آ کر ایک پورے عہد کا المیہ بن جاتا ہے۔

جو لوگ وِگ پہننے والوں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ بہروپ بدلتے ہیں۔ اور بھیس بدل کر زندگی گذارتے ہیں اُن کے اس الزام کو حیدر قریشی نے رد کرتے ہوئے جواباً ایک اور اہم نکتے کی جانب ہماری توجہ دلائی ہے:

'' بہروپ تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر کے شیطان کو مہارت کے ساتھ چھپا کر باہر فرشتہ بنا پھرے۔ مایا لگی ہوئی پگڑی کا اکڑا ہوا طرّہ، تکبر کی ماری ہوئی گردن، ریاکاری کی لمبی داڑھی اور نفیس جُبہ۔ یہ جُبہ و دستار بہروپ ہے۔ ایسے بہروپیوں کا یہ ساز و سامان اتار لیا جائے تو نیچے سے ن۔م۔راشد کا لا=انسان برآمد ہوتا ہے۔'' ۳۰؎

حیدر قریشی کی شکوہ سنجی اپنی جگہ بجا ہے لیکن یہ اقتباس پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ صنفِ انشائیہ کے مجموعی مزاج سے قدرے تجاوز کر رہے ہیں۔ طنز کا استعمال انشائیے میں ممنوعات کی ذیل میں تو نہیں آتا لیکن اس کی غیر ضروری شدت اور کاٹ مذکورہ صنف کے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ صنفِ انشائیہ کے تقریباً تمام بڑے ناقدین مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، اکبر حمیدی، ڈاکٹر سلیم اختر، محمد ارشاد، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر رشید امجد، جمیل آذر، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اور حامد برگی وغیرہ نے طنز کی کاٹ اور مزاح کی شدت کو تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ غصہ یا برہمی کا اظہار انشائیے میں جگہ نہیں بنا سکتا بلکہ انشائیے کے مجموعی تاثر کو کمزور کر دیتا ہے۔

حیدر قریشی نے اس انشائیے میں جن مسائل پر بات کی اُن کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اگر اِن معاملات کو علامتی اور ڈھکے چھپے الفاظ میں پیش کر دیا جاتا ہے تو مجموعی تاثر پر خوشگوار

اثرات مرتب ہوتے۔حامد برگی کا یہ کہنا درست ہے:

''انشائیہ میں مقالہ کی طرح وضاحتوں کی گنجائش نہیں۔ابہام اور ایمائیت انشائیہ کا حسن ہے۔ بات جتنی اشاروں، کنایوں میں ہو اتنی ہی خوبصورت اور فنکارانہ ہوتی ہے۔بشرطیکہ وہ سوچ اور خیال کے دروازے کھولتی جائے۔انشائیہ نگار کا عندیہ مبہم ہونے کے باوجود قاری کی سمجھ میں آجائے،اُسے انشائیہ نگار سے وضاحتیں طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔'' ۳۱؎

انشائیے کا اہم مقام یہی ہے کہ اس میں ایمائیت موجود ہو اور وہ اظہار و ابلاغ کے تمام تقاضے بھی پورے کرے۔حُسنِ معنی کا رکھ رکھاؤ اور پیش کش انشائیے کے بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں اگر ان کا اہتمام نہ کیا جائے تو بات نہیں بنے گی۔

انشائیے کے دو اور مقام ملاحظہ ہوں جہاں حیدر قریشی کا انشائی حوالہ قدرے دھیما ہو گیا ہے:

(ا)''وہ لیڈر بہروپیے ہیں جو عوام کی فلاح کے دعوے کرتے ہیں اور عملاً عوام کا استحصال کرتے ہیں وہ لوگ بھی بہروپیے ہیں جو مغربی دنیا میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے من گھڑت اور جھوٹے بیانات دیتے ہیں کہ گوئبلز کی روح بھی شرما جائے۔'' ۳۲؎

(ب)''ادب میں بھی ایسے کئی بہروپیے پائے جاتے ہیں۔کسی مالدار ادیب سے دولاکھ روپئے کھا کر اُسے ۲۵ ہزار روپئے کا انعام دلانے والے۔'' ۳۳؎

یہ باتیں پڑھ کر دل کو طمانیت اور راحت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اصلاح اور سنجیدگی کا تاثر ابھرتا ہے،شہزاد منظر نے کہا تھا:

''انشائیے کی صنف شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے انشائیہ نگار کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا۔کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد کے لئے کارآمد ہوتی ہے۔'' ۳۴؎

انشائیہ کبھی اصلاحی مقاصد کی خاطر نہیں لکھا جاتا کیونکہ اس کے لئے مضمون کی صنف پہلے سے موجود ہے جو اسلوبیاتی اور موضوعاتی اعتبار سے خاصی وسعت کی حامل ہے۔ انشائیے میں

اکتاہٹ اور طنز کی موجودگی قاری کو مغالطے میں مبتلا کر سکتی ہے۔اگر مضمون اور انشائیے میں اس فرق کے نظر انداز کر دیا جائے تو پھر بات نہیں بنے گی۔

حیدر قریشی کے انشائیوں پر مجموعی رائے:

گذشتہ صفحات میں حیدر قریشی کے چار اہم انشائیوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کر کے اُن کے مجموعی رنگ کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔موجودہ سطور میں اُن کے باقی انشائیوں (نقاب، اطاعت گزاری، یہ خیر و شر کے سلسلے، چشم تصور، اپنا اپنا سچ تجربہ اور تجربہ کاری) کو بھی مدِ نظر رکھ کر سلسلہء کلام آگے بڑھایا جائے گا تا کہ اُن کے فکر و نظر کے ممکنہ پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکے۔ حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن میں درج ذیل نکات حاوی دکھائی دیتے ہیں۔

ا۔انشائیے کا ابتدائی شعر:

حیدر قریشی نے اپنے ہر افسانے اور انشائیہ کا آغاز ایک شعر سے کیا ہے۔اس شعر کا منطقی جواز یہی ہے کہ ہر شعر مرکزی موضوع پر مبنی ہے۔اور ہر موضوع میں زیرِ بحث اُن کہی باتیں شعر کی زبانی بیان ہو جاتی ہیں۔یہ تمام اشعار طبع زاد ہیں اور موضوع کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً ''نقاب'' کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

حیدؔر بھید جہاں کے جیسے خواب کے اندر خواب
ایک نقاب اگر الٹیں تو آگے اور نقاب ۳۵؎

یہ انشائیہ بڑھ چکنے کے بعد قاری محسوس کرنے لگتا ہے کہ جیسے حیدر قریشی نے اس مضمون کو پھیلا کر انشائیہ بنا دیا ہے یا انشائیے کے موضوع کو سمیٹ کر شعر میں بند کر دیا ہے

''وِگ'' کا ابتدائی شعر دیکھئے:

یہ بال و پر تو چلو آ گئے نئے حیدر
بلا سے پہلے سے وہ خال اور خد نہ رہے ۳۶

انشائیہ ''یہ خیر و شر کے سلسلے'' کا شعر دیکھئے:

خیر و شر کی آمیزش اور آویزش سے نکھریں
بھول اور توبہ کرتے سارے سانس بسر ہو جائیں ۳۷

غرض ہر شعر پیش آمدہ صورتِ حال کا جامع مرقع ہے۔

۲۔ تفکر کے عناصر:

ڈاکٹر ناصر عباس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''انشائیہ انسان کی ذہنی اور تہذیبی ترقی کے ایک مرحلے پر نمودار ہوتا ہے۔'' ۳۸

یہی ذہنی اور تہذیبی ترقی انشائیے میں فکریات کے ایسے عناصر پیدا کرتی ہے جن کا مطالعہ حیات و کائنات کی تفہیم میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ حیدر قریشی کے انشائیوں میں فکری اکائیاں دھیمے سروں میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ اگر کہیں تخلیقی رو میں سروں کی آواز اونچی ہونے لگے تو انشائیہ نگار شعوری کاوش سے انھیں پھر سے دھیما بنا دیتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

انشائیہ ''اطاعت گزاری'' میں کہتے ہیں:

''اطاعت گزاری کا جوہر نہ صرف بغاوت، سرکشی اور انحراف کے جذبات کو ختم کرتا ہے بلکہ انسانی ذہن کو زیادہ سوچنے کے عمل سے روک کر اُسے بہت سی مشکلات سے بھی نجات بخش دیتا ہے۔ زیادہ سوچنے والے لوگ یعنی آزادانہ طور پر غور و فکر کرنے والے لوگ جب سوچتے ہیں بُرے بھلے میں حدِ فاصل قائم کر کے تعصب اور آویزش کو ہوا دینے لگتے ہیں۔'' ۳۹

اس طرح کے فکری تصورات اور تجربات کا کوئی اپنا سیاق و سباق بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ اپنے سیاق سے ہٹ کر بھی سماجی المیے کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اقتباس میں موجود تمام الفاظ سادہ

و سہل نظر آتے ہیں لیکن ان میں فکری پیچیدگی موجود ہے۔ جو قاری کی توجہ چاہتی ہے۔ اگرچہ انشائیہ کا مقصد تلخ نوائی نہیں ہوتا اور نہ پڑھنے والوں کو کسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا کرنا ہے بلکہ یہ موضوع کا کمال ہے کہ وہ اپنے اندر چھپے ابعاد اور جہات کبھی سنجیدگی اور کبھی خوشی یا مسرت کے پیرائے میں کھولتا چلا جاتا ہے اور انشائیہ نگار تخلیقی بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔

ایک اور انشائیہ ''فاصلے، قربتیں'' کا یہ جملہ دیکھئے۔

''قربت کی انتہا سے فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح فاصلے کی انتہا قربت کو جنم دیتی ہے یہ کوئی فلسفہ نہیں حقیقت ہے۔'' ۴۰

''تجربہ اور تجربہ کاری'' ایک ایسا انشائیہ ہے جس میں حیدر قریشی نے ''تجربہ'' کو ایجابی اور ''تجربہ کاری'' کو سلبی اوصاف کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ اور اپنے اس نقطۂ نظر یا موقف کو منطقی استدلال سے مزین کر دیا ہے۔ یہ جملے لائقِ توجہ ہیں:

۱۔ ''تجربہ کاری کا یہ اصول ہے کہ جو چیز اپنے مطلب اور فائدے کے مطابق ہے وہی سچائی ہے باقی سب جھوٹ ہے۔'' ۴۱

۲۔ تجربہ کاری کا ہنر جاننے والوں کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اپنے واجبی علم کی خامیوں کو چھپا کر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے علم کا اظہار کریں گے۔'' ۴۲

۳۔ ''زندگی کے تجربات زندگی کو معصومانہ حیرت سے دیکھنے اور پھر اس کی جستجو کے سفر سے عبارت ہیں یہ حیرت اور جستجو اجتماعی نوعیت کی ہے، کیونکہ اس سے پوری انسانیت فیض یاب ہوتی ہے۔'' ۴۳

حیدر قریشی کے انشائیوں میں فکریات کا ایک پورا نظام فعال ہے۔ اس نظام کا مرکز و محور اخلاقیات پر استوار ہے جس میں ایک طرف تو نام نہاد پاکبازوں کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے اور دوسری جانب سماجی رویوں میں چھپے کذب و افترا اور منافقت کا پردہ چاک کیا جاتا ہے لیکن تنقید کا یہ عمل صنفِ انشائیہ کے مزاج کو متاثر نہیں ہونے دیتا۔

۳۔اصول اخذ کرنے کی صلاحیت:

حیدر قریشی کے انشائیوں میں سچی، کھری اور جرآت مندانہ باتوں کا سلسلہ در سلسلہ بیان ملتا ہے۔ یہ بیان قاری کے تجربات میں خوشگوار اضافہ کرتا ہے اور اسے کئی مقامات پر چونکاتا بھی ہے۔''فاصلے، قربتیں'' میں شامل تمام انشائیوں کا ایک نمایاں وصف یہ سامنے آتا ہے کہ حیدر قریشی نے جن حالات و واقعات کو موضوع بنایا اُن پر بات کرتے ہوئے مخصوص نتائج اور اصول اخذ کرتے ہیں۔ یہ اصول وہ ثمرات ہیں جو قاری کی فکری اور جمالیاتی ترتیب کرتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں:

ا۔''اگر ہر شئے بے نقاب ہوتی تو کسی شئے میں کوئی جاذبیت نہ رہتی۔''

(نقاب) ۴۴؎

۲۔''ہر سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ اور ہر جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہوتا ہے۔'' (یہ خیر و شر کے سلسلے) ۴۵؎

۳۔''ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہوتا ہے۔ اور ہر کسی کو اپنے اپنے سچ کی حفاظت کرنی چاہئے۔ نظریاتی سچ کی حفاظت نظریات پر عمل پیرا ہونے سے ہوتی ہے۔''

(اپنا اپنا سچ) ۴۶؎

۴۔''یہ وہی تجربہ کاری ہے جو اپنی عیاری کو حکمت اور دوسروں کی دفاعی حکمت کو بھی مکاری قرار دیتی ہے۔''

(تجربہ اور تجربہ کاری) ۴۷؎

۴۔تجربات اور مشاہدات اور تجزیات

حیدر قریشی نے اپنے تقریباً تمام انشائیوں میں زندگی سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات کو بہ اندازِ دگر پیش کیا ہے۔ یہ تجربات و مشاہدات اگرچہ انفرادی سطح سے اُٹھتے ہیں

لیکن فنی چابکدستی اور انشائی تخلیقی عمل کی بدولت اجتماعی رنگوں سے مالا مال ہیں۔ کچھ رنگ ملاحظہ ہوں:

''یہ ڈپلومیٹس (امریکی) دنیا بھر میں جمہوریت کے نفاذ کے علمبردار ہیں۔ لیکن اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے بعض ممالک میں نہ صرف بادشاہت کو تحفظ فراہم کرتے ہیں بلکہ جہاں اپنا فائدہ نظر آئے وہاں جمہوریت کا خاتمہ کر کے فوجی آمریت بھی مسلط کر دیتے ہیں۔'' ۴۸؎

''اصولاً کسی کو اپنی خوبصورتی کے ثبوت کے لیے دوسروں کی بدصورتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔'' ۴۹؎

''سچے اطاعت گذار کا کمال یہ ہے کہ جو سانحہ اُس کے اپنے گروہ کے ساتھ پیش آئے اُسے تو وہ خدا کی طرف سے آزمائش اور امتحان قرار دیتا ہے لیکن اگر ویسا ہی سانحہ بلکہ اس سے بھی کم تر سانحہ کسی دوسرے گروہ کو پیش آئے تو پورے ایمانی جوش و خروش کے ساتھ اُسے عذابِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔'' ۵۰؎

غرض ان کے انشائیوں کا عمرانی پہلو اصل سائل کو نشان زد کرتا ہے۔

(۵) سائنسی عناصر:

حیدر قریشی کو سائنسی علوم خصوصاً طبیعیات میں خاص دل چسپی ہے اور اس کی وجہ ڈاکٹر وزیر آغا کی دوستی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ آغا صاحب کے اکثر قریبی دوست اس مشترک شوق کے اسیر ہیں۔ حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں کئی مقامات پر اپنے اس شوق کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً اُن کا انشائیہ ''چشمِ تصور'' ایٹم (Atom) کے جدید تصورات پر روشنی ڈالتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے ایٹم کی اندرونی ساخت پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پہلے پہل کہا گیا کہ ایٹم مادے کا بلڈنگ بلاک ہے بعد میں اسی ایٹم کے چالیس

سے زائد پارٹیکلز دریافت ہو گئے۔ بات Quarks تک پہنچی مگر پھر اس کے بھی مزید چھ کلرز سامنے آ گئے۔ Quarks سے ''ہیڈرونز'' بنتے ہیں۔'' ۵۱؎

''سائنس ابھی تک چھوٹی کائنات یعنی ایٹم کا کوئی انت تلاش نہیں کر سکی۔'' ۵۲؎

حیدر قریشی نے اپنے انشائیے میں ان تمام مسائل سے اُس وقت تعرض کیا جب وہ تخلیق کائنات پر غور و فکر کر رہے تھے اور وہ لاشعوری طور پر تخلیق اور ایٹم کے باہمی تعلق پر سوچنے لگ گئے۔ انھوں نے نظامِ شمسی اور کائنات کے دیگر مظاہر کو بلیک ہولز کے تناظر میں بھی سمجھنے کی سعی کی ہے۔ ان کا چشمِ تصور اگر ایک طرف سائنس جیسے جدید ترین نظریات سے روشنی حاصل کرتا ہے تو دوسری جانب جن، دیو، پریاں، اور اڑن کھٹولے اُن کے تخیلات کو مہمیز کر رہے ہیں۔

اُن کا ایک اور انشائیہ ''فاصلے اور قربتیں'' جب تخلیقی امکانات کو زیرِ بحث لاتا ہے تو Big Bang پارٹیکل اور اینٹی پاٹیکل کے تصورات کو بھی اپنے موضوع میں سموتا چلا جاتا ہے۔ یہ تمام سائنسی حوالہ جات محض سائنسی معلومات فراہم نہیں کرتے بلکہ کائنات کے اسرار و رموز کو بھی تخیل کی آنکھ سے دیکھنے کے لیے زمین ہموار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے جو بات انشائی اسلوب کے حوالے سے کہی تھی یہ اس کی عملی صورت ہے، اُنھوں نے کہا تھا:

''انشائیہ نگار اُسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتا ہے، مراد یہ ہے کہ وہ روایتی اور مروجہ اسلوب اظہار کے لیے نئے امکانات کا سراغ لگاتا ہے۔'' ۵۳؎

سائنسی موضوعات عموماً اپنی خشکی اور معروضی صفات کی بنا پر ادب میں مشکل سے ہی جگہ بنا پاتے ہیں لیکن حیدر قریشی جیسے پختہ کار انشائیہ نگار اپنے جاندار تخیل کی بدولت ان میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔

۶۔ ادبی مشاہدات اور تجربات

حیدر قریشی کی زندگی کا بڑا حصہ ادبی مصروفیات کے تابع ہے۔ لہٰذا ادبی باتوں کا

انشائیے یا دوسری نثری اصناف میں در آنا خلافِ توقع نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے انشائیوں میں تلخ ادبی تجربات کا تذکرہ کومل سروں میں کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں:

''دبیز نقاب جب کسی معقول انسان کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ عاشقِ زار بن کر محلے کے شرفا کے لیے متعدد مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن جب یہی نقاب کسی ادیب کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ بے سرو پا نظمیں یا مضمون نما خط قسم کی چیزیں لکھ کر اپنے آپ میں ایک مسئلہ بن جاتا ہے، شاید نفسیاتی مسئلہ!'' ۵۴؎

انشائیہ ''وگ'' میں جب بہروپ بدلنے والوں کا ذکر آتا ہے تو حیدر قریشی کا قلم خود بخود ادب کی جانب مڑ جاتا ہے:

''ادب میں بھی ایسے کئی بہروپیے پائے جاتے ہیں۔ کسی مالدار ادیب سے دو لاکھ روپے کھا کر اُسے ۲۵ ہزار روپے کا انعام دلانے والے، مناسب حق الخدمت کے طور پر کسی لولے لنگڑے افسانے کو دورِ حاضر کا ممتاز ترین افسانہ قرار دینے والے۔'' ۵۵؎

ان ادبی مسائل و عوارض کا پس منظر چاہے کچھ بھی ہو حیدر قریشی اِن میں عمومیت کا رنگ بھر کر یارانِ نکتہ دان کو صلاحِ عام کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

اِن واقعات اور تجربات کی شمولیت کا ایک حسن یہ ہے کہ اصل موضوع کی مرکزیت کو قائم رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں ایسی کر جاتے ہیں جو بادی النظر میں اصل موضوع سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں لیکن اصل موضوع کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ انشائی اسلوب ہی کا وصف ہے کہ موضوع کی وسعت حسبِ ضرورت بڑھائی یا کم کی جا سکتی ہے۔ بقولِ غالب!

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے ۵۶؎

۷۔نفسیات،مشاہدۂ باطن اوراخلاقیات:

انسانی نفسیات اورمشاہدۂ باطن سے حیدرقریشی کو جوغیرمعمولی دل چسپی ہے اس کا اندازہ اُن کی یادنگاری، خاکہ نگاری اورافسانہ نگاری، سے بآسانی ہوجاتا ہے،لیکن انشائیہ نگاری میں بھی یہ عناصرجگہ جگہ مشاہدہ کیئے جاسکتے ہیں۔اس حوالے سے چندمثالیں دیکھئے:

''بچپن میں ہم جوانوں کودیکھ کرجوان ہونے کی تمنا کرتے ہیں لیکن جوان ہوتے ہی بچپن کو یادکرنا شروع کردیتے ہیں۔اس کے برعکس جوانی میں ہم آنے والے بڑھاپے کے تصور سے ہی خوف کھاتے ہیں۔لیکن بڑھاپا آتے ہی ہم پرفکرودانش کے ایسے انوار برستے ہیں کہ نہ صرف بڑھاپے سے ساراخوف دور ہوجاتا ہے۔ بلکہ ہماری زندگی میں ہی بڑھاپا ہمیں بچپن اورجوانی ہمارے بیٹوں اور پوتوں کی صورت میں دکھادیتا ہے۔'' ۵۷؂

نفسیاتی ژرف بینی کی یہ مثال بھی دیکھئے:

''انسانی چہرہ بجائے خودایک نقاب ہے جس میں سے کبھی کبھی اس کے اندرکا حیوان جھانکتا نظرآتا ہے۔اندرکا فرشتہ تواکثر چہرے پرہی ملتا ہے کون ہے جوکسی دوسرے انسان کو پوری طرح جاننے کا دعویٰ کرسکے۔'' ۵۸؂

مشاہدہ باطن کی مثال ملاحظہ ہو:

''اطاعت گزاری،فرمانبرداری اوروفا شعاری ایک ہی حقیقت کے مختلف چہرے ہیں۔اطاعت کا مادہ انسانی نفس کوسنگسارکرکے اس کی روح اورذہن کو ہرطرح سے سبک سار کردیتا ہے۔گویا اطاعت سے مراحلِ تصوف کا آغاز ہوتا ہے اورکمالِ اطاعت تک وہ کامل صوفی بن جاتا ہے۔'' ۵۹؂

حیدرقریشی کاتخلیقی وجدان،سماج،افراد،وقوعات،حوادث اورانسانی مظاہر کے باطن میں چھپے اُس اسرارکوڈھونڈ نکالتا ہے جوعام نظرسے پوشیدہ ہوتے ہیں۔حیدرقریشی کے انشائیوں میں اخلاقیات کاعنصرخاصا نمایاں ہے۔جس طرح اقبال کے بارے میں عموماً یہ شکوہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی غزلوں اورنظموں میں جس کسی موضوع پربات کریں بالآخرگھوم پھر کراپنے فلسفۂ خودی یا

فلسفۂ عشق کاالاپ شروع کردیتے ہیں۔تقریباًایسی ملتی جلتی صورت حیدرقریشی کے انشائیوں میں نظرآتی ہے،وہ موقع ملتے ہی نصیحت کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔یہ مثال دیکھئے:

''ایک اچھے مرد کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی بیوی پرقناعت کرے۔دوسروں کی بیویوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی بجائے اپنے اوراپنی بیوی کے مشترکہ تخلیقی عمل میں مگن رہےاوراس طرح زندگی میں اضافہ کرکے زندگی کی جنت کانظارہ کرتا رہے۔'' ۶۰؂

گواُن کے ہاں پندونصائح والی روایتی کیفیت توپیدانہیں ہوتی لیکن دبے لفظوں میں وہ کوئی نہ کوئی ایسا اخلاقی نکتہ ضرور بیان کرتے ہیں جوقاری کی فکری تربیت میں معاونت کرتا ہے۔حیدرقریشی قاری کے بنیادی عقائد کو مدِنظر رکھتے ہوئے عمومی نکتوں پر بات کرتے ہیں تاکہ ہرشخص حسبِ حال اُن سے مستفید ہوسکے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عقائداورنظریات کا ہر نظام عمرانی شعور کا زائیدہ ہوتا ہےاوراس کی نشوونما اورارتقا کا سلسلہ اُس وقت مزید مستحکم ہوجاتا ہے جب حیدرقریشی جیساقلم کاراپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے۔

حیدرقریشی نے اپنے ایک انٹرویومیں کہاتھا:

''میری انشائیہ نگاری میں ڈاکٹر وزیرآغا کا بہت بڑا حصہ ہے۔باقی انشائیہ نگاروں میں غلام جیلانی اصغر،انورسدید،مشتاق قمراوراکبرحمیدی مجھےاچھے لگتے ہیں۔شاید ان کےاثرات بھی میرےانشائیوں میں ملتے ہیں۔'' ۶۱؂

حیدرقریشی کا یہ اعتراف خاص اہمیت رکھتا ہے،اوران کے اثرات کا کھوج بھی بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔اُنھوں نے جن شخصیات کا حوالہ دیا ہے ان میں تین پروہ خاکے بھی لکھ چکے ہیں۔ جو''میری محبتیں'' کے حصہ دوم میں بعنوان عہدساز شخصیت (ڈاکٹر وزیرآغا)،ایک ادھوراخاکہ (غلام جیلانی اصغر)،اوربلندقامت ادیب(اکبرحمیدی) دیکھے جاسکتے ہیں۔ دبستانِ سرگودھا کے یہ تینوں ادیب انشائیہ نگاری کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔حیدرقریشی نے وزیرآغا والے خاکے میں ایک بار پھراس بات کااعتراف کیا کہ

''وزیرآغا نے مجھےانشائیے لکھنے کاشوق پیدا کیا۔'' ۶۲؂

اوراس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدر قریشی کی زیادہ ملاقاتیں اور مکتوبی رابطے وزیر آغا سے رہے اور آغا صاحب انشائیہ کے بارے میں جو بصیرت افروز نظریات رکھتے تھے وہ مجموعی صورت میں ان کے لیے بھی قابلِ قبول تھے۔''فاصلے، قربتیں'' میں موجود انشائیے جہاں اِن مقتدر شخصیات کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں وہاں حیدر قریشی کی تخلیقی صلاحیت اور سلیقہ شعاری کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے کہا تھا:

''انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتا ہے، مراد یہ ہے کہ وہ روایتی اور مروجہ اسلوبِ اظہار کے نئے امکانات کا سراغ لگاتا ہے۔کثرتِ استعمال سے جو تراکیب، محاورے، استعارے اپنی چمک دمک کھو چکے ہیں، انہیں نئے سیاق وسباق میں پیش کرتا ہے اور اس عمل میں وہ ''روایت'' کو نئی سطح تفویض کرنے کی انشائی ٹیکنیک کے تابع رہتا ہے، اگر وہ اسلوب کی تازگی کو بروئے کار نہ لا سکے تو اس کا انشائی تخلیقی عمل سے گزرنا مشتبہ قرار پائے۔'' ۶۳

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں مذکورہ بالا تمام شرائط کا التزام بطریقِ احسن کیا ہے۔اور ویسے بھی اِن کا تعلق انشائیہ نگاروں کے اُس قبیلے کے ساتھ ہے جن کی نشو ونما براہِ راست اُن ادیبوں کے زیرِ سایہ ہوئی جو فنِ انشائیہ نگاری کے امام اور بنیاد گزار ہیں۔یہ اُنہی کی تربیت اور حیدر قریشی کی ذاتی محنت کا فیض ہے کہ آج اُن کا شمار اردو ادب کے اہم انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

....

حوالاجات

۱ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۵۲۶

۲ اکبر حمیدی، جدید اردو انشائیہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء ، ص۴۔(ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ حوالہ مذکورہ کتاب کے دیباچے سے اخذ کیا گیا ہے، جو اکبر حمیدی کا

تحریر کردہ ہے)

۳ جدید اردو انشائیہ، ص ۶

۴ جدید اردو انشائیہ، ص ۹ (دیباچہ از اکبر حمیدی)

۵ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو انشائیہ کی کہانی، مشمولہ، جدید اردو انشائیہ، مرتبہ، اکبر حمیدی، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۲۴

۶ حیدر قریشی، فاصلے، قربتیں، مشمولہ عمرِ لاحاصل کا حاصل، (کلیات نظم ونثر)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء ،ص ۵۰۷

۷ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، انشائیہ کیا ہے،
مشمولہ، سہ ماہی اوراق، جولائی، اگست ۱۹۹۹ء (خاص نمبر) ص ۱۷۹

۸ خاموشی، مشمولہ، عمرِ لاحاصل کا حاصل، ص ۵۰۷

۹ ایضاً، ۵۰۸

۱۰ اکبر حمیدی، اردو انشائیہ اور نئے افق،
مشمولہ، سہ ماہی اوراق، جولائی اگست ۱۹۹۹ء، (خاص نمبر)، ص ۱۷۸۔۱۷۷

۱۱ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ، مبادیات، مشمولہ، جدید اردو انشائیہ

۱۲ خاموشی، کلیات، ص ۵۰۹

۱۳ جمیل آذر، انشائیہ نگار کا رویہ،
مشمولہ، اوراق، اگست، ستمبر (خاص نمبر)، شمارہ ۸، ۹ ص۳۷۵

۱۴ حیدر قریشی، بڑھاپے کی حمایت میں،
مشمولہ، جدید اردو انشائیہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۱۴۸

۱۵ غالب، دیوانِ غالب، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن اشاعت ندارد، ص ۱۱۹

۱۶ بڑھاپے کی حمایت میں، مشمولہ، جدید اردو انشائیہ، ص۱۵۰

۱۷ شہزاد منظر، ردِ عمل (تنقیدی مضامین)، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۹

۱۸۔ بڑھاپے کی حمایت میں،ص ۱۵۰

۱۹۔ منزہ یاسمین، حیدر قریشی۔شخصیت اور فن،

میاں محمد بخش پبلیشرز، خانپور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۶

(یہ اصل میں ایم اے کا تحقیقی مقالہ ہے، جو ڈاکٹر شفیق احمد کی نگرانی میں مکمل ہوا،

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور،شعبہ اردو کی طالبہ نے یہ مقالہ ۲۰۰۰،تا۲۰۰۲ کے سیشن میں لکھا تھا

،مقالہ ہٰذا باقاعدہ منظوری کے بعد کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا)

۲۰۔ حیدر قریشی، فاصلے، قربتیں، اوراق (سالنامہ)، مدیر ڈاکٹر وزیر آغا،

شمارہ نمبر۲،۳، فروری، مارچ ۱۹۹۵ء ص ۳۳۲ تا ۳۳۳

۲۱۔ یہ شعر،کلیات، (عمرِ لا حاصل کا حاصل) کے صفحہ ۵۱۶ پر چھپنے والے انشائیے

میں تو شامل ہے،لیکن اوراق میں چھپنے والے اس انشائیے میں شعر کو حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۲۔ حیدر قریشی، فاصلے، قربتیں، اوراق، مدیر ڈاکٹر وزیر آغا،

شمارہ نمبر۲،۳، فروری،مارچ ۱۹۹۵ء ص۳۳۲

۲۳۔ فاصلے، قربتیں، ص ۳۳۲

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ نذر خلیق،حیدر قریشی کے انشائیے، مشمولہ، حیدر قریشی کی ادبی خدمات،

(متفرق مضامین)۔میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، ۲۰۰۳ء، ص۲۴۵

۲۷۔ فاصلے قربتیں، ۳۳۲

۲۸۔ حیدر قریشی، وگ(انشائیہ) ،مشمولہ اوراق، شمارہ ۱، ۲،

جنوری، فروری، ۱۹۹۶ء ، ص ۵۵ تا ۵۶

۲۹۔ عمرِ لا حاصل کا حاصل (کلیاتِ نظم و نثر)، ص ۵۱۳

۳۰۔ ایضاً ، ص ۵۱۴

۳۱۔ حامد برگی، انشائیہ کا فن، مشمولہ، جدید اردو انشائیہ، ص ۸۵

۳۲۔ وگ، ص ۵۱۵

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ شہزاد منظر، ردِعمل، (تنقیدی مضامین) ص ۱۷۸

۳۵۔ نقاب، مشمولہ عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات نظم و نثر) ص ۵۱۰

۳۶۔ وگ، مشمولہ، عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات نظم و نثر) ص ۵۱۳

۳۷۔ یہ خیر و شر کے سلسلے،مشمولہ،عمرِ لا حاصل کا حاصل،(کلیات نظم و نثر)ص ۵۲۵

۳۸۔ ناصر عباس نیر ، نئے انشائیہ نگاروں کا شعورِ تخلیق، مشمولہ، ادبیات،

اکادمی ادبیات پاکستان، جلد۱۳ ، شمارہ۵۳، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۳

۳۹۔ اطاعت گزاری، مشمولہ، عمرِ لا حاصل کا حاصل، ص ۵۲۴

۴۰۔ فاصلے قربتیں، مشمولہ عمرِ لا حاصل کا حاصل، ص ۵۱۸

۴۱۔ تجربہ اور تجربہ کاری، عمرِ لا حاصل کا حاصل، ص ۵۳۵

۴۲۔ تجربہ اور تجربہ کاری، عمرِ لا حاصل کا حاصل، ص ۵۳۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۵۳۴

۴۴۔ نقاب، عمرِ لا حاصل کا حاصل، ص ۵۱۱

۴۵۔ یہ خیر و شر کے سلسلے، مشمولہ، عمرِ لا حاصل کا حاصل ، ص ۵۲۷

۴۶۔ اپنا اپنا سچ، مشمولہ، عمرِ لا حاصل کا حاصل، ص ۵۳۱

۴۷۔ تجربہ اور تجربہ کاری ، مشمولہ، عمرِ لا حاصل کا حاصل ، ص ۵۳۵

۴۸۔ تجربہ اور تجربہ کاری ، ص ۵۳۵

۴۹۔ اپنا اپنا سچ، مشمولہ، کلیات ، ص ۵۳۱

۵۰۔ اطاعت گزاری، مشمولہ، کلیات ، ص ۵۲۲

۵۱۔ چشمِ تصور، مشمولہ، کلیات، ص ۵۲۹

۵۲۔ ایضاً

۵۳۔ ناصر عباس نیر، نئے انشائیہ نگاروں کا شعورِ تخلیق، ص ۱۸۴

۵۴۔ نقاب، کلیات، ص ۵۱۲

۵۵۔ وگ، کلیات، ص ۵۱۵

۵۶۔ غالب، دیوانِ غالب، ص ۱۸۲

۵۷۔ بڑھاپے کی حمایت میں، کلیات، ص ۵۲۰

۵۸۔ نقاب، کلیات، ص ۵۱۰، ۵۱۱

۵۹۔ اطاعت گزاری، مشمولہ، کلیات ، ص ۵۲۲

۶۰۔ اپنا اپنا سچ، مشمولہ، کلیات ، ص ۵۳۲

۶۱۔ حیدر قریشی سے لئے گئے انٹرویوز، مرتب سعید شباب،
نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ایمسٹرڈیم، ہالینڈ

(یہ انٹرویو محمد وسیم انجم نے کیا تھا، مذکورہ کتاب میں یہ انٹرویو ''حیدر قریشی سے مکالمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔)

۶۲۔ عہد ساز شخصیت (ڈاکٹر وزیر آغا)، کلیات، ص ۳۳۶

۶۳۔ ناصر عباس نیر، نئے انشائیہ نگاروں کا شعورِ تخلیق، ص ۱۸۴

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

صرف گناہوں کا ہی بوجھ نہیں سر پر
اپنے نیک اعمال بھی ہم کو ڈھونے ہیں

خاموشی

گیت سناتے ہیں جھرنے کے گرنے کا
حرف جوخاموشی کی صدامیں گرتے ہیں

ہنگامہ اورشور زندگی کے صحیح عکاس نہیں۔اسی طرح سنّاٹا اور ویرانی بھی زندگی کے ترجمان نہیں ہیں۔ان کے برعکس خاموشی زندگی کی حقیقی عکاسی کرتی ہے۔جولوگ سنّاٹے اور خاموشی میں فرق نہیں کر پاتے وہ خاموشی کی اہمیت نہیں جان سکتے۔سنّاٹا بے روح اور بے آواز ہوتا ہے جبکہ خاموشی زندگی کی عکاس ہی نہیں، زندگی کوجنم بھی دیتی ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟۔دل کی دھڑکن کا ہر بار ایک وقفے کے ساتھ خاموشی اختیار کرنا اور پھر خاموشی کے اسی وقفے سے اگلی دھڑکن کا جنم لینا زندگی کوجنم دینا نہیں تو اور کیا ہے! پھر خاموشی سنّاٹے کی طرح بے آواز بھی نہیں بلکہ خاموشی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔جب مکمل خاموشی ہو، ہونٹ بھی خاموش ہوں تب دو دھڑکتے دلوں کی جوگفتگو ہوتی ہے اسے اہلِ دل بخوبی جانتے ہیں۔کوئی صوفی جب تک کسی گوشۂ خاموشی میں نہ جائے تب تک اس کے دل کے تار حقیقتِ عظمیٰ سے نہیں مل پاتے۔کسی ہنگامہ خیز، پُرشور ماحول نے نہ کبھی دو سچے دلوں کو ملنے دیا ہے اور نہ کبھی کوئی سچا صوفی پیدا کیا ہے۔عبادت گاہوں میں جب تک خاموشی نہ ہوعبادت کا لطف ہی نہیں آسکتا، یوں بھی خاموشی بجائے خودعبادت کا درجہ رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب سے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال عام ہوا ہے،عبادت گاہوں میں بھی شورسنائی دینے لگا ہے اور عبادتوں کا تقدس ختم ہوتا جارہا ہے۔

عبادت کی حیثیت سے خاموشی وظیفۂ ردِّ بلا بھی ہے۔ایسا قرض خواہ جو دوسال سے

پھیرے لگانے کے بعد یہ ارادہ بدلے کرآئے کہ آج حتمی فیصلہ کر کے جاؤں گا یا ایسا مالک مکان آئے جو گزشتہ چھ سات ماہ کا کرایا یکمشت لینے کی شرانگیزی پر تُلا بیٹھا ہو، ایسے لوگ جب ایسے بدارادوں سے آتے ہیں تو گالی گلوچ سے بھی دریغ نہیں کرتے لیکن ان کے ہر شر سے بچنے کے لئے خاموشی سب سے بہتر وظیفہ ہے۔ایسے ابتلا کے موقع پر آپ دل ہی دل میں ’’جوابِ جاہلاں باشد خموشی‘‘ کا وِرد بھی کر سکتے ہیں۔اگر غلطی سے آپ یہ وِرد باآوازِ بلند کر بیٹھتے ہیں تو اسی وقت آپ کو خود احساس ہوجائے گا کہ خاموشی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی آپ پر عملی صورت میں منکشف ہوگی کہ جاہلانہ کلام سے خاموشی بہتر ہے۔

آواز کی دلکشی بھی خاموشی کے پس منظر کی محتاج ہے۔ہوٹلوں اور بازاروں میں پوری آواز کے ساتھ نشر کئے جانے والے گیت سَر میں درد پیدا کر دیتے ہیں جبکہ وہی گیت آپ رات کو مکمل خاموشی کے پس منظر میں مدھم آواز سے سُنیں تو آپ خود بھی ان گیتوں کے سُروں کے ساتھ جیسے بہتے چلے جائیں گے۔سرگوشی اور دھیمی گفتگو آواز کے خاموشی کی طرف جھکاؤ کے مظہر ہیں۔چنانچہ آپ دیکھیں کہ آوازوں میں جولطف سرگوشی اور دھیمی گفتگو میں ہے وہ بلند لہجے کی آواز میں نہیں ہے۔

میرے ایک کرم فرما ’’ش۔ن‘‘ بے حد دھیمی گفتگو کے عادی ہیں، اس حد تک کہ عام لوگوں کو اُن کی آواز سننے اور سمجھنے کے لئے کان اس طرح کھڑے کرنے پڑتے ہیں جیسے وہ ہمسائے کے گھر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔لیکن میرا اور اُن کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ اور میں اکیلے ہیں اور وہ اپنے مخصوص صوفیانہ لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں۔مجھے صرف ان کے ہونٹ ہلتے نظر آتے ہیں یا کبھی کبھار ایک آدھ لفظ کانوں تک پہنچ جاتا ہے لیکن میرے نزدیک اس لفظ کی کوئی اہمیت نہیں۔میں تو اُن کی بولتی ہوئی خموش گفتگو نہ صرف پوری طرح سنتا ہوں بلکہ خود بھی ساتھ ساتھ شریکِ گفتگو رہتا ہوں۔ہمارے درمیان ابلاغ کا کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

بعض لوگ خاموشی کوشکست کی آواز سمجھتے ہیں۔ایسے لوگ تاریخ اور مستقبل سے بے خبر ’’حال مست‘‘ ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ خاموشی توفتح کی پیش خبری ہوتی ہے۔جب

سمندر خاموش ہو یا فضا میں ہوا خاموش ہو تب خاموشی طوفان اور آندھی کی صورت اپنا جلالی روپ دکھاتی ہے۔ سقراط نے زہر پی کر، حسینؓ نے شہید ہو کر اور ابن منصور نے سولی قبول کر کے خاموشی سے صبر کے جو عظیم نمونے دکھائے بظاہر وہ اُس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست ہی تھی۔ لیکن درحقیقت ان مظلوموں اور سچوں کی خاموشی اُن کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔ مظلوموں کی خاموشی کی یہ سچائی ہمیشہ سے قائم ہے۔

خاموشی اپنے اندر معنویت کے بے پناہ امکانات رکھتی ہے جبکہ آواز کی قید میں آنے والے لفظ مخصوص اور محدود معنویت کے حصار میں آجاتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ موجودہ دور کی مار دھاڑ سے بھرپور بے معنی فلموں کے مقابلہ میں پرانے زمانے کی خاموش فلموں میں کتنی معنویت ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق جو معنی چاہے اخذ کر لے۔ ہمارے تجریدی افسانہ نگار اگر تجرید کے ہنگاموں کی بجائے خاموش اور بے لفظ کہانیوں کی طرف توجہ کریں تو انہیں پسند کرنے والے نقاد سادہ اور صاف صفحات میں اس سے بھی زیادہ معنویت ڈھونڈ نکالیں گے جتنی وہ ان کی تجریدی کہانیوں سے نکال لاتے ہیں۔

انسان خاموشی کو توڑتی ہوئی ایک چیخ کے ساتھ اس دنیا میں آتا ہے۔ نتیجۃً ساری زندگی ہنگامہ بازی میں گزار دیتا ہے۔ ہر وقت بے اطمینانی، مسئلے، پریشانی، اضطراب۔ لیکن موت کی خاموشی آتے ہی وہی پریشان حال انسان کتنا شانت اور کتنا پُرسکون ہو جاتا ہے۔

اتحاد اور امن کے نام پر قائم ہونے والے مقامی، قومی اور بین الاقوامی ہر سطح کے ادارے خاموشی کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں۔ اسی لئے انتشار اور بدامنی کا شکار ہیں۔ کہیں کسی اسمبلی کے ممبران میں ہاتھا پائی، کہیں ہاتھوں، ٹانگوں سے پکڑ کر باہر پھینکوانے کے منظر، کہیں گالی گلوچ۔ اگر ایسے تمام ادارے اپنے ہر اجلاس میں خاموشی کو حرزِ جاں بنالیں تو ساری دُنیا اتحاد اور امن کا گہوارہ بن جائے۔ نہ کوئی تقریر ہو نہ تکرار، نہ کوئی قرارداد نہ بحث، اجلاس چار گھنٹے کا ہو تو بے شک آٹھ گھنٹے تک بیٹھے رہیں بلکہ سوتے رہیں۔ یوں بھاری الاؤنسز کے ساتھ اوورٹائم بھی مل سکتا ہے۔ اس طرح خاموشی ہر سطح پر اتحاد اور امن کے ساتھ معاشی لحاظ سے بھی نعمت بن سکتی ہے۔

نئی تہذیب شور اور ہنگامے سے عبارت ہے۔ اب لڑکیاں برملا رشتے پسند یا ناپسند کرتی ہیں۔ اگلے وقتوں میں جب نئی تہذیب ابھی مسلّط نہیں ہوئی تھی، کیا حیاداری تھی۔ لڑکی کے بزرگ اور قاضی صاحب لڑکی کے پاس جاتے، اس سے دریافت کرتے، یہ رشتہ منظور ہے؟۔ پھر اس کی خاموشی کو نیم رضا ہی نہیں پوری رضامندی سمجھ کر اس کا انگوٹھا لگوا لیتے۔ یہ سب خاموشی کا فیض تھا جس سے ہمارا معاشرہ اب تقریباً محروم ہو چکا ہے۔

خاموشی خیر کی علامت ہے جبکہ شور، شر کا مظہر ہے۔ شور پسند لوگ شورش پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ فتنہ فساد کی سوجھتی ہے جبکہ خاموشی پسند کرنے والے فطرتاً امن پسند ہوتے ہیں۔ اس شوہر کی ازدواجی زندگی کبھی ناکام نہیں ہو سکتی جو مزاجاً خاموشی پسند ہو، چاہے اس کی بیوی کتنی ہی جھگڑالو کیوں نہ ہو، کیونکہ خیر کی قوت بالآخر شر کی قوت پر غالب ہی آتی ہے۔ اسی لئے تو غالبؔ نے کہا تھا:

ایک ''خاموشی'' پہ موقوف ہے گھر کی رونق

ادب میں جو لوگ ڈھول تاشوں، اخباری کالموں، تصویروں، مشاعروں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگراموں کے پُرشور بیک گراؤنڈ میوزک کے ساتھ آتے ہیں، داد و تحسین کی سطحی تالیاں سمیٹ کر جلد ہی مطلع ادب سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر خاموشی سے کام کرنے والے آخری دم تک کام کرتے رہتے ہیں بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی کاغذ پر چلتے ہوئے ان کے کلکِ گوہریں کی سرگوشی برابر سنائی دیتی رہتی ہے۔ گریرسن نے ہندوستان کی زبانوں پر عمر بھر کام کیا اور آخری دن تک کام کرتا رہا۔ جب اس کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقعہ پر لوگ اسے مبارکباد دینے کے لئے اس کے گھر گئے تو دیکھا کہ وہ خاموشی سے میز کے قریب بیٹھا تھا۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ اپنے کام میں کھویا ہوا تھا۔ جب اسے مبارکباد دی گئی تو اس نے حیران ہو کر کہا:

''ارے اسّی برس گزر گئے اور مجھے پتا ہی نہ چلا''۔

☆☆☆

نقاب

حیدرؔ بھید جہاں کے جیسے خواب کے اندرخواب
ایک نقاب اگر اُلٹیں تو آگے اورنقاب

اگلے روز ایک شاپنگ سنٹر پرخریداری کرتے ہوئے میری دوواقف خواتین سے ملاقات ہوئی تو مجھے پہلی بار ایک حیرت انگیز حقیقت سے آشنائی ہوئی۔ان میں سے ایک خاتون خاصی خوبصورت تھی اور ایک نہایت بدصورت لیکن برقع پہننے کا انداز اور آدھے نقاب کا کمال تھا کہ خوبصورت خاتون تو پہلے سے بڑھ کر خوبصورت لگ رہی تھی، بدصورت خاتون بھی حیرت انگیز طور پرخوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔تب میں نے پہلی دفعہ نقاب کے بارے میں غور کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ نقاب نہ صرف حسن کومزید نکھارتا ہے بلکہ عیوب کوڈھانپ کران میں بھی ایک حسن پیدا کر دیتا ہے۔مزید غور کرنے پر مجھے انسانی ذہن اور خواتین کے نقاب کے ارتقا کی کہانیاں ایک دوسرے سے مربوط نظر آنے لگیں۔

شٹل کاک برقع اس دور کی بات ہے جب انسان خودکواور کائناتی رموز کوجاننے کے لئے سرگرداں ہونے لگا تھا۔پھر جب ریشمیں برقع پورے نقاب کے ساتھ آیا تو گویا انسان (ایک حد تک) اپنی ذات اور کائنات کی گتھیاں جان چکا تھا اور انہیں سلجھانے میں مشغول تھا۔ریشمیں برقع پورے نقاب سے آدھے نقاب تک آیا تو انسان بھی حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کے دور میں آ گیا۔جوں جوں خواتین کا نقاب ارتقا کے مزید مرحلے طے کرتا جائے گا انسانی ذہن بھی

اپنی اور کائناتی دریافت کے عمل میں اسی رفتار سے آگے بڑھتا جائے گا۔

ویسے دنیا میں ہر شخص نے نقاب اوڑھ رکھا ہے۔تاجر، ادیب، ملا، پنڈت، افسر، ملازم، دوکاندار، خریدار، سیاستدان۔کیا یہ سب لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں حقیقتاً ویسے ہیں؟ یہ سب لوگ محبت، خلوص، ایمان اور سچائی وغیرہ کے نقاب اوڑھ کر نفرت، ریاکاری اور جھوٹ کے کھیل کھیلتے ہیں لیکن ان کے نقابوں نے ان کے عیوب کوڈھانپ رکھا ہے۔

انسانی چہرہ بجائے خود ایک نقاب ہے جس میں سے کبھی کبھی اس کے اندر کا حیوان جھانکتا ہوا نظر بھی آ جاتا ہے۔اندر کا فرشتہ تو اکثر چہرے پر ہی ملتا ہے۔کون ہے جو کسی دوسرے انسان کو پوری طرح جاننے کا دعویٰ کر سکے۔انسان دوسروں کے لئے تو نقاب میں ہے ہی۔خود اپنے لئے بھی وہ نقاب میں ہے۔کوئی انسان آج تک خودکو پوری طرح نہیں دیکھ سکا، نہ ہی تا حال کوئی ایسا آئینہ دریافت ہوسکا ہے جو انسان کے اندر کے سارے بھید اس پر کھول سکے۔اسی لئے تو سلطان باہوؒ نے کہا ہے:

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہُو

سطح سمندر کا پانی بھی دراصل ایک نقاب ہے جس نے اس کے اندر کی ایک پوری آباد دنیا کو چھپا رکھا ہے۔پھر یہ دھرتی بھی ایک نقاب ہے جس کے اندر چھپے ہوئے پُراسرار خزانے تمام تر معدنی اور آتش فشانی دریافتوں کے باوجود ابھی تک نقاب میں ہیں۔اس سے بھی آگے دیکھیں تو یہ پوری کائنات ہی ایک نقاب ہے جس کے عقب میں خالقِ کائنات کا مسکراتا ہوا،اَن دیکھا حسن ہے۔اس کائناتی نقاب سے جھانکتے ہوئے چاند،سورج، کہکشائیں اور کروڑوں بلکہ اربوں کھربوں ستارے، اسی نقاب کے عقب میں موجود ازلی حسن کی ہلکی سی جھلک دکھا کر ہمیں بے تاب کرتے رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اگر ساری کائنات بنانے کے ساتھ ایسا نقاب نہ اوڑھا ہوتا تو اس کی تلاش اور جستجو کا وہ سفر پھر کہاں ہوتا جو بڑے بڑے سادھو اور صوفی ہزاروں برسوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔گویا نقاب ہمیں سکوت اور ٹھہراؤ کی حالت سے اٹھا کر متحرک کرتا ہے۔تجسّس کی آگ ہمارے سینوں میں بھڑکا کر ہمیں سفر پر روانہ کرتا ہے اور پھر سفر بھی چوتھے

کھونٹ کا۔ چنانچہ انسان کی چاند کی طرف اور پھر اس سے بھی آگے کی طرف کا سفر ہو یا کسی عاشقِ صادق کا آدھے نقاب والے محبوب کے تعاقب میں اس کے گھر کا سفر ہو، سب اسی چوتھے کھونٹ کے سفر کی داستانیں ہیں۔

نقاب معلوم کے جہنم اور نامعلوم کی جنت کے درمیان عالمِ برزخ ہے۔ نقاب کی پُراسراریت ہمارے تجسّس کو بڑھاتی ہے۔ نقاب اوڑھنے والا خود ہی سب کو نہیں دیکھ رہا ہوتا، دوسرے بھی اس کی موجودگی کا لطیف احساس رکھتے ہیں لیکن موجودگی کے اس احساس کی لطافت اس اسرار کے ساتھ بندھی ہوتی ہے کہ وہ نقاب کے باعث دکھائی دے کر بھی دکھائی نہیں دے رہا ہوتا۔ ''ہونے'' ''نہ ہونے'' کی یہ لذّت صرف نقاب کی بدولت ممکن ہے۔ اگر ہر شے بے نقاب ہوتی تو کسی شے میں کوئی جاذبیت نہ رہتی۔ ہر شے معلوم، دیکھی بھالی، جانی پہچانی ہوتی تو ہم پر یکسانیت، بے زاری اور اُکتاہٹ طاری کر دیتی۔ لیکن یہاں تو نقاب در نقاب سلسلے ہیں۔ کسی شے یا شخصیت کا ایک نقاب ہٹائیں تو اندر سے ایک اور جہانِ حیرت ایک اور نقاب سے جھانکتا نظر آئیگا۔ پھر اس نقاب کو ہٹائیں تو ایک اور نقاب اور ایک اور جہانِ حیرت و تجسّس! اسی لئے ادب میں معلوم کی دریافت ایک احمقانہ فعل ہے یا کم از کم سطحی عمل ہے جبکہ نامعلوم کی دریافت ہی اصل تخلیقی سچائی ہے۔

انسانی جسم بھی ایک نقاب ہے جسے روح نے اوڑھ رکھا ہے۔ روح جسم سے نکل کر فنا نہیں ہوتی بلکہ موت کا نقاب اوڑھ کر اس میں زندگی بن کے دھڑکنے لگتی ہے۔ زمانے کی ماہئیت پر سنجیدگی سے غور کریں تو ماضی سے مستقبل تک زمانہ نقاب اوڑھے نظر آتا ہے۔ مستقبل کے پورے مگر باریک نقاب میں سے ہر لحظہ جھانکتا ہوا ''حال'' پلک جھپکتے ہی ماضی کے آدھے نقاب کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور ہم اس لمحے کو چھونے کی، پوری طرح دیکھنے کی خواہش دل میں ہی لئے رہ جاتے ہیں۔

ڈپلومیسی کا نقاب آج کل بہت عام ہے۔ عام زندگی سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ہر شعبۂ حیات میں اس نقاب کو بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اس کے رواج سے پر تکلف

اخلاقیات کا فروغ ہو رہا ہے۔ بعض سر پھرے اسے منافقت قرار دیتے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔ نقصان سر پھروں کا ہی ہوتا ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی کا نقاب اوڑھ کر لوگ بڑے بگڑے کام بھی ٹھیک کرا لیتے ہیں۔ یہ ایسا خوبصورت اور دلآویز نقاب ہے جو کسی بھی طرح کے بڑے سے بڑے اور اصول پرست رہنما کو بھی مغلوب کر لیتا ہے۔

دبیز نقاب جب کسی معقول انسان کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ عاشقِ زار بن کر محلے کے شرفا کے لئے متعدد مسائل پیدا کر دیتا ہے لیکن جب یہی نقاب کسی ادیب کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ بے سر و پا نظمیں یا مضمون نما خط قسم کی چیزیں لکھ کر اپنے آپ میں ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔
شاید نفسیاتی مسئلہ!

☆☆☆

وِگ

یہ بال و پر تو چلو آ گئے نئے حیدؔر
بلا سے پہلے سے وہ خال اور خد نہ رہے

جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے ہی دیکھا کہ ابا جی کے سر پر بال نہیں تھے۔
بچپن سے ہی میری شدید خواہش رہی کہ ابا جی کے سر پر بال سجے ہوئے دیکھوں۔ اس کی دو ممکنہ صورتیں تھیں یا تو کوئی ایسی دوا مل جائے جس سے بال دوبارہ اُگ آئیں یا پھر وِگ سجالی جائے۔ تب وگ خریدنے کے وسائل میسّر نہیں تھے پھر بھی میں نے ایک بار ابا جی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔ اور بس!۔ وسائل میسّر آنے سے پہلے ابا جی فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی یہ انوکھا سا واقعہ رونما ہوا کہ دنیائے فانی سے کوچ کرنے کے بعد ابا جی میرے اندر آن بسے۔ دل میں، لہو میں، روم روم میں بس گئے یہاں تک کہ میرے سر پر بھی پوری طرح نمودار ہو گئے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا ایک حصہ ہے۔ ابا جی کی محبت نے جب میرے اندر اور باہر پر پوری طرح غلبہ کر کے مجھے تصوف کے مقام فنائیت تک پہنچا دیا تب میں، میں نہ رہا۔ میں نے آئینہ دیکھا تو ایسے لگا جیسے بیس برس پہلے کے ابا جی کو دیکھ رہا ہوں۔ سر سے پاؤں تک وہی صورت۔ پھر میں نے مقام فنا سے مقام بقا کا رُخ اختیار کرنے کا سوچا۔ دراصل اب ہمہ وقت ابا جی سے ہی ملاقات ہوتی رہتی تھی اور اپنے آپ سے ملنے کی صورت ہی نہیں بن رہی تھی۔ تب اپنے آپ سے ملنے کی خواہش نے جوش دکھایا:

چلو اپنی بھی جانب اب چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سُونا پڑا ہے

سو میں نے ایک مناسب سی وگ خریدی۔ اپنے مخصوص (مگر گمشدہ) ہیر اسٹائل کے مطابق اسے برش کر کے سر پر سجا لیا۔ وگ کا سر پر سجانا تھا کہ میکدے سے میری جوانی خود ہی اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اپنی جانب کا ویران راستہ رونقوں سے بھر گیا۔ زندگی کا میلہ سا لگ گیا مجھے احساس ہوا کہ میں بیالیس برس کی عمر میں بلا وجہ باون برس کا بنا ہوا تھا۔ وگ کے بغیر میں اپنی عمر سے کہیں آگے نکل گیا تھا۔ وگ نے مجھے میری اصل عمر عطا کر دی۔ وگ پہن کے پہلے پہل آئینہ دیکھا تو ایسے لگا کہ کسی ایسے اجنبی مہمان سے مل رہا ہوں جس نے میرے گھر میں آ کر میرا ہی لباس زیب تن کر رکھا ہے لیکن ''خود کو پہچان'' والا فرمان یاد آیا تو اپنی معرفت کے مرحلے طے ہونے لگے۔ اپنے آپ سے ملاقات ہونے لگی۔

کسی سیلاب یا طوفان کے آنے کے بعد جب کوئی ہنستا بستا شہر ویران اور برباد ہو جاتا ہے تب باہمت اور جرأت مند لوگ اسے از سرِ نو آباد کر کے پہلے سے بھی خوبصورت بنا دیتے ہیں جبکہ کاہل اور نکمّے لوگ عرصہ دراز تک خیمے بنا کر گزارا کرتے ہیں۔ اسی طرح وقت کا بے رحم طوفان کئی انسانی سروں پر تباہی پھیلا کر ان کی اصل صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔ وِگ نہ صرف اسی تباہی کا تدارک کرتی ہے بلکہ انسان کو اس کی اصلی صورت بھی عطا کر دیتی ہے۔ وِگ پہننے والے لوگ وہ باہمت اور جرأت مند لوگ ہیں جو وقت کی پھیلائی ہوئی تباہی سے پھر نئی تعمیر کرتے ہیں جبکہ ٹوپی پہن کر گزارہ کرنے والے لوگ خیموں میں پناہ لینے والوں جیسے ہیں۔

سیاہ رات اس دنیائے موجود کے سر پر ''زُلف دراز'' والی وگ ہے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اس زُلف پر گرے ہوئے شبنمی موتی ہیں، کہکشاں اس کی مانگ میں بھری ہوئی افشاں ہے اور چاند ایک خوبصورت سنہری کلپ۔ یہ دنیائے موجود، رات بھر کسی محبوبۂ دلنواز کی طرح اپنی زلفوں کی مہک بکھیرتی ہے لیکن دن ہوتے ہی سورج کی تپش سے گھبرا کر اس وگ کو اُتار کر رکھ دیتی ہے۔ وگ میں یہ سہولت ہے کہ آپ جب چاہیں وگ پہن کر اپنی اصل صورت دیکھ

لیں اور جب چاہیں وگ کو اتار کر قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ کر لیں۔

ہرے بھرے کھیت، باغات اور جنگلات بہار کے موسم میں خوبصورت وگیں پہن کر اپنی اصل صورت دکھاتے ہیں لیکن خزاں کسی حاسد کی طرح اُن وگوں پر طنز کرتے ہوئے آتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے ان سب کی وگیں اتارتی اور اُدھیڑتی چلی جاتی ہے۔ پھر ایک شیطانی قہقہہ لگا کر کہتی ہے: یہ باغات، جنگلات اور کھیت سب جھوٹ تھے۔ ان سب نے بھیس بدل کر انسانوں کو دھوکہ دیا تھا انہیں بہار کا غلام بنانے کی سازش کی تھی۔ اب اُن کا اصلی روپ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ تمام انسان اُن کا اصلی روپ دیکھ لیں اور بار بار جان لیں کہ یہ بہار ایک دھوکہ ہے۔ زندگی کی حقیقت فنا ہے۔ خزاں اسی سچائی کو پھیلانے کے لئے قدرت کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ وقتی طور پر خزاں کی نحوست اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اسی دوران بہار پھر اپنے کھوئے ہوئے وقت کو واپس لانے کے لئے اندر ہی اندر کام کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی خزاں کی نحوست زائل ہونے لگتی ہے بہار پھر سارے کھیتوں، باغات اور جنگلات کے سروں پر ہریالی کی نئی وگیں سجا دیتی ہے۔ پھولوں کا مسکرانا، پرندوں کا چہچہانا، تتلیوں کا آنا بھنوروں کا منڈلانا۔ زندگی کا میلہ پھر سے لگ جاتا ہے۔

خزاں کے ہمنوا بعض دل جلے بھی وگ پہننے کو بھیس بدلنے یا بہروپ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن وگ پر بہروپ کا الزام بہتان ہے۔ یہ تو ایک ایسی سیدھی سادی سچائی ہے جو انسان کو اس کے اصل روپ میں پیش کرتی ہے۔ کوئی اس سچائی کو مانے نہ مانے یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس کے برعکس بہروپ تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر کے شیطان کو مہارت کے ساتھ چھپا کر باہر فرشتہ بنا پھرے۔ مایا لگی ہوئی پگڑی کا اکڑا ہوا طرّہ، تکبر کی ماری اکڑی ہوئی گردن، ریاکاری، کی لمبی داڑھی اور نفیس جبّہ۔ یہ جبّہ و دستار بہروپ ہے۔ ایسے بہروپیوں کا یہ ساز و سامان اُتار لیا جائے تو نیچے سے ن۔م۔راشد کا لا = انسان برآمد ہوگا۔ جبّہ و دستار کا بہروپ تو خلقِ خدا کو گمراہ کرنے اور غلام بنانے کا ڈھونگ ہے جبکہ اس کے برعکس وِگ اس فکری آزادی کا اعلامیہ ہے جو غلامی سے نجات دلائے۔

وہ لیڈر بہروپیے ہیں جو عوام کی فلاح کے دعوے کرتے ہیں اور عملاً عوام کا استحصال

کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی بہروپیے ہیں جو مغربی ممالک میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے من گھڑت اور جھوٹے بیانات دیتے ہیں کہ گوئبلز کی روح بھی شرما جائے اور اپنے تمام جھوٹے بیانات کے باوجود سچائی کے علمبردار ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ادب میں بھی ایسے کئی بہروپیے پائے جاتے ہیں۔ کسی مالدار ادیب سے دو لاکھ روپے کھا کر اسے ۲۵ ہزار روپے کا انعام دلانے والے، مناسب حق الخدمت کے طور پر کسی لولے لنگڑے افسانے کو دورِ حاضر کا ممتاز ترین افسانہ قرار دینے والے، کمپیوٹر کے عہد کی مناسبت سے کمپیوٹر کی قیمت پر مدح سرائی کرنے والے، ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر غریب مزدوروں اور کسانوں کی حمایت میں ادب لکھنے والے، اصل بہروپیے تو اس قماش کے لوگ ہیں جبکہ وِگ کیرلین پر اسیس کے بیان کردہ گم شدہ حصے کی دریافت میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ وِگ کا جہان بہروپیوں سے یکسر مختلف ہے۔ وِگ پر بہروپ کا الزام عائد کرنے والے حقیقتاً خود بہروپیے ہیں جو اپنے بہروپ کا بھرم قائم رکھنے کے لئے وِگ کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وِگ پہننا اپنے گم شدہ حصے کی بازیافت کا عمل ہے جس کے بغیر اپنی پہچان اور اپنے عرفان کے مرحلے طے نہیں ہو سکتے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد میں نے ایک بار پھر آئینے میں خود کو دیکھا تو مجھے ایسے لگا کہ ابا جی میرے سامنے کھڑے ہیں۔ اُن کے سر پر گھنے اور خوبصورت بال سجے ہوئے ہیں جنہیں سلیقے سے سیٹ کیا گیا ہے۔ اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میری بچپن کی وہ آرزو پوری ہوگئی ہے کہ کبھی ابا جی کے سر پر بھی بال سجے ہوئے دیکھ سکوں۔ تب ہی مجھ پر منکشف ہوا کہ ابا جی میرے اندر کی طرح باہر بھی اسی طرح موجود ہیں جیسے وِگ سے پہلے موجود تھے، اس فرق کے ساتھ کہ میں ان کی عمر کا جو زمانہ نہیں دیکھ سکا تھا اب مجھے وہ زمانہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ میں آئینے میں ابا جی کو دیکھ کر مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

انکشافِ ذات کا یہ نظارہ وِگ سے سرافراز ہوئے بغیر کہاں ممکن تھا!

☆☆☆

فاصلے، قربتیں

جب سرکار کی جانب سے منظوری ہوتی ہے
فاصلہ کتنا بھی ہو عین حضوری ہوتی ہے

مجھے سرسبز و شاداب پہاڑ ہمیشہ اچھے لگتے رہے ہیں۔ اُن کی بلند قامتی، شادابی اور ہریالی سے مجھے انوکھی سی روحانی آسودگی کا احساس ہوتا رہا اور میں من ہی من میں ان کی عظمت کا معترف رہا۔ لیکن جب ایک بار مجھے ایسے ہی ایک پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا شوق چرایا اور میں اس سفر پر روانہ ہوا تو میرے پہلے تصوّر کو شدید ٹھیس پہنچی۔ میں نے دیکھا کہ دور سے اتنا عظیم دکھائی دینے والا پہاڑ ایسے خوفناک ٹیڑھے میڑھے رستوں اور ہولناک کھائیوں سے بھرا ہوا تھا جو سیدھا موت کے منہ میں لے جانے والی تھیں۔ اس کا دامن خونخوار جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے نیچے دیکھا تو اچھے بھلے انسان، بڑی بڑی عمارتیں، گاڑیاں وغیرہ مجھے بہت ہی معمولی اور چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی طرح دکھائی دیئے۔ بے معنی اور حقیر۔! تب مجھے فاصلے کا کمال معلوم ہوا جس نے پہاڑ کے اندر کے ولن کو چھپا کر اسے ہیرو کے روپ میں پیش کر رکھا تھا۔ تب ہی مجھے اندازہ ہوا کہ بڑے بڑے عظیم لوگ، پہاڑ جیسے عظیم لوگ۔ اکثر محض اس لئے عظیم لگتے ہیں کیونکہ ہم انہیں فاصلے سے دیکھتے ہیں۔ اپنی نام نہاد عظمت کی بلندی سے انہیں اچھے بھلے انسان اور بڑی بڑی چیزیں بھی حقیر سی دکھائی دیتی ہیں۔ فاصلے اور بلندی کے اس تماشے کی حقیقت کو سمجھنے کی بجائے ایسے ''عظیم لوگ'' سچ مچ اپنی عظمت کے خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ

انہیں قریب سے دیکھ لیتے ہیں اُن پر اُن کی عظمت سے زیادہ اُن کی شخصیت کے مخفی جوہر کھل جاتے ہیں اس لئے وہ ان کی عظمت کے منکر ہو جاتے ہیں۔ ایسے منکرین کے ساتھ پھر کیا سلوک کیا جاتا ہے یہ ایک الگ داستان ہے بلکہ داستانوں کا ایک سلسلہ ہے جس سے تاریخِ انسانیت بھری پڑی ہے۔

طویل فاصلے سے سورج جیسے چمکتے ہوئے لوگ، اپنے اندر سورج سے بھی زیادہ بڑا جہنم آباد کئے بیٹھے ہوتے ہیں یہ الگ بات کہ فاصلے پر بٹھائے ہوئے لوگوں کے لئے جنت کی بشارتیں نشر کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بشارتوں پر شک کرنے لگے تو اس کی زندگی کو ہی جہنم بنا دیا جاتا ہے۔ فاصلے اور قربت کی کرشمہ سازی کے انکشاف کے بعد مجھے فاصلے اور قربت کے کئی رنگ اور کئی روپ دکھائی دینے لگے۔

قربت کی انتہا یکتائی ہے جبکہ فاصلے کی ابتدا سے فرقِ من و تو پیدا ہوتا ہے۔ قربت محبت اور عقیدت کا ثمر ہے اس لئے دل کے زیرِ اثر ہے۔ عقل و شعور سے اس کا معاملہ بس واجبی سا ہوتا ہے۔ فرقِ من و تو، شعور و آگہی کا پہلا سبق ہے (باقی کے سارے سبق اسی فرق کی تشریح اور تفسیر ہیں) اس لئے فاصلے کو عقل و شعور کے زیرِ اثر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قربت آتشِ نمرود یا آتشِ محبت میں بے خطر کود پڑنے کا نام ہے جبکہ فاصلہ ہمیشہ محوِ تماشائے لبِ بام رہتا ہے بلکہ بعض اوقات لبِ بام سے بھی پرے کھڑا ہوتا ہے۔ اگر فاصلہ بھی اس آتش میں کود پڑے تو پھر فرقِ من و تو ختم ہو جائے گا، فاصلہ ختم ہو جائے گا بس قربت ہو گی، یکتائی کا عالم ہو گا۔ اسے نیستی یا فنا بھی کہہ سکتے ہیں۔

تخلیق کے امکانات کو قربت یکجا کرتی ہے اور فاصلہ تخلیقات کے انبار لگاتا چلا جاتا ہے۔ موجودہ کائنات کی تخلیق کا جو سائنسی نظریہ مقبول ہے۔ اس کے مطابق پہلے سارا کائناتی مادہ یک جا تھا گویا قربت کی انتہا تھی۔ یہ مادہ ایک بہت بڑے گولے کی صورت میں تھا جس کے اندر تخلیق کے سارے امکانات موجود تھے۔ بڑے دھماکے (BIG BANG) کے نتیجہ میں جب یہ گولا پھٹا تو فاصلہ پیدا ہونے لگا۔ فرقِ من و تو پیدا ہونے لگا۔ یہ کہکشاں ہے، یہ سورج ہے، یہ سیارے

ہیں،انہیں سیاروں میں یہ زمین ہے اور یہ ہماری زمین کا چاند ہے۔قربت نے ان ساری رونقوں کو اپنے اندر سمیٹ رکھا تھا فاصلے نے انہیں محبت کے زخموں کی نمائش کی طرح باہر لا کر سجا دیا۔ فاصلہ اور قربت ایک دوسرے کے لئے اسی طرح لازم وملزوم ہیں جس طرح ایٹم کا ہر اینٹی پارٹیکل اور پارٹیکل۔رات اور دِن۔اہرمن اور یزداں۔اور میری بیوی اور میں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔(میری بیوی اور میرے معاملے میں آپ لازم وملزوم کی بجائے''لازم وملزم'' سمجھیں۔الزامات کی نوعیت وہی ہے جو یورپ میں ہر شریف شوہر کو اپنی بیوی سے سننا پڑتے ہیں)

آنکھیں ایک خاص حد تک کی قربت اور ایک خاص حد تک کے فاصلے سے ہی دیکھ سکتی ہیں۔قدِ آدم آئینے سے بالکل قریب ہو کر کوئی اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔خود کو دیکھنے کے لئے بھی تھوڑا سا فاصلہ ضروری ہے۔تمام فاصلوں کو مٹاتے ہوئے دو جوان دلوں کو شاید اسی لئے اپنے ارد گرد کچھ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ وہ قربت کی انتہا تک پہنچ رہے ہوتے ہیں۔''یہ رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی'' کا ایمان افروز منظر ہوتا ہے۔یار لوگ مشرقی ممالک میں تو اُسی وقت کیدو کا روپ دھار کر اصلاح معاشرہ کا فریضہ ادا کرنے لگ جاتے ہیں جبکہ مغربی ممالک میں انہیں نا قابلِ اصلاح سمجھ کر''گونگے گواہ'' کی طرح آگے بڑھ جاتے ہیں۔

فاصلے کے معاملے میں جیومیٹری کے کئی زاویے بھی آڑے آتے ہیں۔میدانی یا صحرائی علاقے میں آپ ایک خاص حد تک صاف اور پھر مدھم مدھم دیکھ سکتے ہیں۔بڑے شہروں میں بیس پچیس منزلہ عمارتوں سے دیکھیں تو ارد گرد کا منظر کسی اور ہی روپ میں سامنے آتا ہے ۔پہاڑی علاقے میں بل کھاتے ہوئے،مڑتے ہوئے اونچے نیچے رستے تو قدم قدم پر چونکاتے ہیں۔۴۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا آدمی جس منظر کو صاف طور پر دیکھ رہا ہوتا ہے۔۲۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا آدمی محض قریبی موڑ آڑے آنے کی وجہ سے اس منظر کو نہیں دیکھ سکتا۔کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے جیسے سارے نظریات ایسے ہی بل کھاتے ہوئے رستوں کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ ۲۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا جس منظر کا انکار کر رہا ہے بظاہر اس کا انکار درست ہے اور ۴۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا جس منظر کی موجودگی پر اصرار کر رہا ہے اس کا اصرار بھی سچ ہے۔مسئلہ تو صرف اتنا

ہے کہ دونوں فریق یہ نہیں کرتے کہ اپنی اپنی جگہ پر جم کر دوسرے کو جھوٹا قرار دینے کی بجائے خود دوسرے کی جگہ پر جا کر بھی اُس منظر پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں۔اگر ایسا ہو جائے تو نظریاتی سطح پر صرف اپنے گروہ کو سچا اور دوسرے گروہوں کو جھوٹا قرار دینے کا منفی رویہ ختم ہو جائے۔

قربت کا ایک رنگ مرد اور عورت کے تعلق سے عبارت ہے۔اس قربت کے مختلف مراحل ہیں۔آخری مرحلے کے اختتام پر فاصلہ وجود میں آجاتا ہے:

بے دم ہوں میں اِدھر تو اُدھر وہ نڈھال ہے

گویا قربت کی انتہا سے فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح فاصلے کی انتہا قربت کو جنم دیتی ہے۔یہ کوئی فلسفہ نہیں حقیقت ہے۔اپنی زمین کا نقشہ دیکھ لیں جو علاقے ایک دوسرے کی مخالف سمت،زمین کی آخری انتہاؤں پر واقع ہیں اس حقیقی گلوب میں سب سے زیادہ قریب ہیں۔بیوی جسمانی طور پر قریب ہوتی ہے لیکن اس کی قربت میں ایک فاصلے کا احساس رہتا ہے۔جبکہ محبوبہ کتنے ہی جغرافیائی فاصلے پر کیوں نہ ہو اس کے فاصلے میں بھی قربت کی مہک تازہ رہتی ہے۔فاصلے میں قربت اور قربت میں فاصلہ۔فاصلے کی انتہا میں قربت اور قربت کی انتہا میں فاصلہ۔

کہیں قربت اور فاصلہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ تو نہیں؟

☆☆☆

بڑھاپے کی حمایت میں

یہ ڈھلتی عمر بھی شعلے مرے بجھا نہ سکی
لہو میں اپنے ابھی اشتعال باقی ہے

پچھلے دنوں مجھ سے بمشکل پانچ سات سال کم عمر کے ایک نوجوان نے مجھے ایک محفل میں انکل کہہ کر مخاطب کیا تو فوری طور پر مجھے اس پر شدید تاؤ آیا۔ کیونکہ عمروں میں پانچ سات برس کا فرق چچا بھتیجے کے مقابلے میں بڑے اور چھوٹے بھائی کا فرق کہلا سکتا ہے۔لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ مجھے مخاطب کرنے والے نے مجھے جس نام سے بھی مخاطب کیا ہے اس میں اس کا خلوص شامل ہے اور مجھے اس کے خلوص کا احترام کرنا چاہئے۔اس نوجوان کے خلوص کے احترام کے باوجود یہ وسوسہ میرے ذہن میں گھر کرنے لگا کہ شاید میری جوانی مجھ سے دامن چھڑاتی جارہی ہے اور بڑھاپے نے دبے پاؤں میری طرف آنا شروع کر دیا ہے۔ میں اسی وسوسے میں گھرا ہوا تھا جب گیان کا ایک حیرت فزا لمحہ مجھ پر اُترا۔۔ میں نے زندگی کے تینوں زمانوں ۔بچپن، جوانی اور بڑھاپے کو اس گیان کی روشنی میں دیکھا تو بڑھاپا مجھے سب سے اعلیٰ، ارفع اور برتر نظر آنے لگا۔

بچپن انسان کے گزرے ہوئے ماضی بعید کی طرح اپنے خاندان سے چمٹے رہنے میں عافیت محسوس کرنے کا عہد ہے۔ ماضی کا ابتدائی انسان بھی اسی طرح زمین سے پیوست اور اپنے معاشرے سے چمٹا ہوتا تھا۔جوانی حال مست رہنے کا عہد ہے جس

طرح ہم اپنے حال میں رہ کر اپنے حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔ایسے ہی جوانی میں بھی اپنے آپ سے بے خبری کا عجیب عالم ہوتا ہے۔لیکن بڑھاپا مستقبل کی طرح یقین اور بے یقینی کی دھند میں لپٹا ہوا عالم برزخ ہے۔ یہاں سے آگے انسان کے ماورائے زمان ومکان ہونے کا سفر شروع ہوتا ہے۔ بڑھاپے کے عالمِ برزخ میں انسان ماورائے مکان ہونے کے لئے اپنے سارے مکان کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے کمرے میں سمٹ آتا ہے(یا سمیٹ دیا جاتا ہے)۔ پھر یہاں آکر اس کے نزدیک سارا زمانہ ہی بے وقعت ہوجاتا ہے کیونکہ بوڑھے آدمی کو اس سے کوئی غرض ہی نہیں ہوتی کہ ناشتہ دوپہر کو دیا گیا اور دوپہر کا کھانا شام کو ملا اور شام کا کھانا ملا ہی نہیں۔ بڑھاپا اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ زمان ومکان کی رہی سہی برائے نام حدود کو توڑ کر ایک طرف تو پوری طرح ماورائے زمان ومکان ہوجاتا ہے اور دوسری طرف زمان کے رگ وپے میں سرایت کر کے مکان پر قابض رہتا ہے۔ اس کی اولاد، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں، ماضی، حال اور مستقبل کے روپ دھارے اس کے نہ ہونے کے باوجود اس کے ہونے کی گواہی بنے رہتے ہیں۔

بچپن میں ہم جوانوں کو دیکھ کر جوان ہونے کی تمنا کرتے ہیں لیکن جوان ہوتے ہی بچپن کو یاد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔اس کے برعکس جوانی میں ہم آنے والے بڑھاپے کے تصوّر سے ہی خوف کھاتے ہیں۔لیکن بڑھاپا آتے ہی ہم پر فکر ودانش کے ایسے انوار برستے ہیں کہ نہ صرف بڑھاپے سے سارا خوف دور ہوجاتا ہے بلکہ ہماری زندگی میں ہی بڑھاپا ہمیں بچپن اور جوانی ہمارے بیٹوں اور پوتوں کی صورت میں دکھا دیتا ہے۔بعض لوگ اپنے بڑھاپے میں اپنی جوانی کو اپنے بیٹے کے روپ میں دیکھنے کی بجائے خود جوان بننے کی کوشش کرتے ہیں۔اس نیک مقصد میں کامیابی کے لئے مخصوص قسم کے حکیموں اور ڈاکٹروں کی چوکھٹوں پر حاضری دیتے ہیں۔ ایسے بوڑھوں کے بڑھاپے کے بارے میں غالبؔ نے کہا تھا:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ   شرم تم کو مگر نہیں آتی

بچپن معصومیت سے عبارت ہے۔ جوانی حیرت وتجسس سے، جبکہ بڑھاپا فکر ودانش کے انوار کے ساتھ معصومیت اور حیرت وتجسّس کو بھی اپنے جلو میں لیے ہوتا ہے۔حضرت موسیٰ

علیہ السلام کی مثال لیجئے کہ مقامِ نبوّت سے سرفراز کئے جانے کے باوجود کس معصومیت کے ساتھ اللہ میاں سے بالمشافہ ملاقات کے متمنّی ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ بار بار سمجھاتے رہے اور فرماتے رہے ’’لن ترانی‘‘۔لیکن یہی ارشاد ان کے تجسّس کو بڑھاتا ہے اور پھر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔پھر معصومیت اور حیرت وتجسّس کا یہ امتزاج اُن کی فکر و دانش میں ایک انوکھی روحانی لذت بھر دیتا ہے۔بڑھاپے اور فکر و دانش کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیغمبری چالیس سال کی عمر میں عطا ہوئی۔فی زمانہ متعدد ممالک کے constitutions میں سربراہِ مملکت کے لئے عمر کی کم از کم حد چالیس سال رکھی گئی ہے۔۔۔۔جبکہ چالیسواں سال بڑھاپے کا نقطۂ آغاز ہے۔

بڑھاپا بزرگی اور متانت عطا کرنے کے ساتھ زندگی کے تجربات کا نچوڑ نکال کر ایک رہنما کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔بڑھاپے میں گرگِ ظالم بھی پرہیزگار بن جاتا ہے اور یہ پرہیزگاری اسے قویٰ کے اضمحلال اور زندگی کے تجربات کے نچوڑ کے بعد نصیب ہوتی ہے۔(آفرین ہے ان بزرگوں پر جو ستر سال کی عمر کے بعد بھی جوان لڑکیوں سے شادی کرنے کی جرأت رکھتے ہیں اور یوں سرِ عام گرگ ظالم کی پرہیزگاری کو بھی شرمسار کر دیتے ہیں۔خواہ ایسے جرأت مندانہ اقدام کے نتیجہ میں جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑیں۔)

بچپن ایسا زمانہ ہے جس میں غیر محسوس طریقے سے بخارات اٹھتے رہتے ہیں۔جوانی میں یہ بخارات گہرے بادلوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ایسے بادل جن میں گرج بھی ہوتی ہے اور چمک بھی۔پھر یہ موسلا دھار بارش بن جاتے ہیں۔بڑھاپا بارش کے بعد قوس قزح کا منظر پیش کرتا ہے۔زندگی کے تجربوں کی دھوپ سے ہفت رنگ عکس اُبھرتا ہے اور ایک حسین منظر بن جاتا ہے۔گرد و غبار دُھل جاتا ہے۔چاروں طرف تازگی اور ہریالی کا سماں ہوتا ہے۔ہلکی ہلکی اور ٹھنڈی میٹھی ہوا انسان کو وہ آرام وسکون بخشتی ہے جو بخارات اٹھنے کے عمل یا موسلا دھار بارش کے دوران ہرگز نصیب نہیں ہوسکتا۔

انسانی بڑھاپے میں مرد اور عورت کی تفریق فطری طور پر قائم رہتی ہے۔بڑھاپے

کے باعث بوڑھی عورت کا سر ہمیشہ اثباتی انداز میں ہلنے لگتا ہے اور بوڑھے مرد کو اپنی زلیخا سے یہ پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آتی کہ اس کا سر کیوں ہل رہا ہے کیونکہ جواباً اس کا اپنا سر منفی انداز میں ہلنا شروع ہو چکا ہوتا ہے۔

انسان بچپن میں ضدی ہوتا ہے اور جوانی میں باغی۔لیکن بڑھاپے میں ضد اور بغاوت دونوں سے دامن چھڑا کر خود سپردگی اور راضی بہ رضا کے صوفیانہ مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔اولاد جتنی گستاخ، بے ادب اور بے پرواہ ہو گی انسان اس صوفیانہ مقام میں اتنا ہی ترقی کرتا جائے گا اور آخر کار اس مقام لاہوت تک جا پہنچے گا جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔اس مقام پر پہنچ کر وہ اپنی اولاد کو بھی خود سے متعلق ہر جھنجھٹ سے آزاد کر دیتا ہے اور خود بھی آسودگی کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے۔

مغرب میں چونکہ کمپیوٹرازم فروغ پا رہا ہے اس لئے انہوں نے مقام لاہوت تک جلدی پہنچنے کے لئے ’’بوڑھوں کے لئے خودکشی کے آسان طریقے‘‘ اور ’’....آرام دہ طریقے‘‘ قسم کی کتابیں چھاپ کر بوڑھوں کے لئے بہت سی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔

بڑھاپے کی ان فضیلتوں اور فیوض کے منکشف ہونے کے بعد میں نے جب اپنی عمر پر دوبارہ غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں تو ایک برتر مقام پر فائز ہونے والا ہوں۔اس احساس کے ساتھ جب میں نے سوچا کہ چالیسویں برس تک پہنچنے کے لئے ابھی سات برس مزید انتظار کرنا ہے تو مجھے یہ سات برس اب پہاڑ کی طرح محسوس ہونے لگے ہیں۔

☆☆☆

اطاعت گزاری

آخر لکیر اپنے فقیروں کو کھا گئی
بس اک فقیر بچ گیا ہٹ کر لکیر سے

میرے ایک جوشیلے لیکن کم فہم دوست کا خیال ہے کہ اطاعت کا مادہ افراد اور قوموں کو فکری لحاظ سے بانجھ اور اپاہج بنا دیتا ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ غلامی کی قدیم روایت نے آج کے مہذب دور میں اطاعت گزاری کی مہذّب صورت اختیار کر لی ہے۔ اطاعت گزاری کو ایک اعلیٰ خوبی کے طور پر پیش کر کے افراد اور قوموں کو اس کے جال میں پھنسا کر غلام بنایا جاتا ہے۔ میں نے اس وقت تو دوست کی بات میں بڑا وزن محسوس کیا لیکن بعد میں جب غور کیا تو مجھ پر لحہ بہ لحہ اطاعت گزاری کی برکات منکشف ہوتی گئیں۔

عام حالات میں اطاعت گزاری کا مادہ ہزار نعمت کے برابر ہے جبکہ تنگ دستی کی حالت میں تو لاکھ نعمت سے بھی بڑھ کر ہے۔ سچے اطاعت گزار اپنے آقا یا ممدوح کی بات کبھی رد نہیں کرتے خواہ ظاہراً وہ بات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ ظاہر بین نہیں بلکہ باطن بین ہوتے ہیں۔ اپنے اندر کی تیز فراست کے باعث انہیں یہ بھید معلوم ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ کسی سورج یا چاند کے نہیں، اپنے آقا کے اطاعت گزار ہیں۔

اطاعت گزاری، فرماں برداری اور وفا شعاری ایک ہی

حقیقت کے مختلف چہرے ہیں۔ اطاعت کا مادہ انسانی نفس کو سنگسار کر کے اس کی روح اور ذہن کو ہر طرح سے سبکسار کر دیتا ہے، گویا اطاعت سے مراحلِ تصوّف کا آغاز ہوتا ہے اور کمال اطاعت تک وہ کامل صوفی بن جاتا ہے۔ دنیا کی لعنت ملامت یا اپنے ضمیر کی طعنہ زنی اسے اطاعت سے نہیں روک سکتی۔ کوئی عاشق اس وقت تک سچا اور کامیاب عاشق نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی وفا کے جوہر کو محبوب کی کامل اطاعت کے مقام تک نہ پہنچا دے۔ اسی لئے سچا عاشق اطاعت کی ایک ہی جست سے عشق کے سارے مرحلے طے کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔

تجریدی تصویر کی طرح اطاعت گزاری بھی تہ در تہ نتائج (معانی) کی حامل ہے۔

آپ نے بڑے افسر کی اطاعت کی تو اس کے منظورِ نظر بن گئے۔ بڑے افسر کے منظورِ نظر بنتے ہی ماتحت عملہ کے اطاعت گزاروں کی ایک فوج آپ کے زیرِ نگیں آ گئی۔ گویا افسروں کی اطاعت کرنے والوں کو بھی ایک افسری نصیب ہو جاتی ہے۔ آمروں کی اطاعت کرنے والوں کو اسی طرح ایک قسم کی آمریت مل جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک مسلسل جاری و ساری رہتا ہے۔ اطاعت گزاری ایک طرف حاکمِ اعلیٰ کے دل میں اطاعت گزار کے لئے محبت اور ہمدردی کے ساتھ نرم گوشہ پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف اس اطاعت گزار کی اطاعت پر کمر بستہ ہو جانے والے ماتحتوں کے دل میں بھی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ یوں اطاعت گزاری کے نتیجے میں دنیا امن اور محبت کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ تمام جماعتیں جو دُنیا کو امن اور محبت کا گہوارہ بنانے پر تُلی ہوئی ہیں، سب سے زیادہ زور اپنی تنظیم کی اطاعت پر ہی دیتی ہیں۔ سچے اور کامل اطاعت گزار ایسی جماعتوں کے لئے روح کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب بھی کوئی فرد یا چھوٹا سا گروہ ایسی کسی جماعت سے انحراف کرنے لگتا ہے تو جماعت کے سب چھوٹے بڑے اسے کچا چبا ڈالنے پر تُل جاتے ہیں اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک اسے تہ تیغ نہیں کر دیتے یا پھر سے اطاعت پر مجبور نہیں کر دیتے۔ ایسے نازک موقع پر اخلاقیات کے سارے اصول بالائے طاق بھی رکھ دیئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اغماض و درگزر کا تو خیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انحراف کرنے والوں کا مسئلہ پوری جماعت کی بقاء کا مسئلہ

ہوتا ہے۔منحرف ہونے والوں کا محاسبہ اور کردار کشی نہ کی جائے تو باقی اطاعت گزاروں کو اطاعت
کُشی کے عمل سے کون روک سکتا ہے!

ہمارے معاشرے میں گھریلو ناچاقیوں کے باعث کئی گھروں میں طلاقیں ہو جاتی
ہیں اور کئی گھر مستقل طور پر میدانِ کارزار بنے رہتے ہیں۔ایسے گھر دراصل اطاعت کی نعمت سے
محرومی کے باعث جہنم کا نقشہ بنتے ہیں۔ساس، بہو میں سے کوئی ایک اور میاں بیوی میں سے اگر
دونوں ہی اطاعت گزاری اختیار کر لیں یعنی اپنی آنکھیں، کان اور ہونٹ پوری طرح مقفّل کر لیں
تو نہ صرف ازدواجی زندگی خوشگوار اور مثالی ہو جائے گی بلکہ سارا گھر جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

کامل اطاعت کے وصف سے محروم لوگوں کو بھیڑوں، بکریوں کے گلّوں سے سبق سیکھنا
چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اشرف المخلوقات کا لقب تو بھیڑ بکریوں کو ملنا چاہئے جن کے ہاں سرِ تسلیم
خم کرنے بلکہ قلم کرانے کا وصف پیدائشی ہوتا ہے۔

سچے اطاعت گزار کا کمال یہ ہے کہ جو سانحہ اس کے اپنے گروہ کے ساتھ گزرے اسے تو
وہ خدا کی طرف سے آزمائش اور امتحان قرار دیتا ہے لیکن اگر ویسا ہی سانحہ بلکہ اس سے بھی کم تر
سانحہ کسی دوسرے گروہ کو پیش آئے تو پورے ایمانی جوش و خروش کے ساتھ اسے عذابِ الٰہی سے
تعبیر کرتا ہے۔کیسا صحیح رویّہ ہے!

ایں سعادت بزور باز واست

اچھا اطاعت گزار اول تو اپنے کھونٹے سے بندھے رہنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے تاہم
اگر گھومنا پھرنا چاہے تو شاہی فرمان کے مطابق تین کھونٹ کے علاقوں تک ہی سفر کرتا ہے، چوتھے
کھونٹ کی طرف کبھی نہیں جاتا۔ نتیجۃً آگہی کی ان ساری اذیتوں اور عذابوں سے محفوظ رہتا ہے جو
ہر اُس شخص کا مقدر ہوتے ہیں جو چوتھی کھونٹ کی طرف نکل جاتا ہے۔ہمارے ہاں ادب میں بھی
اطاعت گزاری کے باقاعدہ سلسلے جاری ہیں۔نظریاتی اطاعت گزاروں نے اپنے اپنے کیمپوں کو
سجا رکھا ہے۔ادبی گدی نشینوں کی ساری توقیر اطاعت گزاروں کے دم قدم سے ہے، جبکہ اطاعت
گزاروں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ ان کے لئے مراعات کا دروازہ ’’کھُل جا سم سم‘‘ کہے بغیر ہی

کھل جاتا ہے۔یوں اطاعت گزاری کے وصف کے باعث انہیں چوتھی کھونٹ کا سفر کرنے کی
ضرورت ہی نہیں رہتی اور اطاعت گزار ادیب ادب میں چوتھی کھونٹ کے سفر کی ساری صعوبتوں
سے محفوظ و مامون رہتے ہیں۔سچ ہے جنہیں اللہ رکھے انہیں کون چکھے!

اطاعت گزاری کا جوہر نہ صرف بغاوت، سرکشی اور انحراف کے جذبات کو ختم کرتا
ہے بلکہ انسانی ذہن کو زیادہ سوچنے کے عمل سے روک کر اسے بہت سی مشکلات سے بھی نجات بخش
دیتا ہے۔زیادہ سوچنے والے لوگ یعنی آزادانہ طور پر غور و فکر کرنے والے لوگ، جب سوچتے ہیں تو
بُرے بھلے میں حدِ فاصل قائم کر کے تعصب اور آویزش کو ہوا دینے لگتے ہیں۔سقراط اور گلیلیو ایسے
ہی باغی لوگ تھے جو ہر وقت ذہن کو استعمال کرنے کی بد عادت میں مبتلا تھے۔صبح و شام غور و فکر میں
ڈوبے رہتے اور پھر اپنے باغیانہ خیالات سے اطاعت گزاروں کی نئی نسل کو بھی گمراہ کرتے۔سب
جانتے ہیں کہ ان ’’بدبختوں‘‘ کا انجام کیا ہوا۔سچے اطاعت گزار آج بھی ان کے انجام سے عبرت
پکڑتے ہیں۔

لیکن کیا واقعی؟۔

یہ سوال میں نے اپنے آپ سے کیا ہے اور اب اس کا جواب سوچ رہا ہوں!

ظاہر ہے جواب سوچنے کے لئے اپنا ذہن استعمال کرنا پڑے گا اور اپنے ذہن کو
استعمال کرنے والوں کا انجام مجھے (خاص طور پر مجھے) اچھی طرح معلوم ہے۔

☆☆☆

یہ خیر وشرّ کے سلسلے

خیراورشر کی آمیزش اور آویزش سے نکھریں
بھول اورتوبہ کرتے سارے سانس بسر ہوجائیں

میرے ایک فلم ساز دوست ص۔پ ہیں۔فلمسازی کے میدان میں دو یادگار فلاپ فلمیں چھوڑنے کے علاوہ انہوں نے تیسری فلم مکمل کر کے ڈبے میں ہی بند کردی ہے۔اپنی دوسری فلم میں انہوں نے ایک نئی لڑکی بطور ہیروئن کاسٹ کی۔لیکن ابتدائی مرحلے میں ہی اسے دل دے بیٹھے،شادی کی بات طے ہوگئی۔ چنانچہ انہوں نے کوشش کر کے پوری فلم اسلامی مزاج کے مطابق بنائی۔ پوری فلم میں ہیروکو ہیروئن کے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔بس دور ہی دور سے پیار کی پینگیں بڑھائی گئیں۔ ہیروئن کو برقع پہنایا گیا۔رقص میں سر سے دوپٹہ نہیں اُترنے دیا گیا۔فلم فلاپ ہوگئی لیکن فلم ساز اور ہیروئن کی شادی کامیاب رہی۔خدا کرے آگے بھی کامیاب رہے۔ یہ تعارف تو ضمنی تھا۔اصل بات مجھے یہ بتانا تھی کہ موصوف بے حد محبت کرنے والے انسان ہیں۔ جس سے محبت کرتے ہیں اسے اعلیٰ قسم کی شراب ضرور پلاتے ہیں۔اکثر احباب محض شراب پینے کے شوق میں جان بوجھ کر اُن کی محبت کا شکار ہوتے ہیں۔میں جب پہلی بار اُن کی محبت کی زد میں آیا تو انہوں نے بڑے خلوص سے اپنے گھر پر مدعو کیا اور بڑی محبت کے ساتھ کوئی مہنگی سی شراب میری تواضع کے لئے پیش کی۔ میں نے سلیقے سے معذرت کر لی اور انہیں بتایا کہ ابھی تک سگریٹ کے لطف سے بھی محروم ہوں۔بس صرف شاعر دِکھنے کے لئے ایک دو تصویریں ایسی ضرور بنوالی

ہیں کہ جیسے سگریٹ پی رہا ہوں۔اس وقت تو موصوف نے رسمی حیرت کا اظہار کر کے مجھے چھوڑ دیا مگر میرے لئے ان کی محبت اسی طرح موجزن رہی۔ چند ملاقاتوں کے بعد وہ مجھے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گئے۔ان کی ہیروئن بیگم بھی ساتھ تھیں۔ وہاں انہوں نے شراب کا آرڈر دے دیا۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹل کا ماحول، دوست کی محبت کی شدت اور ہیروئن بھابی کا مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا اصرار۔

دل نے متعدد دلائل پیش کرنا شروع کر دیئے۔ دیکھو یار! کسی کی محبت اور خلوص کو ٹھکرانا شراب پینے سے بڑا پاپ ہے۔خود کو نیک سمجھنے والے متکبر ہو کر ابلیس قرار پاتے ہیں۔اس مقام سے بچو۔تھوڑی سی شراب پی لو تا کہ خود کو بہت زیادہ نیک پاک نہ سمجھ سکو۔احساسِ گناہ سے طبیعت میں سوز و گداز پیدا ہوگا اور پھر توبہ کی توفیق ملے گی۔ بے شک اللہ تعالیٰ بے حد غفور الرحیم ہے۔ارے یار! جنت میں بھی تو شراب ملنے کی بشارت ہے۔ پتہ نہیں جنت میں داخلہ ملتا ہے یا نہیں۔ وہاں داخلہ نہ ہوا تو جہنم میں رہ کر بھی شراب کی لذت سے ناآشنا رہو گے۔لعنت ہے ایسی جہنمی پر!

دل کے دلائل ابھی جاری تھے،لیکن شراب ختم ہوچکی تھی۔اب میرے سامنے خالی جام دھرا تھا۔کوئی نشہ نہیں ہوا۔ بعد میں پتہ چلا یہ تو زیٹ تھی جس میں ۱۰ فیصد الکوحل ہوتی ہے گویا کوکا کولا سے تھوڑی زیادہ تھی لیکن پھر بھی تھی تو شراب ہی۔ چنانچہ احساسِ گناہ غالب ہونے لگا۔ میری عادت ہے کہ کوئی بات دل پر بوجھ بننے لگے تو بیوی کو ضرور بتا دیتا ہوں چنانچہ میں نے بیوی کو خط لکھ دیا کہ یہاں میں ایک دوست اور اس کی بیوی کا دل رکھنے کے لئے شراب کا ذائقہ چکھ چکا ہوں۔ساتھ ہی اپنی بیوی کا دل رکھنے کے لئے مزید واضح کر دیا کہ اس واقعہ سے رنجیدہ یا پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں۔آخر یورپ پہنچ کر بھی مجھے وائن کا ذائقہ تو چکھنا ہی تھا۔یوں گناہ کا احساس تو کم ہو گیا لیکن ایک سوال ذہن میں اٹھنے لگا۔ گناہ فی ذاتہٖ کیا ہے؟۔ پھر اس سوال سے منسلک متعدد ذیلی سوال اور حقیقت واضح ہونے لگی۔

دُنیا میں کوئی فعل فی ذاتہٖ اچھا یا برا نہیں ہے۔کسی فعل کو آپ مکمل خیر یا شر قرار نہیں

دے سکتے۔ مثلاً مرد اور عورت کے تعلق کا جنسی عمل ایک حقیقت ہے۔ مذہبی یا سماجی نقطۂ نظر سے معاملہ صرف یہ ہے کہ جب یہ تعلق شادی کی کاروائی کے بعد استوار ہوتا ہے تو عین ثواب قرار پاتا ہے اور اگر شادی کے بغیر استوار کرلیا جائے تو قابلِ نفرین! کسی انسان کو عام حالات میں قتل کردیا جائے تو ظلمِ عظیم قرار پاتا ہے لیکن اپنے وطن کی حفاظت کے نام پر جنگوں میں ہزاروں، لاکھوں انسان ہلاک کردیئے جاتے ہیں اور فخر کیا جاتا ہے۔ انسانوں کے قاتلوں کو ان کے کارناموں پر تمغے عنایت کئے جاتے ہیں۔ گویا جنسی عمل ہو یا قتل انسانی۔ اپنی ذات میں کوئی فعل نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ اس کا مذہبی، سماجی یا سیاسی تناظر اسے خیر یا شر کے خانے میں ڈالے گا۔

اگر دنیا کا یہ کارخانہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور اس نے ہر ذرّے میں خواص رکھے ہیں اور ہر ذی روح کو استعدادیں بخشی ہیں تو ہر ذی روح کا کمال یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کی گئی اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو کمال تک پہنچائے۔ اگر یہ فارمولا طے ہے تو پھر سور کو آپ لاکھ برا بھلا کہہ لیں اس بے چارے نے کرنا وہی کچھ ہے جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ سانپ میں ڈسنے کی استعداد اور بچھو میں ڈنک مارنے کی استعداد بھی تو خدا نے رکھی ہے۔ اگر سانپ کسی کو ڈستا ہے یا بچھو کسی کو ڈنک مارتا ہے تو وہ ان کے لئے خیر ہے کیونکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ شر تو اُن کے لئے ہے جو اُن کا شکار ہو رہے ہیں۔ لہٰذا سُور ہو، سانپ ہو، بچھو ہو یا میرے کرم فرما شیخ صاحب۔ سب اپنے اپنے عمل میں، طور طریقوں میں حق بجانب ہیں۔

جرأت وغیرت اور غنڈہ گردی وظلم میں تفریق کسی فعل کی نوعیت سے نہیں کی جاتی۔ فعل تو ایک ہی ہے۔ اگر ہمارے خلاف سرزد ہو رہا ہے تو غنڈہ گردی اور ظلم ہے اور اگر ہم اس کا ارتکاب کررہے ہیں تو یہ جرأت اور غیرت ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ ترقی پسندوں نے ادبی مارشل لا نافذ کیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ویسا ہی طرزِ عمل بعض دینی ادب والوں نے بھی اپنا رکھا ہے تو وہ مسکرائے اور بولے بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن ہم اسے مارشل لا کی جگہ ماشاء اللہ کہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ سچ اور جھوٹ کا ہے۔ بعض لوگ صاف گوئی سے کہتے ہیں کہ

دروغ مصلحت آمیز جائز ہے جبکہ بعض لوگ ہر طرح کے جھوٹ کو جھوٹ قرار دے کر بآوازِ بلند **لعنته الله على الكاذبين** پڑھتے ہیں لیکن اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جھوٹ سے لے کر دھوکہ دہی تک سب حربے بھی استعمال کرجاتے ہیں اور پھر بڑی معصومیت کے ساتھ اسے مومنانہ فراست اور حکمت قرار دے دیتے ہیں۔ میرے کرم فرما شیخ صاحب بھی اسی قماش کے مومن ہیں۔ ایک دانشور دوست نے غالباً شیخ صاحب جیسے لوگوں کے لئے ہی کہا تھا کہ باوضو ہوکر گناہ کرتے ہیں اور گناہ کرنے کے بعد بھی باوضو رہتے ہیں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ ہر سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ اور ہر جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص تاروں بھرا آسمان دیکھ کر کہے کہ میں اس وقت آسمان پر موجود اتنے سارے ستارے دیکھ رہا ہوں، تو یہ بات بالکل سچ ہوگی۔ اس کے باوجود اس میں غیر ارادی جھوٹ بھی شامل ہوگا۔ کیونکہ حقیقتاً جن ستاروں کی روشنی ہم تک پہنچ رہی ہوتی ہے وہ اس وقت کی نہیں ہزاروں برس پہلے کی ہوتی ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص تیسری دنیا کے بعض ممالک کے غیر انسانی رویوں سے تنگ آکر مغربی ممالک میں سیاسی پناہ لیتا ہے تو اس کا بیان عموماً ۹۹ فی صد جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا دکھ سچا ہوتا ہے اس لئے اس کے مداوا کے لئے دیا گیا اس کا جھوٹا بیان بھی سچ ہے۔ مکمل سچائی تو صرف خدا تعالیٰ کی ہستی ہے۔ باقی سب جزوی سچائیاں ہیں اس لئے اپنے جزو پر نازاں ہوکر کسی دوسرے پر انگلی اٹھانے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسی وقت اس کی اپنی باقی ساری انگلیاں خود اُسی پر اٹھی ہوتی ہیں۔

تمام چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ سردی اور گرمی۔ بہار اور خزاں۔ دن اور رات۔ علم ریاضی کا سارا نظام جمع اور نفی پر قائم ہے۔ بجلی میں مثبت اور منفی مل کر کرنٹ پیدا کرتے ہیں۔ تمام جانداروں میں نر اور مادہ مل کر زندگی کو قائم رکھتے ہیں۔ زرتشت مسلک میں دو خداؤں کا تصور ہے۔ یزداں، خیر کا خدا۔ اور اہرمن، شر کا خدا۔ دونوں کے درمیان ازل سے مقابلہ جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ خیر اور شر کی دو بڑی قوتوں کا تصور کسی نہ کسی رنگ میں ہر مذہب میں موجود ہے۔ خیر اور شر کی اسی آویزش اور آمیزش سے ہی تو کائنات رنگ برنگی لگتی ہے۔ یہ خیر وشر

کے سلسلے کتنے خوبصورت ہیں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہیگل کی جدلیات کا جادو کتنا طاقتور ہے جو آج بھی ساری کائنات کے سر چڑھ کر بول رہا ہے!

☆☆☆

چشمِ تصوّر

تمہارا حسنِ خداداد تو نہ رہ پایا
مگر فقیر کا حسنِ خیال باقی ہے

مجھے پانچ چھ سال کی عمر میں ہی خدا اور قیامت کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں بتا دی گئی تھیں، جن میں سے بہت کم باتیں میری سمجھ میں آسکیں۔ تاہم ان تمام باتوں کا مجموعی تاثر ایک خوف کی صورت مجھ پر مسلّط ہوگیا۔ مکمل فنا (قیامت) کا تصوّر مجھ پر گھبراہٹ طاری کر دیتا۔ میں چشمِ تصوّر سے دیکھتا کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے کہیں کچھ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہولناک خلا کا تصوّر میرے ذہن میں آتا اور میرا دل جیسے اس خلا میں ڈوبنے لگتا۔ پھر کبھی میں چشمِ تصوّر سے دیکھتا کہ ساری کائنات تو موجود ہے لیکن انسان کا وجود نہیں ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی مجھ پر ایک عجیب سا اضطراب طاری ہوجاتا اور میں خدا سے دعا کرنے لگتا کہ مولا!۔۔ میں بے شک نہ رہوں مگر یہ دنیا اور اس دنیا میں انسانی زندگی کو کبھی ختم نہ کرنا۔ دعا کرنے کے باوجود میں خدا کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچ پاتا تھا۔ اس کی ہستی کو جاننے اور سمجھنے کی ایک اُلجھن سی رہی۔

ایک مدت کے بعد میرے چھوٹے بیٹے ٹیپو کی ایک معصومیت نے میرے بچپن کی اُلجھن دور کردی۔ میرے والد کی وفات پر ٹیپو کو معاملہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ دادا اَبو کو کیا ہوگیا ہے، جاگتے کیوں نہیں؟۔ جب اسے بتایا گیا کہ اب وہ کبھی نہیں جاگیں گے کیونکہ

اللہ میاں نے انہیں اپنے پاس بلالیا ہے تو دادا پوتے کی محبت کے جوش میں اس نے غصّے سے کہا: میں اللہ میاں کو ماردوں گا۔ اس پر اسے فوری طور پر سمجھانا پڑا کہ اللہ میاں کے بارے میں ایسی بات کہنا گناہ ہے کیونکہ وہ بہت بڑا ہے۔ اللہ میاں کی بڑائی کا سن کر ٹیپو نے پوچھا: کیا اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑا ہے؟ جب اسے باور کرایا گیا کہ وہ سب سے بڑا ہے تب اس نے اس کی بڑائی کا کچھ اندازہ لگایا۔ شاید چشمِ تصوّر سے کچھ دیکھا۔ اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں پیچھے کی طرف جتنا لے جاسکتا تھا، لے جا کر پوچھا: کیا اللہ میاں اتنا بڑا ہے؟۔ اسی لمحے میں مجھے جیسے اپنے بچپن کی سوچ کا جواب مل گیا۔ ایک چھوٹا سا بچہ جس حد تک اپنے بازو پھیلا سکتا ہے اسی حد تک بڑائی کا سوچ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ بڑی شے اس کے نزدیک ہو ہی نہیں سکتی۔ تب ہی مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ خدا کے بارے میں مختلف عقائد رکھنے والے تمام مذاہب اور فرقے خدا کے معاملے میں ایسے معصوم اور سچے چھوٹے بچے ہیں جنہوں نے خدا کی عظمت، مقام اور بڑائی کو سمجھنے کے لئے اپنے اپنے ننھے منّے بازو پھیلا رکھے ہیں۔ جس کے بازو جہاں تک پھیل سکتے ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو سمجھ رکھا ہے اور دوسروں کو بھی وہی خدا منوانے پر مُصر ہے۔

پھر میں نے چشمِ تصوّر سے اس عظیم تخلیق کار کی تخلیق اس کائنات پر غور کیا تو اسی کی طرح اس کی تخلیق بھی بے انت نظر آنے لگی۔ کائنات کی بڑی سطح جس میں کروڑوں کہکشائیں، اربوں نظامِ شمسی اور کھرب درکھرب سیارے موجود ہیں اور جس کا کوئی انت معلوم نہیں ہوتا، اس کی انتہا معلوم کرنا تو دور کی بات ہے۔ سائنس ابھی تک چھوٹی کائنات یعنی ایٹم کا کوئی انت تلاش نہیں کرسکی۔ پہلے پہل کہا گیا کہ ایٹم مادے کا بلڈنگ بلاک ہے بعد میں اسی ایٹم کے چالیس سے زائد پارٹیکلز دریافت ہوگئے۔ بات QUARKS تک پہنچی مگر پھر اس کے بھی مزید چھ کلرز سامنے آگئے۔ QUARKS سے ''ہیڈرونز'' بنتے ہیں۔ ''نان ہیڈرونز'' کس سے بنتے ہیں؟ اس کا ابھی کوئی علم ہی نہیں ہے۔ گویا بڑی کائنات کی انتہا تو کجا چھوٹی کائنات کی انتہا بھی معلوم نہیں کی جاسکتی۔ بس ایک جہانِ حیرت ہے، اسے طے کیجئے تو آگے اس سے بھی بڑا جہانِ حیرت موجود ہوتا ہے۔ حیرانی کا یہ تہ در تہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ شاید اسی لئے شاعر نے کہا تھا:

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ پیدا ہوگئے ہیں اور حیرانی نہیں جاتی

میرے ایک دانشور دوست نے لکھا تھا کہ سارے نظامِ شمسی، کہکشائیں اور بلیک ہولز دراصل ایک ایٹم کے الیکٹرون ہیں۔ اس انکشاف سے میں ایک مسرّت آمیز حیرت سے دوچار ہوا۔ واقعی اگر یہ ساری کائنات الیکٹرون کا درجہ رکھتی ہے تو یہ تو صرف ایک فی صد ہے۔ اگرچہ ہمارے لئے یہ ایک فی صد بھی بے انت ہے مگر ۹۹ فی صد تو نیوکلس کے اندر ہے اور نیوکلس کا پتہ ہی نہیں چل رہا۔ اپنے دانشور دوست کی اس بات پر حیرت اور مسرّت کے اُسی لمحے میں، میں نے چشمِ تصوّر سے دیکھا کہ ہماری دھرتی کے کسی ایک ایٹم کے کسی پارٹیکل میں کوئی مخلوق آباد ہے اور اس کے ''سائنس دان'' اپنی دھرتی کے ایٹم کی دریافت کے بعد اس کے پارٹیکلز پر تحقیق میں مشغول ہیں۔ تب مجھے زمان ومکان کی لامحدودیت کا کچھ اندازہ سا ہونے لگا۔

کون ومکان کی باتیں اپنی جگہ۔ ہماری اس دھرتی پر انسانی زندگی کی ساری ترقی چشمِ تصوّر کی عطا ہے۔ انسان نے پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھا تو اس کے دل میں پرواز کی ہلکی سی خواہش پیدا ہوئی۔ اُس زمانے کے داستان گوؤں نے اس خواہش کی تکمیل کے لئے چشمِ تصوّر سے کام لیا اور پھر اُن کی داستانوں میں جن، دیو، پریاں، اُڑن قالین اور اُڑن کھٹولے پرواز کرنے لگے۔ ان داستانوں نے نسل درنسل انسانوں کے دل میں اڑنے کی خواہش جگائے رکھی جس کے نتیجہ میں آخرکار تیز رفتار سواریاں، ہوائی جہاز اور راکٹ تک ایجاد ہوگئے۔ دوسری تمام ترقیات کا تعلق بھی بنیادی طور پر چشمِ تصوّر سے ہے۔

میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ فلمیں دیکھے بغیر بسر کیا ہے تاہم اس زمانے میں، میں نے بے شمار گیت سنے تھے۔ پھر جب میں نے فلمیں دیکھنا شروع کیں تو اپنے پسندیدہ گیتوں میں سے کسی بھی گیت کی پکچرائزیشن مجھے اچھی نہیں لگی۔ دراصل گیت سنتے ہوئے ہمارے تصوّر کی آنکھ وا ہوتی ہے اور وہ اس گیت پر اپنی مرضی کا سین فلم بند کرتی ہے۔ ایسے سین میں جو بے پناہ معنویت ہوتی ہے ہماری چشمِ تصوّر کا کمال ہوتی ہے۔ جبکہ فلمی سین کسی نظریاتی نقاد کی طرح پارٹی لائن کے

مطابق اسے محدود معنی میں بند کر کے اس کی وسعت میں روک بن جاتا ہے۔ اب کسی فلم میں میری پسند کا کوئی گیت آجائے تو میں اپنی دونوں آنکھیں موند کر چشمِ تصوّر روا کر لیتا ہوں۔ تب میں دیکھتا ہوں کہ اس سین کا ہیرو میں خود ہوں۔ میں خود وہ گیت گا رہا ہوں۔ میری کوئی محبوبہ یا بعض اوقات مجبوراً میری بیوی میرے روبرو ہے۔ میرا انداز اتنا بے ساختہ اور فطری ہے کہ فلمی سین کے اداکار کی مصنوعی اداکاری اس کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتی۔ اگر ہیروئن کا گایا ہوا گیت ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ وہ جذبات میرے حضور پیش کئے جا رہے ہیں۔ شاید اسی لئے جب میں کوئی خوبصورت گیت سنتا ہوں تو وہ گیت سیّال صورت اختیار کر کے میری رگوں میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔

چشمِ تصوّر انسان کو جینے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ کسی شخص کے حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں وہ چشمِ تصوّر سے اپنے آنے والے اچھے دن دیکھ سکتا ہے۔ چاہے بالکل نہ دکھائی دے رہے ہوں پھر بھی دیکھ سکتا ہے۔ دکھ اور تکلیف میں آرام اور سکون کا، سردی میں گرمی اور گرمی میں سردی کا، دجلہ میں قطرہ اور قطرہ میں دجلہ کا نظارہ کر سکتا ہے۔ میری پرانی محبتیں جو اَب بال بچوں میں گھِر کر محبت کے ہجّے تک بھول چکی ہیں، جن کے ڈھلکے ہوئے جسموں اور چہروں پر جھریوں کے آثار دنیا کو دیدۂ عبرت نگاہ بنا چکے ہیں۔ میں چشمِ تصوّر میں انہیں آج بھی اسی طرح جوان، شوخ اور سرسبز، شاداب دیکھ رہا ہوں جیسا وہ دس، پندرہ یا بیس سال پہلے تھیں۔ جوانی کے ایام پر ہی کیا موقوف ہے۔ جب بھی جی چاہتا ہے میں چشمِ تصوّر سے اپنے بچپن اور لڑکپن کے دنوں کو اسی طرح ہنستا کھیلتا دیکھ لیتا ہوں۔ امی، ابو، بابا جی۔ جن بزرگوں اور عزیزوں کو فوت ہوئے زمانہ گزر گیا ہے انہیں بھی اُنہیں یادوں کے ساتھ اُسی حالت میں دیکھ لیتا ہوں۔ گویا چشمِ تصوّر پر نہ صرف زمان و مکان اثر انداز نہیں ہو پاتے بلکہ یہ ارواح کو بھی طلب کر سکتی ہے۔

چشمِ تصوّر ہمیں جاگتے میں خواب دکھاتی ہے۔ لگن سچی اور قسمت اچھی ہو تو خوابوں کی تعبیریں بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن جس طرح نیند میں دیکھے جانے والے کئی خواب بدہضمی کا نتیجہ ہوتے ہیں اسی طرح چشمِ تصوّر سے جاگتے میں دیکھے جانے والے بعض خواب بھی تصوراتی بدہضمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایسے خوابوں کو شیخ چلی کے خواب بھی کہا جاتا ہے۔ ☆☆☆

اپنا اپنا سچ

کعبے میں جا کے یا کہیں پتھر تراش کر
ممکن ہو جس طرح بھی خدا کو تلاش کر

دُنیا میں ہر گروہ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ خود کو سچا سمجھتا ہے۔ ایسا سمجھنے میں کوئی حرج نہیں۔ خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جب اپنی سچائی کا اعلان کرنے والا ساتھ ہی دوسروں کو جھوٹا بھی قرار دے دیتا ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں ہر گروہ اپنے حق بجانب ہونے کے دلائل بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے جھوٹا ہونے کے ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ ایسی صورتحال میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم کسے جھوٹا کہیں اور کسے سچا سمجھیں۔ شاید یہ معاملہ کچھ ایسے ہی ہے کہ جب کوئی خود کو سچا کہتا ہے تو گویا اپنے خوبصورت ہونے کا اعلان کرتا ہے لیکن پھر ساتھ ہی دوسروں کو بدصورت بھی قرار دیتا ہے۔ اصولاً کسی کو اپنی خوبصورتی کے ثبوت کے لئے دوسروں کی بدصورتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ اگر آپ خوبصورت ہیں تو کسی کی بدصورتی کی نشاندہی کئے بغیر بھی آپ خوبصورت ہیں، لیکن اگر آپ بدصورت ہیں تو بے شک سارے جہان کی بدصورتی ثابت کر دیجئے اس سے آپ کا خوبصورت ہونا ثابت نہیں ہو سکے گا۔ چونکہ ہم اصلاً سچائی کی بات کر رہے ہیں اس لئے مختلف گروہوں اور افراد کی سچائیوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہے اور ہر کسی کو اپنے اپنے سچ کی حفاظت کرنی چاہئے۔ نظریاتی سچ کی حفاظت نظریات پر عمل پیرا ہونے سے ہوتی ہے۔

آئینے کو ہمارے ہاں سچ کی بڑی علامت بنالیا گیا ہے اسی لئے ہر کوئی خود آئنہ دیکھنے کی بجائے دوسروں کو آئنہ دکھانے میں لگا ہوا ہے۔ بے شک عام طور پر آئینہ جو کچھ دیکھتا ہے وہی ہمیں دکھا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے آئنہ سچا بھی ہے لیکن کچھ اتنا زیادہ بھی سچا نہیں ہے۔ مثلاً کبھی کوئی تحریر آئینے کو دکھائیے، اچھی بھلی اُردو کو عبرانی تحریر بنا کر دکھا دے گا اور عبرانی بھی ایسی جو عبرانی کے استادوں کے پلّے بھی نہ پڑے۔ پھر ایسے آئینے بھی ہیں جو اچھی بھلی صورت کو بگاڑ کر دکھاتے ہیں۔ گورے چٹے رنگ کو کالا کر کے پیش کر دیتے ہیں۔

آئینے کی طرح پانی کی سچائی میں بھی زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ مختلف رنگوں کے گلاسوں میں پانی ڈال کر دیکھ لیں۔ ہر رنگ کے گلاس کا پانی اسی رنگ کے مطابق نظر آئے گا۔ اس کا شفّاف پن کہیں بھی نظر نہ آئے گا۔ اس کے باوجود پانی کی سچائی پر کبھی انگلی نہیں اٹھائی گئی۔ اس کے برعکس گرگٹ بیچارے کو ہر کوئی لعن طعن کرتا ہے جبکہ اس کا گناہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ آئینے اور پانی کی طرح یہ بھی جو کچھ دیکھتا ہے یا جہاں سے گزرتا ہے اسی رنگ میں رنگین نظر آنے لگتا ہے۔ آئینہ، پانی اور گرگٹ تینوں اپنی اپنی جگہ سچے ہیں اور کسی ایک کی تعریف کر کے دوسرے کو مطعون کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کسی شے یا عمل کا جواز پیش کرنے والے ناجائز کو جائز اور جائز کو ناجائز بنانے کا ہنر دکھاتے ہیں۔

اس دنیا میں اربوں کی تعداد میں انسان موجود ہیں۔ سب کے تمام اعضا ایک جیسے ہیں۔ اتنی گہری یکسانیت کے باوجود ہر انسان دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہے۔ اس کا دوسروں سے کچھ مختلف ہونا اس کی ذاتی شناخت ہے اور یہی اس کا ذاتی سچ ہے۔ پھولوں کو دیکھیں ہزار ہا اقسام کے اور رنگا رنگ پھول ہیں۔ اس کے باوجود ہر پھول ایک قدرِ مشترک رکھنے کے باوجود ہر دوسرے پھول سے مختلف ہے۔ پھولوں، پودوں کو چھوڑیں، پتھروں کو دیکھ لیں۔ پتھروں کو جمع کرنے کا شوق رکھنے والے حضرات اور پتھروں سے سر پھوڑنے والے عشّاق بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا میں ایک جیسے دو پتھر بھی نہیں ملتے۔ گویا اصل سچائی بیک وقت یکسانیت اور اختلاف کے امتزاج سے اُبھرتی ہے۔ ان انفرادی مثالوں سے گروہی اور نظریاتی سچائیوں کی حقیقت کو بھی سمجھا

جا سکتا ہے۔ ہر گروہ کی اپنی اپنی سچائی ہے۔ اپنی اپنی سچائی کو ایک اور رنگ میں اپنی اپنی بیوی سے بھی مشابہت دے سکتے ہیں۔ کسی کی خوبصورت بیوی کو دیکھ کر بعض لوگ بدنیت ہو کر اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں کامیابی نہ ہو تو پھر محرومی اور حسد کے باعث اس کی بدکرداری کی فرضی داستانیں گھڑ کر پھیلانے لگتے ہیں چاہے اس انہماک کے دوران اپنی بیوی کہیں اور مصرفِ عمل ہو چکی ہو۔ ایک اچھے مرد کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنی بیوی پر قناعت کرے۔ دوسروں کی بیویوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی بجائے اپنے اور اپنی بیوی کے مشترکہ تخلیقی عمل میں مگن رہے اور اسی طرح زندگی میں اضافہ کر کے زندگی کی جنت کا نظارہ کرتا رہے۔ اسی طرح مختلف نظریاتی گروہوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی اپنی سچائی کے ذریعے اپنی تعداد بڑھائیں، بلاوجہ دوسروں کی سچائیوں کو بدنیتی سے نہ دیکھیں اور نہ ہی حسد کے ساتھ ان پر الزام تراشی کریں۔ میں ان سارے نظریات کے ماننے والوں کو سلام کرتا ہوں جو دوسروں کی عیب چینی کرنے کی بجائے صرف اپنی خوبیوں کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

جس جگہ میرا گھر ہے، ایک پولٹری فارم اور ایک ڈیری فارم وہاں سے قریب پڑتے ہیں۔ ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر پولٹری فارم کے حوالے سے اپنی بات آگے بڑھانا مشکل ہے کہ اس سے تحریر میں فحاشیت پیدا ہو جانے کا ڈر ہے اس لئے ڈیری فارم کے حوالے سے ہی کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔ ہر نظریہ اپنی جگہ خالص دودھ کی طرح ہے۔ مختلف بنیادی نظریات میں اس دودھ کی مقدار میں کمی بیشی مانی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک نظریہ بنیادی طور پر پانچ من دودھ کا سچ ہے اور دوسرا دَس من کا۔ سو دونوں میں خالص دودھ کی یکسانیت اور مقدار کا فرق واضح ہے۔ اب قصہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ کوئی بھی بنیادی نظریہ مختلف تشریحات کے باعث، بعض رہنماؤں کی خواہشات کے باعث اور بعض اوقات زمانے کے تبدیل شدہ تقاضوں کے باعث تھوڑے وقفے کے بعد گروہ در گروہ ہونے لگتا ہے۔ پانچ من والے کے اگر ۵۰ گروہ بن گئے تو مجموعی طور پر ہر گروہ کے حصے میں چار کلو دودھ آئے گا۔ لیکن چونکہ ہر گروہ کا دعویٰ ہوتا ہے کہ اس نظریے کا پورا اور خالص دودھ صرف ہمارے پاس ہے اس لئے انہیں بنیادی مقدار پوری کرنے کے لئے اس میں چار من ۳۶ کلو پانی

ملانا پڑتا ہے اور اتنی ملاوٹ کے باوجود (''بانگ دہل'' کے مصنف سے معذرت کے ساتھ)
بانگ دہل دعویٰ کریں گے کہ خالص اور پورا پانچ من دودھ صرف ہمارے پاس موجود ہے باقی
سب جھوٹ بولتے ہیں۔ایسے دعویداروں میں جو سادہ قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ تو کثیر پانی
ملا دودھ ہی لئے بیٹھے ہوتے ہیں جس میں چار کلو دودھ موجود ہونے کے باوجود اپنے ''نہ ہونے''
کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔جبکہ بعض کاری گر قسم کے لوگ رنگ بازی سے کام لے کر پانی کو دودھیا
کر لیتے ہیں چاہے اس میں مصنوعی دودھ پاؤڈر ملائیں چاہے چونا۔مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ
دیکھنے والا دھوکہ کھا جائے اور انہیں کو اس نظریے کا اصل محافظ مان لے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہر نظریہ ایک جزوی سچائی ہے۔کامل سچائی صرف اور صرف وہ
حقیقتِ عظمیٰ ہے جو خالقِ کائنات ہے۔جو اس کائنات میں جاری وساری بھی ہے اور اس سے باہر
بھی ہے جو ہر شے پر محیط ہے۔اس کامل سچائی کا اپنی اپنی بساط کے مطابق صرف اندازہ کیا جا سکتا
ہے، احاطہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ لامحدود ہے۔جب ایک بوند روشنی کا مالک جگنو سورج کی اصل
تپش کا اندازہ نہیں کر سکتا اور ایک قطرہ سمندر کی وسعت اور گہرائی کا ادارک نہیں کر سکتا تو ہم
سارے انسان اس عظیم ہستی، اس لامحدود سچائی کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں جس کے لئے کامل سچائی
کا لفظ بھی نامکمل لگتا ہے۔

☆☆☆

تجربہ اور تجربہ کاری

چالاکی کہاں آتی تھی حیدرؔ کو مری جان
بس تیری اداؤں کی کرامات سے آئی

زندگی کے تجربات اور تجربہ کاری دو الگ الگ چیزیں ہیں۔زندگی کے تجربات
زندگی کو معصومانہ حیرت سے دیکھنے اور پھر اس کی جستجو کے سفر سے عبارت ہیں۔یہ حیرت اور جستجو
اجتماعی نوعیت کی ہے کیونکہ اس سے پوری انسانیت فیض یاب ہوتی ہے۔پتھر کے زمانے سے کمپیوٹر
کے زمانے تک انسانی زندگی کے تجربات کے ثمرات دیکھے جا سکتے ہیں۔جستجو کے اس سفر میں انسان
اپنے ہر قدم پر حیرت میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر اسی معصومانہ حیرت کے ساتھ جستجو کا اگلا قدم اٹھاتا
ہے۔اس کے برعکس تجربہ کاری کی ساری کاری گری ذاتی نوعیت کی ہے۔اس سے محض کوئی شخص،
گروہ یا طبقہ فائدہ اٹھاتا ہے۔فائدے کے حصول کے لئے ہر جائز و ناجائز حربے کو بروئے کار لایا
جاتا ہے۔اسی لئے تجربہ کاری انسانی معصومیت پر کاری ضرب ہے۔یہ کسی معصوم بچے کا گرگِ
باراں دیدہ بن جانے کا المیہ ہے۔

جمالیاتی حس رکھنے والے لوگ فطرت کے مناظر اور مظاہر کو دیکھ کر انوکھی سی روحانی
آسودگی محسوس کرتے ہیں جبکہ تجربہ کاری کے ہنر سے آشنا لوگ ایسی روحانیت کو فضولیات میں شمار
کرتے ہیں۔چنانچہ مسکراتے ہوئے گلاب دیکھ کر گلقند بنانے کا پلانٹ لگانے پر غور کرتے
ہیں، پہاڑوں کو دیکھ کر بجری کے بزنس کا سوچتے ہیں، دریاؤں کو دیکھ کر کسی بھی ضروری یا غیر ضروری

جگہ پر ایک اور پُل بنوانے کی اسکیم کی منظوری اور پھر اس کا ٹھیکہ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی تدبیر کرتے ہیں، جنگلات انہیں لکڑی چوری کرانے پر اُکساتے ہیں۔ ہر چیز میں مادی افادیت کا پہلو انہیں اپنی طرف بلا لیتا ہے۔ ہمارے افادی ادب والے حضرات کا رویّہ بھی ادب کے ساتھ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ افادی ادب کی تجربہ کاری نے انہیں بڑی حد تک ادب سے ہی بے نیاز کر دیا ہے۔ تجربہ کار افادی ادب والے ادبا اچھا ادب بے شک تخلیق نہ کرسکیں افادی ادب اور اپنی تجربہ کاری کی برکت سے مادی فوائد ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ نجی افادیت کی اہمیت سے آشنا ہونے کے بعد بے شمار ذاتی فوائد کی خواہشات کے سامنے انہیں ادب بے حد حقیر لگتا ہے۔ محض ایک آلہ۔۔ چنانچہ ایسے لوگ ادب کو آلۂ کار بنا کر فائدے سمیٹتے رہتے ہیں۔

مجھے ایک شعلہ بیان مقرر کی چند تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے یہ بات شدّت سے نوٹ کی کہ کسی غم انگیز واقعہ کے بیان کے وقت شدّتِ غم سے ان کا گلا رندھ جاتا ہے آواز کی لرزش سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کے آنسو بھی نکل آئے ہوں گے۔ لیکن گلا رندھنے کی کیفیت ختم ہونے سے پہلے ان کی شعلہ بیانی پھر اپنا جادو جگانے لگتی۔ میں نے اپنی ذات کے حوالے سے بہت غور کیا۔ اگر مجھ پر غم کی حالت طاری ہو اور گلا رندھ جائے تو بے شک آنسو نکلیں یا نہ نکلیں، دیر تک میری آواز نہیں نکل پاتی۔ میں کوشش کرنے کے باوجود بول نہیں پاتا چہ جائیکہ اسی لمحے شعلہ بیانی کرسکوں۔ چنانچہ میں نے مذکورہ شعلہ بیان مقرر کے ایک مرید سے ان کے مرشد کی کیفیت اور اپنی کیفیت کے فرق کا سبب پوچھا تو خوش عقیدہ مرید نے اسے مرشد کی کرامت قرار دیا لیکن اس کے ایک پیر بھائی جو کچھ کھلّے ڈلّے سے آدمی تھے کہنے لگے یہ ہمارے مرشد کے وسیع تجربے کا ثمر ہے۔ ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وسیع تجربے سے ان کی مراد یہی تجربہ کاری تھی۔ یہ وہی تجربہ کاری ہے جو اپنی عیاری کو حکمت اور دوسروں کی دفاعی حکمت کو بھی مکاری قرار دیتی ہے۔

تجربہ کاری۔۔۔ اخلاص، محبت، دیانتداری، ذاتی شرافت اور دیگر اعلیٰ انسانی اوصاف کو چنداں اہمیت نہیں دیتی۔ یہ تمام اوصاف رکھنے کے باوجود اگر کوئی تجربہ کار لوگوں کے فائدے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر حارج ہو رہا ہے تو اپنی تمام تر انسانی خوبیوں کے باوجود وہ راندۂ

درگاہ ہے۔ اس کے برعکس اگر ٹھگ، لٹیرے، غنڈے اور قاتل قسم کے لوگوں سے مشن کو تقویت مل رہی ہے تو ان کے اخلاص، محبت، دیانت اور شرافت کے گن گائے جائیں گے۔ تجربہ کاری کا یہ اصول ہے کہ جو چیز اپنے مطلب اور فائدے کے مطابق ہے وہی سچائی ہے، باقی سب جھوٹ ہے۔ خدا کی سچی عبادت جو اپنا اجر آپ ہوتی ہے، تجربہ کار لوگوں نے اس کی لذّت بھی جنّت کی لالچ اور دوزخ کے خوف سے جوڑ دی ہے۔ شاید اسی لئے حضرت رابعہ بصری کو وہ دعا مانگنا پڑی جس میں خدا کی عبادت کسی بھی لالچ اور خوف سے پاک نظر آتی ہے اور جس کی لذّت ہی سب سے بڑی جنت ہے۔

یوں تو دنیا کے سارے ڈپلومیٹس تجربہ کاری کے زائیدہ ہیں لیکن دنیا کی واحد سپر پاور کے ڈپلومیٹس نے تجربہ کاری کی انتہاؤں کو چھو لیا ہے۔ جن مخصوص ممالک سے ان کے مفادات وابستہ ہیں وہاں کسی کو کانٹا بھی چبھ جائے تو واشنگٹن میں ان ڈپلومیٹس کا بچہ بچہ بے تاب ہو جاتا ہے لیکن جن خطّوں سے ان کے مفادات لگّا نہیں کھاتے، وہاں انسانی خون بیدردی کے ساتھ پانی کی طرح بھی بہایا جا رہا ہو تو ان کی بے فکری دیدنی ہوتی ہے۔ یہ ڈپلومیٹس دنیا بھر میں جمہوریت کے نفاذ کے علمبردار ہیں لیکن اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے بعض ملکوں میں نہ صرف بادشاہتوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں بلکہ جہاں اپنا فائدہ نظر آئے وہاں جمہوریت کا خاتمہ کر کے فوجی آمریت بھی مسلّط کر دیتے ہیں۔ یہ کھیل تماشہ محض ڈپلومیسی یا سیاست نہیں بلکہ تجربہ کاری کا کمال ہے۔

علم ایک ایسا سمندر ہے جس میں انسان جتنا آگے بڑھتا ہے یہ اتنا ہی وسیع اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ علم کے حصول میں آگے بڑھنے والا جتنا آگے بڑھتا ہے اتنا ہی اس کی علمی بے مائیگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے لیکن تجربہ کاری کا ہنر جاننے والوں کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اپنے واجبی علم کی خامیوں کو چھپا کر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے علم کا اظہار کریں گے۔ ایسے ہی ایک تجربہ کار صاحبِ علم کو جب میں نے بتایا کہ میں فارسی زبان نہیں جانتا تو انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا اظہار نہ کرنا ورنہ تمہاری سبکی ہوگی کہ اُردو کا ادیب ہے اور فارسی نہیں جانتا۔

میں نے مودبانہ گزارش کی کہ میں جتنا ہوں اتنا ہی دِکھنا چاہتا ہوں (جتنا دِکھتا ہوں یار لوگوں کو اتنا بھی دُکھتا ہوں) پھر اس میں سُبکی کہاں سے آ گئی؟ لیکن موصوف پھر بھی پورے خلوص سے مجھے اپنی نصیحت پر عمل کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ ان کی تجربہ کاری آج بھی ان کے کام آ رہی ہے۔ ان پر کیا موقوف۔ ہمارے ہاں مجلسی نوعیت کے ناقدین اور ''صاحبانِ علم'' اپنی تجربہ کاری کا آپ ثبوت ہیں۔

میں ابتدا میں کسی معصوم بچے کی طرح سادہ تھا۔ جس سے محبت اور خلوص کا اظہار کرتا اس سے سچ مچ محبت اور خلوص کا رشتہ محسوس ہوتا۔ رفتہ رفتہ دوسروں کے رویّوں سے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں کسی ''پینڈو'' کی طرح کسی بہت بڑی آبادی والے شہر کی پُر ہجوم ٹریفک میں گھِر گیا ہوں۔ رشتے، دوستیاں، محبت، ادب، ٹریڈ یونین، مذہب۔ زندگی کے ہر شعبے میں مجھے بے لوث اور محبت کرنے والے لوگ بھی نصیب ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر میں لوگوں کی تجربہ کاری کا نشانہ بنتا رہا ہوں۔ یار لوگ میری سادگی اور خلوص سے فائدہ بھی اٹھاتے اور بعد میں اس سادگی اور خلوص کو میری بیوقوفی قرار دے کر مجھ پر ہنستے۔ فائدے اٹھا کر آنکھیں بدل لینے والے دوستوں اور تضحیک کرنے والے کرم فرماؤں کے رویوں پر میں ایک عرصے تک حیران ہوتا رہا۔ لیکن اب میری حیرانی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ یار لوگوں کی تجربہ کاری کا نشانہ بنتے بنتے شاید میں بھی اب تھوڑا بہت تجربہ کار ہو گیا ہوں۔

پتہ نہیں تجربہ کار ہو گیا ہوں یا اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں!

☆☆☆

حیدر قریشی کے انشائیے

منزّہ یاسمین (بھاول پور)

اُردو کی دوسری نثری اصناف یعنی ناول، افسانے اور ڈرامے کی طرح انشائیہ بھی مغرب سے آیا۔ اُردو میں انشائیہ ایک نوخیز صنفِ ادب ہے جس پر طعن و تشنیع کی بہت گرد اڑائی گئی مگر اس کے نقوش پھر بھی دھندلے نہ ہو سکے اور انشائیہ اپنی پوری قوت کے ساتھ شہرت اور مقبولیت کی راہ پر گامزن رہا۔ خاطر غزنوی انشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انشائیہ، انگریزی نثر کی ایک صنف ESSAY کی اُردو صورت ہے۔ لفظ ESSAY فرانسیسی لفظ ESSAI سے انگریزی زبان نے لیا۔ ظہیر الدین مدنی اپنے مقالے میں ESSAY کی اصل عربی لفظ السّعی کو بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صدیوں تک اندلس اور جنوبی فرانس پر عربوں کا سکّہ چلتا رہا۔ اسی وجہ سے فرانسیسی زبان میں لاطینی سے بھی زیادہ عربی الفاظ رائج ہیں۔ ممکن ہے ESSAI بھی ان میں سے ہو۔ کیونکہ دونوں الفاظ کے معنی اور مفہوم کوشش کے ہیں۔ آج کل اُردو زبان میں اسی صنف کو انشائیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔'' (۱)

محمد وسیم انجم اپنے مضمون ''حیدر قریشی کے انشائیے'' میں انشائیہ کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''انشائیہ دراصل مضمون ہی کی ایک قسم ہے، یہ ایسی نثری تحریر ہے جس میں انشائیہ نگار غیر رسمی اور شگفتہ انداز میں اپنا مافی الضمیر قاری تک پہنچاتا ہے۔ انشائیے کے لیے ایسے موضوع کو منتخب کیا جاتا ہے جس میں کوئی نیا پہلو قاری کے سامنے آئے اور وہ اپنے ذہن میں ایک

دریچہ سا کھلتا ہوا محسوس کرے۔اس موضوع کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنے کی بجائے صرف ان انوکھے گوشوں کو منتخب کیا جاتا ہے جو قاری کو چند لمحوں کی مسرت بہم پہنچا سکیں۔علاوہ ازیں اسلوب بیان کی یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ تفصیل و توضیح کی بجائے کم سے کم الفاظ میں مطلب ادا ہو جائے ''۔ (۲)

اُردو ادب میں انشائیہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ڈاکٹر وزیر آغا کے پہلے انشائیوں پر مبنی مجموعہ ''خیال پارے'' سے ہوا جو کہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا اور اُردو ادب میں یہ پہلا انشائیوں کا مجموعہ بھی کہلاتا ہے۔اسی لیے ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر وزیر آغا کو صنفِ انشائیہ کا بانی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اُردو انشائیہ کا بانی قرار دیتا ہوں تو اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس صنف کی بنیادی بوطیقا وضع کی ہے۔اور اس بوطیقا کے مطابق انشائیے تخلیق کیے ہیں، دوسری طرف بات یہ کہ انہوں نے ''پرسنل ایسّے'' کے جس اسلوب کی ترویج و اشاعت کی اس اسلوب میں انشائیہ لکھنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا کی''۔ (۳)

انشائیہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو پہلے وزیر آغا اس اسلوب کے تنہا انشائیہ نگار تھے۔پھر انہی کے انداز پر پروفیسر مشتاق قمر اور پروفیسر جمیل آذر نے بھی انشائیے لکھنے شروع کر دیئے۔بعد میں ڈاکٹر وزیر آغا کے مخصوص انداز میں انشائیہ لکھنے والوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ان انشائیہ نگاروں کی ایک فہرست پروفیسر جمیل آزر نے اپنے مقالے ''اُردو انشائیہ نگاری کے پچاس سال'' مطبوعہ ''اوراق'' جولائی اگست ۱۹۹۷ء میں شامل کی ہے۔جن میں حیدر قریشی کا نام بھی شامل ہے۔ (۴) اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون ''اُردو انشائیہ کی کہانی'' میں بھی چند انشائیہ نگاروں کی فہرست پیش کی ہے، جس میں حیدر قریشی کا نام بھی شامل ہے۔

حیدر قریشی اپنے مضمون ''عہد ساز شخصیت'' میں وزیر آغا سے اپنے تلمذ کا اِن لفظوں میں اعتراف

کرتے ہیں:

''وزیر آغا نے مجھے انشائیہ کے بارے میں زبانی گفتگو میں بھی سمجھایا، مضامین کے مطالعہ کی طرف بھی لگایا اور پھر انشائیے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔'' (۵)

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں منفرد اور متنوع موضوعات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے انشائیے تخلیق کیے ہیں جن میں اختصار، غیر رسمی طریق کار، شگفتگی، اسلوب اور انکشاف ذات کے منفرد عوامل شامل ہیں۔ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں بھی اپنے شاعرانہ انداز کو متعارف کرواتے ہوئے ہر انشائیے کے آغاز میں موضوع کے مطابق ایک ایک شعر تحریر کیا ہے جو کہ انشائیے کے تاثر کو مزید اُجاگر کرنے میں مدد دیتا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں زندگی کی حقیقتوں کو اُن کی مکمل معنویت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔انشائیہ ''خاموشی'' میں حیدر قریشی اپنے منفرد اور فکر انگیز انداز میں لکھتے ہیں:

''بعض لوگ خاموشی کو شکست کی آواز سمجھتے ہیں۔ایسے لوگ تاریخ اور مستقبل سے بے خبر ''حال مست'' ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ خاموشی تو فتح کی پیش خبری ہوتی ہے۔جب سمندر خاموش ہو یا فضا میں ہوا خاموش ہو تب خاموشی طوفان اور آندھی کی صورت اپنا جلالی روپ دکھاتی ہے۔ سقراط نے زہر پی کر، حسینؑ نے شہید ہو کر اور ابن منصور نے سولی قبول کر کے خاموشی سے صبر کے جو عظیم نمونے دکھائے، بظاہر وہ اُس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست ہی تھی۔لیکن درحقیقت ان مظلوموں اور سچوں کی خاموشی ان کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔مظلوموں کی خاموشی کی یہ سچائی ہمیشہ سے قائم ہے۔'' (۶)

انشائیہ ''فاصلے، قربتیں'' میں بھی حیدر قریشی زندگی کی اٹل حقیقتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قربت کا ایک رنگ مرد اور عورت کے تعلق سے عبارت ہے۔اس قربت کے مختلف مراحل ہیں۔آخری مرحلے کے اختتام پر فاصلہ وجود میں آجاتا ہے۔۔۔۔گویا قربت کی انتہا سے

فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح فاصلے کی انتہا قربت کو جنم دیتی ہے۔'' (۷)

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں موضوعات کے تنوع اور عمومیت کا ہر طرح خیال رکھا ہے۔انہوں نے خاموشی، نقاب، وگ، بڑھاپے کی حمایت، اطاعت گزاری، اپنا اپنا سچ جیسے عام موضوعات کو انتہائی مہارت سے پیش کیا ہے یہ تمام انشائیے اپنے اندر گہری معنویت سمیٹے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

موضوعات کے اس تنوع سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حیدر قریشی محض زندگی کے اہم پہلوؤں کو ہی مدنظر نہیں رکھتے بلکہ غیر اہم پہلوؤں کو بھی اپنے گہرے مشاہدات کے ذریعے شاہکار بنا کر پیش کرتے ہیں۔حیدر قریشی کے انشائیے''خاموشی'' کو مدنظر رکھتے ہوئے محمد وسیم انجم یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''حیدر قریشی نے خاموشی جیسے موضوع پر ایسا دھماکہ خیز انشائیہ لکھ کر خاموشی کے ایسے تار کش جوڑے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر انسان معاشرے میں پھیلنے والی خلفشار سے بچ سکتا ہے۔یہاں انہوں نے عقل وخرد کے ارتقاء، ایک گھر، ملک اور عالمی سطح پر معاشرتی اور تہذیبی ہنگاموں کی نقاب کشائی بڑی دانش مندی سے کی ہے۔'' (۸)

ایک اچھے اور کامیاب انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کو شامل کرے۔ڈاکٹر سلام سندیلوی اپنے مضمون''انشائیہ کا مطالعہ''میں لکھتے ہیں:

''ایک کامیاب انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات سے قارئین کو آگاہ کرتا ہے، اس لیے وہ کھل کر اپنے تجربات ان سے بیان کرتا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ ان کو اپنے تجربات میں شریک کر لیتا ہے اس لیے انشائیہ کا موضوع ذاتی تجربات کا اظہار ہوتا ہے۔'' (۹)

اس نقطہ نظر سے جب ہم حیدر قریشی کے انشائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ حیدر قریشی انشائیہ لکھتے ہوئے اپنی ذات کو درمیان میں موجود رکھتے ہوئے اپنے قاری کو اپنے ذاتی تاثرات سے آگاہ کرتے ہیں۔انشائیہ''چشمِ تصور''میں حیدر قریشی اپنی شخصیت کے مختلف گوشوں اور اپنے تاثرات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ فلمیں دیکھے بغیر بسر کیا ہے تاہم اس زمانے میں، میں نے بے شمار گیت سنے تھے۔پھر جب میں نے فلمیں دیکھنا شروع کیں تو اپنے پسندیدہ گیتوں میں سے کسی بھی گیت کی پکچرائزیشن مجھے اچھی نہیں لگی۔دراصل گیت سنتے ہوئے ہمارے تصور کی آنکھ وا ہوتی ہے اور وہ اس گیت پر اپنی مرضی کا سین فلم بند کرتی ہے۔ایسے سین میں جو بے پناہ معنویت ہوتی ہے ہماری چشم تصور کا کمال ہوتی ہے''۔ (۱۰)

حیدر قریشی اپنے اکثر انشائیے اُن موضوعات پر لکھتے ہیں جو اُن کے ذہنی، فکری اور جذباتی ردعمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر انشائیہ ان کے شخصی تجربے اور مشاہدے کا حامل نظر آتا ہے۔وہ اپنے دلچسپ اور انوکھے تجربے میں قاری کو شریک ہی نہیں کرتے بلکہ ہم نوا اور ہم خیال بھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔انشائیہ''خاموشی'' میں اپنے ذاتی تجربات اور احساسات کو یوں بیان کرتے ہیں:

''آواز کی دلکشی بھی خاموشی کے پس منظر کی محتاج ہے۔ہوٹلوں اور بازاروں میں پوری آواز کے ساتھ نشر کیے جانے والے گیت سر میں درد پیدا کر دیتے ہیں جبکہ وہی گیت آپ رات کو مکمل خاموشی کے پس منظر میں مدھم آواز سے سنیں تو آپ خود بھی ان گیتوں کے سروں کے ساتھ جیسے بہتے چلے جائیں گے۔سرگوشی اور دھیمی گفتگو آواز کے خاموشی کی طرف جھکاؤ کے مظہر ہیں۔چنانچہ آپ دیکھیں کہ آوازوں میں جو لطف سرگوشی اور دھیمی گفتگو میں ہے وہ بلند لہجے کی آواز میں نہیں ہے۔'' (۱۱)

انشائیہ''اطاعت گزاری'' میں بھی حیدر قریشی اپنے ذاتی تجربات اور تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''تجریدی تصویر کی اطاعت گزاری بھی تہ در تہ نتائج (معانی) کی حامل ہے۔آپ نے بڑے افسر کی اطاعت کی تو اس کے منظورِ نظر بن گئے۔بڑے افسر کے منظورِ نظر بنتے ہی ماتحت عملہ کے اطاعت گزاروں کی ایک فوج آپ کے زیرنگیں آ گئی۔گویا افسروں کی اطاعت کرنے والوں کو بھی ایک افسری نصیب ہو جاتی ہے۔آمروں کی اطاعت کرنے والوں کو اسی طرح ایک قسم کی

آمریت مل جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اوپر سے نیچے اور نیچے تک مسلسل جاری وساری رہتا ہے۔'' (۱۲)

ایک انشائیہ میں ''میں''، یعنی واحد متکلم کی موجودگی اس کی انفرادیت کا باعث ہوتی ہے کیونکہ یہاں ''میں'' سے مراد خود انشائیہ نگار کی شخصیت ہوتی ہے۔ بعض ناقدین اس ''میں'' کو خود کلامی سمجھتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو اس ''میں'' کے ذریعے انشائیہ نگار اپنے قاری کے سامنے ایک کردار بن کر جلوہ نما ہوتا ہے اور اس کا مخاطب قاری ہوتا ہے۔ اس ''میں'' کے ذریعے انشائیہ نگار اپنے قاری کو اس طرح کہانی سناتا نظر آتا ہے جیسے وہ اس کا بہترین اور بے تکلف دوست ہو۔ حیدر قریشی بھی اپنے انشائیوں میں اپنی ''میں'' کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے قاری سے گفتگو کرتے ہیں۔ حیدر قریشی کا یہ انداز اپنے قاری کو شریک گفتگو کرتے ہوئے اپنی کہانی بیان کرنے جیسا معلوم ہوتا ہے جیسے انشائیہ ''وگ'' میں حیدر قریشی اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے ہی دیکھا کہ اباجی کے سر پر بال نہیں تھے۔ بچپن سے ہی میری شدید خواہش رہی کہ اباجی کے سر پر بال سجے ہوئے دیکھوں۔ اس کی دو ممکنہ صورتیں تھیں یا تو کوئی ایسی دوامل جائے جس سے بال دوبارہ اُگ آئیں یا پھر وِگ سجالی جائے۔ تب وِگ خریدنے کے وسائل میسر نہیں تھے، پھر بھی میں نے ایک بار اباجی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔'' (۱۳)

اسی طرح انشائیہ ''تجربہ کاری'' میں بھی حیدر قریشی کا انداز بالکل ایسا ہے جیسے وہ اپنے ماضی کی داستان بیان کر رہے ہوں:

''میں ابتدا میں کسی معصوم بچے کی طرح سادہ تھا۔ جس سے محبت اور خلوص کا اظہار کرتا اس سے سچ مچ محبت اور خلوص کا رشتہ محسوس ہوتا۔ رفتہ رفتہ دوسروں کے رویوں سے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں کسی ''پینڈو'' کی طرح کسی بہت بڑی آبادی والے شہر کی پرہجوم ٹریفک میں گھر گیا ہوں۔۔۔'' (۱۴)

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں کے ذریعے معاشرے کے ناہموار اور کمزور پہلوؤں کو

بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ کسی ناصح یا مصلح کی طرح پرزور تقریریں یا مدلل انداز میں اپنے قاری کو نصیحت نہیں کرتے بلکہ اپنے غیر رسمی اور بے تکلف انداز بیاں سے معاشرے کے تلخ حقائق کو اس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو کسی طنز کا بھی احساس نہیں ہوتا اور وہ ایک نئی سوچ کے پیش نظر اصل حقیقت تک بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ انشائیہ ''نقاب'' میں حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''ڈپلومیسی کا نقاب آج کل بہت عام ہے۔ عام زندگی سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ہر شعبہ حیات میں اس نقاب کو بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اس کے رواج سے پرتکلف اخلاقیات کا فروغ ہو رہا ہے۔ بعض سرپھرے اسے منافقت قرار دیتے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔ نقصان سرپھروں کا ہی ہوتا ہے''۔ (۱۵)

انشائیہ ''اپنا اپنا سچ'' میں بھی حیدر قریشی معاشرے کے تلخ حقائق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دنیا میں ہر گروہ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ خود کو سچا سمجھتا ہے۔ ایسا سمجھنے میں کوئی حرج نہیں۔ خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جب اپنی سچائی کا اعلان کرنے والا ساتھ ہی دوسروں کو جھوٹا بھی قرار دے دیتا ہے۔ ہر شعبہ حیات میں ہر گروہ اپنے حق بجانب ہونے کے دلائل بھی رکھتا ہے اور دوسروں کو جھوٹا بھی پیش کرتا ہے''۔ (۱۶)

حیدر قریشی کے انشائیے زندگی کے تلخ حقائق کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ رنگ لیے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں۔ حیدر قریشی اپنے موضوعات کو دنیاوی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے اس کے محاسن ومحائب پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، انشائیہ میں موجود فلسفہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انشائیہ میں صرف فلسفہ ہی داخل نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں اخلاقی قدریں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ مختلف انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیہ کے ذریعے انسان کے اخلاق کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے، اس طرح انشائیہ میں افادی اور مقصدی رنگ شامل کر دیا گیا۔'' (۱۷)

حیدر قریشی نے بھی اپنے انشائیوں میں اس فلسفیانہ انداز کو برتا ہے۔ مثلاً انشائیہ ''نقاب'' میں رقم طراز ہیں:

''انسانی جسم بھی ایک نقاب ہے جسے روح نے اوڑھ رکھا ہے۔روح جسم سے نکل کر فنا نہیں ہوتی بلکہ موت کا نقاب اوڑھ کر اس کی زندگی بن کے دھڑکنے لگتی ہے۔زمانے کی ماہیت پر سنجیدگی سے غور کریں تو ماضی سے مستقبل تک زمانہ نقاب اوڑھے نظر آتا ہے۔مستقبل کے پورے مگر باریک نقاب میں سے ہر لحظہ جھانکتا ہوا ''حال'' پلک جھپکتے ہی ماضی کے آدھے نقاب کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور ہم اس لمحے کو چھونے کی پوری طرح دیکھنے کی خواہش دل میں ہی لیے رہ جاتے ہیں۔'' (۱۸)

انشائیہ ''بڑھاپے کی حمایت میں'' حیدر قریشی کا یہ انداز یوں جلوہ دکھاتا ہے:

''انسان بچپن میں ضدی ہوتا ہے اور جوانی میں باغی، لیکن بڑھاپے میں ضد اور بغاوت دونوں سے دامن چھڑا کر خود سپردگی اور راضی بہ رضا کے صوفیانہ مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ اولاد جتنی گستاخ، بے ادب اور بے پرواہ ہوگی۔انسان اس صوفیانہ مقام میں اتنا ہی ترقی کرتا جائے گا اور آخر کار اس مقام لاہوت تک جا پہنچے گا جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔'' (۱۹)

حیدر قریشی کے انشائیوں میں شاعرانہ تخیل کے بھی کچھ اثرات ملتے ہیں۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حیدر قریشی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔اس لیے اگر شاعرانہ حسن بیاں حیدر قریشی کے انشائیوں میں نظر آتا ہے تو وہ فطری بات ہے۔انشائیہ ''وگ'' میں حیدر قریشی کا شاعرانہ انداز بیان کچھ یوں نظر آتا ہے:

''سیاہ رات اس دنیائے موجود کے سر پر زُلف دراز والی وگ ہے۔آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اس زلف پر گرے ہوئے شبنمی موتی ہیں، کہکشاں اس کی مانگ میں بھری ہوئی افشاں ہے اور چاند ایک خوبصورت سنہری کلپ۔یہ دنیائے موجودات بھر کسی محبوبہ دلنواز کی طرح اپنی زلفوں کی مہک بکھیرتی ہے۔۔۔'' (۲۰)

محمد وسیم انجم حیدر قریشی کے انشائیوں میں موجود شاعرانہ رنگ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حیدر قریشی کے انشائیوں میں ذاتی مشاہدات اور تاثرات نمایاں ہیں اور ان کے اسلوب میں شعریت کا عنصر غالب ہے جس کی لطافت اور تہذیب الفاظ کا معیار فنی تقاضوں کے

عین مطابق ہے۔'' (۲۱)

حیدر قریشی کے انشائیوں میں اُن کی فکر وفن سے بھرپور انفرادیت اپنی تمام تر جدت وندرت لیے موجود ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں زندگی کے نئے پہلوؤں کو بڑی کامیابی سے سامنے لاتے ہیں۔اسی لیے محمد وسیم انجم حیدر قریشی کے انشائیوں کی تعریف کرتے ہوئے اظہار رائے کرتے ہیں:

''حیدر قریشی کے انشائیے انفرادی اسلوبی خوبیوں سے مالا مال ہیں جن میں بے ساختہ شگفتگی اور سادگی قاری کو اپنا ہم سفر بنا کر ساتھ لیے رواں دواں رکھتی ہے اور قاری انشائیہ نگار کی فکری صلاحیتوں کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' (۲۲)

مختصر یہ کہ حیدر قریشی کے انشائیوں میں مستقبل کے ایک کامیاب انشائیہ نگار کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔کاش ایسا ہو کہ حیدر قریشی ادب کے بہت سارے شعبوں میں جھانکا ہی کرنے کی بجائے صنفِ انشائیہ پر پُرخلوص توجہ اور ریاضت کا جوہر آزمائیں تو انشائیے کے میدان میں ایک مقامِ فضیلت اُن کا مقدر بن سکتا ہے۔

....

حوالہ جات

۱۔ خاطر غزنوی ''جدید اردو ادب'' ص نمبر ۴۳، سنگِ میل پبلی کیشنز۔لاہور۔۱۹۸۵ء

۲۔ محمد وسیم انجم ''حیدر قریشی، فکر وفن'' ص نمبر ۸۵، انجم پبلی کیشنز، راولپنڈی۔۱۹۹۹ء

۳۔ مرتّبین ڈاکٹر شفیق احمد۔ڈاکٹر روشن آرا راؤ ''انتخاب انشائیہ نمبر''
ص نمبر ۴۹۔کاروانِ ادب، ملتان۔

۴۔ محمد وسیم انجم ''حیدر قریشی، فکر وفن'' ص نمبر ۸۶

۵۔ حیدر قریشی ''عہد ساز شخصیت'' ص نمبر ۲۱، نایاب پبلی کیشنز، خان پور۔۱۹۹۵ء

۶۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۷۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۸۔ محمد وسیم انجم ''حیدر قریشی، فکر و فن'' ص نمبر ۸۷

۹۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی ''ادب کا تنقیدی مطالعہ'' ص نمبر ۲۱۱،
مکتبہ میری لائبریری لاہور۔ ۱۹۸۶ء

۱۰۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۱۱۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۱۲۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۱۳۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۱۴۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۱۵۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۱۶۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۱۷۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی ''ادب کا تنقیدی مطالعہ'' ص نمبر ۳۱۶

۱۸۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۱۹۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۲۰۔ حیدر قریشی ''فاصلے، قربتیں،، (زیر اشاعت)

۲۱۔ محمد وسیم انجم ''حیدر قریشی، فکر و فن'' ص نمبر ۹۳

۲۲۔ محمد وسیم انجم ''حیدر قریشی، فکر و فن'' ص نمبر ۹۳

تاثرات

حیدر قریشی کی ایک کتاب جوان کے دس انشائیوں پر مشتمل ہے۔ ''فاصلے قربتیں'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ اس میں انہوں نے جن عنوانات کے تحت انشائیہ لکھے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں، خاموشی، نقاب، وگ، فاصلے قربتیں، بڑھاپے کی حمایت میں، اطاعت گزاری، یہ خیر و شر کے سلسلے، چشم تصور، اپنا اپنا سچ، اور تجربہ کاری ہیں۔ ان تمام دس انشائیوں میں انہوں نے مختلف کیفیات، زمانے کے نشیب و فراز، سیاسی حالات اور سماجی نیرنگیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان انشائیوں میں تحریر چست اور برجستہ ہے اور ساتھ ہی فقروں کی چستگی نے ایک شگفتگی کو عیاں کر دیا ہے۔ عموماً انشائیوں میں اقوال زرین کی تلاش ہوتی ہے۔ تاہم میری نظر میں انہیں اقوال زرین کی بجائے فقرہ ہائے بذلہ سنجی سے تعبیر کرنا چاہئے۔ جو انگریزی کے Wit & Wisdom کی طرز پر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

حیدر قریشی کے بعض فقرے یا چست اقوال جنھیں میں نے اقوال زرین کی بجائے فقرہ ہائے بذلہ سنجی سے تعبیر کروں گا، جو نہ صرف بڑے چست ہیں بلکہ معنی کا ایک سمندر سمیٹے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غرض حیدر قریشی کے انشائیہ جہاں ہمارے ذہن کو تازگی، فرحت اور شگفتگی عطا کرتے ہیں وہیں دعوت غور و فکر بھی دیتے ہیں اور ہمارے ذوق و وجدان کو مہمیز بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرب استاد (گلبرگہ)

حیدر قریشی کا فکری اور فنی سفر تقریباً تین دہائیوں پر محیط ہے۔انہوں نے اس عرصہ میں خود کو انتہائی فعال رکھا ہے۔اردو ادب کی بہت سی لہروں کے ساتھ سفر کیا ہے اور بدلتے ہوئے رویوں اور دھاروں کا ساتھ دیا ہے مگر اپنے تشخص کو مجروح نہیں ہونے دیا۔یہی انداز ان کے انشائیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔اپنی ادبی اور عملی زندگی کے لمحوں کو، چاہے وہ کتنے ہی کربناک کیوں نہ رہے ہوں، انہوں نے ایک خوشگوار اسلوب میں پرو کر پڑھنے والوں کے لیے سامانِ تفریح بھی مہیا کیا ہے اور لمحہء فکریہ بھی۔اپنے لاشعور میں پرورش پاتے ہوئے کبھی مبہم اور کبھی واضح کرداروں سے انہوں نے طرح طرح کے دلچسپ پہلو نکالے ہیں اور سادہ و پرکار جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کے انشائی پہلوؤں کو بھی خوب خوب اجاگر کیا ہے۔اپنی کیفیات کے ہمراہ قاری کی کیفیات کا بھی لحاظ رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا بھی ان کے تاثرات کو قبول کرتا چلا جاتا ہے اور اسی کشتی میں بہنے لگتا ہے جس میں خود مصنف سوار ہے۔اس طرح ان کے انشائیوں کا مطالعہ ایک رسمی مطالعہ نہیں رہا بلکہ حیدر قریشی کے ذہنی اور ادبی ارتقاء پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ بھی بن گیا ہے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں ان کی فتوحات اور شکستوں کے ساتھ موجود ہیں جو ان کے انشائیوں میں کہیں خاکہ نگاری کا رنگ بکھیر دیتی ہیں اور کہیں یادنگاری کا، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ان ساری کیفیات کے پردے سے ایک انشائیہ ابھار لینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں انکساری اور عاجزی بھی نظر آتی ہے لیکن ان دو خوردبینوں کے ذریعے انہوں نے اپنے اردگرد کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات کو Magnify کر کے دکھایا ہے، اس طرح سے کہ ان کے سامنے خود ان کی انکساری اور عاجزی بڑی دکھائی دینے لگتی ہے۔

حیدر قریشی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اپنی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور جو یہ بھی جانتے ہوتے ہیں کہ انہیں کس شعبہء ادب کا انتخاب کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔انشائیہ کے حوالے سے انہوں نے جو کام کیا ہے وہ اس صنف میں چند قابلِ قدر انشائیوں کے اضافے

سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری کی صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے دوسرے انشائیہ نگاروں سے ہٹ کر موضوعات کا انتخاب کیا ہے اور پھر موضوع کے اعتبار سے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو عام قاری کی نظر میں نہیں آسکتے۔ایک اچھے انشائیہ نگار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ان اشیاء، مظاہر اور ان کے چھپے ہوئے گوشوں کو سامنے لائے جو بآسانی دکھائی نہ دے سکتے ہوں۔حیدر قریشی کی انفرادیت کا ثبوت ان کے زاویہء نگاہ میں مضمر ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ بیشتر نظر آنے والی چیزیں ویسی نہیں ہوتیں جیسی دکھائی دیتی ہیں بلکہ بعض اوقات متضاد اور انتہائی مختلف بھی ہوسکتی ہیں۔حیدر قریشی بعض پیچیدگیوں کو اس فنکارانہ مہارت سے پیش کرتے ہیں کہ فلسفہ اور نفسیات کی گتھیاں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔۔۔۔۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں حیرت آمیز تجسس کی فضاء ہمیشہ موجود رہتی ہے اور پڑھنے والا ایک چوٹی یا عروج سے گزر کر نئی چوٹی کے نظارے میں گم ہو جاتا ہے۔اگرچہ ایک خاص موڑ پر انشائیہ کا اختتام پذیر ہو جانا کوئی نئی بات نہیں رہی لیکن حیدر قریشی اب بھی اپنے انشائیوں کو ایک خوبصورت موڑ دے کر ختم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں جیسے ستارہ ٹوٹتے ہوئے خوب روشنی دیتا ہے۔حیدر قریشی کے بیشتر انشائیوں کے اختتام پر دور تک جاتی ہوئی فکر کی ایک لہر مجھے اسی روشنی کے مترادف دکھائی دیتی ہے جس کے ہمراہ آپ ان سمتوں میں نکل سکتے ہیں جس طرف مصنف کا وجدان آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔ **خاور اعجاز** (اسلام آباد)

ان چند انشائیوں کے تعارف سے جہاں حیدر قریشی کے ذہنی میلان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی انشائیہ نگاری غزل کی ریزہ خیالی کے اثر سے چمک کر ان کی تخلیقی نثر میں ان کی پہچان بن گئی ہے۔ ان کے گنتی کے دس انشائیے اپنی ادبی اہمیت کے لحاظ سے اتنے اہم ہیں کہ اگر کوئی نقاد بہت زیادہ بد دیانتی کا مرتکب نہ ہو تو انہیں نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

ڈاکٹر نذر خلیق (اسلام آباد)

حیدرقریشی اردو ادب کا سرمایہ ہیں، جنہوں نے بیشتر اصناف میں اپنی قلمی برتری کا لوہا منوالیا ہے۔انہوں نے بحیثیت انشائیہ نگار ایسے انشائیے تخلیق کیے ہیں جن میں اختصار، شگفتگی، اسلوب اور انکشاف ذات کے داخلی، خارجی ہیئتی عوامل شامل ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ انشائیہ نگار اپنے جذبات و احساسات کا اظہار انشائیے کے مزاج کے مطابق بڑے تجربے سے کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حیدر قریشی کے انشائیوں میں ذاتی مشاہدات اور تاثرات نمایاں ہیں اور ان کے اسلوب میں شعریت کا عنصر غالب ہے جس کی لطافت اور تہذیب الفاظ کا معیار فنی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔آپ شعور اور تحت الشعور کی ایسی سرحد پر تہذیب وثقافت کی زبان استعمال کرتے ہیں جو تمام بنی نوع انسان کا مشترکہ ورثہ ہے۔حیدر قریشی کے بکھرے ہوئے مطبوعہ انشائیوں کا ورثہ اب کتابی صورت میں ''فاصلے، قربتیں'' کے نام سے منظرِ عام پر ہے۔ جنہیں انشائیہ نگاری کے سلسلے میں بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔انشاءاللہ۔

ڈاکٹرمحمد وسیم انجم (راولپنڈی)

حیدرقریشی صاحب کی نثر کے کئی پہلو ہیں' مجھے ذاتی طور پر ان کے کالم بہت پسند ہیں کیونکہ حالاتِ حاضرہ' معاشرے اور خود اپنی شکست وریخت اور اس پر پوری توانائی سے گفتگو اور سوچ بچار ان کی طرح میرا بھی موضوع ہے جبکہ وہ قدروں کے پیغمبر بھی ہیں اور عامل بھی۔ان کے انشائیے محض لایعنی اشیا کو ادب میں خوبصورتی سے جگہ دینے اور یوں اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو منوانے پر ختم نہیں ہوتے بلکہ ان سے متعلق معاشرے کے اصل مسائل اور موضوعات انشائیوں میں حلول کیے ہوتے ہیں جن پر مضمون یا مزاح لکھنا آسان ہوتا ہے مگر انشائیہ لکھنا اور اس ''غیر ہضم شدہ'' صنف میں اپنا پیغام پہنچا دینا آسان نہیں ہوتا۔ان کے انشائیوں کی یہ خوبی قابلِ ستائش ہے اور ان میں چھپا خفیف تبسم انشائیے کا تحفۂ خاص۔

فیصل عظیم (امریکہ)

حیدرقریشی پر ہونے والا یونیورسٹی سطح کا کام

براہِ راست

۱۔حیدر قریشی شخصیت اور فن....منزہ یاسمین

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ سال۲۰۰۲۔۔۲۰۰۰ء

۲۔حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جھتیں ڈاکٹرعبدالرب استاد

پی ایچ ڈی کا مقالہ ۲۰۱۳۔گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا

۳۔حیدر قریشی۔حیات وخدمات انجم آراء

ایم فل کا مقالہ۔۔۲۰۱۳ء۔کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا۔

حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ ھرمے پرتاپ بھانو

ایم فل کا مقالہ، سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہرلال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

۴۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات....عامر سھیل

ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔ہزارہ یونیورسٹی، ایبٹ آباد، پاکستان

۵۔حیدر قریشی کی افسانہ نگاری راضینہ خان

ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہرلال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

....

بالواسطہ

۱۔جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث....شازیہ حمیرہ

سال ۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

۲۔اردو میں ماھیا نگاری ڈاکٹر صبیحہ خورشید

سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا سے پی ایچ ڈی کا مقالہ

....

حیدرقریشی انٹرنیٹ کی دنیامیں

ان تین ای لائبریریز میں حیدرقریشی کی تمام کتابیں پی ڈی ایف فائل میں موجود ہیں

http://haider-qureshi.blogspot.de/

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

http://issuu.com/haiderqureshi

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

اس ای لائبریری میں حیدرقریشی پرلکھی گئی،مرتب کی گئی کتابیں اوررسالے موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

ان بلاگس پرحیدرقریشی کی کتب یونی کوڈ میں دستیاب ہیں۔

سوئے حجاز: http://soo-e-hijaz.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

''روشنی کی بشارت''،''قصے کہانیاں''اور بعد کے سارے افسانے

http://hq-kayafsanay.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

خاکوں کا مجموعہ ''میری محبتیں'':

http://meri-mohabbaten.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

یادوں کا مجموعہ ''کھٹی میٹھی یادیں'':

http://khatti-mithi-yaden.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

انشائیوں کا مجموعہ''فاصلے،قربتیں'':

http://inshaiya.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

دوخاص بلاگس

کلکتہ اور دهلی کا سفر،با تصویررودا د

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

حیدر قریشی کی البم:**زندگی تصویروں کے آئینے میں**

http://haiderqureshi-album.blogspot.de/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

حیدر قریشی کی سب سے پهلی ویب سائٹ

http://haiderqureshi.com/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

جدیدادب: http://www.jadeedadab.com/

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

وکی پیڈیا پر صفحات

http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi

عمرِ لاحاصل کا حاصل

http://en.wikipedia.org/wiki/Umr-e-Lahaasil_Ka_Haasil

جدید ادب

http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

ادبی اعتراف

حیدر قریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن** **مصنف**: **محمد وسیم انجم**

(مطبوعہ۱۹۹۹ء)**ناشر**:انجم پبلشرز،کمال آباد نمبر۳،راولپنڈی۔پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**

مرتبین:**نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے**(مطبوعہ۲۰۰۲ء)

ناشر:اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**

مرتب:ڈاکٹر نذر خلیق (مطبوعہ۲۰۰۳ء) ناشر:میاں محمد بخش پبلشرز،خانپور،پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن** **منزہ یاسمین** کا تحقیقی مقالہ

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔سال۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء۔کتابی صورت میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔**ناشر:**میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان

۵۔**حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز**

مرتب:**سعید شباب** (مطبوعہ۲۰۰۴ء)

ناشر:نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

۶۔ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدر قریشی نمبر۔۔۔**مدیر ومرتب**: **ارشد خالد**

ناشر:عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)

۷۔۷۔**حیدر قریشی کی شاعری** **مرتب**:**ہردئے بھانو پرتاپ**

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی (مطبوعہ۲۰۱۳ء)

۸۔**حیدر قریشی کی تخلیقی نثر** **مصنف**:**عامر سہیل**

زیرِ اشاعت (سال ۲۰۱۴)

....

حیدر قریشی پر ترتیب دیئے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشہ حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ ''**اسباق**''پونہ شمارہ:فروری تا اپریل۱۹۹۳ء۔

ایڈیٹر: نذیر فتح پوری

۲۔**حیدر قریشی**(بطور افسانہ نگار)مطبوعہ ماہنامہ ''**شاعر**''بمبئی۔

شمارہ مئی تا دسمبر۱۹۹۷ء۔**ہم عصر اردو ادب نمبر**... ایڈیٹر : افتخار امام صدیقی

۳۔اشاعتِ خصوصی''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ،حیدر قریشی''ہفت روزہ **ہوٹل ٹائمز**

اسلام آباد۲۲مئی تا۲۸مئی ۱۹۹۸ء۔ مرتبین:اختر رضا کیکوٹی و محمد وسیم انجم

۴۔گوشہ حیدر قریشی مطبوعہ سہ ماہی''**ادبِ عالیہ**''وہاڑی۔شمارہ مارچ۲۰۰۲ء

ایڈیٹرز:ریاض ہانس و ریاض ملک

۵۔خصوصی مطالعہ ''**مہرِ امروز**''مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی۲۰۰۴ء

(اردو دوست ڈاٹ کام) ایڈیٹر:خورشید اقبال

۶۔گوشہ حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی شمارہ نومبر۲۰۰۴ء ۔ایڈیٹر:افتخار امام صدیقی

۷۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی **ادب ساز** دہلی(تقریباً۵۰صفحات میگزین سائز پر مشتمل)

شمارہ:۶،۷،جنوری تا جون ۲۰۰۸ء ایڈیٹر:نصرت ظہیر

۸۔خصوصی مطالعہ''**عمرِ لاحاصل کا حاصل**''

مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد(کتاب نمبر۱۰) مدیر:ارشد خالد

۹۔گوشہ بحیثیت محقق و نقاد مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد

(کتاب نمبر۱۱،مئی۲۰۱۰ء) مدیر:ارشد خالد

۱۰۔مطالعۂ خاص۔**ایک کتاب:''عمرِ لاحاصل کا حاصل''**۔مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔کتاب نمبر۱۳۔مارچ۲۰۱۱ء۔ مدیر و مرتب:ارشد خالد

....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُوئے حجاز

(سفرنامہ)

حیدرقریشی

ناشر
سرورادبی اکادمی ۔جرمنی
Sarwar Adabi Akademi,Germany

تقسیم کار
میاں محمد بخش پبلشرز محلّہ رحیم آباد۔خانپور۔۶۴۱۰۰ پاکستان

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

Soo-e-Hejaz (Safar Nama)
By : Haider Qureshi
Rossertstr.6, Okriftel,
65795 Hattersheim,GERMANY.

(اس کتاب کا پہلا ایڈیشن عمرہ کے احوال پر مشتمل تھا۔اس دوسرے ایڈیشن کے آخر میں حج کی رُوداد بھی شامل ہے)

نام کتاب: سُوئے حجاز(سفرنامہ)
مصنف: حیدرقریشی
اشاعت اول (دہلی سے): ۲۰۰۰ء
اشاعت دوم: ۲۰۰۴ء
سرورق: کاشف الہدیٰ (امریکہ)
قیمت: ایک سوروپے

انٹرنیٹ ایڈیشن
۲۶؍دسمبر۲۰۱۳ء

انتساب

حضرت ابراهیم علیه السلام

حضرت بی بی هاجره۔۔ اور

حضرت اسماعیل علیه السلام کے نام!

یوں روشن جان هوئی

دل میں کهیں جیسے

مغرب کی اذان هوئی

ترتیب

یا آنکھوں میں خاک برستی تھی حیدرؔ
یا اب پیہم اشک دعا میں گرتے ہیں

ابتدائیہ

اُردو ادب میں دو طرح کے سفر نامے لکھے جا رہے ہیں۔ بہت اچھے اور بہت بُرے۔سفر نامہ نگاری کے ایسے ماحول میں میرا سفر نامہ لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ میں اچھے سفر ناموں کو پڑھ کر خود کو بے مایہ محسوس کرتا ہوں اور بُرے سفر نامے پڑھ کر عبرت پکڑتا ہوں۔ بُرے، بھلے کی تمیز کئے بغیر لکھنا چاہتا تو دہلی کا سفر نامہ اور جرمنی کا سفر نامہ دو کتابیں تو آسانی سے تیار ہو سکتی تھیں۔ پھر انگلینڈ، فرانس، ہالینڈ، سوئیٹزرلینڈ جیسے ممالک یہاں سے کون سے دور ہیں۔ جب جی چاہے ان ممالک میں ایک دو ہفتے گذار آیئے اور سفر نامہ لکھ لیجئے۔ سو یکم دسمبر ۹۶ءتک جب مجھے عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے روانہ ہونا تھا، میرا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا کہ میں کوئی سفر نامہ لکھوں گا۔ میں اس سفر کو اپنی ذات اور اپنے احباب تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔لیکن یہ سفر میرے لئے صرف ایک سفر اور مذہبی فریضے کی ادائیگی نہ رہا۔ میں نے اپنے جسم کے ساتھ اپنے دل، اپنے ذہن اور اپنی روح کو پے در پے انوکھے تجربوں سے گذرتے دیکھا۔ میں نے جسمانی سطح پر سفر کرنے کے ساتھ فکری اور روحانی طور پر بھی سفر کیا.... پھر اس مختلف الجہات سفر کو کسی ایک نقطے پر یک جا ہوتے بھی محسوس کیا۔سو یہ اسی روحانی تجربے کی شدت تھی جس نے مجھے یہ سفر نامہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔

مذہبی عقائد کے سلسلے میں اصولاً میں اعتدال پسندی کو بہتر سمجھتا ہوں۔ انتہا پسند مذہبی رویّہ کوئی بھی اختیار کرے، اپنے مخالفوں کو دکھ پہنچانے کے باوجود یہ رویّہ بالآخر

اپنے ہی مسلک کو نقصان پہنچاتا ہے۔مختلف فرقوں کے مختلف نظریات اور تصورات بنیادی طور پر جزوی سچائیاں ہیں، سکّے کا ایک رُخ ہیں اور اُس رُخ کی مناسب ترجمانی ان کے ذریعے ہو جاتی ہے۔لیکن کسی ایک جزوی سچائی کو مکمل سچائی مان کر کسی دوسری جزوی سچائی کو جبراً دبانا مناسب نہیں ہے۔ میرے اس سفر نامہ میں مذہب کے تئیں میرے رویوں اور تصورات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سفر کے دوران کہیں میرے تصورات میں مزید پختگی آئی ہے اور کہیں بہتر تبدیلی آئی ہے۔ تبدیلیاں غور و فکر کے ارتقائی عمل کے باعث آئیں تو وہ ہر سطح پر مفید ثابت ہوتی ہیں۔''سوئے حجاز'' میں میرے نظریات اور تصورات جس انداز میں آئے ہیں ان سے اتفاق کرنا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوئی علمی رنگ میں اور عالمانہ انداز سے میری اصلاح کرنا چاہے یا مجھے سمجھانا چاہے تو میں دیانتداری کے ساتھ مزید سمجھنے کے لئے، مزید غور و فکر کے لئے تیار ہوں۔لیکن اگر کوئی کسی رنگ میں بلیک میل کر کے یا ڈنڈے کے زور سے مجھے اپنی بات منوانا چاہے تو میں ایسے کسی بھی شخص کے فرمودات پر اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ابھی تک میں مجموعی طور پر مختلف مذہبی مسالک کے تعلق سے ایک اصولی بات کر رہا تھا۔اب مجھے اُس دانشور طبقے کے حوالے سے بھی کچھ عرض کرنا ہے جو مذہب بیزار ہے۔

جو لوگ فیشن کے طور پر خود کو ملحد یا دہریہ کہلوا کر خوش ہوتے ہیں اور اسی الحاد کو اپنی دانشوری سمجھتے ہیں جبکہ یہ سب کچھ بے حد مصنوعی ہوتا ہے مجھے ایسے دانشوروں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا لیکن وہ لوگ جو کسی فیشن کے طور پر نہیں بلکہ فکری اعتبار سے اس سطح پر ہیں کہ مذہب سے بیزاری محسوس کرتے ہیں ان کے حوالے سے مجھے چند باتیں ضرور کرنی ہیں۔ایسے دانشوروں کا خیال ہے کہ مقاماتِ مقدسہ پر جا کر ہمیں اپنے اندر جو تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں وہ ان مقامات سے وابستہ ہماری گہری عقیدت کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔بجا ارشاد.....اگر ایسے مقامات پر جا کر کسی کو ذہنی، قلبی اور روحانی بالیدگی نصیب ہوتی ہے، اس کی حالت میں بہتر تبدیلی آتی ہے تو خود جدید نفسیاتی علم کی رو سے بھی یہ ایک بہترین علاج ہے۔بعض نفسیاتی امراض کا اگر اس طریقے سے علاج ہو جاتا ہے تو اس سے مذہب سے لاتعلق، جدید علوم سے بہرہ ور ہمارے دانشوروں کو خوشی

ہونی چاہیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے امّتِ کلیم، امّتِ مسیح اور امّتِ محمدؐیہ.....تینوں مذاہب میں گہری محبت اور عقیدت پائی جاتی ہے۔ مذہب سے متنفر دانشوروں کے لئے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت میں عظیم انقلابی کردار موجود ہے۔ حضرت ابراہیم کے دور میں دو قبیح رسمیں معاشرتی سطح پر فروغ پانے لگی تھیں۔ بہت سے لوگ رہبانیت کے زیر اثر تجرد پسندی کی طرف مائل ہونے لگے تھے، بعض انتہا پسند اپنی مجردانہ زندگی کو ہر شبہ سے بالا رکھنے کے لئے عضوِ مخصوصہ کو ہی کٹوانے لگے تھے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری.....ایسے ماحول میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس راہبانہ رسم کا خاتمہ کرنے کے لئے اس کی تہذیبی و ثقافتی علامت کے طور پر رسم ختنہ شروع کرادی۔

اُسی دور میں ایک اور بے رحمانہ رسم یہ تھی کہ کسی قربانی کے حوالے سے بڑے بیٹے کو ذبح کر دیا جاتا تھا۔ سو میرے دانشور دوست اگر اس تناظر میں ہی غور کریں تو حضرت ابراہیم کے ذریعے حضرت اسماعیل کا قربان ہو جانے کے لئے راضی ہونا اور پھر آخری مرحلہ میں بیٹے کو ذبح ہونے سے بچانے کے لئے خدا کی طرف سے دنبہ آ جانا اور پھر انسانی قربانی کی جگہ جانوروں کی قربانی کا رائج ہو جانا یہ بھی انسانی قربانی کے خلاف ایک انقلابی قدم بنتا ہے......سو ہمارے دانشور احباب اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ دو اقدامات کو غور سے دیکھیں تو انہیں احساس ہوگا کہ اُس زمانے کی محدود دنیا میں نسلِ انسانی خود ہی اپنے خاتمہ کی طرف جا رہی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مذکورہ انقلابی اقدامات سے نسلِ انسانی کے پھلنے پھولنے کے امکانات کو نمایاں کر دیا۔ یہ میں ان دوستوں کے انداز میں بات کر رہا ہوں جو مذہب سے بیزار ہیں۔ انہیں ان کے مخصوص اندازِ نظر کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت سے آگاہ کیا ہے۔ ذاتی طور پر میں ختنہ کے حکم، ذبیحہ کے حکم اور پھر بیٹے کی جگہ دنبہ کی قربانی کے حکم کو خدائی احکامات میں شمار کرتا ہوں۔

''سوئے حجاز'' میں کہیں کہیں میرا ردِّعمل شدید بھی ہوگیا ہے۔ حقیقتاً یہ ان متشدد

رویوں کا ردِّعمل ہے جو مجھے اپنی ذاتی زندگی میں یا اس سفر کے دوران پیش آتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کسی کی اس سے دلآزاری ہوتی ہے تو میں پیشگی معذرت کئے لیتا ہوں۔ تاہم میرے ردِّعمل سے میرے فکری رجحانات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی میں کبھی کبھار میں مذہبی امور میں کسی حد تک شوخ بھی ہو جاتا ہوں۔ بعض عقلی باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن خدا جانے کعبہ شریف کی دیواروں میں کیا بھید تھے کہ کعبہ کا سامنا ہوتے ہی میری ساری شوخیاں اور عقلی باتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ پھر میرے ساتھ وہاں ایسے ایسے اسرار رونما ہوئے اور اتنے انوکھے روحانی تجربے ہوئے کہ انہیں پوری طرح بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

روانگی سے پہلے میرے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ مکہ میں جلالی شان کا سامنا ہوگا۔ وہاں شاید میں زیادہ دیر تک ٹک نہیں پاؤں گا اور مدینہ کی جمالی شان میں زیادہ مزہ آئے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مدینہ کی جمالی شان میں بھی بہت مزہ آیا لیکن کعبہ شریف نے تو جیسے مجھے باندھ لیا تھا۔ محبت کی، عقیدت کی عجیب سی ڈور تھی۔ بقول شاعر:

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے

میں نے ''سوئے حجاز'' میں اسی ''عالمِ نو'' کی چند جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا یہ سفر ویسے تو جسمانی، فکری اور روحانی تینوں سطحوں پر ہوا تھا اور تینوں سطحوں پر اس کے اثرات مجھے آج بھی محسوس ہوتے ہیں لیکن اس سفر کے روحانی اثرات تو جیسے میری روح کی گہرائیوں تک رچے بسے ہوئے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ بعض امور میں اختلاف رکھنے کے باوجود میرے قارئین، میرے اس سفر میں اپنی شرکت کو محسوس کریں گے۔

> ''اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں۔ کامل ایمان اور سچا یقین اور کشادہ رزق اور عاجزی کرنے والا دل، اور تیرا ذکر کرنے والی زبان، اور حلال اور پاک روزی اور سچے دل کی توبہ اور موت سے پہلے کی توبہ اور موت کے وقت کا آرام اور مرنے کے بعد مغفرت اور

رحمت اورحساب کے وقت معافی اور جنت کا حصول اور دوزخ سے
نجات.... یہ سب کچھ میں مانگتا ہوں تیری رحمت کے وسیلہ سے،اے
بڑی عزت والے،اے بڑی مغفرت والے،اے پروردگار میرے
علم میں اضافہ کراور مجھے نیک لوگوں میں شامل فرمادے‘‘(آمین)
میں طوافِ کعبہ شریف کے ساتویں چکر کی اس مخصوص دعا کے ساتھ اپنے ابتدائیہ کو مکمل
کرتا ہوں!

خاکسار
حیدرقریشی
(مقیم جرمنی)

☆☆☆

ارادے سے روانگی تک

۱۹۹۱ء کے وسط میں مبارکہ اور ہمارے تین بچوں رضوانہ، ٹیپو، مانو کا جرمنی پہنچ جانا ہم سب کے لئے بیک وقت خوشی اور پریشانی کا موجب تھا۔خوشی اس لیے کہ یورپ کے دروازے ہمارے خاندان کے لئے کُھل رہے تھے، پریشانی اس لئے کہ میں اور دونوں بڑے بیٹے شعیب اور عثمان، ہم تینوں پاکستان میں تھے۔ظاہری حالات کے لحاظ سے ہمارے جرمنی پہنچنے کا ابھی کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔یوں گویا ہمارے خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا خطرہ موجود تھا۔لیکن پھر خدا نے کرم کیا۔ایک طوفانی لہر آئی.....ہم تینوں باپ، بیٹے اس طوفانی لہر میں بالکل بے دست و پا تھے۔اور پھر یوں ہوا کہ طوفان کی زد میں آئے ہوئے باپ بیٹوں کا سہارا ان کا خدا بن گیا۔دنیا والوں کے دیکھتے ہی دیکھتے ہم بے آسرا لوگ یونائیٹڈ نیشنز کے ادارہ برائے مہاجرین کے اس شعبہ کے تحت جرمنی پہنچ گئے جو بچھڑے ہوئے خاندانوں کو ملاتا ہے۔جو لوگ تین تین لاکھ روپے ایجنٹوں کو دے کر چوری چھپے جرمنی پہنچے تھے اور یہاں سیٹ ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ یہ تین افراد اس شان سے جرمنی پہنچے ہیں کہ ان کے لئے ٹکٹ UNHCR نے فراہم کیا، ویزہ خود جرمن حکام نے دیا اور فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر یونائیٹڈ نیشنز کی ایک نمائندہ نے آکر انہیں ریسیو کیا۔

جو کوں راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی

بعد میں عجیب عجیب الزام تراشیاں کی گئیں۔پہلے ایک خاص مسلک کے حوالے سے

کہا گیا کہ انہیں ''اُن لوگوں'' نے ایسی شان وشوکت سے بھجوایا ہے۔ جب یہ جھوٹ ظاہر ہوگیا تو کسی کو اپنے بہتان پر شرمندہ ہونے کی توفیق نہیں ملی اُلٹا مجھے امریکہ کا ایجنٹ کہا جانے لگا۔(کاش امریکہ اپنی کوئی چھوٹی موٹی ایجنسی مجھے دے ہی دے۔ موجودہ محنت مزدوری کی مشقت سے تو آرام ملے گا) بہتان طرازی کرنے والوں کو خدا تعالیٰ کا یہ فرمان یاد نہیں آیا کہ **وَتُعِزّ من تشاء وتذلّ من تشاء بیدك الخیر۔ اِنّ الله علیٰ کلّ شی ءِ قدیر**۔ جرمنی پہنچنے کے بعد نہ صرف مجھے خدا کے فضل وکرم سے قانونی تحفظات مل گئے بلکہ میرے کیس کی بنیاد پر مبارکہ اور بچوں کا کیس بھی منظور کرلیا گیا جو تین برسوں سے لٹکا ہوا تھا۔ ان تحفظات کے علاوہ بھی خدا کے فضل اور احسانات کی ایک پھوار تھی (اور اب بھی ہے) جس نے ہماری زندگی کے صحرا کو سیراب کردیا تھا۔ ان سارے احسانات کی شکرگزاری کے لئے میرے اور مبارکہ کے درمیان طے ہوا تھا کہ ہم دونوں مکہ شریف اور مدینہ شریف جائیں گے۔ عمرے کی سعادت حاصل کریں گے، مقاماتِ مقدّسہ کی زیارت کریں گے۔ دسمبر ۱۹۹۵ء میں جانے کا ارادہ تھا لیکن اس سے دو ماہ پہلے میرے چھوٹے بھائی اعجاز نے ایک بھاری رقم بطور قرض مانگ لی۔ میں شش وپنج میں تھا، مبارکہ نے کہا ہماری عمرہ کرنے کی نیت پکی تھی۔ خدا نیتوں کا حال جانتا ہے۔ آپ اپنے چھوٹے بھائی کی ضرورت پوری کردیں۔ خدا کو ہماری نیکی پسند آ گئی تو اس سال نہ ہوسکنے والے عمرہ کو بھی قبول فرمالے گا اور اگلے برس سچ مچ عمرہ کے لئے جانے کے وسائل بھی عطا کردے گا اور جانے کی توفیق بھی بخش دے گا۔ چنانچہ میں نے مبارکہ کے کہنے پر عمل کیا اور اسکی نیت کے مطابق دسمبر ۱۹۹۶ء میں ہمیں عمرہ پر جانے کی سعادت نصیب ہوگئی۔

پہلے السعودیہ ائرلائن کا ٹکٹ خریدا۔ یکم دسمبر سے ۱۲ دسمبر تک کا عمرہ ٹکٹ تھا۔ ۲۶ رنومبر ۱۹۹۶ء کو ٹکٹ اور پاسپورٹ لے کر سعودی سفارت خانہ سے ویزہ کے حصول کے لئے روانہ ہوئے۔ بون میں سفارت خانوں والی سائڈ پر جانے کے لئے یا تو ایک طویل چکر کاٹ کر پُل پر سے گذرنا ہوتا ہے یا پھر دریا میں موجود فیری (اسٹیمر) پر کار سمیت سوار ہوکر دوسرے کنارے تک جانا ہوتا ہے۔ میرے داماد عزیزم حفیظ کوثر مجھے اور مبارکہ کو سعودی عرب کے سفارت

خانہ تک اپنی کار میں لئے جارہے تھے۔ دریائے رائن کے کنارے پہنچے تو وہ کار کو سیدھا فیری کے اندر لے گئے۔ وہاں پہلے بھی متعدد کاریں کھڑی تھیں۔ میں اپنی کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا سامنے کا نظارہ کررہا تھا۔ یکا یک ایک انوکھا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ دریا کا دوسرا کنارہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہاں درختوں کا بڑا اور گھنا ذخیرہ تھا۔ پاکستان میں ٹرین کا سفر کرتے ہوئے تو میں نے کئی بار دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ ہماری گاڑی کے ساتھ ساتھ نیم دائرہ سا بنائے ہوئے بھاگتے ہیں اور پھر جیسے ہار کر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ لیکن یہ نظارہ تو کچھ اور ہی تھا۔ سچ مچ زمین اپنے مدار پر گھومتی نظر آئی۔ درختوں کا جھنڈ ایک مستانہ وقار کے ساتھ جیسے کسی مرکز کا طواف کرنے لگا تھا۔ پہلے تو میں نے سمجھا شاید یہ کوئی کشفی نظارہ ہے لیکن جیسے ہی میں نے اپنے دائیں طرف گردن گھمائی، دریا کا پانی نظر آیا اور ساتھ ہی یہ واضح ہوگیا کہ ہماری فیری حرکت میں آ چکی ہے۔ کار میں بیٹھے ہونے کے باعث نہ تو ہمیں فیری اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی اور نہ ہی اس کے حرکت میں آنے کا احساس ہوا تھا۔ کوئی ہلکا سا جھٹکا بھی نہیں لگا تھا۔ حقیقت واضح ہوجانے کے باوجود دوبارہ سامنے دیکھتے ہوئے پھر ایسے ہی لگ رہا تھا کہ زمین کو اس کے اپنے مدار پر گھومتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ تب مجھے گلیلیو کی یاد آئی۔ گلیلیو نے اس سچائی کا اظہار کیا تھا کہ ہماری زمین مرکزِ کائنات نہیں ہے۔ زمین گول ہے اور اپنے سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ یہ انکشاف کسی مذہبی عقیدے پر براہ راست ضرب نہیں لگا رہا تھا اس کے باوجود گلیلیو کے معاشرے کے مذہبی حلقوں میں قیامت برپا ہوگئی۔ زمین کو مرکزِ کائنات اور خود کو اشرف المخلوقات سمجھنے والوں کو محسوس ہوا کہ زمین کی مرکزیت کی نفی ہوئی تو ان کے اشرف المخلوقات ہونے کی بھی نفی ہوجائے گی۔ سو اپنے انسانی شرف کی حفاظت کے لئے گلیلیو کو مرتد اور واجب القتل قرار دے دیا گیا۔ اُس زمانہ میں زمین پر خدا کی نیابت کے دعویدار نے اس قتل نامہ پر عمل درآمد کا حکم دے کر خود ہی شرف انسانی کی نفی کردی۔ گلیلیو اپنی سچائی کو جاننے کے باوجود فتویٰ کفر، سماجی دباؤ اور بلیک میلنگ کے سامنے گھبرا گیا۔ اس نے باقاعدہ طور پر معافی مانگی، معافی قبول کرنے کی التجا کی۔ میں گناہ گار ہوں۔ بے شک کفر کا مرتکب ہوا ہوں۔ اپنے سارے گناہوں کی غیر مشروط معافی مانگتا ہوں۔

نہ یہ زمین گول ہے، نہ سورج کے گرد گھومتی ہے بس مجھے معاف کر دیں۔لیکن گلیلیو کے سارے معافی نامے ’’خداوند یسوع مسیح‘‘ کے خلیفہ نے بڑی حقارت کے ساتھ مسترد کر دیئے۔اس بدبخت کی معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اسے ذلّت کے ساتھ ہلاک کیا جائے اور پھر گلیلیو کو ہلاک کر دیا گیا۔لیکن زمین تو پھر بھی گول ہی رہی اور آج بھی سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔اور آج یہ کرۂ ارض تو کیا ہمارا پورا نظامِ شمسی بھی اس عظیم تر کائنات میں ایک حقیر سی شے لگتا ہے۔ویسے گلیلیو کے عہد میں ’’خداوند یسوع مسیح‘‘ کے نائب کا ہی قصور نہیں، ہر دور میں مذہبی انتہا پسندی اور دانش کا ٹکراؤ رہا ہے۔وقتی طور پر ہمیشہ دانش ہی کو ذلیل کیا گیا ہے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ہمیشہ دانش کے ساتھ روا رکھی جانے والی ساری ذلّت آخر مذہبی چیرہ دستوں کی ذلّت اور رسوائی بنی ہے....میں گلیلیو کے دور سے اپنے آپ تک پہنچا تو سعودی سفارت خانہ آچکا تھا۔

سفارت خانے میں ویزہ کے حصول کے لئے جب کاغذات جمع کرائے تو ایک دواڑ چنیں بیچ میں آ گئیں۔جرمنی میں ہر انسان کی نجی زندگی کا احترام کیا جاتا ہے۔پاسپورٹ پر نہ تو کسی کی ولدیت لکھی جاتی ہے اور نہ مذہب کا کوئی خانہ ہوتا ہے۔میاں بیوی کے پاسپورٹوں پر ایک دوسرے کا نام اسی صورت میں لکھا جاتا ہے جب دونوں کے کیس منظور شدہ ہوں۔میرا پاسپورٹ جب بنا تھا تب مبارکہ کا کیس منظور نہیں ہوا تھا اس لئے میرے پاسپورٹ پر اس کا نام درج نہیں ہو سکا۔جب مبارکہ کا کیس منظور ہو گیا تب اس کے پاسپورٹ میں اتفاقاً میرا نام درج ہونے سے رہ گیا۔ہمارے لئے یہ کوئی اہم مسئلہ بھی نہیں تھا....لیکن اب سفارت خانہ سعودی عرب والوں کا مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں کو میاں بیوی کیسے مانا جائے۔ہمارا نکاح فارم تو ۱۹۷۳ء میں خانپور میں آنے والے قیامت خیز سیلاب میں بہہ گیا تھا اور نکاح نامہ کا ثبوت تو میں یو۔این۔او والوں کو بھی فراہم نہیں کر سکا تھا۔پاسپورٹ پر بے شک اندراج نہیں تھا لیکن جرمن حکام نے ہمیں میاں بیوی مان لیا تھا۔سعودی سفارت خانہ والوں سے میں نے کہا کہ ہمارے پانچ بچے ہیں اور اب وہی ہمارا نکاح نامہ ہیں۔کہنے لگے چلیں ان بچوں کے کاغذات دکھا دیں۔میں نے کہا اگر مجھے اس الجھن کا علم ہوتا تو پانچوں بچوں سمیت کاغذات لے کر آتا۔میرا خیال ہے میرے لب و لہجے سے انہیں

اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم میاں بیوی ہیں وگرنہ اتنا بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل نہ ہوتا۔سفارت خانہ کے متعلقہ افسر نے کہا دوپہر دو بجے کے بعد آ کر ویزہ لے جائیں۔سو ہم اطمینان سے بون شہر میں گھومنے پھرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔پہلے رائن دریا کے اِدھر والے کنارے پر گئے۔وہاں سے حدِ نگاہ تک آنے والے سارے مناظر کو زاویے بدل بدل کر دیکھا، وہیں ’’ناشتہ کم لنچ‘‘ کیا۔اس کے بعد مارکیٹوں کے چکر لگانے لگے۔تھوڑی بہت خریداری کر لی۔ڈیڑھ بجے تک ہم لوگ واپس سعودی سفارت خانے پہنچے۔پونے دو بجے متعلقہ آفس سے رجوع کیا۔مقررہ وقت دو بجے سے پہلے ہی ہمیں ویزہ مل گیا۔خدا کا شکر ادا کیا اور خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔

۲۶؍نومبر سے ۳۰؍نومبر تک ارضِ حجاز جانے کے لئے چھوٹی موٹی تیاری کرتے رہے۔یکم دسمبر کو گیارہ بجے ہم اپنی مقامی ٹرین S1 (ایس۔ون) پر سوار ہو کر اپنے شہر Hattersheim سے فرینکفرٹ آئے۔یہاں سے پھر ایک اور ٹرین S8 (ایس۔ایٹ) لی اور ائیر پورٹ جا پہنچے۔منجھلا بیٹا عثمان ایئر پورٹ تک ہمارے ساتھ آیا تھا جبکہ شعیب اس لئے گھر پر رہا تھا کہ چھوٹے بھائی بہن کا خیال رکھ سکے۔ایک دو دن کے بعد رضوانہ نے فُلڈا سے ہمارے گھر آ جانا تھا تاکہ ہماری غیر حاضری میں سارے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ایئر پورٹ کی ساری کارروائی سے گذرنے کے بعد ہم ڈیڑھ بجے السعودیہ کے جہاز میں سوار ہوئے اور اپنی سیٹیں سنبھال لیں۔

جہاز اُڑنے لگا تو دل کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ہوائی سفر کی وجہ سے نہیں بلکہ سفر کے رُخ کی وجہ سے۔پھر جب (غالباً) پائلٹ نے اُڑان بھرنے کے ساتھ ہی دعاء السفر پڑھنی شروع کی تو اسپیکر سے نشر ہوتی ہوئی اس دعا کے الفاظ نے ایسا اثر کیا کہ مجھے لگا میری روح جسم سے الگ ہو کر مگر میرے ساتھ ساتھ پرواز کر رہی ہے۔مجھ جیسا گناہ گار ربِ کعبہ کے گھر حاضری دینے جا رہا تھا۔کہاں میں کہاں وہ مقام اللہ اللہ! بے اختیار ہونٹوں سے تسبیح و تحمید ہونے لگی......یہ کیفیت اس وقت ٹوٹی جب مبارکہ نے بتایا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔اصل میں حرمین شریفین جانے کی خوشی میں مبارکہ نے صبح کا ناشتہ نہیں کیا تھا۔ایئر پورٹ تک پہنچنے کے چکر میں

دوپہر کا کھانا بھی رہ گیا تھا اور اب اسے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ ایئر ہوسٹس کو بلا کر اس صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے کہا اگر گھبراہٹ زیادہ ہے تو فوری طور پر کوئی جوس لا دیتی ہوں ورنہ آدھے گھنٹہ تک کھانا لے آتی ہوں۔ سو پہلے جوس آ گیا۔ پھر کھانا...اور مبارکہ کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔

جرمنی اور سعودی عرب میں وقت کے حساب سے دو گھنٹے کا فرق ہے۔ جب ہم دو بجے دوپہر کو جرمنی سے روانہ ہوئے تب جدہ میں سہ پہر کے چار بجے تھے۔ تقریباً پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ دورانِ سفر اچانک ایک صاحب نے اٹھ کر اذان دینا شروع کر دی تو اندازہ ہوا کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ اذان کے بعد تین صاحبان نے سیٹوں کا درمیانی راستہ روک کر نماز باجماعت شروع کر دی۔ ایک جماعت ختم ہوئی تو تین افراد کی ایک اور جماعت کھڑی ہو گئی اور اس جماعت کے بعد تین افراد کی ایک اور جماعت....اس دوران باتھ روم کی طرف جانے والے لوگوں کو پریشانی کا سامنا رہا۔ ان پریشان لوگوں میں مسلم بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی اور مسافروں کی خدمت پر مامور جہاز کا عملہ بھی شامل تھا۔ اس عرصہ کے دوران اس لائن میں سب کا راستہ بند رہا۔ باقی سب کو تو خیر تھوڑی بہت پریشانی ہوئی ہو گی، البتہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی تبلیغ کا ایک خاموش منظر ضرور بن گیا تھا۔ اثر ہوا تھا یا نہیں؟....یہ تو وہی غیر مسلم جانیں لیکن ابلاغ بہر حال ہو گیا تھا۔ مغرب کی نماز کے وقت پھر یہی سین دہرایا گیا۔ میں نے سیٹ پر بیٹھ کر ہی نماز پڑھ لی تھی بلکہ سفر کی رعائت سے فائدہ اٹھا کر جمع بھی کر لی تھی۔ سلام پھیرا تو دیکھا کہ نماز باجماعت والے صاحبان میں سے بعض لوگ مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

جدّہ پہنچے تو وہاں رات کے نو بج چکے تھے۔ جرمنی میں تب رات کے سات بجے ہوئے....ایئر پورٹ سے باہر آنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ باہر ٹیکسی والوں کا ہجوم تھا۔ مکّہ تک جانے کے لئے کوئی ۱۵۰ ریال مانگ رہا تھا، کوئی ۲۰۰ ریال مانگ رہا تھا اور کوئی ۲۵۰ ریال..... ایک ٹیکسی والے سے طے ہوا کہ وہ ایک سواری اور ساتھ بٹھا لے اور ہمارا معاملہ ۱۰۰ ریال میں طے ہو گیا۔ یوں ہم نے پہلے مرحلے میں کم از کم ۵۰ ریال کی بچت کر لی۔

رستے میں میقات کے مقام پر رُکنا تھا۔ وہاں سے احرام خریدا۔ عمرہ کے بارے میں معلوماتی اُردو کتابچہ خریدا، غسل کیا، احرام باندھا.....مبارکہ کو صرف غسل کرنا تھا کیونکہ خواتین اپنے عام لباس میں عمرہ کرتی ہیں۔ غسل خانوں سے باہر صفیں بچھی ہوئی تھیں، وہاں دو نفل ادا کئے۔ عمرہ کی نیت کی اور تلبیہ شروع کر دی۔ **لبیک اَللّٰھم لبیک**....

مکہ شریف سے پہلے دو مقامات پر کاغذات کی جانچ پڑتال ہوئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے خود ہی سارے معاملات نمٹائے۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ حرم شریف کے سامنے کی ایک سڑک پر ہم ٹیکسی سے اترے، وہاں سے قریب ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا۔ یہ صرف رہائش فراہم کرنے والے ہوٹل ہیں۔ کھانا، چائے وغیرہ یہاں نہیں ملتی۔ رہائش کافی آرام دہ ہوتی ہے۔ ہر کمرہ ایئر کنڈیشنر، ریفریجریٹر، گیس سلنڈر، چولہا، اٹیچ باتھ روم کی سہولیات سے آراستہ، اسے آپ جدید طرز کی سرائے بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے جو کمرہ پسند کیا اس کا کرایہ قدرے زیادہ تھا لیکن کمرہ کشادہ تھا۔ اگر ہم سارے افراد خانہ ہوتے تو اسی کمرے میں پورے آ جاتے۔ سامان سیٹ کرنے کے بعد میں باہر آیا تو قریب ہی ایک ایسا ہوٹل دیکھا جہاں کھانا تیار ہوتا تھا۔ ہمارے رہائشی ہوٹل کا مالک بنگالی تھا، اردو بول بھی سکتا تھا اور سمجھ بھی لیتا تھا۔ کھانے والے ہوٹل کا مالک سرائیکی نکلا۔ پہلے مرحلے میں ہی اپنے وطن اور اپنے شہر کی خوشبو سی آنے لگی۔ لیکن ارضِ حجاز بھی تو میرا ہی وطن تھا۔ میرے آباواجداد نے تبلیغ اسلام کی نیت سے اس ارضِ مقدس کو خیر باد کہا تھا یا اسلامی لشکر میں شامل ہونے کے باعث انہیں یہ دھرتی چھوڑنا پڑی، اس کے بارے میں تو وہی بہتر جانتے ہوں گے، میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ آخر کار وہ ہندوستان میں آ بسے تھے اور پھر اس قدیم ہندوستان کی مٹی کے جادو نے انہیں اپنا اسیر کر لیا تھا۔ ہندوستان کے قدیم تاریخی تسلسل میں دیکھیں تو باہر سے آنے والی بڑی اقوام میں آریائی، عرب (اور ان کے لشکروں میں شامل دوسری مسلم اقوام) اور انگریز شامل تھے۔ ان میں سے جو اس دھرتی میں رچ بس گئے وہ اسی کا حصہ ہو گئے۔ جو حصہ نہیں بن سکے انہیں نہ اس دھرتی نے قبول کیا نہ اس کے بیٹوں نے....حصہ نہ بن پانے کی نمایاں مثال انگریز قوم کی ہے اور ان کے لئے برصغیر پاک و ہند کے عوام کا فیصلہ اب تاریخ

کا حصہ بن چکا ہے۔اس دھرتی کا حصہ نہ بن سکنے والوں کواس دھرتی نے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔
بہرحال...سرائیکی ہوٹل کا کھانا عمدہ بھی تھااور سستا بھی...کھانا کھا کر چائے پی اور پھر ہم **لَبیك اَللٰھم لَبیك** کہتے ہوئے حرم شریف کی طرف جانے کے لئے نکل پڑے۔ہمیں مسجد الحرام کا جو بڑا گیٹ قریب پڑتا تھا وہ ''باب الملک فہد'' تھا....

☆☆☆

پہلا عمرہ

روایت ہے کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دعا مانگی جائے وہ قبول کرلی جاتی ہے۔
اس چھوٹے سے سفر کے دوران مجھے حضرت علیؓ سے لے کر امام ابوحنیفہؒ تک کئی بزرگان امّت کی باتیں یاد آتی رہیں۔کہیں میری رہنمائی کرنے والی اور کہیں دل کی گرہیں کھولنے والی باتیں.....
مبارکہ کو میں نے بتادیا تھا کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی اپنی اہم ترین دلی مراد کے لئے دعا مانگ لینا۔دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہم ''باب الملک فہد'' سے گذرنے لگے۔جیسے ہی خانہ کعبہ کی پہلی جھلک دکھائی دی میں نے اپنی دعا مانگ لی۔بعد میں جب میں نے مبارکہ سے پوچھا کہ آپ نے کیا دعا مانگی تھی؟ تو جواب ملا اپنے بچوں کے لئے دعا مانگی تھی۔پھر مبارکہ نے مجھ سے میری دعا کے بارے میں دریافت کیا۔میں نے بتایا کہ میں نے صرف اتنی دعا مانگی ہے''الٰہی! مجھے مستجاب الدعوات بنادے''مبارکہ نے اس کا مطلب پوچھا تو میں نے کہا یوں سمجھ لیں کہ الٰہی میں جب کوئی دعامانگوں اسے قبول کرلیا کرنا.....مبارکہ ہنس پڑی اور کہنے لگی آپ نے اللہ میاں کے ساتھ چالاکی کرلی ہے.... میں نے کہا اگر یہ چالاکی ہے تو امام ابوحنیفہؒ بھی بہت پہلے یہی دعا مانگ چکے ہیں.....اب میں نے بھی یہ دعا مانگ لی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔
ہم مطاف تک پہنچے تو خانہ کعبہ کا جاہ وجلال اپنا اثر دکھانے لگا۔سامنے رکن یمانی تھا۔جاتے ہی پہلے اسے بوسہ دیا۔وہاں سے حجر اسود کی طرف بڑھے اور مخصوص دعاؤں کے ساتھ وہاں سے طوافِ کعبہ کا آغاز کیا۔پہلے چکر ہی میں نہ صرف میں نے خود حجر اسود کو بوسہ دیا بلکہ مبارکہ کو بھی کھینچ

کھانچ کر وہاں تک لایا اور اس نے بھی بوسہ کی سعادت حاصل کر لی۔ اس وقت جب یہ احوال تحریر کر رہا ہوں تو مجھے حضرت عمرؓ کے الفاظ یاد آ رہے ہیں جن کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اے حجرِ اسود! میرے نزدیک تو صرف ایک پتھر ہے لیکن میں تجھے اس لئے بوسہ دے رہا ہوں کہ میرے آقا حضرت محمدؐ نے تجھے بوسہ دیا تھا۔۔۔۔ پر سچی بات ہے اُس وقت مجھے کسی ایسی بات کا ہوش نہ تھا۔ بس گرتے پڑتے، جیسے تیسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دُھن تھی۔ اس دھن میں مجھ سے تھوڑی سی ''ہئ مانی'' بھی ہوگئی۔ دو تین لائنیں بنا کر لوگ باری باری بوسہ دے رہے تھے کہ ان لائنوں میں سے ایک دو اور ضمنی لائنیں نکل آئیں۔ یوں افراتفری سی پیدا ہوگئی اور مجھے اس افراتفری سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ مل گیا۔ میں اپنے دائیں، بائیں اطراف والوں کو تھوڑا تھوڑا سا دھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور حجرِاسود پر سر اور ہونٹ رکھ دیئے۔ اُس افراتفری کو یاد کرتا ہوں تو اب اندازہ کر سکتا ہوں کہ قیامت کے دن بھی ایسی نفسا نفسی ہوگی۔ اگر وہاں بھی میرے جیسے گنہگار اسی طرح منزل مراد پا گئے اور دنیا میں جنت کے ٹھیکیدار اور دعویدار ویسے ہی لائن حاضر رہ گئے تو کیا ہوگا۔

رند بخشے گئے قیامت کو
شیخ کہتا رہا حساب حساب

سات چکر پورے کرنے کے بعد خانہ کعبہ کے دروازہ (ملتزم) کے سامنے دو نفل پڑھے۔ مخصوص دعاؤں کے ساتھ اپنی دلی دعائیں کیں، خدا کے بے پایاں احسانات کا شکر ادا کیا۔ پھر تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر مقامِ ابراہیم کے پاس دو نفل ادا کئے۔ وہاں بھی دعاؤں کی توفیق ملی۔ پھر آبِ زم زم پیا۔ حجرِاسود کے سامنے حاضری دی۔ دور سے بوسہ دیا اور ''الصفا'' گیٹ سے گذر کر کوہ صفا تک پہنچے۔ سعی کی نیت کی، تہلیل و تکبیر پڑھی اور سعی شروع کی۔ مروہ کی طرف جاتے ہوئے مجھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو اس وادیٔ غیر ذی ذرع میں چھوڑ جانا یاد آیا، پھر بھوک، پیاس اور تنہائی کا خوف.... حضرت اسماعیل کا تڑپنا اور حضرت ہاجرہ کی بے تابی.... کبھی صفا کی چوٹی پر جا کر کسی امدادی قافلے کی راہ دیکھنا اور کبھی دوسری سمت دوڑ کر جانا اور مروہ کی چوٹی سے کسی قافلے کی راہ تکنا.... ہزاروں برس پہلے کے اس مکہ کے

ویران بیابان اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو درپیش دردناک اور خوفناک صورتحال کو جیسے لفظوں میں چاہیں بیان کر لیں، اُن دونوں کے دُکھ درد کی کیفیات کی ترجمانی ہو ہی نہیں سکتی۔ بس ان کیفیتوں کو ایک حد تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سعی کے سات چکروں کے دوران مجھے بار بار بی بی ہاجرہ کی تڑپ اپنے سینے میں محسوس ہوتی رہی اور اسی حالت میں دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔ میرے اندر کے صحرا میں میرے آباء واجداد کے جدِّ امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی برکت سے ایک چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔ دل کا اور آنکھوں کا رابطہ ہو گیا تھا۔ میرے اندر کے صحرا کی سلگتی ہوئی ریت سیراب ہونے لگی تھی۔

مردہ کی طرف ساتواں چکر پورا ہوتے ہی ہمارا عمرہ مکمل ہو گیا (الحمد للہ)۔ عمرہ مکمل ہونے پر کسی سائڈ سے تھوڑے سے بال کاٹنے ہوتے ہیں۔ اسے بال ترشوانے کی علامت کہہ سکتے ہیں۔ وہاں بعض خواتین اس کارِ خیر کی تکمیل کے لئے ہاتھ میں قینچیاں لئے کھڑی تھیں۔ ان سے قینچی لے کر میں نے مبارکہ کے تھوڑے سے بال کاٹے اور مبارکہ نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر میرے تھوڑے سے بال کاٹے۔ قینچی واپس کرتے وقت اس خاتون کو ایک ریال بطور ہدیہ یا عطیہ نذر کرنا پڑا۔ (اگلے دن پھر ہم نے اپنی قینچی خرید لی)۔

عمرہ مکمل ہونے کے بعد ہم ''زم زم کا کنواں'' دیکھنے کے لئے نیچے کی طرف گئے انڈر گراؤنڈ حصے میں چھوٹی چھوٹی ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی زنجیر سے بندھے ہوئے گلاس رکھے تھے۔ یہ 'محبت کی زنجیر' تھی تا کہ 'مشترکہ محبت' کو کوئی ایک عاشق اپنی ذاتی ملکیت نہ بنا سکے۔ ایک کمرہ میں ایسے لگا کہ چشمہ کا منبع وہاں ہوگا۔ وہاں گئے تو بھاری بھرکم پمپ لگے ہوئے دیکھے۔ پہلے تو خیال آیا کہ مشینوں نے دلوں سے بڑھ کر مذہبی شعائر پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے لیکن پھر سوچا کہ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں ہمہ وقت آتے چلے جانے والے لاکھوں پروانوں کو پانی کی فوری اور عمدہ فراہمی کے لئے ایسا کرنا بے حد ضروری تھا۔ زم زم کے پمپ کو دیکھ کر باہر نکلا تو میں نے باہر سے چشمہ کی طرف جانے والے رستے کی طرف غور سے دیکھا۔ ہائیں۔ یہ سامنے بورڈ پر کیا لکھا ہے؟ میں نے عینک اتار کر اس کے شیشوں کو صاف کیا۔ آنکھوں کو مل کر دیکھا۔ کہیں مجھے

نشہ تو نہیں ہوگیا۔ وفورِ شوق کا نشہ، جس نے طویل سفر کے بعد آرام کرانے کی بجائے دربارِ کعبہ میں لا کھڑا کیا تھا.... بورڈ پر تین لائنوں میں زم زم کا نام لکھا تھا۔

پہلی لائن: بئر زم زم   دوسری لائن: Zam Zam   تیسری لائن: زم زم کا کنواں

تیسری لائن میں اردو عبارت دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ میں تو بئر زم زم کے الفاظ سے ہی سرور حاصل کرنے لگا تھا۔ ایک دوست یاد آ گئے جو کہا کرتے ہیں کہ بئر شراب نہیں ہوتی۔ غالبؔ یاد آ گئے:

رات پی زم زم پہ مئے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

کہیں ایسا نہ ہو کہ جنت میں ملنے والی موعودہ شراباً طہورا بھی بئر زم زم سے ملتی جلتی کوئی چیز ہو.... چلیں خیر ہے۔ مجھے اس سے کیا، یہ تو جنتی لوگوں کا مسئلہ ہے۔ میں ازلی گنہگار.... نہ جنت میرا مسئلہ نہ شراباً طہورا کا لالچ.... چشمۂ زم زم کے خواتین والے حصہ سے مبارکہ باہر آئی تو میں نے اسے ''بئر زم زم'' کے الفاظ دکھائے۔ اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ایسی چیزیں کہیں بھی ہوں لپک لپک کر آپ تک پہنچ جاتی ہیں۔

یہاں سے ہم حطیم کعبہ میں گئے۔ وہاں دو دو نفل ادا کئے۔ من کی مرادیں مانگیں۔ پھر حطیم والی طرف سے ''باب الملک فہد'' کی طرف جانے والے رستے کی ایک صف میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے:

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دُکھ تینوں نئیں دَسنا

لگ بھگ دو گھنٹے تک دیدارِ کعبہ سے آنکھیں روشن کرتے رہے۔ اس دوران چند نوافل بھی وقفے وقفے سے پڑھتے رہے۔ میرے سامنے کعبہ شریف کی دو دیواریں تھیں۔ ایک حطیم کے طرف والی۔ یہ آدھی سے زیادہ دکھائی دے رہی تھی، دوسری حطیم کے دائیں طرف والی جو رُکن شامی سے رُکن یمانی تک بالکل سامنے تھی۔ حجر اسود، رُکن عراقی اور ملتزم دوسری طرف تھے۔ حطیم میں میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا لیکن اب یہاں سے بیٹھے ہوئے پہلی بار خانہ کعبہ کا

سنہری پرنالہ دکھائی دیا۔ حطیم کی طرف خانہ کعبہ کا یہ وہی پرنالہ ہے جس کے نیچے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی بیٹیوں کی قبریں تھیں۔ یہ روایت پرانی عربی کتابوں سے لے کر اُردو میں اہلِ سنت والجماعت کے مسلک کی کتابوں تک میں مذکور ہے جبکہ ''موحدین'' قسم کے فرقے اس روایت کی تردید کرتے ہیں یا سکوت اختیار کرتے ہیں۔ اس جگہ کو میزاب الرحمت کہا جاتا ہے۔ میزاب، پرنالے کو کہتے ہیں۔

تعمیر کعبہ کی مختلف پرانی تاریخیں میں نے ایک زمانے میں پڑھی تھیں۔ عربی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی طاہر الکردی کی کتاب بھی ان میں شامل تھی اور راولپنڈی سے اہلِ سنت والوں کی جانب سے شائع کردہ ایک کتاب بھی شامل تھی۔ مختلف تواریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اب خانہ کعبہ ہے یہ دنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں اس گمشدہ مقام کی از سرِ نو دریافت ہوئی اور تعمیر ہوئی۔ ایک بار جب حضرت ابراہیم مکہ تشریف لائے تو بی بی ہاجرہ فوت ہو چکی تھیں۔ تب حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو ساتھ لے کر ان کی قبر کے گرد ایک بڑا سا احاطہ بنا دیا جو صرف پتھروں پر پتھر رکھ بنایا گیا۔ اس میں گارے کا استعمال نہیں ہوا۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام فوت ہوئے تو انہیں بھی ان کی والدہ ماجدہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ ان قبروں والی جگہ کو میزاب الرحمت کہا جاتا ہے۔ دراصل اسلام سے پہلے بھی کعبہ شریف کی حدود کو کبھی گھٹانے اور کبھی ابراہیمی بنیادوں پر قائم رکھنے کا سلسلہ چلتا رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے، آپؐ کی حیات مبارکہ میں بھی ایک بار تعمیرِ کعبہ ہوئی تھی۔ تب حجرِ اسود کو اصل مقام پر نصب کرنے کا سنگین قبائلی بحران حضور ﷺ نے نہایت عمدگی سے دور کر دیا تھا۔ عام روایت ہے کہ تب تعمیرِ کعبہ کے لئے قبائل کے رزقِ حلال سے جو چندہ جمع ہوا تھا، اس سے کعبہ شریف کی دیوار ابراہیمی بنیادوں تک نہیں لے جائی جا سکتی تھی چنانچہ حطیم کا حصہ چھوڑ دیا گیا۔ تاہم تب بھی اور اب بھی طواف کعبہ کے لئے حطیم شریف کے اوپر سے چکر لگانا ضروری ہے۔ کیونکہ حطیم، کعبہ کا حصہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے خانہ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کرائی تھی۔ یہ تعمیر ابراہیمی بنیادوں پر کی گئی۔ حطیم بھی کعبہ کے اندر آ گیا لیکن جب حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن

زبیرؓ کو شہید کرادیا تب خانہ کعبہ کی ابراہیمی بنیادوں کو ختم کر کے اس کی تعمیر پھر انہیں بنیادوں پر کرادی جیسی کفّارِ مکّہ نے حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کی تھی۔ یوں حطیم اور میزاب الرحمت پھر دیوارِ کعبہ سے باہر ہو گئے۔

خدا کے بارے میں دو بڑے تصوّر مختلف صورتوں میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ ایک تصوّر انوار پرستی کا اور دوسرا ارض پرستی کا۔ ارض پرستی سے زمین کے درختوں، پہاڑوں، دریاؤں، بعض جانوروں اور بتوں کو مقدّس مانا گیا اور انوار پرستی سے سورج، چاند، ستاروں اور آگ کی پرستش کو رواج ملا۔ اصل میں تو یہ سارے تصورات اور عقائد خالقِ کائنات کی جستجو کے سفر ہیں۔ بس ؎ 'سفرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست'۔ اسلام نے اللہ کو آسمانوں اور زمین کا نور کہہ کر اسے روشنی کے عام مظاہر سے ارفع قرار دیا دوسری طرف بت پرستی کو ختم کر کے خانہ کعبہ کو زمینی مرکز بنادیا یوں اسلام نے انوار پرستی اور ارض پرستی کے مروجہ تصورات سے ہٹ کر ایسا معتدل تصور عطا کیا جو خالق کائنات کے بارے میں ہماری بہتر رہنمائی کرتا ہے۔

اسلام سے پہلے مکہ میں حنفا کا ایک فرقہ موجود تھا۔ یہ بت پرستی اور قبر پرستی نہیں کرتا تھا ممکن ہے ابراہیمی حدود کعبہ سے حطیم شریف کو بار بار باہر کرنے میں شعوری یا لاشعوری طور پر یہ سبب بھی رہا ہو کہ مذکورہ قبروں کے تعویذ ختم کر دیئے جانے کے باوجود بعض ''موحد'' قسم کے قبائل کو قبر پرستی کا احساس ستاتا رہا ہو۔ فکر کی متضاد لہریں بھی تو ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور غیر محسوس طریقے سے ایک ساتھ ارتقائی سفر بھی کرتی چلی جاتی ہیں۔

حطیم کو کعبہ کی دیوار کے اندر رکھا جائے یا باہر.....وہ بہر حال کعبہ شریف کا حصہ ہے۔ اس حصے میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کے مدفون ہونے سے کم از کم مجھے تو کوئی الجھن محسوس نہیں ہوتی کیونکہ میں جب کعبہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتا ہوں تو میرا سجدہ اس عمارت کے لئے نہیں بلکہ خدا کے حکم کی فرمانبرداری کے لئے ہوتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ کرنا بھی درحقیقت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں تھا بلکہ خدا کے حکم کو سجدہ کرنا تھا۔ اسی طرح کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اور سجدہ ریز ہونا، نہ حقیقتاً بی بی ہاجرہ کی قبر کے لئے ہے، نہ حضرت اسماعیل کی قبر کے لئے ہے اور نہ

ہی کسی اور کے لئے.... یہ تو بس خدا کے حکم کو سجدہ ہے اور اس کے حکم کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔

دیدارِ کعبہ کے دوران ہی تہجد کی اذان ہوئی۔ ہم نے تہجد کی نماز پڑھی پھر فجر کی اذان ہوئی، نماز باجماعت ادا کی۔ صبح ۷ بجے تک ان عبادات سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں واپس آ گئے۔ کل دن بھر کے سفر اور رات بھر کی بیداری کے باوجود نیند کا غلبہ نہیں تھا پھر بھی سونے کی کوشش کی۔ سات سے گیارہ بجے تک تھوڑی بہت نیند پوری کی۔ جاگ کر کھانے کا انتظام کیا، کھانا کھایا اور تیار ہو کر ظہر کی نماز کے لئے حرم شریف چلے گئے۔ اس بار میں ''باب الملک فہد'' کے بالکل سیدھ والے رستے سے گذر کر مطاف سے باہر کی ایک صف پر قبلہ رُو تھا۔ اب صرف خانہ کعبہ کی سامنے والی دیوار روبرو تھی۔ اس کے دائیں جانب رُکن یمانی اور بائیں جانب رُکن شامی اور حطیم تھا۔ حطیم کی جانب والی دیوار یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی البتہ پرنالہ بڑی حد تک دکھائی دے رہا تھا۔ دمکتے ہوئے سنہری پرنالے نے میری آنکھوں میں چمک پیدا کر دی تھی۔ ظہر کی نماز کی ادائیگی کے بعد ہم لوگوں نے تھوڑی سی خریداری کی۔ مبارکہ نے جرمنی کے موسم کے مطابق گرم اوور کوٹ پہنا تھا جسے میقات پہنچنے تک اتارنا پڑ گیا۔ میں نے اسے اپنی لمبی جیکٹ دے دی۔ یہ زیادہ گرم نہیں تھی لیکن مکّہ کے موسم کے لحاظ سے یہ بھی خاصی گرم تھی۔ چنانچہ مارکیٹ میں جا کر پہلے تو مبارکہ کے لئے ایک برقعہ خریدا۔ مبارکہ کو برقعہ اتنا اچھا لگا کہ اس نے رضوانہ کے لئے بھی خرید لیا۔ بعض دوسرے عزیزوں کے لئے بھی مختلف تحائف اور تبرکات لئے۔ (آج ۲/دسمبر ۱۹۹۶ء کو) مکہ میں جرمن مارک کی قیمت ۲.۴۱ ریال تھی۔

☆☆☆

دوسرا عمرہ

یکم اور ۲ر دسمبر کی درمیانی رات دیر گئے ہم نے عمرہ کرلیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ جتنے دن مکہ شریف میں قیام رہے گا، روزانہ عمرہ کی سعادت حاصل کریں گے۔ ہر نئے عمرے کے لئے غسل ضروری ہے جو مقرر کردہ مقام پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ مکہ میں قیام کرنے کی وجہ سے ہمیں میقات کی طرف جانے کی بجائے تنعیم تک جانا تھا۔ یہ جگہ مسجد عائشہ کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ میں نے سوچا احرام ساتھ لے لیتا ہوں۔ عصر کی نماز ادا کر کے مسجد عائشہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے اور مغرب کے وقت تک واپس بھی آجائیں گے۔ سو عصر کی نماز کی ادائیگی کے لئے جب ''باب الملک فہد'' سے گذرنے لگے تو گیٹ پر موجود سرکاری اہلکار نے اعتراض کیا کہ آپ احرام ہاتھ میں لے کر اندر نہیں جاسکتے۔ اہل کار کا فرمان درست تھا لیکن لہجہ درست نہیں تھا۔ بائیں طرف تھوڑا سا چل کر ''باب العمرہ'' کی طرف گئے تو وہاں کے اہلکار نے نہ صرف شائستگی سے بات کی بلکہ مسئلے کا حل بھی نکال لیا۔ میرا احرام قریب کی ایک جگہ پر رکھوا کر مجھے تسلی دی کہ اسے یہاں سے کوئی نہیں لے جائے گا....اور واقعی ایسا ہی ہوا....''باب العمرہ'' سے اندر جا کر میں نے حطیم کے عین سامنے جگہ حاصل کی۔ حطیم کے اندر تو نوافل ادا کر چکا تھا اب اسے رُکن شامی سے رُکن عراقی تک والی دیوار اور دیوار پر لگے سنہری پرنالے کے جلو میں اس پورے منظر کے ساتھ۔ اور تھوڑے سے فاصلے سے دیکھنا چاہتا تھا۔ سو دیکھا اور جی بھر کے دیکھا۔

موجودہ کعبہ مربع شکل میں ہے جبکہ حضرت ابراہیم والی بنیادوں کے مطابق حطیم کو اس میں شامل کر کے دیکھیں تو پھر یہ ایک حد تک مستطیل بن جاتا ہے ویسے حطیم کی دیوار دونوں طرف سے تھوڑی سی گولائی میں ہے۔ یہ دیوار اونچائی میں قدِ آدم سے تھوڑی سی کم

ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تاریخ تعمیر کعبہ میں کہیں یہ بھی پڑھا تھا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے جب کعبہ کی تعمیر کی تھی تو اس کی اونچائی بھی لگ بھگ اتنی ہی تھی جتنی اب حطیم کی دیوار کی ہے۔ تب چھت بھی نہیں ڈالی گئی تھی۔ باقی اضافے وقت کے ساتھ ساتھ بعد میں ہوتے گئے۔

عصر کی نماز کی ادائیگی کے بعد مبارکہ اور میں مسجد عائشہ کے لئے روانہ ہوئے۔ حرم شریف کے قریب ہی بسوں کا اڈہ ہے۔ یہاں سے مختلف اطراف میں بسیں جاتی ہیں۔ ہم مسجد عائشہ جانے والی بس میں بیٹھے اور آخری اسٹاپ پر اتر گئے۔ مسجد خاصی خوبصورت تھی۔ نہانے کے لئے سرکاری طور پر اچھے انتظامات تھے۔ میں نہا کے، احرام باندھ کے باہر نکلا۔ مبارکہ مجھ سے پہلے ہی مسجد کے خواتین والے حصہ میں جا چکی تھی۔ میں نے مسجد میں دو نفل ادا کئے، عمرہ کی نیت کی۔ یہ عمرہ میں اپنے اباجی کی طرف سے کرنے جا رہا تھا۔ تلبیہ شروع کی۔ مسجد سے باہر آیا تو مبارکہ باہر منتظر کھڑی تھی۔ مسجد عائشہ سے حرم شریف آئے۔ اس بار ''باب النبی'' سے گذر کر حرم شریف میں داخل ہوئے۔ آگے جا کر تھوڑا سا بائیں ہاتھ کو ہوئے تو ''باب عباس'' کی سیدھ میں آگئے۔ اسی سیدھ میں کعبہ شریف کی طرف بڑھتے گئے۔ اب کعبہ شریف کی جو دیوار ہمارے سامنے تھی اس کے دائیں طرف حطیم اور بائیں طرف حجرِ اسود ہے۔ حجرِ اسود سے تھوڑا سا دائیں جانب خانہ کعبہ کا دروازہ ہے۔ درِ کعبہ کو ملتزم شریف کہتے ہیں۔ طواف کے سات چکر پورے کرنے کے بعد یہاں دو نفل پڑھنا باعثِ ثواب ہے۔ ہجومِ عاشقاں کے باعث نفل پڑھنے کے لئے جگہ نہ بن سکے تو دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض مخصوص دعاؤں کے ساتھ اپنی دلی دعائیں اپنی زبان میں بارگاہ خداوندی میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ کل میں نے ہمت کر کے درِ کعبہ کے سامنے دو نفل ادا کر لئے تھے۔ پھر کوشش کی کہ دروازے کی چوکھٹ تک رسائی حاصل کرسکوں، لیکن وہاں تو پہلے ہی سے انبوہِ عاشقاں تھا۔ بہت سے لوگ درِ کعبہ کی چوکھٹ سے لپٹے ہوئے، چمٹے ہوئے گریہ وزاری میں مصروف تھے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹا پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

مجھے درِکعبہ کے واہونے کا ظاہری طور پر کوئی انتظار نہیں تھا کہ میرے باطن میں کعبہ کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا تھا۔سو میں نے الٹا پھر آنے کی بجائے ملتزم کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے تھے۔جو کچھ مانگنا تھا، مانگتا چلا گیا تھا۔یہاں سے پھر مقام ابراہیم کے سامنے آیا تھا، اس کے قریب دو نفل ادا کئے تھے، دعائیں کی تھیں لیکن یہ تو کل کی بات ہے....اب کہ ۲ردسمبر اور ۳ردسمبر کی درمیانی رات تھی۔ مجھے مقامِ ابراہیم کے سامنے نماز مغرب کی ادائیگی کی توفیق ملی۔ کعبہ کے اس رُخ کے دیدار کی سعادت دیر تک نصیب ہوتی رہی۔نماز عشاء کی ادائیگی کے لئے میں نے خصوصی طور پر کوہ صفا کی طرف جانے والے گیٹ ''الصفا'' والی سائڈ سے جگہ منتخب کی۔ یہاں سے کعبہ کی جو دیوار سامنے تھی اس کے دائیں جانب کونے میں حجرِ اسود اور بائیں جانب رکن یمانی ہے۔ یہ دیوار اس لحاظ سے اہم ہے کہ طوافِ کعبہ کا آغاز اس کے سائے میں شروع ہوتا ہے۔اس کے دائیں کونے میں حجرِ اسود سے طواف کا آغاز ہوتا ہے اوراسی جگہ پر پہنچ کر اختتام ہوتا ہے۔گویا آغاز بھی وہی تھا اور اختتام بھی وہی تھا۔وہی اوّل، وہی آخر....طواف کے ہر چکر پر حجرِ اسود کے مقام سے ایک مخصوص دعا پڑھنا شروع کی جاتی ہے اور رُکن یمانی تک پہنچنے تک اسے مکمل کرنا ہوتا ہے۔لیکن میں عموماً مقام ابراہیم تک عربی دعا پڑھ لیتا تھا، پھر حطیم کے نصف حصہ تک پہنچتے پہنچتے دعا کا اُردو ترجمہ بھی پڑھ لیتا تھا اور باقی وقت اپنی زبان میں اپنی دعائیں کرتا ہوا رُکن یمانی تک پہنچتا تھا۔ وہاں سے حجرِ اسود تک پھر ایک اور مخصوص دعا پڑھنی ہوتی ہے۔اس بار طوافِ کعبہ کے ساتوں چکروں میں مجھے اباجی کی حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے محبت کے جذبات بار بار یاد آتے رہے۔مبارکہ آج کا عمرہ اپنی والدہ مرحومہ یعنی میری ممانی مجیدہ کی طرف سے کر رہی تھی اور میں یہ عمرہ اباجی کی طرف سے کر رہا تھا۔ پہلے تو اس سوچ کے ساتھ شدّت سے دل بھر آیا کہ آج اباجی خود زندہ ہوتے اور ہم باپ، بیٹے ایک ساتھ یہ سعادت حاصل کر رہے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔لیکن پھر یہ درد اباجی کی مغفرت کے لئے دعاؤں کے ساتھ خدا کی شکر گذاری میں ڈھل گیا کہ مجھ جیسے ملامتی شخص کو نہ صرف اس ارضِ مقدّس میں حاضری کی سعادت بخشی بلکہ اباجی کی دیرینہ آرزو اُن کی وفات کے

باوجود میرے ذریعے سے پوری کرادی۔درد اور شکر گزاری کی لہریں پھر بھی ایک دوسرے میں مدغم ہوتی رہیں۔اس سے عمرہ کے سرور میں اضافہ ہوا۔طواف سے سعی تک تمام مراحل میں یہ سرور قائم رہا۔اب سوچتا ہوں کہ اباجی کی طرف سے وہ عمرہ نہ کرتا تو اس انوکھی لذّت سے آشنا ہی نہ ہوتا جو اس عمرہ کے دوران نصیب ہوئی۔رات ساڑھے گیارہ بجے ہم اپنے کمرے میں پہنچے۔وہاں سے برتن لے کر میں آبِ زم زم لینے چلا گیا۔جب سے ''بئر زم زم'' کے الفاظ لکھے دیکھے ہیں آبِ زم زم پیتے ہوئے تبرّک کے احساس کے ساتھ ایک اشتیاق سا بھی ہونے لگا تھا۔سوا بارہ بجے تک آبِ زم زم لے کر لوٹا تو ۳ردسمبر کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔رات ایک بجے کے قریب آنکھ لگی۔

☆☆☆

تیسرا عمرہ

فرطِ شوق سے پونے چار بجے ہی آنکھ کھل گئی۔ میں نے اچھی طرح سے غسل کیا۔ پھر مبارکہ کو جگایا.... جب ہم لوگ حرم شریف کے قریب پہنچے تہجد کی اذان ہونے لگی۔ نماز کی ادائیگی کے وقت خواتین کو آگے نہیں آنے دیا جاتا۔ سومبارکہ رستے میں خواتین کے ایک حصے میں چلی گئی اور میں نے حطیم کے سامنے ایک جگہ منتخب کی۔ ایک بار پھر میں حطیم کے روبرو تھا۔ حطیم کی چھوٹی لیکن خوبصورت گولائی والی دیوار کے دائیں بائیں کبھی ایک جنگلہ سا سجا دیا جاتا ہے، کبھی اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔ دائیں، بائیں اور درمیان میں بجلی کے تین بڑے سے چراغ روشن ہیں۔ نماز تہجد سے نماز فجر کے درمیانی عرصہ میں دیدار کعبہ کے ساتھ نوافل اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ فجر کی نماز کے بعد ہم لوگ اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ ناشتہ کیا اور پھر بے سُدھ ہو کر سو گئے۔ پونے بارہ بجے کے قریب بیدار ہوئے اور ظہر کی نماز کے لئے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اسی دوران ظہر کی اذان ہونے لگی۔ ہم جب حرم شریف کے قریب پہنچے نماز کی تکبیر شروع ہوگئی۔ بس پھر جہاں جگہ ملی نماز ادا کر لی۔ نماز کے بعد ہم ''باب مروہ'' سے باہر کی طرف مارکیٹ میں چلے گئے۔ وہاں تھوڑی بہت خریداری کی۔ بیوی ساتھ ہو تو جتنا خرچہ بھی ہو جائے خریداری ''تھوڑی بہت'' ہی کہلاتی ہے۔ خریداری کے بعد وہیں ایک پاکستانی ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد مبارکہ حرم شریف میں چلی گئی۔ میں سارے سامان سمیت اپنے ہوٹل والے کمرہ میں گیا۔ وہاں سارا سامان رکھا اور پھر بھاگم بھاگ واپس حرم شریف پہنچا۔ عصر کی نماز میں ابھی پندرہ بیس منٹ کی دیر تھی۔ میں ''باب السلام'' سے اندر داخل ہوا۔ اس رستے سے خانہ کعبہ

کی دو دیواریں صاف نظر آتی ہیں۔ دائیں طرف رکن شامی سے رکن عراقی تک والی دیوار اور حطیم۔ بائیں طرف ملتزم (درِ کعبہ) والی دیوار.... ساتھ ہی کونے میں حجر اسود ہے۔ ملتزم کے سامنے مقام ابراہیم...''باب السلام'' کی گذرگاہ تو بڑی برکتوں والی نکلی۔ ایک نظر میں اتنے جہان دکھا دیئے۔ میں اس گذرگاہ سے صحنِ کعبہ کے قریب والی سیڑھیوں تک آیا۔ پھر وہیں بائیں جانب ایک صف میں بیٹھ گیا۔ تھوڑا سا بائیں جانب ہو کر بیٹھنے کے نتیجہ میں باقی سارے منظر تو ٹھیک دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن حجر اسود کا کونہ مقام ابراہیم کی اوٹ میں آ گیا تھا۔ اچانک ایک صاحب میرے آگے آ کر نماز پڑھنے لگے۔ عصر کے وقت کا سورج چمک رہا تھا۔ ان صاحب کا احرام ہلکے لٹھے کا تھا۔ لٹھا میں نے احتراماً لکھ دیا ہے آپ اسے تھوڑی سی موٹی ململ سمجھ لیں تو صورتحال بہتر طور پر واضح ہو سکے گی۔ کچھ احرام کے کپڑے کی باریکی اور نزاکت تھی، کچھ سورج کی کرنوں نے شوخی کی جو اُن کے احرام سے چھن چھن کر باہر آنا چاہتی تھی۔ موصوف کے قیام اور رکوع تک تو پھر بھی معاملہ غنیمت تھا لیکن جب وہ سجدہ میں گئے تو کپڑے کی نزاکت اور سورج کی سامنے سے پڑتی ہوئی کرنوں کی شوخی نے عجب گل کھلا دیا۔ ستم بالائے ستم سجدۂ شوق خاصا طویل ہو گیا۔ خدا شاہد ہے کہ طواف سے سعی تک تمام مرحلوں میں خواتین کی موجودگی نے کبھی بھی میرے ارتکاز میں خلل پیدا نہیں کیا لیکن ان صاحب کے اس سجدہ کے منظر نے میرے دھیان کو توڑ کر مجھے کراہت آمیز بیزاری کی حد تک پہنچا دیا۔ میں نے ذہن کو حضرت لوط علیہ السلام کی نافرمان قوم کے انجام کی طرف لے جانے کی کوشش کی لیکن اس میں مغرب کا جدید ''گے کلچر'' گھس آیا۔ خدا خدا کر کے ان صاحب کی نماز مکمل ہوئی اور مجھے اس اذیت سے نجات ملی۔ تب ہی مجھے خیال آیا کہ میرا احرام تو لیے جیسے کپڑے کا ہے اور میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کفار مکہ طواف کعبہ کرتے تھے تو چند قبیلوں کو چھوڑ کر زیادہ تر خواتین وحضرات بالکل برہنہ ہو کر طواف کیا کرتے تھے۔ اسے آپ جہالت بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اُس زمانے کے لحاظ سے اس کے دو جواز میری سمجھ میں آتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ خدا کی نظر تو ہمارے پاتال تک جاتی ہے اور جب ہم عبادت کے

ارفع ترین مقام پر آئے ہیں تو خدا کے سامنے کسی ظاہری لباس کی ضرورت نہیں ہے۔جیسے اس نے ہمیں اس دنیا میں پیدا کیا ویسے ہی ہم اس کی بارگاہ میں حاضر ہو رہے ہیں۔اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ برہنہ ہو کر طواف کعبہ کرنے کی صورت میں وہ لوگ اپنی نفس کشی کا ثبوت دیتے ہوں۔اسلام نے برہنہ ہو کر طواف کرنے کی رسم کو ختم کر دیا۔اسلام میں احرام کی اہمیت پر غور کرتا ہوں تو اس کے بعض روحانی اور ثقافتی پہلو سامنے آتے ہیں۔احرام کا ایک حوالہ یہ بنتا ہے کہ انسان کو کفن کی چادروں کا احساس رہے۔موت ہمارا انجام ہے۔مرنے کے بعد کفن میں اگلے جہان جانا ہے اور کچھ بھی ساتھ نہیں لے جانا ہے۔یہ احساس زندہ رہے تو معاشرے سے بہت سی برائیاں از خود ختم ہو جاتی ہیں....احرام سے یہ تاثر بھی بنتا ہے کہ ہماری اب تک کی پہلی زندگی کے سارے گناہ خدا نے بخش دیئے ہیں۔اب ہم ایک نیا جنم لے رہے ہیں اور آئندہ ہم نے گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنی ہے....احرام کو ارضِ حجاز کے قدیم ثقافتی حوالے سے دیکھیں تو اس کا اَن سِلا ہونا۔ مکمل برہنگی اور مکمل لباس کی درمیانی کڑی قرار پاتا ہے۔اسلام نے مکمل برہنگی کی ممانعت کر دی لیکن مکمل لباس پہننے سے بھی روک دیا اور دونوں کے درمیان والے رستے یعنی اَن سِلے احرام کی چادروں کو پسند فرمایا۔میں سمجھتا ہوں کہ اسلام نے بشری کمزوریوں کا احساس کیا ہے اور میرے جیسے گناہ گاروں کو کسی نفسانی آزمائش اور ابتلا میں ڈالے بغیر روحانی لحاظ سے خدا کے ساتھ تعلق کو اعلیٰ سطح تک لے جانے کا امکانی راستہ دکھا دیا ہے۔

نمازِ عصر کی ادائیگی کے بعد ہم پھر خریداری کے لئے نکل گئے۔دوپہر کو زیادہ تر زیورات کی خریداری کی تھی۔اب کپڑوں کی خریداری کا موسم تھا۔مغرب کی نماز سے پہلے مجھے پھر اپنے کمرے میں سامان چھوڑنے کے لئے آنا پڑا۔مبارکہ حرم شریف جا چکی تھی۔نماز مغرب کے بعد ہمیں حجر اسود کی سیدھ والی پٹی پر ملنا تھا مگر مغرب تک زائرین کا اتنا زیادہ رش ہو گیا کہ مجھے اور مبارکہ کو ایک دوسرے تک پہنچنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ہم پھر بذریعہ بس مسجد عائشہ کے لئے روانہ ہوئے۔وہاں عمرہ کے لئے غسل کیا، احرام باندھا، دو نفل پڑھے، نیت عمرہ کی اور تلبیہ پڑھتے ہوئے پھر بذریعہ بس حرم شریف آ گئے۔آج مبارکہ نے اپنے والد اور میرے ماموں ناصر کی

طرف سے عمرہ کرنا تھا اور میں نے اپنی امی جی کی طرف سے...امی جی اور ماموں ناصر میں گہری محبت تھی۔شاید یہ اسی محبت کا اثر تھا کہ میرے اور مبارکہ کے عمرے دونوں بہن بھائی کے لئے ایک ہی وقت میں ہو رہے تھے، حالانکہ ہم نے اس سلسلے میں پہلے سے کچھ بھی طے نہیں کیا تھا۔

طواف اور سعی کے دوران امی جی شدت سے یاد آتی رہیں۔میں ایک عرصہ تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ دنیا کی ساری مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔لیکن دنیا کو دھیان سے دیکھا تو لوگوں کی ناگنوں اور ڈائنوں جیسی مائیں بھی دیکھیں۔اپنی اولاد کے گھروں کو خود اجاڑ دینے والی مائیں، بہو دشمنی میں بیٹوں کی زندگی میں زہر گھول دینے والی مائیں اور حرص و ہوس کی ماری، ممتا کے نور سے عاری مائیں۔جب سے میں نے لوگوں کی ایسی مائیں دیکھی ہیں اپنی والدہ مرحومہ سے میری محبت کا تعلق اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔ایسی مائیں بہت کم ہوتی ہیں جو اپنے جذبوں، اپنی خوشیوں اور اپنی خواہشوں کی خاموشی کے ساتھ قربانی دیتی چلی جائیں اور اولاد کو کبھی اشارتاً بھی اس کا احساس نہ دلائیں۔مجھے ایک طرف امی جی کی محبتوں اور دعاؤں کی پھوار بھگو رہی تھی تو دوسری طرف بی بی ہاجرہ کی عظیم ہستی شفقت کے بادل کی طرح میری روح پر چھائی ہوئی تھی۔

طواف اور سعی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مبارکہ کو بتایا کہ حطیم میں ہم پہلے بھی نوافل ادا کر چکے ہیں لیکن آج ہم ایک سنّت پر عمل کرنے کا ثواب بھی حاصل کریں گے پھر میں نے اسے بتایا کہ ایک بار حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ کی خدمت میں خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنا چاہتی ہیں تب حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں حطیم میں لاتے ہوئے ارشاد فرمایا یہاں نماز پڑھ لیں کیونکہ حطیم بھی کعبہ کا حصہ ہے۔یہ بات کہہ کر حضورؐ نے پھر ارشاد فرمایا: نیا نیا ایمان لانے کے باعث اگر مجھے اپنی قوم کے ابتلا کا ڈر نہ ہوتا تو میں کعبہ کی عمارت کو گرا کے پھر سے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کراتا۔یہ بتا کر میں نے سنتِ رسولؐ کی پیروی میں مبارکہ کا ہاتھ پکڑا اور اسی طرح اسے لے کر حطیم میں داخل ہوا۔یہاں ہم نے نوافل ادا کئے۔خدا کے احسانات کی شکر گزاری کی، دلی دعائیں کیں حطیم والی طرف خانہ کعبہ کی جو دیوار ہے اس سے بہت سارے لوگ چمٹے ہوئے تھے۔یکا یک مجھ پر منکشف ہوا کہ۔۔۔ یہ سامنے والی دیوار

تو صرف ظاہری پردہ ہے وگرنہ میں جو حطیم میں بیٹھا ہوا ہوں

درحقیقت خانہ کعبہ کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہوں۔ عجیب لذّت آفریں اسرار تھا کہ میں بیک وقت کعبہ کے اندر بھی تھا اور باہر بھی۔ یہ داخلیت اور خارجیت کی بحث تو بس ایسے ہی ہے۔ اس انوکھے تجربے نے مجھے احساس دلایا کہ ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا ایک حصہ ہے۔ لیکن پھر اسی بھید کا ایک اور مرحلہ بھی مجھ پر منکشف ہوا۔

ظاہر، باطن عین ایانی، ہُو ہُو پیا سنیوے ہُو

سلطان باہو کے اس عارفانہ تجربے جیسی ہی کوئی بات تھی لیکن میرے لئے ناقابلِ بیان ہے۔

حطیم سے باہر آئے تو اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مبارکہ نے کہا حضرت عائشہؓ کی حطیم میں نماز پڑھنے والی روایت سے مجھے یاد آیا ہے کہ جب حجاج بن یوسف نے کعبہ کی ابراہیمی بنیادوں والی عمارت کو گرا کر اسے پھر موجودہ بنیادوں پر تعمیر کرا دیا تب کسی نے حجاج کو اس روایت سے آگاہ کیا۔ تب حجاج بن یوسف نے افسوس کیا اور کہا کہ مجھے پہلے سے اس کا علم ہوتا تو عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر کرائی ہوئی ابراہیمی بنیادوں کو ہرگز نہیں چھیڑتا، ویسے ہی رہنے دیتا۔ مبارکہ کی اس بات کے جواب میں تب میں نے کہا کہ حجاج بن یوسف کے سامنے مسئلہ ابراہیمی بنیادوں کا تھا ہی نہیں۔ ان کے سامنے تو مسئلہ یہ تھا کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے لئے کوئی یادگار کریڈٹ رہنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان کا مسئلہ ان کے اپنے اقتدار کے استحکام کا تھا۔ اگر حجاج بن یوسف کو حضورؐ کی روایت کا اتنا ہی پاس تھا تو ایک بار عمارت گرانے کے بعد دوسری بار بھی گرا کر ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کرا لینے میں کیا پریشانی تھی؟..... یہ میرے ذہن تاثر تھا لیکن میرا دل مجھے کہہ رہا تھا کہ حجاج کی نیت کا معاملہ خدا پر چھوڑو۔ یہ دیکھو کہ اگر حجاج نے ایسا نہ کیا ہوتا تو تم نے کعبہ کے باہر بیٹھ کر کعبہ کے اندر بیٹھنے کا روحانی تجربہ کیسے کیا ہوتا!

☆☆☆

مکّہ کے تاریخی اور مقدس مقامات

۶ر دسمبر کو ہمیں مکہ شریف پہنچے چوتھا دن ہو رہا تھا سو گرد و نواح کے تاریخی اور مقدس مقامات دیکھنے کا پروگرام بنا۔ صبح ۶ بج کر ۲۵ منٹ پر ہم روانہ ہوئے اور سوا نو بجے تک لوٹ آئے۔ ایک پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور نے یہ سارے مقامات دکھائے اور بہترین گائیڈ ثابت ہوا۔ ہمارے ہوٹل سے قریب ترین مقام ''شبیقہ'' تھا۔ یہ وہ خوفناک قبرستان ہے جہاں زمانۂ جاہلیت میں کفّار مکہ اپنے گھر میں بیٹی پیدا ہونے پر ''غیرت'' کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بیٹی کو یہیں لا کر زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ انسان اپنی جہالت کے باعث ''غیرت'' کے نام پر کیسے کیسے ظلم ڈھاتا رہا ہے اور آج بھی دوسرے حوالوں سے یہی جہالت ''غیرتوں'' کے کیسے کیسے غیر انسانی مظالم کو فخریہ طور پر روا رکھ رہی ہے۔ ویسے اُس زمانے میں سارے قبیلے ایسا نہیں کرتے تھے۔ بعض قبیلے ہی جھوٹی غیرت کے نام پر اس انسانیت سوز ظلم کے مرتکب ہوتے تھے۔ اس وقت اچانک مجھے ایسے لگا ہے جیسے اُن سفاک لوگوں سے میری بھی کوئی دور کی، پرانی رشتہ داری ہے۔ شاید اسی لئے مجھ سے ایسا شعر ہوا ہے:

اس کی چیخوں کی صدا آج بھی آتی ہے مجھے
میں نے زندہ ہی تری یاد کو دفنایا تھا

شبیقہ سے تھوڑا آگے گئے تو ''جنت المعلیٰ'' آ گئی۔ یہ جگہ دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی مفلوک الحال جنت بی بی بیوہ بھی ہو گئی ہو۔ قبر پرستی سے خوف بھی کیا کیا گل کھلا دیتا ہے۔ سعودی خاندان نے امّت مسلمہ کو ''مشرکانہ'' رسومات سے بچانے کے لئے

پورے قبرستان پر بلڈوزر چلوادیا ہے۔ یہاں اب قبرستان نہیں بلکہ ''رڑا میدان'' ہے۔حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ ،حضرت عبدالمطلبؓ ،حضرت ابوطالبؓ ،حضوراکرم ﷺ کے تین صاحبزادگان حضرت قاسمؓ ،حضرت طاہرؓ اور حضرت طیبؓ (چوتھے فرزند حضرت ابراہیمؑ مدینہ میں جنت البقیع میں مدفون ہیں) اور متعدد صحابۂ کرامؓ اس قبرستان میں مدفون ہیں۔ جنت البقیع کے بعد یہ قبرستان دنیا بھر کے قبرستانوں سے افضل سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں آپ کسی مزار کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔ کوئی پتہ نہیں کہ کون کہاں مدفون ہے۔ اگر قبر کا کچی مٹی کا تعویذ بھی نہیں رہنے دینا تو پھر قبر پرستی سے اتنے ڈرنے والے ''موحدین'' کو تدفین کی ضرورت ہی کیا ہے۔سیدھا سیدھا رام نام ست ہے۔ بولو....اور شمشان گھاٹ لے چلو۔ نہ رہے کوئی قبر اور نہ رہے قبر پرستی کا خوف۔ پکے موحد بن جایئے۔(استغفراللہ)

جنت المعلیٰ کے کھلے میدان میں (اسے قبرستان کی جگہ اب میدان ہی کہنا چاہیے) میں نے کھڑے ہو کر سارے بزرگوں کے لئے دعا کی اور باہر نکل آیا۔ یہاں خواتین کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔صرف طوافِ کعبہ اور سعی کے دوران عورتیں اور مرد یک جا ہوتے ہیں۔تب روحانیت کے ساتھ انسانیت بھی معراج پر ہوتی ہے۔کوئی فرقِ من و تو نہیں ہوتا۔لیکن جیسے ہی نماز کی اذان ہوتی ہے پُلسیئے خواتین کو الگ سائڈ پر ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں قبرستان سے باہر آیا تو مبارکہ مغموم سی کھڑی تھی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا اور بتایا کہ میں اندر کا حال دیکھ کر زیادہ مغموم ہوا ہوں... جنت المعلیٰ کے بعد ہم مسجد جن کے سامنے گئے۔ روایت ہے کہ جن صاحبان حضورؐ سے اس مقام پر ملے تھے اور ایمان لائے تھے۔ یہ مسجد صرف نماز کے معین اوقات میں کھلتی ہے پھر بند کر دی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے بعض زائرین یہاں آ کر بھی ''مشرکانہ'' حرکات کرتے ہوں جو جِنّوں کو اچھی نہ لگتی ہوں۔ مسجد جن سے تھوڑا آگے مسجد شجر ہے۔ یہاں ایک درخت تھا۔ آنحضرت ﷺ جب غارِ حرا تشریف لے جایا کرتے تھے تو آتے اور جاتے ہوئے اس درخت کے نیچے آرام فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مشرکانہ رسومات کے ڈر سے وہ درخت کٹوا کر وہاں مسجد بنوادی۔ اب اس مسجد کو مسجد عمر فاروقؓ کہتے ہیں۔ مسجد عمر کے نزدیک ہی مسجد

الرایۃ ہے۔اسے مسجد الفتح بھی کہتے ہیں۔فتح مکہ کے موقعہ پر حضورؐ نے یہاں اسلام کی فتح کا پرچم لہرایا تھا۔اسی جگہ کعبہ کا متولی رہتا تھا۔کعبہ کی چابی اس کے پاس ہوتی تھی۔اس سے چابی لے کر حضورؐ نے خانہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے ۳۶۰ بت توڑے تھے اور کعبہ کی دیواروں سے لگی ہوئی تصویریں بھی پھاڑ دی تھیں۔بت توڑنے اور تصویریں پھاڑنے کے بعد حضورؐ نے خانہ کعبہ کی چابی پھر اسی متولی خاندان کے سپرد کر دی تھی۔سعودی خاندان کے آنے کے بعد کیا صورتحال ہے؟ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔تاہم خانہ کعبہ کی چابی آج بھی مسجد الفتح ہی میں محفوظ ہوتی ہے۔خانہ کعبہ میں موجود ۳۶۰ بتوں کو توڑنے کے تاریخی واقعہ کے ساتھ ہی مجھے ہندوستان کے بی جے پی کے ایک لیڈر کا بیان یاد آ گیا۔بابری مسجد کی شہادت کے ساتھ ہی جامع مسجد دہلی اور بعض دیگر مساجد کے بارے میں بھی اشتعال انگیز بیان داغے گئے تھے۔جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جب مسلم لیڈروں نے دکھ اور غصے کی حالت میں شدید ردِعمل ظاہر کیا تب طاقت کے نشے میں بی جے پی کے ایک لیڈر نے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ ہندوستان کی مسجدوں کے معاملے پر شور کر رہے ہیں، ہمیں تو مکہ میں اپنا بڑا مندر بھی لینا ہے جہاں آپ نے ہمارے سارے بُت توڑ کر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔لیکن اس بیان کے ساتھ ہی ایسا طوفانی ردِعمل سامنے آیا تھا کہ بی جے پی کے لیڈر گھبرا گئے۔ان کی ہائی کمان نے فوراً اس بیان سے لاتعلقی کر کے اور معذرت خواہانہ وضاحت کر کے اپنی جان چھڑائی۔

اسلام جہاں بت پرستی کے خلاف ہے وہیں تصویر کی بھی ممانعت کرتا ہے۔شروع شروع میں فوٹوگرافی کے لئے مذہبی رہنماؤں نے مجبوری کے تحت جائز کا فتویٰ دیا اور پھر شخصیت پرستی کے رویّے کو پوری طرح فروغ دیا۔بعض ''موحد'' فرقوں کے گھروں میں جا کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کے گھروں میں کرشن جی اور رام جی کی مورتیاں اتنے اہتمام سے نہیں سجی ہوں گی جتنے اہتمام سے ان ''موحد'' فرقوں کے رہنماؤں کی تصویریں سجی ہوئی ہیں۔پھر بعض ''موحد'' قسم کی حکومتوں نے سرکاری کرنسی نوٹوں پر اپنی شاہانہ تصویریں طمطراق سے چھپوا رکھی ہیں۔بس جہاں جی چاہے بت پرستی اور تصویر پرستی کی مذمت کر دیجئے اور جہاں جی چاہے اپنی نمائش پسند

نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے جواز پیدا کر لیجئے۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں

مسجد الفتح کے بعد ہم نے مسجد علیؓ دیکھی۔حضرت علیؓ اکثر عشاء کی نماز یہاں پڑھایا کرتے تھے اسی مناسبت سے اس کا نام مسجد علیؓ ہے۔کافی خوبصورت مسجد ہے۔ یہاں سے ہم حرم شریف کی دوسری سمت میں آ نکلے۔جبل الابوقبیس کے ایریا میں بہت سارے اسلامی تاریخی مقامات تھے مثلاً حضور اکرم ﷺ کا مقام پیدائش، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مکان، حضرت حسّان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور متعدد دیگر صحابہ کرام کے مکانات....شعبِ ابی طالب جہاں مسلمانوں کو تین سال کے لگ بھگ کفارمکّہ کی ''نفرت انگیز دینی غیرت'' کا نشانہ بن کر محصور ہونا پڑا تھا۔ کفارمکہ نے مسلمانوں کا انتہائی سخت سوشل بائیکاٹ کیا تھا...یہ سارے مقامات ضائع کر دیئے گئے ہیں۔ ایک طرف ''مکتبہ مکۃ المکرّ مہ'' کے نام سے کتب خانہ بنا دیا گیا ہے۔ دوسری طرف شاہی خاندان کے محلّات میں بعض مقام غائب ہو گئے ہیں۔شاہی خاندان کے محلّات کے سلسلے میں تو کوہ صفا کا بہت سارا حصہ بھی لے لیا گیا ہے۔ سعی کرنے والوں کے لئے تھوڑی سی کوہ صفا کی نشانی چھوڑ دی گئی ہے جو ظاہر ہے شاہی خاندان کی خاص مہربانی ہے۔جبل الابوقبیس کے بارے میں دو روایتیں مشہور ہیں۔ایک یہ کہ حضورؐ نے یہیں سے چاند کو دو ٹکڑے کرنے کا معجزہ دکھایا تھا۔ دوسری یہ کہ زمین کو متوازن رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلا پہاڑ یہی بنایا تھا، نیز حجر اسود اسی پہاڑ سے لیا گیا تھا۔شق القمر والے مقام پر اب ایک مسجد ہے اسے مسجد بلال کہا جاتا ہے۔

جبل ابوقبیس کے بعد ہم مکہ مکرمہ سے تھوڑا باہر جبل ثور کی طرف گئے۔اس پہاڑ کی چوٹی پر غارِ ثور ہے۔ یہ وہی غار ہے جہاں آنحضرت ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے دوران تین راتیں قیام فرمایا تھا۔کفارمکہ آپؐ کی تلاش میں تھے۔اس سفر ہجرت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی حضورؐ کے ہمراہ تھے یوں ''یارِ غار'' کا اعزاز ان کا نصیب ہو گیا...غارِ ثور خاصی دور تھا۔ میں پہاڑ کی چڑھائی

چڑھ کر چوٹی تک جانا چاہتا تھا مگر مبارکہ کی حالت کا خیال کر کے اپنی یہ خواہش چھوڑ دی۔ یوں بھی غارِ ثور تک پہنچنے کے لئے اور پھر واپس آنے کے لئے پورے ایک دن کا پروگرام بنانا ضروری ہے۔یا پھر دشمنوں کا کوئی گروہ پیچھے لگا ہو تو چڑھائی آسان ہو سکتی تھی...لیکن میرے اندر کے صحرا میں کہیں، کسی طرف میرے اپنے ہی اندر کے کافروں اور دشمنوں کا ایک گروہ بھی تو میرے پیچھے لگا ہوا ہے اور مجھے ابھی تک اپنی ذات کے غار ثور تک پہنچنا نصیب نہیں ہو سکا۔شاید میں ابھی تک اپنی ذات میں شعبِ ابی طالب کے مرحلے سے گذر رہا ہوں....آنحضرت ﷺ جب اس غار میں قیام فرما تھے تب غار کے دہانے تک پہنچ کر رک جانے والے کھوجیوں نے دعوے سے کہہ دیا تھا کہ یا تو آپؐ اسی غار کے اندر ہیں یا آسمان پر چلے گئے ہیں۔غار کے اندر موجودگی اس لیے ماننے میں نہیں آتی تھی کہ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا بُن دیا تھا۔ چنانچہ پھر بعض لوگوں نے رائے ظاہر کی کہ چونکہ حضورؐ ایک بار پہلے بھی طائف جا چکے ہیں اس لئے ممکن ہے اب پھر طائف چلے گئے ہوں کیونکہ جبل ثور کے دوسری طرف اتر جائیں تو وہاں سے لگ بھگ ۱۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر طائف شہر ہے۔

جبل ثور کو دور سے دیکھنے کے بعد ہم میدان عرفات کی طرف نکل گئے۔ ۹رذی الحج کو حاجی صاحبان یہاں پہنچتے ہیں۔ وقوفِ عرفات حج کا رکن اعظم ہے۔ یہاں قیام کر کے دن بھر دعائیں کی جاتی ہیں۔ ہمارا ٹیکسی ڈرائیور بتا رہا تھا کہ روزِ حشر کو ساری دنیا یہیں جمع ہو گی۔ مجھے پہلے تو اس کی بات پر ہنسی آئی کہ صرف اسی زمانے کے پانچ ارب انسان بھی اس میدان میں سما نہیں سکتے تو سارے گذرے اور آنے والے زمانوں کے کھربوں انسان کہاں سمائیں گے۔ لیکن پھر یاد آیا کہ جدید سائنس نے تسلیم کیا ہے کہ اگر مادہ میں سے خلا نکال دیا جائے تو ساری کائنات کا مادہ چیچ بھر ہو گا۔ مادہ اتنا محدود ہو سکتا ہے تو روح تو ویسے ہی لطیف ہے۔سو ضروری نہیں ہے کہ مذہبی عقائد کی حکمت ہم ایک دم ہی سمجھ جائیں۔ جہاں کچھ کچھ سمجھ جاتے ہیں، ہماری تسلی ہو جاتی ہے۔ جہاں بات پلّے نہیں پڑتی وہاں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جاتے ہیں اور انہیں اپنی دانشوری سمجھ کر خوش ہو لیتے ہیں لیکن اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں ہے...عرفات میں مسجد نمرہ کی

خاص اہمیت ہے۔اسے صرف حج والے دن کھولا جاتا ہے۔آنحضرت ﷺ نے اسی مقام پر وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا جسے خطبہ حجۃ الوداع کہا جاتا ہے اور جس کی روح پر نیک نیتی سے عمل درآمد کی صورت میں آج بھی پوری انسانیت کے دکھوں کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔اس مسجد کے بند دروازے کے سامنے قبلہ رو ہو کر میں نے اور مبارکہ نے شکرانے کے نفل پڑھے۔ یہاں سے ہم جبل الرحمت کی طرف آئے۔ یہ ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جسے ہم نے آسانی سے سر کر لیا۔روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکالے جانے کے بعد عرصہ تک توبہ کرتے رہے۔اس مقام پر رحمت خداوندی نے ان کی توبہ قبول فرمائی اس لیے اسے جبل الرحمت کہتے ہیں۔ یہاں ایک چھوٹا سا ستون یادگار کے طور پر بنا ہوا ہے۔آنحضرت ﷺ بھی اس مقام پر تشریف لے گئے تھے اور وہاں جا کر کھڑے رہے تھے اس لئے وہاں جانا تو سنّتِ رسولؐ کی پیروی کے زمرہ میں بھی آجاتا ہے۔اس کے باوجود پہاڑ کے رستے کے شروع میں ایک بڑا سا بورڈ نصب کر دیا گیا ہے جس میں اس جگہ کو صرف ایک تاریخی مقام قرار دے کر یہاں دعا کرنے سے بھی روکا گیا ہے۔ چلیں یہ صرف ایک تاریخی مقام ہی سہی۔لیکن وہاں دعا کرنے میں کیا قباحت ہے؟ کیا وہاں جا کر خدا سے دعا کی تو اس میں بھی شرک ہو جائے گا؟ میں نے اور مبارکہ نے یہاں کھڑے ہو کر دعا کی۔ میں نے تو اپنے اب تک کے گناہوں کے علاوہ آئندہ ہونے والے گناہوں کی بھی ایڈوانس میں معافی مانگ لی۔

عرفات سے مزدلفہ کی طرف جاتے ہوئے ایک دیوار سی دکھائی دی۔استفسار پر پتہ چلا کہ خلیفہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ نے جو تاریخی نہر بنوائی تھی، یہ وہی ہے۔اُس زمانے میں دجلہ وفرات سے یہاں مکہ تک حاجیوں کے لئے اور مسافروں کے لئے اتنی شاندار نہر بنوا دینا بہت بڑی بات تھی۔مزدلفہ کے قریب مسجد مشعر الحرام ہے، یہ مسجد صرف حج والی رات کھلتی ہے۔ اس کے دروازے کے آگے بھی ہم دونوں نے نفل پڑھے۔ یہاں سے آگے بڑھے تو وادی محسّر اور جبل الابابیل نظر آئے۔جبل الابابیل وہ پہاڑ ہے جہاں سے ابابیلوں نے کنکر اٹھائے تھے اور خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کے لئے آنے والے یمن کے بادشاہ کے، ہاتھیوں پر سوار عظیم لشکر کو تہس نہس

کر کے رکھ دیا تھا۔یمن کا بادشاہ ابرہہ مسیحی تھا۔اس نے خانہ کعبہ سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے صنعاء میں ایک عالی شان گرجا تعمیر کرایا تھا۔لیکن جب اس کی شان وشوکت دیکھ کر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے تو وہ خانہ کعبہ ہی کو مٹانے کے لئے چڑھ دوڑا۔ربِّ کعبہ نے نہ صرف اپنے گھر کی عظمت کو قائم رکھا بلکہ اس پر حملہ کرنے والوں کو معمولی ابابیلوں کے ذریعے برباد کرا دیا۔خانہ کعبہ کی روحانی عظمت اور شان وشوکت کا یہ عالم ہے کہ سوائے فرض نماز باجماعت کی ادائیگی کے چند منٹوں کے، دن رات اس کے گرد عشاق کا طواف جاری رہتا ہے۔نہ اس تسلسل میں کبھی کوئی تعطل پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی عشّاق کی تعداد میں کمی ہوتی ہے۔سو دنیا کا کوئی بھی دوسرا مقدس مقام خانہ کعبہ کی اس فضیلت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ہجومِ خلق کے لحاظ سے بھی اور فیوض وبرکات کے لحاظ سے بھی صرف ارضِ حرم ہی ارضِ حرم ہے۔

وادیٔ محسّر، جبل الابابیل کے دامن میں ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں یمن کا بادشاہ ابرہہ اپنے ہاتھی سمیت ہلاک ہو گیا تھا اور اس کا سارا لشکر بھی برباد ہو گیا تھا۔اس جگہ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ یہاں خدا کا بہت بڑا عذاب نازل ہوا تھا اس لیے یہاں سے تیزی کے ساتھ گذر جانا چاہیے۔ چنانچہ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے بھی ٹیکسی کی رفتار کو تیز کیا اور ہم جلد ہی اس وادی سے آگے نکل گئے....اس علاقہ میں ہم نے دور سے پیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا ستون سا دیکھا۔ پتہ چلا یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لئے لٹایا تھا۔غالباً اسی جگہ مسجد الکبش ہے۔لیکن اُس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی بلکہ اس طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرنے میں خطرہ تھا۔دراصل وہیں ساتھ ہی ایک شاہی محل بنا لیا گیا ہے اس لئے عوام کا داخلہ اس علاقے میں بھی ممنوع ہو گیا ہے۔حفاظتی اقدامات کے طور پر بے حد طاقتور اور حساس کیمرے نصب کئے گئے ہیں یوں اُس طرف ہماری انگلی کا اشارہ بھی ہمیں مشکوک بنا سکتا تھا۔سو چُپ چاپ اس مقام سے آگے نکل گئے۔تھوڑا سا آگے جانے کے بعد مسجد خیف آ گئی۔ یہ منیٰ کی بڑی مسجد ہے۔ حج کے چار دنوں میں اسے کھولا جاتا ہے۔ایک معروف روایت کے مطابق یہاں ستّر ہزار پیغمبرانِ خدا مدفون ہیں۔ میں نے اور مبارکہ نے یہاں

بھی مسجد کے بند دروازے کے آگے قبلہ رو ہو کر دو دو نفل شکرانے کے ادا کئے۔

یہاں سے نکل کر ہم سیدھے منیٰ پہنچے جہاں حج کے دنوں میں شیطان کو کنکر مارے جاتے ہیں۔ پتھر کے تین بڑے بڑے ستون تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نصب تھے۔ سائز کے لحاظ سے بھی اور عقیدے کے لحاظ سے بھی ایک بڑا شیطان ہے۔ ایک درمیانہ۔ اور ایک چھوٹا.... درمیانے شیطان کی ان دنوں Repairing ہو رہی تھی...شیطان کی Repairing.... بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پتھر تو صرف علامت ہیں، چاہے خیر کی قوت کی علامت ہوں یا شر کی قوت کی...اصل خیر اور شر تو ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے۔ شیطان بے چارہ تو مفت میں بدنام ہو گیا ہے۔ ہم جو بھی گناہ کر لیں اسی کے سر منڈھ کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ بس جی شیطان نے بہکا دیا تھا۔۔۔۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے خود اپنے اندر کئی چھوٹے بڑے شیطان بنا رکھے ہیں۔ ان میں سے کوئی کبھی کمزور ہونے لگے تو ہم خود ہی اس کی Repairing کرنے لگ جاتے ہیں.... میں نے منیٰ میں بڑے شیطان کو دیکھتے ہوئے خیال ہی خیال میں اسے کنکریاں ماردیں اور خیال ہی خیال میں دیکھا کہ وہی کنکریاں پلٹ کر مجھے آن لگی ہیں۔ شیطان اس تماشے پر مسکرا رہا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ ہم آج کے انسان۔ روایتی شیطان سے کتنا آگے نکل گئے ہیں۔ اگلے زمانوں میں کسی پر تکبر کا بھوت یا شیطان سوار ہوتا تو وہ براہ راست خدائی کا دعویٰ کر دیتا تھا لیکن آج کا متکبر انسان چالاک ہے کہ خدائی کا دعویٰ کرنے کی بجائے خدا کو اپنی مذموم نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک ذریعہ اور بہانہ بنا بیٹھا ہے۔ اپنی انسانی حالت میں ریاکاری کی عاجزی بھی دکھائی اور خدائی کے سارے اختیارات بھی سنبھال لئے۔ یہی تو وہ ذہانت ہے جو نہ فرعون اور نمرود جیسے لوگوں کو نصیب ہوئی نہ شیطان کو ہی سوجھ پائی۔

شیطان سے فارغ ہوئے تو ایک جگہ رُک کر مسجد الکوثر دیکھی۔ یہاں آنحضرت ﷺ پر سورۃ کوثر نازل ہوئی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ نے یہیں اسلام قبول کیا تھا۔ یہاں بہت ہی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی چھت کے بغیر.... مسجد الکوثر سے ہم سیدھے جبل

نور کی طرف گئے۔ غار حرا اسی پہاڑ پر ہے۔ یہاں بھی چڑھائی کا معاملہ غار ثور جیسا تھا۔ جبل الرحمت کی طرح یہاں بھی سعودی حکومت نے ایک بورڈ لگا رکھا تھا کہ غارِ حرا صرف ایک تاریخی مقام ہے۔ اس کی کوئی مقدس اہمیت نہیں ہے۔ قرآن یا حدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا وغیرہ وغیرہ۔ مطلب وہی ''موحدانہ'' تھا کہ شرک سے اجتناب کریں۔ جس غار میں آنحضرت ﷺ ایک لمبے عرصے تک عبادت و ریاضت میں مشغول رہے، جہاں قرآن پاک کی پہلی وحی نازل ہوئی۔ اگر وہ بھی مقدس مقام نہیں ہے تو پھر مقامات مقدّسہ کیا ہوتے ہیں؟ کیسے ہوتے ہیں؟....مفروضہ شرک سے بچنے کے لئے ہی غالباً ''موحد'' سعودی حکومت نے جبل نور کا علاقہ تعمیراتی مقاصد کے لئے فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران عوام الناس تک تو خبریں نہیں پہنچیں لیکن بعض مسلمان حکومتوں نے اندر ہی اندر سعودی حکومت سے نیازمندانہ گذارش کر کے انہیں اس ''موحدانہ عمل'' سے روک لیا تھا۔ تاہم اس کے آس پاس جو تعمیرات ہو چکی تھیں وہ اب بھی موجود ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ غار حرا سلامت موجود ہے۔

غار حرا سے واپسی پر رستے میں بچوں کا ایک پارک دیکھا۔ یہ پارک اس مقام پر ہے جہاں حضرت عمر فاروقؓ نے عدل سے کام لیتے ہوئے اپنے بیٹے کو شرعی سزا دی تھی۔ بیٹا مقررہ کوڑے پورے ہونے سے پہلے ہلاک ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کی لاش پر باقی کوڑوں کی گنتی مکمل کی جائے۔ یوں عدلِ عمر فاروقؓ کی ایک مثال قائم ہوئی۔ اس جگہ کو میدان العدل بھی کہتے ہیں۔ اب یہاں بچوں کا پارک بنا دیا گیا ہے۔ آخر میں حرم شریف کے قریب موجود مسجد الناقہ دیکھی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرت ﷺ کی اونٹنی بیٹھی تھی اور حضور نے وہیں پڑاؤ کا حکم دے دیا تھا۔ یہیں ابوسفیان نے دس ہزار صحابہء کرام کو حضورؐ کی امامت میں نماز پڑھتے دیکھا تھا اور مبہوت رہ گیا تھا کہ جس یتیم اور بظاہر بے آسرا ہستی کو ہم نے مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا آج اس کی شان اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کے جھکنے پر دس ہزار افراد ایک ساتھ جھک جاتے ہیں اور اس کے اٹھنے پر ایک ساتھ اٹھ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور پھر حضرت ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

☆☆☆

چوتھا عمرہ

سوا نو بجے زیارات سے واپسی ہوئی تو جرمنی میں گھر پر فون کر کے بچوں کی خیریت معلوم کی۔ رضوانہ اپنے گھر (Fulda) سے آ چکی تھی اور سارے بچے خیریت سے تھے۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر ''ناشتہ کم لنچ'' کیا اور سو گئے۔ گہری اور مزے کی نیند آئی۔ ظہر کی نماز کے لئے بروقت بیدار ہوئے۔ ظہر کی نماز کے لئے میں حرم شریف میں جس جگہ کھڑا ہوا تھا وہاں سے خانہ کعبہ دکھائی نہیں دیتا۔ شاید مسلسل دیدار کے بعد اب تھوڑا سا حجاب ضروری ہو گیا تھا۔ عصر کی نماز بھی اسی حجاب کے عالم میں ادا ہوئی۔ عصر کی نماز کے بعد پھر تھوڑی سی خریداری کی۔ یہ تھوڑی سی خریداری بھی اتنی زیادہ تھی کہ مجھے تشویش ہونے لگی ہم مدینہ منوّرہ بھی جا سکیں گے یا نہیں؟

مغرب کی نماز کے لئے ہم باب النبیؐ سے اندر آئے۔ پھر یاد نہیں دائیں مڑے یا بائیں۔ جس صف میں جگہ ملی وہاں سے میزاب الرحمت، حطیم، رکن عراقی، ملتزم، مقام ابراہیم اور حجر اسود۔۔۔۔ سارے نظارے دکھائی دے رہے تھے۔ صرف حطیم کا کچھ حصہ نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے بائیں طرف والے صاحب پر تھوڑا سا بوجھ ڈالا تو وہ تھوڑا سا پرے سرک گئے۔ مجھے تھوڑا سا بائیں جانب ہونے کے لئے جگہ مل گئی اور اب حطیم کا وہ حصہ بھی میرے سامنے تھا جسے میں نگاہوں میں رکھنا چاہتا تھا۔ مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد میں اور مبارکہ پھر مسجد عائشہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ میں ہماری آمد سے پہلے ڈیڑھ دو ہفتے تک بارشیں ہوتی رہی تھیں۔ یہاں کی سڑکیں Heat Proof بنائی گئی ہیں تاکہ یہاں کی شدید گرمی

کے باعث سڑکیں خراب نہ ہوں لیکن مسلسل بارشوں نے سڑکوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہاں اتنی زیادہ بارش شاید آدھی صدی کے بعد ہوئی تھی۔ ہم مسجد عائشہ جانے کے لئے حرم شریف سے باہر نکلے تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ مسجد عائشہ پہنچ کر غسل کر کے، احرام باندھ کے، قریب کی ایک دوکان سے چھتری خریدی۔ پھر دو نفل پڑھے۔ نیت عمرہ کی اور تلبیہ پڑھتے ہوئے حرم شریف آئے۔ یہاں پہنچنے تک بارش رُک گئی تھی۔ حرم شریف کے باہر اور صحنِ کعبہ میں بارش کے پانی کو جذب کرنے کے لئے خود کار مشینیں کام کر رہی تھیں۔ دم بھر میں صحنِ کعبہ کا فرش چمک اٹھا۔ صفائی کا اتنا بروقت اور عمدہ انتظام دیکھ کر سعودی بادشاہوں کے لئے دل سے دعا نکلی۔ ان کے انتہا پسند ''موحدانہ'' عقائد اپنی جگہ....ان کے بہت سارے شاہانہ معاملات اپنی جگہ...اور ان کے عالمی سیاسی کردار سے اختلاف کے باوجود ان کی خدمت کعبہ بلکہ خدمت حرمین شریفین کا اعتراف نہ کرنا کم ظرفی ہو گا۔ اللہ انہیں خدمت کی اس سعادت کے طفیل اپنی خامیاں دور کرنے کی توفیق بخش دے۔ نماز عشا ادا کی تو اس میں سعودی خاندان کے لئے یہی دعا کی....میں بے تکی مشرکانہ رسومات کو اچھا نہیں سمجھتا لیکن سخت دلی والا موحدانہ رویہ بھی کوئی صحت مند رویہ نہیں ہے۔ خدا کو براہ راست نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں، نہ سمجھ کر مان سکتے ہیں۔ خدا کے پیغمبروں کے وسیلے سے ہی اسے دیکھا ہے، جانا ہے اور مانا ہے۔ پیغمبروں کی عدم موجودگی میں ولیوں اور صوفیوں نے کسی حد تک وسیلے کا کام کیا ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص اپنی روحانی طاقتوں کو بیدار اور متحرک کر کے کسی وسیلے کے بغیر بھی خدا سے تعلق قائم کر سکتا ہو لیکن اس کے لئے جس روحانی اور جسمانی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ عامۃ الناس کو تو کسی نہ کسی وسیلے پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ چاہے وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا ہو اور چاہے حضرت امام عبدالوہاب ہی کا وسیلہ کیوں نہ ہو۔

عشاء کی نماز کے بعد ہم نے طواف شروع کیا۔ آج کے عمرہ میں مبارکہ نے اپنے پانچوں بچوں کے لئے دعائیں کیں جبکہ میں نے اپنے تایا جی کی طرف سے عمرہ ادا کیا۔ تایا جی کو ہم سب بابا جی کہا کرتے تھے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے ابا جی پر بھی احسانات کئے تھے اور

ہم پر بھی۔ان کے نزدیک یہ احسانات....احسانات نہیں تھے بلکہ صرف بھائی سے اور بھائی کی اولاد سے ان کی محبت تھی۔ باباجی سیدھے سادے مسلمان تھے انہیں کامل یقین تھا کہ مولا پاک انہیں اپنے پیارے حبیبؐ کے صدقے بخش دے گا۔انہیں آنحضرتﷺ کے بارے میں بھی مکمل یقین تھا کہ وہ ضرور ان کی شفاعت فرمائیں گے۔ باباجی علم کے گورکھ دھندے سے بچے ہوئے تھے اسی لئے یقین کی دولت سے مالا مال تھے۔میں جب ان کے یقین اور اپنے تذبذب کا موازنہ کرتا ہوں تو خود کو بہت ہی غریب اور جاہل محسوس کرتا ہوں۔

طوافِ کعبہ سے سعی تک عمرہ کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد ہم نے حجرِ اسود کے سامنے اس کی سیدھ کو ظاہر کرنے والی پٹی پر کھڑے ہو کر نوافل ادا کئے۔اس پٹی سے کھڑے ہو کر دیکھا تو سامنے حجر اسود، بائیں جانب رکن یمانی اور دائیں جانب سے ملتزم، مقام ابراہیم، رکن عراقی کے ساتھ حطیم کا ایک کونہ بھی اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ میں خانہ کعبہ کو زاویے اور سمتیں بدل بدل کر مختلف مناظر کے ساتھ دیکھ سکتا تھا لیکن ایک ہی وقت میں پورے کا پورا کعبہ مکمل طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔بقیہ حصہ دیکھنے کے لئے سامنے کی جگہ چھوڑ کر عقبی حصہ میں جانا ضروری ہو جاتا ہے گویا ہم کسی شے کو کسی ایک طرف سے پوری طرح، مکمل طور پر نہیں دیکھ سکتے۔معمولی سا سکہ ہاتھ میں لے کر دیکھ لیں۔ہاتھ میں ہونے کے باوجود ہم ایک وقت میں اس کا ایک رُخ ہی دیکھ سکیں گے اور جب دوسرا رُخ سامنے لائیں گے تو پہلا رُخ نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔وحدت اور کثرت کا معاملہ بھی شاید کچھ ایسا ہی ہے۔ جب وحدت کا رُخ سامنے ہوتا ہے تو کثرت کا رُخ غائب ہوتا ہے اور جب کثرت کا رُخ سامنے ہوتا ہے تو وحدت کا رُخ غائب ہو جاتا ہے حالانکہ بظاہر دکھائی نہ دینے کے باوجود اس کے عقب میں ہی موجود ہوتا ہے۔ وحدت اور کثرت کے کھیل پر سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں گئے۔کھانا کھایا اور پھر وحدت و کثرت دونوں سے بے خبر ہو کر سو گئے۔

☆☆☆

پانچواں عمرہ

۵/دسمبر کو صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی ہم دونوں تیار ہو کر تہجد کے وقت حرم شریف پہنچ گئے۔میں نے رکن یمانی کی سیدھ میں، مطاف سے باہر دیوارِ کعبہ کے لئے ایک نیا زاویہ تلاش کیا۔یہاں سے رکن یمانی کے علاوہ بائیں طرف سے حطیم کا ایک حصہ، رکن شامی اور دائیں طرف سے حجر اسود کے کونے کے ساتھ مقام ابراہیم کی نامکمل جھلک....یہ مناظر میرے سامنے تھے۔میں نے اندازہ کیا کہ اگر میں چھ سات صفیں اسی سیدھ میں پیچھے چلا جاتا تو مقام ابراہیم پوری طرح سامنے ہوتا اور حطیم بھی تھوڑا سا اور نمایاں ہو جاتا۔رات وحدت اور کثرت کا جو خیال شدت کے ساتھ آیا تھا اب کچھ اور سمجھ میں آنے لگا تھا۔فاصلے سے کثرت اور قربت سے وحدت آشکار ہوتی ہے:

کثرت کی زبانی ہیں
کعبہ کی دیواریں
وحدت کی نشانی ہیں

خانہ کعبہ کی چاروں دیواریں، ان سے منسلک تبرّکات، حتیٰ کہ خانہ کعبہ کی چھت اور بنیادیں بھی کثرت کی مظہر ہیں لیکن یہ کثرت ایک وحدت کی ترجمان ہے...خانہ کعبہ کی وحدت... مجھے یاد آیا ایک بار میں خانہ کعبہ کی ایک دیوار سے لپٹا ہوا تھا۔اس قربت کو وصال محبوب جیسی سمجھ لیں تو یہ وحدت کا جلوہ تھا کہ اُس لمحے میں میری اپنی نفی ہو گئی تھی۔میرے لئے دیوار کے اسی حصے

میں سارا کعبہ سمٹ آیا تھا اور میرا وجود رہا ہی نہیں تھا۔قربت کے نتیجہ میں یہ وحدت کا ایک نقشہ تھا۔ لیکن جیسے ہی میں دیوار سے الگ ہوا قربت کی جگہ فاصلہ ابھرا۔میرا وجود ظاہر ہوا،اور پھر کثرت ظاہر ہوتی گئی۔ میں اپنی دانست میں کعبہ سے لپٹا ہوا تھا لیکن وہ تو کعبہ کی صرف ایک طرف کی دیوار کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ پھر باقی تین دیواریں،حطیم،میزاب الرحمت،ملتزم،حجر اسود،رکن عراقی،رکن شامی،رکن یمانی،مطاف...گویا تھوڑے فاصلے سے کعبہ کے گرد چکر لگا کر دیکھیں تو جلووں کی کثرت ہی کثرت ہے۔لیکن یہ کثرت،وحدت کی علمبردار ہے ؎

تیری وحدت سے سمجھ پائے تجھے
اور کثرت میں نظارا کر لیا

نماز ظہر میں نے ''باب الفتح'' والے رستے کی قریب کی ایک صف میں ادا کی۔نماز عصر حرم شریف کے اندرونی حصہ میں ادا کی،نمازِ مغرب بھی اسی طرح ادا کی۔نماز مغرب کے بعد میں اور مبارکہ پھر مسجد عائشہ کی طرف عازمِ سفر ہوئے۔وہاں حسبِ معمول غسل کیا،نفل پڑھے،عمرہ کی نیت کی اور **لبیك اللھم لبیك**...کا ورد کرتے ہوئے حرم شریف واپس پہنچے۔ہمارے پہنچنے تک نماز عشاء کے لئے جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ہمیں حرم شریف کے باہر بے شمار لوگوں کی بنائی ہوئی صفوں میں جگہ ملی۔آخری رکعت میں شمولیت سے با جماعت نماز میں شرکت بھی ہو گئی۔فرض ادا کرنے کے بعد ہم نے سیدھا حطیم کا رخ کیا۔وہاں سنّتیں اور نوافل ادا کئے اور پھر طواف کعبہ سے عمرہ کا آغاز کیا۔ویسے تو عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ کے ورد سے ہی عمرہ کا آغاز ہو جاتا ہے لیکن مجھے ہمیشہ ایسے لگتا رہا ہے کہ جب تک طواف شروع نہ ہو،عمرہ محسوس ہی نہیں ہوتا۔مبارکہ نے اس بار بہت سارے عزیز و اقارب کے لئے خصوصی دعاؤں کے طور پر یہ عمرہ کیا جبکہ میرا یہ عمرہ اپنے دادا جی کی طرف سے تھا۔

میرے پردادا حضرت میاں میر محمد گڑھی اختیار خاں (خانپور) کے ایک اہم پیر تھے۔ ''آبائی پیشہ'' یہی سلسلہ تھا۔میرے دادا جی میاں اللہ رکھا اس لحاظ سے انقلابی آدمی تھے کہ انہوں نے معصوم اور بے خبر لوگوں کے سامنے روحانیت کا ڈھونگ رچا کر ان کے جذبوں کا استحصال

کرنے کی بجائے یہ سلسلہ ہی ترک کر دیا۔گڑھی کو چھوڑ کر خانپور چلے آئے۔قیام پاکستان سے پہلے ہی دادا جی فوت ہو گئے تھے۔ میں نے ان کی تصویر بھی نہیں دیکھی۔لیکن میرے لہو میں اور میری سانسوں میں ان کی ایک تصویر ہے جو میری ہی طرح ہے...میں اپنے ننھیالی رشتہ داروں میں بعض ایسے کزنز کو جانتا ہوں جنہیں اپنے دادا کی محبت اور شفقت ملی لیکن وہ اس بے بہا دولت کی قدر نہ کر سکے۔اپنے دادا جی سے میری محبت بے شک میرے اندر سے پھوٹی تھی لیکن اس کا بیج تو ابا جی نے بویا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اپنے بزرگوں کی اس محبت کو میں اپنی اولاد کے اندر بھی اُگا سکا ہوں۔''اللہ کو اسی طرح یاد کرو جیسے اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ''... پر جو لوگ اپنے باپ دادوں تک کو بھلا بیٹھے ہوں وہ اللہ کو بھی کیا یاد کریں گے...میں اللہ کو یاد کروں نہ کروں پر اپنے باپ دادوں کو ہمیشہ یاد رکھتا ہوں۔ بہر حال آج کا عمرہ اس لحاظ سے پُر لطف رہا کہ میں ایک طرف اپنے دادا جی کے لئے دعائیں کر رہا تھا تو دوسری طرف اپنی اولاد کے لئے دعائیں کرتے ہوئے خود دادا بن جانے کی تمنا کر رہا تھا...دادا بننے کی دعا نے مجھے جیسے جوان کر دیا تھا۔ مجھے لگتا ہے اندر ہی اندر مبارکہ پر بھی اس دعا کا اثر ہوا ہو گا کیونکہ ابھی تک ہر عمرہ کے بعد ہم ہمیشہ گرتے پڑتے اپنے کمرہ تک جایا کرتے تھے لیکن آج ہم دونوں ہی تازہ دَم تھے۔سو ہوٹل کی طرف جانے کی بجائے مارکیٹ کی طرف چلے گئے۔آج کی خریداری ملبوسات اور چھوٹے موٹے تحائف تک محدود رہی جس سے مجھے تھوڑا سا اطمینان ہوا۔دراصل پچھلے دو تین دن کی شاپنگ کے انداز سے میں گھبرا گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ مروہ کے مقام پر قینچی لے کر نہ کھڑا ہونا پڑ جائے....آج کی شاپنگ پر خدا کا شکر اور مبارکہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے واپس چلنے کی بات کی اور پھر ہم اپنے کمرہ میں آ گئے۔کھانا کھایا اور پھر خود پر خدا کے بے شمار فضل و احسانات کا تذکرہ کرتے کرتے ہم نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

☆☆☆

چھٹا عمرہ

۶ ردسمبر کا دن ہمارے لئے اس وجہ سے بے حد اہم تھا کہ یہ ارضِ حجاز پر ہمارا پہلا یوم الجمعہ تھا۔مبارکہ خواتین والے حصے میں چلی گئی۔ میں نے ''باب الملک'' کے سامنے والی دیوارِ کعبہ کے سائے میں نفل ادا کئے۔نماز فجر ادا کی۔اپنی معمول کی دعاؤں اور تسبیحات سے فارغ ہوکرسورۃ یاسین اور سورۃ صافات پڑھیں اور پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھاکرایک دلی مراد مانگی۔آنحضرتﷺ کا یہ ارشاد گرامی میں نے ایک بار کہیں پڑھا تھا کہ جمعہ کے دن یہ دونوں سورتیں پڑھ کر خدا سے جو مراد مانگی جائے وہ عطا کردی جاتی ہے۔میں تب سے مسلسل تجربہ کررہا ہوں۔ایک وقت میں صرف ایک ہی مراد مانگنی ہوتی ہے سو چھوٹا موٹا مسئلہ ہوتو ایک دو جمعوں میں ہی کام ہوجاتا ہے۔کام بے حد مشکل ہوتو پھر مسلسل ڈیڑھ دو ماہ تک یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک مذکورہ سورتیں پڑھ کردلی مراد مانگنی ہوتی ہے۔

میں نے اس تجربے کی برکت سے ایسے ایسے کام خدا سے کرائے ہیں جو صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن قسم کے تھے۔ہاں کبھی کبھار یوں بھی ہوا کہ کوئی خواہش ہمیں اپنے حق میں اچھی لگی....جب وہ مراد پوری نہیں ہوئی تو اس کا وہ پہلو واضح ہوکرسامنے آگیا کہ اس کا پورا ہونا ہمارے لئے خوشی کی بجائے دکھ اوراذیت کا موجب بن جاتا۔یوں ایسی دعا کا قبول نہ ہونا خود ہمارے لئے بہتری کا موجب بنا ہے۔سواس قسم کی چند مستثنیات کو چھوڑ کران سورتوں کو پڑھنے کے بعد کوئی ایک مراد مانگنے سے مجھے ہمیشہ دلی مراد ملی ہے۔میرا دعا کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

نمازاور دعا کے بعد میں اور مبارکہ ''باب الندوہ'' سے باہر آئے۔پھر وہیں بیرونی رستے سے اوپر کی منزل پر جانے والی سیڑھیوں سے اوپر چلے گئے۔وہاں میں نے ''باب الندوہ'' کی سیدھ میں آگے تک جا کر خانہ کعبہ کی طرف دیکھا تو ایک بالکل نیا منظر میرے سامنے تھا۔زائرین میں شامل ہوکر طواف کرنے کے منظر،اور کسی زاویے سے کعبے کے سامنے بیٹھ کر دیدار کرنے کے منظر سے بالکل مختلف....اب کعبہ بھی میرے سامنے تھا اور کعبہ کے گرد مستانہ وار رقص کرتے ہوئے پروانے بھی میرے سامنے تھے۔عجیب روح پرور اور دل کش نظارا تھا۔مختلف اطراف میں بیٹھ کر کعبہ کو اب تک سامنے سے جتنا زیادہ سے زیادہ دیکھ چکا تھا،ان ابعاد میں اب ایک نئے بُعد کا اضافہ ہوگیا تھا۔جیسے خلا کے تین ابعاد میں وقت چوتھے بُعد کے طور پر دریافت ہوا ہے۔اب کعبہ کے رکن یمانی کو چھوڑ کر باقی سارے منظر بھی میرے سامنے تھے اور کعبہ کی چھت بھی میرے سامنے تھی۔میں اوپر کی منزل پر کھڑا ہونے کے باعث کعبہ کی چھت سے زیادہ اونچائی پر تھا۔ہلکا سا احساس ہوا کہ کہیں یہ بے ادبی نہ ہو....پھر مجھے اپنے بچپن کے وہ منظر یاد آئے جب اباجی میری ننھی منی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے پیار سے اونچا اٹھا لیتے تھے۔تب میں اباجی سے اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود ان سے اونچا ہوجاتا تھا۔پررہتا تو اُنہیں کے ہاتھوں میں تھا۔ساتھ ہی قرآن شریف کی اس آیت کو یاد کرلیا کہ خدا کو اس طرح یاد کرو جیسے اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو....سو بے ادبی کا احساس کم ہونے لگا۔پھر میں نے نیچے طواف کرنے والوں کے ساتھ اوپر کی منزل پر ہی دائیں طرف سے پورا لمبا چکر کاٹنا چاہا۔مبارکہ میرے ارادے سے گھبرا گئی کہ اس کے لئے اتنا لمبا چکر کاٹنا دشوار تھا۔میں نے اسے تسلی دی کہ آپ یہیں بیٹھ کر اللہ اللہ کریں،میں اکیلا ہی یہ چکر لگا کر آتا ہوں۔چنانچہ میں نے اکیلے حرم شریف کی بالائی منزل سے کعبہ کے چاروں طرف کا چکر مکمل کیا۔یہ چکر طوافِ کعبہ کے سات چکروں کے برابر محسوس ہوا۔فاصلہ زیادہ اور عام رفتار ہونے کے باعث میں نے دیکھا کہ مناظر میں تبدیلی ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔بس آہستہ آہستہ اوجھل ہوتے منظر میں نیا منظر ابھرتا چلا آتا تھا جب بالکل دوسرے زاویے پر پہنچا تب پتہ چلتا کہ منظر میں کوئی تبدیلی آگئی ہے...نیچے کو وہ صفا اور مروہ تک سعی کے لئے حصہ مخصوص ہے

اسی کے اوپر سعی کے لئے دوہری منزل بنادی گئی ہے تاکہ حج کے دنوں میں رش کے باعث حجاج کرام وہاں سے بھی سعی کر سکیں۔ یہ ایک اچھی سہولت لگی۔صفا کی پہاڑی کا تھوڑا سا حصہ زائرین کے لئے ہے۔باقی حصے پر شاہی محلّات بن گئے ہیں۔یہ محلّات حرم شریف کے ساتھ ہی ہیں لیکن اس سے کافی بلند وبالا ہیں۔ مجھے بعض محتاط قسم کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ سعودی حکمران اور شہزادے اپنے محلوں ہی میں نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔کچھ عرصہ پہلے میں نے پاکستان میں بھی کہیں یہ خبر پڑھی تھی کہ منسلکہ شاہی محلوں کے بارے میں فتویٰ حاصل کیا گیا ہے کہ یہ بھی حرم شریف کا حصہ ہیں۔یوں سعودی خاندان گھر بیٹھے نماز باجماعت میں شرکت کر لیتا ہے۔اگر واقعتاً ایسا ہے تو بے حد افسوسناک ہے۔حرم شریف کے وضوخانے اور باتھ روم بھی حدودِ حرم سے باہر ہیں لیکن اگر شاہی محلات کو حدودِ حرم میں شامل ماننے کا فتویٰ حاصل کیا گیا ہے تو اس کا مطلب ہے شاہی خاندان کے بیڈروم، باتھ روم بھی حدودِ حرم میں شامل ہیں۔خدا کرے اس سلسلے میں کوئی احتیاطی تدبیر ضرور کر لی گئی ہو۔ایسا ہے یا نہیں ہے؟ اس سلسلے میں صحیح صورتحال واضح ہونی چاہئے....سعودی عرب میں ہر دلعزیز شاہی خاندان کو اپنے عوام سے اتنا بھی نہیں گھبرانا چاہیے کہ حرم شریف میں آکر نماز باجماعت بھی نہ پڑھ سکیں اور اپنی سیاسی ضرورتوں کے چکر میں حرم شریف کے تقدس کو مجروح کرنے لگیں۔فتویٰ فروشوں کا کیا ہے وہ تو بلا امتیاز ہر فرقہ میں ہر وقت دستیاب ہیں جس طرح کا چاہیں دل پسند فتویٰ مانگ لیں، من پسند استخارہ کرا لیں، حسبِ منشا خدمات حاضر ہیں۔

خانہ کعبہ کے بالائی نظارہ کے بعد ہم لوگ اپنے کمرہ میں گئے۔وہاں ناشتہ کیا۔تھوڑی سی نیند کی۔ بیدار ہو کر جمعہ نماز پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔جیسے ہی ہم تیار ہوئے پہلی اذان ہونے لگی۔ہم اطمینان سے حرم شریف کی طرف روانہ ہوئے۔خیال تھا کہ کسی نئے زاویے سے بیٹھ کر دیدارِ کعبہ کروں گا اور جمعہ نماز ادا کروں گا لیکن یہاں تو انسانوں کا غیر معمولی سیلاب آیا ہوا تھا۔نچلی منزل میں تو جگہ ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔مجبوراً دوسری منزل پر گئے مگر یہاں بھی نمازیوں کا ہجوم دیدنی تھا۔بس جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے اور اسی کو اپنے لئے اعزاز جانا۔نماز جمعہ کے

بعد سیڑھیوں سے اترتے ہوئے بھی دیکھا اور پھر باہر آکر سڑک کی طرف بنے اونچے فٹ پاتھ سے بھی نظر دوڑائی....حد نگاہ تک نمازیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوں دریا تھا۔جس طرف دیکھیں نمازی ہی نمازی.... یہ جمعہ کے دن کا حال تھا۔ عام جمعہ......تو پھر جمعۃ الوداع اور عید پر کیا حال ہوتا ہوگا۔میں اندازہ نہیں کر سکتا۔حج کے دنوں کا تو خیر معاملہ ہی الگ ہے۔اپنے کمرے میں آکر ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔مبارکہ نے تھوڑا سا آرام کیا۔آج ہم نے بعد نماز عشاء عمرہ کرنا ہے اور کل ہمارا مدینہ منوّرہ جانے کا پروگرام ہے۔ بیٹھے بیٹھے مجھے ایک بھولی بسری نعت کے بول یاد آنے لگے اور میں غیر ارادی طور پر انہیں گنگنانے لگا۔یہ نعت غالباً شمشاد بیگم کی آواز میں تھی:

پیغام صبا لائی ہے گلزارِ نبیؐ سے
آیا ہے بلاوا مجھے دربارِ نبیؐ سے

نماز عصر کے لئے ہم ’’باب العمرہ‘‘ سے گذر کر حرم شریف میں داخل ہوئے۔نماز مغرب کے لئے ’’باب الملک فہد‘‘ سے گذر کر اندر گئے۔اسی سیدھ میں مطاف سے باہر کعبہ کے سامنے جاکر نماز کے لئے جگہ حاصل کی۔نماز سے پہلے میں نے سوچا کے خانہ کعبہ کی اس سامنے کی دیوار، دائیں جانب رکن یمانی، اور بائیں جانب حطیم اور میزاب الرحمت کو پہلے صاف اور واضح طور پر بھی دیکھ چکا ہوں اور اسی ’’باب الملک فہد‘‘ کی سیدھ میں بالکل پیچھے، حرم شریف کے اندر کعبہ سے اوجھل ہو کر بھی بیٹھ چکا ہوں۔ گویا حجاب اور بے حجابی کے دونوں مرحلے طے کر چکا ہوں۔ اب کوئی اور مرحلۂ شوق ہونا چاہیے۔سو میں نے اپنی ۳.۲۵۔نمبر کی (دور کی نظر کی) عینک اتار دی اور سامنے دیکھنے لگا۔وہاں سارے مقامات وہی تھے لیکن اب ان میں ہلکی سی دھندلاہٹ کے باعث حجاب اور بے حجابی کے درمیان کی کوئی صورت بن گئی تھی۔اردگرد لگی ہوئی تیز روشنیوں کی روشنی تھوڑی سی مدھم لگنے لگی تھی اور ان کے ہالے نسبتاً بڑے ہو گئے تھے۔دیدارِ کعبہ کا ایک اور زاویہ مجھے نصیب ہو گیا تھا۔ ذاتی طور پر میرے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔میں اس وقت تک اس تجربے سے سرور حاصل کرتا رہا جب تک نماز مغرب کے لئے جماعت کھڑی نہ ہو گئی۔نماز مغرب کے بعد ہم پھر مسجدِ عائشہ کی طرف گامزن تھے۔حسبِ معمول غسل کیا،

نیت عمرہ کی،اطمینان سے بس پکڑی اور **لبیك اللھم لبیك**...کا ورد کرتے ہوئے حرم شریف کی جانب روانہ ہوئے۔بس اطمینان سے اس لیے پکڑی کہ مغرب اور عشاء کی نمازوں کا درمیانی وقفہ کم ہوتا جا رہا ہے۔

کل بھی ہم تقریباً بھاگ کر آخری رکعت حاصل کر سکے تھے۔اطمینان سے آنے کے نتیجہ میں ہمارے حرم شریف پہنچنے تک نمازِ عشاء ہو چکی تھی۔ہم اپنے ہوٹل کے قریب والے بس اسٹاپ کی بجائے بس اڈے پر جا کر اترے۔وہاں سے حرم شریف کے مین گیٹ سے داخل ہوئے تو ہمارے سامنے تین دروازے تھے۔''باب النبیؐ''۔''باب العباسؓ''اور''باب علیؑ''۔پہلے دو دروازوں سے ہم پہلے بھی داخل ہو چکے تھے اس لیے میں نے چاہا کہ اس بار''باب علیؑ''سے اندر جائیں لیکن ''باب علیؑ''بند کیا جا چکا تھا(رات کو بعض دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں)۔اس کے ساتھ دائیں طرف''باب العباس''کھلا ہوا تھا،وہیں سے اندر داخل ہو کر میں''باب علیؑ''کی سیدھ میں آ گیا۔ عین اسی سیدھ میں زم زم کے کنویں کے سامنے حرم شریف کی پہلی صف میں جگہ کا انتخاب کیا لیکن یہ کیا؟دائیں طرف حطیم،میزاب الرحمت،رکن عراقی،سامنے مقام ابراہیم،ملتزم،حجر اسود کا کونہ اور رکن یمانی والا کونہ....اتنے سارے منظر ایک ہی جگہ بیٹھنے سے دکھائی دے رہے تھے۔صرف یہی نہیں،آب زم زم کا کنواں بھی بالکل میرے سامنے تھا....مجھے حدیث شریف یاد آ گئی:''میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے''....کثرتِ نظارا اور فراوانیٔ شوق.....حیدرِ بے قرار نے پورے زور کے ساتھ حیدرِ کرار کے نام کا نعرہ لگایا...نعرۂ حیدری:یا علی!.....یہ نعرۂ مستانہ میں نے من ہی من میں لگایا تھا اور اس کی گونج بھی میرے دل ہی میں دیر تک ارتعاش پیدا کرتی رہی۔

لطف آ گیا جینے میں
نور مناظر کا
جب بھر گیا سینے میں

مبارکہ نے میرے ساتھ کھڑے ہو کر نماز عشاء ادا کی۔دراصل نماز باجماعت کے وقت خواتین کو الگ حصے میں بھیج دیا جاتا ہے۔باقی وقت میں زیادہ پابندی نہیں لگائی جاتی۔مبارکہ عشاء

کی نماز پڑھ کر تسبیح وتحمید میں مشغول تھی۔میں جب نماز سے فارغ ہوا تو اس کے تسبیح کرتے ہونٹوں کے باوجود اس کے چہرے سے اکتاہٹ اور بیزاری کو صاف دیکھ رہا تھا۔مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھے نماز پڑھنے میں زیادہ دیر لگ گئی ہے۔لیکن میں اسے کیا بتاتا کہ میں کس موج میں آیا ہوا تھا۔بس اسے مختصراً سامنے کے سارے مناظر کی نشاندہی کر دی۔پتہ نہیں اسے بات پوری طرح سمجھ میں آئی بھی یا نہیں....نماز پڑھنے کے بعد ہم نے طواف کعبہ کا آغاز کیا۔یہ عمرہ مبارکہ نے اپنے پانچوں بچوں کی زندگیوں اور زندگی کی خوشیوں کی دعاؤں کے لئے مخصوص رکھا جبکہ میرا عمرہ اپنی دادی اماں''صاحب خاتوں''کی طرف سے تھا۔میری دادی اماں تب فوت ہو گئی تھیں جب ابا جی کی عمر چھ سال کے لگ بھگ تھی۔ابا جی رحیم یار خاں میں قیام کے عرصہ میں ہر سال محرّم کی دس تاریخ کو ہم سب کو قبرستان لے جاتے۔وہاں دادی جان کی قبر پر دعا کرتے۔جب ہم خانپور آ گئے تب سے ابا جی کا جب بھی کسی کام سے رحیم یار خاں جانا ہوتا وہ دادی جان کی قبر پر دعا کرنے کے لئے ضرور جاتے۔مجھے یاد ہے ایک بار ابا جی رحیم یار خاں سے واپس آئے تو بے حد اداس لگے۔بتانے لگے قبرستان بہت پھیل گیا ہے۔تلاش کے باوجود اماں کی قبر نہیں ملی پھر قبرستان کے گیٹ پر ہی دعا کر کے آ گیا ہوں۔قبر کیا کھوئی تھی ایسے لگا تھا جیسے دادی جان ابھی ابھی فوت ہو گئی ہیں۔یہ قبروں کا بھی عجیب سا جادو ہوتا ہے۔مٹی کا جادو....شاید دھرتی ماں کی کشش ہوتی ہے:

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

طواف کعبہ کے بعد ہم سعی کے لئے کوہ صفا سے مروہ کی طرف روانہ ہوئے۔صفا سے مروہ کی طرف جاتے ہوئے سبز ستونوں والی ایک مخصوص جگہ آتی ہے۔اسے اخضر میلین کہتے ہیں۔اس حصے میں مردوں کو جھپٹتے ہوئے تیز تیز چلنے کا حکم ہے لیکن عورتیں صرف اپنی عام رفتار سے ہی گذرتی ہیں۔پہلے تو مجھے خیال آیا کہ یہاں بے قراری سے تو ایک عورت(حضرت بی بی ہاجرہ) دوڑتی پھر رہی تھی جس کی یاد میں ہم سب سعی کرتے ہیں لیکن اب ہم نے عورتوں کے دوڑنے پر پابندی لگا کر خود دوڑنے کی اجازت لے لی ہے۔لیکن پھر خیال آیا کہ حضرت بی بی ہاجرہ نے جس

بے قراری سے بھاگ دوڑ کی تھی اس سے تو ساری دنیا کی عورتوں کا حصہ بھی انہوں نے پورا کر دیا تھا۔شاید اسی لئے اب عورتوں کو اس معاملے میں رعائت ملی ہے۔اخضر میلین والے حصہ سے گذرتے ہوئے جو دعائیں کی جائیں ان کے بارے میں روایت ہے کہ خصوصی طور پر قبول کی جاتی ہیں۔

۷؍دسمبر کو ہمیں مدینہ منورہ جانا تھا۔تہجد کی اذان کے ساتھ ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔ باتھ روم سے فراغت کے بعد مبارکہ کو جگایا اس نے تیاری کر لی تو ہم حرم شریف کی طرف روانہ ہوئے۔میں نے آج حجرِ اسود کے سامنے نماز پڑھنے کے لئے جگہ بنالی۔یوں تو دن رات کسی وقفے کے بغیر خانہ کعبہ کے طواف کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور سب سے زیادہ ہجوم حجرِ اسود کے سامنے ہوتا ہے لیکن نماز باجماعت کے وقت طواف رُک جاتا ہے۔سو اس مختصر سے وقفہ کے دوران یہاں سے حجر اسود کی زیارت زیادہ صاف طور سے کرنا ممکن تھا۔میں حجر اسود سے نویں نمبر کی صف میں شامل تھا۔طواف رُک گیا تھا لیکن اگلی صفوں میں ابھی بعض لوگ سنتیں ادا کر رہے تھے اور کسی نہ کسی کے قیام و رکوع کے باعث دیدار میں روک بن جاتی تھی۔آخر یہ روک بھی دور ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے حجر اسود کا جتنا حصہ ظاہر اور باہر تھا سب میری آنکھوں کے سامنے تھا۔باہر سے کوئی سفید اور مضبوط سی دھات اس پر منڈھ دی گئی تھی۔دھات کے اندر بہت بڑے سائز کے کٹورے جیسا حجر اسود دکھائی دے رہا تھا جیسے زنجبیل کا کٹورا ہو...جنتیوں کو زنجبیل کے کٹوروں میں پاک شراب عطا کی جائے گی....زنجبیل کا بڑا سا کٹورہ میرے سامنے تھا...بیئر زم زم سے بھرے خوبصورت کولر میرے آس پاس تھے اور بیئر زم زم کا سرچشمہ میرے نیچے تہہ خانے میں تھا....پل بھر کے لئے میں نے حجر اسود کے منظر سے اپنی آنکھیں روشن اور دل کو مالا مال کر لیا تھا....اس طرف بیٹھنے سے یہ بھی دیکھا کہ امام کعبہ....مقام ابراہیم سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر نماز کی امامت کراتے ہیں۔میرے دائیں طرف ۱۵،۲۰ میٹر کے فاصلے پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔میری صف ان کی صف سے کافی آگے تھی۔ لیکن یہاں پہنچ کر تو ساری سمتیں ہی بے معنی ہو جاتی ہیں۔دائیں، بائیں، آگے، پیچھے...مشرق، مغرب، شمال، جنوب سب بے معنی...بس جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے۔جیسے ہی نماز ختم

ہوئی۔طواف کرنے والے دیوانہ وار اٹھے اور حجر اسود پھر اپنے پروانوں کی اوٹ میں چلا گیا۔بس کبھی کبھی اسکی لَو ہلکی سی جھلک دکھا دیتی تھی۔جہاں تک ممکن تھا شوقِ زیارت نے زاویے بدل بدل کر دیدارِ کعبہ کر لیا تھا۔**کل یوم ھو فی شان** کا نظارا کر لیا تھا۔

☆☆☆

دیارِ نبی مدینہ منورہ

(مسجد نبوی، روضۂ رسولؐ اور جنت البقیع)

اور اب اپنے کعبہ کے کعبہ کا دیدار کرنے کا ارادہ ہے۔ دربار نبیؐ کو میں نے کعبہ کا کعبہ غلط نہیں لکھا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنی ایک نعت میں کیا خوب کہا ہے:

ہم سب کا قبلہ سُوئے کعبہ، سُوئے محمدؐ روئے کعبہ
کعبے کا کعبہ روئے محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ شعر مبالغہ آمیز نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے.... یہاں مجھے فتح مکہ کے موقعہ پر ہونے والا ایک ایمان افروز واقعہ یاد آ گیا ہے۔ حضرت بلالؓ اذان دینے کے لئے خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے آنحضرت ﷺ سے استفسار کرنے لگے کہ ویسے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے اذان دی جاتی ہے لیکن میں تو کعبہ کی چھت پر ہوں۔ اب کس طرف منہ کر کے اذان دوں؟ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میری طرف منہ کر کے اذان دو۔ چنانچہ حضرت بلالؓ نے حضور اکرم ﷺ کے روئے انور کی طرف منہ کر کے اذان دی۔

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ذاتِ خداوندی کا مظہر تھے۔ خدا کو ہم اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ لباس نبوّت کے ذریعے اسے جانا جا سکتا ہے۔ یہ مشرکانہ بات نہیں ہے خود قرآن میں متعدد مقامات پر خدا اور رسول میں یگانگت کو واضح کیا گیا ہے مثلاً:

۱۔ اے رسول جو کنکریاں تو نے ماریں، وہ تو نے نہیں ماریں بلکہ

خدا نے ماریں۔

(سورۃ انفال)

۲۔ جن لوگوں نے تمہارے ہاتھ پر بیعت کی انہوں نے اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ تمہارا ہاتھ نہیں تھا بلکہ اللہ کا ہاتھ تھا۔ **(سورۃ فتح)**

غالبًا اسی آیت کو مدنظر رکھ کر علامہ اقبال نے کہا تھا: ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

اسے محض محاورۃً اور مجازاً کہہ کر جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔ ایک اور واقعہ بھی یاد آ گیا۔ عرب بدّو جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور حضور ﷺ کے مقام و مرتبہ کا انہیں ٹھیک سے علم نہ تھا۔ حضورؐ کے ساتھ چلتے ہوئے یہ بدّو لوگ حضورؐ کو اپنے بھائی جیسا سمجھتے ہوئے ادب کو ملحوظ نہیں رکھتے تھے بلکہ حضورؐ کے آگے آگے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ تب سورۃ الحجرات کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں **"لاتقدموبین یدی الله و رسوله"** کا حکم بھی شامل ہے یعنی مومنو! اللہ اور رسول کے آگے آگے مت چلا کرو....سو رسول کے آگے چلنا، خدا کے آگے چلنا بھی ہے۔ رسول کو دکھ دینے والے خدا کو دکھ دیتے ہیں حالانکہ خدا تو دکھ کے احساس ہی سے بے نیاز ہے۔ سو یہ اور ایسی دیگر آیات رسول کے بشری اور الوہی دونوں پہلوؤں کو واضح کرتی ہیں اور اس میں کوئی شرک بھی نہیں ہے۔ اس سے بھی آگے چلیں.....دن میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ نیت نماز کے وقت اپنی تمام توجہ خدائے واحد کی طرف مبذول کرنے کے ساتھ شرک سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پھر ہر دو رکعت کے بعد بھی اور نماز کی آخری رکعت میں بھی التحیات پڑھی جاتی ہے اور اسی التحیات میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں **'السلام علیك ایها النبی و رحمة الله و برکاته'**.... یا نبی! آپ پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں.... یہ بالکل خطابیہ الفاظ ہیں۔ براہ راست خطاب....سوچنے والی بات ہے کہ جس نماز کی نیت کے وقت ہم پوری توجہ خدائے واحد کی طرف مرکوز کر کے ہر شرک سے اپنی بریت کا اقرار کرتے ہیں، اسی نماز میں خدا کے رسول سے براہ راست بات کیوں کرنے لگتے ہیں؟.....اور کیا ہمارے کٹر قسم کے موحدین کو ان الفاظ کی ادائیگی کرتے وقت کبھی شرک کا احساس ہوا ہے یا نہیں؟

اصل شرک تو کچھ اور ہے جس میں بڑے بڑے موحدین بھی ملوث ہیں۔نص صریح سے ظاہر ہے کہ سب سے بڑا شرک فرقہ بازی ہے۔

۱۔ مشرکوں میں سے مت بنو یعنی ان مشرک لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو پراگندہ کر دیا اور دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور ہر فرقہ اس خیال سے خوش ہے کہ جو ٹکڑا ہم نے لیا ہے وہی بہتر ہے**(سورۃ روم)**

۲۔ جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ ہو گئے (اے رسول!) تیرا ان سے کچھ تعلق نہیں ہے**(سورۃ انعام)**

احادیث کے سلسلے میں میرا ان لوگوں سے مکمل اتفاق ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مستند حدیث بھی نص صریح سے ٹکرائے تو اسے رد کر دیا جائے اور اگر کوئی ضعیف حدیث بھی قرآن سے مطابقت رکھتی ہے تو اسے قبول کر لیا جائے....لیکن یہی بات کہنے والے جب مذکورہ نصوصِ صریحہ کے ہوتے ہوئے فرقہ ناجی والی حدیث سے خود کو سچا فرقہ بتانے لگتے ہیں تو حیرت ہونے لگتی ہے۔بعض کاری گر قسم کے فرقوں نے اپنے سابقوں اور لاحقوں سے فرقہ کا لفظ ہٹا کر کوئی اور متبادل لفظ لگا لیا ہے اور اسی بنیاد پر خود کو گروہوں میں شمار نہیں کرتے۔ایسی خوش فہمی پر اب کیا کہا جائے....شرک کے مسئلے پر یہ بات خاصی طویل ہو گئی ہے جبکہ مجھے یہاں بعض ''موحدین'' کے کٹر پن پر صرف اتنا بتانا تھا کہ سب سے بڑا شرک از روئے قرآن فرقہ بازی ہے اور سارے ''موحد'' فرقے بھی اس شرک میں مبتلا ہیں۔

الصلٰوۃ والسلام علیك یا رسول الله
والصلٰوۃ والسلام علیك یا حبیب الله

گیارہ بجے کے قریب ہم مدینہ منوّرہ کے لئے روانہ ہوئے۔بس کی سروس اچھی تھی۔راستے میں نماز اور کھانے کے لئے پڑاؤ کیا گیا۔۵ بجے سے پہلے ہم مدینہ شریف پہنچ گئے۔پہلے ایک کمرہ کرائے پر حاصل کیا۔وہاں سامان رکھ کر تازہ دم ہوئے پھر نماز مغرب کے لئے مسجد نبویؐ کی طرف روانہ ہوئے۔جاتے ہوئے ہم دونوں مسلسل درود شریف پڑھتے رہے۔مسجد نبویؐ میں

خواتین کا حصہ الگ ہے،مبارکہ اس طرف چلی گئی اور میں مردانہ حصے کی طرف آ گیا۔میرے اندر داخل ہوتے ہی مغرب کی جماعت کھڑی ہو گئی۔سو قریبی صف ہی میں کھڑے ہو کر نماز شروع کر دی۔نماز کے بعد میں نے قبلہ رُخ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔سیدھا ریاض الجنۃ تک جا پہنچا۔ریاض الجنۃ مسجد نبوی کا وہ حصہ ہے جو آنحضرتؐ کے حجرہ مبارک سے منبر شریف تک کا حصہ ہے۔حضورؐ نے اس حصہ کو جنت کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا قرار دیا ہے جس سے اس حصہ زمین کی فضیلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔میں نے ریاض الجنۃ میں پہلے منبر رسولؐ کی طرف دیکھا۔اس جگہ اب امام مسجد نبوی نماز کی امامت کراتے ہیں۔یہاں قد آدم سے تھوڑی سی زیادہ اونچائی پر چھت ڈال دی گئی ہے۔امام صاحب چھت پر امامت کرتے ہیں اور نیچے عاشقانِ رسولؐ نماز پڑھتے ہیں۔ریاض الجنۃ کے سارے حصہ میں سبز قالین بچھا کر اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ میں ریاض الجنۃ میں پہلے منبر رسولؐ کے نیچے نفل پڑھنا چاہتا تھا مگر وہاں ساری سیٹیں بُک تھیں۔وہاں سے تھوڑا آگے بڑھا تو وہ جگہ آ گئی جہاں حضور ﷺ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ایک محراب میں **''محراب النبی صلی الله علیه وسلم''** کے الفاظ لکھے تھے اور اس کے دائیں ستون پر **هذامصلی رسول الله**ﷺ تحریر تھا۔دونوں جگہوں پر نوافل پڑھنے والوں کا اور باری کا انتظار کرنے والوں کا ہجوم تھا۔میں نے پہلے تو لائن میں لگ کر باری آنے پر نفل پڑھنے کا ارادہ کیا لیکن جب دیکھا کہ لائن والے دھکم پیل میں پیچھے ہوتے جا رہے ہیں تو پھر یہاں بھی حجرِ اسود تک پہنچنے والا فارمولا استعمال کیا اور آنحضرتﷺ کے مقامِ صلوٰت تک رسائی حاصل کر لی۔یہ جگہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ ہمارا سجدہ اس مقام پر ہو پاتا ہے جہاں حضورؐ کے پاؤں مبارک ہوا کرتے تھے۔ہجوم عاشقاں کے حال زار کے پیش نظر میں نے صرف دو نفل ادا کئے البتہ اس میں بیشتر اہم دلی دعائیں مانگ لیں۔دن بھر کی مسافرت کے بعد مسجد نبویؐ میں ابھی اتنی حاضری ہی مناسب تھی۔روضۂ رسولؐ کے روبرو ہونے کے لئے تو ابھی مجھے خود کو تیار کرنا تھا۔یہاں سے نکل کر باہر آیا تو مبارکہ میری منتظر تھی۔ہم دونوں تھوڑی دیر تک قریبی بازار میں گھومتے رہے۔عشاء کی اذان ہونے تک پھر مسجد نبویؐ میں آ گئے۔نماز عشاء ادا کی۔پھر اپنے کمرہ میں

گئے۔کھانا کھایااور سیر کرنے کے لئے باہر نکل آئے۔سیر کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آکر سو گئے۔

۸رد سمبر کا دن میرے لئے اس لحاظ سے بے حد اہم دن تھا کہ اس دن مجھے روضۂ رسولؐ کے سامنے حاضری دینی تھی۔نماز فجر کے بعد میں نے ریاض الجنۃ کے استوانہ عائشہ میں بڑی مشکل سے جگہ حاصل کی۔نوافل ادا کئے۔کثرت سے درود شریف پڑھنے کے بعد خود کو روضۂ رسولؐ پر حاضری دینے کے لئے تیار پایا۔لائن میں جگہ آرام سے مل گئی۔زیادہ دھکم پیل نہیں ہوئی۔جالیوں کے سامنے سرکاری اہلکار کھڑے تھے۔زائرین کو درود وسلام پڑھتے ہوئے بس گذرتے چلے جانا تھا۔جالی کو احتراماً چھونا بھی منع تھا۔زیارت روضۂ اقدس کے بعد میں قبلہ رُخ ہوکر مڑ گیا اور پیچھے سے آکر روضۂ اقدس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔یہاں اور بہت سارے لوگ بھی کھڑے تھے۔ہمارے اور روضۂ اقدس کے درمیان زائرین کی قطار رواں دواں تھی تاہم اس طرف کھڑے ہوکر دیدار کرتے رہنے کی سہولت ملنا بھی بہت بڑی بات تھی۔پہلے تو میں نے روضۂ رسولؐ پر پڑھی جانے والی مخصوص دعائیں پڑھیں۔طریق کار کے مطابق ایک بار روضۂ رسولؐ کی طرف منہ کرکے اور قبلہ کی طرف پشت کرکے اور ایک بار قبلہ کی طرف منہ کرکے اور روضۂ اقدس کی طرف پُشت کرکے مخصوص دعائیں پڑھنی ہوتی ہیں۔ایسا دو دو بار کرنا ہوتا ہے۔جب میں قبلہ رُخ ہوتا تھا تو میرے سامنے وہ کھڑکی ہوتی تھی جس کی نسبت روایت ہے کہ حضرت جبرائیل یہاں سے گذر کر وحی لاتے تھے۔ویسے جس حجرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں حضورؐ کی حضرت جبرائیل سے ملاقات ہوا کرتی تھی، وہ روضۂ رسولؐ کے اندر آ گیا ہے۔اسی طرح اسطوانۂ علی اور اسطوانہ وفود... یہ تینوں اسطوانے ریاض الجنت والی سائڈ سے نصف کے لگ بھگ روضۂ اقدس کے اندر ہیں اور نصف کے لگ بھگ باہر ہیں۔روضۂ اقدس پر مخصوص دعائیں پڑھنے کے بعد میں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے لئے بھی مخصوص دعائیں پڑھیں پھر جالی کے درمیانے حصے کے سامنے آ گیا۔میں نے داتا دربار میں، حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر اور بابا بلھے شاہ سے لے کر اپنے والدین کے مزاروں تک ہمیشہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے۔والدین کے لئے ان کی

مغفرت کی، بزرگوں کے مزارات پر خدا سے ان کے درجات کی بلندی کی اور ان کے نیک نقش قدم پر چلنے کی توفیق پانے کی دعائیں کی ہیں۔یہاں بھی مجھے خدا کے پیارے حبیب کے صدقے، اپنی زبان میں خدا سے بہت کچھ مانگنا تھا۔جب میں ہر اذان کے بعد آنحضرتﷺ کے لئے مقام محمود کی دعا کرسکتا ہوں تو اب یہاں کھڑے ہوکر بھی کرسکتا ہوں۔سو میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے۔میں اپنی دعاؤں میں مگن تھا۔جب دعائیں ہوگئیں اور میں نے درود شریف پڑھنا شروع کیا، تب کسی کے زور سے چلاّنے کی آواز آئی۔میں نے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرے اور دیکھا تو جالیوں کے سامنے کھڑا ہوا ایک پُلسیا مجھ پر برہم ہو رہا تھا۔اس کی آواز خاصی اونچی تھی اور اسی جگہ روضۂ رسولؐ کی جالی سے اوپر کرکے وہ آیت لکھی ہوئی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے: نبیؐ کے سامنے اپنی آواز بلند مت کیا کرو۔پُلسیئے کی برہمی سے یہ تو اندازہ ہوگیا تھا کہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے کو بھی شرک میں شمار کرلیا گیا ہے لیکن وہ کیا کہہ رہا تھا یہ سمجھ میں نہیں آیا۔چلیں جو کچھ بھی کہہ رہا تھا عربی شریف میں ہی کہہ رہا تھا۔

میں زیارتِ روضۂ رسولؐ کے بعد باہر آیا تو صبح کے پونے سات بجے تھے۔مبارکہ عورتوں والے حصے سے ابھی تک باہر نہیں آئی تھی۔پورے ایک گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑا۔اتنا طویل انتظار اور پھر وہ بھی بیوی کا....لیکن اس عمر میں تو بیوی کا ہی انتظار کیا جاسکتا ہے۔البتہ ایک پریشانی لاحق ہوگئی۔مکہ مکرمہ دسمبر میں بھی ٹھنڈا نہیں لگا تھا۔وہاں کی راتیں اور صبحیں خوشگوار ہوتی تھیں۔میں نے وہیں کے موسم کے حساب سے مدینہ شریف میں بھی صرف سلوار قمیص پہنی تھی۔قمیص کے نیچے بنیان بھی نہیں تھی۔ایک تو مدینہ منوّرہ کا موسم مکہ کی نسبت تھوڑا سا ٹھنڈا تھا۔پھر صبح کا وقت۔لباس میں بے احتیاطی۔ستم بالائے ستم اس حالت میں حرم شریف مسجد نبوی کے باہر مبارکہ کا طویل انتظار....اس ٹھنڈے ٹھار انتظار نے جوانی کی بعض محبتیں یاد دلا دیں (ان ادیبوں سے معذرت کے ساتھ جو شاید اپنے نجی تجربوں کے باعث یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کے ہر شاعر کی محبت فرضی ہوتی ہے) مسجد النبی کے باہر مبارکہ کا انتظار کرتے ہوئے میں نے ان سارے پیارے لوگوں کے گھروں کے خوشحال اور آباد رہنے کی دعا کی اور ارادہ کیا کہ ایک بار ان سارے لوگوں کے لئے

نوافل پڑھتے ہوئے بھی دعا کروں گا۔اسی دن ہی اس دعا کی توفیق مل گئی۔فالحمدللہ۔

مبارکہ سات بج کر پچاس منٹ پر باہر آئی تو پتہ چلا کہ روزانہ سوا سات بجے کے قریب خواتین کو روضۂ رسولؐ پر حاضری کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں عارضی پردے کا انتظام کیا جاتا ہے۔اس بابرکت موقعہ سے فائدہ اٹھا کر مبارکہ بھی روضہ شریف کی زیارت کر آئی تھی لیکن میں تو اس دوران بالکل ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جلدی جلدی اپنے کمرہ تک پہنچے۔ ناشتہ کیا اور پھر کمبل لے کر سو گیا۔ٹھنڈ کے باعث کمبل لپیٹنے سے مزے کی نیند آئی۔تقریباً ساڑھے گیارہ بجے آنکھ کھلی تو نماز ظہر کی تیاری کرنے لگے۔نماز ظہر کے بعد ہم نے جنت البقیع جانا چاہا تو پتہ چلا اس وقت گیٹ بند ہے۔نماز عصر کے بعد کھلے گا۔ چنانچہ ہم نیچے سے ہی مارکیٹ کی طرف نکل گئے۔وہاں سے مدینہ شریف کے تبرّکات خریدے۔ پھر اپنے کمرہ میں آئے،دوپہر کا کھانا کھایا۔تھوڑا آرام کیا پھر نماز عصر کے لئے چل پڑے۔نماز عصر کے بعد جنت البقیع کی طرف گئے تو ابھی بھی گیٹ بند تھا۔ گیٹ سے باہر جنت البقیع کا جو حال دیکھا وہی کافی ہو گیا۔ یہاں بھی سرکار نے بلڈوزر چلوا دیئے تھے۔ وہ قبرستان جس کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن اس قبرستان میں دفن ہونے والے تمام لوگوں کو کسی حساب کتاب کے بغیر بہشت میں ڈال دیا جائے گا۔جس قبرستان میں حضرت میمونہؓ۔حضرت بی بی فاطمۃ الزہرأؓ،حضورؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ، حضرت عباسؓ،حضرت امام حسنؓ،حضرت بی بی حلیمہ سعدیہؓ،حضرت عثمانؓ،اوران کی دونوں ازواج مطہرات، حضرت عقیل بن طالب، حضرت علی کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد اور کئی جیّد صحابۂ کرام کے مزارات تھے۔اب ان سب کو بے نام ونشاں کر دیا گیا ہے۔ جنت المعلیٰ والا حال ہے.....مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس کے مزار کا قیاس کر کے دعا کروں...اباجی والی بات یاد آ گئی.... میں ماں کی قبر بھول گیا ہوں قبرستان بہت پھیل گیا ہے آخر قبرستان کے مین گیٹ پر ہی دعا کر کے آ گیا ہوں.... پر یہاں تو قبریں ہی بے نشاں کر دی گئی ہیں۔ میں نے سوچا میں بھی مین گیٹ پر کھڑے ہو کر دعا کر لیتا ہوں۔ اچانک مین گیٹ سے پرے بائیں جانب مجھے ایک صاحب دکھائی دیئے۔اپنے لباس سے کوئی ایرانی عالم لگ رہے تھے۔ان کے قریب گیا تو وہ سامنے کی چند

قبروں کو جنگلے میں سے محبت اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ان سے ٹوٹی پھوٹی فاسی میں پوچھا یہ کس کا مزار ہے؟ انہوں نے بتایا فاطمہ بنت اسد کا.....یعنی حضرت علیؓ کی والدہ ماجدہ کا مزار تھا۔مرتے دم تک آنحضرتﷺ کا ساتھ دینے والے حضرت ابوطالبؓ کی زوجہ محترمہ، ایک عمر تک حضورؐ کی دیکھ ریکھ کرنے والی ان کی چچی،حضرت فاطمہ الزہرا کی ساس،حضرت امام حسنؓ،حسینؓ کی دادی اماں.....اتنے معتبر رشتوں والی ہستی....میں نے وہیں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لیے...سارے اہل بیت،صحابہ کرام اور بزرگان دین کے نیک نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق پانے کی دعا کی۔سب کے درجات کی بلندی کی دعا کی۔ اور سعودی حکمرانوں کا ’’شرک فوبیا‘‘ دور ہونے کے لئے بھی دعا کی۔ پھر بجھے ہوئے دل کے ساتھ واپسی ہوئی۔

مسجد نبوی میں داخل ہو کر اسطوانہ تہجد میں جگہ بنائی۔ یہاں نفل ادا کئے۔اسی دوران ایک باباجی نے میرے مخصوص انداز میں میرے بائیں طرف بیٹھے صاحب کو تھوڑا سا پرے دھکیلا اور مجھے بھی کندھا مارا۔ یہ تو بالکل میرے والا اسٹائل تھا۔ میں نے احترام اور محبت کے ساتھ انہیں دیکھا اور ان کے لئے مزید جگہ بنا دی....استوانہ تہجد ایک چبوترہ کی صورت میں بنایا گیا ہے۔روضۂ رسولؐ کے عین پیچھے۔ اور اسی کی چوڑائی کے برابر سائز...اس جگہ آنحضرتﷺ تہجد کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔اسطوانہ تہجد کے بعد غالباً ایک دو صفیں زمین پر تھیں اور پھر ایک بڑا سا چبوترہ تھا.... یہ اصحاب صفہ کا چبوترہ تھا...مسجد نبویؐ میں درویشوں،فقیروں کا ڈیرہ....اسلامی تصوف کے ابتدائی نقوش اصحاب صفہ اور حضرت علیؓ تک ملتے ہیں۔حضرت علیؓ کا رمزیہ فرمان **انا نقطہ تحت البائے**...ایک طرح سے اسلامی تصوف کا نقطۂ آغاز ہے۔تصوف میرا پسندیدہ موضوع ہے۔صوفیا اور فقیروں سے محبت اور عقیدت رکھتا ہوں۔جبّہ و دستار والے بہروپیوں کے مقابلہ میں صوفی کی عظمت اسکی عاجزی اور نیازمندی میں ہوتی ہے جبکہ جبّہ و دستار والی ہستیوں کو اپنی دستارِ فضیلت سنبھالے رکھنے کے لئے ہر وقت گردن اکڑا کے رہنا پڑتا ہے اور پھر انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ گردن کے ہمہ وقت اکڑاؤ کے باعث تکبّر ان کی شخصیت کا حصہ بن چکا ہے۔ دوسروں کو عاجزی اور انکساری کی تلقین کرنے والے متکبروں کے مقابلہ میں صوفی اور فقیر لوگ خود انکساری

اور عاجزی کی جیتی جاگتی مثال ہوتے ہیں۔ان کی انکساری اور عاجزی انہیں دستاروں والے متکبر سروں کے مقابلہ میں عظیم بنادیتی ہے۔ وہی شاخِ ثمر دار والی مثال.....اسطوانہ تہجد کے بعد میں اصحاب صفہ کے چبوترہ پر گیا۔اسطوانہ تہجد اور اصحاب صفہ کا چبوترہ.....دونوں چبوترے تین ستونوں کے گھیرے میں ہیں اور دونوں چبوترے روضۂ رسولؐ کی چوڑائی کے برابر روضۂ رسولؐ کی عقبی جانب اسکی سیدھ میں ہیں۔ میں اصحاب صفہ کے چبوترہ کے درمیانے ستون کی سیدھ میں آخری صف میں جگہ حاصل کرسکا۔ یہاں سے بیٹھ کر اسطوانہ تہجد والے حصے کی چھت کی طرف دیکھا تو دائیں طرف اللہ، بائیں طرف علیؓ اور درمیان میں محمدؐ لکھا ہوا نظر آیا۔حضور ﷺ کے اسمِ گرامی کے ساتھ ایک اور نام درج تھا مگر ستون کے آڑے آنے کی وجہ سے وہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔صوفیوں کے ڈیرے پر اللہ، محمدؐ اور علیؓ کے ناموں کا ایک ساتھ دکھائی دینا بھی کوئی صوفیانہ رمز ہی تھی۔ بعد میں جب میں نے زاویہ تبدیل کر کے دیکھا تو جو نام اوجھل ہو رہا تھا حضرت عثمانؓ غنی کا تھا...میں حضرت عثمانؓ سے محبت رکھتا ہوں۔اپنے دوسرے بیٹے کا نام میں نے عثمان حیدر رکھا تھا۔ یہ نام ایک طرح سے شیعہ، سنی اتحاد کی علامت ہے۔تاہم اصحابِ صفہ کے چبوترہ پر تصوف کے حوالے سے مجھے صرف اللہ، محمدؐ اور علیؓ کے نام دکھائی دیئے تو شاید ایسے ہی دِکھنے چاہئیں تھے کہ اسلامی تصوف کی تکون ان تین ناموں سے ہی بنتی ہے۔ میں نے نماز مغرب اصحاب صفہ کے چبوترہ پر ادا کی اور ایک بار پھر روضۂ رسولؐ پر حاضری دینے کے لئے تیار ہو گیا۔روضۂ اقدس کے سامنے سے گذر جانے کے بعد پھر قبلہ رُخ ہو کر واپس آ گیا۔روضہ کی جالی کے سامنے، زائرین کی رواں دواں قطار سے تھوڑا سا پیچھے کھڑے ہو کر میں نے مخصوص دعائیں، مخصوص طریقے سے پڑھیں۔ پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے لئے مخصوص دعائیں کیں۔اس کے بعد تھوڑا سا مزید پیچھے ہو گیا تا کہ میرے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر کوئی پُلسیا پھر شور نہ مچادے۔اب میں اپنی دعائیں کر رہا تھا۔اپنی زبان میں.....اپنی خواہشیں، آرزوئیں، تمنائیں.....

روضۂ رسولؐ پر حاضری کے بعد سیدھے باہر نکل جائیں تو بیرونی دروازے سے پہلے دائیں جانب کی دیوار پر چند نشانات بنے ہوئے ہیں۔ یہاں حضور اکرم ﷺ کی دیگر ازواج

مطہرات کے حجرے ہوا کرتے تھے۔ روضۂ رسولؐ پر ساری دعائیں کر لینے کے بعد میں نے امہات المومنینؓ کے حجروں کے نشانات کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کی اور باہر آ گیا۔آدھے گھنٹے کے بعد عشاء کی نماز ہوئی۔عشاء کے بعد ہم دونوں مارکیٹ کی سیر کے لئے نکلے۔مبارکہ کو بچی ہوئی رقم کی مالیت کا اندازہ ہو گیا تھا اس لئے اب وہ خود ہی خریداری کرتے وقت احتیاط کر رہی تھی۔ مارکیٹ سے باہر آ کر اپنے کمرہ میں پہنچے۔رات کا کھانا کھایا اور سو گئے.....سونے سے پہلے میں نے ارادہ کیا کہ کل ۹؍دسمبر کی صبح میں نے تین بجے تک جاگ جانا ہے۔چنانچہ صبح ٹھیک تین بجے میری آنکھ کھل گئی۔ باتھ روم میں جا کر حوائج ضروریہ سے فارغ ہوا۔ پھر اچھی طرح سے اور جی بھر کے نہایا۔ نئے کپڑے پہنے، مبارکہ کو جگایا۔مبارکہ وضو کرنے سے ہی تازہ دم ہو گئی۔ ہم مسجد نبویؐ کی طرف روانہ ہوئے...مدینہ شریف میں پہلے دن سے ہمارا یہ طریق کار رہا ہے کہ جب بھی ہم مسجد نبویؐ کی طرف جاتے۔مبارکہ زیرلب درود شریف پڑھتی رہتی اور میں بہت ہی دھیمی آواز میں لے کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پڑھتا جاتا:

الصلوٰۃ والسلام علیك..... یا رسول اللّٰه!
والصلوٰۃ والسلام علیك ....یا حبیب اللّٰه!
صلِّ علیٰ نبیّنا.. صلِّ علیٰ محمدٍ
صلِّ علیٰ شفیعنا۔ صلِّ علیٰ محمدٍ
صلیِ علیٰ حبیبنا۔صلِّ علیٰ محمدٍ
صلیِ علیٰ شفیقنا۔ صلِّ علیٰ محمدٍ
صلیِّ علیٰ کریمنا۔ صلِّ علیٰ محمدٍ
صلِّ علیٰ رحیمنا۔ صلِّ علیٰ محمدٍ

جتنے صفاتی نام یاد آتے جاتے اسی طرح لَے کے ساتھ پڑھتا جاتا۔حرم شریف کے قریب پہنچنے تک درود شرف پڑھنا شروع کر دیتا۔لیکن آج یہ صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہوئے مجھے جو سرور آ رہا تھا میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔شاید یہ سرور اُس آنے والی گھڑی کا اشارہ تھا جو مجھے مسجد

نبوی میں پہنچتے ہی نصیب ہونے والی تھی ۔اسطوانہ تہجد پرتو میں پہلے بھی نوافل ادا کر چکا تھا۔لیکن آج مجھے یہاں نماز تہجد پڑھنے کی توفیق مل رہی تھی۔تہجد کی نماز پڑھنے کا مزہ آگیا۔ڈھیر ساری دعائیں کرنے کا موقعہ ملا اور ایسے لگا جیسے وہ ساری دعائیں بارگاہِ خداوندی میں منظور کرلی گئی ہیں اور اپنے اپنے وقت پر پوری ہوتی چلی جائیں گی۔ **سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔ اللھم صلّ علیٰ محمد و آل محمد۔**

اسطوانۂ تہجد سے اٹھ کر میں ریاض الجنتہ والے حصہ کی طرف آیا مگر یہاں تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔کسی لائن اور دھکم پیل والی بات بھی نہیں تھی کہ کوئی چالا کی کام آجاتی۔ایک انڈونیشین یا ملائیشین دوستوں کا گروپ بیٹھا تھا۔ ان سے منّت کر کے تھوڑی سی جگہ مانگی۔ انہیں میری اردو کا تو ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا لیکن لگتا ہے میری صورت دیکھ کر ہی انکا دل پسیج گیا ہوگا جو مفت کی لسی مانگنے والوں جیسا بنا ہوا تھا۔سواُن اللہ کے بندوں نے خود کو تنگی میں ڈالا اور مجھے کھڑے ہونے کی تھوڑی سی جگہ عنایت کردی۔ یہاں میں نے دو دو کر کے چار نفل پڑھے۔ نوافل کے بعد ابھی تسبیح وتحمید کر رہا تھا کہ فجر کی اذان ہوگئی۔ریاض الجنتہ میں نماز فجر کی ادائیگی کی توفیق ملی۔ پھر روضۂ اقدس پر حاضری کے لئے خود کو تیار کرنے کے لئے درود شریف پڑھنا شروع کیا۔کافی دیر تک درود شریف پڑھنے کے بعد **صلِ علیٰ نبینا** کا ورد کرتے ہوئے لائن میں کھڑا ہوگیا۔جب روضہ شریف سامنے آیا میں نے صلوٰت وسلام شروع کردیا۔لائن میں آگے تک چلے جانے کے بعد میں پھر حسبِ معمول لائن سے پیچھے ہٹ کر روضہ شریف کی جالی کے سامنے آگیا اور روضۂ اقدس پر حاضری کی مخصوص دعائیں پڑھنے لگا۔طریق کار کے مطابق ایک دعا روضہ کی طرف منہ کر کے (تب پیٹھ قبلہ کی طرف ہوتی ہے) اور ایک دعا قبلہ کی طرف منہ کر کے (تب پیٹھ روضہ کی طرف ہوتی ہے) پڑھنا ہوتی ہے۔ایسا دو دو بار کرنا ہوتا ہے۔ دوسری اور آخری بار جب میں قبلہ رُو ہو کر دعا پڑھ رہا تھا،نورانی چہرے اور سفید لمبی داڑھی والے ایک بزرگ مجھے گستاخِ رسولؐ سمجھ کر برہم ہونے لگے کہ میں روضۂ اقدس کی طرف پشت کئے کھڑا ہوں۔ میں اپنی دعا میں مشغول تھا اس لئے انہیں سمجھا بھی نہیں سکتا تھا۔’’موحدین‘‘ کے

نزدیک میری عقیدت شرک ہے اور ایسے بزرگوں کے نزدیک میں بے ادب اور گستاخ تھا۔میں ادھر جاؤں یا ادھر جاؤں؟..... ان بزرگ نے مجھے دیکھ کر باقاعدہ **اعوذباللہ من الشیطن الرجیم** کا ورد شروع کردیا۔ شاید بات ان کی بھی ٹھیک تھی۔فرشتوں کے سردار نے جب بڑا موحد بنتے ہوئے،سجدۂ آدم کے خدائی حکم سے منہ پھیر لیا تھا تب اس نے آدم کی نہیں، خدائی حکم کی توہین کی تھی۔ چنانچہ وہ متکبر موحد اپنی سرداری کے باوجود خدا کی بارگاہ میں ملعون ٹھہرا۔میں جب روضۂ اقدس کی جانب پشت کئے قبلہ رو کھڑا تھا تو میری شخصیت کا موحدانہ رخ نمایاں تھا۔سو اس بزرگ نے اپنی سمجھ کے مطابق مجھے گستاخِ رسولؐ باور کر کے شیطان سمجھ لیا، وہ بھی اپنی جگہ حق بجانب ہوں گے۔ یہ الگ بات کہ تھوڑی دیر کے بعد جب اسی ’’شیطان ‘‘ نے پھر قبلہ سے منہ پھیر کر روضۂ اقدس کی جانب کرلیا تو وہی بزرگ مجھے سنانے کے لئے ماشاء اللہ،سبحان اللہ کہنے لگ گئے...ان کے چہرے پر خوشی کا نور پھیل گیا، جیسے میں گمراہی کے گڑھے سے نکل آیا تھا....میں نے بے حد مدھم آواز میں خوش الحانی کے ساتھ **’’الصلوٰۃ والسلام‘‘** کا ورد شروع کیا پھر **’’صلِ علی نبینا...‘‘** کا ورد کرتا رہا اور پھر درود شریف پڑھتے ہوئے روضۂ رسولؐ کے قریب والے دروازے سے باہر آگیا... باہر سے پھر ’’باب جبریل‘‘ کے راستے سے اندر آگیا۔اسطوانۂ تہجد سے روضۂ رسولؐ کی بائیں دیوار کے شروع میں دو چھوٹے سے کمرے دکھائی پڑے تھے۔’’باب جبریل‘‘ سے اندر داخل ہوتے ہی وہ دیوار نظر آئی۔ وہاں بہت سارے اہلِ تشیع حضرات کا جمگھٹا سا تھا۔ میں نے ایک ایرانی بھائی سے ٹوٹی پھوٹی فارسی میں دریافت کیا کہ یہ کونسی جگہ ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ حضرت فاطمہ الزہراؑ کا حجرہ ہے اور امیر علیہ السلام بھی یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔اس جگہ کے باہر کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔اگر یہ واقعی دخترِ رسولؐ، خاتونِ جنت، حضرت بی بی فاطمۃ الزہراؓ کا حجرہ مبارک تھا تو یہاں بھی اس کے بارے میں وضاحت سے لکھا جانا چاہیے تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر دعا کی پھر اسطوانہ تہجد اور اصحاب صفہ کے چبوترہ کے درمیانی رستے سے گذرتا ہوا آگے جا کر بائیں طرف ریاض الجنتہ کے حصہ کی طرف مڑ گیا۔روضۂ رسولؐ سے منسلک استوانۂ سریر کی زیارت کی۔ یہاں سے حضرت عائشہ صدیقہؓ بیٹھے

بیٹھے ہی حضورؐ کو ان کے حجرہ میں، حالتِ اعتکاف میں، سر پر تیل لگا دیا کرتی تھیں۔اسی کی سیدھ میں آگے اسطوانہ ابی لبابہ ہے اور اس سے اگلے ستون پر اسطوانۂ عائشہ تحریر ہے۔اسطوانۂ سریر کے بعد روضۂ رسولؐ کی عمارت سے جڑا ہوا اسطوانہ حرس ہے، یہ اسطوانہ علیؓ بھی کہلاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی اسطوانہ وفود ہے۔حضور اکرم ﷺ باہر سے آنے والے وفود سے اسی جگہ ملاقات فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک زیارت کرنے کے بعد میں مسجد نبویؐ سے باہر آ گیا۔ وہاں سے مبارکہ کو ساتھ لیا اور ہم دونوں درود شریف پڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئے۔ یہاں پہلے ناشتہ کیا۔ پھر مدینہ منوّرہ کے چند مقدس اور تاریخی مقامات کو دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے۔

☆☆☆

مدینہ منوّرہ کے مقدس اور تاریخی مقامات

سب سے پہلے احد کے پہاڑ پر پہنچے۔ یہاں غزوۂ احد کے ۷۳ شہداء کے مزار ہیں۔ حضرت حمزہؓ، حضرت جحشؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کے مزار سامنے سے دکھائی دیتے ہیں، باقی ستر شہداء کے مزار آگے ہیں۔ یہاں حضرت حمزہؓ سمیت تمام شہدائے احد کے لئے دعا کی۔ یہاں کے زائرین میں اکثریت اہلِ تشیع کی لگ رہی تھی۔حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد ہندہ نے جس سفّاکی کے ساتھ آپؐ کا سینہ چاک کرکے، کلیجہ نکال کر چبایا تھا وہ اسلامی تاریخ کا ایک اندوہناک واقعہ ہے۔آنحضرت ﷺ رحمۃ للعالمین تھے۔آپؐ نے اپنے خون کے پیاسوں کو بھی معاف کر دیا تھا لیکن ہندہ کی بہیمیت کا آپ کے دل پر گہرا اثر تھا۔فتح مکہ کے موقعہ پر ہندہ نے خاموشی سے آ کر اور اجتماعی بیعت میں شامل ہو کر اسلام کو تسلیم کر لیا تھا۔حضورؐ کو جب ہندہ نے یہ بات بتائی کہ وہ بھی بیعت کر چکی ہے تو آپؐ نے فرمایا ٹھیک ہے، لیکن دوبارہ میرے سامنے نہیں آنا.....اسی ہندہ کے پوتے یزید نے بعد میں ''خلیفۂ وقت'' کے لیبل کے ساتھ آلِ رسولؐ کو میدانِ کربلا میں بے دردی کے ساتھ شہید کرایا۔شاید اسی پس منظر کے باعث یہاں اہلِ تشیع زائرین کی کثرت تھی۔احد کی جنگ ہی میں حضور ﷺ کا دندان مبارک شہید ہوا تھا اور آپ ﷺ زخمی ہوئے تھے۔

میدان احد کے بعد ہم مسجد قبلتین کی طرف گئے۔مسجد قبلتین کا مطلب ہے دو قبلوں والی مسجد.... پہلے شمالی جانب (بیت المقدس کی طرف) قبلہ تھا۔اسی مسجد میں نماز کے دوران تحویل

قبلہ کا حکم ہوا اور دورانِ نماز ہی حضورؐ نے شمال سے جنوب کی طرف رُخ فرما لیا کہ خانہ کعبہ جنوب کی طرف ہے۔ اس تبدیلی سے بعض صحابہ نے شدید ٹھوکر کھائی۔ بعض نماز چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بعض نے اسلام سے علیحدگی اختیار کرلی۔ میں مسجد قبلتین کے اندرونی حصہ میں جا کر شمالاً جنوباً دیکھنے لگا۔ میری سمجھ بوجھ کے مطابق قبلہ کی فلاسفی مجھ پر کھلنے لگی۔ خدا لامحدود ہے۔ لامحدود ہستی کسی محدود مکان میں نہیں آسکتی بقول غالبؔ:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہاں۔۔۔خدا کسی مقام کو فضیلت بخش دے تو اس کا فرمان ہی اس گھر کو برکات و انوار کا مرکز اور منبع بنا دیتا ہے۔ تحویل قبلہ سے پہلے اسلام کے ابتدائی دس برس مکہ میں گذرے۔ وہاں مکہ والوں کا روحانی مرکز اور محور خانہ کعبہ تھا لیکن حضورؐ خدائی حکم کے مطابق بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ہی نماز پڑھتے رہے۔ مدینہ تشریف آوری کے بعد بھی کچھ عرصہ تک قبلہ بیت المقدس ہی رہا۔ مدینہ اور اس کے آس پاس یہودیوں اور مسیحیوں کے کئی قبائل آباد تھے مسلمانوں کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا انہیں اچھا لگتا تھا لیکن جب قبلہ تبدیل ہوا تو کئی صحابہ کو ٹھوکر لگنے کے ساتھ یہودیوں اور مسیحیوں کو بھی اس سے سخت صدمہ پہنچا....اس سے میں نے یہ اصول سمجھا کہ خدا جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم دیتا ہے تو وہ لوگوں کے مروّجہ عقائد اور تصوّرات کے برعکس اپنا حکم صادر کرتا ہے جس سے مخالفین کے دلوں میں نفرت بڑھانے والا جوش پیدا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں قبلہ کی تبدیلی پر متعدد اعتراضات کئے گئے جن میں ایک اعتراض یہ تھا کہ اسلام تو بت پرستی کا مخالف ہے لیکن خانہ کعبہ جسے اب قبلہ بنایا گیا ہے اس میں تو ۳۶۰ بُت پڑے ہوئے ہیں اور یہ اعتراض تو مغرب کے مستشرقین آج بھی دہراتے نہیں تھکتے کہ نعوذ باللہ حضورؐ نے قوم پرستی کے جذبہ کے تحت قبلہ تبدیل کیا تھا۔ بیت المقدس حضرت ابراہیم کے بعد حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی نسبت سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف حضرت ابراہیم کے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیل کی نسبت سے خانہ کعبہ کو

اہمیت حاصل تھی۔ حضورؐ خود حضرت اسماعیل کی آل سے تھے چنانچہ تحویل قبلہ کے وقت قوم پرستی کا اعتراض بھی جڑ دیا گیا۔ قطع نظر اس سے کہ قوم پرستی کا الزام لگانے والے یہودیوں اور مسیحیوں کے الزام سے خود ان کی اپنی قوم پرستی ظاہر ہوتی ہے، از روئے قرآن خانہ کعبہ کی وجہ فضیلت تو سراسر ابراہیمی ہے۔ قرآن مجید سے دو حوالے یہاں درج کر دینا مناسب ہوگا:

۱۔ ”اور جب ہم نے اس گھر کو (یعنی کعبہ کو) لوگوں کے لئے بار بار جمع ہونے کی جگہ اور امن کا مقام بنایا تھا اور (حکم دیا تھا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ“ **(البقرہ:۱۲۶)**

۲۔ ”سب سے پہلا گھر جو تمام لوگوں کے (فائدہ کے) لئے بنایا گیا تھا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ تمام جہانوں کے لئے برکت والا مقام اور موجبِ ہدایت ہے اس میں کئی روشن نشانات ہیں۔ وہ ابراہیم کی قیام گاہ ہے“ **(آل عمران:۹۸)**

بہرحال وہی کعبہ جس کے حوالے سے اعتراضات کئے گئے آج دنیا کا واحد ایسا روحانی مرکز ہے جہاں سے فیض پانے والوں کا سلسلہ دن رات مسلسل جاری رہتا ہے۔ جہاں خدا کی رحمتوں، برکتوں اور انوار کی ایسی بارش ہوتی رہتی ہے کہ میرے جیسا ”گمراہ“ بھی وہاں جاتا ہے تو اپنے اندر حیرت انگیز پاک تبدیلیاں پاتا ہے۔ جہاں میری ساری عقلی باتیں، ٹھوس دلائل۔۔۔۔ سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اندر کی دُھلائی ہونے لگتی ہے، ساری میل کچیل نکلنے لگتی ہے۔

مسجد قبلتین کے بعد ہم میدان خندق کی طرف گئے۔ وہاں سب سے پہلے مسجد فتح میں گئے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں حضور اکرم ﷺ نے جنگ خندق کے دوران تین دنوں تک دعا فرمائی تھی اور چوتھے دن آپؐ کو جنگ میں فتح کی بشارت ہوئی تھی۔ مسجد تھوڑی اونچائی پر تھی۔ یہاں آکر ہم نے دو نفل پڑھے۔ پھر نیچے اترے اور سامنے دکھائی دینے والی مسجد سلمان فارسی میں گئے۔ یہ چھوٹی سی مسجد خاصی خستہ حالت میں تھی۔ صفائی کا انتظام انتہائی خراب۔ مجھے حضرت سلمانؓ فارسی کی عظیم شخصیت یاد آنے لگی.....حضرت عمر فاروقؓ خلیفۃ الرسول اور امیر المومنین..... رعب و دبدبے کے لحاظ سے بھی ڈاڈھے قسم کے تھے۔ مالِ غنیمت سے باقیوں کو ایک ایک چادر ملی

تھی، حضرت عمرؓ نے دو چادریں پہن رکھی تھیں۔ بھرے دربار خلافت میں حضرت سلمان فارسیؓ کھڑے ہوتے ہیں اور خلیفۂ وقت سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کے پاس دو چادریں کہاں سے آ گئیں؟.... یہ احتسابی سوال تھا۔ سرِ عام جواب طلبی.... حضرت عمرؓ نے بڑے تحمل سے جواب دیا کہ ایک چادر جو میرے بیٹے کو ملی تھی وہ اس نے مجھے دے دی تھی..... یہ تھی خلیفہ وقت کی عظمت کہ اس نے خلافت کی طاقت کو خدا کی امانت سمجھا، ذاتی ملکیت نہیں بنایا.... بھری کچہری میں اعتراض ہوا۔ پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ لہجے میں چبھن نہیں آئی۔ خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ مطمئن ہو گئے.... یہ خلافتِ حقہ اسلامیہ کا کردار تھا دوسری طرف یزید کی خلافت کا کردار ہے جو کسی کو اختلاف کا حق دینے کو تیار نہیں۔ سر عام احتساب کی تو بات ہی الگ ہے۔ جس کے پاس طاقت کا گھمنڈ اور بائیکاٹ کا حربہ ہے اور جس نے کربلا کو لہو رنگ کر رکھا ہے۔ یزیدی خلافت میں انسانیت فرات کے کنارے پر پیاسی دم توڑ دیتی ہے جبکہ حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میری خلافت میں فرات کے کنارے تک ایک کتّا بھی بھوکا پیاسا مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ اس کے لئے جواب دہ ہوگا۔ جوابدہی کا یہ احساس ہی تھا جو خدا کی امانت کو اپنی ذاتی ملکیت نہیں بننے دیتا تھا.... مسجد سلمان فارسیؓ میں ہم دونوں نے دو دو نفل ادا کئے۔

مسجدِ فاروقؓ کی طرف جانے لگے تو رستے میں ایک طرف بڑی سی خندق کھدی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے سمجھا کہ شاید اُس زمانے کی خندق کا ایک حصہ محفوظ کر لیا گیا ہے لیکن استفسار پر پتہ چلا کہ مسجد ابوبکر کی توسیع ہو رہی ہے اور جسے ہم خندق کا حصہ گمان کر رہے تھے وہ اصلاً مسجد ابوبکرؓ کی توسیع کے سلسلے میں ہونے والی کھدائی تھی۔ میں نے چاہا کہ مسجد ابوبکرؓ کا پرانا حصہ ہی دیکھ لیں لیکن موجودہ توسیع کے کام کے باعث ہمارا فی الوقت وہاں جانا ممکن نہیں تھا۔ مسجد ابوبکرؓ کے اندر نہ جا پانے کے باعث مجھے کچھ کھو جانے کا احساس ہوا۔ وہاں سے سیدھے گذرتے ہوئے مسجدِ عمر فاروق میں گئے۔ وہاں دو نفل ادا کئے۔ مسجد عمر فاروقؓ سے آگے پھر اونچائی پر جانا پڑا۔ مسجد علیؓ چوٹی پر تھی وہاں جا کر بھی دو نفل ادا کئے۔ دراصل جنگِ خندق کے دوران ان ممتاز صحابہ کرام نے اپنے اپنے مجاہدین کے ساتھ ان مقامات پر پڑاؤ کر رکھا تھا۔ چونکہ محاصرہ طویل تھا۔

آنحضرت ﷺ مختلف وقتوں میں اسلامی لشکر کے معائنہ کے لئے نکلتے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ کے مجاہدین کے پڑاؤ کے مقامات پر مختلف اوقات میں حضورؐ کے معائنہ کے دوران جس نماز کا وقت ہو گیا، حضورؐ نے امامت فرما دی اور ان صحابہ کے پڑاؤ کی نسبت سے وہاں بعد میں مسجدیں بنا کر ان کے نام سے منسوب کر دی گئیں۔ مسجد علیؓ سے واپسی پر ایک چھوٹے سے کمرے جتنی ''مسجد فاطمہؓ ''دیکھی۔ یہاں دروازہ اتنا تنگ تھا کہ صرف دو آدمی ایک وقت میں مشکل سے گذر سکتے تھے۔ پھر وہاں رش بھی بہت زیادہ تھا۔ سو مبارکہ نے اور میں نے مسجد کے باہر کھڑے ہو کر ہی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے۔

میدانِ خندق کے بعد ہم مسجد قبا میں گئے۔ یہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ مسجد الحرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے بعد اس مسجد کو دنیا بھر کی مساجد پر فضیلت حاصل ہے روایت ہے کہ یہاں دو نفل پڑھنے کا ثواب عمرہ کے ثواب کے برابر ہے.... سنیچر اور سوموار کے دن مسجد قبا میں جانا زیادہ بابرکت اور افضل سمجھا جاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہم جب یہاں حاضر ہوئے تو سوموار کا دن تھا۔ مسجد قبا کی بنیاد آنحضرت ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی۔ میں نے محراب کے سامنے پہلی صف میں کھڑے ہو کر دو نفل ادا کئے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆

دیارِ نبیؐ میں آخری دن

مقامات مقدسہ کی زیارتوں کے بعد ہم السعودیہ ائیر لائنز کے آفس میں گئے۔ وہاں سے اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کرائی اور گیارہ بجے تک اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ ایک گھنٹہ آرام کیا پھر ظہر کی نماز کے لئے مسجد نبویؐ میں گئے۔ نماز کے بعد تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا۔ چنانچہ اپنے کمرے میں آکر دوپہر کا کھانا کھائے بغیر سو گئے۔ تین بجے جاگے تو عصر کی نماز کی تیاری کرنے لگے۔ مسجد نبویؐ میں نمازِ عصر کی ادائیگی کے بعد مارکیٹ کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے جرمنی میں بچوں کو فون کیا۔ رضوانہ، حفیظ، شعیب، عثمان، ٹیپو، مانو سب خیریت سے تھے۔ انہیں اپنی سیٹ کنفرم ہو جانے کی خبر دی اور بتایا کہ ہم انشاءاللہ ۱۲ر دسمبر کو فرینکفرٹ پہنچ جائیں گے۔ نماز مغرب کے بعد کھانا کھایا۔ عشاء کے وقت نماز کے لئے پھر مسجد نبوی میں گئے۔ نماز عشاء کے بعد پھر قریبی مارکیٹ کی طرف نکل گئے۔ وہاں ہلکی پھلکی خریداری کی۔ اپنے کمرے میں آکر سامان پیک کیا کیونکہ کل ۱۰ر دسمبر کو ہمیں مدینہ سے پھر مکہ واپس جانا ہے۔

سامان پیک کرنے کے بعد ہم لیٹے تو نیند آئی گئی۔ پتہ نہیں چلا کب گہری نیند آ گئی لیکن صبح تین بجے ہم دونوں بیدار ہو کر، تیار ہو کر مسجد نبویؐ میں پہنچ گئے۔ شاید آج دربارِ نبویؐ میں آخری حاضری کا احساس تھا کہ ہم مسجد کے گیٹ کھلنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ جیسے ہی گیٹ کھلا میں لپکتا ہوا اسطوانۂ تہجد پر پہنچا۔ کل میں نے اسطوانۂ تہجد پر ہی نماز تہجد ادا کی تھی اور اسے اپنے لئے بہت بڑا..... بہت ہی بڑا اعزاز جانا تھا لیکن دل میں کہیں یہ خواہش بھی دبی ہوئی تھی کہ عین اس جالی کے نیچے نمازِ تہجد ادا کر سکوں جہاں کبھی حضور انور ﷺ نے تہجد کی نمازیں پڑھی تھیں۔ آج یہ خواہش خدا نے پوری فرما دی۔ اسطوانہ تہجد کی پہلی صف تھی۔ تہجد والی جالی کے بالکل نیچے مجھے جگہ ملی اور میں یہیں جم گیا۔ نماز تہجد پڑھی، پھر خاص

طور پر سورۃ رحمٰن پڑھی۔ فجر کی نماز بھی اسی جگہ پر ادا کی۔ فجر کی نماز کے بعد حسبِ معمول درود شریف اور صلوٰۃ وسلام کے ساتھ روضۂ رسولؐ پہ حاضری دی۔ مخصوص طریق کار کے مطابق دعائیں پڑھیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے لئے بھی مخصوص دعائیں پڑھیں۔ پھر اپنی دعائیں.....الوداعی دعائیں شروع کر دیں۔ دعائیں اختتام کو پہنچیں تو مجھے ایسے لگا جیسے پُلسیا کسی کو ڈانٹ رہا ہو۔ میں نے آدھا درود شریف پڑھا تھا، آدھا ابھی پڑھ رہا تھا کہ پُلسیا مجھ تک پہنچ گیا۔ وہ دعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھ گرانے کو کہہ رہا تھا۔ لہجہ بالکل پاکستانی پولیس والا تھا... میں نے درود شریف مکمل کر کے منہ پر ہاتھ پھیرا تو عربی پولیس والا غصے کے تاثرات کے ساتھ واپس چلا گیا۔ جہاں تک توحید باری تعالیٰ پر ایمان کا تعلق ہے۔ یہودی بھی سخت توحید پرست ہیں اور سکھ حضرات تو اتنے موحد ہیں کہ ان کے نزدیک ہندو اور مسلمان دونوں پتھر کی پوجا کرنے والے ہیں، صرف اتنے سے فرق کے ساتھ کہ ہندو پتھر کو گھڑ کر پوجتا ہے اور مسلمان اَن گھڑ پتھر (حجر اسود) کو پوجتا ہے.... پر بابا..... یہ کیسی توحید پرستی ہے جو یہودیوں اور سکھوں کی مزعومہ توحید پرستی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ جب میں اسطوانہ تہجد پر تھا۔ میرے آگے روضۂ رسول تھا، اسی کی سیدھ میں واقع اصحاب صفہ کے چبوترے سے بھی سجدہ کریں تو روضہ شریف سامنے ہوتا ہے۔ اسطوانۂ تہجد سے اسی سیدھ میں۔ حرم مسجد نبوی کے اخیر تک چلے جائیں تو روضۂ رسولؐ کی چوڑائی جتنے حصہ کی ساری صفوں کے نمازیوں کے سامنے روضۂ رسولؐ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ہونے کے باوجود ہزاروں لوگ اسی رُخ پر نماز پڑھ رہے ہیں، رکوع اور سجدے کر رہے ہیں۔ اگر روضۂ رسول کے سامنے ہونے والا سجدہ خدا کی بارگاہ میں ہی جا رہا ہے۔ یہ کوئی شرک نہیں ہے تو پھر جالی کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے سے کونسا شرک عظیم ہو گیا تھا؟

قرآن شریف میں ارشاد خداوندی ہے۔ ''حکم سارا تو اللہ کے اختیار میں ہے'' (سورۃ انعام:۵۸)۔ اس اختیار میں خدا کی شرکت بلا غیرے کا واضح فرمان موجود ہے۔ ''وہ اپنے حکم اور اپنے فیصلے میں کسی کو اپنا شریک نہیں بناتا'' (سورہ کہف:۲۷) یہاں خدائی احکامات اور فیصلوں میں کسی اور کی شمولیت کو واضح الفاظ میں شرک سے جوڑ دیا گیا ہے..... اب یہ آیات دیکھیں جن

میں رسولؐ کی شرکت صاف صاف ظاہر ہو رہی ہے۔

۱۔ ''پس تیرے رب کی قسم ہے کہ جب تک وہ ہر اُس بات میں جس کے متعلق ان میں جھگڑا ہو جائے تجھے حکم نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس سے اپنے نفوس میں کسی قسم کی تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر فرماں بردار نہ ہو جائیں، ہرگز ایمان دار نہ ہوں گے'' (سورۃ النساء:٦٦)

۲۔''جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دیں.....'' (سورۃ احزاب:۳۷)

اب خدائی حکم اور فیصلے میں رسولؐ کی پوری شرکت ہوگئی۔ کیا نعوذ باللہ یہ کہہ دیا جائے کہ وہ خدا جو اپنے حکموں اور فیصلوں میں کسی کو اپنا شریک نہیں بناتا تھا، اس نے خود ہی ایک شریک بنالیا ہے۔ **لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم**۔ میں خود شرک کی جاہلانہ حرکات اور رسومات سے متنفر ہوں۔ شاید ایک بہت ہی چھوٹا سا وہابی میرے اندر بھی کہیں چھپا ہوا ہے....لیکن میں موحد پن کے نام پر بہت زیادہ سخت رویہ اختیار کرنے والوں کے بھی خلاف ہوں۔ ایسے سخت گیر لوگ **فقست قلوبھم** والے حکم کے نیچے آتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے خدا کو ہم نے رسولؐ کے وسیلے سے ہی جانا اور مانا ہے۔ رسولؐ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک بشری اور ایک الوہی....بشری حیثیت تو وہی ہے جس میں رسولؐ بھی ہم جیسے عام انسانوں کی طرح چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، زندگی بسر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن الوہی مقام میں وہ صرف ایک آلہ بن جاتا ہے۔ جیسے ریڈیو سیٹ سے آواز آ رہی ہوتی ہے۔ یہ ریڈیو پاکستان، لاہور ہے...یا....یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے۔ ویسے تو بے شک ریڈیو سیٹ ہی بول رہا ہوتا ہے لیکن حقیقتاً اس نے مذکورہ اسٹیشن کی فریکوئنسی پر اصل مرکز کی آواز کو نشر کیا ہوتا ہے۔ تو رسولؐ بھی اسی طرح بول رہا ہوتا ہے اور وہ اس کی اپنی نہیں، خدا کی آواز ہوتی ہے۔ یہ خدائی جلووں کا بڑا اظہار ہے کہ وہ خدا جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک درخت کے ذریعے سے بولا تھا: ''اے موسیٰ! میں خدا ہوں۔ سارے جہانوں کا رب'' (سورۃ قصص:۳۱) وہی خدا آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کسی درخت کی بجائے براہ راست حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے بول رہا تھا:

وماینطق عن الھویٰ ہ ان ھواِلّا وحیٌ یوحٰی (سورۃ النجم:۴،۵)

میں یہودیوں کی توحید پرستی کی قدر کرتا ہوں، سکھوں کی پتھر پرستی سے بیزاری کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اسی طرح مسلمانوں میں جو موحد فرقے بے تکی مشرکانہ رسومات کے خلاف ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں۔ لیکن ان سب کا موحدانہ موقف تصویر کا ایک رخ ہے۔ اب اسی نکتے پر ہی غور کر لیں کہ سجدہ تو ہم نے خدا کے حضور کرنا ہوتا ہے لیکن ناک اور ماتھا زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ کیا اس پر ارض پرستی کا، دھرتی پوجا کا الزام نہیں لگایا جا سکتا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ زیادہ باریکی میں جانا ٹھیک نہیں ہوتا....میں ان رسومات اور افعال کو بھی اچھا نہیں کہتا جن سے شرک کا واضح اندیشہ ہو۔ لیکن کسی برتر روحانی دیار اور مقدس مقام پر جا کر کسی سے اگر بے اختیاری میں کچھ ہوتا ہے تو اس پر ڈنڈا لے کر نہیں کھڑا ہو جانا چاہیے۔ وہی مولانا روم والی بات کہ نشہ کے سرور میں وہ ہے اور بدمستیاں تم کر رہے ہو...ویسے بعد میں مبارکہ نے بتایا تھا کہ خواتین روضۂ اقدس کے سامنے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھیں۔ مبارکہ نے بھی دعا مانگی تھی۔ انہیں کسی نے نہیں روکا ٹوکا۔ اللہ تعالیٰ سعودی عرب کی لیڈی پولیس کو جزائے خیر دے اور مردانہ پولیس کو ہدایت دے۔

روضۂ رسولؐ پر حاضری دینے کے بعد میں نے دورِ نبویؐ کی مسجد کے سارے حصہ پر چلنے کی سعادت حاصل کی۔ ریاض الجنۃ کے نیچے بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کی۔ دو نفل ادا کئے۔ پھر مسجد سے باہر آنے سے پہلے اصحاب صفہ کے چبوترہ پر جا کر پہلی صف میں دو نفل ادا کئے اور پھر باہر آ گیا۔ تقریباً اتنے ہی وقت میں مبارکہ بھی باہر آ گئی تھی۔ کل اور آج۔۔۔دونوں دن ہم دونوں تہجد کے وقت سے لے کر صبح آٹھ بجے تک مسجد نبوی میں برکات وانوار سے فیضیاب ہوتے رہے۔ مسلسل چار گھنٹے تک کسی اکتاہٹ کے بغیر، پولیس والوں کی رخنہ اندازی کے باوجود نہ صرف مرا ذہنی، قلبی اور روحانی ارتکاز قائم رہا بلکہ انبساط وسرور کی انوکھی کیفیتیں بھی سرشار کرتی رہیں۔ حرم شریف مسجد نبویؐ سے باہر آ کر اس کی طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر ہم درود شریف پڑھتے ہوئے آہستہ قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف جانے لگے....وہاں پہنچ کر ناشتہ کیا۔ ۱۰ بجے تک تیاری مکمل کر کے ہم مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جانے کے لئے روانہ

ہوئے۔اس باراچھی سروس والی بس کی بجائے ہمیں ایک نکمی سی گاڑی میں سفرکرناپڑا۔ہم پنا سامان اٹھائے بس اسٹینڈ کو ڈھونڈرہے تھے کہ بس اسٹینڈ کی طرف رہنمائی کرنے والے ایک صاحب نے اس بس کی نشاندہی کرکے اسی پر سوار کرادیا۔ یہ بس لب سڑک کھڑی تھی۔جیسے ہمارے ملک میں فلائنگ کوچ کے نام پر کھڑ کھڑاتی ہوئی بسیں چلائی جاتی ہیں یہ بھی کچھ اسی قسم کی گاڑی تھی۔اس گاڑی میں سرگودھاکے (غالباً چک ۵۲ کے) تین باپ بیٹے بھی موجود تھے۔ مولوی قسم کی چیز لگتے تھے۔ساڑھے بارہ بجے تک ان میں سے کسی ایک نے مجھ سے صلاح کے انداز میں کہا نماز پڑھنے کے لئے گاڑی رکنی چاہیے۔میں نے کہاڈرائیورخودہی روکے گا۔اس کے باوجودمولوی صاحب کے ایک بیٹے نے ڈرائیور کومخاطب کرتے ہوئے صلوٰت صلوٰت کی آواز بلندکی۔ جواب میں ڈرائیور نے عربی میں پتہ نہیں کیا کہا لیکن اس کے لہجے سے ایسے لگا جیسے کہہ رہاہوکوئی مناسب جگہ آجائے، میں گاڑی روک لوں گا...اسکے بعد بمشکل پندرہ بیس منٹ گذرے ہوں گے۔ بیک مرر میں دیکھا تو ڈرائیورکوبار بار اونگھ آرہی تھی۔میں نے اردو میں شور مچادیا۔اے میاں ڈرائیور!ہوش میں آؤ....تینوں پاکستانیوں کوتو میری بات سمجھ میں آ گئی لیکن باقی سارے مسافر حیران تھے کہ اسے بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیاہے.... ڈرائیور بھی وقتی اونگھ سے ہوش میں آ گیاتھالیکن اسے بھی سمجھ نہیں آئی کہ میں نے شور کیوں مچایا تھا۔آخرظہرکی نماز کے وقت فجر کی اذان سے مخصوص الفاظ کام آئے۔میں نے ڈرائیورکی طرف اشارہ کرکے کہا **الصلوٰۃ خیر من النوم** (نماز نیند سے بہتر ہے)سارے مسافر یہ سن کرہنس پڑے اورڈرائیور کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔مزید فائدہ یہ ہوا کہ اب باقی مسافروں نے بھی ڈرائیورکو یہ سمجھانا شروع کردیا تھا کہ واقعی نماز نیند سے بہتر ہے لہٰذا اب کسی مناسب جگہ پر گاڑی روک لے۔ ڈرائیور نے ایک نہایت گھٹیااور مہنگے ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی۔ہم نے تو ہوٹل کی حالت دیکھ کر ہی کھانا کھانے کاارادہ ختم کردیا۔ بعد میں سرگودھوی بھائیوں نے بتایا کہ ہوٹل جتنا گھٹیا ہے اتنامہنگا بھی ہے۔

☆☆☆

ساتواں عمرہ

پانچ بجے تک ہم لوگ مکہ شریف میں اپنے پہلے والے ہوٹل پہنچے۔کمرہ لیا،کھانا کھایا۔تکلیف وہ سفر کے باعث مبارکہ کی طبیعت خراب سی ہورہی تھی اس لئے میں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیااور خود نماز مغرب ادا کرنے کے لئے حرم شریف چلا آیا۔اس بار میں ’’باب الملک فہد‘‘ سے سیدھااندر جا کر، مطاف سے باہر، کعبہ کے سامنے بائیں ہاتھ بیٹھا تھا میرے سامنے رکن یمانی اوررکن شامی کی پوری دیوارتھی۔بائیں طرف میزاب الرحمت اور حطیم تھا۔

مدینہ شریف سے مکہ آتے ہوئے ہماری بس ایک جگہ رُکی تھی۔ یہ مدینہ کی طرف سے مکہ آتے ہوئے میقات تھی۔مسجد کا نام تو اب یادنہیں رہا۔ہم نے وہیں غسل کرلیا تھا۔ میں نے احرام بھی وہیں باندھ لیاتھا۔سو اب مسجد عائشہ جاکرغسل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔عشاء کے وقت مبارکہ اور میں ایک ساتھ حرم شریف میں حاضر ہوئے۔نمازعشاء کے بعد ہم نے اپنے اس بابرکت سفر کے ساتویں اور آخری عمرہ کے لئے طواف کعبہ سے آغاز کیا۔قرآن مجید میں سات آسمانوں اور سات زمینوں کا ذکر ملتا ہے۔ ہفتے میں سات دن ہوتے ہیں۔عمرہ میں خانہ کعبہ کے طواف کے سات پھیرے ہوتے ہیں صفاومروہ کے درمیان سعی کے بھی سات چکر ہوتے ہیں۔ ہم جو پانچ بچوں کے ماں،باپ ہیں،ہمارااپنا خاندان سات افراد پر مشتمل ہےاور یہ ہماراساتواں عمرہ ہے....کبھی کبھی ہندسوں کے کھیل میں عجیب اوردلچسپ صورتحال بن جاتی ہے۔

حجراسود پر بوسہ دینے والوں کارش سب سے زیادہ ہوتا ہے لیکن چونکہ وہاں سرکاری اہلکار کسی کو دیرتک رہنے نہیں دیتے بس بوسہ دیجئے اور جگہ چھوڑ دیجئے۔اس

لئے بے حد رش اور دھکم پیل کے باوجود وہاں تک پہنچنے میں کامیابی مل جاتی ہے۔اس کے برعکس درِ
کعبہ (ملتزم شریف) پر رش تو حجر اسود کے مقابلہ میں کم ہوتا ہے لیکن وہاں جو کعبہ کی چوکھٹ سے
لپٹ گئے۔ سو لپٹ گئے۔ پھر وہ اپنی مرضی سے ہی پیچھے آتے ہیں۔اسی وجہ سے کعبہ کی چوکھٹ
تک شرف باریابی پانا، حجرِ اسود تک رسائی پانے سے زیادہ مشکل تھا۔ پہلے چھ عمرے میں نے
اس طرح کئے تھے کہ طوافِ کعبہ کے اختتام پر چوکھٹ سے تھوڑے فاصلہ پر کھڑے ہو کر مخصوص
دعائیں بھی پڑھ لیتا تھا اور اپنی زبان میں دعائیں بھی کر لیتا تھا۔ وہاں پر نوافل کی ادائیگی کی توفیق
بھی مل چکی تھی۔ سو مبارکہ کو اندازہ تھا کہ طواف کعبہ کے اختتام کے بعد ملتزم شریف پر مجھے دعاؤں
میں کتنی دیر لگتی ہے اور مقام ابراہیم پر کتنا وقت لگتا ہے، پھر وہ مجھے مقام ابراہیم کے قریب ہی مل
جایا کرتی تھی۔لیکن اس بار تو معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا۔ میں حسبِ سابق ملتزم شریف کے سامنے
جا کر کھڑا ہوا کہ یہاں سے دعائیں پڑھنا شروع کرتا ہوں۔مخصوص دعائیں مکمل کرتے ہی ایسے
لگا جیسے رش کے باوجود میرے لئے خود بخود رستہ بن گیا ہے اور کسی نے مجھے پیچھے سے، کندھے سے
پکڑ کر کعبہ شریف کے دروازے کی چوکھٹ پر پہنچا دیا ہے۔

جسے چاہا در پہ بلا لیا، جسے چاہا اپنا بنا لیا

بس پھر میری کھلی ہوئی بانہیں اور جھکا ہوا سر تھا اور اُس کا در تھا۔ دروازے کی چوکھٹ
کے درمیانے حصے میں (غالباً سونے کا) ایک سنہری گول دائرہ سا لگا ہوا تھا۔ میں چوکھٹ تک
کیا پہنچا تھا، میرے لئے تو گویا درِ کعبہ ہی وا ہو گیا تھا۔ اب تک کی ساری دعائیں، تمنائیں،
التجائیں ایک بار پھر بیان کر دیں۔ میرے لئے تو یہ پل بھر تھا مگر مبارکہ اُدھر مقام ابراہیم کے
پاس سرگرداں تھی میری غیر موجودگی سے اس کی گھبراہٹ اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب میں
ملتزم شریف کے بعد مقام ابراہیم کے قریب پہنچا تو مبارکہ نے مجھے دور سے دیکھ لیا اور اس کی جان
میں جان آئی۔مقام ابراہیم پر میں نے دو نفل ادا کئے۔مخصوص دعائیں پڑھیں۔ پھر بئر زم زم پینے
بیٹھا لیکن مجھے تو ویسے ہی کعبہ کی چوکھٹ کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ یہاں مبارکہ بھی آ گئی تھی۔ہم دونوں
نے حجر اسود کے سامنے آ کر اسے دور سے بوسہ دیا اور ''الصفا'' کے رستے سے گذر کر صفا اور مروہ

کے درمیان سعی کے لئے جانے لگے۔ جاتے جاتے میں نے پلٹ کر دیکھا میرے دائیں ہاتھ
آب زم زم، سامنے مقام ابراہیم، حطیم کا ایک حصہ، رکن عراقی، ملتزم، حجر اسود، رکن یمانی۔۔۔
سب میرے سامنے تھے۔صرف میزاب الرحمت، رُکن شامی اور اُدھر کی دو دیواریں نظر سے اوجھل
تھیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اس نظارے میں کھو سا گیا۔سعی کے دوران جی بھر کے دعائیں
کیں، خدا کا شکر ادا کیا....عمرہ مکمل کرنے کے بعد ہم مارکیٹ کی طرف نکل گئے۔ جرمنی میں بچوں
کو ٹیلی فون کر کے پھر اطلاع دی کہ ہم انشاء اللہ کل ۱۱ر دسمبر کو جدہ سے روانہ ہو کر ۱۲ر دسمبر کی صبح
فرینکفرٹ پہنچ جائیں گے۔اس کے بعد اپنے کمرے میں آ گئے۔۱۰ر دسمبر کا دن گذر چکا تھا کل
۱۱ر دسمبر کی شام سے پہلے ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔یہی خیال کرتے ہوئے نیند آ گئی۔

☆☆☆

مکہ مکرمہ میں آخری دن اور جرمنی واپسی

اگلے دن تہجد کی اذان ہونے سے پہلے ہی میں بیدار ہوکر تیار ہوگیا تھا۔مبارکہ کو جگایا۔ اس کے تیار ہونے تک تہجد کی اذان شروع ہوگئی۔ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کرتے ہوئے حرم شریف کی طرف روانہ ہوئے۔''باب الملک فہد'' سے گذر کر خانہ کعبہ کے سامنے کی صفوں میں تھوڑا سا بائیں جانب ہوکر مجھے بیٹھنے کا موقعہ ملا۔کل رات ''الصفا'' سے گذرتے ہوئے میں نے پلٹ کر جو منظر دیکھا تھا،اسکے عقب میں چھپا ہوا منظر اب میرے سامنے تھا۔رُکن یمانی اور رُکن شامی کے درمیان کی دیوار،میزاب الرحمت اور پورا حطیم....میں نماز تہجد کے بعد قرآن شریف پڑھنے لگا۔پھر دیدارِ کعبہ میں مشغول ہوگیا۔فجر کی اذان ہوئی تو سنّتیں ادا کرنے کے بعد پھر تسبیح وتحمید کے ساتھ کعبہ کا دیدار کرنے لگا۔ فرض نماز ادا کرنے کے بعد ہم اپنے کمرے میں آگئے۔ناشتہ کیا اور سوگئے....گیارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی تو اٹھ کر سامان پیک کیا اور اسے ہوٹل کے امانت خانے میں رکھوادیا۔ پھر میں بئر زمزم لینے چلا گیا۔۱۰لٹر کا برتن بھر کر لایا اور اسے بھی ہوٹل کے کاؤنٹر پر رکھوادیا۔ظہر کا وقت ہونے والا تھا سو ہم دونوں حرم شریف آگئے۔''باب الملک فہد'' سے گذر کر کعبہ کے سامنے جگہ حاصل کی۔اس بار غلافِ کعبہ پر نظریں مرتکز کیں۔کالے غلاف پر کالے حروف کے ابھار سے ہی پورے غلاف پر ہر جگہ کلمہ شریف تحریر تھا۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ......لیکن چونکہ یہ تحریر معمولی سے ابھار کے ساتھ تھی اس لیے عام نظر سے دیکھیں تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ غلافِ کعبہ پر جگہ جگہ کلمہ شریف تحریر ہے۔اوپر بنیرے سے چندفٹ نیچے،ایک چوڑی سنہری پٹی ہے جو کعبہ کی چاروں دیواروں تک

مسلسل تھی۔اس پٹی میں قرآنی آیات ابھری ہوئی ہیں۔اس پٹی سے تھوڑا نیچے،ہر دیوار پر دو مستطیل سنہری پٹیاں ہیں اوران کے دائیں،بائیں اور درمیان میں تین مختصر سی سنہری پٹیاں ہیں جن پر آیات اور بعض صفاتِ باری درج ہیں۔مختصر سی پٹیوں کو بالی نما خوبصورت ڈیزائن بھی کہا جاسکتا ہے۔کعبہ شریف کی ہر دیوار کے کونے پر ایک چوکور مربع سنہری پٹی بنی ہوئی ہے جو دونوں منسلک دیواروں کوتھوڑا تھوڑا ٹچ کرتی ہیں۔

نماز ظہر کے بعد ہم نے اپنے بچے کھچے سامان کو بھی سمیٹا،تھوڑی سی نیند کی۔بیداری کے بعد باقی سارا سامان بھی امانت خانے میں رکھوادیا۔کمرے کی چابی کاؤنٹر پر جمع کرائی کیونکہ ہمارے یہاں قیام کا مقررہ وقت پورا ہو چکا تھا چنانچہ ہم نے کمرہ چھوڑ دیا۔عصر کی نماز کا وقت ہونے والا تھا۔سوحرم شریف چلے گئے۔نماز عصر ادا کرنے کے بعد مارکیٹ کی طرف چلے گئے۔یہاں اس سفر کی سب سے کم خرچے والی خریداری کی۔''ہر مال ملے گا۲ریال میں'' والے سے مزید رعائت کرا کے ۵۰ریال کا چھوٹا چھوٹا سامان خریدا۔پھر حرم شریف میں آگئے۔ایسا کوئی سامان حرم شریف میں اندر لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔''باب الفتح'' کے سرکاری اہل کار نے مہربانی کی۔ہمارا سامان اپنے پاس رکھ لیا۔

اب درکعبہ میرے سامنے تھا۔کعبہ کی باقی تین دیواروں پر بنی ہوئی پٹیوں کی ترتیب ایک جیسی ہے لیکن درِکعبہ کی وجہ سے یہاں دو مستطیل پٹیوں کی جگہ صرف ایک مستطیل پٹی ہے البتہ بالی نما ڈیزائن یہاں بھی تین ہی ہیں۔درِکعبہ پر ایک دیدہ زیب سنہری سی چلمن آویزاں ہے۔اس پر قرآنی آیات درج ہیں۔یہ چلمن بیچ میں سے تھوڑی دائیں جانب اور تھوڑی سی بائیں جانب ہٹی ہوئی ہے۔''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' جیسی چلمن....یہاں مغرب سے پہلے آدھ گھنٹہ تک دیدار کعبہ کی سعادت نصیب ہوئی۔مغرب کے بعد ہم لوگ ایک ہوٹل میں گئے۔وہاں کھانا کھایا،پھر تھوڑی سی چہل قدمی کی....حرم شریف میں آنے والوں کے لئے بنائے گئے باتھ روم میں گئے۔وضو کیا اور حرم شریف کے اندر چلے گئے۔''باب الفتح'' کے سرکاری اہل کار نے اس بار پھر کمال مہربانی اور خندہ پیشانی سے ہمارا سامان رکھ لیا۔اب پھر وہی کعبہ کا ملتزم

شریف تھا اور ہم تھے.....نمازِ عشاء ادا کی....کعبہ کا الوداعی دیدار کیا اور پھر اپنے ہوٹل میں چلے گئے۔وہاں جا کر مبارکہ نے امانت خانے سے سامان نکلوایا اور میں ٹیکسی والے کو لے آیا....اب ہم جدّہ کی طرف جا رہے تھے۔رات پونے دس بجے تک ہم جدہ ائیر پورٹ پر پہنچ گئے۔۱۰ بجے تک سامان بُک کرا دیا۔ہماری فلائیٹ رات ایک بجے کی تھی۔سو گذرے ہوئے بابرکت دنوں کو اور ان دنوں کے مناظر اور واقعات کو یاد کرنے لگے....ایسے واقعات جو ہو کر گذر بھی چکے تھے لیکن جدہ ائیر پورٹ پر ہی خواب جیسے لگنے لگے تھے۔

جہاز اڑنے لگا تو مبارکہ کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔پچھلی بار تو بھوک لگنے کا مسئلہ تھا لیکن اس بار تو بھوک بالکل ہی نہیں تھی۔مبارکہ نے ''السعودیہ'' والوں کا کھانا بھی نہیں کھایا۔صرف جوس پر گذارا کیا۔جہاز میں بہت سارے گورے سوار تھے۔یہ سب کے سب روم میں اترنے والے تھے۔۲۵ردسمبر کو کرسمس منانے کے لئے ابھی سے ویٹی کن سٹی کے لئے جانا شروع ہو گئے تھے۔ہمارا جہاز روم کے ایئر پورٹ پر ایک گھنٹے کے لئے رُکا اور پھر ہم فرینکفرٹ پہنچ گئے۔ایئر پورٹ کے مراحل سے گذر کر بخیر و خوبی باہر آئے۔ٹیکسی لی اور پندرہ منٹ کے بعد ہم اپنے گھر، اپنے بچوں کے پاس پہنچ گئے۔

فالحمدلله علیٰ ذلك۔

میں نے کعبہ شریف اور مسجد نبویؐ میں بار بار اپنے ابا جی، امی جی، دادا جی، دادی جی، نانا جی، نانی جی، پردادا جی، پردادی جی، بابا جی، ممانی مجیدہ، ماموں ناصر، اپنے پانچوں بچوں، چاروں بھائیوں اور چاروں بہنوں اور ان کی اولادوں کے لئے نام بنام دعائیں کیں۔ان تمام قریبی رشتہ داروں عزیزوں اور دوستوں کے لئے دعائیں کیں جنہوں نے ہمارے عمرہ پر جانے کی خبر سن کر خوشی کا اظہار کیا تھا اور محبت کے ساتھ دعا کے لئے کہا تھا۔سچی بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے میں نے دعائیں کی ہی نہیں، وہ تو خود بخود دل سے نکلتی رہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت بی بی ہاجرہ، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے میں گناہ گار کیا دعا کرتا۔ان کے نیک اور عظیم نقشِ قدم پر چلنے کی ہمت اور توفیق مانگتا رہا۔اپنے لئے اور

مبارکہ کے لئے دعائیں کیں۔کچھ بہت ہی پیارے لوگوں کے لئے دعائیں کی۔

گھر واپس آ جانے کے بعد صبح کے وقت معمول کے مطابق قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہوئے ایک دن سورۃ الحج کی ایک آیت میں **بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ** کے الفاظ پڑھے تو میں رُک گیا....پھر اُردو ترجمہ والے قرآن مجید میں بئر کا مطلب دیکھا تو معلوم ہوا کنویں کو عربی میں بئر کہتے ہیں۔خانہ کعبہ میں اپنی بے خبری کے باعث میں ''بئر زم زم'' کو ''زم زم کا کنواں'' سمجھنے کی بجائے شراباً طہوراً جیسی بئر سمجھ کر تھوڑی سی شوخی اور تھوڑے سے سرور کا مزہ لیتا رہا۔اب اصل مطلب واضح ہو چکا ہے لیکن اُس بے خبری کا مزہ اب بھی اپنی جگہ موجود ہے۔

جرمنی میں جتنے عزیز اور دوست ملنے کے لئے آئے۔مکہ مدینہ کے حالات پوچھتے، عمرہ کا طریق کار معلوم کرتے۔ہمارے احوال سن کر ایسے لگتا تھا جیسے انہیں....، انہیں تو جیسے لگتا تھا سو لگتا تھا۔خود مجھے ایسے لگتا تھا جیسے میں وہاں کے احوال نہیں سنا رہا پھر سے وہاں کی زیارتیں کر رہا ہوں، طواف کر رہا ہوں، سعی کر رہا ہوں، روضۂ رسولؐ پر حاضری دے رہا ہوں، مقاماتِ مقدسہ کی زیارتیں کر رہا ہوں، نوافل پڑھ رہا ہوں، دیدار کعبہ کر رہا ہوں......

اور اب کہ وہاں کی یہ رُوداد مکمل کی ہے تو اس وقت اپنے دل، اپنی رُوح اور اپنے ذہن کی کیفیات، اپنے پورے وجود کی حالت کو میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔

''اے اللہ! میرے اس سفر کو اپنے گھر کا آخری سفر مت بنا۔اور بنا دیا تو اس کے بدلے میں جنت عطا فرما۔ہم سب اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں، توبہ کرتے ہیں، اسی کی عبادت اور تعریف کرتے ہیں اور اس کی رحمت کے طلب گار ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور لشکرِ کفار کو تنہا شکست دی۔گناہوں سے بچنے اور نیکی کی قوت اللہ بزرگ و برتر ہی کی طرف سے ہے''۔۔۔۔۔۔۔(طوافِ وداع کی مخصوص دعا کا ترجمہ)

☆☆☆

کعبہ شریف سے متعلق چند ماہیے

عاشق ، محبوب ہوا
کھیل انوکھا تھا
جاذب ، مجذوب ہوا

کس نُور کا درشن تھا
سامنا ہوتے ہی
روشن مرا تن من تھا

کثرت کی زبانی ہیں
کعبہ کی دیواریں
وحدت کی نشانی ہیں

پوچھو نہ مزہ ہم سے
پیاس بجھائی تھی
جب بئرِ زم زم سے

لطف آ گیا جینے میں
نوُرمناظر کا
جب بھر گیا سینے میں

قربت میں کمال ہوا
نازقبول اور عجز
بلند اقبال ہوا

جو یار سے دُور ہوا
عجز، ریا اس کا
اور ناز ، غرور ہوا
☆☆☆

نعت شریف

اٹھ کر بیٹھ گئے جب آدھی رات ہوئی　　پھر محرابِ تہجد میں ہر بات ہوئی

بنجر دل میں اُگتی یہ ہریالی سی　　مجھ کو گنبدِ خضرا کی سوغات ہوئی

روضے کی جالی کے سامنے کیا آیا　　سامنے میرے ساری کائنات ہوئی

رُوح کا صحرا یوں نکھرا کہ چمک اُٹھا　　نُورِ محمدؐ کی ایسی برسات ہوئی

جانے وہ اک کیسا انوکھا لمحہ تھا　　جب ہم جیسوں سے بھی نفیٔ ذات ہوئی

ہم سے گمراہوں کی بخشش کا باعث　　صرف انہیں کی ذاتِ بابرکات ہوئی

ٹاٹ ایسا دل مخمل جیسا کر لائے　　مسجد نبوی میں اک ایسی بات ہوئی

کملی والےؐ سے اک نسبت کے صدقے　　جیت میں ڈھل گئی جب بھی اپنی مات ہوئی

حیدرؔ اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے
نعت کہی تو ہے لیکن کب نعت ہوئی!

سفرِ حج

(سال ۲۰۰۳ء)

حال دھمال سے تن من روشن، روشن ہوگئی جان
جگمگ کر اٹھی ہو جیسے ایک اندھیری گور

دسمبر ۱۹۹۶ء میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد سے دل میں یہ خواہش تھی کہ ارضِ حجاز میں پھر سے حاضری دی جائے۔مسئلہ یہ تھا کہ ایک بار عمرہ سے ہوآنے کے بعد دوبارہ عمرہ کے لئے جانے سے پہلے حج کرنا ضروری تھا۔حج کے بعد پھر جتنی بار چاہیں عمرہ کے لئے جا سکتے ہیں۔۲۰۰۳ء میں حج کے لئے جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔اس کے لئے عمرہ جتنی رقم بھی بچالی تھی۔لیکن جب جانے کا وقت قریب آیا اور حج کے جملہ اخراجات کی تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا کہ جتنی رقم کے ساتھ ہم عمرہ کرآئے ہیں اس سے دوگنی رقم بھی حج کے لئے کم ہے۔اپنی مالی حیثیت دیکھتے ہوئے چُپ کر کے بیٹھ گئے۔

اسی دوران پہلے بڑے بیٹے اور بہو(شعیب اور تسنیم) نے اپنی طرف سے ایک پیش کش کی۔پھر دوسرے بیٹے اور بہو(عثمان اور نادیہ) نے ساتھ دیا۔دونوں بھائیوں کو دیکھتے ہوئے طارق نے بھی ہمت کی اور اپنی پاکٹ منی سے ہی اچھی خاصی رقم نکال دی۔تینوں بیٹوں کی طرف سے حج کرانے کی پیش کش سامنے آئی تو فرانس میں مقیم میرے سب سے چھوٹے بھائی اعجاز کو بھی جوش آ گیا۔چنانچہ اس نے بھی اس کارِخیر میں خاطر خواہ حصہ ڈال لیا۔اعجاز کی وجہ سے ۱۹۹۵ء میں ہم نے اپنا عمرہ موخر کر دیا تھا اور اب حج پر جانے کی توفیق ملنے لگی تھی تو اس میں اعجاز کا بھی خاطر خواہ حصہ شامل تھا۔اللہ تعالیٰ تینوں بیٹوں،دونوں بہوؤں اور بھائی کو جزائے خیر دے۔آمین

رقم کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا تو آخری مرحلہ میں فرینکفرٹ میں سعودی عرب کے منظور شدہ ادارہ ''فہد عمرہ سروس'' سے رابطہ کیا۔انہوں نے کاغذی کاروائی مکمل کر لی تو پاسپورٹ ان کے حوالے کر کے آ گئے۔یکم فروری کو ان کی طرف سے ٹیلیفون آیا کہ ویزہ اور ٹکٹ لے جائیں۔ہمیں بتایا گیا کہ فہد عمرہ سروس کا ایک بندہ ہمیں وہاں سے لے لے گا۔ہمیں فہد سروس

والوں کا سعودی عرب کا ٹیلی فون نمبر بھی دیا گیا کہ کسی مسئلہ کی صورت میں ان سے رابطہ کریں۔وہ تاریخی نمبر یہ ہے: 055311846

۲رفروری اتوار کے روز ساڑھے نو بجے کی حج فلائیٹ سے روانہ ہوئے۔۳رفروری کو علی الصبح سعودی عرب کے وقت کے مطابق ۵ بجے جدہ پہنچے۔جدہ ائر پورٹ پر بدانتظامی کی انتہا تھی۔بے شک حج کے ایام میں رش بہت زیادہ ہوجانے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور کہیں نہ کہیں کوئی انتظامی کوتاہی رہ جاتی ہے۔لیکن یہاں تو دیدہ دانستہ بدانتظامی کے مناظر تھے۔میں اس سفر کی روداد کے آخر میں سعودی انتظامیہ کے لئے ایک دو مشورے لکھوں گا۔اگر ان پر غور کر کے عملدرآمد کی کوئی صورت نکل آئے تو اچھی بات ہوگی۔

جدہ ائر پورٹ سے باہر نکلنے تک افراتفری،بدنظمی کے کئی مرحلوں سے گزرے۔باہر آئے تو ہمارا سامان ایک بڑے ٹرالے پر لاد کر کسی انجان سمت لے جایا جانے لگا۔پھر ایک ٹرمینل پر لے جا کر سارا سامان ڈھیر کر دیا گیا۔دراصل حج کے سلسلہ میں سعودی حکومت نے گروپ کی صورت میں آنے والوں کو ترجیح دے رکھی ہے جو حکومت کے لئے خاصا منفعت بخش کاروبار بن چکا ہے۔انفرادی اور ذاتی طور پر آنے والوں کی حوصلہ شکنی کا بطور خاص انتظام کر رکھا ہے تاکہ لوگ صرف حج گروپس کی صورت میں آئیں اور سعودی حکومت کے خزانے میں اضافہ کا موجب بنیں۔آگے چل کر پوری طرح اس بات کی تصدیق ہوتی گئی کہ ایک دینی فریضہ کی ادائیگی کو''خادمین الحرمین الشریفین'' کی قائم کردہ وزارت حج کی جانب سے باقاعدہ کمرشلائز کر دیا گیا ہے۔

میں نے''فہد عمرہ سروس'' کے بندے سے مذکورہ بالا فون نمبر پر بات کی وہاں سے ایک اور نمبر دے دیا گیا۔اس نمبر پر رابطہ کیا تو کہا گیا کہ میں دو گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔پھر کئی گھنٹے گزر گئے۔پریشان ہو کر میں نے ایک پاکستانی کو ڈھونڈا۔ان کی مدد سے وزارت حج کے ایک افسر کے دفتر میں گئے۔موصوف بڑی شائستگی سے پیش آئے۔ان کو فہد سروس کا فون نمبر دیا تو انہوں نے اپنے موبائل فون سے ان سے رابطہ کیا اور انہیں فوراً اپنے دفتر میں طلب کیا۔پھر ہمیں بتایا کہ وہ

بس آنے والا ہے اور ہمیں لے کر دفتر سے باہر آ گئے۔ایک جگہ ہمیں رکنے کے لئے کہا اور پھر خود بھی غائب ہو گئے۔جس پاکستانی دوست کے ذریعے وزارت حج کے اس ''عظیم افسر'' سے رابطہ کیا ان کا نام رضاءاللہ خالدی تھا۔

وہاں سے واپس اس ٹرمینل تک آئے جہاں ہمارا سب کا سامان ڈھیر تھا،تو دیکھا کہ مبارکہ اکیلی کھڑی رو رہی ہے۔سارا سامان غائب ہے۔پتہ چلا کہ وہ ٹرمینل کے ساتھ منسلک باتھ روم تک گئی ہے اور تین منٹ کے اندر سارا سامان غائب ہو گیا ہے۔وہاں گروپ حج والے بھی موجود تھے۔وہ جانے لگے تو ان کے سامان کے ساتھ ہمارا سامان بھی چلا گیا۔یہ گروپ والوں میں سے کسی کی بد نیتی تھی یا سعودی انتظامیہ کی بد انتظامی تھی،خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

دو بھرے ہوئے اٹیچی کیس اور ایک بڑا بیگ، لے جانے والے سب کچھ ہی لے گئے۔اب فہد عمرہ سروس والوں کی سروس کا کیا کرتے،سامان کی فکر دامنگیر ہوئی۔تشویش والی سب سے اہم بات یہ تھی کہ بلڈ پریشر اور شوگر چیک کرنے والے ہمارے سارے آلات بھی اس سامان میں تھے اور ہماری بیماریوں کی دوائیں بھی اس سامان میں تھیں۔میرا مسئلہ شوگر کی ایک گولی تک تھا لیکن مبارکہ کو بیک وقت سات آٹھ گولیاں دن میں دو تین بار لینا ہوتی ہیں۔اور ہر گولی بہت ضروری ہوتی ہے۔سارا سامان غائب ہونے کے باوجود یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ مبارکہ کا پرس اس کے کندھوں پر تھا۔پرس میں ہماری ساری سفری دستاویزات اور ایک معقول رقم موجود تھی۔اسی لئے مجھے سامان کی اتنی فکر نہیں تھی البتہ دواؤں کے سلسلے میں پریشانی ضرور تھی کہ کیا بنے گا۔

رضاءاللہ خالدی صاحب اس وقت اپنی ڈیوٹی پر تھے پھر بھی انہوں نے ''حج سروس آفس'' تک میری رہنمائی کی۔وہاں پہلے تو ایک سے بڑھ کر ایک ''بدو'' سے واسطہ پڑا،جو عربی کے علاوہ کسی زبان میں بات نہیں کر سکتے۔لیکن آخر ڈاکٹر غازی غورب تک پہنچے تو قدرے تسلی ہوئی کہ جس سے بات کی جا رہی ہے وہ بات کو سن رہا ہے،سمجھ رہا ہے اور اپنی بساط کے مطابق کچھ کر بھی سکتا ہے۔انہوں نے ہمارے تینوں اٹیچی کیس اور بیگ کی تفصیل مخصوص فارم پر لکھ لی اور اپنا فون

نمبر بھی ہمیں دے دیا۔(02-68 58 328)

صبح پانچ بجے جدہ ائرپورٹ پر

پہنچنے کے بعد سے لے کر اگلے پندرہ گھنٹے تک ہم مسلسل ائرپورٹ پر خوار ہوتے رہے۔اس خواری کی وجہ یہی تھی کہ ہم حج گروپ کے ساتھ نہیں تھے اور ذاتی طور پر آنے والوں کو جان بوجھ کر خوار کیا جا رہا تھا۔ہر طرف سے پریشانیوں کا سامنا کرنے کے بعد آخر بغیر سامان کے مکہ میں اپنے مقررہ ہوٹل تک پہنچے۔پندرہ گھنٹے سے زائد کی پریشانی،تھکن اور کوفت کے باوجود ہوٹل میں اپنا کمرہ سنبھالنے کے بعد سیدھا خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے حرم شریف روانہ ہو گئے۔حرم شریف پر نظر پڑتے ہی ایسے لگا جیسے ساری تکالیف کی قیمت وصول ہو گئی ہو۔

۴؍**فروری(۳ ذی الحجہ)** کو ہم نے فجر کی نماز کے بعد پہلے ناشتہ کیا۔پھر ہوٹل میں جا کر آرام کیا۔ظہر کی نماز حرم شریف میں ادا کی۔پھر کچھ خریداری کرنے نکلے۔وہاں پاکستانی طرز کے لباس نہیں مل رہے تھے۔مجبوراً عربی ملبوسات پر گزارا کرنا پڑا۔واپس آ کر جب ہم دونوں نے عربی لباس پہن کر انہیں چیک کرنا چاہا تو عربی لباس میں ملبوس ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔میں تو ہنستا ہی رہا لیکن ہنستے ہنستے مبارکہ کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔اسے سامان کی گمشدگی کا بہت دکھ تھا۔میں نے اسے تسلی دی کہ پرانے زمانے میں لوگ بہت تکالیف اور دکھ اٹھا کر مکہ پہنچ پاتے تھے۔سوطرح کی بیماریوں سے گزرتے ہوئے،دوران سفر ہی ان کے قافلے کئی مصائب میں مبتلا ہوتے۔خود عرب بدوان کے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ہم ہوائی جہاز سے بڑے آرام سے آئے ہیں۔صرف سامان غائب ہوا ہے تو یہی سمجھ لیں کسی عرب بدو نے لوٹ لیا ہے۔اگر وہ سارا سامان موجود ہوتا لیکن صرف آپ کا پرس گم ہو جاتا تو ہم کتنی بری حالت میں ہوتے؟اس پرس میں اتنی رقم ہے کہ ہم ویسے ہی تین بیگ اور ویسے ہی سامان سے دوگنا سامان آسانی سے خرید سکتے ہیں۔

۴؍فروری کو خانہ کعبہ کی زیارت کی تو منظر بہت بدلا بدلا سا لگا۔غلافِ کعبہ کو اس کے اصل مقام سے شاید اندازاً ڈیڑھ دو میٹر اونچا کر دیا گیا تھا اور اس کے نیچے سفید لٹھا قسم کا کپڑا اسلائی کر دیا

گیا تھا۔ یہ صورت دیکھ کر دل کو دھچکا سا لگا۔ کعبہ شریف غلاف میں اس ردوبدل کے باعث پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ حطیم کی روشنی بھی بجھی بجھی سی تھی۔ پتہ نہیں یہ عالمی صورتحال پر خانہ کعبہ کی اداسی کا منظر تھا یا ویسے ہی میرے اپنے اندر کی اداسی تھی۔ ویسے یہ بات مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ بہت زیادہ عقیدت مند حجاج، حج کے رش سے فائدہ اٹھا کر غلافِ کعبہ کے ٹکڑے قینچی سے کاٹ کر گھروں میں تبرک کے طور پر لے جاتے رہے ہیں (چوری کیا ہوا تبرک؟)۔ غالباً اسی وجہ سے حکومت نے حفاظتی تدبیر کے طور پر غلافِ کعبہ کو اونچا کر دیا تھا۔ یہ مناسب تدبیر تھی لیکن اس تبدیلی سے یوں لگتا تھا جیسے دل اور کعبہ دونوں ہی اداس ہیں۔

مغرب کی نماز کے بعد ہم حرم شریف سے نکل کر اپنے ہوٹل کی طرف جانے لگے تو مسلسل بڑھتے ہوئے رش میں پھنس گئے۔ حجاج کی آمد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، سڑکوں پر کپڑا بچھا کر سامان بیچنے والے موجود، سڑک پر بے ترتیب ٹریفک کا ہجوم اور تنگ سڑکیں۔۔۔نماز کے بعد حرم شریف سے نکلنے والے حجاج کا ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ ہم دونوں اس میں پھنس کر رہ گئے۔ میں مبارکہ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک تیز ریلا آیا جس میں ہم دونوں تنکے کی طرح بہہ نکلے۔ مبارکہ کی حالت اتنی غیر ہو گئی کہ شارع خالد بن ولید پر واقع ایک دوکان ''تسجیلات الاسلامیہ الخلفاء'' کے تھڑے پر کھڑے ایک صاحب نے پہلے مبارکہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر اسے کھینچ کر دوکان کے اندر کر لیا۔ میری بھی جان میں جان آئی۔ دوکان کے تھڑے پر چڑھے تو دیکھا وہاں پہلے سے ایسی چند اور خواتین بھی پناہ گزین تھیں اور بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ دراصل اس ایریا کا ہمارا سابقہ تجربہ عمرہ کے عام دنوں کا تھا، ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ حج کے دنوں میں رش کی وجہ سے ایسی خوفناک صورتحال بھی پیش آ سکتی تھی۔ اس تجربہ کے بعد ہم نے یہ احتیاط شروع کر دی کہ نماز کے بعد لگ بھگ ایک گھنٹہ تک حرم شریف کے اندر ہی بیٹھے رہتے تاکہ رش کا زور ٹوٹ جائے۔

۵؍فروری (۴؍ذی الحجہ) کو حجاج کی آمد میں اضافہ ہوا تو نمازی سڑکوں سے بھی پرے تک پھیلنے لگے۔ ہم نے بھی رش کی یلغار میں آنے سے بچنے کے لئے حفاظتی

تدابیر میں اضافہ کر لیا۔ اس روز ہم دونوں نے عمرہ کیا۔

۶؍فروری (۵؍ذی الحجہ) کا دن گزشتہ دو دنوں کی طرح گزرا۔ تاہم ۶ اور ۷ **فروری** کی درمیانی رات ہم نے حرم شریف میں جاگ کر گزارنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ صحنِ کعبہ میں بیٹھ کر شب بیداری کی توفیق بھی ملی اور نوافل کی ادائیگی اور تلاوت قرآن پاک کے ساتھ جی بھر کر دعائیں کرنے کی توفیق بھی ملی۔ طوافِ کعبہ کرنے والوں کے بڑھتے ہوئے ہجوم کے باوجود صحنِ کعبہ میں ہی رات گزارنے کی توفیق مل جانا بہت بڑی بات تھی۔ اس شب بیداری کا سب سے بڑا اجر دیدارِ کعبہ کی صورت میں ملتا رہا۔ سات فروری کا دن چڑھا تو نمازِ فجر کے کے بعد ہم لوگ صحنِ کعبہ سے اٹھ کر حرم شریف کے اس حصے میں آ گئے جو باب الملک فہد والی سائڈ پر تھا۔ یہاں ہم نے ایسی جگہ حاصل کر لی جہاں سے خانہ کعبہ دکھائی دیتا رہتا۔ یہاں ہمیں دو ہلکے سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم نے اپنی ضرورت کے مطابق جگہ سنبھال رکھی تھی۔ ایک بار مبارکہ باتھ روم تک گئی تو اس دوران متعدد افراد نے خالی جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے ان سب سے جگہ بچائی۔ جب میں باتھ روم کے لئے گیا تو تب مبارکہ کو بھی یہی مشکل درپیش رہی۔

دوسرا مسئلہ صرف میرے لئے تھا۔ ہماری صف سے اگلی صف میں تین خواتین نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ آبِ زم زم کے کولرز کے ساتھ بیٹھی ہوئی ان خواتین نے قرآن شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر انہوں نے ثواب کی غرض سے کولرز سے گلاسوں میں پانی بھر بھر کر وہیں سے آگے بڑھانا شروع کر دیئے۔ ان کے ثواب کمانے کی نیت نے مجھے بلاوجہ گنہگار کئے رکھا۔ ''ساقیانِ زم زم'' کو دیکھ کر دو تین حجاج کرام بھی ثواب کمانے کی غرض سے مستعد ہو کر کھڑے ہو گئے اور ان خواتین سے گلاس لے لے کر اگلی پچھلی صفوں تک پہنچانے لگ گئے۔ ساقیانِ زم زم کو دیکھ کر بعض حجاج کرام کو ویسے ہی پیاس لگنے لگ گئی۔ گلاس آگے پہنچانے والے ایک حاجی صاحب نے سرگوشی کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ خواتین مصر سے آئی ہیں۔ یہ سبحان اللہ اور استغفر اللہ ایک ساتھ پڑھنے کا نازک مقام تھا۔ قلوپطرہ مصری حسن کی مثال تھی تو یہ

خواتین بھی اس سے کم نہ تھیں۔باقی ہرقوم میں بہت خوبصورت چہروں کی ایک مخصوص تعداد ہوا کرتی ہے۔اوسط صورتیں وہی ہوتی ہیں جوہم عام طور پر اپنے اردگرد اور آئینے میں دیکھتے رہتے ہیں۔

۸/فروری (۷/ذی الحجہ) کو ہم دونوں ''حی الہجرۃ'' علاقہ میں ''عمارت السحینی'' پہنچے۔اس عمارت کی تلاش میں خاصا خوار ہونا پڑا۔ان کے جاری کردہ ایڈریس پر ''الہجرۃ'' درج تھا۔جبکہ مطلوبہ عمارت ''حی الہجرۃ'' علاقے میں تھی۔بہرحال پہلے ہم کافی دیر تک ''الہجرۃ'' ایریا میں ''عمارت السحینی'' کو تلاش کرتے رہے۔کافی خواری کے بعد اللہ کے ایک بندے نے رہنمائی کی تو ''حی الہجرۃ'' تک پہنچ پائے۔وہاں مذکورہ عمارت کے دفتر میں گئے تو جان میں جان آئی۔لیکن پھر جب انگلش جاننے والے عربی کارکنوں سے واسطہ پڑا تو یہاں بھی وہی شانِ بے نیازی تھی جوائرپورٹ سے لے کر ہر جگہ تک عام طور پر حجاج کے ان خدمتگاروں کا رویہ بن گیا ہے۔یہاں مجھے ابوجہل یاد آ گیا ہے۔اس کی بدنصیبی تھی کہ سرورِکائنات حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بھی آپؐ کو قبول کرنے سے محروم رہا لیکن اس بدنصیب بلکہ بدبخت کو بھی اپنے زمانے میں حاجیوں کی خدمت کی بڑی توفیق ملتی رہی تھی۔عربی روایات میں بڑی صراحت سے لکھا ہوا ہے کہ ابوجہل حاجیوں کی خدمت میں پیش پیش رہتا تھا۔بہت بڑا سردار ہونے کے باوجود پانی کی مشک اپنے کندھوں پر ڈال کر حاجیوں کو پانی پلایا کرتا تھا۔۔۔۔ایک وہ ایمان کی سعادت سے محروم بدبخت تھا اور دوسری طرف یہ ''ایمان کی دولت سے مالا مال'' عرب مومنین تھے جو کوئی سردار بھی نہ تھے،جن کی ڈیوٹی بھی حاجیوں کی پریشانیوں کو دور کرنا تھا لیکن یہ ''صاحبِ ایمان'' خدمتگار حاجیوں کو پریشان کر کے ان کی خدمت کر رہے تھے۔

کئی خدمتگاروں کے ہاتھوں خوار ہونے کے بعد ایک نوجوان امین نغامذی سے واسطہ پڑا۔پہلے سارے کارکنوں سے بالکل مختلف۔۔۔شائستہ،نرم رو اور بات کو سمجھ کر مسئلے کا ممکنہ حل نکالنے کی کوشش کرنے والا۔۔۔۔اس نوجوان نے ہمارے ہر چھوٹے بڑے درپیش مسئلہ کو سنا،سمجھا اور پھر موقعہ پر ہی اس کا ممکنہ حل بھی نکال دیا۔امین نغامذی سے ملنے کے بعد انتظامی اور

نقل وحمل کے امور سے متعلق ذہن سے بہت سا بوجھ اتر گیا۔ہمیں رات کو یہیں پہنچ کر منیٰ کے لئے گاڑی لینا طے ہوا تو ہم اطمینان سے خریداری کرنے چلے گئے۔مقررہ وقت پر پھر عمارت السحینی میں پہنچ گئے۔

رات بارہ بجے کے بعد **۹ فروری (۸ ذی الحجہ)** کی تاریخ شروع ہوچکی تھی۔جب منیٰ کے لئے ہماری روانگی ہوئی۔منیٰ خیموں کا عالی شان شہر بنا ہوا تھا لیکن جاتے ہی پہلی خرابی یہ ہوئی کہ بس ڈرائیور نے ہمیں ہمارے کیمپ 39-B کی بجائے نمبر 39 پر اتار دیا۔وہاں پھر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔مبارکہ کی طبیعت بگڑنے لگی۔وہ تھک ہار کر سڑک کے کنارے پر ہی بیٹھ گئی۔آخر ایک ویگن آئی اور ہمیں اصل ٹھکانے پر لے گئی۔بس میں بیٹھے ہوئے دور سے خیموں کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ ان کے اندر مجھے گھٹن ہوسکتی ہے۔لیکن نہ صرف خیمے بے حد کشادہ تھے بلکہ ان کے اندر بڑے بڑے ائرکنڈیشنڈ لگے ہوئے تھے۔گھٹن کی بجائے سردی لگنے لگی۔خواتین کے خیمے الگ تھے اور مردوں کے الگ۔تاہم رابطہ کرنے میں زیادہ دقت نہیں تھی۔مبارکہ کو اتنی زیادہ ٹھنڈ لگ رہی تھی کہ اس کے کہنے پر میں نے خود اس کے خیمے میں جا کر اس کا ائرکنڈیشنڈ بند کیا۔پھر بھی صبح تک مبارکہ کی حالت کافی خراب ہوگئی۔چنانچہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ایک ایمبولینس آئی۔وہیں پر مبارکہ کی دیکھ بھال کی گئی اور پھر وہ لوگ دوا دے کر رخصت ہوئے۔۹/فروری کا سارا دن منیٰ میں اپنے اپنے خیموں میں نمازیں،نوافل کی ادائیگی کرتے،تلاوت قرآن پاک کرتے اور دعائیں کرتے ہوئے گزارا۔

اگلے روز **۱۰/فروری (۹/ذی الحجہ)** کو صبح سویرے ہی عرفات کے لئے روانگی ہوئی۔وقوف عرفات حج کا رکنِ اعظم ہے۔یہاں حج کا خطبہ ہوتا ہے اور مسجد نمرہ میں خطبہ عید ہوتا ہے اور اس سے ملحق بڑے میدان میں نماز باجماعت کے ساتھ اپنے اپنے گروپوں میں نماز باجماعت کا انتظام ہوتا ہے۔ہم نے اپنے ہی گروپ میں نماز باجماعت پڑھی۔(یہاں گروپ سے مراد صرف یہ ہے کہ ہم جس حصے میں مقیم تھے وہاں کے سارے لوگوں نے باجماعت نماز ادا کی)شام ہونے کے بعد یہاں سے مزدلفہ کے لئے روانگی ہوئی۔یہ ایک کھلا میدان ہے۔یہاں

بے سروسامانی کی حالت میں کسی چھت کے بغیر اور مرد، عورت کی کسی تفریق کے بغیر جہاں جگہ ملے وہاں رہ کر پوری رات عبادت میں گزارنی ہوتی ہے۔لاکھوں لوگوں کا ہجوم یکجا ہوا تو گرد وغبار بھی بہت زیادہ بڑھ گیا۔روایت ہے کہ مزدلفہ میں جو کوئی ساری رات جاگ کر دعا مانگتا رہے، اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔حقیقتاً دن بھر میدانِ عرفات میں عبادت کے بعد مزدلفہ پہنچنے تک ہی انسان اتنا تھک جاتا ہے کہ اس کا رات بھر جاگنا ہی مشکل ہو جاتا ہے اور پھر انہماک کے ساتھ دعا مانگنے کی کیفیت پیدا ہونا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔شاید اسی لئے اسی موقعہ پر قبولیت دعا کا چانس زیادہ کر دیا گیا کہ مانگنے والوں کو اتنا ہوش ہی کہاں ہو گا۔مزدلفہ میں سب کچھ غیر منظّم تھا۔کوئی سونا چاہے تو جیسے چاہے جہاں چاہے دستیاب صورتحال کے مطابق سو سکتا تھا۔محرم اور غیر محرم کی کوئی تفریق نہ تھی۔بس کوئی اپنے طور پر احتیاط کر لے تو کر لے۔

یہاں کے گرد وغبار کی وجہ سے مبارکہ کی حالت ایک دفعہ پھر بگڑ گئی۔لیکن اب صبر کے ساتھ تکلیف برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔خود مجھے بھی کھانسی کی تکلیف ہو گئی تھی اور کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا تھا۔یہیں سے میں نے منیٰ میں شیطان کو مارنے کے لئے اپنے اور مبارکہ کے حصے کی کنکریاں جمع کر لیں۔

۱۱ر فروری کو ہم لوگ گرتے پڑتے منیٰ میں اپنے خیموں تک پہنچے۔مبارکہ کی علالت کے باعث اسے اس کے خیمے میں چھوڑا اور خود شیطان کو کنکریاں مارنے کے لئے چلا گیا۔۱۰ ذی الحجہ کو صرف بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا ہوتی ہیں۔شیطان تک پہنچتے ہوئے رش اتنا زیادہ تھا کہ مجھے اپنا دَم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔پھر بھی جیسے تیسے ہمت کر کے میں نے پتھر مارنے کا کام پورا کر لیا۔بعد میں پتہ چلا کہ اسی ہجوم میں ۱۴ افراد رش کی وجہ سے کچلے گئے یا دَم گھٹنے سے ہلاک ہو گئے۔شیطان کو کنکریاں مار کر نکلا تو باہر آ کر سر کا حلق کرایا۔یعنی سر پر مکمل استرا پھرایا۔یہاں سے فراغت کے بعد کھانے کے لئے کچھ عربی قسم کا چاولوں اور مرغ کا کھانا خریدا۔پیک کرایا اور منیٰ میں اپنے خیموں کی طرف روانہ ہوا۔لیکن ایک جیسے خیموں کو دیکھ کر ایسا چکر آیا کہ اپنے خیموں کا رستہ نہیں ملا۔منیٰ میں بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا بجائے خود بہت بڑی مشقت کا کام تھا اس

کے بعد کچھ آرام کرنا ضروری تھا لیکن میں رستہ بھول گیا تھا اور اب پیدل چلتے ہوئے اپنے ایریا کے خیمے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔جگہ جگہ سعودی وزارت حج کے متعین کردہ اہلکار اور پولیس موجود تھی ۔ایک ایک سے اپنے خیمے کا رستہ پوچھا لیکن مجال ہے جو کسی نے انسانوں کی طرح بات کرنا بھی گوارا کیا ہو۔رہنمائی کرنا تو بعد کی بات ہے۔اپنے خیمے کا لکھا ہوا، اتہ پتہ میرے پاس موجود تھا لیکن چار گھنٹے کی خواری کے باوجود کسی سرکاری اہلکار یا پولیس والے نے کسی قسم کی کوئی رہنمائی نہیں کی۔پتہ نہیں ان سب کو وہاں کس مقصد کے لئے تعینات کیا گیا تھا۔

چار گھنٹے کی اس خوفناک تلاش کے بعد حقیقتاً میری کیفیت ایسی ہو گئی کہ جی چاہا چھوٹے بچوں کی طرح سر پر ہاتھ رکھ کر اونچی آواز سے رونا شروع کر دوں۔بس ادھر یہ کیفیت بنی اور اُدھر ایک حاجی نے میری رہنمائی کر دی۔خدا جانے وہ حاجی کس ملک کا تھا اور کس زبان میں سمجھا رہا تھا لیکن میرے لکھے ہوئے ایڈریس سے اسے میری جائے قیام کا اندازہ ہو گیا تھا اور اس نے جس زبان میں بھی مجھے سمجھایا، سمجھ میں آ گیا تھا۔ میرے خیموں کا ایریا میرے سامنے تھا لیکن ایک لمبے سے چکر کے بعد وہاں تک پہنچنا ممکن تھا۔لمبے چکر کے بارے میں بھی حاجی بھائی نے سمجھا دیا اور میں انتہائی تھکاوٹ کی حالت میں لمبا چکر مکمل کر کے اور مزید کسی چکر میں پڑے بغیر اپنے خیمے تک پہنچ گیا۔مبارکہ کچھ آرام کرنے کے باعث قدرے بہتر تھی اور میری حالت کافی خراب ہو چکی تھی پھر بھی ہم نے حج کے طریق کے مطابق مکہ شریف جانے اور طواف وسعی کا فرض ادا کرنے کے لئے کمرِ ہمت کس لی۔خیموں کی حدود سے باہر آ کر برلبِ سڑک کھڑے ہو گئے۔چند ناکامیوں کے بعد ایک ویگن میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔اس ویگن نے حرم شریف سے خاصی دور اتارا۔ ان کی مجبوری بھی جائز تھی کہ اس رش میں جتنی دیر میں ویگن وہاں پہنچ پاتی پیدل چلنے والے اس سے کہیں پہلے پہنچ جاتے۔ویگن سے اتر کر پھر پیدل چلنے لگے۔ہمیں جتنا سفر حرم شریف پہنچنے تک کرنا تھا لگ بھگ اتنا ہی سفر پھر آگے اپنے ہوٹل تک پہنچنے کے لئے کرنا تھا۔گرتے پڑتے اپنے ہوٹل تک پہنچے۔یہاں حکم کے مطابق اپنا احرام کھولا۔غسل کیا اور نئے کپڑے پہن لئے۔مبارکہ بھی غسل کر کے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو گئی۔ہوٹل کی انتظامیہ کو

ہم نے پہلے ہی سے چھ بکروں کی قربانی کے لئے رقم دے کر ضروری کاروائی کر لی تھی۔ یہ قربانی ایک ایک ہم دونوں کی طرف سے تھی اور باقی چار ابا جی، امی جی، ماموں ناصر اور ممانی مجیدہ کی طرف سے کرائی تھیں۔ قربانی کا گوشت آیا ہوا تھا ، انتظام کرنے والوں نے کچھ گوشت پکا کر بھی رکھا ہوا تھا۔ ہم نے اس میں سے تھوڑا سا کھایا اور پھر حرم شریف چلے گئے۔ نماز عشاء کے بعد ہم طواف اور سعی کے لئے مستعد تھے۔

پہلے عمرہ میں، منیٰ جانے سے پہلے، طواف کرتے ہوئے ہم گراؤنڈ فلور سے خانہ کعبہ کے گرد تین چکر لگا پائے تھے کہ ہجوم کی وجہ سے مجھے لگا مبارکہ اس میں کچلی جا سکتی ہے۔ چنانچہ باقی کے چار چکر ہم نے دوسری منزل سے جا کر پورے کئے تھے۔ اس بار پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ طواف اور سعی کے سارے مراحل اوپر والی کسی منزل پر طے کریں گے۔

چنانچہ تیسری منزل سے ہم نے خانہ کعبہ کا طواف شروع کیا۔ مبارکہ کے لئے وہیل چیئر کا انتظام کر لیا تھا۔ یہ ایک چکر زمین سے خانہ کعبہ کے گرد تین چکروں کے برابر لگا لیکن رش کی موجودہ حالت میں یہی بہتر لگا۔ طوافِ کعبہ کے بعد سعی کے چکر شروع ہوئے۔ میں سعی کے دوسرے پھیرے میں تھا جب مبارکہ مجھے ملی اور بتایا کہ اس کا چھٹا چکر ہے۔ ہم نے سعی کے بعد سعی کے اختتام والے دروازے پر ملنے کا طے کیا۔ جب میں نے سعی کا عمل مکمل کیا اور سعی کے اختتام والے دروازے سے باہر گیا تو مبارکہ غائب۔۔۔

صبح سویرے منیٰ جانے سے لے کر موجودہ وقت تک میں مسلسل چلنے کے عالم میں تھا۔ چلنا بھی ایسا جس میں زیادہ تر پریشانی اور بے یقینی ساتھ ساتھ تھی۔ ساڑھے تین گھنٹوں میں طواف اور سعی کے مکمل ہونے والے عمل کے بعد اب ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ مبارکہ کو کہاں تلاش کیا جائے؟ پہلے تو باہر والے دروازے کے آس پاس ڈھونڈتا رہا۔ پھر طواف والے ایک کھلے حصے میں چلا گیا کہ وہاں عقب میں بچھی کھلی صفوں میں شاید کہیں مل جائے۔ کبھی ادھر اور کبھی اُدھر۔۔۔ لیجئے میری ذاتی سعی اب شروع ہوئی۔۔۔ بی بی حاجرہ اپنے لختِ جگر کے لئے بے چینی سے دوڑ رہی تھیں تو میں اپنے لختانِ جگر کی والدہ محترمہ کے لئے پریشان ہوا پھر رہا تھا۔ کبھی سعی

کے اختتام والے دروازے کی طرف تو کبھی آغاز والی طرف۔۔ کبھی بالکل باہر جا کر تو کبھی سعی یا طواف والے ہجوم میں جا کر۔ کبھی کسی طرف اور کبھی کسی طرف کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں۔ تیسری منزل پر موجود سرکاری اہلکاروں کو اپنی پریشانی بتائی، وہ ویسے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے اوپر سے ان کا حسبِ معمول نازیبا رویہ۔

ننگے پاؤں ہی حرم شریف سے باہر نکل آیا۔ رستے میں ایک ہندستانی نوجوان مل گیا۔ اس نے میری پریشانی جان کر پولیس اسٹیشن تک میری رہنمائی کی۔ وہاں ترجمان کا فریضہ بھی ادا کیا۔ لیکن جس پولیس نے جدہ سے لے کر منیٰ تک کسی مرحلے کی کسی پریشانی میں دھیلے کا تعاون نہیں کیا وہ اس صورتحال میں کیا مدد کرتے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ حرم شریف کی تیسری منزل کے اہلکاروں کو موبائل پر یہ واقعہ بتا کر اتنا کہہ دیں کہ کوئی خاتون اس پریشانی میں ملیں تو آپ کو اطلاع کر دیں۔ لیکن پولیس اسٹیشن نے اس رنگ کا کوئی تعاون کرنے سے بھی انکار کیا۔

پولیس اسٹیشن سے مایوس ہو کر ہندوستانی دوست کا شکریہ ادا کیا اور حرم شریف کی طرف لوٹ آیا۔ میری سعی گیارہ بج کر پچاس منٹ پر مکمل ہوئی تھی اور اب رات کے دو بج رہے تھے۔ میں گراؤنڈ فلور پر خانہ کعبہ کے سامنے اس طرف کھڑا ہو گیا جہاں سے حطیم شریف، مقامِ ابراہیم اور حجر اسود اور ملتزم شریف والے حصے میرے سامنے تھے۔ ننگے پاؤں چل چل کر ویسے ہی مت ماری گئی تھی۔ اس وقت دعا کے لئے الفاظ بھی نہیں سوجھ نہیں رہے تھے۔ حج پر آنے سے پہلے مجھے بلھے شاہ کی ایک کافی ریاض قادری کی آواز میں دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا تھا۔ مجھے اس کی پیش کش اور گانے کا انداز سب بہت اچھا لگا تھا۔ نئی موسیقی کے اوچھے پن کی بجائے اس میں وہی پاکیزگی ملتی تھی جو بلھے شاہ کی کافی کا خاصہ ہے۔ پتہ نہیں کیسے اس کافی کا ایک بند میرے ذہن میں گونجنے لگا۔ منیٰ کے لئے صبح ساڑھے آٹھ بجے روانگی کے سفر سے لے کر اب تک میں مسلسل چل رہا تھا۔ کبھی سفر کے باعث، کبھی رستہ بھول کر، کبھی طواف اور سعی کے لئے اور اب مبارکہ کو ڈھونڈنے کے لئے۔۔۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے سے اب رات کے دو بجے کا وقت تھا اور میرے پاؤں کا چکر ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ پاؤں میں سچ مچ چھالے سے پڑ گئے تھے۔ شاعری میں چھالوں کا

ذکر بڑی آسانی سے کر لیا تھا اب سچ مچ واسطہ پڑا تو پتہ چلا کہ پاؤں کے چھالے کیا ہوتے ہیں۔زخمی پیر، بے پناہ تکان اوران سب سے بڑھ کر پریشانی اور بے بسی۔اسی حالت میں خانہ کعبہ میرے سامنے تھا۔پتہ نہیں کیسے بلھے شاہ کی کافی کا بند ذہن میں گونجنے لگا اور شاید میں اسے ہلکے ہلکے اپنے ہونٹوں سے بھی ادا کرنے لگا۔

ایس عشق دی جھنگی وچ مور بولیندا
ایس عشق دی دی جھنگی وچ مور بلیندا
ساہنوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار ڈسیندا
سانہوں گھائل کر کے فر خبر نہ لئی آ۔سانہوں گھائل کر کے فیر خبر نہ لئی آ
تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا تھیا۔۔۔۔۔تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا تھیا

میں کتنی دیر تک وہاں تھیا تھیا کی کیفیت میں رہا کچھ نہیں کہہ سکتا۔بس جب اس کیفیت سے باہر آیا تو ایک بار پھر حرم شریف کی تیسری منزل پر چلا گیا۔وہاں نماز گاہ والی جگہ سے ایک سرکاری اہلکار سے ’’زوجِ گم گشتہ‘‘ کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ سعی کے اختتامی حصے کے قریب ایک جگہ چند گم شدہ خواتین ہاتھ بلند کر کے کھڑی ہیں ان میں دیکھ لیں۔سعی کرنے والوں کے ہجوم سے گزرتا ہوا وہاں تک گیا تو دور سے چند خواتین ایک اونچی جگہ پر اپنے دائیں ہاتھ بلند کئے کھڑی تھیں۔ایک چہرے کو دیکھ کر کبھی گمان ہوتا تھا کہ یہ مبارکہ ہے اور کبھی لگتا تھا آنسوؤں سے دھلے ہوئے چہرے والی کوئی فلسطینی عورت ہے۔یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر یہ مبارکہ نہ ہوئی اور میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو یہیں کوئی تماشہ نہ بن جائے۔بہر حال خدا خدا کر کے مبارکہ کی نظر بھی مجھ پر پڑی اور پھر دونوں کی جان میں جان میں آئی۔

حرم شریف سے نکلے تو بالکل نڈھال ہونے کے باوجود محض اس وجہ سے کچھ تازہ دَم ہو گئے کہ دونوں بچھڑے ہوئے مل گئے تھے۔وہاں سے نکل کر سامنے والی سڑک پر گئے تا کہ اب سیدھا منیٰ کی طرف نکل جائیں۔اڑھائی بجے سے لے کر چار بجے تک کسی بس یا ویگن کے لئے بھاگ دوڑ کرتے رہے۔اس بھاگ دوڑ کی وجہ سے کبھی سڑک پر اور کبھی سڑک کے کنارے پر

رہے۔گاڑیوں کے دھوئیں نے مزید ستیاناس کر دیا۔جب رات کے (بلکہ صبح کے) چار بج گئے اور کوئی گاڑی نہیں ملی تو مجبوراً ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔گیارہ فروری سے **بارہ فروری** ہو چکی تھی اور میں مسلسل چل رہا تھا۔وہاں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد مبارکہ کی حالت مزید خراب ہونے لگی۔پہلے ہوٹل کے ڈاکٹر کو بلایا۔اس نے حالت دیکھتے ہوئے ایمبولینس منگا لی۔اب ہم لوگ ایمبولینس میں بیٹھ کر عبدالعزیز ہسپتال جا رہے تھے۔وہاں ضروری دیکھ بھال کے بعد دوائیں وغیرہ دے کر ہمیں چھٹی دے دی گئی۔وہاں سے نکل کر حرم شریف چلے گئے۔ظہر کی نماز ادا کی۔پھر ہوٹل واپس آئے۔یہاں مبارکہ کو چھوڑا۔کیونکہ اب اس کا منیٰ جانا زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔دوا کھا کر اس پر غشی سی طاری ہو رہی تھی۔میں نے اسے بتا دیا کہ آج تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنی ہیں۔آپ کے حصے کی کنکریاں آج بھی میں خود ہی مار کر آؤں گا۔ویسے سچی بات ہے کل کے تجربے کے باعث مجھ پر خوف سا طاری تھا کہ کل صرف ایک شیطان کو مارنے میں کتنا حشر ہو گیا تھا، آج تینوں شیطانوں کو پتھر مارنے ہیں۔پتہ نہیں وہاں سے زندہ واپسی ہوتی ہے یا نہیں۔

جمرات پہنچ کر شیطان کو کنکر مارنے کا سلسلہ شروع ہوا تو بے شک رش کافی تھا لیکن روانگی کے وقت مجھ پر جتنا خوف طاری تھا وہ سارا دور ہو گیا۔میں نے تھوڑی محنت اور ہمت سے کام لے کر نہ صرف تینوں مقامات پر اپنے حصے کی کنکریاں ماریں بلکہ مبارکہ کے حصے کی کنکریاں بھی مار لیں۔اس بار یہ بھی اندازہ ہوا کہ ہجوم کے باعث جو ہلاکتیں ہوتی ہیں اس میں ہجوم کی زیادتی سے زیادہ بد انتظامی کا دخل ہے۔جہاں سے لوگ پتھر مارنے کے لئے جا رہے ہیں وہیں سے واپس آ رہے ہیں۔کوئی لائن یا ترتیب نہیں ہے۔بس جب ایک طرف کا چھوٹا سا ہجوم اور مخالف سمت کا چھوٹا سا ہجوم برابر کی زور آزمائی شروع کر دیتا ہے تو پھر کچلے جانے سے یا دَم گھٹنے سے اموات ہو جاتی ہیں۔میں انتہائی معذرت کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اگر جرمنی کی کسی کمپنی کو اس کا انتظام سونپ دیا جائے تو یہ لوگ ایسی سیٹنگ کر دیں گے کہ لاکھوں کی تعداد کے باوجود حجاج کرام اطمینان سے اس مرحلہ سے گزر سکتے ہیں۔جتنی اموات بھی ہوتی ہیں محض بد انتظامی کی وجہ

سے۔وہ بدانتظامی جو سارے اسلامی ملکوں کی شناخت بن چکی ہے۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تین شیطانوں سے اتنی آسانی سے گلوخلاصی ہو جائے گی۔وہاں سے نکلا تو اطمینان سے سڑک کے کنارے لگی ہوئی عارضی دکانوں کو دیکھتا چلا۔اپنی پسند کی چند چیزیں بھی خرید لیں۔واپسی کے لئے ایک ویگن میں جگہ مل گئی اور میں شیطانوں کو کنکر مار کر منیٰ کی بجائے اطمینان سے واپس مکہ پہنچ گیا۔اصولاً ہمیں یہ دن منیٰ کے خیموں میں گزارنے چاہئیں تھے۔لیکن مبارکہ کی حالت کے پیشِ نظر ہوٹل میں قیام کرنا پڑ رہا تھا۔منیٰ میں ہم دو راتیں ہی گزار سکے تھے جبکہ ایک رات مزدلفہ میں گزری تھی۔

شیطان کو دوسرے دن پتھر مارنے کے تجربے کے بعد مجھے کافی تسلی ہو گئی تھی اور ۱۳؍**فروری** (۱۲ **ذی الحجہ**) کو میں ہوٹل سے نکلنے سے پہلے جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے ڈائیلاگ مارتے ہوئے کہہ رہا تھا او شیطانو! تیار ہو جاؤ میں آ رہا ہوں۔۔۔۔لیکن جب جمرات پہنچا تو رمی جمرات (شیطانوں کو کنکریاں مارنے کا عمل) ۱۰ ذی الحجہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئی۔لگتا ہے شیطان میرے للکارنے کا برا مان گئے تھے۔اس بار رش اتنا زیادہ تھا کہ ایک مرحلہ پر تو مجھے سچ مچ اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا اور لگا کہ میں گیا۔۔اگرچہ شیطان کو مارنے میں بری طرح نڈھال ہو گیا لیکن پھر بھی جیسے تیسے یہ کام مکمل ہو گیا۔جمرات سے واپسی میں بھی مشکل ہو گئی۔آج شیطان کو کنکریاں مارنے کا آخری دن تھا اور روایات کے مطابق منیٰ میں مقیم حجاج کی اکثریت آج ہی غروبِ آفتاب سے پہلے حدودِ منیٰ سے نکل جانا چاہتی تھی۔اسی لئے وہاں سے واپسی کے لئے کوئی گاڑی نہیں مل رہی تھی۔پیدل چلنے والوں کے کئی کارواں رواں دواں تھے۔مبارکہ ساتھ نہیں تھی تو مجھے لگا کہ میں اکیلا پیدل چل کر حرم شریف تک پہنچ ہی جاؤں گا۔سڑک کے کنارے کنارے بہت سے لوگ پیدل جا رہے تھے۔میں بھی اسی طرف چلنے لگا۔آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ایک سکوٹر والا میرے قریب آ کر رُک گیا۔یہ کوئی بنگالی نوجوان تھا۔اس سے ہوٹل تک پہنچانے یا حرم شریف تک پہنچانے کی بات ہوئی۔۳۰ ریال میں معاملہ طے پایا۔یوں میں نسبتاً کم تکلیف کے ساتھ ہوٹل پہنچ گیا۔مبارکہ کو تسلی دی۔کچھ دیر آرام کیا۔

پھر ہم عشاء کی نماز کے لئے حرم شریف کی طرف روانہ ہوئے۔مبارکہ نے ہمت کر لی تھی کہ جیسے تیسے حرم شریف چلنا ہے۔نماز عشاء کے بعد ساڑھے نَو بجے تک ہم صحنِ کعبہ میں بیٹھے رہے۔ اتنے بے پناہ رش کے باوجود صحنِ کعبہ میں بیٹھ کر اتنی دیر تک دیدارِ کعبہ کی سعادت مل جانا بہت بڑی بات تھی۔پھر طواف کرنے والوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو ہمیں صحنِ کعبہ سے پیچھے ہٹنا پڑا کہ طواف کرنے والوں کا حق فائق تھا۔

۱۴؍**فروری** (۱۳؍**ذی الحجہ**) جمعۃ المبارک کا دن اور مکہ شریف میں ہمارا آخری دن کہ اگلے روز ۱۵؍فروری کو ہمیں مدینہ شریف روانہ ہو جانا ہے۔اس لحاظ سے مکہ میں یہ ہمارا آخری دن تھا۔منیٰ سے واپس آنے والوں کے باعث کل رات سے ہی مکہ میں رش بہت بڑھ چکا تھا۔ہمیں آج طوافِ وداع بھی کرنا ہے۔فجر کی نماز کے بعد ہم نے حرم شریف میں ہی سورۃ یاسین اور سورۃ صافات پڑھ کر اپنی دلی مرادیں مانگیں۔پھر وہیں بیٹھے رہے۔دن کے دس بجنے والے تھے جب میں نے باہر آ کر ایک وہیل چئیر والے سے بات کی۔بات طے ہو گئی تو مبارکہ کو بھی باہر لے آیا۔اس بار ہم نے کسی گمشدگی کی صورت میں اپنا میٹنگ پوائنٹ طے کر لیا تھا۔مبارکہ نے وہیل چیئر پر بیٹھ کر تیسری منزل سے طواف شروع کیا اور میں نے صحنِ کعبہ ہی میں طواف کی سعادت حاصل کی۔10.20 بجے سے لے کر 11.35 بجے تک یہ طواف مکمل ہو گیا۔مبارکہ بھی جلد ہی میٹنگ پوائنٹ پر پہنچ گئی۔اس کے بعد ہم نے جمعہ نماز کی تیاری شروع کی۔جمعہ نماز کی ادائیگی کے بعد میں نے ایک قریبی ہوٹل سے کھانا پیک کرایا۔حرم شریف کے باہر والے وسیع فرش پر بیٹھ کر ہم نے وہ کھانا کھایا۔خدا کا شکر ادا کیا۔کھانا کھانے کے بعد مبارکہ کی طبیعت خراب ہونے لگی تو اسے ہوٹل لے آیا۔وہاں اسے دوا دینے کے ساتھ آرام کرنے کو کہا اور پھر خود حرم شریف آ گیا۔یہاں سے عشاء کی نماز کے بعد ہوٹل سے کھانا پیک کرایا۔مبارکہ کو کھانا پہنچایا۔پھر شارع خالد بن ولید کی سڑک کے کنارے لگی ہوئی فرشی مارکیٹ کو دیکھتا ہوا حرم شریف پہنچ گیا۔اس بار صحنِ کعبہ تک پہنچ کر میں نے مقامِ ابراہیم اور درِ کعبہ کے سامنے ایک جگہ حاصل کر لی۔طوافِ کعبہ کرنے والوں کے وسیع دائرے سے ذرا ہٹ کر مجھے ایسی جگہ مل گئی

جہاں سے دیدار ممکن تھا۔ بیٹھ کر بھی کافی دیر تک دیدار کیا۔ پھر کھڑے ہوکر الوداعی نظر ڈالنا چاہی تو جیسے پاؤں فرش سے جم گئے اور آنکھیں کعبہ شریف پر ہی گڑی رہ گئیں۔ یہ الوداعی نظر خاصی طویل ہوگئی۔ شاید بیٹھ کر کئے گئے دیدار سے بھی زیادہ طویل۔۔۔اس سفر کے دوران اٹھائی گئی ساری تکالیف اور پریشانیاں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں اور اس دیدار کی لذت میں بے معنی ہوتی جا رہی تھیں جو اس الوداعی نظر سے نصیب ہو رہی تھی۔ پھر میں ویسی ہی اداسی کی کیفیت کے ساتھ باہر آیا جیسی بہت ہی پیاروں سے بچھڑتے لمحوں والی اداسی ہوتی ہے۔

۱۵/ **فروری** (۱۴/ **ذی الحجہ**) کو ہم صبح سویرے ساڑھے پانچ بجے ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر اپنے متعلقہ آفس میں پہنچ گئے۔ وہیں فجر کی نماز ادا کی۔ وہیں سے ہمیں بس اسٹیشن تک لے جایا گیا۔ مکہ سے مدینہ تک کا یہ سفر انتہائی تکلیف دہ تھا۔ ہم صبح ساڑھے پانچ بجے کے نکلے ہوئے رات ساڑھے گیارہ بجے مدینہ میں اپنے ہوٹل تک پہنچے۔ یہ بس کا ایک عام سا سفر تھا۔ اس میں کہیں ٹریفک جام ہونے کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود پورا اہتمام کیا گیا تھا کہ حجاج کرام کو زیادہ سے زیادہ ثواب ملتا رہے (روایت ہے کہ سفرِ حج کے دوران جتنی تکالیف اور پریشانیاں ہوں اتنا ہی سارے سفر کا ثواب ملتا ہے)۔

۱۶/ **فروری** کو فجر کی نماز کے لئے نکلے۔ اس بار ہمارا ہوٹل مسجد نبوی سے کافی قریب ہے۔ میری کھانسی کی تکلیف شدت اختیار کر گئی ہے۔ مبارکہ تو خیر ویسے ہی مستقل بیمار ہے۔ خواتین کے لئے اس موقعہ پر زیارتِ روضۂ رسولؐ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ شاید اتنے رش میں ممکن بھی نہیں تھا۔ میں نے پہلے ہی مرحلہ میں تمام تر رش کے باوجود روضۂ رسولؐ پر حاضری کی سعادت حاصل کر لی۔ مدینہ کے کھانے والے ہوٹل، مکہ کے مقابلہ میں زیادہ سستے ہیں۔ لیکن ہم دونوں کے گلے بری طرح خراب ہیں۔ نوالہ حلق سے نہ اترے تو سستا اور اچھا کھانا بھی کس کام کا؟۔ بہر حال جتنا ہو سکا مدینہ میں گھوم پھر لئے۔ نمازیں بروقت ادا کرنے کی توفیق پا لی۔ کچھ خریداری بھی ہوگئی۔ LTU والوں سے اپنی واپسی کی سیٹ او کے کرانا ضروری تھا لیکن ٹیلی فون پر نہ تو ہوائی کمپنی کا کوئی بندہ فون اٹھا رہا تھا اور نہ ہی فہد عمرہ سروس والوں کا نمائندہ کسی طرح لائن پر

آ رہا تھا۔

۱۷/ **فروری** کو پھر LTU والوں اور فہد عمرہ سروس والوں سے رابطہ کی کوشش کی لیکن دونوں کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ آخر جرمنی میں بڑے بیٹے شعیب اور بہو تسنیم کو فون کر کے اس مسئلہ سے آگاہ کیا اور انہیں تاکید کی کہ LTU والوں کو رِنگ کر کے ہماری سیٹ کی کنفرمیشن کرا لیں۔ آج مسجد نبوی کے بیرونی حصے میں دستیاب آبِ زم زم حاصل کیا۔ باقی یہ دن بھی گزشتہ دن کی طرح ہی گزرا۔

۱۸/ **فروری** کو نمازِ فجر کے بعد واپسی پر ہی ناشتہ کیا۔ ہوٹل میں آ کر مبارکہ نے اپنی دوائیں لیں۔ تھوڑا سا آرام کیا۔ پھر ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ مدینے کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے رہے۔ اس دوران نمازوں کا وقت ہوتا تو مسجد نبوی میں جا کر نماز ادا کر لیتے اور پھر مارکیٹ میں جا نکلتے۔ عشاء کی نماز کے بعد ہوٹل میں آ گئے۔ سوا آٹھ بجے ہم نے ''ہجرہ ریسیپشن اسٹیشن'' کے لئے ایک ٹیکسی لی۔ وہاں جاتے ہی جدہ جانے والی بس میں جگہ مل گئی۔ ۱۰ بجے چلنے والی بس گیارہ بجے روانہ ہوئی اور اگلے روز یعنی ۱۹/ **فروری** کو صبح سات بجے ہم جدہ پہنچ گئے۔ وہاں متعلقہ آفس سے اپنے گمشدہ سامان کے بارے میں پتہ کیا۔ ایک عمارت میں بہت سے لوگوں کا گمشدہ سامان جمع کیا ہوا تھا۔ ہمیں وہ ساری جگہیں دکھا دی گئیں۔ لیکن ان میں ہمارا سامان کہیں بھی نہیں تھا۔ مبارکہ کی طبیعت پھر مضمحل سی ہوگئی اور اس کی حالت دیکھ کر مجھے بوریت ہونے لگی۔ یہ سارا دن جدہ ائر پورٹ پر ہی گزارنا تھا، اور اسی بوریت کے ساتھ ہی گزارنا پڑا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے ٹیلی فون کر کے ٹیپو کو اطلاع دی کہ ہم آج رات جرمنی کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی اسے تاکید کی کہ ہم دونوں کے اوور کوٹ ائر پورٹ پر لیتے آئیں۔ شام سات بجے روانہ ہونے والا جہاز رات ایک بجے کے بعد ملا۔ صبح (رات) دو بجے جہاز جرمنی کے لئے روانہ ہوا تو ۲۰ **فروری** کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔

جدہ ائر پورٹ پر ایک ایسا واقعہ دیکھنے میں آیا جس کا تکلیف دہ اثر آج بھی میرے ذہن میں موجود ہے۔ ائر پورٹ پر مسافروں کے لئے کئی ہوٹل اور اسٹالز بنے ہوئے تھے۔ ایک اسٹال پر

کھانا فروخت ہو رہا تھا۔لوگ ویسے تو لائن میں لگے ہوئے تھے لیکن ساتھ ہی اضافی لائنیں بھی بن رہی تھیں اور کوئی نظم وضبط نہیں تھا۔اس اسٹال پر ایک نہایت نفیس قسم کا افریقی نوجوان لمبی لائن کے باوجود بڑے تحمل کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔جب اس کی باری قریب آئی تب بھی اس کے آس پاس سے لوگ کھانا لئے جا رہے تھے اور وہ کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر بھی لمبی لائن جیسی حالت میں تھا۔چنانچہ اس سے اتنی غلطی ہو گئی کہ اس نے اسٹال کے مالک کی طرف منہ کر کے لائن کی بے ترتیبی پر شستہ انگریزی میں اتنا کہہ دیا:

''یہاں کوئی ڈسپلن نہیں ہے۔رسولِ اکرمؐ کی تعلیمات پر عمل کر کے مغربی دنیا کتنی ترقی کر گئی اور عرب کے لوگ ویسے کے ویسے ہی رہ گئے۔''

عرب دوکاندار کو اس بات کی اتنی غیرت آئی کہ جب افریقی اس کے بالکل سامنے پہنچ گیا اس نے کہہ دیا''کھانا ختم ہو گیا ہے''

حالانکہ ابھی بہت کھانا موجود تھا اور ہر ایک کو دکھائی دے رہا تھا۔یہ دراصل عرب دوکاندار کی طرف سے اس افریقی کو کھانا دینے سے انکار کرنے کا اعلان تھا۔تب اس افریقی نے کسی غصے کے بغیر اتنا کہا:

مجھے اس مقدس سرزمین کی قسم ہے کہ پھر کبھی اس زمین پر نہیں آؤں گا۔

اسے محض ایک واقعہ نہیں سمجھیں،حقیقتاً یہ غیر عرب مسلمانوں کے تئیں عربوں کے جاہلانہ رویے کی ایک جھلک تھی۔مجھے اس ڈیسنٹ سے افریقی اور عرب دوکاندار کے چہروں اور دونوں کے کردار کا فرق آج بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ عربوں کی حالتِ زار پر رحم کرے۔اور انہیں اپنے رویے ٹھیک کرنے کی توفیق دے۔

جدہ ائر پورٹ پر آتے ہوئے بھی افراتفری اور نفسانفسی کا سماں دکھائی دیتا تھا اور اب جاتے ہوئے بھی وہی نفسانفسی کا منظر تھا۔کوئی لائن،کوئی ترتیب،کوئی تنظیم نہیں تھی۔دھکم پیل،مار پیٹ کے بعض مناظر بھی دیکھنے میں آ رہے تھے۔لیکن جیسے ہی ہم فرینکفرٹ ائر پورٹ پر پہنچے وہی سارے کے سارے مسافر کسی مار دھاڑ کے بغیر،کسی دھکم پیل کے بغیر بڑے ہی سلیقے اور

مہذب ترتیب کے ساتھ باہر جا رہے تھے۔کہیں معمولی سی بھی بدنظمی دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔

یہاں تک وہ روداد لکھی گئی ہے جس کے میں نے نوٹس تیار کئے تھے۔اب ان کے علاوہ چند باتیں جو ذہن میں آ رہی ہیں وہ یہاں کسی ترتیب کے بغیر بیان کر دیتا ہوں۔بس جیسے جیسے کوئی بات یاد آتی ہے لکھ دیتا ہوں۔

مکہ میں قیام کے دوران ہم نے زیادہ تر کھانا اسی سرائیکی ہوٹل سے کھایا یا پیک کرایا جہاں سے عمرہ والے دنوں (۱۹۹۶ء) میں کھانا کھاتے رہے تھے۔البتہ کبھی کبھار بہت زیادہ رش ہو جاتا تو کسی دوسرے ہوٹل سے بھی کھانا کھا لیتے۔شروع کے دو تین دن کے بعد ہم دونوں کے گلے خراب ہو گئے تھے اس لئے کھانا کھانے میں بھی تکلیف ہونے لگی تھی،لیکن کچھ نہ کچھ کھانا تو پڑتا تھا۔ہوٹل میں ہی بعض پاکستانی احباب کو دیکھا کہ کھانے کی ادائیگی کا حساب کرتے ہوئے انہیں خاصی پریشانی ہو رہی تھی۔ریال کے مقابلہ میں پاکستانی روپے کی حالتِ زار نے پاکستان سے آنے والوں کو زار و نزار کر رکھا تھا۔یورو چونکہ ریال سے کہیں بہتر تھا اس لئے ہمیں کھانا بہت ہی سستا لگتا تھا۔

مبارکہ کی زیرِ استعمال دواؤں کی اہمیت کی وجہ سے مکہ پہنچتے ہی بڑی بہو کو فون پر تاکید کر دی تھی کہ ان دواؤں کے جرمن ناموں کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر سے پوچھ کر ہمیں بتائیں۔چنانچہ ایک ہی دن میں یہ مرحلہ طے ہو گیا۔مبارکہ کی دوائیں مکہ سے ہی خرید لیں اور بلڈ پریشر ماپنے کی ایک مشین بھی وہیں سے خرید لی۔تاکہ مبارکہ کے سلسلے میں کوئی بڑا مسئلہ نہ بنے۔مجھے دن میں دو بار شوگر کے مرض کی ایک دوا لینا ہوتی ہے۔مکہ کے میڈیکل سٹورز سے پتہ کیا تو اسی نام کی ٹیبلٹ موجود تھی لیکن وہ فرانس کی بنی ہوئی تھی۔خدا کا شکر ادا کیا اور وہ ٹیبلٹس خرید لیں۔لیکن دو تین گولیوں کے استعمال سے یہ ماجرا سامنے آیا کہ وہ گولی کھانے کے بعد مجھے شدید سر درد کی شکایت ہو جاتی۔میں نے گولی کا استعمال ترک کیا تو سر درد کی تکلیف رفع ہو گئی۔چنانچہ میں نے پھر بغیر دوا کے اور بغیر کسی غیر معمولی پرہیز کے ہی باقی ایام گزارے۔اس دوران ایک بار ایک میڈیکل سٹور سے اپنی شوگر چیک کرائی تو نارمل تھی۔دوسری بار جدہ ائر پورٹ پر جرمنی سے گئے ہوئے ایک

دوست سید سعید احمد صاحب سے ملاقات ہوئی، آپ انڈیا سے آ کر جرمنی میں سیٹ ہوئے ہیں۔دورانِ گفتگو میری شوگر کے مسئلہ کا ذکر ہوا تو انہوں نے اسی وقت اپنی مشین نکالی اور میری شوگر چیک کی۔میرے لئے انتہائی حیرت کی بات تھی کہ شوگر کا لیول بالکل نارمل تھا۔کھانے میں کسی غیر معمولی پرہیز کے بغیر اور معمول کی دواؤں کے بغیر ۱۷ دن تک شوگر کا نارمل رہنا خدا کا خاص فضل ہی تھا۔ویسے اس فضل کا ایک طبی جواز بھی اب سمجھ میں آتا ہے۔

چاول، نان اور مرغن غذاؤں کے کھانے سے شوگر لازماً بڑھتی تھی لیکن اس دوران پاؤں میں جو چکر سا تھا، جو کسی نہ کسی بہانے گردش میں رکھے ہوئے تھا، وہی اس کا علاج کرتا جاتا تھا۔خاص طور پر ۱۱ ر فروری کو صبح ساڑھے آٹھ بجے سے لے کر سارا دن اور ساری رات اگلی صبح کے چار بجے تک جو مسلسل چلنا پڑا تھا اور جس کی وجہ سے خانۂ خدا میں بھی بلھے شاہ والا ''تھیا تھیا'' ہوتا رہا تھا تو دراصل یہ پاؤں کا چکر اضافی شوگر کا خصوصی علاج بھی کر رہا تھا۔

خانہ کعبہ کے طواف کے دوران بہت زیادہ بوڑھوں اور معذوروں کے لئے دو سہولتیں میسر تھیں۔وہیل چیئر کی سہولت سے استفادہ کرنے والوں کو اوپر کی منزلوں پر جانا ہوتا تھا جبکہ گراؤنڈ فلور پر اوپن ائر ڈولی کا انتظام تھا۔اس ڈولی کو چار قوی قسم کے افریقیوں نے اٹھایا ہوتا تھا۔اس اوپن ائر ڈولی پر بیٹھے ہوئے بوڑھے بزرگ سب سے زیادہ آرام سے طواف کر لیتے تھے۔مجھے ایک دو بار ایک بوڑھی سی، بہت ہی بوڑھی سی خاتون دکھائی دیں، بہت ہی سمٹی ہوئی سی، پتلی دبلی اور ارد گرد سے بے خبر، دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے، اور رُخ مسلسل کعبہ کی طرف کئے ہوئے مجھے وہ بہت ہی پیاری لگیں۔کبھی لگتا جیسے بواحیات خاتوں بیٹھی ہوئی ہیں اور کبھی لگتا مبارکہ کی پڑنانی بیٹھی ہیں جنہیں سارا خاندان ''وڈی بھابی'' (بڑی بھابی) کہا کرتا تھا۔میں نے اپنے بالکل ابتدائی بچپن میں انہیں دیکھا تھا۔پتہ نہیں وہ پیاری سی بوڑھی خاتون کون تھیں۔ان کی دعا کا والہانہ انداز مجھے اتنا اچھا لگا کہ اپنے دو بھولے بسرے بزرگ یعنی بواحیات خاتوں اور بڑی بھابی یاد آگئیں اور میں نے اسی بہانے سے ان دونوں کے لئے دعا کر لی۔

حج کے دوران یہ تکلیف دہ منظر دیکھنے میں آیا کہ پیشہ ور بھکاریوں کی ایک بڑی تعداد

منظّم طریقے سے نہ صرف سارے علاقے میں بلکہ حرم شریف میں صحنِ کعبہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ان لوگوں میں بعض واقعتاً معذور تھے اور بعض اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کی بنا پر معذور بنے ہوئے تھے۔ان کی یلغار ویسے تو ہر طرف تھی لیکن خواتین والے حصہ میں توجہ زیادہ تھی۔وجہ ظاہر ہے کہ خواتین کا دل جلدی پسیج جاتا ہے۔جس حصے میں کسی بھکاری کو زیادہ خیرات مل جاتی وہاں دوسرے بھکاریوں کی بھی یلغار ہو جاتی۔بعد میں پتہ چلا کہ ان میں سے بیشتر کے پاس موبائل ٹیلی فون تھے اور وہ ایک دوسرے سے براہِ راست رابطہ رکھتے تھے۔موبائل ٹیلی فون سے یاد آ گیا کہ حرم شریف میں بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ موبائل سے بھی استفادہ فرما رہے تھے۔بعض لوگوں کا طرزِ عمل نہ صرف ''نودولتیوں'' کی طرح بہت زیادہ مضحکہ خیز تھا بلکہ خاصا تکلیف دہ بھی تھا۔

ہم نے پہلے یا دوسرے دن جو خریداری کی اس میں ایک اٹیچی کیس بھی شامل تھا۔ خریدنے کے بعد جب اسے دیکھا تو اس کے اندر سے مزید تین اٹیچی کیس نکل آئے۔ہم نے تو ایک کی قیمت طے کی تھی یہاں چار نکل آئے۔میں نے اسی وقت مبارکہ سے کہا ہمارے دو اٹیچی کیس اور ایک بیگ غائب ہوا ہے، تین چیزوں کے بدلے میں خدا نے چار چیزیں دیدی ہیں۔بے شک چاروں اٹیچی خالی تھے لیکن جب ہم سعودی عرب سے واپس ہوئے تو چاروں ہی تبرکات سے بھرے ہوئے تھے۔

میں نے شروع میں لکھا تھا کہ حج کے انتظامات کو بہتر بنانے کے لئے چند مشورے لکھوں گا۔حج کے دنوں میں جدہ ائر پورٹ کی بجائے خصوصی حج پروازوں والا ائر پورٹ کھولا جاتا ہے۔مسافرانِ کرام کی کثرت کے باوجود یہ مناسب حد تک وسیع و عریض ایریا ہے۔رضا کاروں، اہلکاروں کی ایک بڑی تعداد وہاں متعین ہے۔لیکن یہ سب کے سب عربی بولنے والے لوگوں کے علاوہ باقی سب کے لئے بے کار ہیں۔جدہ ائر پورٹ سے لے کر منیٰ کی سڑکوں تک متعین اہلکاروں کے ساتھ ان تمام ممالک کی زبان بولنے والوں کا تعین کرنا بے حد ضروری ہے جہاں سے لوگ کثرت سے حج پر آتے ہیں۔مثلاً انڈونیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش، انڈیا، ملائیشیا، ترکی، ایران، افغانستان جیسے ممالک اور متعدد دیگر ممالک کی زبانیں جاننے

والوں کے رضا کار متعین کئے جانے چاہئیں۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔صرف نیت ٹھیک ہونی چاہئے اور حجاج کی مشکلات دور کرنے کا جذبہ ہونا چاہئے۔تمام متعلقہ ممالک سے ایسے رضا کار بلا معاوضہ خدمات انجام دینے کے لئے تیار مل سکتے ہیں۔ انہیں حج سے پہلے خصوصی تربیت دے کرانفرادی طور پرآنے والے حجاج کی مشکلات دور کرنے کے لئے کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگ محض عربی سے نابلد ہونے کے باعث خوار نہیں ہوں گے۔ان کی پریشانی کو سمجھا بھی جاسکے گا اور اس کا حل بھی نکل سکے گا۔ حج کو سچ مچ میں کمرشیلائز کر ہی دیا ہے تو تب بھی سعودی عرب کی حکومت کا فرض بنتا ہے کہ وہ لوگوں کے لئے پریشانیاں پیدا کرنے کی بجائے ان کی پریشانیاں کم کرنے کی کوشش کرے۔ورنہ قدرے تاخیر سے سہی خدا کی ناراضگی کسی نہ کسی رنگ میں ظاہر ہو کر رہے گی۔اگر ابوجہل جیسے بدبخت لوگ بھی نیک نیتی کے ساتھ حجاج کی خدمت کیا کرتے تھے تو سعودی حکمرانوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اتنا دیکھ لینا چاہئے کہ وہ حجاج کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ اور جہاں جہاں خامیاں ہیں انہیں دور کرنے کے لئے کیا اقدامات کئے جاسکتے ہیں؟

منیٰ میں رمی جمرات کے موقعہ پر ہر سال اموات ہوتی ہیں۔یہ اموات صرف اور صرف بدانتظامی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔اس سلسلے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ جہاں سے لوگ پتھر مارنے کے لئے آرہے ہوتے ہیں ان کی واپسی بھی وہیں سے ہوتی ہے۔اسی لئے آتے ہوئے ہجوم اور جاتے ہوئے ہجوم کے ٹکراؤ سے بھگدڑ مچتی ہے اور کمزور لوگ مارے جاتے ہیں۔اسی حج کے موقعہ پر اور اسی رش کے عالم میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے وقت جو جگہ ہوتی ہے وہ منیٰ کے مقابلہ میں خاصی محدود جگہ ہوتی ہے لیکن چونکہ وہاں آنے اور جانے کے رستے بالکل الگ الگ بنے ہوئے ہیں۔اسی لئے نہ وہاں کوئی بھگدڑ مچتی ہے نہ وہاں لوگوں کی اموات ہوتی ہیں۔ان دو مثالوں سے ہی مسئلے کا حل واضح ہو جاتا ہے۔یعنی رمی جمرات کے لئے آنے اور جانے کے بالکل الگ الگ رستے بنائے جانے چاہئیں۔یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوگا صرف نیت کرنے کی بات ہے اور کام شروع کر دیا جائے تو اگلے حج سے پہلے سارا نظام سیٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔اگر

سعودی حکومت یہ کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تو پھر شیطان کو مارنے کے رستوں کا انتظام کسی جرمن کمپنی کو ٹھیکے پر دے دے۔اگر خانہ کعبہ سے سعودی حکومت کے بعض باغیوں کو نکالنے کے لئے مغربی ممالک کی افواج سے مدد لی جاسکتی ہے (جو سعودی حکومت کسی زمانے میں لے چکی ہے) تو شیطان والے حصے میں حاجیوں کے بچاؤ اور سہولت کے لئے بھی ایسی مدد لے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

گروپ کی صورت میں آنے والے حجاج کسی فوجی دستے کی طرح لگتے تھے۔انڈونیشیا اور ملائیشیا کے گروپس تو دیکھنے میں بہت ہی پیارے لگتے تھے۔افغانیوں کے گروپ دیکھے تو دل میں ان کے لئے کوئی انجانا سا (یا شاید جانا سا) درد اٹھا لیکن گروپ کے افراد چہروں سے سرخرو دکھائی دے رہے تھے۔ان کے سر بلند تھے اور چال دھمک پیدا کرنے والی تھی۔مختلف عربی گروپ بھی اچھے لگ رہے تھے۔فلسطینیوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان سب کو سعودی حکومت نے اپنے سرکاری خرچ پر پورا طیارہ چارٹر کر کے بلایا تھا اور ان کے قیام وطعام کا سارا خرچہ بھی حکومت کے ذمہ تھا۔یہ خبر اچھی لگی۔

خانہ کعبہ کو اس بار پہلے دن دیکھا تھا تو اس کے اصل غلاف کے نیچے لگ بھگ دو میٹر چوڑی سفید پٹی لگی ہوئی تھی۔۱۲رفروری کو جب خانہ کعبہ کو دیکھا تو غلافِ کعبہ بدستور اصل مقام سے اونچا رکھا گیا تھا لیکن اس کے نیچے لگائی گئی اضافی سفید پٹی ہٹا دی گئی تھی۔اب نیچے سے کعبہ کی دیواروں کی اینٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔

حج کرنے کے بعد حج اور عمرہ کے فرق کا اندازہ ہوا۔حج فرض ہے۔عمرہ کی حیثیت نوافل جیسی ہے۔روحانی دنیا کے اہلِ نظر بخوبی جانتے ہیں کہ فرض نماز تو صرف فرض پورا کرنے والی بات ہوتی ہے، حکم بجا لانا ہوتا ہے۔محض فرض نمازیں پڑھنے سے قربِ خداوندی نہیں ملتا۔قربِ خداوندی کے لئے فرض سے آگے بڑھ کر نوافل کی منازل طے کرنا ہوتی ہیں۔یوں بھی فرض نماز کی باجماعت ادائیگی میں وہ روحانی لطف پیدا نہیں ہو پاتا جو اکیلے میں نوافل کی ادائیگی میں ملتا ہے ۔بس جیسے نمازوں میں فرض اور نوافل کا فرق ہے ویسے ہی حج اور عمرہ میں فرق

ہے۔حج فرض ہے اور صاحبِ توفیق پر لازم ہے۔اس میں مشقت اور ریاضت کا پہلو نمایاں ہے۔عمرہ فرض نہیں ہے لیکن نوافل کی طرح اس کی لذت الگ ہے۔ابھی تک کے تجربوں سے تو یہی کچھ سمجھ میں آیا ہے۔زندگی رہی،مزید توفیق ملی
اور اگلے تجربوں میں اس تاثر سے ہٹ کر کوئی نیا تاثر بنا تو ’’سوئے حجاز‘‘ کے کسی اگلے ایڈیشن میں اسے بیان کردوں گا۔ورنہ ابھی تک کا جو بھی تاثر بنا ہے وہ بیان کر دیا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ گنہگار کو (میری اہلیہ سمیت) نہ صرف عمرہ کی لذت عطا کی بلکہ حج کا فریضہ ادا کرنے کی توفیق بھی بخش دی۔اسے قبول کرے نہ کرے اس کی مرضی ہے۔ہمیں توفیق ملی تو ہم نے گرتے پڑتے جیسے تیسے ممکن ہوا فرض کو ادا کرلیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

چند تاثرات

میری رائے میں حیدر قریشی کا یہ سفرنامہ اردو میں لکھے ہوئے حج کے سفرناموں میں ایک بہت نمایاں اور ممتاز مقام کا حامل ہے اور سفرناموں کے ضمن میں ایک قیمتی اضافہ جو آئندہ چل کر بہت سے نقطہ ہائے نظر سے تاریخی حوالہ جات کا کام دے گا۔۔۔۔حیدر قریشی کا سفرنامہ ’’سوئے حجاز‘‘ پڑھتے ہوئے اس موضوع کا کوئی بھی سفرنامہ یاد نہیں آتا۔اس کی وجہ حیدر قریشی کا منفرد اندازِ فکر اور منفرد اسلوبِ تحریر ہے۔حیدر قریشی کا یہ امتیاز بہت نمایاں ہے کہ وہ قاری کی تمام تر توجہ اپنی جانب اس طور باندھ رکھتا ہے کہ پڑھنے والے کو کہیں اِدھر اُدھر کی نہ تو فرصت ملتی ہے اور نہ ہی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔وہ حیدر قریشی کے تخلیقی سحر میں سرتا پا شرابور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اکبر حمیدی(اسلام آباد)

....

’’**سوئے حجاز** میرے لئے ایک انمول تحفہ ہے۔یوں لگا گویا میں آپ دونوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے سارے متبرک مناظر اور شب و روز مجھے یاد آئے۔‘‘

(خط **افتخار امام صدیقی** مدیر ماہنامہ **شاعر** بمبئی،بنام حیدر قریشی ۱۳؍جولائی ۲۰۰۵ء)

....

سوئے حجاز کی فکری اور ادبی سطح کے علاوہ بھی اور کئی سطحیں ہیں جن کا اس مختصر مضمون میں احاطہ کرنا مشکل ہے تاہم یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حیدر قریشی کا یہ سفرنامہ عصرِ حاضر کے بیشتر سفرناموں میں منفرد مقام رکھتا ہے۔

ڈاکٹر نذر خلیق(اسلام آباد)

....

پارسل کی ڈوری کیا کھولی کہ محبت کی ڈوری سے بندھ گیا۔سوئے حجاز فوراً پڑھنا شروع کی۔دو نشستوں میں عمرے کا سفرنامہ ختم کیا ایک افطاری سے پہلے اور دوسری افطاری کے بعد۔آج حج کا سفرنامہ پڑھ کے ختم کیا ہے اور نیٹ پر آ گیا ہوں۔سارا سفرنامہ دردمندی اور عقیدت سے لکھا گیا ہے۔بلا وجہ کسی کو جذباتی نہیں کیا۔بات سادگی سے کہہ دی ہے۔سفرنامے کو انتہائی مختصر رکھا گیا ہے،شاید یہی اس کی خوبصورتی بھی ہے کہ بات کو زیادہ پھیلایا نہیں گیا۔ایک بات زیادہ خوبصورت لگی کہ سفرنامہ ہیٹرس ہائم سے شروع ہوتا ہے،پاکستان سے نہیں۔

محمد یونس خان(سرگودھا) ای میل بنام حیدر قریشی 03.10.2006 / 19:36

....

سفرنامہ ’’سوئے حجاز‘‘ جہاں حیدر قریشی کے احساسات اور خیالات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے،وہاں اپنے قارئین کے لیے نہایت اہم تاریخی اور مذہبی معلومات کا خزینہ بھی ہے۔ **منزہ یاسمین** (بھاول پور)

....

حیدرقریشی۔۔شخص وعکس

مرتّب:ارشدخالد

مدیرعکاس انٹرنیشنل(اسلام آباد)

نام: قریشی غلام حیدرارشد

قلمی نام: حیدرقریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور

پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر۱۹۵۳ء '

درست خاندانی روایت:۱۳رجنوری۱۹۵۲ء

مقامِ پیدائش: چناب نگر(سابق ربوہ)

آبائی علاقہ: رحیم یارخاں خان پور(سابق ریاست بھاولپور)

تعلیم: ایم اے(اردو)

ادبی سفر کا آغاز: ۱۹۷۱ء

اصنافِ ادب: **شاعری میں:** غزل،نظم،ماہیا

نثر میں: افسانہ،خاکہ،انشائیہ،سفر نامہ،یادنگاری،تحقیق وتنقید،حالاتِ حاضرہ

....

کتب کی تفصیل:

شاعری

سلگتے خواب(غزلیں)،ناشر:تجدیداشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ۱۹۹۱ء

عمرِ گریزاں(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)،ناشر:تجدیداشاعت گھرلاہور،اسلام آباد۔
مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

محبت کے پھول(ماہیے)،ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

دعائے دل(غزلیں،نظمیں)ناشر:نصرت پبلشرز لاہور۔مطبوعہ۱۹۹۷ء۔

چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں**،**نظمیں**،**ماہیے** ناشر:سروراد بی اکادمی۔جرمنی۔
مطبوعہ۱۹۹۸ء۔

درد سمندر(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)یہ مجموعہ کلیات'عمرلاحاصل کا حاصل'میں شامل کیا گیاہے۔

تخلیقی نثر

روشنی کی بشارت(افسانے)ناشر:تجدیداشاعت گھر،اسلام آباد،لاہور۔
مطبوعہ۱۹۹۲ء۔

قصے کہانیاں(افسانے)یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا۔**افسانے** میں شامل ہے۔

افسانے(روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں ایک جلد میں)،ناشر:معیارپبلی کیشنز دہلی۔
مطبوعہ۱۹۹۹ء۔

ایٹمی جنگ(تین افسانے اردواور ہندی میں)ناشر:معیارپبلی کیشنز دہلی۔مطبوعہ۱۹۹۹ء۔

میں انتظار کرتا ہوں(افسانوں کا ہندی ترجمہ)ناشر:ساہتیہ بھارتی،دہلی۔
مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

AND I WAIT (اب تک کے سارے افسانوں کاانگریزی ترجمہ)
ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۸ء

میری محبتیں(خاکے)،ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

میری محبتیں(خاکے)،ناشر:معیارپبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔

کھٹی میٹھی یادیں(یادنگاری)پہلے یہ الگ سے شائع نہیں کی،عمرِ لاحاصل کا حاصل

میں شامل ہے۔اب سال ۲۰۱۳ء میں تین ابواب کے اضافوں کے ساتھ پاکستان سے الگ کتابی
صورت میں شائع کی گئی ہے۔ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز،خانپور
۔مطبوعہ ۲۰۱۳ء

سُوئے حجاز (سفرنامہ۔عمرہ کا احوال)' ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۰ء۔

سُوئے حجاز (سفرنامہ،سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ)،ناشر:سرور ادبی اکادمی جرمنی۔
مطبوعہ ۲۰۰۴ء۔

فاصلے،قربتیں (انشائیے) پہلے یہ کتاب الگ سے شائع نہیں کی،'عمرِ لاحاصل کا حاصل'
میں شامل ہے۔اب سال ۲۰۱۴ء میں اس مختصر کتاب کو الگ سے شائع کر دیا گیا ہے۔
ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔مطبوعہ ۲۰۱۴ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات۔میگزین سائز ۲۸۴ صفحات
ناشر:معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۵ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات،لائبریری ایڈیشن۔
میگزین سائز ۶۱۶ صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)
ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء

....

عمرِ لاحاصل کا حاصل (انٹرنیٹ ایڈیشن)

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات،لائبریری ایڈیشن۔
میگزین سائز ۶۸۰ صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء
کے بعد ۲۰۱۲ء تک کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ ایڈیشن

....

قفس کے اندر

چھ شعری مجموعے ایک ساتھ۔۔عوامی اور اکانومی ایڈیشن ۶۰۰ سے زائد صفحات کا میٹر
صرف ۱۵۲ صفحات میں

سلگتے خواب — **عمرِ گریزاں** — **محبت کے پھول**
دعائے دل — **دردِ سمندر** — **زندگی**

ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز خانپور۔مطبوعہ ۲۰۱۳ء

قفس کے اندر کا انٹرنیٹ ایڈیشن
چھ شعری مجموعے الگ الگ کتاب کی صورت میں یک جا۔اس لنک پر موجود ہے۔

http://haider-qureshi.blogspot.de/

....

خواب کے اندر خواب

تخلیقی نثر کے چھ مجموعے ایک ساتھ
۱۔**روشنی کی بشارت** (افسانے)،۲۔**قصے کہانیاں**،۳۔**میری محبتیں** (خاکے)
۴۔**کھٹی میٹھی یادیں**،۵۔**فاصلے،قربتیں** (انشائیے)،۶۔**سوئے حجاز** (سفرنامہ)
چھ نثری مجموعے ایک ساتھ اس لنک پر دستیاب ہیں

http://haider-qureshi.blogspot.de/

....

تحقیق و تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت(مضامین)

ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور مطبوعہ۱۹۹۵

حاصلِ مطالعہ(تنقیدی مضامین) ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی مطبوعہ ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت

ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء

تاثرات (تنقیدی مضامین اور تبصرے)۔ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔مطبوعہ ۲۰۱۲ء

ستیہ پال آنند کی ”۔۔بُودنی نابُودنی“(مضامین)۔

ناشر: عکاس انٹرنیشنل،اسلام آباد۔۲۰۱۳ء

مضامین اور تبصرے(نئے مضامین کا مجموعہ) زیر اشاعت۔

ناشر: عکاس انٹرنیشنل،اسلام آباد۔امکانی طور پر ۲۰۱۴ء

اردو میں ماہیا نگاری(تحقیق و تنقید) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۷ء

اردو ماہیے کی تحریک(مضامین) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔راولپنڈی۔مطبوعہ ۱۹۹۹ء

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما(مضامین)

ناشر: معیار پبلی کیشنز دہلی۔۱۹۹۹ء

اردو ماہیا(ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔

یہ کتاب ”اردو ماہیا تحقیق و تنقید“ میں شامل ہے)

ماہیے کے مباحث(مضامین۔یہ کتاب ”اردو ماہیا تحقیق و تنقید“ میں شامل ہے)

اردو ماہیا تحقیق و تنقید(ماہیے کی تحقیق و تنقید کی پانچ کتابیں ایک جلد میں)

ناشر: الوقار پبلی کیشنز۔لاہور۔مطبوعہ ۲۰۱۰ء

....

حالاتِ حاضرہ

منظر اور پس منظر(9/11 کے بعد حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے فکر انگیز کالموں کا مجموعہ)

ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی اور www.urdustan.com مطبوعہ ۲۰۰۴ء

خبر نامہ (خبروں پر تبصروں کا سلسلہ)۔ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔

مطبوعہ ۲۰۰۶ء۔

اِدھر اُدھر سے(خبروں پر تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۸ء

چھوٹی سی دنیا(مشرق و مغرب کے پس منظر میں لکھے گئے کالموں کا مجموعہ)

۲۰۱۲ء میں اس مختصر کتاب کا انٹرنیٹ ایڈیشن شائع کیا گیا

....

بطور مرتب

شفق رنگ: (ضلع رحیم یار خان کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز،خانپور،

مطبوعہ اپریل ۱۹۷۹ء

کرنیں: (بھاولپور ڈویژن کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز،خانپور۔

مطبوعہ اپریل ۱۹۸۰ء

سرائیکی غزل: (سرائیکی میں ایک بحث کے ساتھ غزلوں کا انتخاب)

ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز،خانپور مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۰ء

پہلا ورق: (اوراق کے اداریے) ناشر: مکتبہ ہم زبان کراچی۔مطبوعہ ۱۹۹۰ء

....

ادارت

ادبی رسالہ ”**جدید ادب**“ خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔۷ شمارے شائع کیے۔ان میں ۸۰ صفحات سے لے کر ۵۰۰ صفحات تک کے شمارے شامل ہیں۔

جرمنی سے **جدید ادب** ۱۹۹۹ء میں دوبارہ شروع کیا گیا لیکن دوشماروں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ چند برسوں کی بندش کے بعد جولائی ۲۰۰۳ء سے یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا ہوا ہے۔ یہ رسالہ کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر اس سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔

www.jadeedadab.com

ان کوائف کی ترتیب تک اس کے ۱۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس ششماہی رسالہ کے سجاد ظہیر نمبر اور میرا جی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی کی سب سے پہلی ویب سائٹ:

www.haiderqureshi.com

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

چار ای لائبریریز

حیدر قریشی کی تمام کتابیں پی ڈی ایف فائل میں موجود ہیں

http://haider-qureshi.blogspot.de/

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

■■■■■■■■■■

حیدر قریشی پر لکھی گئی، مرتب کی گئی کتب و رسائل کی پی ڈی ایف فائلز موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■

حیدر قریشی کی تمام کتابیں اس لائبریری میں بھی موجود ہیں

http://issuu.com/haiderqureshi

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

ادبی بلاگس ان بلاگس پر حیدر قریشی کی کتب یونی کوڈ میں دستیاب ہیں۔

سوئے حجاز: **http://soo-e-hijaz.blogspot.de/**

■■■■■■■■■■

''روشنی کی بشارت''، ''قصے کہانیاں'' اور بعد کے سارے افسانے

http://hq-kayafsanay.blogspot.de/

■■■■■■■■■■

خاکوں کا مجموعہ ''میری محبتیں'':

http://meri-mohabbaten.blogspot.de/

■■■■■■■■■■

یادوں کا مجموعہ ''کھٹی میٹھی یادیں'':

http://khatti-mithi-yaden.blogspot.de/

■■■■■■■■■■

انشائیوں کا مجموعہ ''فاصلے، قربتیں'':

http://inshaiya.blogspot.de/

■■■■■■■■■■

دو خاص بلاگس

کلکتہ اور دهلی کا سفر، با تصویر

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■

حیدر قریشی کی البم: زندگی تصویروں کے آئینے میں

http://haiderqureshi-album.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

وکی پیڈیا کے صفحات

حیدر قریشی

http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi

جدید ادب

http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab

عمرِ لاحاصل کا حاصل

http://en.wikipedia.org/wiki/Umr-e-Lahaasil_Ka_Haasil

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

ادبی اعتراف

حیدرقریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن** **مصنف**: **محمد وسیم انجم**

(مطبوعہ۱۹۹۹ء) **ناشر**: انجم پبلشرز،کمال آباد نمبر۳،راولپنڈی۔پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**

مرتبین: **نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے** (مطبوعہ۲۰۰۲ء)

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**

مرتب: **ڈاکٹرنذر خلیق** (مطبوعہ۲۰۰۳ء) ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز،خانپور،پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن** **منزہ یاسمین** کا تحقیقی مقالہ

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔سال۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء۔

کتابی صورت میں ۔۔۔۔۔۔۔۔**ناشر**: میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان

۵۔**حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز** **مرتب**: **سعید شباب**

(مطبوعہ۲۰۰۴ء) **ناشر**: نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

۶۔ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدرقریشی نمبر۔۔۔**مدیر ومرتب**: **ارشد خالد**

ناشر: عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)

۷۔**حیدر قریشی کی شاعری** **مرتب**: **ہردئے بھانو پرتاپ**

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی (مطبوعہ۲۰۱۳ء)

۸۔**حیدر قریشی کی تخلیقی نثر** **مصنف**: **عامر سہیل**

زیرِاشاعت (سال ۲۰۱۴)

....

حیدر قریشی پر ترتیب دئیے گئے
گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشہ حیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ ''**اسباق**'' پونہ شمارہ: فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء۔

ایڈیٹر: نذیر فتح پوری

۲۔**حیدر قریشی** (بطور افسانہ نگار) مطبوعہ ماہنامہ ''**شاعر**'' بمبئی۔

شمارہ مئی تا دسمبر ۱۹۹۷ء۔**ہم عصر اردو ادب نمبر**... ایڈیٹر : افتخار امام صدیقی

۳۔اشاعتِ خصوصی ''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ،حیدر قریشی'' ہفت روزہ **ہوٹل ٹائمز**

اسلام آباد ۲۲ مئی تا ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء۔ مرتبین: اختر رضا کیکوٹی و محمد وسیم انجم

۴۔گوشہ حیدرقریشی مطبوعہ سہ ماہی ''**ادبِ عالیہ**'' وہاڑی۔شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء

ایڈیٹرز: ریاض ہانس و ریاض ملک

۵۔خصوصی مطالعہ ''**مہرِامروز**'' مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی ۲۰۰۴ء

(اردو دوست ڈاٹ کام) ایڈیٹر: خورشید اقبال

۶۔گوشہ حیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء ۔ایڈیٹر: افتخار امام صدیقی

۷۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی **ادب ساز** دہلی (تقریباً ۵۰ صفحات میگزین سائز پر مشتمل)

شمارہ: ۶،۷، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء ایڈیٹر: نصرت ظہیر

۸۔خصوصی مطالعہ **''عمرِ لاحاصل کا حاصل''**

مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد (کتاب نمبر۱۰) مدیر: ارشد خالد

۹۔گوشہ بحیثیت محقق ونقاد مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد

(کتاب نمبر۱۱،مئی ۲۰۱۰ء) مدیر: ارشد خالد

۱۰۔مطالعۂ خاص۔**ایک کتاب**: **''عمرِ لاحاصل کا حاصل''**۔مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔کتاب نمبر۱۳۔مارچ ۲۰۱۱ء۔ مدیر ومرتب: ارشد خالد

....

پاکستان اور جرمنی سے باہر کے اسفار

ہندوستان۔سعودی عرب۔انگلینڈ۔ہالینڈ۔فرانس۔ماریشس۔آسٹریا۔بلجیم۔

حیدر قریشی کاڈاک کا پتہ:

Haider Qureshi

Rossertstr.6, Okriftel,

65795 Hattersheim, Germany.

ٹیلی فون نمبر:0049-6190-930078 ای میل:haider_qureshi2000@yahoo.com

----

بحوالہ **عکاس** اسلام آباد شمارہ اکتوبر ۲۰۰۵ء **حیدر قریشی نمبر** مدیر **ارشد خالد**

فروری ۲۰۱۴ء تک تازہ ترین اضافوں کے ساتھ

خصوصی نوٹ

حیدر قریشی کے اوریجنل ورک کے حوالے سے اب تک ستائیس کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

شاعری: چھ مجموعے۔۔۔افسانے: دومجموعے۔۔۔خاکے: ایک مجموعہ

یادنگاری: ایک مجموعہ۔۔۔انشائیہ نگاری: ایک مجموعہ۔۔۔سفرنامہ: ایک مجموعہ

ماہیا کی تحقیق وتنقید: پانچ کتابیں۔۔۔۔متفرق تنقیدی مضامین چھ کتابیں

حالاتِ حاضرہ: کالموں کے چار مجموعے

یہی ۲۶ کتابیں متفرق اور مختلف ایڈیشنز کی صورت میں چونتیس کی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔یہ صرف اوریجنل ورک کے ذیل میں آنے والی کتابیں ہیں۔مرتب کردہ کتب اور ادبی رسائل کی ایڈیٹنگ کو ان میں شمار نہیں کیا گیا۔

حیدر قریشی کے حوالے سے یونیورسٹی سطح کا کام

براہِ راست

۱۔حیدر قریشی شخصیت اور فن۔۔۔منزہ یاسمین

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۰۲۔۔۲۰۰۰ء

۲۔حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جھتیں ڈاکٹرعبدالرب استاد

پی ایچ ڈی کا مقالہ ۲۰۱۳ء۔گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا

۳۔حیدر قریشی۔حیات وخدمات انجم آراء

ایم فل کا مقالہ۔۔۲۰۱۳ء۔کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا۔

۴۔حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ ہرمے پرتاپ بھانو

ایم فل کا مقالہ، سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

۵۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات۔۔۔عامر سھیل

ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔ہزارہ یونیورسٹی، ایبٹ آباد، پاکستان

۶۔حیدر قریشی کی افسانہ نگاری راضینہ خان

ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

بالواسطہ

۱۔جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث۔۔۔شازیہ حمیرہ

سال ۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

۲۔اردو میں ماھیا نگاری ڈاکٹر صبیحہ خورشید

سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا سے پی ایچ ڈی کا مقالہ